ضیاء النبی ﷺ
پیر محمد کرم شاہ الازہری
ضیاء القرآن پبلی کیشنز
گنج بخش روڈ، لاہور

جلد ششم

تحریک استشراق کا پس منظر، اس تحریک کی تعریف،
تاریخ اور طریق کار، مستشرقین کی طرف سے قرآن حکیم
پر کیے جانے والے اعتراضات کے مدلل جوابات

پیر محمد کرم شاہ الازہری
علامہ عبدالرسول ارشد

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
گنج بخش روڈ۔ لاہور

نام کتاب	ضیاء النبی ﷺ (جلد ششم)
مصنفہ	ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ
	علامہ عبدالرسول ارشد گولڈ میڈلسٹ
	فاضل دار العلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف
کتابت	کمپیوٹر کمپوزنگ، الفاروق کمپیوٹرز، لاہور
تعداد اشاعت	پانچ ہزار
تاریخ اشاعت	ذیقعد ۱۴۱۸ ہجری
ایڈیشن	اول
طابع	تخلیق مرکز پرنٹرز، لاہور۔ فون: ۷۲۴۴۵۵۵
ناشر	محمد حفیظ البرکات شاہ
	ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ گنج بخش روڈ، لاہور

فہرست مضامین

صفحہ نمبر

اللّٰھمّ صلّ علی

سیّدنا و مولانا

وعلیٰ آلِ سیّدنا و مولانا محمّد

صاحب الوجہِ الجمیلِ والخدّ

الاسیلِ والطرفِ الکحیل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

جب حضور ﷺ نے مکہ کے بت پرستوں کے سامنے اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصب رسالت کے لئے منتخب فرمایا ہے اور آپ کو حکم دیا ہے کہ نسل آدم جو خود تراشیدہ پتھروں کے حضور سر بسجود ہے اسے پتھروں کی پوجا چھوڑ کر خدائے واحد کی عبادت کی طرف بلائیں، زندگی کو کھیل تماشا سمجھنے والوں کو اس حقیقت سے آشنا کریں کہ ان کے خالق نے انہیں عبث پیدا نہیں کیا بلکہ انہیں ایک عظیم مقصد کی خاطر نعمت وجود سے نوازا ہے اور وہ مقصد یہ ہے کہ وہ خالق کائنات کی بندگی کریں اور ساتھ ہی انہیں اس حقیقت سے بھی آگاہ کریں کہ زندگی صرف اس دنیا میں آنے اور یہاں سے کوچ کر جانے سے عبارت نہیں بلکہ فانی زندگی کے خاتمے کے بعد ایک اور زندگی انسان کی منتظر ہوتی ہے، جس میں اس کی کامیابی یا ناکامی کا دارومدار اس بات پر ہوگا کہ انسان نے دنیوی زندگی کو کس انداز سے گزارا۔

خدا کے حبیب ﷺ نے جب اپنے ابنائے قوم کو اس حقیقت سے آگاہ کیا تو وہ اس عجیب و غریب اعلان کو سن کر ششدر رہ گئے۔ جس ہستی کو ان لوگوں نے خود صادق اور امین کا لقب دے رکھا تھا، شاید اس کی کسی بات کا ثبوت، اس سے پہلے انہوں نے نہیں مانگا ہوگا، لیکن یہ اعلان جو ان کی مذہبی، سماجی، معاشی اور فکری زندگی کی جڑیں کاٹ رہا تھا، اسے وہ اتنی آسانی سے کیسے قبول کر سکتے تھے؟

اس صورت حال پر ان کی طرف سے جس قدرتی ردعمل کا اظہار ہوا وہ یہ تھا کہ انہوں نے حضور ﷺ سے اس دعویٰ کی صداقت کے ثبوت کا مطالبہ کیا۔ حضور ﷺ نے اس دعویٰ کے ثبوت کے طور پر اپنی گزشتہ چالیس سالہ زندگی کو پیش کر دیا اور اپنے خالق و مالک کے حکم پر ان لوگوں سے فرمایا: فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ(1) کہ میری چالیس سالہ زندگی کے شب و روز تمہارے سامنے ہیں۔ میں نے تمہارے درمیان آنکھیں کھولی ہیں۔ بچپن اور لڑکپن کی منزلیں تمہاری آنکھوں کے سامنے طے کی ہیں۔ تم میری ذاتی زندگی سے بھی آگاہ ہو۔ میری اخلاقی حالت بھی تم سے پوشیدہ نہیں۔ زندگی

1۔ سورۂ یونس: 16

کے معاملات میں دوسرے لوگوں کے ساتھ میرا جو رویہ رہا ہے، وہ تمہارے سامنے ہے۔ میری کتاب حیات کے ایک ایک صفحے کو غور سے دیکھو۔ میری گفتار، میرے کردار اور میرے اخلاق کو انسانی اخلاق کی سخت سے سخت کسوٹی پر پرکھو۔ اگر میرا کردار اور میرے اخلاق اس کسوٹی پر پورے نہ اتریں تو میرے دعویٰ کو مسترد کردو۔ اور اگر میرا ماضی ہر کسوٹی پر پورا اترے تو ذرا سوچ لو کہ جس انسان کی زندگی ہر عیب سے پاک رہی ہے وہ دفعتاً اتنا بڑا جھوٹ کیسے بول سکتا ہے؟

تاریخ انسانی شاید اس حیران کن رویے کی مثال پیش نہ کرسکے، جب کسی مدعی نے اپنے دعوے کی صداقت کے ثبوت کے طور پر اپنی کتاب حیات کو پیش کیا ہو۔

کفار مکہ کو مظاہر فطرت میں غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی۔ انہیں ارض و سما کی تخلیق، شمس و قمر کے طلوع و غروب، موسموں کے بدل بدل کر آنے، دن کے رات اور رات کے دن میں تبدیل ہونے اور نزول باراں سے مردہ زمین کے زندہ ہونے کے حوالے سے خالق کے وجود کا یقین دلانے کی کوشش کی گئی لیکن ان کی کٹ حجتیاں ان براہین قاطعہ کے سامنے سرنگوں نہ ہوئیں لیکن حبیب خدا ﷺ کے پاکیزہ کردار، آپ کے صدق مقال، آپ کے معصوم بچپن، آپ کے بے عیب لڑکپن اور آپ کی کوثر و سلسبیل میں دھلی ہوئی جوانی کے سامنے نہ ان کا تعصب ٹھہر سکا اور نہ ہی ان کے ترکش میں کوئی ایسا تیر تھا جس سے وہ ان بے شمار خوبیوں سے متصف اس عظیم شخصیت کو مجروح کرسکیں۔

حضور ﷺ کی حیات طیبہ میں کوئی ایک نہیں بلکہ ہزاروں واقعات ایسے پیش آئے، جب کوئی انسان اپنے سینے میں عداوت رسول کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر لے کر آپ کے سامنے آیا اور حبیب خدا ﷺ کی شخصیت کے جمال جہاں آرا نے اس کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ چند لمحے پہلے جہاں عداوت کے جذبات ٹھاٹھیں مار رہے تھے، اب وہاں اسی ذات کی محبت کے گلشن آباد ہو چکے تھے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایمان لانے کے واقعے پر ایک نظر ڈالیں۔ اس بدو کو ایک نظر دیکھ لیں جس نے آپ کو تنہا ایک درخت کے نیچے محو استراحت دیکھ کر تلوار سونت لی تھی اور پھر اس تلوار سے حضور ﷺ کو شکار کرنے کے بجائے خود آپ کی زلف واللیل کا شکار ہو گیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ سخت جان اور سخت دل عربوں کے دلوں میں جو عقائد و نظریات چٹانوں کی طرح راسخ تھے ان کو حضور ﷺ کے حسن اخلاق اور حسن سیرت نے ہی متزلزل کیا تھا۔ اہل مکہ غالباً اسی وجہ سے آپ کو ساحر کہتے تھے کیونکہ ان کی بڑی بڑی قد آور شخصیتیں رسول مبین ﷺ کی سیرت کے طلسم ہوشربا کے سامنے ڈھیر ہو گئی تھیں۔

اسلام کے حیرت انگیز سرعت سے پھیلنے کا راز پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت کے حسن اور آپ کی دعوت کے کمال میں پوشیدہ ہے۔ آپ کے غلاموں نے اس راز کو پا لیا تھا اور انہوں نے اپنی زندگیوں کو اس نمونہ کمال کے سانچے میں ڈھالنے کی پوری کوشش کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جہاں بھی گئے دیکھنے والوں کو ان کی سیرتوں میں ان کے محبوب کے حسن سیرت کے جلوے نظر آئے اور انہوں نے ان کے سامنے اپنے دل فرش راہ کر دیئے۔

سیرت رسول اکرم ﷺ ملت اسلامیہ کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ اسی سیرت کے جلوے ان کے دلوں میں حب رسول کے دیپ جلاتے ہیں اور یہی محبت رسول ان کے ایمان کی جان ہے۔ یہی جذبہ محبت ان کے لئے معرکہ ہائے بدر وحنین میں فتح ونصرت کے پھریرے لہراتا ہے۔ اسی لطیف جذبے نے ان کی شخصیتوں کو جمال آشنا کیا اور اسی دولت نے ان کو دنیا کا امام بنایا۔

مسلمانوں نے سیرت رسول ﷺ کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اپنے آقا کی حیات طیبہ کے ایک ایک گوشے کو انتہائی احتیاط، بڑی عرق ریزی اور بے مثال خلوص ومحبت سے محفوظ کیا ہے۔ ملت کے قابل ترین افراد نے اپنی زندگیاں اس مقصد رفیع کے لئے وقف کیں اور آج بلا خوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جس خوبصورتی سے آپ کے غلاموں نے آپ کی حیات طیبہ کے مختلف گوشوں کو محفوظ کیا ہے اس کی مثال تاریخ اقوام وملل پیش کرنے سے قاصر ہے۔

اسلام ایک عالمی مذہب ہے۔ یہ جہالت کی تاریکیوں میں ہدایت کی روشن شمع ہے۔ اس نے اپنے پیروکاروں کو حکم دے رکھا ہے کہ وہ اسلام کی حیات بخش تعلیمات اور اس کے داعی اول کے دلربا کردار کا نقشہ لوگوں کے سامنے رکھیں اور انہیں دعوت دیں کہ وہ اس دین متین کے دامن میں پناہ لے کر اپنی دنیا اور آخرت کو سنوارنے کا انتظام کریں۔

جو لوگ مسلمان نہیں ہیں یا کسی دوسرے دین کو عمدہ ترین دین سمجھتے ہیں ان کو حق پہنچتا

ہے کہ وہ اسلام کے مقابلے میں اپنے دین کی فوقیت کو ثابت کرنے کی کوشش کریں۔ اگر ان کو دین اسلام کی تعلیمات میں کوئی نقص نظر آتا ہے یا انہیں داعی اسلام کی سیرت پر کوئی دھبہ نظر آتا ہے تو اس کی نشاندہی سے ان کو کوئی نہیں روک سکتا۔ وہ جس چیز کو حق سمجھتے ہیں اس کو حق ثابت کرنا اور جس چیز کو باطل سمجھتے ہیں، اس کا بطلان ثابت کرنا ان کا حق ہے۔ اگر وہ علمی انداز میں ایسی کسی بات کی نشاندہی کریں تو ہم انہیں خوش آمدید کہیں گے لیکن ہم کسی کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ اسلام کی طرف ایسی چیزیں منسوب کرے جن سے اسلام بری الذمہ ہے اور وہ حضور ﷺ کی پاکیزہ سیرت پر اس قسم کا کیچڑ اچھالے جس سے آپ کا دامن پاک ہے۔

جو انسان اسلام کی تعلیمات کو بگاڑ کر پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے یا حضور ﷺ کے دامن حیات کو ان رذائل سے آلودہ کرنے کی کوشش کرتا ہے جن سے نسل آدم کو پاک کرنے کے لئے آپ نے اپنی ساری زندگی وقف کر دی، وہ صرف مسلمانوں پر ہی ظلم نہیں کرتا بلکہ وہ ساری انسانیت پر ظلم کرتا ہے۔ وہ حق کی جستجو کرنے والوں کے لئے منزل حق تک پہنچنے والے تمام راستوں کو مسدود کرنے کی مذموم کوشش میں مصروف ہے۔ وہ نہ اپنی ذات کا خیر خواہ ہے اور نہ ہی اپنے مذہب و ملت کا ہمدرد۔ وہ ساری انسانیت کا قاتل ہے اور اس کے دست جفا کو روکنا ہمارا حق ہی نہیں فرض بھی ہے۔

شمع اسلام کو روز اول ہی سے تند و تیز طوفانوں سے واسطہ پڑا ہے۔ اس شمع کو گل کرنے کے لئے ہزاروں آندھیاں اٹھی ہیں اور کاروان حق کی اس ناؤ کو ڈبونے کی ہزاروں کوششیں ہوئی ہیں لیکن ہر طوفان اس چٹان سے ٹکرا کر اپنا رخ موڑنے پر مجبور ہوا ہے۔ جور و ستم کی وہ کون سی ادا تھی جو کفار مکہ نے مسلمانوں کے خلاف استعمال نہ کی ہو؟ مکر و فریب کا وہ کون سا انداز تھا جس کے ذریعے مدینہ کے یہود و منافقین نے اشاعت اسلام کے راستے میں بند باندھنے کی کوشش نہ کی ہو؟ لیکن حق پھیلنے کے لئے ہی کرہ ارضی پر جلوہ گر ہوا تھا اور یہ پھیلتا ہی رہا اور ایک صدی سے بھی کم عرصہ میں اس نے دنیا کے دو براعظموں کو اپنا زیر نگین بنا لیا اور براعظم یورپ کے دروازوں پر دستک دینا شروع کر دی۔

جو طاقتیں اسلام کے راستے میں مزاحم ہوئیں ان میں یہودیت اور نصرانیت خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں طاقتیں چودہ سو سال سے مسلسل اسلام کے خلاف برسر پیکار

ہیں۔ انہوں نے تلوار سے بھی اسلام کا مقابلہ کیا ہے اور دلیل سے بھی لیکن ہر میدان میں شکست ان کا مقدر بنی ہے اور ان پے درپے شکستوں نے ان کی اسلام دشمنی میں ہمیشہ مزید اضافہ کیا ہے۔

ان طاقتوں نے اسلام کے خلاف جو حربے استعمال کئے، ان میں اسلام کی شکل مسخ کر کے مسلمانوں کے دلوں میں اپنے دین کی وقعت کو کم کرنے کی کوشش سب سے زیادہ خطرناک حربہ ہے۔ یہود و نصاریٰ کی اسلام کے خلاف سازشیں روز اول سے جاری ہیں لیکن صلیبی جنگوں کے بعد ان سازشوں نے انتہائی گھناؤنی شکل اختیار کی اور یورپ کی مادی ترقی کے ساتھ ساتھ یورپ میں اسلام دشمنی ایک باقاعدہ سائنس کی شکل اختیار کر گئی۔

علمی تحقیق کے نام پر اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف کیچڑ اچھالنے کا بیڑہ جن لوگوں نے اٹھایا، انہیں مستشرقین کہا جاتا ہے۔ ایک سیرت نگار جو حضور ﷺ کی حیات طیبہ کے حسین گوشے پورے خلوص و عقیدت سے اپنے قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے، اب اس کا یہ بھی فرض بن گیا ہے کہ وہ مقدور بھر ان دھبوں کو بھی اپنے قلم تحقیق سے دور کرنے کی کوشش کرے جو علمی تحقیق کا لبادہ اوڑھنے والے مستشرقین نے حضور ﷺ کی سیرت پاک پر لگانے کی کوشش کی ہے۔

ضیاء النبی کی پہلی پانچ جلدوں میں ہم نے مقدور بھر حضور ﷺ کی حیات طیبہ کے مختلف حسین و جمیل گوشے قارئین کے سامنے پیش کئے ہیں۔ سیرت کے وہ مقامات جن کے بارے میں مستشرقین نے خامہ فرسائی کی ہے، ان مقامات پر معترضین کے اعتراضات کے جواب دینے کی کوشش اسی لئے نہیں کی گئی کہ ابتدا ہی سے یہ خیال تھا کہ اس اہم موضوع پر ایک مستقل جلد میں تفصیلی گفتگو کی جائے۔ مستشرقین کے اعتراضات کے جواب دینے سے پہلے یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ اس تحریک کی تاریخ، اس کے اغراض و مقاصد، اس کے طریقہ ہائے واردات اور مسلمانوں کے ان کی کوششوں سے متاثر ہونے کے اسباب پر تفصیل سے بحث کی جائے تاکہ قارئین اعتراض پڑھنے کے ساتھ ساتھ معترضین کی فطرت اور اعتراض کے پس منظر میں جو محرکات کارفرما ہیں ان سے بھی آگاہ ہو سکیں۔

بدقسمتی سے ہم مادی پسماندگی کے ساتھ ساتھ مغرب کی ذہنی غلامی کا بھی شکار ہیں

اور ہم اپنی ہر ضرورت کی تکمیل کے لئے مغرب کی طرف دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔

ہمیں جہاں یورپ کا اسلحہ، ان کی ٹیکنالوجی اور ان کی مادی ترقی متاثر کرتی ہے، وہاں ہم نظریات کی دنیا میں بھی انہی کی طرف دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اس لئے وہ تحقیق کے لبادے میں لپیٹ کر ہمیں جو کچھ بھی دے دیں ہم اس کو شکریے کے ساتھ قبول کرنے کے لئے ذہنی طور پر تیار بیٹھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مستشرقین نے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے متعلق جو غلط فہمیاں پھیلانے کی کوشش کی، اب انہی غلط فہمیوں کو پوری ملت میں رائج کرنے کا بیڑہ ملت کے کچھ خیر خواہوں نے اٹھا رکھا ہے۔

آج مسلمانوں کی صفوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنی ملت کو یہ باور کرانے کی کوششوں میں مصروف ہیں کہ اسلام چودہ سو سال پہلے تو قابل عمل تھا لیکن وہ دور جدید کی متمدن دنیا کے تقاضے پورے کرنے سے قاصر ہے، جو ہمیں بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ملت مسلمہ کے موجودہ تنزل کا واحد سبب اسلام ہے اور جن کو اسلام کا قانون سزا ظالمانہ نظر آتا ہے۔

یہ نظریات دراصل اس واویلے کی صدائے بازگشت ہیں جو صدیوں یورپ کی یونیورسٹیوں، ایشیائی سوسائٹیوں، مبشرین اور مستشرقین کی کانفرنسوں اور یہود و نصاریٰ کے مشنری اداروں میں بلند ہو تا رہا۔

موجودہ کیفیت یہ ہے کہ اہل مغرب اسلام اور مسلمانوں کو اپنا سب سے بڑا دشمن اور اپنے وجود کے لئے سب سے بڑا خطرہ سمجھتے ہیں اور مسلمان اہل مغرب کو اپنا بہترین دوست اور بہی خواہ تصور کرتے ہیں اور ملت کے زعماء اہل مغرب سے دوستی استوار کرنے کے فن کو ہی سب سے بڑا کمال سمجھتے ہیں۔ مغرب کی طرف سے مبادیات دین کی پابندی کو بنیاد پرستی کا نام دیا جاتا ہے تو ہم بنیاد پرستی کے الزام سے بچنے کے لئے اپنے دینی اور سماجی تشخص کا حلیہ بگاڑنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔

یہ صورت حال ملت کو ایک خوفناک انجام کی طرف دھکیل رہی ہے اور جتنی جلدی ملت اس غلط رویے کو ترک کر دے اتنا ہی بہتر ہوگا۔

کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہمارا خلوص اور دوستی یہود و نصاریٰ کو بھی خلوص کا جواب خلوص سے دینے پر مجبور کر دے گی لیکن غالباً ان کی نظر قرآن حکیم کے اس واضح ارشاد پر

نہیں جس میں رب کائنات نے اپنے حبیب ﷺ کی امت کو متنبہ کیا ہے کہ لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ کہ یہود ونصاریٰ کی تم سے دوستی کی پہلی اور آخری شرط یہ ہے کہ تم دین مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کا طوق اپنے گلے سے اتار کر ان کے دین کا طوق اپنے گلے میں ڈال لو۔

اسلام کی تاریخ شاہد ہے کہ اسلام نے اہل کتاب کو دوسرے تمام غیر مسلموں پر فوقیت دی ہے اور ہر شعبے میں ان کے ساتھ دوسرے کفار کی نسبت زیادہ دوستانہ اور ہمدردانہ رویہ اپنایا ہے لیکن اس کے باوجود اسلام دشمنی میں ان کا کوئی ثانی نہیں رہا۔

یہود ونصاریٰ کی اسلام دشمنی کے اسباب صرف دینی نوعیت کے نہیں ہیں بلکہ اس دشمنی کے پیچھے معاشی اور سیاسی محرکات بھی کارفرما ہیں جو زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتے بھی رہے ہیں اور اس دشمنی کا اظہار بھی مختلف رنگوں میں ہوتا رہا ہے۔ یہ دشمنی جب کبھی دوستی کا روپ دھارتی ہے تو انتہائی خطرناک بن جاتی ہے۔ ہمارے دور میں یہود ونصاریٰ ہمارے ساتھ دوستی کے لبادے میں دشمنی کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

اس کتاب میں ہم انشاء اللہ، یہود ونصاریٰ کی اسلام دشمنی کے اسباب کا کھوج لگانے کی کوشش کریں گے۔ اس مقصد کے لئے ہم سب سے پہلے طلوع اسلام کے وقت یہود ونصاریٰ کی دینی، سیاسی، اقتصادی اور سماجی حیثیت پر گفتگو کریں گے۔ اس کے بعد دیکھیں گے کہ اسلام کا پیغام ان کی مختلف حیثیتوں پر کس طرح اثر انداز ہوا اور اسلام کے اس اثر پر یہود ونصاریٰ کی طرف سے کس قسم کے ردعمل کا اظہار ہوا اور مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ ان لوگوں نے مسلمانوں کے ساتھ کون سا رویہ روا رکھا۔ قرون وسطیٰ میں اہل مغرب نے مسلمانوں کی زبان، تہذیب اور علوم دینیہ کی طرف توجہ مبذول کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی اور پھر علوم دینیہ کی تحصیل کی کوششوں نے کس طرح تحریک استشراق کی شکل اختیار کی اور کس طرح مستشرقین نے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی صورت کو مسخ کرکے پیش کیا اور کس طرح مسلمانوں کو اپنے دین سے دور کرنے، ان کو اخلاقی پستیوں کی طرف دھکیلنے، ان کی صفوں میں انتشار پیدا کرکے ان کے ممالک پر سیاسی غلبہ پانے اور اس غلبے کو طول دینے کی کوشش کی۔ اور آج وہ کس انداز میں ملت اسلامیہ کو کمزور کرنے اور اس کے علاقوں میں پائے جانے والے زر سیال کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

آخر میں ہم ان اعتراضات بلکہ الزامات کا حسب استطاعت جواب دینے کی علمی کوشش کریں گے جن سے مستشرقین نے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے پاکیزہ دامن کو ملوث کرنے کی کوشش کی ہے۔

ہمارا بھروسہ صرف رب قدیر و حکیم کی ذات پر ہے اور اسی سے ہم اس مشکل کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی توفیق مانگتے ہیں۔

طلوعِ اسلام
کے وقت
یہود و نصاریٰ کی
سیاسی اور سماجی حیثیت

طلوع اسلام کے وقت یہود و نصاریٰ کی سیاسی اور سماجی حیثیت

یہودیوں کی سماجی حیثیت

یہودیوں کی قومی تاریخ میں کئی نشیب و فراز آئے ہیں۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے نعمت نبوت سے بھی نوازا اور انہیں دوسری اقوام پر سیاسی غلبہ بھی عطا فرمایا لیکن اس قوم نے اپنی بداعمالیوں سے بارہا غضب خداوندی کو دعوت دی اور نہ صرف وہ سیاسی غلبے سے محروم ہوئے بلکہ دوسری اقوام نے ان کے ممالک کو تاخت و تاراج کیا، ان کے مذہبی مقامات کے تقدس کو پامال کیا، ان کی مذہبی کتابیں نذر آتش کیں، ان کے بے شمار مردوں کو قتل کیا اور جو قتل و غارت سے بچ گئے انہیں اور ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنا کر اپنے ممالک میں لے گئے اور ان کی کئی کئی نسلیں غلامی کی ذلت میں ایام زیست گزارتی رہیں۔

اسی قسم کے عبرتناک واقعات نے ان کو اپنے آبائی وطن سے دور کسی علاقے میں پناہ تلاش کرنے پر مجبور کیا۔ اس طرح یہودی قوم فلسطین سے نکل کر دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیل گئی۔ ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں یہودی جزیرہ عرب کے مختلف گوشوں میں آباد تھے۔ (1) یثرب، خیبر، وادی القریٰ، فدک اور تیما میں یہودیوں کے مضبوط قبائل آباد تھے۔ ان آبادیوں کے علاوہ یہودی تاجروں، غلاموں اور اہل حرفہ کی شکل میں دوسری آبادیوں میں بھی پھیلے ہوئے تھے۔ یہ وہ دور تھا جس میں یہودیوں کی نہ کوئی مستقل حکومت تھی اور نہ ہی کسی علاقے میں انہیں سیاسی غلبہ حاصل تھا۔ لیکن معاشی اور سماجی سطح پر اس قوم کے لوگ کافی مضبوط تھے۔ عرب قوم بت پرست تھی۔ وہ علم و تہذیب کے میدان میں پسماندہ تھی۔ یہ قوم کئی صدیاں وحی ربانی کی روشنی سے محروم رہی تھی اس لئے حیات اور کائنات کے متعلق ان کی معلومات اوہام باطلہ سے زیادہ کچھ نہ تھیں۔ انبیائے کرام نے

1۔ جواد علی، "المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام" (دار العلم للملایین بیروت 1970)، ج 6، صفحہ 527

نسل آدم کو علم وہدایت کی جس روشنی سے روشناس کیا تھا عرب اس سے محروم تھے جب کہ بنو اسرائیل میں اللہ تعالیٰ نے ہزاروں نبی مبعوث فرمائے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسی عظیم ہستیاں اس قوم کے بخت خفتہ کو بیدار کرنے کے لئے مبعوث ہوتی رہی تھیں، اس لئے بے شمار لفظی اور معنوی تحریفات کے باوجود وحی الٰہی کی شکل میں ان کے پاس بے پناہ علمی سرمایہ موجود تھا۔ مشرکین عرب ان سے دینی اور مذہبی اختلاف رکھنے کے باوجود، انہیں علم کے میدان میں اپنے آپ سے بہتر سمجھتے تھے۔ اس لئے تہذیبی طور پر ان کو عربوں میں ایک خاص مقام حاصل تھا۔ ان کے سماجی رعب کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ عرب کی جن عورتوں کے بچے زندہ نہ رہتے، وہ یہ نذر مانتی تھیں کہ اگر بچہ زندہ رہا تو وہ اس کو یہودی بنائیں گی۔ (1)

مورخین لکھتے ہیں کہ بعض عرب اپنے بچوں کو رضاعت کے لئے یہودیوں کے حوالے کرتے تھے اور وہ بچے یہودیوں کے ساتھ رہ کر یہودی ہو جاتے تھے لیکن ان کے والدین کو اس تبدیلی مذہب پر کوئی اعتراض نہ ہوتا بلکہ بعض عرب تو یہودیت کو بہترین مذہب سمجھتے ہوئے اپنی اولاد کو اراداً یہودی بناتے تھے اور اس طرح بے شمار عرب خاندانوں اور قبیلوں نے یہودی مذہب اختیار کر لیا تھا۔

ہجرت کے بعد جب اوس وخزرج نے اسلام قبول کرنا شروع کیا تو انہوں نے اپنے ان بچوں کو بھی اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنا چاہا جو یہودیوں کے زیر سایہ رہ کر یہودی ہو چکے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس بات سے منع فرما دیا۔ (2) بعض مفسرین کا خیال ہے کہ قرآن حکیم کی یہ آیت کریمہ اسی موقعہ پر نازل ہوئی۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (3)

یمن میں بھی یہودیت کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی تھی اور تبع (تبان اسعد ابو کرب) کے یہودیت قبول کرنے کی وجہ سے کافی عرصہ یہودیت یمن کا سرکاری مذہب بھی رہا تھا۔ (4)

1۔ تاریخ العرب قبل الاسلام، جلد 6، صفحہ 515
2۔ ایضاً، صفحہ 514
3۔ سورۃ البقرۃ 256
4۔ تاریخ العرب قبل الاسلام، جلد 6، صفحہ 537

جواد علی نے تاریخ العرب قبل الاسلام میں طبقات ابن سعد کے حوالے سے لکھا ہے کہ مقنا کے مقام پر یہود کا ایک قبیلہ بنو جنبہ موجود تھا۔ حضور ﷺ نے قبیلہ بنو جنبہ اور اہل مقنا کو اسلام قبول کرنے یا جزیہ ادا کرنے کیلئے لکھا تھا۔ اسی طرح حضور ﷺ نے یہود کے قبائل بنو غادیا اور بنو عریض کے نام بھی نامہ مبارک ارسال کیا تھا اور انہیں اسلام کی دعوت دی تھی اور بصورت انکار جزیہ ادا کرنے کا حکم دیا تھا۔(1)

یہ تفصیلات اس لئے بیان کی گئی ہیں تاکہ قارئین کرام کو اس حقیقت کا علم ہو سکے کہ جزیرہ عرب میں یہودیوں کے صرف چند قبیلے ہی آباد نہ تھے بلکہ ان کے برتر تہذیب و تمدن اور ان کے بلند علمی مقام سے متاثر ہو کر بے شمار عربوں نے انفرادی، خاندانی یا قبائلی سطح پر یہودیت قبول کر لی تھی جس سے یہودیوں کی ساجی پوزیشن کافی مضبوط ہو گئی تھی۔

اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ علم و تہذیب کے اس بلند مقام سے تمام یہودی بہرہ ور نہ تھے بلکہ یہ طبقہ علماء کا خاصہ تھا۔ ان کے قومی امور میں ان کے مذہبی راہنماؤں کو فیصلہ کن حیثیت حاصل تھی۔ یہ افراد قوم کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کرتے تھے۔ مذہبی معاملات میں وہ جو کچھ کہہ دیتے، اسے حرف آخر کی حیثیت حاصل ہوتی۔ دینی امور بھی انہی کے ہاتھوں میں تھے۔ شعائر دین کا قیام بھی انہی کے ذمہ تھا اور دین کی تدریس کا فریضہ بھی انہی سے متعلق تھا۔ اپنے ان اختیارات کی بدولت یہودی احبار مال بھی اکٹھا کرتے تھے اور دولت کی اس دیوی نے ان میں باہمی رقابت اور حسد وعناد کے بیج بھی بو دیئے تھے۔ اس حسد وعناد کے نتیجے میں ان کے درمیان لڑائیاں بھی چھڑ جاتی تھیں اور وہ ان لڑائیوں میں دل کھول کر ایک دوسرے کو جانی اور مالی نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔ بات ان کی باہمی لڑائیوں تک محدود نہ رہتی تھی بلکہ وہ ایک دوسرے کے خلاف مشرک قبائل سے حلیفانہ معاہدے بھی کرتے تھے۔ یثرب کے بعض یہودی قبائل کے قبیلہ بنو اوس اور بعض کے قبیلہ بنو خزرج سے حلیفانہ معاہدے کرنے کا سبب یہی تھا۔ مندرجہ ذیل آیت کریمہ میں قرآن حکیم نے ان کی اسی خویش آزاری پر ان کو ملامت کی ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ۝ ثُمَّ اَنْتُمْ

1۔ تاریخ العرب قبل الاسلام، صفحہ 518، بحوالہ طبقات ابن سعد

هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ؗ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ؕ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْىٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ٥(1)

"اور یاد کرو جب لیا ہم نے تم سے پختہ وعدہ کہ تم اپنوں کا خون نہیں بہاؤ گے اور نہیں نکالو گے اپنوں کو اپنے وطن سے پھر تم نے (اس وعدہ پر ثابت رہنے کا) اقرار بھی کیا اور تم خود اس کے گواہ ہو۔ پھر تم وہی ہو نا (جنہوں نے وعدے کئے) کہ اب قتل کر رہے ہو اپنوں کو اور نکال باہر کرتے ہو اپنے گروہ کو ان کے وطن سے (نیز) مدد دیتے ہو ان کے خلاف (دشمنوں کو) گناہ اور ظلم سے اور اگر آئیں تمہارے پاس قیدی بن کر (تو بڑے پاکباز بن کر) ان کا فدیہ ادا کرتے ہو حالانکہ حرام کر دیا گیا تھا تم پر ان کا گھروں سے نکالنا تو کیا تم ایمان لاتے ہو کتاب کے کچھ حصہ پر اور انکار کرتے ہو کچھ حصہ کا (تم خود ہی کہو) کیا سزا ہے ایسے نابکار کی تم میں سے سوائے اس کے کہ رسوا رہے دنیا کی زندگی میں اور قیامت کے دن تو انہیں پھینک دیا جائے گا سخت ترین عذاب میں۔ اور اللہ بے خبر نہیں ان (کرتوتوں) سے جو تم کرتے ہو۔"

مختصر یہ کہ مستقل وطن اور مستقل حکومت کے بغیر بھی یہودیوں کو جزیرہ عرب اور گردونواح کے مختلف علاقوں میں بڑی باوقار سماجی حیثیت حاصل تھی اور خصوصاً طبقہ علماء ایسی بلند سماجی حیثیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا جس کا تصور بھی دور جدید کے حکمران نہیں کر سکتے۔ ان کی زبان سے جو بات نکل جاتی تھی وہی مذہب بھی تھا اور وہی قانون بھی۔ نہ ان سے کسی کو اختلاف رائے کی اجازت تھی اور نہ ہی وہ اپنے کسی فعل کے لئے کسی کے سامنے جوابدہ تھے۔ اپنے ہم مذہب بھی ان کا احترام کرتے تھے اور مشرکین بھی حیات و کائنات

1۔ سورۃ البقرہ 85-84

کے دقیق مسائل کا حل تلاش کرنے کیلئے انہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اس سماجی حیثیت نے ان کے لئے مال و دولت کے انبار لگا دیئے تھے۔

جس انسان کو بغیر کسی استحقاق کے اتنی بلند حیثیت حاصل ہو وہ کسی ایسی آواز، کسی ایسی دعوت یا کسی ایسی تحریک کو کیسے برداشت کر سکتا ہے جس کے نتیجے میں اسے اپنی حیثیت سے محروم ہونا پڑے۔

یہودیوں کی اقتصادی حیثیت

جزیرہ عرب میں طلوع اسلام کے وقت یہودیوں کی اقتصادی حالت مشرکین عرب کے مقابلے میں کافی مضبوط تھی۔ وہ تجارت، سودی کاروبار، زراعت، شراب کی خرید و فروخت اور مختلف دستکاریوں میں مہارت رکھنے کی وجہ سے مالی طور پر بہت مضبوط تھے۔ لوگ ان سے قرضہ لے کر ان کے پاس اپنی چیزیں رہن بھی رکھتے تھے۔ رنگریزی، حیوانات کی تربیت، مرغ بانی اور ماہی گیری میں ان کو کمال حاصل تھا اور ان پیشوں کے ذریعے وہ معقول آمدنی حاصل کر لیتے تھے۔(1)

مشرکین عرب مالی میدان میں یہودیوں کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ اس کی متعدد وجوہات تھیں۔ مال و دولت کمانے کے جو گر یہودیوں کے پاس تھے، وہ ان کے پاس نہ تھے۔ اہل یثرب خصوصاً تجارت کے فن سے نا آشنا تھے۔ ان کا بھروسہ کھیتی باڑی پر تھا اور زراعت کے میدان میں بھی وہ یہودیوں سے پیچھے تھے کیونکہ یہودی بڑے بڑے زرعی قطعات اور باغات کے مالک تھے جن سے ان کو معقول آمدنی حاصل ہوتی تھی۔

عام یہودیوں کی مالی حالت بھی مضبوط تھی اور طبقہ علماء بالخصوص مالی طور پر بہت مضبوط تھا۔ وہ جائز اور ناجائز ذرائع سے مال اکٹھا کرتے تھے۔ قرآن حکیم نے ان کے کرتوتوں کا پردہ چاک کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (2)

"اے ایمان والو! بیشک اکثر پادری اور راہب کھاتے ہیں لوگوں کے مال

1۔ تاریخ العرب قبل الاسلام، جلد 6، صفحہ 535

2۔ سورۃ التوبہ: 34

ناجائز طریقہ سے اور روکتے ہیں (لوگوں کو) راہ خدا سے۔"

علمائے تفسیر لکھتے ہیں کہ احبار یہود تنازعات کے فیصلے عدل وانصاف کی بنیاد پر نہیں کرتے تھے بلکہ رشوت لے کر باطل فیصلے کرتے تھے۔ وہ شرفا پر قانون شریعت کے اطلاق میں تساہل سے کام لیتے تھے اور ان کی حیثیت کی وجہ سے ان کے ساتھ نرم رویہ اختیار کرتے تھے۔ جب کہ کم حیثیت کے لوگوں پر شرعی قوانین کے اطلاق میں سختی کا رویہ اپناتے تھے۔(1) اور ظاہر ہے کہ اس غیر عادلانہ طرز عمل سے ان کا مقصود مادی فوائد حاصل کرنا ہوتا تھا۔

یہودی اپنے اس سماجی اور اقتصادی مقام کو قائم رکھنے اور اس کی جڑیں مضبوط کرنے کے لئے قبائل کے سرداروں سے قریبی تعلقات استوار رکھتے تھے۔ اگر ان کی کوششوں سے متاثر ہو کر کچھ قبائل کے سردار حلقہ یہودیت میں داخل ہو جاتے تو ٹھیک ورنہ وہ اسی بات پر قناعت کر لیتے کہ وہ سردار قرضوں کی واپسی اور سودی منافع کے حصول میں ان کی حمایت کرتے رہیں اور تجارت میں ان کو آزادی کی ضمانت دے دیں۔

یہودی اپنی اس حیثیت کی حفاظت کیلئے صرف سرداروں کی حمایت ہی حاصل نہ کرتے تھے بلکہ ضرورت پڑنے پر مختلف سرداروں کی باہمی رقابتوں کو ہوا دے کر قبائل کے درمیان جنگ وجدل کی آگ بھی بھڑکا دیتے تھے تاکہ ان کے ممکنہ دشمنوں کو ان کی طرف متوجہ ہونے کا موقع ہی نہ ملے اور ان کا ایک دشمن دوسرے دشمن سے ٹکرائے اور دونوں دشمنوں کا خاتمہ ہو جائے۔

یثرب کے قبائل اوس اور خزرج کی طویل باہمی آویزش کے پیچھے یہودیوں کی سیاست اور سازش ہی کارفرما ہوتی تھی۔ ان لڑائیوں میں ان کا تیار کردہ اسلحہ بھی بکتا تھا، ان سے سودی قرض بھی لئے جاتے تھے اور ان کے پاس چیزیں رہن بھی رکھی جاتی تھیں۔ اس طرح یہ جنگیں جہاں اوس وخزرج کے قبائل کے لئے مالی اور جانی تباہیوں کا باعث ہوتیں، وہاں یہودیوں کیلئے کئی اعتبار سے سودمند ثابت ہوتیں۔

اوس وخزرج کے قبائل جن کی عددی قوت اور حربی صلاحیت کسی بھی وقت ان کے قومی وجود کے لئے خطرہ بننے کی اہل تھی، وہ اپنی موت آپ مر جاتے۔ یہودیوں کی تجارتی

1۔ تاریخ العرب قبل الاسلام، جلد6، صفحہ 534

منڈی میں گہما گہمی آجاتی، دولت کی دیوی ان سے خوش ہوتی اور وہ اپنی خوش قسمتی پر پھولے نہ سماتے۔

اس مضبوط سماجی اور اقتصادی حیثیت نے یہودی قوم کے اس موروثی عقیدے کو بھی سہارا فراہم کر رکھا تھا کہ وہ خدا کی لاڈلی قوم ہیں۔ خدا صرف ان کا ہے اور صرف وہی خدا کی طرف سے عطا ہونے والی مادی اور روحانی نعمتوں کے مستحق ہیں۔ دنیا بھی انہی کی ہے اور عقبیٰ بھی انہی کی۔ وہ دنیا میں عیش کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور آخرت میں جنت بھی صرف انہی کا انتظار کر رہی ہے۔

اسلام کا یہودیوں کی سماجی اور اقتصادی حیثیت پر اثر

اسلام دین رحمت ہے۔ اس کا وجود کائنات کی ہر مخلوق کے لئے رحمت تھا۔ اس کے دامن میں اقوام و ملل کے لئے تباہی و بربادی کی بجلیاں نہ تھیں بلکہ اس کے پیغام میں محبت کی نوید تھی۔ رافت و رحمت کے گلہائے رنگارنگ تھے۔ یہ انسانیت کو شرک کی ظلمتوں، ظلم کی آندھیوں اور جہالت کی شب تار سے نجات دلانے کے لئے آیا تھا۔ اسلام کا خدا رحمٰن بھی تھا اور رحیم بھی۔ یہ کسی کا بھی دشمن نہ تھا۔ یہ ہر ایک کا دوست تھا لیکن جو لوگ اپنی جانوں کے دشمن بنے ہوئے تھے، وہ اس حیات بخش پیغام کے سائے میں پناہ لینے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ انہوں نے ظلمت کو نور پر، گمراہی کو ہدایت پر، ظلم کو عدل پر اور کفر کو اسلام پر ترجیح دی۔

یہودیوں کے لئے بھی اسلام اپنے دامن میں محبت و رافت کے پھول سمیٹے تشریف لایا تھا۔ اس کی نظر میں یہودیوں کا دین تحریفات کے باوجود مشرکین کی اوہام پرستی اور بت پرستی کے مقابلے میں کہیں بہتر تھا۔ اسلام نے یہودیوں کی مذہبی کتابوں کے منزل من اللہ ہونے کا اقرار کیا تھا۔ اس نے یہودیوں کی مقدس ہستیوں کے تقدس کی گواہی دی تھی۔ بنو اسرائیل میں جو عظیم الشان انبیاء و رسل مبعوث ہوئے تھے، اسلام ان کی عصمت کا نگہبان بن کر جلوہ گر ہوا تھا۔ ان مقدس ہستیوں پر جو کتابیں اتری تھیں اسلام نے ان پر ایمان لانے کو اپنے پیروکاروں کے لئے ضروری قرار دیا تھا لیکن اسلام کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ یہودیوں کی ہر فکری اور عملی بے راہروی کو صحیح تسلیم کر کے اس کے جواز کا فتویٰ صادر کرتا۔ اسلام ظلم کی رات کو ختم کر کے عدل کی شمع فروزاں کرنے کے لئے آیا تھا۔ وہ اونچ

نیچ کو ختم کر کے انسانی مساوات کو قائم کرنے کے لئے تشریف لایا تھا۔ اس لئے اسلام نے جہاں صحف بنواسرائیل کے سماوی الاصل ہونے کا اقرار کیا وہاں اس بات کا بھی اعلان کر دیا کہ یہود و نصاریٰ نے ان صحف سماوی میں بے پناہ لفظی اور معنوی تحریفات کر رکھی ہیں۔ اس نے اعلان کیا کہ خدا صرف یہودیوں یا نصرانیوں کا نہیں بلکہ وہ ساری مخلوق کا خدا ہے۔ اسلام نے سود کو حرام قرار دیا۔ شراب کی ممانعت کا حکم صادر کیا۔ ناجائز ذرائع سے جلب زر کی تمام صورتوں کو ختم کیا۔ جو لوگ غلط نظریات کے بل بوتے پر خدائی اختیارات کے مالک بنے بیٹھے تھے، ان کو ان کے اختیارات سے محروم کیا۔ یہودی عوام کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ تمہارے مذہبی راہنما تمہاری ملت کے کاروان کو ہدایت کے جادۂ مستقیم پر لے کر نہیں چل رہے بلکہ وہ تمہیں اس راستے پر لے کر چل رہے ہیں جس کا انجام تباہی کے سوا کچھ نہیں۔ اسلام نے یہودیوں کو دعوت دی کہ وہ اس گمراہی کو چھوڑ کر حق کی روشنی کو اپنا راہنما بنائیں اور اس دین کے دامن میں پناہ لیں جو ان کی کتابوں کی بھی تصدیق کرتا ہے اور ان کے انبیاء و رسل کی بھی۔ جو دنیوی خوش حالی کی بھی ضمانت دیتا ہے اور اخروی سعادت کی بھی۔ یہ پیغام محبت یہودیوں کو اپنے باطل مزعومات کا دشمن نظر آیا۔ سود کی حرمت اور شراب کی ممانعت کی شکل میں اسلام انہیں اپنے معاشی مفادات کا قاتل نظر آیا۔ اسلام کی عادلانہ تعلیمات علمائے یہود کو اپنے جھوٹے اقتدار کیلئے خطرہ نظر آئیں۔ یہودی نبوت کو صرف بنواسرائیل کی میراث سمجھتے تھے اور حضور ﷺ جو بنواسماعیل میں سے تھے، ان کی نبوت کو تسلیم کرنا، ان کے قدیم مزعومات کو باطل قرار دینے کے مترادف تھا۔

بات یہاں پر ختم نہیں ہوئی بلکہ مشرکین عرب جو یہودیوں کی تجارت اور سودی کاروبار کے لئے منڈی کی حیثیت رکھتے تھے، انہوں نے دھڑا دھڑ اسلام قبول کرنا شروع کر دیا۔ وہ لوگ طویل مدت یہودیوں کے ساتھ رہے تھے۔ وہ یہودیوں کے علمی اور تہذیبی مقام سے متاثر بھی تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے یہودیت کو بطور دین قبول نہ کیا تھا۔ جب کہ آفتاب اسلام کے طلوع ہوتے ہی، اس کی روشنی سے ان کی آنکھیں خیرہ ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ اور انہوں نے اس حیات بخش پیغام کے داعیوں کے لئے اپنے دیدہ و دل فرش راہ کر دیئے تھے۔ اب ان کی نظر میں پسندیدہ ترین دین یہودیت نہیں بلکہ اسلام تھا۔ اب ان پر یہودیوں کا علمی رعب ختم ہو چلا تھا۔ اب نہ یہودیت کی اشاعت کے لئے مواقع باقی

رہے تھے اور نہ ہی یہودیت پر قائم رہتے ہوئے یہودیوں کا کوئی مستقبل نظر آتا تھا۔

اگر یہودی سود کی معاشرتی اور معاشی تباہ کاریوں کا صحیح اندازہ لگا سکتے تو سود کی ممانعت کے اسلامی حکم کو اپنے مفادات کے خلاف تصور نہ کرتے۔ اگر وہ شراب کے انسانی زندگی پر منفی اثرات کا ادراک کر سکتے، تو شراب کی حرمت کا قانون متعارف کرانے پر اسلام کو مطعون نہ کرتے۔ اگر معاشی اور معاشرتی ناہمواریوں کے قوموں کی زندگی پر مترتب ہونے والے تباہ کن اثرات کو وہ سمجھ سکتے تو اسلام کی مساوات انسانی کی حیات بخش تعلیم کو اپنے لئے مضرنہ سمجھتے۔ لیکن بد قسمتی سے انہوں نے اسلام کی ان خوبیوں کو خامیاں سمجھا اور اسلام کا ہر سطح پر مقابلہ کرنے کا تہیہ کر لیا۔

یہودیوں کا ردعمل

حضور ﷺ کے اعلان نبوت سے پہلے یہودی تورات کی پیشگوئیوں کے مطابق ایک عظیم الشان نبی کے منتظر تھے۔ مشرکین سے لڑائیوں اور منازعات کے وقت وہ ان سے کہا کرتے تھے کہ ایک عظیم الشان نبی کی آمد کا وقت قریب ہے۔ جب وہ تشریف لائیں گے تو ہم ان کی قیادت میں تمہیں شکست فاش دیں گے۔ قرآن حکیم نے تو یہاں تک بتادیا ہے کہ وہ حضور ﷺ کو یوں پہچانتے تھے جیسے وہ اپنے بچوں کو پہچانتے تھے لیکن شاید ان کا خیال یہ تھا کہ آنے والا نبی بھی ان کے تمام باطل نظریات اور فاسد اعمال کو برقرار رکھے گا جو ان کی انفرادی اور قومی زندگی کی پہچان بن چکے تھے۔

مسلمان جب تک مکہ میں رہے، یہودیوں نے اسلام کو اپنے لئے کوئی بڑا خطرہ نہ سمجھا۔ کیونکہ مکہ میں یہودیوں کا کوئی طاقتور قبیلہ آباد نہ تھا، جس کے مفادات اسلام کی اشاعت سے متاثر ہوتے۔ وہاں اگر کچھ یہودی افراد یا خاندان موجود تھے تو بھی ان کو اسلام سے کسی قسم کا خطرہ محسوس کرنے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ کفار مکہ نے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ وہاں تو بظاہر مسلمانوں کا اپنا وجود خطرے میں نظر آتا تھا کسی کو ان سے ڈرنے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن جب مسلمان ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو صورت حال تبدیل ہوگئی۔ حضور ﷺ نے ایسے حالات پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی، جن میں مدینہ کے اندر مسلمان دوسری قوموں اور مذاہب کے لوگوں کیساتھ پرامن زندگی بسر کریں۔ اسی مقصد کے لئے مدینہ کے مختلف عناصر کے مابین میثاق مدینہ کے نام سے ایک معاہدے

پر دستخط بھی ہوئے تھے لیکن جوں جوں اسلام پھیلتا گیا اور قرآن حکیم کی ایسی آیات نازل ہوتی گئیں جو یہودیوں کے مزعومات کی تردید کے ساتھ ساتھ ان کی بداعمالیوں کا پردہ بھی چاک کرتی تھیں اور ان کے معاشی اور معاشرتی نظام پر ضرب بھی لگاتی تھیں، تو انہوں نے اپنے دین، اپنے سماج اور اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے اسلام کی مخالفت کرنا ناگزیر سمجھا۔ یہ مخالفت ابتدا میں دلیل کی سطح پر تھی۔ مسلمان جب انہیں اسلام کے دامن میں پناہ لینے کی دعوت دیتے اور انہیں باور کرانے کی کوشش کرتے کہ اسلام کی تعلیمات یہودیت کی تعلیمات سے بہتر ہیں تو وہ اسلام کے مقابلے میں یہودیت کو بچ ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے۔ وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور طرح طرح کی کٹ حجتیاں کرتے۔ وہ آپ پر مختلف سوالات کر کے آپ کو آزمانے کی کوشش کرتے۔ کبھی وہ آپ سے کسی معجزہ کا مطالبہ کرتے۔ قرآن حکیم میں ان کے اس طرز عمل کا ذکر ملتا ہے۔ قرآن انہیں بتاتا ہے کہ تمہارا یہ رویہ نیا نہیں۔ تمہارے آباء واجداد کا رویہ بھی انبیائے کرام کے ساتھ ایسا ہی تھا۔

جوں جوں مدینہ میں مسلمانوں کی پوزیشن مضبوط ہوتی گئی، یہودیوں کی اسلام دشمنی میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان کی اسلام دشمنی نے کئی شکلیں اختیار کیں۔ انہوں نے مسلمانوں کی ملی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لئے اوس وخزرج کے قبائل کے دلوں میں اس قبائلی عصبیت کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی، جس کی بیخ کنی کر کے اسلام نے ان کو رشتہ اخوت میں پرو دیا تھا۔ انہوں نے مدینہ کے اندر اور باہر ان افراد اور قبائل سے روابط قائم کئے جن کے مفادات کو اسلام کی ترقی سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ مدینہ میں منافقین کی جو جماعت مسلمانوں کے لئے مار آستین کی حیثیت رکھتی تھی، اس کی پشت پناہی بھی یہودی کرتے تھے۔ عبداللہ بن ابی کی موت کے وقت اس کے جنازے کے گرد وہ یہودی جمع تھے جو بنو نضیر کی جلاوطنی اور اور بنو قریظہ کے عبرتناک انجام کے بعد مدینہ طیبہ میں باقی بچ گئے تھے۔ یہ لوگ عبداللہ بن ابی کے جنازے کے ساتھ اس کی قبر تک گئے تھے اور اس کی موت کے غم میں انہوں نے اپنے سروں پر مٹی ڈالی تھی۔ (1)

جب یہودیوں نے دیکھا کہ اسلام کے خلاف ان کی یہ کوششیں بار آور نہیں ہو رہیں تو

1۔ تاریخ العرب قبل الاسلام، جلد 6، صفحہ 548

انہوں نے کفار مکہ کے ساتھ روابط بڑھانے اور انہیں مدینہ پر حملہ کرنے اور مسلمانوں کو تباہ وبرباد کرنے کی ترغیب دی۔ انہوں نے تمام اسلام دشمن عناصر کو ترغیب دی کہ وہ متفق اور متحد ہو کر اسلام کا خاتمہ کریں ورنہ اگر اسلام کی جڑیں جزیرہ عرب میں مضبوط ہو گئیں تو پھر ان کا مقابلہ مشکل ہو جائے گا۔ یہودیوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیے ہوئے معاہدوں کی خلاف ورزی کی۔ حضور ﷺ کی شمع حیات کو گل کرنے کی سازشیں کیں۔ کفار مکہ کو مسلمانوں کے خلاف جنگوں پر اکسایا۔ ان جنگوں کے دوران مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کی اور انجام کار ان کو ان شرارتوں پر ذلت آمیز انجام سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ یہودیوں کی ان کارروائیوں کی تفصیل ضیاء النبی کی ابتدائی جلدوں میں گزر چکی ہے یہاں ان باتوں کی طرف اشارہ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قارئین کرام یہودیوں کی اسلام دشمنی کے تاریخی پس منظر سے آگاہ ہو سکیں۔

اسلام کے متعلق یہودیوں کا یہ رویہ ہجرت مدینہ کے بعد شروع ہوا اور آج تک جاری ہے۔ اسلام کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ جب مسلمانوں نے عیسائیوں سے بیت المقدس چھین لیا تو یہودیوں کی اسلام دشمنی کے اسباب میں ایک اور سبب کا اضافہ ہو گیا۔ اب یہودیوں کے خیال میں مسلمانوں نے اس سرزمین پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا تھا جو خدائی وعدے کے مطابق یہودیوں کی میراث ہے۔ وہ صدیوں مسلمانوں سے اس مقدس سرزمین کو واپس لینے کی سازشوں میں مصروف رہے اور آخر کار اپنی ان کوششوں میں کامیاب ہو گئے۔ مسلمانوں سے ان کا قبلہ اول چھین لینے پر یہودی مطمئن ہو کر بیٹھ نہیں گئے بلکہ ابھی ان کے اور بھی کئی خطرناک عزائم ہیں جو اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔

عیسائیوں کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی حیثیت

طلوع اسلام کے وقت عیسائیوں کے حالات یہودیوں سے مختلف تھے۔ یہودی اگرچہ خوش حال اور باوقار زندگی بسر کر رہے تھے لیکن ان کی بنیادیں مضبوط نہ تھیں۔ جو قبائل ان کے زیر اثر تھے، یہودیوں کی تعداد بھی ان کے مقابلے میں بہت کم تھی اور وہ عسکری میدان میں بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر ان قبائل کے سرداروں کو مختلف حیلوں سے یہودی اپنی مٹھی میں رکھنے کی کوشش کرنے پر مجبور تھے، جب کہ عیسائی سیاسی طور پر اس وقت دنیا کی مضبوط ترین قوم تھے۔ اس وقت دنیا

میں دو عظیم سلطنتیں تھیں۔ ایک سلطنت ایران اور دوسری سلطنت روم۔ سلطنت روما کا سرکاری مذہب مدت سے عیسائیت چلا آ رہا تھا۔ قیصر قسطنطین نے 313ء میں مذہب عیسائیت قبول کر کے اس کو سرکاری مذہب قرار دیا تھا۔(1) اور اس کے ساتھ ہی اس مذہب کو پھیلانے اور اس کی تشہیر کا بیڑا روم کے حکمرانوں نے اٹھا لیا تھا۔ عیسائیت کی تشہیر میں رومی حکومت کے سیاسی مفادات بھی مضمر تھے اس لئے انہوں نے اس مذہب کی تشہیر کے لئے پانی کی طرح روپیہ بہایا۔ رومی حکمرانوں نے عیسائی پادریوں اور راہبوں کی، سلطنت کے مختلف حصوں میں اور حدود سلطنت سے ملحقہ علاقوں میں، گرجے اور خانقاہیں قائم کرنے میں دل کھول کر مالی مدد کی۔

قسطنطین ثانی نے 356ء میں تھیوفیلس ہندی (Theophilus Indus) کو جزیرہ سرانذیپ سے عیسائیت کی تبلیغ کے لئے جنوبی عرب کی طرف بھیجا جس نے ایک کنیسہ عدن میں قائم کیا۔ دوسرا ظفار میں اور تیسرا ھرمز میں۔ اس نے نصرانیت قبول کرنے والوں کا رئیس مقرر کیا اور پھر وہاں سے چل دیا۔ کچھ عرصہ بعد ظفار کو رئیس الاساقفہ کے ہیڈ آفس کی حیثیت حاصل ہو گئی جو نجران، ہرمز اور سقطری کے عیسائیوں کے امور کا نگران تھا۔(2)

ایک روایت میں ہے کہ قسطنطین ثانی نے تھیوفیلس ہندی مذکور کو ملک حمیر اور حبشہ کے بادشاہ نجاشی کی طرف بھیجا تھا اور اسے ان بادشاہوں کے نام خط بھی دیئے تھے۔

مستشرق (رونیکی) کہتا ہے کہ قسطنطین کے تھیوفیلس کو ملک حمیر کے پاس بھیجنے کا مقصد محض دینی نہ تھا بلکہ وہ حمیریوں کے ساتھ تعلقات سے اقتصادی اور سیاسی فوائد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ حمیریوں کے ساتھ تعلقات سے رومیوں کی بحری تجارت کو فائدہ پہنچے گا اور ان تعلقات کی بدولت یمنی لوگ ایرانیوں کے مقابلے میں رومیوں کے مددگار ثابت ہوں گے۔(3)

رومی عیسائیت کے پھیلاؤ کو اپنے سیاسی استحکام کے لئے ضروری سمجھتے تھے جبکہ ان کے مقابلے میں ایرانی حکومت مجوسیت کو صرف اپنی قوم کا مخصوص مذہب سمجھتی تھی اس لئے اپنے زیر اثر اقوام کو مجوسیت قبول کرنے کی دعوت نہ دیتی تھی۔ ان کو اپنے زیر اثر لوگوں

1۔ تاریخ العرب قبل الاسلام، جلد 6، صفحہ 613

2۔ ایضاً، صفحہ 612، بحوالہ النصرانیہ

3۔ ایضاً

کے مذہب سے اس وقت تک کوئی دلچسپی نہ ہوتی تھی جب تک ان کا مذہب ایرانی حکومت کے سیاسی مفادات سے ٹکرانہ جاتا۔ وہ عیسائیت کو اس لئے بھی اپنے لئے خطرہ نہ سمجھتے تھے کہ ان کے علاقوں میں عیسائی مذہب کی جو شاخ پھیل رہی تھی اس کے عقائد روم کے سرکاری مذہب سے متصادم تھے اور دونوں فرقوں کے مابین اختلافات انتہائی شدید تھے۔

رومی حکومت کی تبشیری کوششوں اور ایرانی حکومت کے اس کے راستہ میں رکاوٹ نہ بننے کی وجہ سے صورت حال یہ تھی کہ وہ تمام چھوٹی چھوٹی ریاستیں جو رومی حکومت کے زیر اثر تھیں ان کے حکمرانوں نے عیسائیت قبول کر لی تھی اور دین ملوک کی پیروی میں عوام نے بھی عیسائیت کو گلے سے لگایا تھا۔ دومۃ الجندل، ایلہ، حبشہ، یمن اور مملکت بنو غسان کے حکمران عیسائی تھے۔ وہ عرب قبائل جو شام کی سرحدوں کے قریب تھے انہوں نے بھی عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا۔ سلیح، تغلب، تنوخ، لخم اور لیاد کے قبائل عیسائی ہو گئے تھے۔(1)

عیسائیت کی تبلیغ کی کوششیں سرکاری سطح تک محدود نہ تھیں بلکہ عیسائیوں نے ہر سطح پر اپنے مذہب کو پھیلانے کے لئے بھرپور کوششیں کیں۔ عیسائیوں کے عربوں کے ساتھ قدیم زمانے سے تجارتی تعلقات چلے آ رہے تھے۔ عرب تاجر شام اور فلسطین جاتے تھے اور عیسائی تاجر عرب میں وارد ہوتے تھے۔ عربوں کو عیسائیوں کے عقائد و نظریات اور مذہب عیسوی کی تعلیمات کو سمجھنے کا موقع ملتا تھا اور کئی عرب عیسائیت سے متاثر ہو کر اس مذہب کو قبول کر لیتے تھے۔ عیسائی تاجر تجارت سے مادی منافع بھی کماتے تھے لیکن وہ یہ سمجھتے تھے کہ تجارت کے ساتھ ساتھ تبشیری کوششیں اضافی منافع کا کام ہے۔ یہ وہ منافع ہے جو دونوں جہانوں میں کام آئے گا اس لئے وہ تجارت کے ساتھ عیسائیت کی تبلیغ کو بھی اپنا فرض سمجھتے تھے۔

عیسائی غلاموں کی شکل میں بھی جزیرہ عرب کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے اور وہ بھی کسی حد تک اہل عرب پر اثر انداز ہوتے تھے۔ بعض غلام ایسے بھی تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور لوگوں کے سامنے ان باتوں کی تشریح کرتے تھے جو تورات اور انجیل میں موجود تھیں۔ وہ انہیں نصرانی قصص سناتے تھے۔ یہ عیسائی غلام بعض عربوں کو مذہب نصرانیت میں داخل کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ بعض لوگ عیسائی غلاموں کے اثر

1۔ تاریخ العرب قبل الاسلام، جلد 6، صفحہ 591 بحوالہ یعقوبی

سے بت پرستی سے تو کنارہ کش ہو جاتے لیکن عیسائی مذہب میں داخل نہ ہوتے کیونکہ عیسائیت کے عقائد و نظریات سے وہ پوری طرح مطمئن نہ ہوتے تھے۔

عیسائیت کی تبلیغ اور اشاعت کا اصل سہرا عیسائی پادریوں اور راہبوں کے سر بندھتا ہے جنہوں نے اپنے دین کی تبلیغ کے لئے زبردست کوششیں کیں۔ انہوں نے تبلیغ مسیحیت کے لئے مختلف انداز اختیار کئے۔ کبھی عیسائیوں کے کچھ زاہد اور راہب لذات دنیا سے دور کوئی گوشہ تنہائی تلاش کرتے، اس میں سکونت پذیر ہوتے اور لوگ ان کی زندگی سے متاثر ہو کر ان کا دین قبول کر لیتے۔

بعض مبشرین اپنے علم طب کی بدولت مشرکین پر اثر انداز ہوتے۔ ان کے علاج سے مریضوں کے شفایاب ہونے کو ان کی کرامت سمجھا جاتا اور مشرکین ان کا مذہب قبول کر لیتے۔

عیسائی مورخین نے اپنے بعض راہبوں کی طرف حیرت انگیز کرامتیں منسوب کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ان راہبوں کی دعا اور برکت سے کئی بانجھ عورتوں کو اللہ تعالیٰ نے نرینہ اولاد عطا کی۔ عیسائی مورخین کے مطابق ضجاعمہ کے سردار ضجعم کی اولاد نہ تھی۔ وہ ایک راہب کے پاس گیا جس کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے اس کو بیٹا عطا کیا۔ راہب کی اس کرامت سے متاثر ہو کر اس نے عیسائی مذہب قبول کر لیا۔(1)

کنیسہ کی تاریخ میں ایسے بے شمار واقعات مذکور ہیں جب کسی راہب کی دعا سے کسی سردار کو شفا نصیب ہوئی یا راہب کی کوئی اور کرامت ظاہر ہوئی اور سردار سمیت سارا قبیلہ عیسائی ہو گیا۔

عیسائی مبشرین تبشیر کے راستے میں پیش آنے والی ہر قسم کی تکلیفوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے تھے۔ وہ جزیرہ عرب کے دور دراز علاقوں تک پہنچتے۔ بدو قبائل کے ساتھ راہ و رسم قائم کرتے۔ ان کے ساتھ رہتے اور انہی کا طرز حیات اختیار کرتے۔ خیموں میں رہنے کی وجہ سے وہ اساقفۃ الخیام یا اساقفۃ اھل الوبر کے لقب سے مشہور ہوئے جس کا مطلب ہے خیموں والے پادری یا دیہی پادری۔ کنیسہ کی تاریخ میں مطران کا ذکر ملتا ہے جو اس قسم کے بیس کے قریب پادریوں کا رئیس تھا جو (عرب حوران) اور (عرب غسان) میں پھیلے ہوئے تھے اور مندرجہ بالا ناموں سے یاد کئے جاتے تھے۔(2)

1۔ تاریخ العرب قبل الاسلام، جلد 6، صفحہ 592

2۔ ایضاً، صفحہ 588 بحوالہ النصرانیہ

عیسائی راہبوں نے بھی عرب تاجروں اور بدوؤں کو عیسائیت سے متعارف کرانے کے لئے خاص کردار ادا کیا۔ تاجروں کو ان کی خانقاہوں کی شکل میں ایسی پناہ گاہیں میسر تھیں جن میں وہ استراحت کرتے۔ وہاں سے پانی کا تازہ زادِ راہ لیتے۔ ان کو وہاں مہکتے ہوئے رنگا رنگ پھول اور لہلہاتی ہوئی کھیتیاں دعوت نظارہ دیتیں جو راہبوں کی کوششوں سے وہاں موجود ہوتیں۔ ان خانقاہوں میں ان کے لئے سامان طرب بھی میسر ہوتا۔ وہاں انہیں ایسی شراب سے لطف اندوز ہونے کا موقعہ ملتا جس کی کشید میں راہبوں کو خاص مہارت حاصل تھی۔ یہ راہب اپنے ان مہمانوں کی راہنمائی کے لئے رات کی تاریکی میں ہاتھوں میں روشن شمعیں لئے اپنی خانقاہوں کے باہر کھڑے ہوتے تھے۔ یہ راہب جہاں اپنے مہمانوں کو مختلف سہولتیں فراہم کرتے، ان کے آرام و آسائش کا خیال رکھتے وہاں وہ انہیں اپنے دین کی تعلیمات سے بھی آگاہ کرتے۔

یہ خانقاہیں جو دراصل زندگی کے ہنگاموں سے دور عبادت اور فکر و مراقبے کے لئے مخصوص تھیں وہ عیسائیت کی تبلیغ کے مراکز کی شکل اختیار کر چکی تھیں۔ اس قسم کی خانقاہیں جزیرہ عرب کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان خانقاہوں کی تفصیلات اور ان کے راہبوں کی تبشیری کوششوں کا حال پڑھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔

یہ خانقاہیں عراق اور شام کے علاقوں میں کثیر تعداد میں موجود تھیں۔ حجاز اور جزیرہ عرب کے جنوبی اور مشرقی حصوں میں بھی ان خانقاہوں کا ذکر ملتا ہے۔ یہ خانقاہیں عراق اور شام کے کنیسوں سے مالی اعانت حاصل کرتی تھیں۔(1)

رومی حکومت کے تعاون سے راہب اپنی خانقاہوں اور پادری اپنے گرجوں کو اس شاندار طریقے سے سجاتے کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتیں۔ انسان فطرتاً چمک دمک سے جلد مرعوب ہوتا ہے۔ اس قسم کی شاندار عبادت گاہوں کو دیکھ کر عرب مرعوب ہو جاتے اور عیسائی تہذیب اور مذہب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے۔

عیسائیوں کی ان ہمہ گیر کوششوں کا نتیجہ یہ تھا کہ جزیرہ عرب کے طول و عرض اور اس کے گردونواح میں عیسائیت کی جڑیں بہت مضبوط ہو چکی تھیں۔ نجران طلوع اسلام کے وقت یمن کے عیسائیوں کے مرکز کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ وہاں ایک مضبوط سیاسی نظام

1۔ تاریخ العرب قبل الاسلام، جلد 6، صفحہ 590

رائج تھا۔ حیرہ میں نہ صرف عیسائی آباد تھے بلکہ اس علاقے نے عیسائیت کے بڑے بڑے مذہبی علماء پیدا کئے جو حیرہ سے اندرون عرب تبلیغی کاموں کے لئے جاتے تھے۔

خود خانہ کعبہ میں دیگر تصویروں کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کی تصویروں کی موجودگی اس بات کی دلیل ہے کہ مکہ مکرمہ تک بھی عیسائیت کے اثرات پہنچ چکے تھے۔

عیسائی اثرات کی اس وسعت اور عیسائیوں کی ان تھک تبلیغی اور تبشیری کوششوں کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اگر توحید خداوندی کا اعلان کرنے کے لئے فاران کی چوٹیوں سے خدا کا حبیب جلوہ گر نہ ہوتا، اگر بتوں کی سرزمین جزیرہ عرب میں بت شکنوں کی مقدس جماعت ظاہر نہ ہوتی تو آج جزیرہ عرب کی شکل وہ نہ ہوتی جو نظر آرہی ہے۔ جزیرہ عرب پتھروں کی خدائی کے چنگل سے نکل کر تثلیث کے چنگل میں پھنس چکا ہوتا اور ہر طرف عیسائیت کے پرچم لہراتے نظر آتے۔

گزشتہ سطور سے قارئین نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ رومی حکومت کے زیر سایہ عیسائیوں کی مضبوط سیاسی حیثیت کے ساتھ ساتھ ان کی سماجی اور اقتصادی حیثیت بھی مضبوط تھی۔ جو لوگ ان کے مذہب اور تہذیب سے متاثر ہو کر اپنا دین چھوڑ دیتے تھے وہ ان کے دین کے حلقہ بگوش ہو جاتے تھے، ظاہر ہے وہ عیسائیوں کو اپنے آپ سے بہتر سمجھتے تھے۔ عیسائی پرامن ماحول میں تجارتی اور دیگر معاشی سرگرمیوں سے معقول آمدنی حاصل کر کے فارغ البالی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور ان کے مذہبی راہنما اپنی مضبوط سماجی حیثیت کی بدولت عیش و عشرت کی زندگی گزار رہے تھے۔

اسلام کے عیسائیت اور عیسائیوں کی حیثیت پر اثرات اور ان کا رد عمل

ابتداء میں مسلمان، عیسائیوں کو یہودیوں اور مشرکین کی نسبت اپنے زیادہ قریب سمجھتے تھے۔ قرآن حکیم نے بھی اعلان کیا تھا۔

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا

نصٰرٰی (1)

"ضرور پائیں گے آپ سب لوگوں سے زیادہ دشمنی رکھنے والے مومنوں سے یہود کو اور مشرکوں کو اور پائیں گے آپ سب سے زیادہ قریب دوستی میں ایمان والوں سے انہیں جنہوں نے کہا ہم نصاریٰ ہیں۔"

ایرانیوں کے ہاتھوں رومیوں کی شکست پر مسلمان پریشان بھی ہوئے تھے اور پھر جب قرآن حکیم کی پیشگوئی کے مطابق رومیوں کو ایرانیوں کے خلاف فتح نصیب ہوئی تو یہ فتح مسلمانوں کے لئے خوشی کا باعث بھی بنی تھی۔ جب تک مسلمانوں کے کفار مکہ اور یہودیوں کے ساتھ معرکے برپا تھے اس زمانے میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان معرکہ آرائی شروع نہیں ہوئی تھی کیونکہ اس زمانے میں عیسائی حکومتیں اسلام کو اپنے لئے کسی قسم کا خطرہ نہیں سمجھتی تھیں بلکہ ایسے تاریخی شواہد موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضور ﷺ کی بعثت سے پہلے ہی نصرانیت کے کچھ نیک طینت پیروکاروں نے حضور ﷺ کے حالات کو دیکھ کر یہ بتا دیا تھا کہ یہ وہی آخری نبی ہیں جن کی آمد کی بشارتیں صحف سماوی میں مذکور چلی آتی ہیں۔ بحیریٰ راہب نے شام کے ایک سفر میں حضور ﷺ کو پہچان لیا تھا اور آپ کے روشن مستقبل کی پیشگوئی کی تھی۔ اس نے آپ کے چچا کو یہ بتا دیا تھا کہ اگر یہودیوں نے آپ کو دیکھ لیا تو وہ آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔

ورقہ بن نوفل نے بھی آپ پر ابتدائی وحی کے نزول کی کیفیت سن کر یقین کر لیا تھا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول ہیں۔ اس نے اس حسرت کا بھی اظہار کیا تھا کہ کاش اس کی زندگی ساتھ دے اور وہ مخالفت کی تند و تیز آندھیوں میں آپ کا ساتھ دے سکے۔

سفر طائف میں ایک عیسائی غلام نے آپ کی زبان پاک سے چند کلمات سن کر آپ کے لئے جذبات محبت و عقیدت کا اظہار کیا تھا اور اپنے آقاؤں کو بتایا تھا کہ یہ انسان جو تمہیں اپنی موجودہ ہیئت میں بالکل بے بس و بے کس نظر آتا ہے، یہ کائنات کی عظیم ترین ہستی ہے۔ شاہ حبشہ نجاشی نے جس طرح اپنے ملک میں پناہ لینے والے مسلمانوں کی پذیرائی کی تھی اور حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے اس کے دربار میں مشرکین مکہ کے ایلچیوں، بادشاہ کے درباریوں اور کلیساء حبشہ کے نمائندوں کے سامنے اسلام کی حقانیت پر جو تقریر

1۔ سورۃ المائدہ 82

کی تھی، اسے سن کر نجاشی نے جس رد عمل کا اظہار کیا تھا اور پھر جس طرح اسلام کے دامن میں پناہ لے کر اس نے سعادت دارین حاصل کی تھی، ہر قل شاہ قسطنطنیہ اور مقوقس شاہ مصر واسکندریہ نے آپ ﷺ کے نامہ ہائے مبارک پا کر جن خیالات وجذبات کا اظہار کیا تھا، ان سے پتہ چلتا ہے کہ حضور ﷺ کی ذات کی شکل میں ان کو اپنی الہامی کتب کی پیشگوئیوں کی تکمیل نظر آرہی تھی۔ اس لئے بعثت نبوی کو وہ اپنے لئے چیلنج نہیں بلکہ رحمت خداوندی سمجھتے تھے اور باران رحمت سے اپنا دامن طلب بھرنے کے متمنی تھے۔

جن چند واقعات کی طرف سطور بالا میں اشارہ کیا گیا ہے ان سے قرآن حکیم کی اس آیت کریمہ کی تصدیق ہوتی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ عیسائی مومنوں کے لئے دوستی کے معاملہ میں سب سے زیادہ قریب ہیں۔

انسان کی بد بختی جب زور کرتی ہے تو تعصب، جھوٹا وقار، مادی مصلحتیں اور ذاتی مفادات اسے اندھا کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اس کی بصارت کام کرتی ہے لیکن بصیرت جواب دے جاتی ہے۔ قوت سماعت کے باوجود وہ بہرہ ہو جاتا ہے۔ وہ حق کے جلوے دیکھتا ہے لیکن اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ آواز حق اس کے کانوں تک پہنچتا ہے لیکن وہ اس کے لئے اپنے دل کے دروازے بند کر لیتا ہے۔ حکمت ودانائی کی ساری نعمتوں سے متمتع ہونے کے باوجود وہ ابو جہل بننا گوارا کر لیتا ہے۔

جب آفتاب اسلام کی حیات بخش کرنیں نمودار ہوئیں تو تاریکی وظلمت کے بیوپاریوں نے اسے اپنے وجود کے لئے خطرہ سمجھا۔ اسلام کے ابتدائی ایام میں عیسائیوں کا رویہ اگرچہ مصالحانہ رہا لیکن وہ بد بخت جو تحریف شدہ دین عیسوی کی بنیاد پر اپنی شوکت وسطوت اور جھوٹے وقار کا محل تعمیر کئے بیٹھے تھے، انہیں اسلام اپنی امتیازی حیثیت کے لئے خطرہ نظر آیا اور انہوں نے اسلام کی مخالفت کا تہیہ کر لیا۔

مدینہ طیبہ میں ایک شخص رہتا تھا جس کا نام ابو عامر بن صیفی تھا اور راہب کے لقب سے مشہور تھا۔ اوس کے کئی نوجوان اس کی تبلیغ سے متاثر ہو کر عیسائیت قبول کر چکے تھے۔ جب حضور ﷺ نے مدینہ طیبہ کو اپنے قدوم میمنت لزوم کا شرف عطا فرمایا تو ابو عامر کو اپنی پارسائی اور چودھراہٹ خطرے میں نظر آئی۔ اس نے حضور ﷺ کی مخالفت پر کمر باندھ لی۔ وہ خود چونکہ اسلام اور مسلمانوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا اس لئے عداوت رسول

کے طوفان سینے میں چھپائے وہ اپنے چیلوں کے ساتھ عازم مکہ ہوا۔ اس نے مکہ والوں کو اسلام اور داعی اسلام کے خلاف بھڑکایا۔ اس نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اسلام کے خطرے کو ختم کرنے کے لئے جتنا جلد ممکن ہو ضروری اقدام کریں وگرنہ اسلام کی ترقی ان کے لئے پیام موت بن جائے گی۔ جب اس نے دیکھا کہ اہل مکہ مسلمانوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تو اس نے قیصر روم سے مسلمانوں کے خلاف مدد لینے کے لئے قسطنطنیہ کا رخ کیا۔ روانہ ہونے سے پہلے اس نے اپنے چیلوں اور منافقین کی جماعت کو حکم دیا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا مرکز قائم کرنے کیلئے ایک مسجد تعمیر کریں اور مسلمانوں کے خلاف فیصلہ کن کارروائی کرنے کی تیاری کرلیں۔ یہ شخص روم گیا لیکن جو مذموم عزائم لے کر وہ گیا تھا اسے ان میں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اس کے اشارے پر جو مسجد تعمیر ہوئی اسے قرآن حکیم نے مسجد ضرار کا نام دیا۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًاۢ بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ۝(1)

"اور وہ لوگ جنہوں نے بنائی ہے مسجد نقصان پہنچانے کے لئے، کفر کرنے کے لئے اور پھوٹ ڈالنے کے لئے مومنوں کے درمیان اور (اسے) کمین گاہ بنایا ہے اس کے لئے جو لڑتا رہا ہے اللہ سے اور اس کے رسول سے اب تک۔ اور وہ ضرور قسمیں کھائیں گے کہ نہیں ارادہ کیا ہم نے مگر بھلائی کا۔ اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ صاف جھوٹے ہیں۔

اس مسجد کو گرا کر اسلام کے خلاف عیسائی سازش کے اس اولین مرکز کو ختم کردیا گیا۔

ابو عامر راہب کی کوششوں سے پتہ چلتا ہے کہ مدینہ طیبہ میں بھی عیسائی عنصر موجود تھا۔ ان کی اسلام دشمنی میں وہ زور تو نہ تھا جو یہودیوں کی اسلام دشمنی میں تھا لیکن یہ عنصر بھی خاموش نہیں بیٹھا تھا۔ یہ عنصر بھی مقدور بھر اسلام کو زک پہنچانے کی کوششوں میں مصروف تھا۔

نجران میں طلوع اسلام کے وقت عیسائیوں کا زور تھا۔ نجران کے احبار و رہبان نے

1۔ سورۃ التوبہ: 107

بھی اسلام کو اپنے مفادات کا قاتل سمجھا لیکن انہوں نے اسلام کے خلاف مسلح مزاحمت کی بجائے دلیل کے ذریعے اس دین حق کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ ان کے جید علماء کا ایک وفد مدینہ طیبہ حاضر ہوا۔ انہوں نے حضور ﷺ سے مناظرانہ گفتگو کی۔ ان کے خیالات کی تردید میں قرآن حکیم کی کئی آیات کریمہ نازل ہوئیں لیکن اپنے ہر سوال کا تسلی بخش جواب پا کر بھی انہوں نے اپنے دلوں کے دریچے آفتاب حق کی نورانی کرنوں کے لئے وانہ کئے۔ پروردگار عالم نے ان کی ہٹ دھرمی پر ایسا فیصلہ کن وار کیا جس نے ہمیشہ کیلئے عیسائی عقائد کے بطلان پر مہر لگا دی۔ ارشاد خداوندی ہوا۔

اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝ فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۝ (1)

"بے شک مثال عیسیٰ (علیہ السلام) کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک آدم (علیہ السلام) کی مانند ہے۔ بنایا اسے مٹی سے پھر فرمایا اسے ہو جا تو وہ ہو گیا (اے سننے والے!) یہ حقیقت (کہ عیسیٰ انسان ہیں) تیرے رب کی طرف سے (بیان کی گئی) ہے۔ پس تو نہ ہو جا شک کرنے والوں سے۔ پھر جو شخص جھگڑا کرے آپ سے اس بارے میں اس کے بعد کہ آ گیا آپ کے پاس (یقینی) علم تو آپ کہہ دیجئے کہ آؤ ہم بلائیں اپنے بیٹوں کو بھی اور تمہارے بیٹوں کو بھی اور اپنی عورتوں کو بھی اور تمہاری عورتوں کو بھی۔ اپنے آپ کو بھی اور تم کو بھی۔ پھر بڑی عاجزی سے (اللہ کے حضور) التجا کریں۔ پھر بھیجیں اللہ تعالیٰ کی لعنت جھوٹوں پر۔"

یہ آیت کریمہ سن کر نجران کے عیسائی سناٹے میں آ گئے۔ ان کے تقدس و پارسائی کے محلات زمین بوس ہو گئے۔ یہ خدائی چیلنج سن کر انہوں نے اسلام اور داعی اسلام کے مقابلے سے دستبردار ہو جانے میں ہی عافیت سمجھی۔ انہوں نے باہمی مشورے کے بعد مباہلہ نہ

---

(1) سورۃ آل عمران: 61-59

کرنے کا فیصلہ کیا۔ مباہلہ کرنے کا فیصلہ وہ کیسے کرتے۔ انہیں حضور ﷺ کے نبی برحق ہونے میں کوئی شک نہ تھا۔ نجران سے روانہ ہونے سے پہلے ان کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی اس سے یہ واضح اشارے ملتے ہیں کہ وہ سمجھ چکے تھے کہ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کے سچے نبی ہیں۔ قوم نے انہیں صورت حال کی تحقیق ہی کے لئے بھیجا تھا۔ اگر حضور ﷺ کی صداقت کے بارے میں ان کے ذہنوں میں کوئی شک تھا بھی تو وہ حضور ﷺ کے ساتھ مذاکرات میں رفع ہو گیا ہوگا۔ اس صورت حال میں خاندان نبوت کے ان مقدس نفوس کے مقابلے میں، جو مباہلے کے لئے تیار ہو کر آگئے تھے، مباہلہ کرنا کوئی معمولی کام نہ تھا۔

انہوں نے میدان مباہلہ سے راہ فرار اختیار کر کے اپنے آپ کو تباہی سے بچالیا اور جزیہ دینا منظور کر کے حضور ﷺ سے امن نامہ بھی لکھوالیا جس میں ان کو جان و مال کی حفاظت کی ضمانت دی گئی تھی اور یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ ان کے مذہبی معاملات میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔

حضور ﷺ کی حیات طیبہ میں مسلمانوں کی عیسائیوں سے باقاعدہ مسلح مڈبھیڑ صرف ایک بار ہوئی۔ شرحبیل بن عمرو غسانی نے حضور ﷺ کے سفیر کو قتل کروادیا۔ سفیر کے اس ظالمانہ قتل سے تمام سفیروں کی جانیں خطرے میں پڑگئیں۔ اس سفیر کے قتل کا بدلہ لینے اور سفارتی امن کے قیام کے لئے حضور ﷺ نے شرحبیل بن عمرو غسانی کے خلاف کارروائی کیلئے لشکر بھیجا اور جنگ موتہ پیش آئی۔ جنگ موتہ کا حال قارئین ضیاء النبی کی گزشتہ جلدوں میں پڑھ چکے ہیں اس لئے یہاں اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ جنگ موتہ کے علاوہ ایک دوسری فوجی مہم جو عیسائیوں کے خلاف مدینہ سے روانہ ہوئی وہ سفر تبوک تھا۔ اس سفر میں مسلح تصادم کی نوبت نہیں آئی۔

اسلام جب تک جزیرہ عرب کے اندر رہا عیسائیوں نے اسے اپنے لئے بڑا خطرہ نہ سمجھا لیکن جب اسلام انتہائی سرعت سے پھیلتے ہوئے عرب کی سرحدوں سے باہر نکلنے لگا، جب اس نے جزیرہ عرب کے اندر اپنے تمام مخالفین کو نہ صرف ختم کیا بلکہ ان کی اکثریت کو اپنے جھنڈے کے نیچے جمع کر لیا، جب عرب کے عیسائی قبائل عیسائیت چھوڑ کر اسلام قبول کرنے لگے تو عیسائی حکمرانوں نے اسلام کے خلاف فیصلہ کن کارروائی کرنے کا تہیہ کر لیا۔ وہ اسلام کی اشاعت کے مقابلے میں خم ٹھونک کر کھڑے ہو گئے۔ مسلمانوں اور عیسائیوں

کے درمیان جنگوں کا ایک وسیع سلسلہ چل نکلا۔ عیسائی فوجیں طاقت کے نشے میں دھت میدان میں نکلتیں اور مے خانہ توحید کے متوالوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتیں۔

مسلمانوں نے نہ صرف عیسائی فوجوں کو فاش شکستیں دے کر ان کے علاقوں کو فتح کیا بلکہ انہوں نے اپنے دین کی برکت اور اپنے مثالی کردار سے عیسائیوں کے دلوں کو بھی فتح کیا۔ عیسائیوں کے خلاف مسلمانوں کی فتوحات صرف عسکری فتوحات نہ تھیں بلکہ یہ فتوحات اخلاقی بھی تھیں اور روحانی بھی۔ مسلمان علاقے فتح کرنے کے ساتھ ساتھ عیسائی رعایا کے دلوں کو بھی فتح کرتے جا رہے تھے۔ انتہائی قلیل مدت میں اسلام نے ایشیا اور افریقہ سے عیسائیوں کے سیاسی اور روحانی اقتدار کا جنازہ نکال دیا۔ ان کے پوپ اور پادری اس صورت حال کو انتہائی بے بسی کے ساتھ دیکھنے پر مجبور ہو گئے۔ ان کی صدیوں کی تبلیغی اور تبشیری کوششیں برباد ہو گئی تھیں۔ ان کا سیاسی اور روحانی مستقبل اجڑ گیا تھا۔ انہوں نے صدیوں کی کوششوں سے جو کچھ کمایا تھا وہ مسلمانوں نے ایک قلیل مدت میں برباد کر دیا تھا۔ ان کے دل اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت سے معمور ہو گئے۔ انتقام کی چنگاریاں ان کے بے بس دلوں میں سلگنے لگیں۔ یہ صورت حال تقریباً چودہ سو سال سے جاری ہے۔ عیسائیوں نے مسلمانوں کے سیاسی زوال کے بعد ان سے اپنی ماضی کی شکستوں کے دل کھول کر بدلے بھی لئے ہیں لیکن انتقام کی جو چنگاری ان کے دلوں میں سلگ رہی ہے اس کی حدت میں کمی نہیں آئی۔ آج بھی عیسائی مسلمان کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتا ہے اور اسے نقصان پہنچانے کے کسی موقعہ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔

عیسائی مسلم تعلقات پر صلیبی جنگوں کے اثرات

عیسائی مسلم تعلقات پر صلیبی جنگوں کے اثرات

مستشرقین نے اسلام کے متعلق صدیوں سے جو معاندانہ رویہ اپنا رکھا ہے، اس کے اسباب کی تہ تک پہنچنے کے لئے مسلمانوں اور عیسائیوں کے تعلقات کو تاریخ کے پس منظر میں دیکھنا ضروری ہے اور ان دونوں مذاہب کی طویل باہمی چپقلش کو صلیبی جنگوں سے علیحدہ کر کے دیکھنا ممکن نہیں۔

تاریخ کا ہر طالب علم اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ مسلمان ساتویں صدی عیسوی میں دنیا کی عظیم ترین طاقت بن کر نمودار ہوئے اور انہوں نے انتہائی قلیل مدت میں دنیا کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ اپنے دور کی دو عالمی طاقتیں ان سے ٹکرائیں اور پاش پاش ہو گئیں۔ اسلامی فتوحات کے اس سیلاب میں ایرانی سلطنت صفحہ ہستی سے مٹ گئی اور بیز نطینی سلطنت اپنے بیشمار علاقوں سے محروم ہو گئی۔ مدینہ کی اسلامی ریاست کے قیام سے صرف سترہ سال بعد مسلمانوں نے عیسائیوں سے اپنا قبلہ اول چھین لیا۔ (1) سو سال سے بھی کم عرصہ گزرا تھا کہ مسلمانوں نے اندلس کی سرزمین پر اپنے ہلالی پرچم لہرا دیئے اور 92ھ میں طارق بن زیاد نے راڈرک کے لشکر کو تاریخی شکست دے کر اندلس میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ (2)

یہ وہ دور تھا جب مسلمان ایمان کی قوت سے سرشار تھے۔ ان کے اخلاق میں اور ان کے کردار میں اسلام کی نورانی تعلیمات کے جلوے ضوفشاں تھے۔ غیرت ایمانی ان کی ڈھال تھی اور اعلائے کلمۃ الحق کا جذبہ ان کی تلوار تھا۔ وہ نہ موت سے ڈرنا جانتے تھے اور نہ ہی دنیا کی چمک انہیں خرید سکتی تھی۔ انہی خوبیوں سے متصف ہو کر وہ جزیرہ عرب سے نکلے اور دنیا پر چھا گئے۔ ان کے راستے میں نہ مکہ وطائف کی بت پرستی ٹھہر سکی اور نہ ہی یثرب و خیبر کی

1۔ ابوالحسن البلاذری "فتوح البلدان"، (دار الکتب العلمیہ بیروت، 1983)، صفحہ 145
2۔ "اندلس" اردو دائرہ معارف اسلامیہ، لاہور 1973

یہودیت۔ نہ ایران کی مجوسیت ان کے راستے میں بند باندھ سکی اور نہ ہی مشرقی و مغربی یورپ کی نصرانیت۔ ان کی تلواریں دشمن کی تلواروں سے ٹکرائیں اور انہیں کند کر دیا۔ ان کے اخلاق و کردار نے دشمن کے دلوں کو فتح کیا۔ ان کے دین کی نورانی تعلیمات نے مختلف افکار و نظریات کی تہی دامنی کو آشکار کیا اور مشرق و مغرب کی فضائیں کلمہ توحید کی صداؤں سے گونج اٹھیں۔

حکمت خداوندی نے آفتاب اسلام کے طلوع کے لئے جس زمانے کا انتخاب کیا تھا وہ ظلمت و تاریکی میں اپنی مثال آپ تھا۔ انسانیت کی جتنی تذلیل اس دور میں ہو رہی تھی شاید اتنی تاریخ انسانی کے کسی دوسرے دور میں نہ ہوئی ہو۔ جہالت کا عفریت اس عہد میں جس طرح تباہی مچار ہا تھا وہ اپنی مثال آپ تھا۔

بنو اسرائیل نے ہر زمانے میں اپنی تحریفی کاروائیاں جاری رکھیں لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک انبیائے کرام مسلسل اس دنیا میں تشریف لاتے رہے اور الہامی تعلیمات سے انسانی تحریفات کے عنصر کو صاف کر کے انہیں شفاف آئینے کی طرح بنی نوع انسان کے سامنے پیش کرتے رہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے لے کر حضور ﷺ تک کا زمانہ فترت کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں اہل کتاب نے الہامی تعلیمات کے ساتھ انتہائی ظالمانہ سلوک کیا۔ اہل کتاب ہونے کے باوجود وہ الہامی روشنی سے محروم ہو چکے تھے۔ عیسائیوں کے مختلف فرقوں کی باہمی چپقلش عروج پر تھی۔ مغربی کلیسا، کلیسائے مشرق کے ساتھ بر سر پیکار تھا۔ کلیسائے مشرق کی نسطوری اور یعقوبی شاخیں ایک دوسرے کا گلا کاٹنے میں مصروف تھیں۔ حکام ظالم اور عیاش بن چکے تھے۔ امرا عیش و طرب کی زندگی میں مدہوش تھے۔ احبار و رہبان کو صرف زر و سیم کی چمک میں سکون قلب میسر آتا تھا۔ رعایا حکام کے مظالم سے تنگ آ چکی تھی اور ان کے آہنی شکنجے سے نکلنے کے لئے بے چین تھی۔ ان حالات میں آفتاب اسلام کی نورانی کرنیں نمودار ہوئیں اور انہوں نے ظلم کی شب دیجور کو ختم کر کے رکھ دیا۔

اسلام کے بسرعت پھیلنے کا راز جہاں ایک طرف اس کی نورانی تعلیمات اور اس کے خادموں کے پاکیزہ کردار میں مضمر تھا وہاں عالم انسانیت کی زبوں حالی، مذہبی عقائد و نظریات کا کھوکھلا پن اور استبدادی قوتوں کا جبر و استبداد بھی اشاعت اسلام کے لئے ممد و

معاون ثابت ہوئے۔

تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان جہاں بھی گئے وہاں کے مظلوم انسانوں نے ان کے لئے اپنے دیدہ و دل فرش راہ کر دیئے۔ بیشمار علاقوں کے باسیوں نے اپنے حکام کے مظالم سے تنگ آ کر مسلمانوں کو مداخلت کی دعوت دی۔ ان حالات میں اسلام انتہائی تیزی سے پھیلا۔ اس کی ہمہ گیر فتوحات علاقوں کے ساتھ ساتھ دلوں کو بھی فتح کرتی چلی گئیں اور قسطنطنیہ کی فصیلوں، بواتیہ کے شارل مارٹل اور دولت خزر کے علاوہ کوئی طاقت ان کے راستے میں حائل نہ ہو سکی۔(1)

جن طاقتوں نے اسلام کا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی ان میں سے کچھ تو ہمیشہ کے لئے صفحہ ہستی سے نابود ہو گئیں اور انہیں پھر کبھی سر اٹھانے کا موقعہ نہ ملا۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ جن طاقتوں نے کبھی اسلام کی شمع کو گل کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا، وہی طاقتیں پھر اسلام کی علمبردار بن کر اٹھیں اور انہوں نے اسلام کے نور کو چار دانگ عالم میں پھیلانے کے لئے اپنا تن من دھن قربان کر دیا۔ ابو جہل جیسے دشمن اسلام کے جگر گوشے نے شجر اسلام کی آبیاری کے لئے اپنا خون پیش کیا۔ ابو سفیان اور عمرو بن عاص جیسے لوگ جو کبھی اسلام دشمن قوتوں کی قیادت کر رہے تھے، انہوں نے اسلام قبول کیا اور اس دین حق کی اشاعت کو ہی اپنی زندگی کا مقصد بنالیا۔ جنگ احد میں مسلمانوں کی فتح کو شکست میں تبدیل کرنے والا خالد بن ولید اشاعت اسلام کے راستے میں شہادت کو ہی کائنات کی سب سے بڑی سعادت سمجھنے لگا۔ وہ ایرانی جنگجو جو کبھی اپنی طاقت کے نشے میں سر مست اسلام کو مٹانے کے لئے اٹھے تھے کچھ عرصہ بعد وہی اسلام کے علمبرداروں کی شکل میں نظر آئے۔

تاریخ اسلام کا یہ باب انتہا روشن اور پاکیزہ ہے کہ کسی قوم کی تاریخ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ کتنی حیران کن حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے مسلمانوں کا مقابلہ میدان جنگ میں کیا تھا۔ جن کے مسلمانوں کے ساتھ خون ریز معرکے ہوئے تھے اور ان کے کئی عزیز مسلمانوں کے ہاتھوں خاک و خون میں تڑپ گئے تھے، وہی لوگ اسلام قبول کر کے مسلمانوں کے دینی بھائی بن گئے۔ وہ ماضی کی تلخیوں کو بھول گئے اور اپنے دینی بھائیوں کے شانہ بشانہ اسی دعوت کو پھیلانے کے لئے مصروف جہاد ہو گئے جس کو دبانے کیلئے انہوں نے

1۔ ڈاکٹر سہیل زکار، مترجم و مقدمہ نگار، "تاریخ الحروب الصلیبیہ" از ولیم صوری، (دار الفکر، 1990ء)، جلد 1، صفحہ 21

ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا۔

کچھ لوگ اسلام کو صرف عربوں کا دین سمجھتے ہیں اور اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ جن لوگوں نے اسلام کی دعوت کو ایشیا، افریقہ اور یورپ کے طول و عرض تک پہنچایا تھا وہ صرف عرب ہی نہ تھے بلکہ ان میں شامی بھی تھے اور عراقی بھی، ایرانی بھی تھے اور مصری بھی، سلجوقی بھی تھے اور غزنوی بھی، ترک بھی تھے اور بربر بھی۔ یہ بات بھی اوراق تاریخ پر ثبت ہے کہ ان سب قوموں نے ابتدا میں اسلام کے راستے میں مزاحم ہونے کی کوشش بھی کی تھی لیکن اسلام خدا کا بھیجا ہوا دین ہے اور خدائے قادر و قیوم اس بات پر قادر ہے کہ وہ صنم خانے کے پجاریوں کو کعبے کا نگہبان بنادے۔

جن قوموں نے اسلام کی اشاعت کا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی ان میں سے اکثر نے اسلام کی حقانیت کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے لیکن عیسائیوں اور یہودیوں نے اسلام دشمنی کا رویہ کبھی ترک نہیں کیا۔ مسلمانوں کے دور عروج میں یہ قومیں کسی حد تک دب ضرور گئیں لیکن خاموش ہو کر بیٹھی نہیں۔ یہودیوں کی چونکہ کوئی باقاعدہ حکومت نہ تھی اس لئے یثرب و خیبر سے یہودیوں کے انخلاء کے بعد ان کا براہ راست مسلمانوں کے ساتھ مسلح تصادم نہیں ہوا لیکن دولت خزر جس نے مسلمانوں کے مشرقی یورپ میں داخل ہونے کا راستہ روکا تھا اس کے حکمرانوں نے آٹھویں صدی عیسوی میں دین یہودیت قبول کر لیا تھا۔ یہ حکومت تیرہویں صدی عیسوی تک قائم رہی حتیٰ کہ روسیوں نے اس کا خاتمہ کیا اور یہاں سے یہودی یورپ کے مختلف حصوں میں پھیل گئے۔

اب دنیا میں یہودیوں کی جو کل تعداد آباد ہے اس کا نوے (90) فی صد حصہ انہی لوگوں پر مشتمل ہے جن کا تعلق اس دولت خزر سے منتشر ہونے والوں کے ساتھ ہے۔ (1)

عیسائیوں کا معاملہ یہودیوں سے مختلف ہے۔ ان سے مسلمانوں نے دنیا کے مختلف علاقے چھینے تھے۔ قسطنطنیہ کی بیزنطینی سلطنت کی صورت میں عیسائیوں کی ایک مضبوط حکومت موجود تھی۔ مغربی یورپ میں بھی پاپائیت کا بڑا زور تھا۔ مسلمانوں نے جن علاقوں کو فتح کیا تھا، ان کو یہود و نصاریٰ سے پاک کرنے کی پالیسی پر انہوں نے کبھی عمل نہیں کیا تھا۔ اہل کتاب جزیہ دے کر مسلمانوں کی حفاظت میں مسلمانوں کے علاقوں میں پر امن زندگی

1۔ تاریخ الحروب الصلیبیہ، جلد 1، صفحہ 37

گزارتے تھے۔ نہ صرف یہ کہ مسلمانوں نے انہیں اپنے علاقوں سے نہیں نکالا بلکہ مسلمانوں کے زیر سایہ رہتے ہوئے بھی ان کے سماجی مقام میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں آئی جس کی وجہ سے انہیں احساس کہتری کا شکار ہونا پڑتا۔ وہ مسلمان خلفاء کے درباروں میں بلند ترین مناصب پر فائز رہے۔ مسلمانوں کے سائے میں ان کے ذہین اور قابل افراد کو اپنی صلاحیتیں استعمال کرنے کے مواقع میسر آئے۔ حکومت کی طرف سے ان کی حوصلہ افزائی ہوئی اور انہوں نے بڑے بڑے علمی کارنامے انجام دیئے اور ان کے ان علمی کارناموں کی وجہ سے ان کے نام آج تک صفحات تاریخ پر ثبت ہیں۔

مسلمانوں کے تحت رہتے ہوئے انہیں جان و مال کی حفاظت کی ضمانت حاصل تھی۔ وہ اپنے مذہب اور عقیدے کے معاملے میں آزاد تھے۔ ان کو اپنے باہمی تنازعات کے فیصلے اپنی اپنی شریعتوں کے مطابق کرنے کا حق حاصل تھا۔ مسلمان بادشاہوں کی شکل میں انہیں جو عادل اور رحمدل حکمران ملے تھے، اس قسم کے عادل اور رحمدل حکمرانوں کا خواب انہوں نے عیسائی غلبے کے دور میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔

لیکن یہ ایک انتہائی تلخ حقیقت ہے کہ مسلمان اپنی تمام عدل گستریوں اور رحمدلانہ کارروائیوں کے باوجود اہل کتاب کے دلوں سے تعصب اور اسلام دشمنی کے جذبے کو ختم نہ کر سکے۔ مسلمانوں سے وہ اس عادلانہ سلوک کے باوجود خوش نہ ہوئے۔ اور مسلمانوں کو اس بات کی توقع بھی نہیں کرنی چاہئے تھی کیونکہ قرآن حکیم نے پہلے ہی اعلان کر رکھا تھا۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِىْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (1)

"اور ہرگز خوش نہ ہوں گے آپ سے یہودی اور نہ عیسائی یہاں تک کہ آپ پیروی کرنے لگیں ان کے دین کی۔ آپ (انہیں) کہہ دیجئے کہ اللہ کا بتایا ہوا راستہ ہی سیدھا راستہ ہے اور اگر (بفرض محال) آپ پیروی کریں ان کی خواہشوں کی اس علم کے بعد جو آپ کے پاس آچکا ہے (تو پھر) نہیں ہوگا آپ کے لئے اللہ (کی گرفت) سے بچانے والا

1- سورۃ البقرۃ:120

کوئی یار اور نہ کوئی مددگار۔"

یہود و نصاریٰ کے مسلمانوں سے خوش ہونے کی شرط بہت کڑی تھی۔ ان قوموں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے مسلمانوں کو اپنے دین سے ہاتھ دھونے پڑتے تھے۔ اس شرط کو تو مسلمان پورا نہیں کر سکتے تھے لیکن اس حقیقت کے باوجود اسلام نے اپنے پیروکاروں کو ان کے ساتھ عدل کرنے کا حکم دیا۔ اسلام نے مسلمانوں کو یہ تنبیہ تو ضرور کی تھی کہ وہ یہود و نصاریٰ کو اپنا دانا نے راز نہ بنائیں اور فرمایا تھا:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَتَّخِذُوا۟ بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا وَدُّوا۟ مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ ٱلْبَغْضَآءُ مِنْ أَفْوَٰهِهِمْ وَمَا تُخْفِى صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ ۚ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ ٱلْءَايَٰتِ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْقِلُونَ ه (1)

"اے ایمان والو! نہ بناؤ اپنا راز دار غیروں کو۔ وہ کسر نہ اٹھا رکھیں گے تمہیں خرابی پہنچانے میں۔ وہ پسند کرتے ہیں جو چیز تمہیں ضرر دے۔ ظاہر ہو چکا ہے بغض ان کے مونہوں (یعنی زبانوں) سے اور جو چھپا رکھا ہے ان کے سینوں نے وہ اس سے بھی بڑا ہے۔ ہم نے صاف بیان کر دیں تمہارے لئے اپنی آیتیں اگر تم سمجھ دار ہو۔"

قرآن حکیم نے اس آیت کریمہ کے ذریعے مسلمانوں کو اس بات سے منع کیا تھا کہ وہ یہود و نصاریٰ کو اپنا ہمراز بنائیں لیکن اس ممانعت کے باوجود اسلام نے اپنے پیروکاروں کو یہ حکم نہیں دیا تھا کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ کسی قسم کا تعلق نہ رکھیں بلکہ اسلام نے اپنے پیروکاروں کو حکم دیا تھا کہ وہ ان قوموں کے بارے میں محتاط رہیں۔ اسلام کا حکم یہ تھا کہ ان قوموں سے تعلقات استوار کرنے سے پہلے ان کے رویہ کو دیکھ لیں۔ اگر ان کا رویہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف معاندانہ ہے تو ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے کی مسلمانوں کو اجازت نہیں اور اگر ان کا رویہ معاندانہ نہیں تو مسلمان بھی ان کے ساتھ دنیوی معاملات میں دوستانہ رویہ اختیار کر سکتے ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے:

لَّا يَنْهَىٰكُمُ ٱللَّهُ عَنِ ٱلَّذِينَ لَمْ يُقَٰتِلُوكُمْ فِى ٱلدِّينِ وَلَمْ

1۔ سورۃ آل عمران: 118

يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ٥ اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ٥(1)

"اللہ تعالیٰ تمہیں منع نہیں کرتا کہ جن لوگوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ نہیں کی اور نہ انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا کہ تم ان کے ساتھ احسان کرو اور ان کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کرو۔ بیشک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں صرف ان لوگوں سے روکتا ہے جنہوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا یا مدد دی تمہارے نکالنے میں کہ تم انہیں دوست بناؤ۔ اور جو انہیں دوست بناتے ہیں تو وہی (اپنے آپ پر) ظلم توڑتے ہیں۔"

یہودی ونصاریٰ مسلمانوں کے زیر سایہ امن وعافیت کی زندگی بسر کرتے رہے لیکن ان کے دلوں میں اسلام کے خلاف بغض اور دشمنی بدستور موجود رہی اور ان کی اس اسلام دشمنی کو دنیا کی عیسائی حکومتوں سے غذا ملتی رہی۔

مسلمان جب تک منظم اور طاقتور تھے، جب ان کی زمام اقتدار جراتمند اور غیور لوگوں کے ہاتھ میں تھی، اس وقت تک ان لوگوں کو اسلام کے خلاف کارروائی کا موقعہ نہ ملا اور انہوں نے مسلمانوں کے زیر سایہ امن وعافیت اور عیش وعشرت کی زندگی گزارنے کو ہی کافی سمجھا۔ لیکن تاریخ کی یہ بڑی تلخ حقیقت ہے کہ جن قوموں کا آفتاب اقبال کبھی پوری آب وتاب سے نصف النہار پر ضوفشاں نظر آتا ہے وہی قومیں کسی دوسرے دور میں اغیار کے رحم وکرم پر نظر آتی ہیں۔ مسلمانوں کی ملی تاریخ بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔ جب تک مسلمان اپنے دین کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہے، دنیا ان کی عظمتوں اور رفعتوں کی معترف رہی لیکن اس ملت پر وہ وقت بھی آیا جب اس کا رابطہ اپنے دین کی قوت بخش تعلیمات سے کمزور پڑ گیا، جب ان کی قوت عمل مفلوج ہوگئی، جب ان کی زمام اقتدار ان

1۔ سورۃ الممتحنۃ: 9-8

لوگوں کے ہاتھ میں آگئی جن کا مقصد خدا کی زمین پر خدا کی عظمت کا جھنڈا لہرانا نہ تھا بلکہ انہوں نے شان و شوکت کی زندگی گزارنے اور دوسروں پر اپنی بڑائی کا رعب جمانے کو ہی اپنی زندگی کا مقصد بنالیا، جو بیت المال کو قوم کی امانت نہیں بلکہ اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے تھے، جن کو شمشیر و سناں سے زیادہ طاؤس و رباب مرغوب تھے، جن کے دربار میں اصحاب علم و فن نہیں بلکہ مطرب اور مغنی اعلیٰ مقام پاتے تھے، جن کے نزدیک اہل الرائے اور مخلص افرادِ ملت کی نہیں بلکہ چاپلوسوں کی قدر و قیمت زیادہ تھی، جب ملت کی زمام اقتدار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آئی تو وہی ہوا جو ایسے حالات میں ہوتا ہے۔

خالق کائنات کا قانون سب قوموں کے لئے ایک ہے۔ اس نے مسلمانوں کو کبھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی اجازت نہیں دی کہ وہ جو چاہیں کرتے رہیں، رفعتیں اور بلندیاں صرف انہی کو حاصل ہونگی۔ نہیں، بلکہ خالق کائنات کا قانون ہے کہ جو قومیں بے عمل اور بد عمل ہوتی ہیں مکافات عمل کا خدائی قانون انہیں اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور ان کی زبوں حالی دوسری قوموں کے لئے درس عبرت بن جاتی ہے۔

ملت اسلامیہ کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ جب خلافت بغداد کمزور ہو گئی تو شر پسند عناصر کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ قسمت آزما لوگوں نے عظمت ملت کے کھنڈرات پر اپنے ذاتی اقتدار کی عمارتیں تعمیر کرنا شروع کر دیں۔ دربار خلافت مختلف عناصر کی باہمی چپقلش کی آماجگاہ بن گیا۔ تشتت پسند عناصر نے ملت کو فرقہ واریت کی بھٹی میں جھونک دیا اور سلطنت اسلامیہ کئی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی۔

گیارہویں صدی عیسوی میں ملت اسلامیہ سیاسی، اقتصادی اور نظریاتی ابتری کا شکار تھی۔ دو مستقل خلافتیں قائم تھیں۔ ایک بغداد میں اور دوسری قاہرہ میں۔ یہ دونوں خلافتیں ایک دوسری کے ساتھ برسرپیکار تھیں۔ ان کے سیاسی اور نظریاتی اختلافات میں مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی گردنیں مسلسل کٹ رہی تھیں۔ ان کے داخلی حالات اور بھی ابتر تھے۔ خلفاء اپنے درباری سرداروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے اور سردار، خلفا پر اپنے اثرات کو بڑھانے اور اپنے مدمقابل سرداروں کو نیچا دکھانے کی کوششوں بلکہ سازشوں میں مصروف تھے۔

مختلف عناصر نے مختلف اسلامی علاقوں میں اپنی اپنی آزاد اور خود مختار ریاستیں قائم کر لی

تھیں اور یہ ریاستیں بھی مسلسل باہم برسرپیکار تھیں۔ یہ ریاستیں ایک دوسرے کے خلاف عیسائیوں سے مدد لینے سے بھی دریغ نہیں کرتی تھیں۔

ادھر جنوبی یورپ میں بھی مسلمانوں کی قوت کمزور پڑگئی تھی۔ سسلی کا جزیرہ ان کے ہاتھوں سے نکل گیا تھا۔ سپین میں بھی ملت اسلامیہ کا شیرازہ منتشر ہو رہا تھا۔ ان کی متحدہ قوت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم ہو گئی تھی۔ یہ ریاستیں آپس میں نہ صرف دست و گریباں تھیں بلکہ ایک دوسری کے خلاف عیسائیوں سے مل جانے سے بھی دریغ نہیں کرتی تھیں۔ ان حالات میں اندلس کے مسلمانوں کی قوت روز بروز کمزور پڑتی جا رہی تھی اور عیسائیوں کی قوت بڑھتی جاتی تھی۔

عیسائیوں کی متعدد حکومتیں قائم ہو گئی تھیں۔ مشرقی سپین کی عیسائی حکومت اتنی طاقتور ہو گئی تھی کہ اس کا فرمانروا الفانسو دوم اسلامی حکومتوں سے خراج وصول کرتا تھا۔ عیسائی دنیا کو یقین ہو گیا تھا کہ اسپین سے مسلمانوں کے خاتمہ کا وقت قریب آگیا ہے۔ (1)

مسلمانوں کی اس زبوں حالی اور کمزوری سے عیسائیوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور انہوں نے مسلمانوں کے علاقوں میں اپنا اثر و نفوذ بڑھانے بلکہ ان علاقوں پر ایک مرتبہ پھر عیسائیت کا پرچم لہرانے کے لئے کارروائیاں تیز کر دیں۔

شام اور فلسطین میں عیسائیوں کی کثیر تعداد مستقل طور پر آباد تھی اور یورپ بھر سے بھی عیسائی زائرین مقامات مقدسہ کی زیارت کے لئے مسلسل فلسطین آتے رہتے تھے۔ یہ زائرین کس قسم کے لوگ ہوتے تھے، اس کے متعلق لیبان یوں رقمطراز ہے۔

"قسطنطین کے وقت سے اور علی الخصوص اس زمانہ سے جب ہارون رشید اور شارلیمین کے مابین سلام و پیام ہوا، عیسائیوں کی زیارت فلسطین جاری رہی اور روز بروز بڑھتی گئی۔ ان زائرین کے بعض گروہ تو فی الواقع ایک فوج کی حیثیت رکھتے تھے۔ ایک قسیس رچرڈ اپنے ساتھ سات سو آدمی لے گیا جو وہاں تک نہ پہنچ سکے اور سائپرس واپس آئے۔ 1024ء میں شیر فرائے مینانس کا بطریق اور چار بطریق اور، اپنے ساتھ سات ہزار زائرین کا گروہ لے گئے۔ ان میں بہت سے سردار اور امراء تھے جو بدویوں اور ترکمانوں سے لڑتے بھی تھے۔ بیت

1۔ معین الدین احمد ندوی، "تاریخ اسلام انجیریں"، ناشران قرآن لاہور، صفحہ 488

المقدس کی زیارت اس قدر مشکل اور پر خطر ہو گئی کہ پادریوں نے مجرموں کے لئے اسے سزا قرار دیا تھا۔ اس زمانے میں بڑے بڑے مجرم بہت ہی کثرت سے تھے اور چونکہ دوزخ کی آگ کا خوف شدت سے تھا اس لئے زائرین کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ یہ استثنائے چند راسخ الاعتقاد اشخاص کے بیت المقدس کے اکثر زائرین اس قسم کے بدمعاش ہوتے تھے جن کی فطرت میں ہر قسم کی شرارت بھری ہوئی تھی اور جنہیں محض دوزخ کی آگ میں جلنے کا خوف اتنی دور لے جاتا تھا۔" (1)

یہ ایسے حالات تھے جن میں ملت اسلامیہ کا مستقبل انتہائی مخدوش نظر آتا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ملت عیسوی کے اقبال کا آفتاب طلوع ہونے کے قریب ہے۔ لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ اسے یہ منظور نہ تھا کہ تثلیث پرستوں کے ہاتھوں دین توحید کی رسوائی ہو۔ اس نے اپنے دین کی حفاظت کا مقدس فریضہ ان لوگوں سے واپس لے لیا جنہوں نے اپنے آپ کو اس عظیم ذمہ داری کے لئے نااہل ثابت کر دیا تھا اور اس نے یہ ذمہ داری اپنے کچھ اور خوش نصیب بندوں کو سونپ دی۔

اسی زمانے میں ایشیائے کوچک سے ترکان آل سلجوق اٹھے۔ انہوں نے خلفائے عباسیہ کو دوسرے سرداروں کے تسلط سے آزاد کرا کے اپنے تسلط میں لیا، شام و فلسطین کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ختم کر کے اپنی سلطنت میں شامل کیا اور اس طرح مسلمانوں کی منتشر قوت کی شیرازہ بندی کی۔

سلجوقیوں کی طاقت میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا اور انہوں نے ایشیائے کوچک کے بہت سے علاقے فتح کر لئے۔ انہوں نے جو علاقے فتح کئے تھے گو وہ براہ راست بیزنطینی سلطنت کا حصہ تو نہ تھے البتہ وہ علاقے ایک تو بیزنطینی سلطنت کے ہمسائے تھے دوسرا ان ریاستوں کے اکثر حکمران بیزنطینی سلطنت کے باجگزار تھے۔ اس لئے بیزنطینی ان علاقوں میں مسلمانوں کی فتح پر خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ قیصر ارمانوس دیوجانس 1071ء / 464ھ میں سلجوقی سلطان الپ ارسلان کی فتوحات کو روکنے کے لئے تین لاکھ کا لشکر جرار لے کر میدان میں آیا۔ منازکرد کے میدان میں دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ سلجوقی تعداد کی

1۔ معین الدین احمد ندوی، "تاریخ اسلام اخیرین" صفحہ 490، بحوالہ تمدن عرب اردو ترجمہ، صفحہ 293

قلت کے باوجود بڑی بے جگری سے لڑے اور قیصر کی فوجوں کو عبرت ناک شکست سے دوچار کیا۔ قیصر ارمانوس مسلمانوں کے ہاتھوں قید ہوا۔(1) یہ پہلا بیز نطینی شہنشاہ تھا جس کو مسلمانوں نے قیدی بنایا تھا۔ اس ذلت آمیز شکست نے بیز نطینی حکومت کا وقار خاک میں ملا دیا۔ الپ ارسلان نے قیصر کو زر فدیہ لے کر چھوڑ دیا اور اس کو بڑے احترام سے رخصت کیا۔(2) اس شاندار فتح کے بعد سلجوقی مسلمانوں کا ایشیائے کوچک، شام اور جزیرہ پر مکمل تسلط قائم ہو گیا۔(3)

مسلمانوں کے ہاتھوں اس عبرت ناک شکست کے بعد بیز نطینیوں نے پاپائے روم سے اپنے صدیوں پرانے اختلافات کو فراموش کر دیا اور مسلمانوں سے اپنے علاقے بازیاب کرانے کے لئے پاپائے روم سے مدد کی درخواست کر دی۔(4)

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ مغربی یورپ سے عیسائی زائرین مقامات مقدسہ کی زیارت کے لئے فلسطین آتے تھے۔ ان میں اکثریت جرائم پیشہ افراد کی ہوتی تھی جن کو پادری گناہ بخشوانے کے لئے ارض مقدس کی زیارت کرنے کا حکم دیتے تھے۔

یہ عیسائی زائرین مسلم علاقوں میں آزادانہ داخل ہوتے اور ملکی قوانین کو پس پشت ڈال کر من مانیاں کرتے۔ ان لوگوں کی ان کارروائیوں سے مسلمانوں کے علاقوں میں امن و امان کے بے شمار مسائل پیدا ہوتے۔ جب تک مسلمان کمزور تھے وہ ان یورپی زائرین سے تعرض نہ کرتے تھے۔ لیکن جب ان علاقوں پر سلجوقی ترکوں کا غلبہ ہوا تو ان کے لئے عیسائیوں کی اس بے لگامی کو برداشت کرنا ممکن نہ تھا۔ انہوں نے عیسائی زائرین کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ ملکی قوانین کا احترام کریں اور راستے کی آبادیوں سے تعرض نہ کریں۔

قانون کی پابندی ان لوگوں کو اپنی آزادی پر حملہ نظر آئی۔ ان پابندیوں کے نتیجے میں مغربی یورپ میں مسلمانوں کے خلاف نفرت و عداوت کی آگ بھڑک اٹھی اور مقامات مقدسہ اور ان تک پہنچنے کے راستوں کو مسلمانوں کے تسلط سے آزاد کرانا دینی فریضہ قرار پایا۔(5)

اسی زمانے میں ایک اور واقعہ پیش آیا جس نے معرکہ ہلال و صلیب کا رخ بدل دیا۔ جس

1۔ تاریخ الحروب الصلیبیہ، صفحہ 39، نیز "تاریخ اسلام اخیرین"، صفحہ 448
2۔ ایضاً، صفحہ 499
3۔ تاریخ الحروب الصلیبیہ، صفحہ 39
4۔ ایضاً۔ 5۔ "صلیبی جنگیں" اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد 12، صفحہ 210

زمانے میں سپین کے مسلمان باہمی انتشار کی وجہ سے کمزور ہو چکے تھے، ان کی وحدت پارہ پارہ ہو چکی تھی، مملکت کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ چکی تھی، یہ ریاستیں ایک دوسری سے برسرِ پیکار تھیں اور عیسائی قوتیں سیلاب بن کر ان کو بہالے جانے کے لئے تیار تھیں، اسی زمانے میں شمالی افریقہ میں پاسبان حرم کی ایک نئی جماعت اٹھ کھڑی ہوئی۔ یہ لوگ مرابطین کے نام سے مشہور ہیں۔ یوسف بن تاشفین اسی سلسلے کا عظیم مجاہد ہے جس کی جرات، شجاعت اور تدبر نے سپین میں مسلمانوں کے زوال پذیر اقتدار کو سہارا دیا اور سپین میں مزید کئی صدیوں تک مسلمانوں کی عظمت کے جھنڈے لہراتے رہے۔

جب سپین میں مسلمانوں کا اقتدار خطرے میں نظر آیا تو اشبیلیہ کے حکمران معتمد بن عباد نے مرابطی سلطان یوسف بن تاشفین سے مدد طلب کرنے کا فیصلہ کیا۔ معتمد کا شمار پانچویں صدی ہجری کی عظیم شخصیات میں ہوتا ہے۔ وہ ایک عظیم سیاستدان، کامیاب منتظم اور ایک بہادر جنگجو ہونے کے علاوہ ایک عظیم ادیب اور شاعر بھی تھا۔ (1)

معتمد نے یوسف بن تاشفین سے اندلس کی سرزمین پر مسلمانوں کی زبوں حالی کا مداوا کرنے کی درخواست کی۔ یوسف بن تاشفین کو اس وقت کئی داخلی مسائل درپیش تھے۔ سپین جانے کی صورت میں اسے مراکش میں اقتدار سے محروم ہونے کا خوف بھی تھا لیکن اس کے سینے میں ایک مسلمان مجاہد کا دل دھڑکتا تھا۔ اس نے مشکل ترین حالات میں جس جذبے کے ساتھ سپین کے مسلمانوں کی امداد کے لئے جانے کا فیصلہ کیا اس کا صحیح اندازہ اس گفتگو سے ہو سکتا ہے جو سپین روانہ ہونے سے پہلے، اس کی اپنے بیٹے کے ساتھ ہوئی۔ اس کے بیٹے نے کہا: کیا آپ اندلس جاتے ہوئے ہمارے اس اندلس (مراکش) کو ان لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑے جا رہے ہیں جو ہم سے حکومت چھین کر ہمیں تباہ و برباد کر دیں گے؟ یوسف بن تاشفین نے اپنے لخت جگر کی یہ بات سن کر یہ تاریخی جملے کہے: میرے بچے! خدا کی قسم لوگ میرے متعلق کسی کی زبان سے یہ بات نہیں سنیں گے کہ میں نے اندلس کو دوبارہ دارالکفر بننے دیا، اور نہ یہ سنیں گے کہ میں نے اندلس کو عیسائیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ اسلام کے منبروں سے مجھ پر بھی وہی لعنتیں برسیں جو دوسروں پر برس رہی ہیں۔ خدا کی قسم اونٹوں کے خطرے کو برداشت کرنا میرے لئے

1- تاریخ الحروب الصلیبیہ، صفحہ 46

خنزیروں کے خطرے کو برداشت کرنے سے بہتر ہے۔ (1)

یوسف بن تاشفین نے معتمد بن عباد کی دعوت کو وقت کی پکار سمجھا اور 479ھ میں پچیس ہزار کا لشکر لے کر اندلس پہنچ گیا۔ اشبیلیہ میں معتمد نے اس کا استقبال کیا۔ مختلف ریاستوں کے مسلمان بادشاہ بھی اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ اس طرح اسلامی لشکر کی کل تعداد پچاس ہزار ہو گئی۔ (2)

یوسف بن تاشفین نے قشتالہ کے عیسائی بادشاہ الفانسو ششم کو لکھا کہ وہ یا تو اسلام قبول کرلے یا جزیہ ادا کرے اور یا پھر جنگ کے لئے تیار ہو جائے۔ الفانسو نے جنگ کی دعوت قبول کی اور صلیب کے جھنڈے کے نیچے ایک عظیم لشکر لے کر زلاقہ کے میدان میں پہنچ گیا۔ اس لشکر میں یورپ کے ہر حصے سے جنگجو شامل تھے اور انہیں پوپ کی تائید حاصل تھی۔ دونوں فوجوں کے درمیان گھمسان کی جنگ ہوئی اور اس جنگ کا نتیجہ مسلمانوں کی شاندار فتح کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس جنگ میں عیسائیوں کے چالیس ہزار کے قریب جنگجو کام آئے اور خود الفانسو شدید زخمی ہوا۔ اس شکست نے عیسائیوں کی آرزوؤں کا تاج محل زمین بوس کر دیا اور سپین میں مسلمانوں کے اقتدار کو حیات نو مل گئی۔

یہ بات خصوصی طور پر ذہن میں رکھنے کے قابل ہے کہ زلاقہ کا معرکہ ایشیائے کوچک میں مناز کرد کے معرکہ کے صرف چھ ماہ بعد پیش آیا تھا جس میں قیصر قسطنطنیہ کو سلجوقیوں کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ (3)

زلاقہ اور مناز کرد کی ہزیمتیں اور بیت المقدس کے زائرین پر لگائی جانے والی پابندیاں ایسے واقعات تھے جنہوں نے یورپ میں آتش انتقام بھڑکا دی۔

مناز کرد میں عیسائیوں کی شکست پر بھی بیز نطینیوں نے پوپ سے امداد کی درخواست کی تھی لیکن اہل یورپ نے اپنے داخلی مناقشات کی وجہ سے اس دعوت کو قبول کرنے میں کچھ تاخیر کر دی تھی لیکن زلاقہ کی شکست کے بعد ان کیلئے چین سے بیٹھنا ممکن نہ رہا۔

مذہبی راہنماؤں نے عیسائیوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے کو اپنا مذہبی فریضہ سمجھا۔ انہوں نے ارض مقدس کو مسلمانوں کے غلبے سے آزاد کرانے کو پوری ملت مسیحی کا اجتماعی فریضہ قرار دیا۔

1۔ الحروب الصلیبیہ، صفحہ 46
2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، صفحہ 47

ان مبشرین میں سے جس مبشر کی ان تھک کوششیں پہلی صلیبی جنگ کا راستہ ہموار کرنے میں سب سے زیادہ نمایاں ہیں وہ پطرس ناسک کے نام سے مشہور ہے۔ اس شخص نے اہل یورپ کے جذبات کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے کے لئے جو کوششیں کیں ان کا خلاصہ معین الدین ندوی صاحب نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"اتفاق سے اسی زمانہ میں فرانس کا پیٹر نامی ایک راہب بیت المقدس کی زیارت کو گیا۔ لیبان نے مخبوط الحواس اور متعصب کے لقب سے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ بیت المقدس کو مسلمانوں کے ہاتھ میں دیکھ کر بہت رنجیدہ خاطر ہوا۔ یہاں کے بطریق سمعان نے مدفن مسیح پر مسلمانوں کے قبضہ اور عیسائیوں پر ان کے مظالم کی فرضی داستان سنا کر اس کے جذبات کو اور زیادہ بھڑکایا اور وہ بیت المقدس کو مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھڑانے پر آمادہ ہو گیا۔ یہاں سے واپسی پر وہ سیدھا روم پہنچا اور پاپائے روم اربن دوم سے مل کر ساری داستان سنائی۔ مسلمانوں کے خلاف اعلان جنگ کے سیاسی اسباب پہلے سے موجود تھے۔ پیٹر کی فریاد سے پوپ کو ایک مذہبی بہانہ ہاتھ آ گیا اور وہ اس مقدس کام میں مدد دینے کے لئے آمادہ ہو گیا اور پیٹر کو یورپ کی حکومتوں کے نام سفارشی خطوط دے کر عیسائی دنیا میں مقدس جہاد کی منادی پر مامور کیا۔ وہ پوپ کا اجازت نامہ لے کر سارے فرانس واٹلی میں روتا پیٹتا پھرا اور زائرین بیت المقدس پر مسلمانوں کے مظالم بیان کر کے ان کے خلاف سارے یورپ میں جوش پیدا کر دیا۔"(1)

جب ان کوششوں سے یورپ میں مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیل گئی اور ہر عیسائی مسلمانوں کے خلاف فیصلہ کن جنگ کے لئے بے تاب نظر آنے لگا تو پوپ اربن ثانی نے فرانس کے شہر کلیر مونٹ میں عیسائیوں کی ایک عظیم الشان کانفرنس منعقد کی۔ یہ اتنا بڑا اجتماع تھا کہ کلیر مونٹ کے کنیسہ کا وسیع و عریض صحن اپنی وسعت کے باوجود تنگ پڑ گیا۔

اس اجتماع میں دو سو پانچ کے قریب بشپ، تیرہ آرچ بشپ، کثیر تعداد میں امراء و شرفا اور ہزاروں کی تعداد میں کنیسہ کے پیروکار شریک ہوئے۔ اس عظیم اجتماع میں پوپ اربن ثانی سٹیج پر آیا اور اس نے ایسی خوفناک تقریر کی جس کی مثال کنیسہ کے پوپوں اور

1۔ تاریخ اسلام، اخیرین، صفحہ 491

سیاستدانوں کی تقریروں میں نہیں ملتی۔(1) اس نے اپنی تقریر میں عیسائیوں کو مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دی اور اس مقصد کے لئے اس نے انجیل کی ایک آیت کے غلط معنی بیان کیے۔ اس قسم کی معنی آفرینی قرونِ وسطی میں آئے دن ہوتی رہتی تھی۔ پوپ نے اس آیت کا مطلب یہ بیان کیا کہ اس وقت جو شخص اپنی صلیب نہ اٹھائے گا اور میرے ساتھ نہ چلے گا وہ میرا پیرو نہیں ہے۔(2)

پوپ نے اپنی تقریر میں صلیبی جنگوں کو خدا کی مشیت قرار دیا اور مغربی یورپ کو اسلامی مشرق پر ٹوٹ پڑنے کی تلقین کرتے ہوئے بتایا کہ اس مقدس جنگ سے بیت المقدس کی تسخیر کے علاوہ ایشیائی ممالک کی دولت و ثروت پر بھی مکمل قبضہ مقصود ہے۔ اس نے کہا: بیت المقدس کو بہانہ بناؤ اور سرزمین مقدس کو مسلمانوں سے چھین کر اس کے خود مالک بن جاؤ۔ یہ سرزمین تمہاری وراثت ہے اس سے ان کافروں (ملت اسلامیہ) کا کوئی واسطہ نہیں۔ اس مقدس سرزمین کے بارے میں تورات کا کہنا ہے کہ اس میں دودھ اور شہد کی نہریں جاری ہیں۔(3)

ادھر یورپ میں مسلمانوں کی تباہی کے نہ صرف مشورے ہو رہے تھے بلکہ ایک تباہ کن لشکر ترتیب پا رہا تھا اور ادھر مسلمان ایک بار پھر اپنی ان غلطیوں کو دہرانے میں مصروف تھے جن کی وجہ سے پہلے بھی انہوں نے سخت نقصان اٹھائے تھے۔

اسلامی مشرق وسطی کے اولوالعزم بادشاہ ملک شاہ سلجوقی کا انتقال ہو چکا تھا۔ سلجوقیوں کا اتحاد پارہ پارہ ہو چکا تھا، ان میں باہمی تنازعات شروع ہو چکے تھے اور اس بے اتفاقی نے مسلمانوں کو ایک بار پھر کمزور کر دیا تھا۔ 1095ء/ 489ھ میں شام و فلسطین کا مردِ آہن اور ملک شاہ کا بھائی سلطان تتش قتل ہو گیا تھا اور اس کے قتل کے بعد کوئی ایسا حکمران باقی نہیں رہ گیا تھا جو صلیبی یلغار کو روکنے کا دم خم رکھتا ہو۔(4)

جس طرح مشرق میں سلجوقیوں کی قوت کا شیرازہ بکھرنے سے مسلمانوں کی طاقت کمزور ہوئی تھی بعینہٖ وہی کچھ مغرب میں پیش آیا۔ جب یوسف بن تاشفین اندلس کے

1۔ تاریخ الحروب الصلیبیہ

2۔ تاریخ اسلام، اخیرین، صفحہ 492، بحوالہ تاریخ یورپ

3۔ صلیبی جنگیں، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد 12، صفحہ 211

4۔ ایضاً

مسلمان علاقوں کو عیسائیوں سے آزاد کرانے بلکہ یورپ میں اسلامی فتوحات کا نیا سلسلہ شروع کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا، اسی زمانے میں مغرب میں مہدی بن تومرت ظاہر ہوا جس نے تحریک موحدین کی بنیاد رکھی اور کئی خونریز جنگوں کے بعد مرابطین کی حکومت ختم کر کے موحدین کی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔(1)

مرابطین کے خاتمے اور سلاجقہ کے انتشار سے ملت اسلامیہ کمزور ہوئی۔ عیسائیوں کے لئے یہ موقعہ غنیمت تھا۔ پوپ اس بات سے اچھی طرح آگاہ تھا کہ اپنے اقتدار کو بحال کرنے اور اسلامی مشرق پر کاری ضرب لگانے کا ایسا موقع اسے پھر کبھی ہاتھ نہ آئے گا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنی تقریر کے ذریعے یورپ بھر میں جوش جنوں پھیلا دیا تھا۔

پوپ اربن ثانی کی یہ تقریر صلیبی جنگوں کا نقطہ آغاز تھا جن میں مسلمان اور عیسائی صدیوں ایک دوسرے کے خون سے ہاتھ رنگتے رہے۔

مغربی یورپ کے طول و عرض میں مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ لوگ اس جنگ کو نہ صرف گناہوں کی بخشش کا ذریعہ سمجھنے لگے تھے بلکہ اس مقدس جنگ کے نتیجہ میں انہیں اپنی کئی مادی آرزوؤں کی تکمیل بھی نظر آتی تھی۔ غرض مردوں، عورتوں اور بچوں کا ایک انبوہ کثیر ارض مقدس کی طرف روانگی کے لئے آمادہ ہو گیا۔ لیبان کے بیان کے مطابق ان مقدس مجاہدین کا یہ حال تھا:

"جنت ملنے کے علاوہ ہر شخص کو اس میں حصول مال کا بھی ایک ذریعہ نظر آتا تھا۔ کاشتکار جو زمین کے غلام (تھے) اور آزادی پر جان دیتے تھے، خاندانوں کی اولاد اصغر جو قانون وراثت کی رو سے محروم الارث تھی، امراء جنہیں آبائی جائداد کا حصہ کم ملا تھا اور جنہیں دولت کی خواہش تھی، راہب جو خانقاہی زندگی کی سختیوں سے عاجز آ گئے تھے، غرض کل مفلوک الحال اور ممنوع الارث اشخاص جن کی تعداد بہت تھی اس میں شریک تھے۔"(2)

دینی اور دنیوی نعمتوں کے لالچ میں لاکھوں انسانوں کا سمندر یورپ سے مشرق کی طرف روانہ ہوا۔ اس لشکر میں مرد بھی تھے، عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی۔ ان کی تعداد

1۔ تاریخ الحروب الصلیبیہ، جلد 1، صفحہ 48

2۔ تاریخ اسلام، اخیرین، صفحہ 492، بحوالہ تمدن عرب

تیرہ لاکھ تھی۔ یورپی انسانوں کا یہ انبوہ کثیر پیٹر راہب کی قیادت میں قسطنطنیہ روانہ ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پورا یورپ ایشیا پر چڑھ دوڑا ہے۔ راستہ میں جابجا ان مجاہدین کی آؤ بھگت ہوئی لیکن بلغاریہ والوں نے مفت سامان رسد دینے سے انکار کر دیا۔ ان کے انکار پر ان حامیان دین نے دیہاتوں کو لوٹنا اور ان کے باشندوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ بلغاریہ کے لوگ اس قسم کا سلوک برداشت کرنے کے عادی نہ تھے۔ انہوں نے صلیبیوں سے ان کی زیادتیوں کا پورا پورا بدلہ لیا۔ انہوں نے ان میں سے ہزاروں کو مار اور دریا میں غرق کر دیا۔ باقی بھاگ کر کسی طرح قسطنطنیہ پہنچے۔ یہاں مختلف ملکوں کے مجاہدین کے گروہ پہنچ چکے تھے۔ ان سب نے مل کر قتل و غارت اور طرح طرح کے مظالم شروع کر دیئے۔ قیصر الیکسس نے عاجز آکر انہیں باسفورس پار ایشیائے کوچک کی طرف ہانک دیا۔ یہاں ان کی وحشت و درندگی اور زیادہ بڑھ گئی اور انہوں نے بلا امتیاز مسلمان و عیسائی دونوں کے ساتھ وحشیانہ فعل شروع کر دیئے۔ ان کا محبوب مشغلہ یہ تھا کہ جو بچہ ان کے سامنے آجاتا اس کی تکابوٹی کر کے اسے آگ میں جلا دیتے۔ قلج ارسلان والی قونیہ نے ان سے ان کی وحشت کا پورا پورا انتقام لیا اور جانوروں کی طرح ان کو قتل کیا اور قریباً پوری فوج برباد ہو گئی۔ (1)

سطور بالا میں جن لوگوں کا ذکر ہوا ہے وہ باقاعدہ فوجی نہ تھے۔ وہ تو غیر منظم انسانوں کا ایک ہجوم تھا جنہیں پوپ اور دوسرے مذہبی راہنماؤں کی تقریروں اور وعدوں نے دیوانہ بنا دیا تھا۔ ان کا انجام وہی ہوا جو اس قسم کے ہجوم کا ہونا چاہئے لیکن صلیبی لشکر جو عالم اسلام کی تباہی و بربادی کا عزم لے کر اٹھا وہ صرف انہی لوگوں پر مشتمل نہ تھا بلکہ ان لوگوں کی روانگی کے بعد یورپ کی مختلف حکومتوں کی تربیت یافتہ فوجیں مختلف جنگ آزما کمانڈروں کی قیادت میں روانہ ہوئیں۔ ان کی تعداد دس لاکھ تھی۔ (2)

ان فوجوں کا ظاہری مقصد تو مقامات مقدسہ کو مسلمانوں کے غلبے سے آزاد کرانا تھا لیکن اس ظاہری مقصد کے پیچھے اور کئی مقاصد کارفرما تھے جنہوں نے ان متضاد اور متصادم عناصر کو ایک جھنڈے تلے جمع کر دیا تھا۔ آلیور تھیچر اس مقدس لشکر کے مقاصد بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"نصرانیوں کا یہ لشکر مختلف و متباین عناصر سے مرکب تھا۔ پاپا کا ارشاد ہو چکا تھا کہ جو لوگ اس

1۔ تاریخ اسلام، اکبر شاہ نجیب آبادی، صفحہ 493
2۔ ایضاً

راہ میں شہید ہوں گے، ان کے سب گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔ بہتوں نے اس ارشاد کے اعتماد پر خالص مذہبی جوش سے اس میں شرکت کی تھی۔ بہت سے ایسے لوگ اس میں شریک ہوگئے تھے جو ادائی قرض سے بچنا چاہتے تھے یا اپنے خاندانوں سے بھاگ آئے تھے۔ بہت سے مجرم تک اس میں شریک تھے اور جرائم کی سزا سے جان بچانا چاہتے تھے۔ بہت سے غلام اپنے آقاؤں کی سخت گیری سے تنگ آکر اس میں آملے تھے۔ بہت منچلے اس لئے شامل ہوگئے تھے کہ سیر وسیاحت اور معرکہ آرائی کا لطف آئے گا۔ یہ عام سپاہیوں کا حال تھا۔ سرداران فوج تمام تر اس غرض سے شریک ہوئے تھے کہ ان کے اقتدار میں اضافہ ہو اور مشرقیوں اور یونانیوں سے حاصل کیے ہوئے علاقوں پر مشرق میں اپنی آزاد حکومت قائم کریں۔ پوپ کا مقصد بیشک مقامات مقدسہ کا آزاد کرانا تھا مگر اس کے ساتھ ہی یہ غرض بھی پیش نظر تھی کہ مشرق میں ان کا مذہبی اقتدار قائم ہو جائے (مشرق کی عیسائی دنیا قسطنطنیہ کے مشرقی کلیسا کے ماتحت تھی جس کو روم کے کلیسا کے ساتھ ہمیشہ چشمک رہتی تھی۔) اٹلی کے جو شہری اس پہلے محاربے میں شریک ہوئے ان کی اصل غرض یہ تھی کہ اپنی تجارت کو پھیلائیں اور مشرقی سواحل پر اپنے خاص حقوق قائم کریں۔(1)

مختلف مقاصد رکھنے والا کئی عناصر پر مشتمل یہ لشکر بری اور بحری راستوں سے سوئے مشرق روانہ ہوا۔ یہ لوگ ایک ہی نعرے پر اور ایک ہی جھنڈے کے نیچے روانہ ہوئے تھے۔ اگر ان کا مقصد صرف ارض مقدس کو مسلمانوں سے آزاد کرانا ہوتا تو کم از کم اس مقصد کے حصول تک یقیناً متحد اور متفق رہتے لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ مشرق پہنچ کر انہوں نے جہاد کے اصل مقصد کو پس پشت ڈال دیا اور ان کے مابین اختلافات پیدا ہو گئے۔ قیصر قسطنطنیہ جس کی دعوت پر یہ لوگ ارض مشرق پر وارد ہوئے تھے، اس کے ساتھ بھی ان کے اختلافات شروع ہوگئے۔

قیصر سے ان کے اختلافات کا سبب یہ تھا کہ قیصر کا مطالبہ تھا کہ اس کے پرانے مقبوضات مسلمانوں سے واپس لینے کے بعد اسے ملنے چاہئیں لیکن صلیبی ان علاقوں کو آپس میں تقسیم کرنا چاہتے تھے۔(2) ان اختلافات نے کافی شدت اختیار کرلی لیکن صلیبیوں کی خوش قسمتی اور مسلمانوں کی انتہائی بدقسمتی تھی کہ اختلافات کی وبا صلیبیوں کی نسبت

1۔ "تاریخ اسلام اخیرین"، صفحہ 494، بحوالہ تاریخ یورپ از الیور تھیچر

2۔ ایضاً، صفحہ 495، بحوالہ تاریخ یورپ از اے۔ جے گرانٹ

مسلمانوں میں کہیں زیادہ تھی۔ سلجوقیوں میں اتفاق اور وحدت عمل مفقود تھی اور کئی غدار سلجوقی قائدین صلیبیوں کے معاون بھی بن گئے تھے۔(1)

اس صورت حال نے صلیبیوں کے حوصلے بڑھادیئے اور وہ علاقوں پر علاقے فتح کرتے گئے اور ان پر عیسائی ریاستیں قائم کرتے گئے۔ کئی مسلمانوں نے انفرادی طور پر بہادری سے ان کا مقابلہ کیا لیکن وحدت ملی کے بغیر اتنے بڑے سیلاب کو روکنا ان کے لئے ممکن نہ تھا۔ عیسائیوں نے متعدد علاقے مسلمانوں سے چھین لئے اور آخر کار 492ھ /1099ء میں عیسائیوں نے مسلمانوں سے بیت المقدس بھی چھین لیا۔(2)

پہلے صلیبی حملے کے نتیجے میں شام اور فلسطین کے علاقے میں چار آزاد عیسائی ریاستیں قائم ہوئیں: بیت المقدس، انطاکیہ، طرابلس اور الرہا۔(3)

صلیبیوں نے طاقت کے نشے میں مفتوحین کے ساتھ جو سلوک کیا قارئین کرام اس کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیں: صلیبی فوجوں نے معرۃ النعمان میں جس درندگی کا مظاہرہ کیا اس کے متعلق معین الدین ندوی نے تاریخ یورپ اور ابن اثیر کے حوالہ سے لکھا ہے:

"صلیبی فوجیں معرۃ النعمان کو فتح کر کے تین دن تک قتل عام کرتی رہیں اور ایک لاکھ سے زائد مسلمان قتل اور اسی قدر زندہ گرفتار کیے گئے۔"(4)

صلیبیوں نے جس درندگی کا مظاہرہ معرۃ النعمان میں کیا تھا انہوں نے اسی درندگی کا مظاہرہ انطاکیہ کو فتح کرنے کے وقت بھی کیا۔ انہوں نے انطاکیہ کو فتح کیا اور پوری مسلمان آبادی کو تہ تیغ کر دیا اور ان کے مکانات مسمار کر دیئے۔(5)

بیت المقدس کو فتح کرنے کے بعد صلیبیوں نے جس بہیمیت کا مظاہرہ کیا اس کے متعلق فرانسیسی مورخ میشو لکھتا ہے:

"بیت المقدس کی فتح میں صلیبیوں نے ایسے اندھے تعصب کا ثبوت دیا ہے جس کی مثال گزشتہ تاریخ میں نہیں ملتی۔ عربوں کو زبردستی اونچے برجوں اور بلند مکانوں کی چھت سے گرا دیتے تھے۔ آگ میں زندہ جلا دیتے تھے۔ گھروں سے

1۔ "مقالہ، صلیبی جنگیں"، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد 12، صفحہ 211
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً
4۔ "تاریخ اسلام"، اخیرین، صفحہ 497
5۔ ایضاً، صفحہ 496

نکال کر میدانوں میں جانوروں کی طرح گھسیٹتے تھے۔ مسلمانوں کی لاشوں پر لے جا کر مسلمانوں کو قتل کرتے تھے۔ کئی ہفتوں تک قتل عام کرتے رہے۔ مشرق و مغرب کے بیان کے مطابق انہوں نے ستر ہزار سے زیادہ مسلمان تہ تیغ کئے (یہ تعداد صرف مسجد اقصیٰ کے مقتول مسلمانوں کی ہے۔) بہت سے یہودیوں نے مذبح میں پناہ لی۔ صلیبیوں نے آگ لگا کر مع مذبح کے ان کو جلا دیا۔" (1)

لیبان نے جنگ صلیبی کے مشہور مجاہد اور عینی شاہد رابرٹ کے حوالہ سے لکھا ہے:

"ہمارے لوگ (صلیبی) مکانوں کی چھت پر دوڑ رہے تھے اور مثل اس شیرنی کے جس کے بچے چھین لئے گئے ہوں، قتل عام کے مزے لے رہے تھے۔ یہ بچوں کے ٹکڑے کر رہے تھے اور جوان و پیر فرتوت دونوں کو برابر قتل کر رہے تھے۔ یہ کسی متنفس کو کبھی نہ چھوڑتے اور جلد فراغت حاصل کرنے کی غرض سے ایک ہی رسی میں کئی کئی آدمیوں کو لٹکا دیتے ------- بالآخر بوہمینڈ نے ان سب کو جنہیں اس نے قصر کے صحن میں جمع کیا تھا سامنے بلایا اور بلا امتیاز بڈھے، عورت اور مرد اور معذور و بے کار اشخاص سب کو قتل کیا اور جو جوان اور مضبوط تھے انہیں فروخت کرانے کے لئے انطاکیہ بھجوا دیا۔

عینی شاہدوں کی رپورٹ لکھنے کے بعد لیبان اس پر ان الفاظ میں تبصرہ کرتا ہے:

"ہم خیال کر سکتے ہیں کہ اقوام مشرق جو اس وقت اس قدر مہذب تھیں، ایسے غنیم کی بابت کیا خیال کرتی تھیں۔ ان کی تاریخیں بھی نفرت سے بھری ہوئی ہیں اور سعدی شیرازی نے ان ہی کی نسبت کہا ہے کہ انہیں آدمی کہنا انسانیت کی عار ہے۔ ان کا برتاؤ اس مقدس شہر کے باشندوں کے ساتھ کیا تھا، بالکل مختلف تھا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کئی صدیاں پیشتر عیسائیوں کے ساتھ کیا تھا۔" (2)

ولیم صوری جو صور کا آرچ بشپ تھا لکھتا ہے:

"یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی مقتولین کی اس کثیر تعداد کو دیکھتا اور اس پر خوف طاری نہ ہوتا۔ انسانی جسموں کے کٹے ہوئے اجزاء ہر طرف بکھرے پڑے تھے۔ زمین مقتولین کے خون میں ڈوبی ہوئی تھی۔ صرف بے سروں کے لاشے اور جا بجا

1۔ "تاریخ اسلام"، اخیرین، صفحہ 98-497، بحوالہ خطط الشام

2۔ ایضاً، صفحہ 99-498، بحوالہ تمدن عرب

بکھرے ہوئے انسانی اعضا کا منظر ہی خوفناک نہ تھا بلکہ فاتحین کی ہیبت کذائی کا منظر اس سے بھی زیادہ خوفناک تھا۔ وہ سر سے لے کر پاؤں تک خون میں لت پت تھے۔"

ولیم صوری اس قتل و غارت کا جواز ان الفاظ میں پیش کرتا ہے:

"یہ اللہ تعالیٰ کا وہ صحیح فیصلہ تھا جو اس نے ان لوگوں کے خلاف کیا جنھوں نے حرم مسیح کو فضول رسوم سے ملوث کر دیا تھا اور مومنین (مسیحیوں) کے لئے اسے ایک اجنبی مقام بنا دیا تھا۔ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ تھا کہ وہ اپنے گناہوں کا کفارہ موت کی صورت میں ادا کریں اور سر زمین مقدس کو اپنا خون بہا کر پاک کریں۔"(1)

صلیبیوں کے فتح بیت المقدس کے حالات ذرا تفصیل سے اس لئے لکھے گئے ہیں تا کہ قارئین عیسائیوں کی رحم دلی اور انسانی ہمدردی کے دعوؤں کی حقیقت سے آگاہ ہو سکیں۔

بیت المقدس کو اس سے پہلے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی مسلمانوں نے فتح کیا تھا اور عیسائیوں کی اس سفاکی کے نوے سال بعد بھی سلطان صلاح الدین ایوبی نے اس مقدس شہر پر دوبارہ اسلامی پرچم لہرا دیا تھا (جس کی تفصیل قارئین تھوڑی دیر بعد ملاحظہ فرمائیں گے) لیکن ان دونوں مواقع پر مسلمانوں نے جس رحم دلی، انسانی ہمدردی، امن پسندی، عفو و در گزر اور عالی ظرفی کا ثبوت دیا تھا، اس کو عیسائیوں کی تاریخ میں تلاش کرنے کی کوشش کرنا عبث ہے۔

یہ انسانیت کے ساتھ کتنا بڑا مزاح اور تاریخ کے ساتھ کتنا بڑا ظلم ہے کہ ان تاریخی شواہد کے باوجود، جن کو اپنے پرائے سب تسلیم کرتے ہیں، مسلمانوں کے اکابر کو ڈاکو، لٹیرے، انسانیت کے دشمن، امن و امان کے ویری، دہشت گرد اور غیر مہذب ثابت کیا جاتا ہے اور جن لوگوں کے ہاتھ لاکھوں بے گناہ انسانوں کے خون سے رنگین ہیں، جن کی سفاکی کو بیت المقدس کی پاک سر زمین کا تقدس بھی نہیں روک سکا، وہ حرمل، انسانیت کے غم خوار اور امن کے ٹھیکیدار تصور کئے جاتے ہیں۔

صلیبیوں کے بیت المقدس پر قبضہ کر لینے کے بعد بھی جنگ ختم نہیں ہوئی بلکہ

1۔ "تاریخ الحروب الصلیبیہ"، جلد 1، صفحہ 436

صلیبیوں نے مسلمانوں کی کمزوریوں سے خوب فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے مسلمانوں سے ان کے علاقے چھیننے شروع کر دیے اور چند شہروں کو چھوڑ کر شام کے اکثر حصے پر صلیبیوں کا تسلط قائم ہو گیا۔

صلیبی جس شہر پر حملہ کرتے وہاں بہیمیت کی اسی تاریخ کو دہراتے جو انہوں نے بیت المقدس میں مسلمانوں کے خون سے رقم کی تھی۔ کچھ مسلمان ان کا مقابلہ کرتے اور کبھی کبھی کسی معرکے میں ان کو فتح بھی حاصل ہو جاتی لیکن مجموعی طور پر صلیبیوں ہی کا پلہ بھاری تھا۔ ان کی مشرق میں اپنی کئی ریاستیں قائم تھیں۔ بیزنطینی سلطنت ان کی معاون تھی۔ مغربی یورپ سے ان کو مسلسل کمک پہنچتی رہتی تھی۔ اس لئے مسلمانوں کے مقابلے میں ان کا پلہ بہت بھاری تھا۔

اگر یہ صورت حال جاری رہتی تو صلیبی بہت جلد ان علاقوں پر بھی قبضہ کر لیتے جو مسلمانوں کے پاس باقی بچ گئے تھے لیکن بیت المقدس کی صلیبیوں کے ہاتھوں بے حرمتی، لاکھوں مسلمانوں کے سفاکانہ قتل اور حاملان صلیب کے ہاتھوں توحید پرستوں کی مسلسل تذلیل نے مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں۔

ان کے حکمرانوں کی اکثریت تو اب بھی اسی بے حسی کا شکار تھی جس نے امت مسلمہ کو یہ ایام بد دکھائے تھے، ان کی نظر تو اب بھی محض اپنے ذاتی اقتدار کے قیام اور اسے وسعت دینے پر تھی، وہ تو اب بھی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے لیکن مسلمان عوام کی سوچ میں انقلاب آچکا تھا۔ وہ اس صورت حال کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اب نااہل اور خود غرض حکمرانوں کے لئے ان کے دل نفرت سے معمور ہو چکے تھے۔ ان کے ہاتھ بارگاہ خداوندی میں دعا کے لئے اٹھتے اور کسی راہبر فرزانہ کا سوال کرتے۔ انہوں نے اپنے حکمرانوں کو بار بار جھنجھوڑنے کی کوشش کی تھی۔ وہ بغداد کے عباسی خلفاء کو وقت کے تقاضوں کے مطابق اپنے رویوں کو تبدیل کرنے اور اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرنے پر مجبور کرتے رہتے تھے۔

جب کوئی قوم اپنے قومی جرائم پر ندامت کا اظہار کر کے اپنی گزشتہ کوتاہیوں کا کفارہ ادا کرنے کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو جاتی ہے تو قدرت بھی اسے مایوس نہیں کرتی۔

ملت مسلمہ کی دعا ہائے نیم شبی کام آگئیں اور قدرت نے انہیں یکے بعد دیگرے عماد

الدین زنگی، نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی جیسے غیور اور جری راہنما عطا کئے جنہوں نے تاریخ کے دھارے کا رخ بدل دیا، ملت مسلمہ کو ایک نئے جذبے سے سرشار کیا اور ارض مقدس کو صلیبیوں کے تسلط سے آزاد کرالیا۔

عماد الدین زنگی نے 521ھ / 1127ء میں موصل کی زمام اقتدار اپنے ہاتھوں میں لی۔ یہ اعلیٰ پائے کا جنگجو، عظیم مدبر اور لاجواب منتظم تھا۔ اس میں وہ ساری قائدانہ صفات موجود تھیں جن کے حامل قائد کی اس وقت ملت اسلامیہ کو ضرورت تھی۔

امت نے جس عظیم ذمہ داری کا بوجھ اس کے کندھوں پر ڈالا تھا، اس نے اس فرض سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اپنی ساری صلاحیتیں وقف کر دیں۔ اس نے قوم کو متحد کیا۔ ملت کے مختلف عناصر میں تفرقے کی جو خلیج حائل ہو چکی تھی، اسے پاٹنے کی کوشش کی۔ اس نے ایک طرف ملت کو متحد کرنے اور دوسری طرف اپنی سرزمین سے صلیبیوں کے تسلط کو ختم کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ مختلف مقامات پر صلیبیوں کے ساتھ اس کی جھڑپیں جاری رہیں۔ اس نے صلیبیوں سے معرۃ النعمان، کفر طاب، بارین اور اثارب کے علاقے چھین لئے اور آخر کار عماد الدین زنگی نے صلیبیوں کو شکست فاش دے کر الرھا کی عیسائی ریاست کا خاتمہ کر دیا۔ (1)

الرھا کی ریاست صلیبیوں کے لئے انتہائی اہم تھی۔ اس کے سقوط پر وہ خاموش نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ مغربی یورپ میں ایک مرتبہ پھر غم وغصے کی لہر دوڑ گئی۔ پوپ اور دوسرے مذہبی راہنماؤں نے ایک مرتبہ پھر اسی انداز میں اہل یورپ کے جذبات کو بھڑکانے کی مہم چلائی جو پہلے صلیبی حملے کے لئے چلائی گئی تھی۔

پہلے صلیبی حملے کے لئے جو کردار پیٹر راہب نے ادا کیا تھا وہ کردار قدیس برنارڈ نے ادا کیا۔ پوپ یوجینیوس ثالث نے وہ خدمات سرانجام دینے کا عزم کیا جو خدمات پہلے صلیبی حملہ کے وقت اوربان ثانی نے انجام دی تھیں۔

اس نے 1146ء میں عیسائیوں کی ایک عظیم الشان کانفرنس منعقد کی اور اس اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے عیسائیوں کے مذہبی جذبات کو بھڑکایا۔ ان کے سینوں میں مسلمانوں کے خلاف تعصب کی جو آگ پہلے سے بھڑک رہی تھی اسے ہوا دی اور ملت عیسوی کو

1۔ "تاریخ الحروب الصلیبیہ"، صفحہ 54

مسلمانوں کے خلاف دوسرے صلیبی حملے کے لئے آمادہ کیا۔(1)

پوپ اور دوسرے عیسائی راہنماؤں کی چیخ و پکار پر دوسرے صلیبی حملے کے لئے ایک لشکر جرار ترتیب پایا۔ فرانس، جرمنی، برطانیہ اور دوسرے یورپی ممالک کے لشکر اپنے اپنے بادشاہوں اور کمانڈروں کی قیادت میں ارض مقدس کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ لشکر کئی لاکھ انسانوں پر مشتمل تھا۔

باہمی اختلاف کی وجہ سے انہوں نے مختلف راستے اختیار کئے۔ اس لشکر کو رومی سلجوقیوں کی طرف سے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ لشکر کے بیشمار لوگ سلجوقیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ کچھ گرمی اور پیاس کی وجہ سے جاں بحق ہوئے۔ جوان سختیوں سے بچ گئے وہ القدس پہنچ گئے۔ وہاں سب لشکر اکٹھے ہو گئے اور انہوں نے مل کر 1148ء میں دمشق کا محاصرہ کر لیا۔

نور الدین زنگی اور اس کا بھائی سیف الدین، والی موصل، اہل دمشق کی امداد کو پہنچ گئے اور صلیبی محاصرہ اٹھانے پر مجبور ہو گئے۔(2)

یہ حملہ بری طرح ناکام ہوا اور صلیبی مسلمانوں سے انتقام لینے اور ان سے الرھا کی ریاست کو آزاد کرانے کی حسرت اپنے سینوں میں چھپائے یورپ واپس چلے گئے۔(3)

الرھا میں صلیبیوں کی شکست کے بعد جب یورپ میں مسلمانوں کے خلاف انتقام کی آگ بھڑکائی جا رہی تھی، اسی زمانے میں عماد الدین زنگی کو قلعہ جعبر کے محاصرے کے دوران ایک غلام نے قتل کر دیا۔(4)

عماد الدین زنگی کا قتل ملت اسلامیہ کے لئے ایک بہت بڑا سانحہ تھا۔ اس مرد مجاہد نے ملت کے منتشر شیرازے کو یکجا کر کے اس میں از سر نو صلیبیوں سے مقابلہ کرنے کی جرات پیدا کی تھی۔ اس کے قتل نے ملت کو ایک عظیم راہنما سے محروم کر دیا تھا۔ لیکن قدرت نے ملت مسلمہ پر رحم فرمایا اور عماد الدین زنگی کے بیٹے نور الدین زنگی نے اس عظیم مقصد کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی جس مقصد کی خاطر اس کے باپ نے جان دی تھی۔

1۔ "تاریخ الحروب الصلیبیہ"، صفحہ 54

2۔ ایضاً، صفحہ 56

3۔ "مقالہ، صلیبی جنگیں" اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد 12، صفحہ 211

4۔ "تاریخ الحروب الصلیبیہ"، صفحہ 55

نور الدین زنگی اپنے عظیم باپ کی طرح بہادر، مخلص اور عالی ہمت تھا۔ اس کے علاوہ قدرت نے اسے زہد، تقویٰ اور حسن نیت کی دولت سے بھی حظ وافر عطا فرمایا تھا۔ اس نے ملت مسلمہ کو متحد کرنے کے لئے زبردست کوشش کی۔ اس نے شام، جزیرہ اور مصر کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو متحد کیا اور 1171ء میں مصر کی فاطمی خلافت کو ختم کر دیا۔

فاطمی خلفاء اپنی نااہلی کی وجہ سے ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کے راستے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔

اسلامی قوتوں کو متحد کرنے کے بعد نور الدین زنگی صلیبیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کے صلیبیوں کے ساتھ کئی معرکے ہوئے جن میں صلیبیوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ نور الدین صلیبیوں کے خلاف فیصلہ کن جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اس کو صلیبیوں کے خلاف فتح یاب ہونے اور بیت المقدس کو صلیبیوں کے قبضے سے چھڑا لینے کا اتنا پختہ یقین تھا کہ اس نے ایک منبر تیار کرنے کا حکم دیا جو بیت المقدس کی آزادی کے بعد مسجد اقصیٰ میں رکھا جائے گا اور آزادی کے بعد اس پر پہلا خطبہ جمعہ دیا جائے گا۔

نور الدین نے بیت المقدس کی آزادی کیلئے سخت تیاریاں کی تھیں اور ان تیاریوں کی وجہ سے اس کی کامیابی کے امکانات بھی روشن نظر آ رہے تھے لیکن اس کی حیات مستعار نے وفا نہ کی اور وہ 1174ء میں عالم بقا کو سدھار گیا۔

نور الدین زنگی کی وفات کے بعد معرکہ ہلال و صلیب میں اسلامی قوتوں کی قیادت کی سعادت صلاح الدین ایوبی کے حصے میں آئی۔ اس نے اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اپنی ساری صلاحیتیں وقف کر دیں۔ نور الدین زنگی نے جس طاقتور اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی تھی، اسے صلاح الدین ایوبی نے اور مضبوط کیا۔ فوج کی تربیت اور اسلحہ سازی پر خصوصی توجہ دی۔

مورخین لکھتے ہیں کہ صلاح الدین نے ایسی توسیں تیار کرائیں جو انتہائی ہلکی پھلکی تھیں۔ گھڑ سوار تیر انداز ان کے ذریعہ ہر سمت میں تیر پھینک سکتا تھا۔ یہ توسیں اتنی عمدہ تھیں کہ ان سے تیر انداز ایک منٹ میں دس تیر پھینک سکتا تھا اور ان سے چار سو میٹر کے فاصلے تک تیر پھینکے جا سکتے تھے۔(1)

1۔ "تاریخ الحروب الصلیبیہ"، صفحہ 61

عسکری تیاریوں کے ساتھ ساتھ صلاح الدین ایوبی نے عیسائی ریاستوں کے اندرونی حالات پر بھی نظر رکھی اور اس وقت کا انتظار کرتا رہا جو بیت المقدس کی آزادی کیلئے صلیبیوں سے فیصلہ کن پنجہ آزمائی کے لئے موزوں ہو۔

1187ء میں صلاح الدین ایوبی نے اعلان جہاد کیا۔ مسلمان فوجیں اس کے جھنڈے تلے جمع ہوئیں اور وہ صلیبیوں کے ساتھ فیصلہ کن جنگ کے لئے بیت المقدس کی طرف روانہ ہوا۔ حطین کے مقام پر ہلال اور صلیب کا فیصلہ کن معرکہ بپا ہوا جس میں صلاح الدین کی فوجوں کو شاندار فتح حاصل ہوئی اور صلیبیوں کو ایسی ذلت آمیز شکست ہوئی جس کا رنج انہیں صدیوں تڑپاتا رہا۔

حطین کی فتح کے بعد سلطان صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس کو صلیبیوں سے آزاد کرانے کا وہ تاریخی کارنامہ سرانجام دیا جس کی وجہ سے اس کا نام ہمیشہ کے لئے صفحات تاریخ میں زندہ ہے۔

سلطان کی فوجوں نے بیت المقدس کا محاصرہ کیا۔ عیسائیوں نے ابتدا میں بے جگری سے مسلمانوں کا مقابلہ کیا لیکن آخر کار ان کی ہمت نے جواب دے دیا۔ عیسائیوں میں جب مقابلے کی طاقت نہ رہی تو وہ جان و مال کی حفاظت کی شرط پر شہر حوالے کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ سلطان نے ان کی درخواست قبول کر لی اور شرط یہ قرار پائی کہ بیت المقدس کے تمام مسیحی فی مرد دس دینار، فی عورت پانچ دینار اور فی بچہ دو دینار فدیہ ادا کریں گے اور چالیس دن کے اندر جن کا فدیہ ادا نہ ہو گا وہ غلام شمار کئے جائیں گے۔ (1)

اس مقام پر ہم اہالیان بیت المقدس کے ساتھ سلطان صلاح الدین ایوبی کے سلوک کو اختصار سے بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں تا کہ قارئین اس سلوک کا موازنہ صلیبیوں کے اس سلوک سے کر سکیں جو نوے سال پہلے بیت المقدس کو فتح کرتے وقت، انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا تھا، اور ان دونوں فاتحین کے سلوک کو سامنے رکھ کر یہ فیصلہ کر سکیں کہ انسانیت دوست کون ہے اور نسل انسانی کا دشمن کون ہے؟ دہشت گرد کون ہے اور امن پسند کون؟ تنگ ظرف اور متعصب کون ہے اور عالی ظرف اور بردبار کون؟

لین پول لکھتا ہے:

1۔ "تاریخ اسلام"، اخترین، صفحہ 619

"صلاح الدین نے پہلے کبھی اپنے کو ایسا عالی ظرف اور باہمت ثابت نہیں کیا تھا جیسا کہ اس موقعہ پر کیا جب کہ یروشلم مسلمانوں کے حوالے کیا جارہا تھا۔ اس کی سپاہ اور معزز ذمہ دار افسروں نے جو اس کے ماتحت تھے، شہر کے گلی کوچوں میں انتظام قائم رکھا۔ یہ سپاہی ہر قسم کے ظلم وزیادتی کو روکتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ہرگز کوئی واقعہ جس میں کسی عیسائی کو گزند پہنچا ہو پیش نہیں آیا۔ شہر سے باہر جانے کے لئے کل راستوں پر سلطان کا پہرہ تھا۔ ایک نہایت معتبر امیر باب داؤد پر متعین تھا تا کہ ہر شہر والے کو جو زر فدیہ ادا کر چکا ہو شہر سے باہر جانے دے۔"(1)

"زر فدیہ کی ادائیگی بڑی احتیاط سے عمل میں آئی۔ ان غریب اور نادار صلیبیوں کی رہائی میں جو زر فدیہ ادا نہ کر سکتے تھے مسلمان امراء نے بھی حصہ لیا۔ امیر مظفر الدین کو کبری نے رہا کے ایک ہزار ارمنی عیسائیوں کا فدیہ اپنی جیب سے ادا کر کے انہیں آزاد کرالیا۔"(2)

لین پول کا بیان ہے کہ چالیس روز تک مفلس عیسائیوں کی رہائی کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ رعایت کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اس پر بھی ہزار ہا غریب اور مفلس عیسائی جنہیں بخیل اور کنجوس تاجروں اور مالدار عیسائی اداروں نے غلام بننے کے لئے چھوڑ دیا تھا، شہر میں رہ گئے۔ یروشلم کے تقدس مآب بطریق نے جو اخلاق اور ایمان دونوں سے عاری تھا، گرجاؤں کی دولت سمیٹی، سونے کے پیالے اور آب مطہر رکھنے کا سامان حتیٰ کہ مہد مسیح پر جو طلائی ظروف رکھے رہتے تھے ان کو بھی اپنے قبضے میں کیا اور اپنا ذاتی اندوختہ بھی محفوظ کرلیا۔ جمع کی ہوئی دولت اتنی زیادہ تھی کہ اگر وہ چاہتا تو بہت سے غریب عیسائیوں کا زر فدیہ دے کر ان کو آزاد کرا لیتا۔ مسلمان امیروں نے سلطان سے کہا اس بے ایمان اور نالائق پادری کو لوٹ کا تمام مال لے جانے سے روکا جائے۔ اس نے جواب دیا: میں قول دے چکا ہوں اس سے پھر نہیں سکتا۔ غرض اور لوگوں کی طرح یہ بڑا پادری کل دس ہزار اشرفیاں دے کر آزاد ہو گیا اور اس کو ایک مسلمان بادشاہ نے اس بات کا سبق دیا کہ خیر وخیرات کے کیا معنی ہیں۔ ابن اثیر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان نے اس پادری اور رہا شدہ عیسائیوں کو اپنے

1۔ "تاریخ اسلام"، اخبرین، صفحہ 620، بحوالہ صلاح الدین
2۔ ایضاً

آدمیوں کی حفاظت میں صور تک پہنچایا۔(1)

لین پول لکھتا ہے کہ دولت مند عیسائیوں کی خود غرضی کی وجہ سے غریب عیسائیوں کی ایک بڑی تعداد باقی رہ گئی۔ ان کی بے کسی دیکھ کر سلطان کے بھائی الملک العادل نے سلطان سے ایک ہزار عیسائیوں کو بطور غلام لے کر انہیں اپنی طرف سے آزاد کر دیا۔(2)

الملک العادل کے اس فعل کو دیکھ کر سلطان نے کہا کہ اے عادل! بالیان اور بطریق نے اپنی اپنی طرف سے خیرات کی اب میں اپنی طرف سے خیرات کرتا ہوں اور اس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ شہر میں عام منادی کر دیں کہ وہ تمام بوڑھے جو فدیہ ادا نہیں کر سکتے، آزاد کئے جاتے ہیں۔ انہیں اختیار ہے وہ جہاں چاہیں چلے جائیں۔ چنانچہ سورج نکلنے کے وقت سے لے کر سورج ڈوبنے تک برابر ان کی جماعتیں شہر سے نکلتی رہیں۔ یہ خیر خیرات تھی جو سلطان صلاح الدین نے بے شمار مفلسوں اور غریبوں کے ساتھ کی۔(3)

سلطان نے عیسائی عورتوں کو بھی انتہائی احترام سے رخصت کیا۔ اس کے پاس کچھ عورتوں نے اپنا حال زار بیان کیا جس سے متاثر ہو کر سلطان نے ان عورتوں میں سے جن کے شوہر زندہ تھے، ان کو رہا کر دیا اور جن کے شوہر قتل ہو چکے تھے ان کو ان کے مرتبہ کے مطابق روپیہ دے کر ان کی دلجوئی کی۔(4)

صلاح الدین کے صلیبیوں کے ساتھ حسن سلوک کے واقعات لکھنے کے بعد لین پول مندرجہ ذیل تبصرہ کرتا ہے:

"جب ہم سلطان کے ان احسانات پر غور کرتے ہیں تو وہ وحشیانہ حرکتیں یاد آتی ہیں جو صلیبیوں نے فتح بیت المقدس کے وقت کی تھیں۔ جب گاڈ فرے اور تنکر ویروشلم کے بازار سے گزرے تو وہاں مسلمانوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں اور جان بلب زخمی لوٹتے تھے، جب کہ صلیبیوں نے بے گناہ اور لاچار مسلمانوں کو سخت اذیتیں دیکر مارا تھا اور زندہ آدمیوں کو جلا دیا تھا اور جب قدس کی چھتوں پر مسلمان پناہ لینے چڑھے تھے تو صلیبیوں نے انہیں وہیں تیروں سے چھید کر گرا

1۔ "تاریخ اسلام"، اخیرین، صفحہ 21-620، بحوالہ لین پول وابن اثیر

2۔ ایضاً

3۔ ایضاً

4۔ ایضاً

دیا تھا اور جہاں ان کے اسی قتل عام نے مسیحی دنیا کی عزت کو بٹہ لگایا تھا اور اس مقدس شہر کو انہوں نے ظلم و بدنامی کے رنگ میں رنگا تھا جہاں رحم و محبت کا وعظ مسیح نے سنایا تھا اور فرمایا کہ خیر و برکت والے ہیں وہ لوگ جو رحم کرتے ہیں ان پر خدا کی برکتیں نازل ہوتی ہیں۔ جس وقت یہ عیسائی اس پاک اور مقدس شہر کو مسلمانوں کا خون کر کے مذبح بنا رہے تھے اس وقت وہ اس کلام کو بھول گئے تھے اور یہ ان بے رحم عیسائیوں کی خوش قسمتی تھی کہ سلطان صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں ان پر رحم ہو رہا تھا۔ اگر صلاح الدین کے کارناموں میں صرف یہی کام دنیا کو معلوم ہو تا کہ اس نے کس طرح یروشلم کو بازیافت کیا تو صرف یہی ایک کارنامہ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی تھا کہ وہ نہ صرف اپنے زمانے کا بلکہ تمام زمانوں کا سب سے بڑا عالی حوصلہ انسان اور جلالت اور شہامت میں یکتا اور بے مثل تھا۔"(1)

سلطان صلاح الدین ایوبی نے نہ صرف بیت المقدس کو فتح کیا بلکہ عیسائیوں کے اکثر علاقے ان سے چھین لئے اور ان کے پاس انطاکیہ، صور اور طرابلس کی ساحلی ریاستوں کے سوا کچھ بھی باقی نہ رہا۔

بیت المقدس کے مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہونے کی خبر نے ایک مرتبہ پھر یورپ میں آگ لگا دی۔ پادریوں نے مسلمانوں کے ہاتھوں بیت المقدس کی بے حرمتی اور عیسائیوں پر ان کے مظالم کی فرضی داستانیں سنا سنا کر عیسائیوں کو بیت المقدس کی آزادی کے لئے تیار کیا۔

ان تیاریوں کے نتیجے میں تیسری صلیبی جنگ کے لئے یورپ سے تین لشکر روانہ ہوئے۔ جرمن لشکر، جرمنی کے بادشاہ فریڈرک بار بروسا کی قیادت میں، انگلستان اور دوسرے علاقوں کا لشکر رچرڈ شیر دل، شاہ برطانیہ کی قیادت میں اور فرانس کا لشکر فرانس کے بادشاہ فلپ آگسٹس کی قیادت میں روانہ ہوئے۔ تینوں لشکروں نے مختلف راستے اختیار کئے۔ جرمن بادشاہ نے اپنے لشکر سمیت خشکی کا راستہ اختیار کیا۔ وہ ایشیائے کوچک کے ایک دریا میں ڈوب کر مر گیا۔ اس کے لشکر کا اکثر حصہ بھی جرمنی واپس چلا گیا۔ اس لشکر کا بہت

1۔ "تاریخ اسلام"، اخیر ین، صفحہ 622، بحوالہ صلاح الدین

تھوڑا حصہ شام پہنچا۔

فرانسیسی اور برطانوی لشکر بحری راستے سے آئے۔ تینوں لشکروں نے مل کر 1189ء میں عکا کا محاصرہ کر لیا۔(1)

مسلمانوں نے بڑی جرات سے مقابلہ کیا۔ فرانس کا بادشاہ تو رچرڈ سے اختلافات کی بنا پر عکا کے محاصرہ کے دوران ہی واپس چلا گیا لیکن رچرڈ نے محاصرہ جاری رکھا اور 1191ء میں عکا پر صلیبیوں کا قبضہ ہو گیا۔

بیت المقدس جس کو مسلمانوں کے ہاتھوں سے آزاد کرانے کے لئے یہ مسیحی لشکر آئے تھے اسے آزاد کرانے کے لئے مسلمانوں کے ساتھ معرکہ آرائی کی نوبت ہی نہ آئی۔ رچرڈ شیر دل سلطان صلاح الدین ایوبی کے ساتھ معاہدہ صلح کرنے میں کامیاب ہو گیا جس کی رو سے عکا سے یافا تک ساحلی شہر عیسائیوں کو دے دیئے گئے اور ان کو زیارت بیت المقدس کی پوری آزادی مل گئی۔(2)

صلیبیوں کا یہ حملہ بھی پوری طرح ناکامی کا شکار ہوا کیونکہ جس مقصد کے لئے انہوں نے اتنی کوشش کی تھی وہ پورا نہ ہو سکا تھا۔ گو انہیں کچھ فتوحات بھی حاصل ہوئیں اور کچھ علاقوں پر انہوں نے قبضہ بھی کیا لیکن اس کے مقابلہ میں ان کو جو نقصانات اٹھانا پڑے وہ کہیں زیادہ تھے اور بیت المقدس بھی بدستور مسلمانوں کے قبضہ میں تھا۔

اس صلیبی جنگ میں مسلمانوں کو اخلاقی فتح بھی حاصل ہوئی تھی اور رچرڈ شیر دل نے اپنے سب سے بڑے دشمن صلاح الدین ایوبی کے اخلاق سے متاثر ہو کر اسے مسلمانوں کا عظیم ترین بادشاہ قرار دیا تھا۔(3)

گو صلاح الدین ایوبی اور رچرڈ شیر دل کے درمیان معاہدہ صلح ہو گیا تھا اور صلیبی جنگوں کا سلسلہ بظاہر ختم ہو گیا تھا لیکن عیسائیوں کے مذہبی راہنما اس صورت حال سے سمجھوتا کرنے کیلئے تیار نہ تھے۔ انہوں نے بیت المقدس کی بازیابی کے لئے مسلسل کوششیں جاری رکھیں۔

1۔ حسین مونس، "اطلس تاریخ اسلام"، (قاہرہ، 1987ء)، صفحہ 269، نیز "مقالہ، صلیبی جنگیں"، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد 12، صفحہ 212

2۔ ایضاً

3۔ "اطلس تاریخ اسلام"، صفحہ 270

1195ء میں جرمنی کے بادشاہ ھنری ہشتم نے چوتھا صلیبی حملہ کیا لیکن عکا پہنچ کر وہ خود مر گیا اور حملہ ناکام ہو گیا۔(1)

1221ء میں پاپائے روم کی دعوت پر ھنگری آسٹریا، آرمینیا اور قبرص کے حکمرانوں نے پانچواں صلیبی حملہ کیا۔ اس حملے میں صلیبیوں کو مصر کے شہر دمیاط کے مقام پر ذلت آمیز شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اس طرح یہ حملہ بھی ناکام رہا۔(2)

1228ء میں جرمنی کے بادشاہ فریڈرک دوم نے چھٹا صلیبی حملہ کیا۔ اس حملے کے نتیجے میں صلیبیوں کا الملک الکامل کے ساتھ نیا معاہدہ صلح طے پایا جس کی رو سے بیت المقدس ایک بار پھر صلیبیوں کے حوالے کر دیا گیا لیکن 1244ء میں الکامل کے بھائی معظم نے صلیبیوں کو پھر بیت المقدس سے نکال دیا۔(3)

ایوبی حکومت کے بعد مملوک ترکوں نے صلیبیوں کے خلاف جہاد کا سلسلہ جاری رکھا۔ مملوک سلطان ظاہر بیبرس نے 1268ء میں انطاکیہ کی عیسائی ریاست کا خاتمہ کر دیا۔(4) اس کے رد عمل کے طور پر فرانس کے بادشاہ لوئی نہم کی قیادت میں ساتواں صلیبی حملہ ہوا جسے صلیبیوں کا آخری بڑا حملہ شمار کیا جاتا ہے یہ حملہ شمالی افریقہ میں تونس کے ناکام محاصرہ پر ختم ہو گیا۔

اس لشکر کا ایک حصہ انگلستان کے ولی عہد شہزادہ ایڈورڈ کی قیادت میں عکا پہنچا اور آخر کار ظاہر بیبرس کے ساتھ اس نے صلح کے ایک معاہدے پر دستخط کئے اور یہ مہم بھی ختم ہو گئی۔(5)

مملوک سلاطین نے شام اور فلسطین کی عیسائی ریاستوں کو یکے بعد دیگرے ختم کرنا شروع کر دیا اور 1291ء میں الملک الاشرف نے عکا کا قلعہ بھی فتح کر لیا جو صلیبیوں کا آخری حصار تھا۔(6) اس طرح پوپ اربن ثانی نے صلیبی جنگوں کی جو آگ بھڑکائی تھی وہ اپنے انجام کو پہنچی۔

اگرچہ شام اور فلسطین سے صلیبیوں کا صفایا ہو چکا تھا اور یورپ کے صلیبی حملے ختم ہو گئے تھے لیکن بحیرہ روم کے جزائر قبرص، روڈس اور مالٹا وغیرہ عیسائیوں کے قبضے میں تھے۔ وہاں علاقوں سے قرون وسطیٰ کے آخر تک اسلامی مشرق میں لوٹ مار اور غارت گری کرتے رہے۔

1۔ "مقالہ، صلیبی جنگیں"، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد 12، صفحہ 212

2۔ ایضاً

3۔ ایضاً

4۔ ایضاً

5۔ ایضاً، صفحہ 213

6۔ صفحہ 214

انہی جزیروں میں ہوسپٹیلرز اور ٹمپلرز وغیرہ مقدس جماعتیں تیار ہوئیں جو در حقیقت بحری قذاقوں کے منظم گروہ تھے لیکن مسیحی قدسیوں سے منسوب کر کے انہیں مقدس و محترم بنا دیا گیا تھا۔ یہ جماعتیں بھی مسلسل مسلمانوں کے خلاف برسرپیکار رہیں۔

قبرص ہی کے ایک بادشاہ پطرس اول نے نئے سرے سے صلیبی حملے کی پرجوش تنظیم کا بیڑا اٹھایا اور ترک مملوکوں کے قبضے سے ارض مقدس کو آزاد کرانے کے لئے ایک (جنگجو لشکر) منظم کیا اور تین سال تک یورپی دار الحکومتوں کا دورہ کر کے عیسائی دنیا کو صلیبی جنگ پر ابھارا۔ بالآخر 1365ء میں اس نے ایک طاقتور بحری بیڑے کے ساتھ اسکندریہ پر چڑھائی کی۔ اس حملے میں صلیبی لشکر آٹھ دن تک اسکندریہ میں قتل وغارت گری میں مشغول رہا جس سے 1099ء میں بیت المقدس پر صلیبی قبضے کے وقت ہونے والے قتل عام کی یاد تازہ ہو گئی۔ (1)

حادثہ اسکندریہ کے بعد بھی صلیبیوں کی کارروائیاں جاری رہیں۔ ان کا مقابلہ کبھی مملوک ترکوں سے رہا اور کبھی ایشیائے کوچک کے عثمانی سلاطین سے لیکن 1453ء میں سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ کو فتح کر لیا۔ فتح قسطنطنیہ کے ساتھ ساتھ عثمانیوں نے بحر متوسط کو صلیبیوں سے صاف کر دیا اور انہیں دھکیل کر قلب یورپ تک لے گئے۔ عثمانیوں نے ان پر ایسی کاری ضربیں لگائیں کہ آئندہ تقریباً دو صدیوں تک صلیبی یورپ کو سیاسی اور عسکری میدان میں آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ (2)

قارئین کرام صلیبی جنگوں کی اس طویل تاریخ پر غور فرمائیں۔ صلیبیوں کے ہر حملے کی تیاریوں کا انداز بتاتا ہے کہ وہ شام اور فلسطین سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹا دینا چاہتے تھے۔ بیت المقدس کا ایک دن بھی مسلمانوں کے تسلط میں رہنا ان کے لئے باعث عار تھا۔ انہوں نے بیت المقدس کو مسلمانوں کے تسلط سے آزاد کرانے کے لئے زبردست کوششیں کی تھیں لیکن صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں بیت المقدس کی فتح کے بعد وہ صدیوں اس پر قبضہ کرنے میں ناکام رہے تھے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے لاکھوں جانیں قربان کی تھیں۔ ان کے کئی بڑے بڑے قائدین اس معرکہ ہلال و صلیب میں کام آئے تھے لیکن بیت المقدس کو تثلیث کا مرکز بنانے میں وہ کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ انہوں نے ملت اسلامیہ کو دبانے کی جتنی کوششیں کی تھیں وہ اتنی ہی ابھری تھی۔ انہوں نے بار ہا ملت اسلامیہ کی

1۔ "مقالہ، صلیبی جنگیں"، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد 12، صفحہ 214

2۔ ایضاً

نااتفاقی، حکمرانوں کی نااہلی اور ان کے باہمی تنازعات کو دیکھ کر یہ یقین کیا تھا کہ اب یہ ملت اپنی ملی زندگی کے آخری سانس لے رہی ہے لیکن وہ حیران تھے کہ ایک بار نہیں بلکہ بار ہا ایسا ہوا تھا کہ جب اس ملت کی تباہی یقینی نظر آ رہی ہوتی تھی، کوئی بندہ خدا میدان میں آ جاتا، وہ ملت کے منتشر شیرازہ کو یکجا کرتا، اس کی مردہ رگوں میں زندگی کا نیا خون دوڑا تا اور توحید کے یہ متوالے ایک بار پھر نئے جذبے اور تازہ ولولے کے ساتھ میدان میں آتے اور تثلیث پرستوں کے غرور کو خاک میں ملا دیتے۔

انہوں نے بار ہا اس حقیقت کا مشاہدہ کیا تھا کہ ایک حکمران خاندان پرچم توحید کی حفاظت میں کوتاہی کرتا تو ایک دوسرا خاندان آگے بڑھ کر اس مقدس فریضہ کو اپنے ذمہ لے لیتا اور اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دیتا۔

مسلسل ناکامیوں نے عسکری میدان میں تو صلیبیوں کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا لیکن ان کی اسلام دشمنی میں ہزاروں گنا اضافہ ہو گیا۔ انہوں نے مسلح تصادم کی بجائے مسلمانوں کو کمزور کرنے کے لئے دوسرے حربے استعمال کرنا شروع کر دیئے۔

انہیں یقین ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کی کامیابی کا رازنہ کسی حکمران کی جرات میں پنہاں ہے اور نہ کسی جنگجو قوم کی بسالت و شجاعت میں بلکہ مسلمانوں کی قوت ان کے دین کی تعلیمات میں پنہاں ہے۔ ان کی قوت کا مرکز گنبد خضراء ہے جہاں سے ان کے حوصلوں کو نت نیا ولولہ عطا ہوتا ہے۔ ان کو کمزور کرنے کی صورت ایک ہی ہے کہ ان کا رشتہ اپنے دین سے منقطع کر دیا جائے۔ ان کا رابطہ اپنے مرکز سے توڑ دیا جائے۔

انہوں نے یہ اندازہ لگا لیا کہ مسلمانوں کا اپنے دین سے رابطہ منقطع کرنے کی صورت یہی ہے کہ دین اسلام اور داعی اسلام ﷺ کی ایسی مکروہ تصویر کشی کی جائے کہ پھر مسلمان کو مسلمان کہلاتے ہوئے شرم محسوس ہو اور مسلمانوں کو مدنی تاجدار ﷺ کی غلامی کے جذبے میں شرک کا شائبہ نظر آئے۔

صلیبیوں نے تیغ و سنان رکھ دیئے اور قلم و قرطاس کے ذریعے مسلمانوں پر حملے شروع کر دیئے۔ انہوں نے ڈراموں میں، فلموں میں، کارٹونوں میں اور کتابوں میں اسلام اور داعی اسلام ﷺ کے کردار کو مسخ کر کے پیش کرنا شروع کر دیا۔ اس مقصد کیلئے انہوں نے کئی روپ دھارے۔ جن میں سے ایک روپ استشراق کا ہے۔ ایک مستشرق کے مقاصد اور

عزائم بعینہ وہی ہیں جو صلیبیوں کے تھے۔ فرق صرف طریقہ کار کا ہے۔ صلیبی دشمن کے روپ میں اسلامی مشرق میں وارد ہوتے تھے لیکن مستشرق، علم دوست بن کر اور مشرقی علم و ثقافت، تہذیب و تمدن، علم و ادب اور دین و مذہب کے حقائق کا جوئندہ بن کر مشرق میں آتا ہے اور پھر اپنے قلم کے زور اور تخیل کی پرواز سے اسلام اور مسلمانوں کو قتل کرتا ہے۔

اب وقت آگیا ہے کہ جس طرح مسلمانوں نے صلیبی تلواروں کے مقابلے میں تلواریں اٹھائی تھیں اسی طرح آج کا مسلمان صلیبی قلم کے مقابلے میں قلم اٹھا کر میدان میں آجائے۔ جب مسلمان اپنی ملی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لئے میدان میں آجائیں گے تو انشاءاللہ العزیز نصرت خداوندی انہی کا مقدر ٹھہرے گی۔

تاتاریوں کے قبول اسلام کے عیسائیوں پر اثرات

ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی میں ایشیاء سے ایک نئی طاقت ابھری جس نے ہر طرف تباہی مچادی۔ یہ چنگیز خان کی قائم کردہ مغل سلطنت تھی۔ مغلوں نے خوارزم شاہی حکومت کا خاتمہ کیا اور بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

یہ وہ دور تھاجب مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان معرکہ ہلال و صلیب زوروں پر تھا۔ عیسائی مشنریوں نے اس نئی طاقت کو عیسائیت کی طرف مائل کرنے کے لئے زبردست زور لگایا۔ پوپ نے مغل حکمرانوں کو عیسائی بنانے کے لئے کئی ایک تبلیغی مشن بھیجے اور یورپ کے عیسائی حکمرانوں نے سفارتی ذرائع سے تحائف بھیج کر مغل تاجداروں کو اپنی حمایت پر آمادہ کرنے اور عالم اسلام کے خلاف بھڑکانے کی بہت کوششیں کیں۔(1)

عیسائیوں کو اپنی تبلیغی مساعی کی کامیابی کا یقین تھا اور انہوں نے مغلوں سے بھی بڑی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ صلیبی جنگوں میں مسلمانوں کے ہاتھوں پے در پے شکستوں کے بعد وہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ طاقتور مغل حکمران ان کے ساتھ مل کر مسلمانوں کو شکست دیں گے اور اس طرح صلیبی بیت المقدس کو مسلمانوں کے تسلط سے آزاد کرانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا کا مقالہ نگار لکھتا ہے کہ ہلاکو خان یروشلم پر قبضہ کرنے اور اس کو عیسائیوں کے حوالے کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اسے منگو کی وفات کی خبر ملی اور وہ

1۔"مقالہ،صلیبی جنگیں"، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد 12، صفحہ 213

منگولیا لوٹ گیا۔(1)

جب قراخطائی مغلوں کو سلطنت سنجر کے خلاف فتح حاصل ہوئی تو عیسائی راہبوں نے مغرب میں مشہور کر دیا کہ قراخطائی بادشاہ عیسائی ہے اور وہ مشرق سے اسلام کا صفایا کر دے گا۔ انہوں نے مشہور کر دیا کہ قراخطائی نے یوحنا الملقب بہ و برسترجوں، کے ہاتھ پر نصرانیت قبول کی۔(2)

عیسائیوں کی یہ امیدیں بر نہ آئیں۔ مغلوں نے ملت اسلامیہ کے ملی وجود پر اگر چہ بڑی کاری ضربیں لگائیں لیکن مغل عیسائیوں کے کسی کام نہ آسکے۔ مغلوں کے اس سیلاب کو روکنے میں آخر کار مسلمان کامیاب ہو گئے۔ مملوک سلاطین نے انہیں عین جالوت کے معرکے میں شکست فاش دے کر ان کی تباہ کاریوں کا خاتمہ کر دیا۔(3)

بات ان کی شکست پر ختم نہیں ہوئی بلکہ چنگیز خان کے پوتے برکا خان نے حضرت شیخ شمس الدین باخوری، جو حضرت شیخ نجم الدین کبیر کے اصحاب میں سے تھے، کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔(4)

چنگیز خان کی اولاد میں سے ملوک چغتائی، جو ترکستان، کاشغر اور ماوراء النہر پر حکمران تھے، نے بھی اسلام قبول کر لیا۔(5)

ہلاکو کا بیٹا خربندا بادشاہ بنا تو تاجپوشی کے بعد جو پہلا کام اس نے کیا وہ کلمہ توحید پڑھنا تھا۔ اس نے اپنا نام محمد رکھا اور غیاث الدین کا لقب اختیار کیا۔(6)

مغلوں کی ایک شاخ مشرقی یورپ میں آباد تھی جو سنہری جرگے یعنی (Golden Horde) کے نام سے مشہور تھی، اس کے متعلق انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا کا مقالہ نگار لکھتا ہے۔

سنہری جرگے کے بادشاہوں کے قبول اسلام نے قسطنطنیہ اور مصر کے ساتھ ان کے روابط قائم کر دیے۔(7)

1۔ "مقالہ، منگولز" انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، جلد 15، صفحہ 717

2۔ "اطلس تاریخ الاسلام"، صفحہ 239

3، ایضاً، صفحہ 241

4۔ علامہ ابن خلدون المغربی، "تاریخ العلامہ ابن خلدون"، (بیروت۔1968)، جلد 5، صفحہ 1123

5۔ ایضاً، صفحہ 1127

6۔ ایضاً، جلد 21، صفحہ 83

7۔ "مقالہ، منگولز"، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، جلد 15، صفحہ 719

اس طرح جن لوگوں نے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی تھی، ان کی مساجد کی بے حرمتی کی تھی، ان کے ادب وثقافت کو زبردست نقصان پہنچایا تھا، جن کے وحشیانہ مظالم نے عروس البلاد بغداد کو انسانی خون میں ڈبو دیا تھا وہی لوگ پھر اسلام کا پرچم تھامے نظر آئے۔

ع پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

صرف مغل بادشاہوں نے ہی اسلام قبول نہیں کیا تھا بلکہ ان کے عوام کی اکثریت بھی مسلمان ہوگئی تھی۔ مغل قومیں آج بھی دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں اور ان کی اکثریت دین اسلام کی پیروہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا نے لفظ "تاتار" کے ضمن میں لکھا ہے کہ تاتاری مسلمان ہیں اور ترکی زبان بولتے ہیں۔(1)

صلیبی جنگوں میں عیسائیوں کی شکستوں کے ساتھ ساتھ مغلوں کا مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنا پھر انہی کے ہاتھوں مغلوب ہونا اور آخر کار دین اسلام کے حصار میں پناہ لینا ایسے واقعات تھے جنہوں نے متعصب عیسائیوں کے دلوں میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت میں مزید اضافہ کر دیا۔ اس نفرت کو علیم وخبیر خدا نے صدیوں پہلے ہی بیان فرمادیا تھا:

قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚ وَمَا تُخْفِىْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ۚ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ (2)

"ظاہر ہو چکا ہے بغض ان کے مونہوں (یعنی زبانوں) سے اور جو چھپا رکھا ہے ان کے سینوں نے وہ اس سے بھی بڑا ہے۔ ہم نے صاف بیان کردیں تمہارے لئے اپنی آیتیں اگر تم سمجھدار ہو۔"

مستشرقین کی کتابوں میں اسلام کے خلاف بغض کے جو شعلے آپ کو نظر آتے ہیں وہ وہی بغض ہے جس کی طرف قرآن حکیم نے اشارہ کیا ہے۔

1۔ "تاریخ العلامہ ابن خلدون"، جلد 21، صفحہ 83

2۔ سورۃ آل عمران: 118

اہل مغرب کے علوم شرقیہ اسلامیہ کی طرف متوجہ ہونے کے اسباب

علامہ اقبال نے جب اپنے اسلاف کے علمی شاہپاروں کو یورپ کی لائبریریوں میں دیکھا تھا تو بڑی حسرت سے کہا تھا:

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

ہر مسلمان جو ان تجربات سے گزرتا ہے جن سے علامہ اقبال کو واسطہ پڑا تھا، اس کے جذبات وہی ہوتے ہیں جو علامہ اقبال کے تھے اور وہ ان ہی تاثرات کا اظہار کرتا ہے جن کا اظہار علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں کیا تھا۔

یورپ اور امریکہ کے کتب خانوں میں مسلمان اکابر کی کثیر تعداد میں تصنیفات اور مخطوطے محفوظ ہیں۔ ہزاروں یورپی اور امریکی علماء نے اپنی زندگیاں اسلامی علوم کے مطالعے کے لئے وقف کر رکھی ہیں۔ وہ ان کتابوں کی فہرستیں مرتب کر رہے ہیں۔ ان پر حاشیے لکھ رہے ہیں۔ ان کی تشریحات کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کو جب اپنی علمی میراث تک رسائی کی ضرورت پڑتی ہے تو انہیں اہل مغرب کی مساعی سے استفادہ کرنا پڑتا ہے۔ بڑے بڑے علمی شاہکار جو مسلم علماء کے قلم سے نکلے تھے ان کی اشاعت کا فریضہ اہل مغرب ادا کر رہے ہیں۔

یورپی ممالک اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں اسلامیات، عربی اور دیگر علوم شرقیہ پڑھانے کے باقاعدہ شعبے موجود ہیں جن سے ہزاروں کی تعداد میں طلبہ تحصیل علم کر کے فارغ ہو رہے ہیں۔ ان طلبہ میں صرف یورپی اور امریکی طلبہ ہی نہیں ہوتے ہیں بلکہ ان میں کثیر تعداد میں عرب اور مسلمان طلبہ شامل ہوتے ہیں جو اپنی زبان اور اپنا دین سیکھنے کے لئے

مغرب کی یونیورسٹیوں میں مغربی اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرتے ہیں۔
سوچنے کی بات یہ ہے کہ آخر اہل مغرب مسلمانوں، انکی زبان، ان کی تہذیب، ان کی تاریخ، ان کے ادب اور ان کے مذہب پر اتنے مہربان کیوں ہیں؟
ہم انشاء اللہ العزیز اپنے مقام پر اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کریں گے، سر دست ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ وہ کون سے اسباب تھے جنہوں نے ابتداء میں اہل مغرب کو علوم اسلامیہ کی طرف متوجہ کیا تھا؟
مختصر الفاظ میں اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جب اسلام اپنے علم، ادب، تہذیب، اخلاق اور کردار کے نور سے پورے مشرق کو بقعہ نور بنا رہا تھا اور علم و ثقافت کا یہ نور بحر متوسط کی پہنائیوں کو پھلانگتا ہوا سپین تک جا پہنچا تھا، اس وقت باقی یورپ جہالت کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔
جس دور میں بغداد، قرطبہ اور غرناطہ کی یونیورسٹیاں علم و معرفت کے موتی لٹارہی تھیں، اس وقت یورپ مدرسے کے تصور سے بھی نا آشنا تھا۔ جب مسلمان علماء کے قلم سے ہزاروں علمی شاہکار نکل رہے تھے، اس وقت یورپ نے کاغذ کی شکل بھی نہ دیکھی تھی۔ جب مسلمانوں کے شہر اپنی روشنی، صفائی، خوبصورتی اور حسن انتظام کی وجہ سے دور جدید کی متمدن دنیا کو بھی شرمار ہے تھے، اس وقت مغرب میں تاریکی، گندگی اور بدنظمی کے سوا کچھ نہ تھا۔
یہ انسانی فطرت ہے کہ اندھیروں میں بھٹکتے ہوئے انسان کو جہاں روشنی نظر آتی ہے وہ بے اختیار اس طرف لپکتا ہے۔ یہی بات اہل مغرب کے علوم شرقیہ کی طرف متوجہ ہونے کا بنیادی سبب تھی۔ اہل مغرب کے اسلامی علوم و فنون کی طرف متوجہ ہونے کا دوسرا سبب مسلمانوں کی فتوحات کا وہ سیلاب تھا جو ساری دنیا کو تنکوں کی طرح بہا کرلے گیا تھا۔ اہل مغرب طاقت کے اس راز کا کھوج لگانا چاہتے تھے جو فتوحات کے اس لامتناہی سلسلے کے پیچھے کار فرما تھا۔
اہل مغرب کے علوم اسلامیہ کی طرف مائل ہونے کا تیسرا سبب مشرق و مغرب کے درمیان وہ رابطہ تھا جو ان مسلمان تاجروں کی بدولت قائم تھا جو اپنے مال تجارت کے ساتھ وسطی یورپ کو عبور کرتے ہوئے سکینڈے نیویا کے ممالک تک جا پہنچتے تھے۔ ان کے تاجروں کی تاجرانہ مہارت، ان کے اخلاق، ان کے کردار اور ان کی خوشحالی سے متاثر ہو کر اہل مغرب کے دلوں میں اسلامی مشرق کے ساتھ رابطے کا شوق جنم لیتا اور وہ مسلمانوں

سے کچھ سیکھنے کے لئے مشرق کا رخ کرتے۔

ہم یہاں صرف پہلے سبب کے متعلق ذرا تفصیل سے گفتگو کریں گے۔ دوسرے دونوں اسباب کی طرف صرف اشارے پر ہی اکتفا کریں گے۔

ہم پہلے قرون وسطی میں یورپ کی سیاسی، سماجی اور معاشی حالت کا مختصر خاکہ قارئین کی خدمت میں پیش کریں گے۔ پھر اسی دور میں اسلامی دنیا کی حالت بیان کریں گے اور اس کے بعد بتائیں گے کہ اسلام نے یورپ پر کیا اثر ڈالا۔

قرون وسطی میں یورپ کی حالت

آج یورپ علوم وفنون میں بہت آگے نکل گیا ہے۔ وہاں کے لوگ معاشی طور پر خوشحال ہیں۔ ہزاروں تعلیمی ادارے وہاں علم وعرفاں کے موتی لٹا رہے ہیں۔ ٹیکنالوجی میں ایک دنیا ان کی دست نگر ہے اور تاریخ کا دھارا ان کی مرضی سے اپنا رخ بدلتا ہے۔ لیکن یورپ کی حالت ہمیشہ ایسی نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپ اپنی تاریخ میں جہالت کی ان تاریکیوں سے گزرا ہے جن سے شاید کسی دوسرے انسانی معاشرے کو واسطہ نہ پڑا ہو۔

یورپی مورخین اپنی تاریخ کو تین ادوار میں تقسیم کرتے ہیں: دور قدیم، قرون وسطی اور عصر حاضر۔

دور قدیم آٹھویں صدی قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے اور پانچویں صدی عیسوی پر ختم ہوتا ہے۔ اسی دور میں روم کی عظیم سلطنت قائم ہوئی اور یونان سے علوم وفنون کے دریا بہہ نکلے۔

قرون وسطی سے مراد وہ زمانہ ہے جو زوال رومہ 476ء سے شروع ہوتا ہے اور یورپ کی نشاۃ ثانیہ پر ختم ہوتا ہے۔ اور دور حاضر سولہویں صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے۔ (1)

ہمارے موضوع کا واسطہ یورپ کی تاریخ کے دوسرے دور سے ہے کیونکہ اسی دور میں جزیرہ عرب سے آفتاب اسلام طلوع ہوا اور اسی دور میں مختلف محاذوں پر عیسائیوں اور مسلمانوں کا آمنا سامنا ہوا۔

قرون وسطی کا زمانہ یورپ کی تاریخ کا تاریک ترین زمانہ ہے۔ اس دور کے بارے میں ڈاکٹر ڈریپر (1882ء) لکھتا ہے کہ قرون وسطی میں یورپ کا بیشتر حصہ لق ودق بیابان یا بے راہ جنگل تھا۔ کہیں کہیں راہبوں کی خانقاہیں اور چھوٹی چھوٹی بستیاں آباد تھیں۔ جابجا

1۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق، "یورپ پر اسلام کے احسانات"، (شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور س ن)، صفحہ 36

دلدلیں اور غلیظ جوہڑ تھے۔ لندن اور پیرس جیسے شہروں میں لکڑی کے ایسے مکانات تھے جن کی چھتیں گھاس کی تھیں۔ چمنیاں، روشندان اور کھڑکیاں مفقود۔ آسودہ حال امراء فرش پر گھاس بچھاتے اور بھینس کے سینگ میں شراب ڈال کر پیتے تھے۔ صفائی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ نہ گندے پانی کو نکالنے کے لئے نالیوں اور بدروؤں کا رواج تھا۔ گلیوں میں فضلے کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔ چونکہ سڑکوں پر بے اندازہ کیچڑ ہوتا تھا اور روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا اس لئے رات کے وقت جو شخص گھر سے نکلتا وہ کیچڑ میں لت پت ہو جاتا۔ تنگی رہائش کا یہ عالم کہ گھر کے تمام آدمی اپنے مویشیوں سمیت ایک ہی کمرے میں سوتے تھے۔ عوام ایک ہی لباس سالہا سال تک پہنتے تھے جسے دھوتے نہیں تھے۔ نتیجۃً وہ چرکین، میلا اور بدبودار ہو جاتا تھا۔ نہانا اتنا بڑا گناہ تھا کہ جب پاپائے روم نے سسلی اور جرمنی کے بادشاہ فریڈرک ثانی (1212-1250) پر کفر کا فتویٰ لگایا تو فہرست الزامات میں یہ بھی درج تھا کہ وہ ہر روز مسلمانوں کی طرح غسل کرتا ہے۔(1)

مارڈیوک پکتھال اپنی کتاب تہذیب اسلام میں لکھتا ہے کہ جب سپین میں اسلامی سلطنت کو زوال آیا تو فلپ دوم (1556-1598) نے تمام حمام حکماً بند کر دیئے کیونکہ ان سے اسلام کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ اسی بادشاہ نے اشبیلیہ کے گورنر کو محض اس لئے معزول کر دیا تھا کہ وہ روزانہ ہاتھ منہ دھوتا تھا۔(2)

ڈاکٹر ڈریپر لکھتا ہے: فقر و فاقہ کا یہ عالم تھا کہ عام لوگ سبزیاں، پتے اور درختوں کی چھال ابال کر کھاتے تھے۔ متوسط طبقہ کے ہاں ہفتہ میں ایک مرتبہ گوشت عیاشی سمجھا جاتا تھا۔ 1030ء کے قحط میں لندن کے بازاروں میں انسانی گوشت بھی بکتا تھا۔ امراء معدودے چند تھے جن کا کام بدکاری، شراب نوشی اور جوا تھا۔ جاگیرداروں کے قلعے ڈاکوؤں کے اڈے تھے جو مسافروں پر چھاپے مارتے اور زرِ فدیہ وصول کرنے کے لئے انہیں پکڑ لاتے تھے۔ حصول زر کے لئے وہ مختلف طریقے استعمال کرتے تھے۔ مثلاً آدمی کے پاؤں کے انگوٹھوں کو رسی سے باندھ کر اسے الٹا لٹکا دیتے تھے یا گرم سلاخوں سے جسم کو داغتے یا گرہ دار رسی کو سر کے گرد لپیٹ کر پوری طاقت سے مروڑتے تھے۔ یورپ میں سڑکیں نہ تھیں۔ ذرائع نقل و حمل بیل گاڑیاں، خچر اور گدھے تھے۔ جنگلوں اور پہاڑوں میں ایسے ڈاکو رہتے تھے جو آدم

1۔ "یورپ پر اسلام کے احسانات"، صفحہ 76، بحوالہ معرکہ مذہب و سائنس
2۔ ایضاً، بحوالہ تہذیب اسلام

خور بھی تھے۔ وبائیں عام تھیں۔ صرف دسویں صدی میں دس تباہ کن قحط اور تیرہ وبائیں پھوٹیں اور لوگ مکھیوں کی طرح ہلاک ہوئے۔

ان کے پادری فریب اور جعلسازی سے کام لیتے تھے۔ پوپ جنت کی راہداریاں اور گناہ کے پرمٹ (اجازت نامے) فروخت کیا کرتا تھا۔ عوام کے لئے سود لینا حرام تھا لیکن پوپ کا بینک لوگوں کو بھاری شرح سود پر قرض دیتا تھا۔ عوام گور پرست اور مجسمہ ساز تھے اور علماء عشائے ربانی، کرامات اولیاء، رہبانیت اور تصرفات روح کی بحثوں میں الجھے ہوئے تھے۔(1)

یورپ کا مشہور مورخ گبن لکھتا ہے: اتنے طویل تاریخی زمانے میں بدی کی یہ کثرت اور نیکی کی یہ قلت کہیں اور نظر نہیں آتی۔(2)

گاتھ قوم کا ایک مورخ پروکو پیس (560ء) لکھتا ہے: میں ان وحشیوں کے ہولناک افعال کے ذکر سے صفحات تاریخ کو آلودہ نہیں کرنا چاہتا تاکہ آئندہ نسلوں کے لئے خلاف انسانیت افعال کی مثال زندہ رکھنے کی ذمہ داری مجھ پر نہ ہو۔(3)

اہل یورپ کی انسان دشمنی

ان لوگوں کے نزدیک انسانیت کی جو قدر تھی اس کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے:
"آنکھیں نکالنا، زبان کاٹنا، کھال کھینچنا اور زندہ جلا دینا، رومیوں کی عام سزائیں تھیں۔

ایک مرتبہ جب رومیوں نے روسیوں کو شکست دی تو قیدیوں کے ہاتھ کاٹ کر ان کے ہار بنائے اور ان ہاروں سے قسطنطنیہ کی فصیل کو سجایا۔ ایک موقع پر جب اسلامی فوج کو شکست ہوئی تو رومیوں نے مسلم اسیران جنگ کو سمندر کے کنارے لٹا کر ان کے پیٹ میں لوہے کے بڑے بڑے کیل ٹھونک دیئے تاکہ بچے کھچے مسلمان جب جہازوں پر واپس آئیں تو اس منظر کو دیکھیں۔ قیصر باسل دوم (963-1025) نے بلغاریہ پر فتح حاصل کی تو پندرہ ہزار اسیران جنگ کی آنکھیں نکال دیں اور ہر سو قیدیوں کے بعد ایک قیدی کی ایک آنکھ رہنے دی تاکہ وہ ان اندھوں کو گھروں تک پہنچا سکیں۔ غلاموں کی تجارت زوروں پر تھی۔ غلاموں سے بھرے ہوئے جہاز برطانیہ آتے اور وہاں سے یورپ میں جاتے تھے۔ یہ غلام عموماً پانچ شلنگ فی کس کے حساب سے فروخت ہوتے تھے۔ فرانس کی حریت پسند خاتون

1۔ "یورپ پر اسلام کے احسانات"، صفحہ 77، بحوالہ معرکہ مذہب و سائنس
2۔ ایضاً، صفحہ 80
3۔ ایضاً، بحوالہ تشکیل انسانیت

جون آف آرک انگریزوں کے ہتھے چڑھی تو اسے سر بازار زندہ جلادیا گیا۔(1)

ستر ہویں صدی کے یورپ کے متعلق بریفالٹ لکھتا ہے کہ وہ لوگ اپنی ہر بدی کو نیکی کا رنگ دیتے تھے۔ سفیروں کا کام یہ تھا کہ وہ وحشی سرداروں کی نفس پرستیوں اور بد معاشیوں کو ایسے حسین انداز میں پیش کریں کہ وہ خوبیاں نظر آئیں۔ منافقت، جھوٹ، دھوکہ اور ریاکاری ایک فن لطیف بن گیا تھا جس میں ہر شخص ماہر تھا اور مکیاولی (1527ء) اس فن کا امام سمجھا جاتا تھا۔(2)

اہل یورپ کی علم دشمنی

آج یورپ علم کی دنیا میں ساری دنیا کا استاد ہے لیکن قرون وسطیٰ میں حالت کچھ اور تھی۔ زوال روما (476ء) کے بعد پاپائیت برسر اقتدار آگئی تھی اور 1546ء تک سیاہ و سفید کی مالک رہی۔ پوپ مذہبی ادب کے بغیر تمام اصناف علم کا دشمن تھا اور جہاں کہیں کوئی عالم یا فلسفی یا مفکر سر اٹھاتا، اسے کچل دیتا تھا۔ اس دور میں مدارس حکماً بند ہوئے۔ لاکھوں کی تعداد میں کتابیں نذر آتش ہوئیں۔ کئی علماء پوپ کی علم دشمنی کے ہاتھوں قتل ہوئے اور یورپ پر ہر طرف جہالت کی تاریکی چھاگئی۔

پوپ کی علم دشمنی کی چند جھلکیاں قارئین کی خدمت میں پیش کی جاتی ہیں:

عیسائیوں کا ایک فرقہ نسطوری کہلاتا ہے۔ اس کا بانی نسطوریس پادری (م 451ء) تھا۔ یہ لوگ بعض عقائد میں دوسرے عیسائیوں سے اختلاف رکھتے تھے۔ 431ء میں انہیں عیسائی کونسل نے کافر قرار دیا۔ قیصر زینو (474ء۔ 491ء) نے ان کی درس گاہیں بند کردیں اور انہیں ملک سے نکال دیا۔

یہ لوگ ایران کے شہر جندیشاپور میں جمع ہوگئے۔ وہاں ایک عظیم درس گاہ اور شفا خانے کی بنا ڈالی۔ جب 529ء میں قیصر جسٹینین اول (527-565ء) نے یونان و مصر کی تمام درس گاہیں بند کردیں تو وہاں کے علماء بھی جندیشاپور میں جمع ہوگئے۔(3)

فلورنس میں ایک اکادمی تدریس و تصنیف کے فرائض سر انجام دیا کرتی تھی لیکن کلیسا

1۔ "یورپ پر اسلام کے احسانات"، صفحہ 91-82، بحوالہ تشکیل انسانیت و تاریخ پیر رز آف اسلام

2۔ ایضاً، صفحہ 84، بحوالہ تشکیل انسانیت

3۔ ایضاً، صفحہ 94، بحوالہ میراث اسلام، معرکہ مذہب و سائنس

نے اس کی مخالفت کی اور وہ بند ہو گئی۔(1)

پوپ سلوسٹر دوم (999-1003ء) نے یورپ میں کچھ درس گاہیں کھولنا چاہیں تو عام آبادی کو یہ اقدام سخت ناگوار گزرا اور مشہور کر دیا کہ پوپ پر شیطان مسلط ہو گیا ہے۔(2)

فریڈرک ثانی نے اٹلی کے مختلف شہروں میں مدرسے قائم کئے تو پوپ نے اسے دجال قرار دے دیا۔(3)

قیصر زینو (474-491) اور قیصر جسٹینین اول (527-565) نے تمام اہل علم کو اپنی سلطنت سے نکال دیا اور مدارس بند کر دیئے۔(4)

زوال رومہ کے بعد حملہ آور اقوام یعنی گاتھ، ہنز اور وینڈل وغیرہ نے غربی و وسطی یورپ کے تمام مدارس بند کر دیئے اور صدیوں تک تعلیم و تدریس کا سلسلہ منقطع رہا۔(5)

اہل یورپ کی کتب سوزی

بریفالٹ کہتا ہے کہ قرون وسطیٰ میں راہبوں کی علمی سرگرمیاں یہ تھیں کہ وہ یونان و روما کی کتابیں جلا کر ان کی جگہ مسیحی اولیاء کی داستانیں لکھ دیتے تھے۔ چونکہ اس زمانے میں کاغذ نایاب تھا اور اس کی جگہ چرمی جھلی استعمال ہوتی تھی جس کی قیمت کافی زیادہ تھی اس لئے یہ راہب جھلی پر لکھی ہوئی کتابیں کھرچ ڈالتے اور ان پر اولیاء کی داستانیں لکھ دیتے۔(6)

پاپائے اعظم گریگوری (540-604) سائنس تاریخ، ادب، شعر اور دیگر علوم کا دشمن تھا اور دینیات یا دعاؤں کے سوا کسی اور صنف کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے رومی سیاستدان و خطیب سسرو (43 ق م) اور مورخ لیوی (17 ق م) کی سب کتابیں تلف کر ڈالیں۔ ایک مرتبہ اسے خبر پہنچی کہ وی آنا (آسٹریا کے دارالحکومت) کے لاٹ پادری نے کسی ادبی موضوع پر ایک مقالہ پڑھا ہے تو اسے لکھا "ہمیں خبر ملی ہے جس کے ذکر سے ہمیں شرم آتی ہے کہ تم نے کوئی ادبی مقالہ پڑھا ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم مجھے لکھو گے کہ تمہیں ان

1۔"یورپ پر اسلام کے احسانات"، صفحہ 94، بحوالہ معرکہ مذہب و سائنس
2۔ایضاً، صفحہ 105، بحوالہ تمدن عرب
3۔ ایضاً، بحوالہ تشکیل انسانیت
4۔ ایضاً، صفحہ 106
5۔ایضاً صفحہ 94، بحوالہ تمدن عرب
6۔ایضاً، بحوالہ تشکیل انسانیت

لغویات سے کوئی سروکار نہیں۔" (1)

انگلستان کا ایک مورخ تھیچسن سٹرنگ لکھتا ہے کہ چوتھی صدی عیسوی میں راہبوں کے گروہ جابجا گھومتے نظر آتے تھے۔ یہ جہاں بھی کوئی کتاب یا آرٹ کا کوئی نمونہ پاتے اسے جلا دیتے تھے۔ (2)

چوتھی صلیبی جنگ (1203) میں جب صلیبیوں کا مقدس لشکر قسطنطنیہ میں پہنچا تو اس نے وہاں کی تمام عیسائی آبادی کو لوٹ لیا اور ساری کتابیں جلادیں۔ (3)

طرابلس میں اس دور کی عظیم ترین لائبریری تھی جس میں کتابوں کی تعداد تیس لاکھ بتائی جاتی ہے۔ ایک مرتبہ جب صلیبیوں کا لشکر اس شہر میں پہنچا تو کتب خانے کو آگ لگا دی۔ یہ تمام کتب جلا ڈالیں اور مسلمانوں کی چھ سو سالہ محنت کو تباہ کر دیا۔ (4)

سپین کی مذہبی عدالت نے، جو 1478ء میں قائم ہوئی تھی، عربی علوم پر یہودی علماء کی لکھی ہوئی چھ ہزار کتابیں سپرد آتش کر دیں۔ (5)

برطانیہ کا ایک فلسفی جان اریجینا سپین کے مشہور مسلم فلسفی ابن رشد (1198) کا شارح تھا۔ اس نے اپنی تصانیف میں فلسفہ و مذہب میں اتحاد کی کوشش کی تھی۔ پادریوں نے اس کی بیشتر کتابیں جلا دیں۔ (6)

مسلمانوں نے سپین میں ہر جگہ عظیم کتب خانے قائم کیے تھے۔ ان کتب خانوں میں لاکھوں کے حساب سے کتابیں تھیں۔ پادریوں نے ان کتابوں کو جلا دیا۔ صرف طلیطلہ میں وہاں کے بشپ زمینیز (Xminese) (1517-1437) نے مسلمانوں کی اسی ہزار کتابیں سپرد آتش کیں۔ (7)

اہل یورپ کی عالم کشی

یونان کی ایک لڑکی ہائے پیشیا (414) نے سکندریہ سے فلسفے کا علم حاصل کیا اور ممتاز

1۔ "یورپ پر اسلام کے احسانات"، صفحہ 95، بحوالہ تشکیل انسانیت
2۔ ایضاً، صفحہ 96، بحوالہ تاریخ پیپرز آف ہسٹری
3۔ ایضاً، صفحہ 96، بحوالہ تمدن عرب
4۔ ایضاً، بحوالہ معرکہ مذہب و سائنس
5۔ ایضاً، صفحہ 97
6۔ ایضاً
7۔ ایضاً، صفحہ 96، بحوالہ تشکیل انسانیت

فلسفی بن گئی۔ اسکندریہ کے بشپ سائرل نے اس لڑکی کو کافرہ قرار دیا اور ایک روز جب وہ فرائض تدریس سرانجام دینے کے لئے اپنی درس گاہ کی طرف جارہی تھی، سائرل کے بھیجے ہوئے چند سنگدل راہبوں نے اسے پکڑ لیا۔ پہلے اسے ننگا کر کے بازار میں گھسیٹا پھر اسے گرجے میں لے گئے۔ وہاں تیز سیپیوں سے اس کی کھال کھرچی، پھر سے اس کا سر توڑا، لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کئے اور انہیں آگ میں پھینک دیا۔(1)

گلیلیو (1642ء) اٹلی کا وہ مشہور ہیئت دان ہے جس نے دوربین ایجاد کی تھی۔ جب اس نے کاپرنیکی (1543ء) کے نظام شمسی کی تائید کی تو پوپ نے اسے گرفتار کر کے مذہبی عدالت کے سامنے پیش کر دیا۔ اس نے وہاں ڈر سے توبہ کر لی لیکن 1632ء میں اپنی کتاب "نظام عالم" شائع کر دی جس پر اسے جیل میں پھینک دیا گیا۔ جہاں وہ دس سال تک انتہائی دکھ اٹھانے کے بعد 1642ء میں فوت ہو گیا۔(2)

ڈاکٹر ڈریپر نے دو علماء دینی 1629ء اور سرومیٹس کا ذکر کیا ہے جنہیں کلیسا نے زندہ جلا دیا تھا۔(3)

اٹلی کے مشہور فلسفی برونو کو مذہبی عدالت نے 1600ء میں زندہ جلا دیا۔(4) کپلر (1630ء) جرمنی کا مشہور ہیئت دان تھا۔ سب سے پہلے اسی نے "کشش ارضی" اور "سمندر پر چاند کا اثر" کے نظریات پیش کئے تھے۔ (نیوٹن (1724) محض ایک شارح ہے) جب 1618ء میں اس نے اپنی کتاب "خلاصہ نظام کاپرنیکی" شائع کی تو کلیسا نے اسے کافر قرار دے دیا اور اس کی کتاب ضبط کر لی۔(5)

کولمبس (1506ء) وہ جانباز ملاح ہے جس نے آج سے ساڑھے چار سو سال پہلے، جب بحری سفر سخت خطرناک تھا، ایک کمزور سے جہاز میں بحر اوقیانوس کو عبور کیا اور ساڑھے پانچ ہزار میل سفر کے بعد 1492ء میں وہ امریکی ساحل کے قریب جزائر بہاما میں اترا۔

وہ اس سفر پر سپین کے فرمانروا فردینان کی منظوری و اجازت سے روانہ ہوا تھا۔ وہ بہاما سے واپس آیا۔ فردینان کو ایک نئے ملک کی خبر دی۔ فردینان نے اسے وہاں کا گورنر مقرر

1۔ "یورپ کے اسلام کے احسانات"، صفحہ 101، بحوالہ معرکہ مذہب و سائنس
2۔ ایضاً، صفحہ 2-101، بحوالہ معرکہ مذہب و سائنس
3۔ ایضاً
4۔ ایضاً
5۔ ایضاً، صفحہ 103

کیا۔ چنانچہ یہ دوبارہ وہاں پہنچا۔ نظم ونسق قائم کیا۔ سات سال بعد اس کی گرفتاری کے احکام صادر کر دیئے گئے۔ دنیا کا عظیم ملاح اس حال میں واپس آیا کہ ہاتھ پاؤں جکڑے ہوئے تھے۔ بادشاہ نے اسے جیل میں پھینک دیا۔ گو کچھ عرصے بعد اسے رہا کر دیا لیکن بھوک، ناداری اور بیماری نے آخر تک اس کا پیچھا کیا اور چھ برس کے بعد ایک سرائے میں اس کی وفات ہو گئی۔(1)

قرون وسطیٰ میں مسلمانوں کی حالت

قرون وسطیٰ میں یورپ کی معاشی، معاشرتی، علمی اور اخلاقی حالت کو انحصار کے ساتھ بیان کرنے کے بعد ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اب اسی دور میں مسلمانوں کی حالت پر سرسری نظر ڈال لی جائے تاکہ مشرق و مغرب کے حالات کا موازنہ کرنے میں آسانی ہو۔

اہل مغرب جس دور کو قرون وسطیٰ کے نام سے یاد کرتے ہیں، یہی دور طلوع اسلام اور اسلامی عروج وارتقاء کا دور ہے۔ اس دور میں مسلمانوں نے ایک طرف سیاسی اور عسکری فتوحات کے ذریعے ایک عالم کو اپنا زیرنگیں بنایا تو دوسری طرف انہوں نے علم اور تہذیب کے میدان میں وہ ترقی کی جس کی مثال تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔

ساتویں صدی عیسوی کے اوائل میں مدینہ طیبہ میں اسلامی ریاست کی ابتداء ہوئی اور نویں صدی عیسوی کے وسط تک اسلامی سلطنت کی حدود شمال میں بحیرہ اسود، جنوب میں ملتان، مشرق میں سمرقند اور مغرب میں جنوبی فرانس اور ساحل اوقیانوس تک پھیلی ہوئی تھیں۔

اس زمانے میں بغداد، ایران، مصر، سپین اور سسلی سے اسلامی علوم وفنون اور تہذیب و تمدن کی نورانی لہریں اٹھ رہی تھیں اور ایک عالم کو بقعہ نور بنا رہی تھیں۔

مسلمان جہاں گئے وہاں خوبصورت عمارتوں، رنگارنگ پارکوں، سڑکوں، نہروں، باغات، پلوں، تالابوں، مدرسوں اور کتب خانوں کا جال بچھا دیا۔ انہوں نے دنیا بھر سے علمی شاہپارے جمع کئے۔ انہیں جہاں بھی کسی عالم کی موجودگی کا علم ہوا، اسے دربار خلافت میں بلا کر علم کی خدمت پر لگا دیا۔

انہوں نے علماء کی حوصلہ افزائی کی جس کے نتیجے میں علماء نے یونان کے فلسفہ کو عربی میں منتقل کیا۔ اس کی خامیاں تلاش کیں اور انہوں نے اس جامد فلسفہ کو اپنے مسلسل

1۔"یورپ پر اسلام کے احسانات"، صفحہ 104، بحوالہ تاریخ پیپرز آف ہسٹری

تجربات کے ذریعے انسانیت کی فلاح اور ترقی کے لئے استعمال کیا۔ ان کی ان مسلسل کوششوں سے اسلامی شہروں اور ان شہروں میں بسنے والوں کی جو کیفیت تھی اس کی ایک جھلک پیش خدمت ہے۔

عبد مامون (813-833) میں بغداد کی آبادی دس لاکھ تھی جس میں تیس ہزار مساجد، دس ہزار حمام، ایک ہزار محل اور آٹھ سو آٹھ اطباء تھے۔ نیز ایک دار الحکمت تھا جس میں ایران، عراق، شام، مصر اور ہندوستان کے سینکڑوں حکماء دنیا بھر کے علوم وفنون کو عربی میں منتقل کر رہے تھے۔ سڑکوں پر ہر روز گلاب اور کیوڑے کا عرق چھڑکا جاتا تھا۔(1)

ول ڈیوران لکھتا ہے کہ دمشق میں سو حمام، سو فوارے، پونے چھ سو مساجد اور بے شمار باغات تھے۔ آبادی ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ تھی۔ شہر کا طول بارہ میل اور عرض تین میل تھا۔ یہاں ولید اول (705-715) نے ایک مسجد تعمیر کرائی جس پر بارہ ہزار مزدور آٹھ سال تک کام کرتے رہے۔(2)

رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے کہ عربوں کے نفیس کتانی، سوتی، اونی اور ریشمی لباس، بغداد کے حریر وپرنیاں، دمشقی مشجر، موصل کی ململ، غازہ کی جالی، غرناطہ کے اونی کپڑے، ایرانی تافتہ اور طرابلس کے شیفون نے یورپ کی نیم برہنہ آبادی کو اعلیٰ لباس کا شوقین بنادیا۔ اس قسم کے مناظر اکثر دیکھنے میں آئے کہ بشپ گرجے میں عبادت کر رہا ہے اور اس کی عبا پر قرآنی آیات کاڑھی ہوئی ہیں۔ مرد تو رہے ایک طرف عورتیں بھی عربی قمیص اور جبہ بڑے فخر سے پہنتی تھیں۔ سپین اور سسلی میں بے شمار کرگھے تھے۔ صرف اشبیلیہ میں سولہ ہزار تھے۔ قرطبہ میں ریشم بافوں کی تعداد ایک لاکھ تین ہزار تھی۔ سسلی کے پایہ تخت میں تین ہزار سے زیادہ جامہ باف تھے۔ ان کی تیار کردہ عباؤں، قباؤں اور چادروں پر قرآنی آیات بھی رقم ہوتی تھیں جنہیں عیسائی بادشاہ اور پادری فخر سے پہنتے تھے۔ سسلی میں عیسائی عورتیں نقاب اوڑھتی تھیں۔(3)

عبد الرحمن سوم (912-961) کے زمانے میں قرطبہ کی آبادی پانچ لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ اس میں سات سو مساجد، تین سو حمام، ایک لاکھ تیرہ ہزار مکانات، اکیس مضافاتی

1۔ "یورپ پر اسلام کے احسانات"، صفحہ 124
2۔ ول ڈیوران "دی ایج آف فیتھ" (نیویارک۔ 1950)، صفحہ 230
3۔ "یورپ پر اسلام کے احسانات"، صفحہ 125، بحوالہ تشکیل انسانیت

بستیاں اور ستر لائبریریاں تھیں۔ اس میں شیشہ سازی اور چمڑہ رنگنے کے کارخانے بھی تھے۔ مسلمانوں نے سسلی میں نہریں نکالیں۔ دور دور سے شفتالو اور لیموں وغیرہ کے درخت منگا کر لگائے۔ کپاس اور بیشکر کو عام کیا۔ ریشم کو رواج دیا۔ تعمیرات میں سرخ و سفید پتھر استعمال کیے۔ نوکدار محرابوں، آرائشی طاقچوں، جالیوں اور میناروں کو مقبول بنایا۔ محلات و مساجد پر خط طغرائی میں آیات نویسی کا سلسلہ شروع کیا۔ جابجا درس گاہیں اور کتب خانے قائم کیے۔ ایک سو تیرہ بندرگاہیں بنائیں اور وہاں کے لوگ اسلامی تہذیب سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کا لباس، تمدن، نظام تعلیم اور رہن سہن سب کچھ اسلامی سانچے میں ڈھل گیا۔(1)

مسلمانوں کی شان و شوکت

قرون وسطیٰ میں مشرقی یورپ پر قیصر کا تسلط تھا اور مغربی یورپ پر پوپ کا۔ یورپ کی یہ دونوں بڑی طاقتیں مختلف زمانوں میں مسلمانوں کی باجگزار رہی ہیں۔

مسلمانوں نے 829ء میں اٹلی پر حملہ کیا اور 872ء میں روم تک جا پہنچے۔ اس وقت پوپ جان ہشتم مسند پاپائیت پر فائز تھا۔ اس نے ہتھیار ڈال دیئے اور مسلمانوں کو جزیہ دینا منظور کر لیا۔(2)

اسی طرح قیصر قسطنطنیہ بھی مسلمانوں کا باج گزار تھا۔ قیصر نائیسیفورس نے ہارون الرشید کو جزیہ دینے سے انکار کر دیا۔ ہارون الرشید نے جوابی کاروائی کے طور پر اسے خط لکھا جس میں یہ تاریخی جملے لکھے:

امیر المومنین ہارون الرشید کی طرف سے رومی کتے کے نام۔

اے فاحشہ ماں کے بچے! میں نے تمہارا خط پڑھا۔ اس کا جواب تو عنقریب اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔ چند روز بعد قیصر پر حملہ کیا۔ اسے شکست فاش دی اور دوبارہ باج گزاری پر مجبور کر دیا۔(3)

تاریخ بتاتی ہے کہ مائیکل ہفتم (1067-1078) سلجوقی بادشاہوں کو خراج دیتا تھا۔(4)

1۔ "یورپ کے اسلام کے احسانات"، صفحہ 26-125

2۔ ایضاً، صفحہ 127، بحوالہ تمدن عرب

3۔ ایضاً، بحوالہ معرکہ مذہب و سائنس

4۔ ایضاً

مسلمانوں کی بلند اخلاقی

اسلام کی تعلیمات میں حسن اخلاق کو انسانیت کا زیور قرار دیا گیا ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ تم میں حسین ترین شخصیت کا مالک وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں۔ حضور ﷺ معلم اخلاق کی حیثیت سے اس دنیا میں تشریف لائے۔

قرآن حکیم کی تعلیمات اور حضور ﷺ کے ارشادات نے امت مسلمہ کو بلند اخلاقی کے جس زیور سے آراستہ کیا، اس کی جھلک مسلمان معاشروں میں ہر دور میں عیاں نظر آتی رہی ہے۔ درحقیقت یہی بلند اخلاقی مسلمانوں کا اصل ہتھیار رہا ہے جس کی بدولت وہ دشمنوں کے دل جیتنے میں کامیاب ہوئے اور مفتوح اقوام کے دلوں میں اپنے لئے عقیدت و احترام کا وہ جذبہ پیدا کیا کہ اس کی مثال تاریخ اقوام و ملل میں ملنی محال ہے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مسلمان اہل شام سے جزیہ وصول کرتے تھے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ مسلمان رومیوں کے دباؤ کی وجہ سے اس علاقے کو چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔ حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے، جو مسلمانوں کے سپہ سالار تھے، شامیوں سے وصول کردہ تمام جزیہ واپس کر دیا اور فرمایا: ہم نے یہ جزیہ تم سے اس شرط پر وصول کیا تھا کہ ہم تمہاری حفاظت کریں گے۔ موجودہ حالات میں ہم تمہاری حفاظت نہیں کر سکتے اس لئے تمہارا مال واپس کر رہے ہیں۔

کیا رقت انگیز منظر تھا کہ مسلمان رخت سفر باندھ رہے تھے اور عیسائی مسلمانوں کو جاتے ہوئے دیکھ کر زار و قطار رو رہے تھے۔ ان کا پوپ انجیل ہاتھ میں پکڑ کر کہہ رہا تھا: "اس مقدس کتاب کی قسم! اگر کبھی ہمیں اپنا حاکم خود منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا تو ہم عربوں کو ہی منتخب کریں گے۔"(1)

سلجوقی سلطان الپ ارسلان نے قیصر رومنس کو شکست دے کر گرفتار کر لیا۔ قیصر کو سلطان کے سامنے پیش کیا گیا۔ سلطان نے پوچھا: اگر میں تمہارے پاس گرفتار ہو کر پیش ہوتا تو تم میرے ساتھ کیا سلوک کرتے؟ قیصر نے جواب دیا: میں کوڑوں سے تمہاری کھال کھینچ لیتا۔ سلطان نے کہا: مسلم اور عیسائی میں یہی فرق ہے۔ اس کے بعد قیصر کی خدمت میں بیش بہا تحائف پیش کئے اور اسے بڑے احترام کے ساتھ رخصت کیا۔(2)

1۔ "یورپ پر اسلام کے احسانات"، صفحہ 128
2۔ ایج آف فیتھ، صفحہ 308

برطانیہ کے بادشاہ رچرڈ شیر دل کو صلیبی جنگوں کا ہیرو سمجھا جاتا ہے۔ وہ سلطان صلاح الدین ایوبی کے خلاف مسلسل برسر پیکار رہا۔ ایک مرتبہ جب وہ بیمار ہوا تو بیماری کے دنوں میں سلطان صلاح الدین ایوبی اسے مفرحات اور پھل وغیرہ بطور تحفہ بھیجتا رہا۔(1)

موسیو لیبان لکھتا ہے:

عربوں نے چند صدیوں میں اندلس کو مالی اور علمی لحاظ سے یورپ کا سر تاج بنادیا۔ یہ انقلاب صرف علمی اور اقتصادی نہ تھا بلکہ اخلاقی بھی تھا۔ انہوں نے نصاریٰ کو انسانی خصائل سکھائے۔ ان کا سلوک یہود و نصاریٰ کے ساتھ بھی وہی تھا جو مسلمانوں کے ساتھ تھا۔ انہیں سلطنت کا ہر عہدہ مل سکتا تھا۔ مذہبی مجالس کی کھلی اجازت تھی۔

یہ وہ سلوک تھا جس سے متاثر ہو کر صرف غرناطہ میں انیس لاکھ سے زیادہ عیسائیوں نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ اسی سلوک کی وجہ سے مسلمان جس علاقے میں گئے، وہاں ان کی شان و شوکت اور ان کے دین کی عظمت کے پرچم صدیوں لہراتے رہے۔

مسلمانوں کی علم دوستی

اسلام علم و عمل کا دین ہے۔ اس کی الہامی کتاب کا جو پہلا جملہ نازل ہوا وہ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ (2) تھا۔ یعنی پڑھیے اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے (سب کو) پیدا فرمایا۔ قرآن حکیم نے بار بار علم کی عظمت کو بیان فرمایا اور حضور ﷺ نے اپنے ارشادات سے مسلمانوں کے دلوں میں علم کی محبت کا جذبہ پیدا فرمایا جس کی وجہ سے ان کی کثیر تعداد نے اپنی زندگیاں علم کے لئے وقف کر دیں۔ انہوں نے اپنی مادی ضروریات سے بے نیاز ہو کر الٰہی علم کے نور سے اپنے سینوں کو منور کیا۔ انہوں نے قرآن حکیم کے ایک ایک لفظ کو اپنے سینوں میں محفوظ کیا، اسے سپرد قلم کیا اور پھر پورے خلوص کے ساتھ اسے ملت کی آئندہ نسلوں کی طرف منتقل کیا۔

انہوں نے حضور ﷺ کی حیات طیبہ کا مکمل اور جامع ریکارڈ تیار کیا۔ جو بات آپ کی زبان پاک سے نکلی یا جو کام آپ نے کیا اسے پوری محنت اور دیانتداری سے آئندہ نسلوں کو منتقل کیا۔

1۔ "یورپ پر اسلام کے احسانات"، صفحہ 129

2۔ سورۃ العلق: 1

قرآن حکیم نے مسلمانوں کو انفس و آفاق میں غور و تدبر کرنے کا بار بار حکم دیا اور مسلمانوں نے اس ارشاد خداوندی کی تعمیل میں اپنی زندگیاں کائنات کے مخفی رازوں کا کھوج لگانے کے لئے صرف کر دیں۔

جب یورپ جہالت کی تاریکیوں میں سر سے پاؤں تک ڈوبا ہوا تھا اس وقت مسلمانوں کی علمی حالت کیا تھی، اس کی چند جھلکیاں پیش خدمت ہیں۔

یزید اول (680) کے بیٹے خالد نے ایک دارالترجمہ قائم کیا جس میں ایک پادری ایرن نامی نگرانی پر مامور تھا۔ خود خالد بھی مصنف تھا۔ ابن الندیم نے، الفہرست، میں اس کی چار کتابوں کے نام دیئے ہیں۔(1)

عباسی خلفاء نے دنیا کے ہر حصے میں آدمی بھیجے جو کتابوں کے انبار لے کر واپس آئے۔ جہاں بھر کے علماء اور حکماء دربار خلافت میں طلب ہوئے اور تصنیف و ترجمہ پر مامور ہوئے۔ ان لوگوں نے تھیلز (پ 640 ق م) سے لے کر بطلیموس (151ء) تک کی تصانیف عربی میں منتقل کر ڈالیں۔ جالینوس اور ارسطو کی شرحیں لکھیں۔ بطلیموس کے بعض مشاہدات پر تنقید کی اور نہایت محنت سے ستاروں کے مقام و حرکت کی فہرستیں بنائیں۔ خسوف و کسوف کے اسباب بتائے۔ زمین کی جسامت متعین کی۔ کئی قسم کے اصطرلاب بنائے۔ علماء کے ساتھ بعض وزراء، امراء اور سلاطین بھی کتب خانوں اور رصد گاہوں میں جا بیٹھے۔ حکمت یونان کو، جسے دنیا بھول چکی تھی، پھر زندہ کیا۔ قرطبہ سے سمرقند تک ہزاروں درس گاہیں قائم کیں۔ ان میں طلبہ کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ بقول ول ڈیوران: جغرافیہ دانوں، مورخوں، منجموں، فقیہوں، محدثوں، طبیبوں اور حکیموں کے ہجوم سے سڑکوں پر چلنا مشکل تھا۔(2)

جب سلطان محمود غزنوی کو معلوم ہوا کہ خوارزم شاہی دربار میں البیرونی اور ابن سینا جیسے علماء موجود ہیں تو خوارزم شاہ کو پیغام بھیجا کہ یہ علماء اس کے پاس بھیج دیئے جائیں ورنہ خوارزم شاہی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجادی جائے گی۔ محمود کے دربار میں چار سو علماء و شعراء تھے۔ پروفیسر براؤن لکھتا ہے کہ محمود اہل علم کو اغوا کیا کرتا تھا۔(3)

1۔"یورپ پر اسلام کے احسانات"، صفحہ 137

2۔ایضاً، صفحہ 138، ایج آف فیتھ، صفحہ 237

3۔ایضاً، صفحہ 139

ایک مرتبہ مامون نے قیصر روم کو لکھا کہ وہاں کے ایک حکیم لیونامی کو دربار خلافت میں بھیج دیجئے۔ اس کے عوض چالیس من سونا دینا نیز دائمی صلح کا وعدہ کیا۔ (1)
مامون علمائے دارالحکمت کی تصانیف کو سونے میں تو لتا اور یہ سونا مصنف کو دے دیتا تھا۔ (2)
جب شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ (1291ء) بغداد کے دارالعلوم نظامیہ میں داخل ہوئے اس وقت زیر تعلیم طلبہ کی تعداد سات ہزار تھی۔ اور اس میں ابھی مزید طلبہ کی گنجائش تھی۔ مرزا حیرت دہلوی اپنی کتاب (حالات سعدی) میں لکھتے ہیں کہ دارالعلوم نظامیہ پورا ایک شہر تھا۔ لاتعداد کمرے اور ایک وسیع ہال جس میں دس ہزار انسان سما سکتے تھے۔ دارالعلوم میں قرآن، حدیث، فقہ، فلسفہ، ریاضی، ہیئت اور دیگر علوم کی تدریس کا پورا انتظام تھا۔ ایک شعبہ اجنبی زبانوں کا تھا جہاں یونانی، عبرانی، لاطینی، سنسکرت اور فارسی پڑھائی جاتی تھیں۔ تیر اندازی، تیغ بازی اور گھڑسواری کی بھی مشق کرائی جاتی تھی۔ (3)
جب گیارہویں صدی میں اٹلی کا ایک پادری پیٹر نامی حصول علم کے لئے سپین گیا تو اس نے قرطبہ اور غرناطہ میں ہر خطے کے طلبہ دیکھے۔ جن میں چند ایک انگریز بھی تھے۔ اساتذہ کا سلوک بیرونی ممالک کے طلبہ سے بڑا فیاضانہ اور مشفقانہ تھا۔ خلیفہ کے محل میں ایک بہت بڑا کتب خانہ تھا۔ جس میں کتابوں کی تعداد چار لاکھ تھی۔ وہاں کاتبوں، جلد سازوں اور نقاشوں کا بھی ایک بہت بڑا گروہ تھا جن کا کام کتابوں کو نقل کرنا اور جلد باندھنا تھا۔ خلیفہ کے درجنوں قاصد دنیا بھر سے کتابیں جمع کرنے پر مامور تھے۔ (4)
جامعہ قرطبہ عربوں کی قدیم ترین یونیورسٹی تھی جس کی بنیاد عبد الرحمٰن سوم (912-961) نے ڈالی تھی۔ اس میں یورپ، افریقہ اور ایشیا سے طلبہ آتے تھے۔ اس کی لائبریری میں چھ لاکھ کتابیں تھیں۔ اس کی فہرست چوالیس جلدوں میں تیار ہوئی تھی۔ (5)
عربوں نے ایک درس گاہ طلیطلہ میں قائم کی تھی۔ جہاں یورپ کے ہر حصے سے طلبہ آتے تھے۔ اس کالج سے بڑے بڑے اہل قلم نکلے مثلاً رابرٹ (1140) جس نے قرآن حکیم اور خوارزمی کے الجبرا کو لاطینی میں منتقل کیا تھا۔ مائیکل سکاٹ، ڈینیل مارلے اور ایڈل

1۔ "یورپ پر اسلام کے احسانات"، صفحہ 140
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً، صفحہ 142 بحوالہ معرکہ مذہب و سائنس
4۔ ایضاً، 3-142
5۔ ایضاً، صفحہ 143

ہارڈ، جنھوں نے عربوں سے علوم سیکھے اور پھر یورپ میں علم کی روشنی پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔(1)

مسلمانوں نے اٹلی اور فرانس کے مختلف شہروں میں بھی مدارس قائم کئے تھے۔ جہاں مسلمان فلاسفہ کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔(2)

مسلمانوں نے نہ صرف مدارس قائم کئے، کتابیں لکھیں بلکہ خلفاء، سلاطین اور امراء کی علم دوستی نے کتابوں سے محبت کو ملت اسلامیہ کی پہچان بنادیا۔ دنیائے اسلام میں جہاں ہر یونیورسٹی اور کالج کے ساتھ ایک بہت بڑا کتب خانہ قائم تھا وہاں بے شمار لوگوں کے ذاتی کتب خانے بھی تھے۔ ان نجی کتب خانوں میں کتابوں کے قیمتی ذخائر موجود تھے۔ چند کتب خانوں کی تفصیل پیش خدمت ہے:

محدث ابن شہاب الزہری (742ء) کی کتابیں اس قدر تھیں کہ جب وہ ایک کتب خانے میں منتقل کی گئیں تو کئی خراور خچر استعمال ہوئے۔(3)

حماۃ (شام) کے والی ابوالفداء (1331ء) جو بحیثیت مورخ بہت مشہور ہے، کے پاس بہت بڑا کتب خانہ تھا جس میں دو سو علماء وکاتبین کتابیں لکھنے اور نقل کرنے پر مامور تھے۔(4)

جب نصیر الدین طوسی نے ایران کے ایک شہر مراغہ میں رصد گاہ قائم کی تو ساتھ ہی ایک لائبریری بھی بنائی جس میں چار لاکھ کتابیں تھیں۔(5)

حملہ تاتار کے وقت (1258ء) بغداد میں چھتیس سرکاری لائبریریاں تھیں اور ہر تعلیم یافتہ آدمی کے پاس بھی کتب کا خاصا ذخیرہ تھا۔(6)

جس زمانے میں عالم اسلام میں کتابوں کی یہ بہتات تھی اس زمانے میں عیسائیوں کی سب سے بڑی لائبریری کنٹربری میں تھی جس میں صرف پانچ ہزار کتابیں تھیں اور دوسری بڑی لائبریری کلونی (فرانس) میں تھی جہاں کل پانچ سو ستر کتابیں تھیں۔(7)

لطف کی بات یہ ہے کہ جس زمانے میں یورپ کی سب سے بڑی لائبریری صرف پانچ

1۔ "یورپ پر اسلام کے احسانات"، صفحہ 144

2۔ ایضاً، بحوالہ تشکیل انسانیت

3۔ ایضاً، صفحہ 146، بحوالہ ابن سعد

4۔ ایضاً 5۔ ایضاً، صفحہ 148، بحوالہ وفیات الاعیان

6۔ ایج آف فیتھ، صفحہ 237

7۔ ایج آف فیتھ، صفحہ 909

ہزار کتابوں پر مشتمل تھی، ول ڈیوران اس زمانے کے بارے میں بڑے فخر سے کہتا ہے کہ لائبریریوں کی یورپ میں کثرت تھی، حالانکہ یہ وہی زمانہ ہے جب عالم اسلام میں بیشمار لائبریریاں تھیں اور ایک ایک لائبریری میں لاکھوں کی تعداد میں کتابیں تھیں۔

مسلمانوں کے علمی کارنامے

مسلمانوں نے علم اور سائنس کی دنیا میں جو کارنامے سرانجام دیئے ان کی فہرست بڑی طویل ہے۔ یورپ نے اپنے دور عروج میں جو سائنسی ترقی کی ہے اس کی بنیادیں مسلمانوں نے ہی رکھی تھیں۔

کولمبس بحر اوقیانوس کو عبور کر کے امریکہ جا پہنچا تھا لیکن اس مہم کے لئے اس نے جو قطب نما استعمال کیا تھا وہ مسلمانوں نے ایجاد کیا تھا۔ اسی کی مدد سے مسلمانوں کے جہاز جدہ سے چین تک جاتے تھے اور اسی کی مدد سے واسکوڈے گاما ہندوستان تک نکل گیا تھا۔

بارود جسے اہل یورپ راجر بیکن کی ایجاد سمجھتے ہیں، وہ راجر بیکن سے صدیاں پہلے مسلمان استعمال کر رہے تھے۔

نویں صدی عیسوی میں قرطبہ کے مسلمان سائنسدان ابن فرناس نے عینک، میزان الوقت اور اڑنے والی ایک مشین یعنی طیارہ ایجاد کر کے بنی نوع انسان کی مادی ترقی کی بنیادیں رکھ دی تھیں۔(1)

سپین کی مصنوعات کو افریقہ اور ایشیا لے جانے والا بحری بیڑا ہزار جہازوں پر مشتمل تھا۔ سینکڑوں بندرگاہوں سے بحری جہاز تجارتی مقاصد کے لئے سپین کی بندرگاہوں پر لنگر انداز ہوتے تھے۔(2)

ہم یہاں اس دور کے مسلمان سائنسدانوں کی چند ایک حیران کن ایجادات کا تذکرہ کرتے ہیں تاکہ ان سے مسلمانوں کی سائنسی مہارت کا اندازہ ہو سکے۔

جرمنی کا شہنشاہ فریڈرک عربی علوم وتہذیب کا دلدادہ تھا۔ وہ پوپ کے حکم سے صلیبی جنگوں میں شامل ہوا۔ مصر و شام کے مسلمان بادشاہ محمد الکامل نے اس کا دوستانہ استقبال کیا۔ جب فریڈرک رخصت ہوا تو الکامل نے اسے ایک کلاک بطور تحفہ دیا۔ کلاک پر ایک چاند

1۔ ایج آف فیتھ، صفحہ 298

2۔ ایضاً

اور ایک سورج بنا ہوا تھا اور کلاک کے آفتاب و ماہتاب، آسمانی آفتاب و ماہتاب کی حرکت کے عین مطابق حرکت کرتے تھے۔ موسم کی تبدیلی کے باوجود ان کی حرکت آسمانی سورج اور چاند کی حرکت کے عین مطابق رہتی تھی۔(1)

سسلی میں ایک نارمن امیر رابرٹ وسکرڈ کو سنگ مرمر کے چبوترے پر نصب ایک مورتی نظر آئی۔ مورتی کے سر پر کانسی کا تاج تھا اور اس پر یہ الفاظ کندہ تھے: "یکم مئی کو غروب آفتاب کے وقت میرے سر پر سونے کا تاج ہوگا۔" کئی علماء سے اس عبارت کا مفہوم پوچھا گیا لیکن کوئی جواب نہ دے سکا۔ ایک مسلم قیدی کو جب صورت حال کا علم ہوا تو اس نے کہا: "اگر مجھے آزاد کر دیا جائے تو میں اس معمہ کو حل کر سکتا ہوں۔" اسے آزاد کر دیا گیا۔ اس نے بتایا کہ یکم مئی کو غروب آفتاب کے وقت اس جگہ کو کھودا جائے جہاں مورتی کے سر کا سایہ پڑ رہا ہو، وہاں سے خزانہ نکلے گا۔ مقررہ تاریخ پر اس جگہ کو کھودا گیا اور سچ مچ وہاں سے بہت بڑا خزانہ برآمد ہوا۔(2)

ترکستان کے ایک شہر نخشب میں حکم بن ہاشم نے ایک چاند بنایا تھا جو غروب آفتاب کے ساتھ نخشب کے ایک کنوئیں سے نکلتا۔ تقریباً سو مربع میل رقبے کو رات بھر منور کرتا اور طلوع آفتاب سے عین پہلے ڈوب جاتا۔ ہر موسم میں اس کا طلوع و غروب سورج کی حرکت کے مطابق ہوتا۔ یہ چاند، ماہ نخشب کے نام سے اسلامی ادب میں بہت شہرت رکھتا ہے۔(3)

اسلام کے یورپ پر اثرات

ہم نے گزشتہ صفحات میں عیسائی مغرب اور اسلامی مشرق کے معاشی، سماجی، علمی اور اخلاقی حالات کا تقابلی جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ جائزہ اس حقیقت کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ جب مسلمانوں کی یونیورسٹیاں علم و فن کے موتی لٹا رہی تھیں، اس وقت یورپ سر سے پاؤں تک جہالت میں ڈوبا ہوا تھا۔ جب مسلمان علماء کے قلم سے ہزاروں علمی شاہپارے نکل رہے تھے، اس وقت یورپ کی اکثریت کتاب کے نام تک سے ناآشنا تھی۔ جب مسلمانوں کے شہر اپنی صفائی اور خوبصورتی کی وجہ سے دل و نگاہ کو اپنی طرف کھینچ

1۔"یورپ پر اسلام کے احسانات"، صفحہ 129
2۔ایضاً، صفحہ 174، بحوالہ تمدن عرب
3۔ایضاً، صفحہ 175

رہے تھے، اس وقت یورپ کے شہروں میں گندگی، غلاظت اور تاریکی کے سوا کچھ نہ تھا۔ جب عالم اسلام کی زمینیں رنگا رنگ باغات اور لہلہاتی کھیتیوں کی وجہ سے رشک ارم نظر آتی تھیں، اس وقت یورپ کی زمینیں بنجر اور غیر آباد تھیں۔ جب مسلمان انسانی اخلاق کی بلندیوں پر فائز نظر آتے تھے، اس وقت یورپ کو حسن اخلاق کی ہوا بھی نہ لگی تھی۔ جب مسلمانوں کے ہسپتالوں میں ہر قسم کے امراض کے علاج کے لئے بہترین سہولتیں موجود تھیں اور ماہر اطباء کی نگرانی میں ہر قسم کے مریضوں کے مفت علاج کئے جارہے تھے، اس وقت یورپ کے طبیب چند ٹوٹکوں کے سوا کچھ نہ جانتے تھے اور یہ ٹوٹکے اکثر مریضوں کی زندگی سے کھیل جاتے تھے۔

یہ انسانی فطرت ہے کہ اندھیروں میں بھٹکنے والا انسان اس طرف دوڑتا ہے جہاں اسے روشنی کی کرن نظر آتی ہے۔ اہل یورپ نے بھی یہی کچھ کیا۔ جب انہیں اپنے ہاں ہر طرف تاریکی اور ظلمت نظر آئی تو انہوں نے علم، تہذیب، اخلاق اور خوش حالی کا درس لینے کے لئے مسلمانوں کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔

علم کے پیاسے یورپ کے طول و عرض سے اسپین کے اسلامی مدارس کی طرف دوڑ پڑے۔ انہوں نے عربوں سے علم سیکھا، تہذیب سیکھی اور پھر یورپ کو علم و تہذیب کے نور سے منور کرنے کے لئے اپنی زندگیاں وقف کردیں۔

یورپ زندگی کے ہر میدان میں اسلامی تہذیب سے متاثر ہوا۔ زراعت، صنعت، تجارت، صحت، علم، ادب، تہذیب، تمدن اور اخلاق ہر میدان میں مسلمانوں نے یورپ پر اتنے گہرے اثرات چھوڑے کہ یورپ کی تہذیبی تاریخ ہی بدل گیا۔

یورپ پر اسلامی تہذیب کے اثرات کتنے گہرے تھے؟ اس کا اندازہ ان حقائق سے لگائیے۔ ول ڈیوران لکھتا ہے:

اندلسی مسلمانوں نے چاول، گنا، انار، کپاس، ریشم، کیلا، سنگترہ، لیموں، کھجور اور پنیر وغیرہ کی کاشت کا فن ایشیا سے درآمد کیا اور پھر اہل یورپ کو یہ فن سکھایا۔ انگور کی کاشت مسلمانوں کے ہاں ایک مقبول صنعت تھی۔ قرطبہ، غرناطہ، ویلنشیا کے گردونواح کے پھل دار باغات، زیتون کے درختوں کے جھنڈوں اور مرغزاروں نے اسپین کو دنیا کا باغیچہ بنادیا تھا۔(1)

1۔ دی ایج آف فیتھ، صفحہ 298

یہی مصنف لکھتا ہے:

عیسائی یورپ سے پادری اور عام آدمی پوری آزادی اور امن کے ساتھ طالب علم، زائر اور سیاح بن کر قرطبہ، طلیطلہ اور سیول آتے جاتے تھے۔ عیسائی پادری اس صورت حال پر کڑھتے تھے۔ انہیں اس بات پر بڑا دکھ ہوتا تھا کہ عیسائیوں نے عربی علم وادب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے اور وہ عربی کے سوا کوئی زبان پسند کرتے ہیں اور نہ ادب۔ ایک عیسائی پادری بڑے دکھ کے ساتھ لکھتا ہے: ''میرے ہم مذہب عیسائی عربوں کی شاعری اور رومانوی ادب پڑھ کر خوش ہوتے ہیں۔ وہ مسلمان فقہاء اور فلاسفہ کا کلام پڑھتے ہیں۔ اور وہ ان چیزوں کو ان کی تردید کی خاطر نہیں پڑھتے بلکہ اس لئے پڑھتے ہیں تاکہ عربی ادب کی صحیح روح سے آشنا ہو سکیں۔ ہائے افسوس! وہ عیسائی نوجوان، جو اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے نمایاں ہیں، عربی زبان وادب کے سوا کسی زبان سے واقف ہیں اور نہ ہی کسی اور ادب سے۔ وہ عربی کتابوں کو بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ وہ کثیر رقم خرچ کر کے عربی کتابوں کے انبار اکٹھے کرتے ہیں۔ اور ہر جگہ ان کی زبانوں سے عربی زبان وادب کی تعریف سنائی دیتی ہے۔''(1)

سسلی کے فرمانروا ولیم دوم (1166-1189) اور فریڈرک دوم (1212-1250) عربی کے عالم تھے۔ ولیم عموماً عربی میں گفتگو کیا کرتا تھا اور فریڈرک نے سلطنت کے طول و عرض میں ایسے مدارس کھول دیئے تھے جہاں عربی کی تعلیم لازمی تھی۔ جرمنی کی دو راہبات یعنی ہل ڈی گراڈ (1179) اور یوراس ویٹانے بڑی تعداد میں ایسے سکول کھولے جن میں عربی علوم پڑھائے جاتے تھے۔

ولیم فاتح برطانیہ (1066-1086ء) کے ہمراہ یہودیوں کی ایک خاصی تعداد فرانس سے برطانیہ پہنچی تھی۔ یہ لوگ عربی کے عالم تھے۔ انہوں نے انگلینڈ میں عربی مدارس کھولے۔ ایک مدرسہ آکسفورڈ میں جاری کیا۔ راجر بیکن اسی مدرسے کا فارغ التحصیل تھا جو آکسفورڈ یونیورسٹی کا پروفیسر مقرر ہوا۔ وہ اپنے طلبہ سے کہا کرتا تھا کہ حقیقی علم حاصل کرنے کا واحد ذریعہ عربی زبان ہے۔(2)

جرمنی کا عظیم القدر فلسفی البرتوس میگنوس (1206-1280) اور اٹلی کا فلسفی پادری طامس ایکوناس (1225-1274) عربی مدارس کے فارغ التحصیل تھے۔ ان دونوں نے فلسفے

1۔ ''دی ایج آف فیتھ''، صفحہ 300-299

2۔ ''یورپ پر اسلام کے احسانات''، صفحہ 161، بحوالہ تشکیل انسانیت

پر کتابیں لکھیں اور فارابی، سینا اور الکندی کے دلائل کو ہضم لے لیا۔ مسلمان حکماء نے یورپ کے پادریوں کو فلسفہ بھی دیا اور طب بھی یعنی انہوں نے پادری بھی پالے اور گلیلیو جیسے ہیئت دان بھی۔

1473ء میں فرانس کے بادشاہ لوئی یازدھم (1461-1483) نے فرانس کے تمام مدارس میں ابن رشد کے فلسفے کی تدریس کو لازمی قرار دیا۔ اٹلی کی ایک یونیورسٹی (پیڈوا) میں بھی ابن رشد کا فلسفہ شامل نصاب تھا۔(1)

ہم نے محض نمونے کے طور پر چند مثالیں پیش کی ہیں۔ اسلامی تہذیب کے یورپ پر اثرات ہمہ گیر تھے ان کا احاطہ یہاں ممکن نہیں ہے۔

جو حقائق گزشتہ صفحات میں بیان کیے گئے ہیں ان کے مطالعہ سے انسان اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اہل یورپ ابتداءً اسلامی علم و ادب، تہذیب و تمدن، صنعت و حرفت اور انداز حیات سے متاثر ہو کر مشرق کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ مشرق و مغرب کے درمیان صلیبی جنگوں کے نام سے جو معرکے صدیوں تک جاری رہے تھے انہوں نے بھی اہل مغرب کو مسلمانوں کی تہذیب اور ان کے تمدن کی طرف متوجہ کیا تھا۔ گزشتہ صفحات میں قارئین نے پڑھا ہے کہ سسلی کا بادشاہ فریڈرک دوم صلیبی لشکر کے ساتھ مشرق گیا تھا اور اس کے مصر و شام کے بادشاہ محمد الکامل کے ساتھ دوستانہ مراسم قائم ہو گئے تھے۔ اور رچرڈ شیر دل بھی اپنے دشمن نمبر ایک صلاح الدین ایوبی کے کردار سے زبردست متاثر ہوا تھا۔

جرمن مستشرقہ زیگرید ہونکہ نے اپنی کتاب "شمس العرب تسطع علی الغرب" میں اسامہ بن منقذ کے حوالے سے لکھا ہے کہ صلیبی جنگوں کے دوران فرنگی مغربی اطباء پر بھروسہ نہیں کرتے تھے بلکہ وہ اپنے مختلف امراض کا مشرقی اطباء سے علاج کروانے کو ترجیح دیتے تھے۔ اس مستشرقہ نے اس ضمن میں ایک واقعہ لکھا ہے جو طب کے میدان میں اہل مغرب کی بے مائیگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ واقعہ کی تفصیل حسب ذیل ہے:

منیطرہ کے حاکم نے اسامہ بن منقذ کے ماموں کو، جو قلعہ شیزر کا حاکم تھا، لکھا کہ وہ ان کے پاس ایک طبیب بھیجیں جو ان کے مریضوں کا علاج کرے۔ حاکم قلعہ نے ایک عیسائی طبیب ثابت نامی کو ان کے پاس بھیج دیا۔ ثابت صرف دس دن کے بعد قلعہ میں واپس آ

1۔ "یورپ پر اسلام کے احسانات"، صفحہ 162، بحوالہ انٹر ڈکشن ٹو ہسٹری آف ویسٹرن یورپ

گیا۔ اس سے پوچھا گیا کہ تم اتنی جلدی اپنے فرائض سے فارغ ہو کر کیسے واپس آگئے ہو؟ اس نے بتایا کہ فرنگیوں نے دو مریض علاج کیلئے اس کے حوالے کئے۔ ایک مرد تھا جس کے پاؤں پر ایک پھوڑا نکل آیا تھا اور دوسری ایک عورت تھی جو کسی نسوانی مرض میں مبتلا تھی۔ اس نے ان دونوں کا علاج شروع کیا کہ ایک فرنگی طبیب وہاں آیا اور اس نے ان دونوں مریضوں کا علاج کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اسے ان کا علاج کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ اس نے اس مرد سے کہا: تو ایک پاؤں کے ساتھ زندہ رہنا پسند کرتا ہے یا یہ چاہتا ہے کہ تیرے دونوں پاؤں باقی رہیں اور تجھے موت آجائے؟ مریض نے ایک پاؤں کے ساتھ زندہ رہنے کو ترجیح دی۔ طبیب نے ایک طاقتور نوجوان اور ایک تیز کلہاڑا منگایا۔ مریض کا پاؤں ایک لکڑی پر رکھا اور نوجوان سے کہا: کلہاڑے کا ایک ہی بھرپور وار کر کے اس کا پاؤں کاٹ دو۔ نوجوان نے کلہاڑے کا بھرپور وار کیا لیکن مریض کا پاؤں نہ کٹا۔ اس نے دوسرا وار کیا جس سے مریض کی پنڈلی کا گودا بہہ نکلا اور مریض کا کام تمام ہو گیا۔

طبیب صاحب نے عورت کو دیکھا اور فرمایا اس کے سر میں شیطان ہے جو اس عورت سے محبت کرتا ہے، تم اس کے سر کے بال کاٹ دو۔ بال کاٹ گئے لیکن عورت کو افاقہ نہ ہوا۔ طبیب نے فیصلہ دیا کہ شیطان اس کے سر کے اندر داخل ہو گیا ہے۔ اس نے استرا لے کر عورت کے سر کو چیرا حتی کہ سر کی ہڈی نظر آنے لگی۔ طبیب نے اس زخم پر نمک چھڑکا اور عورت بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ ثابت کہتا ہے کہ اس نے فرنگیوں سے پوچھا کہ کیا اب اس کی کچھ ضرورت ہے؟ تو انہوں نے نفی میں جواب دیا اور ثابت اپنے لشکر میں واپس آگیا۔(1)

زیغرید ھونکہ نے اس سے ملتا جلتا ایک اور لطیفہ نقل کیا ہے کہ امیر (دیدو ثانی) بہت موٹا تھا۔ اس نے اپنے موٹاپے کے بارے میں ایک طبیب سے مشورہ کیا۔ طبیب نے فوراً استرا لیا۔ امیر کے پیٹ کو چاک کیا اور اسکے جسم سے زائد چربی کو علیحدہ کرنے کی کوشش کی۔ بے چارہ امیر اس احمقانہ اپریشن کے نتیجے میں جاں بحق ہو گیا۔(2)

جو لوگ اپنی آنکھوں سے اس قسم کے اپریشنوں اور علاج کا مشاہدہ کرتے ہوں گے ان کا بیماری کی حالت میں مسلمان اطباء کی طرف رجوع کرنا ایک قدرتی امر تھا۔

صلیبی جنگوں نے جہاں ایک طرف فریقین کو زبردست جانی اور مالی نقصان پہنچایا وہاں

1۔ المستشرقۃ الالمانیۃ زیغرید ھونکہ، "شمس العرب تسطع علی الغرب"، (بیروت 1979) صفحہ 216
2۔ ایضاً، صفحہ 217

ان کی وجہ سے مشرق و مغرب کو ایک دوسرے کو سمجھنے کے مواقع بھی میسر آئے۔ صدیوں کا یہ ملاپ گو معاندانہ ہی تھا لیکن صلیب وہلال کی کشمکش کے دوران کئی مواقع ایسے آتے رہتے تھے جب مسلمان اور عیسائی آپس میں آزادانہ ملتے اور ایک دوسرے کی تہذیب کو دیکھتے تھے۔ وہ دونوں تہذیبوں کی خوبیوں اور خامیوں کا موازنہ کرتے اور جس طرح عام دستور ہے کہ دو تہذیبوں کے ٹکراؤ میں طاقتور تہذیب، کمزور تہذیب کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے، یہی اس وقت بھی ہوا۔ اسلامی تہذیب نے یورپی تہذیب کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ تاریخ ہمیں ایسے پادریوں کا پتہ دیتی ہے جو اپنے گرجوں میں محو عبادت ہوتے تھے اور انہوں نے جو قبائیں زیب تن کر رکھی ہوتی تھیں ان پر قرآنی آیات کڑھی ہوتی تھیں۔ عیسائی بادشاہوں کے سکوں پر عربی عبارات کندہ ہوتی تھیں اور وہ بڑے فخر سے عربی طرز حیات کو اپناتے تھے۔

مسلمان تاجر اور یورپ

انسان جب کسی دوسرے انسان سے ملتا ہے تو کچھ اسے سکھاتا ہے اور کچھ اس سے سیکھتا ہے۔ مسلمان تاجروں کا یہ طرہ امتیاز ہے کہ انہوں نے تجارت کی غرض سے دنیا کے کونے کونے کا سفر کیا۔ وہ جہاں بھی گئے اپنا مذہب اور اپنی تہذیب ساتھ لے کر گئے۔ انہوں نے دین اسلام کی تعلیمات کی قوت اور اسلامی تہذیب کے حسن سے کئی قوتوں کو مسخر کیا۔

مسلمان تاجر بحر الکاہل، جزائر ملایا اور چین میں تجارت کی غرض سے گئے اور وہاں کا نقشہ بدل آئے۔ انڈونیشیا، ملائشیا، چین اور مشرقی و وسطی افریقہ سے آج اللہ اکبر کی جو صدائیں سنائی دیتی ہیں یہ انہی تاجروں کی یاد دلاتی ہیں۔

مسلمان تاجروں نے یورپ کا بھی رخ کیا تھا۔ مصر، تیونس، کریٹ، قبرص، جزائر یونان، اندلس، شام، انطاکیہ، آرمینیا اور عراق وغیرہ کی منڈیوں میں مسلمان تاجر صدیوں مغربی تاجروں سے ملتے رہے اور انہیں اپنی تہذیب سے متاثر کرتے رہے۔

موسیو لیبان لکھتا ہے کہ عرب تاجر دریائے والگا کے راستے فن لینڈ تک جاتے تھے نیز بحیرہ بالٹک کے جزائر مثلاً گاٹ لینڈ، بارن ہوم اور آلینڈ سے ہو کر سویڈن اور ڈنمارک کو نکل جاتے تھے۔ ان جزائر سے کئی سو عرب سکے ملے ہیں اور یہ اس بات کی واضح شہادت ہے کہ عرب وہاں تجارت کے لیے گئے تھے۔ یہ سکے پولینڈ میں بھی دستیاب ہوئے ہیں۔(1)

1۔ "یورپ پر اسلام کے احسانات"، صفحہ 133، بحوالہ تمدن عرب

ڈاکٹر ڈریپر لکھتا ہے: بارسلونا کی بندرگاہ خلفائے اندلس کی بحری تجارت کا مرکز تھی۔ یہاں سے سینکڑوں جہاز مال تجارت سے لدے ہوئے اکناف عالم میں جاتے تھے۔ مسلمانوں نے یہودی تاجروں کی مدد سے تجارت کے بہت سے اصول اختراع کئے جو رفتہ رفتہ یورپ کی تاجر جماعتوں تک پہنچے۔

حساب میں ڈبل انٹری سسٹم مسلمانوں کی ایجاد ہے۔(1)

رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے: سسلی اور سپین کے تاجروں کی تجارتی و صنعتی سرگرمیوں نے یورپ کی تجارت و صنعت کو جنم دیا۔ اس دور میں یورپ کے افلاس کی یہ حالت تھی کہ اٹلی کے تاجروں کے پاس عربوں کا مال خریدنے کیلئے کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ وہ عموماً اردگرد کے دیہات سے بچے چرالاتے، انہیں غلام بنا کر بیچتے اور اس طرح عربوں سے خریدی ہوئی چیزوں کی قیمت ادا کرتے۔

عربوں نے ہند، چین، ملاکا اور ٹمبکٹو تک خشکی کے راستے کھول دیئے اور سوڈان سے مڈغاسکر تک تجارتی منڈیوں کا ایک سلسلہ قائم کر دیا۔ جہاز سازی کے فن کو ترقی دی۔ دنیا کو بحر پیمائی کا درس دیا۔ ہنڈیوں کا طریقہ رائج کیا اور بحری تجارت کے لئے انتظامی کونسلیں قائم کیں۔(2)

مسلمانوں کی تجارتی اور صنعتی میدانوں میں یہ ترقی اور معاصر یورپ کی ان میدانوں میں پسماندگی کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ اہل یورپ ان میدانوں میں مسلمانوں کی مہارت سے فائدہ اٹھانے کی طرف مائل ہوئے۔ انہوں نے مسلمانوں کی ایجادات اور ان کی مصنوعات کو خریدا۔ ان کو اپنے معاشروں میں رواج دیا اور اس طرح عربوں کی مصنوعات کا استعمال یورپ میں مہذب ہونے کی دلیل قرار پایا۔

گزشتہ صفحات میں جو جائزہ پیش کیا گیا ہے، اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ یورپ تاریخ انسانی کے تاریک ترین دور سے گزر رہا تھا۔ ان کے ہاں زمام اقتدار پوپ اور قیصر کے ہاتھوں میں تھی۔ اور وہ دونوں علم، تہذیب، آزادی، مساوات اور انسانیت کے دشمن تھے۔

اسی دور میں مسلمانوں نے علم و تہذیب کی جو شمعیں روشن کیں ان کا اجالا قلب یورپ تک جا پہنچا۔ یورپ کے تشنگان علم و تہذیب نے ممالک اسلامیہ کا رخ کیا۔ ان سے علم

1۔"یورپ پر اسلام کے احسانات"، صفحہ 133، بحوالہ معرکہ مذہب و سائنس
2۔ایضاً، بحوالہ تشکیل انسانیت

سیکھا۔ تمدن کا درس لیا۔ مہذب زندگی گزارنے کے گر سیکھے اور ان کی زندگیوں پر عربیت کی چھاپ واضح نظر آنے لگی۔ انہوں نے اس روشن تہذیب سے یورپ کو بھی منور کرنے کی کوشش کی۔ علم کی جو شمعیں بغداد، دمشق، قاہرہ، فلسطین، سسلی، قرطبہ اور غرناطہ میں روشن تھیں، ان کی ضو سے انہوں نے یورپ کی فضاؤں میں بھی اجالا کرنے کی کوشش کی۔

علم اور تہذیب دونوں قیصر اور پوپ کے اقتدار کے دشمن تھے۔ کیونکہ ان کا اقتدار رعایا کی جہالت اور ان کی توہم پرستی کے سہارے قائم تھا۔ اور جہاں علم و تہذیب ڈیرے ڈال دیں وہاں سے جہالت اور توہمات دونوں کوچ کر جاتے ہیں۔

قیصر اور پوپ دونوں ایک دوسرے کے دشمن تھے لیکن اسلامی تہذیب کا خطرہ دونوں کے لئے یکساں تباہ کن تھا۔ بات صرف اسلامی علم و تہذیب کے غلبے تک محدود نہ رہی تھی بلکہ دنیائے عیسائیت نے فوج در فوج دین اسلام میں داخل ہونا شروع کر دیا تھا۔

ول ڈیوران کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

> عیسائیوں کے لئے اسلام کی کشش کا اندازہ ہم 1311ء کے ایک خط سے لگا سکتے ہیں۔ جس زمانے میں یہ خط لکھا گیا اس وقت غرناطہ کی آبادی دو لاکھ تھی اور پانچ سو افراد کو چھوڑ کر یہ ساری آبادی ان ہسپانوی لوگوں کی اولاد پر مشتمل تھی جنہوں نے عیسائیت کو چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا تھا۔ وہاں جو لوگ مذہب عیسوی پر قائم تھے وہ بھی اکثر عیسائی حکومت کے مقابلے میں مسلمان حکومت کو ترجیح دیتے تھے۔(1)

یہ صورت حال نہ تو پوپ کے لئے قابل قبول تھی اور نہ ہی قیصر کے لئے۔ انہوں نے اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کا تہیہ کر لیا۔ انہوں نے اپنے ابنائے ملت کو علم و تہذیب کی طرف سے آنکھیں بند کر لینے پر مجبور کیا۔ انہوں نے ہر ایسی چیز کا نام لینے کو ناقابل معافی جرم قرار دیا، جس سے اسلام اور اسلامی تہذیب کی بو آتی ہو۔

انہوں نے اپنی قوم کو اسلامی اثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے مدارس بند کئے، کتابیں جلائیں، علماء کو قتل کیا، مسلمانوں کی طرح روزانہ ہاتھ منہ دھونے والوں اور غسل کرنے والوں پر کفر و ارتداد کے فتوے لگائے اور انہیں موت کی سزائیں سنائیں۔

1۔ دی ایج آف فیتھ، صفحہ 300

یہ ان کی خام خیالی تھی کہ اندھیرے روشنیوں پر غالب آجائیں گے۔ اندھیرا تو نام ہی روشنی کے عدم وجود کا ہے۔ جب روشنی وجود میں آجاتی ہے تو اندھیرے خود ہی کافور ہو جاتے ہیں۔

یورپ میں علم اور مذہب کا معرکہ برپا ہوا۔ علم کے شیدائیوں نے ہر ظلم سہ لیا لیکن روشنی کی جو کرن انہیں مشرق میں جلوہ فگن نظر آئی تھی وہ اسے نظرانداز نہ کرسکے۔ پاپائیت اور علم کا یہ معرکہ پوپ کے اقتدار کے زوال پر منتج ہوا۔ یورپ تہذیب، علم اور ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہوا اور عروج وارتقاء کے ان بلند مقامات پر جا پہنچا جہاں دنیا اسے آج دیکھ رہی ہے۔

پوپ اور قیصر نے اپنی تاریک تہذیب کی حفاظت کے لئے دو محاذ کھولے تھے۔ ایک اپنے ابنائے وطن کے خلاف اور دوسرا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف۔

آپ نے گزشتہ صفحات میں ایک پادری کا واویلا پڑھا ہے جو اپنے ابنائے مذہب سے یہ شکایت کر رہا ہے کہ وہ عربی کتابیں مسلمانوں کی تردید کی خاطر نہیں بلکہ عربی ادب میں کمال حاصل کرنے کے شوق سے پڑھتے ہیں۔ گویا پادریوں کی خواہش تھی کہ جو عیسائی عربی کتابیں پڑھیں، وہ اسلام کی تردید کی خاطر پڑھیں ورنہ انہیں پڑھنا چھوڑ دیں۔

پادریوں کی یہ خواہش صرف ان کے دلوں میں مخفی نہ تھی بلکہ انہوں نے عملاً اس خواہش کی تکمیل کی کوششیں بھی کی تھیں۔ قرآن حکیم کا پہلا ترجمہ ایک عیسائی راہب پطرس محترم کے ایماء پر ہوا تھا اور اسی کے ایماء پر کچھ دوسری عربی کتابوں کے تراجم بھی ہوئے تھے۔ ان تراجم کا مقصد اسلام کی تفہیم نہیں بلکہ اس کی تردید تھا۔

یہ پادری فوج در فوج اسلام کی طرف دوڑنے والے عیسائیوں کو روکنا چاہتے تھے اور اس مقصد کے لئے وہ ان کے سامنے مسلمانوں اور اسلام کی خامیوں کو تفصیل سے بیان کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ان پادریوں نے ایک طرف علمی محاذ پر اسلام کے خلاف جنگ کی اور دوسری طرف صلیبی جنگوں کے اس تباہ کن سلسلے کا آغاز کیا جس کی تفصیل قارئین گزشتہ باب میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

پادریوں کو علمی محاذ کے ساتھ ساتھ عسکری محاذ پر بھی پے در پے شکستوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ذلت آمیز شکستوں نے ان کے سینوں میں حسد اور انتقام کی آگ بھڑکا دی۔ اور انہوں نے اسلام اور بانی اسلام کے خلاف اتنا زہر اگلا جس کے بیان سے ایک مہذب زبان

کانپ اٹھتی ہے، قلم تھرتھرا جاتا ہے اور انسانیت کا چہرہ عرق انفعال سے تر ہو جاتا ہے۔

اسلام کے خلاف جو طوفان متعصب عیسائیوں نے اٹھایا تھا، اسی نے آگے چل کر تحریک استشراق کی شکل اختیار کی۔ یہ تحریک زمانے کے ساتھ ساتھ اپنے مقاصد میں بھی رد و بدل کرتی رہی، اس کے طریقہ ہائے واردات میں بھی تبدیلی آتی رہی، مستشرقین کے بھیس بھی بدلتے رہے لیکن ان کا بنیادی مقصد ہمیشہ ایک ہی تھا اور وہ مقصد یہ تھا کہ اسلام کی شمع بجھ جائے اور اگر بجھ نہ سکے تو اس کے شعلے کے ارد گرد شکوک و شبہات کے دھوئیں کا وہ حصار بن جائے کہ اس شمع کی روشنی کو کفر کی تاریکیوں سے علیحدہ کرنا ممکن نہ رہے۔ لیکن آخر تا کجے۔ اس شمع کی روشنی جیسے پہلے ہر دور میں پھیلتی رہی ہے اب بھی پھیلتی رہے گی۔ ہمیشہ کی طرح اب بھی اسلام نے اپنا پیغام دوسروں تک پہنچانے کا فریضہ ان لوگوں کو سونپا ہے جو برسوں اس کی شمع کو گل کرنے کے درپے رہے تھے۔

قرون وسطی کے مستشرقین نے اسلام کے خلاف جو بے بنیاد الزام تراشیاں کی تھیں، انہیں بے بنیاد ثابت کرنے کا کام بھی قدرت نے بعد میں آنے والے ان مستشرقین سے لیا ہے جو خود بھی اسلام دشمنی میں کسی سے کم نہیں ہیں۔

آج امریکہ اسلام دشمنی میں کسی سے کم نہیں لیکن امریکہ کی خاتون اول مسز ہیلری کلنٹن کا ایک تازہ بیان ملاحظہ فرمائیں جو 23 مارچ 1996ء کے روزنامہ نوائے وقت میں چھپا ہے۔ وہ کہتی ہیں:

> میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ مغربی معاشرہ میں اسلام اور اس کے پیروکاروں کی اکثر غلط تصویر پیش کی گئی ہے۔ ہم نے ایک چھوٹی سی اقلیت کو اسلام کے متعلق اس کا مکروہ گھسا پٹا نظریہ پیش کرنے کا موقعہ دیئے رکھا۔

کچھ عرصہ پہلے انگلستان کے ولی عہد شہزادہ چارلس کا بھی اس سے ملتا جلتا بیان نظر سے گزرا تھا۔

جو لوگ مسلمانوں کو بنیاد پرست، دہشت گرد، جاہل، انسانیت کے دشمن، عورت کے ویری اور مذہبی آزادی کے مخالف کہہ کر ان کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں، انہی کے ہم مذہب و ملت لوگوں میں سے کچھ اٹھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف یہ الزامات بے بنیاد ہیں۔

یہ اللہ تعالیٰ کا ملت اسلامیہ پر خصوصی فضل و کرم ہے اور اس کے اسی فضل و کرم کے صدقے اسلام کا علم جیسے ہمیشہ بلند رہا ہے اب بھی بلند رہے گا۔ اسلام کی جو شمع مکہ کے مشرکوں، یثرب کے یہودیوں اور قیصر و کسریٰ کے جرار لشکروں کی پھونکوں سے نہیں بجھی، وہ مستشرقین کی پھونکوں سے بھی بجھنے والی نہیں۔

ع پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا۔

تحریکِ استشراق

تعریف، آغاز اور تاریخی جائزہ

تحریک استشراق

تعریف، آغاز اور تاریخی جائزہ

تعریف

استشراق کی جو تعریف عام طور پر مشہور ہے وہ یہ ہے۔

"غیر مشرقی لوگوں کا مشرقی زبانوں، تہذیب، فلسفے، ادب اور مذہب کے مطالعے میں مشغول ہونے کا نام استشراق ہے۔" (1)

اس تعریف کی رو سے جو غیر مشرقی عالم، مشرقی علوم کیلئے اپنے آپ کو وقف کرے گا اسے مستشرق کہا جائے گا۔

آکسفورڈ کی جدید ڈکشنری میں مستشرق کی جو تعریف کی گئی ہے وہ یہ ہے۔

"مستشرق وہ ہے جو مشرقی علوم و آداب میں مہارت حاصل کرے۔" (2)

المنجد میں مستشرق کا مفہوم یہ بتایا گیا ہے:

اَلْعَالِمُ بِاللُّغَاتِ وَالْآدَابِ وَالْعُلُوْمِ الشَّرْقِیَّةِ وَالْاِسْمُ اَلْاِسْتِشْرَاقُ

یعنی مشرقی زبانوں، آداب اور علوم کے عالم کو مستشرق کہا جاتا ہے اور اس علم کا نام استشراق ہے۔ (Collinggem English Dictionary) میں مستشرق کا مفہوم یہ بتایا گیا ہے:

"An expert in eastern languages and history"

یعنی مستشرق وہ ہے جو مشرقی زبانوں اور تاریخ کا ماہر ہو۔

ان تعریفوں میں سے کوئی تعریف بھی ایسی نہیں جو صدیوں سے موجود، استشراق کی فعال اور متحرک تحریک کے مقاصد اور عملی پہلوؤں پر صحیح روشنی ڈالتی ہو۔

1۔ دکتور محمد احمد دیاب، "اضواء علی الاستشراق والمستشرقین"، (قاہرہ۔ 1989)، صفحہ 10

2۔ دکتور محمد ابراہیم الفیومی، "الاستشراق رسالۃ الاستعمار"، (قاہرہ۔ 1993)، صفحہ 143

مشرق کا لفظ بذات خود وضاحت طلب ہے۔ مشرق و مغرب کے مفہوم میں تبدیلیاں بھی واقع ہوتی رہتی ہیں۔ قرون وسطیٰ بلکہ ازمنہ قدیمہ میں بحیرہ روم کو دنیا کا مرکز قرار دیا جاتا تھا اور جہتوں کا تعین اسی کے حساب سے ہوتا تھا۔ اس کے مشرقی اطراف میں واقع علاقوں کو مشرق اور اس کے مغرب میں واقع علاقوں کو مغرب سے تعبیر کیا جاتا تھا۔

اگر ہم مشرق و مغرب کے اس مفہوم کو تسلیم کر لیں تو بھی بات واضح نہیں ہوتی اور نہ ہی مشرق کے اس مفہوم کی رو سے مستشرق کی مندرجہ بالا تعریف جامع و مانع رہتی ہے۔

مشرق کی اس تعریف کی رو سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دین مسیحی کا تعلق مشرق سے ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں جو مغربی عالم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان، آپ کی سیرت، آپ کے مذہب اور دیگر مسائل کے مطالعہ کے لئے اپنی زندگی وقف کر دے، اسے مستشرق کا لقب دیا جانا چاہئے لیکن عملاً ایسا نہیں ہے۔

بائبل کے دونوں حصوں عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید میں جتنے واقعات اور حالات کا بیان ہے ان میں سے اکثر کا تعلق مشرق سے ہے لیکن بائبل کے علوم کے ماہر کو کوئی بھی مستشرق نہیں کہتا۔

یہ ایک حیران کن حقیقت ہے کہ وہ علمی مصادر جو مستشرقین کی مساعی کا نتیجہ ہیں وہ یا تو اس تحریک کے بارے میں بالکلیہ خاموش ہیں اور اگر وہاں (Orientalism) یا (Orientalist) کا کوئی ذکر ملتا بھی ہے تو وہ انتہائی ناکافی اور باہم مختلف ہے۔

اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ جس طرح مستشرقین اپنے مقاصد کو پوشیدہ رکھنے کی حکمت عملی پر کار بند ہیں، اسی طرح وہ اپنے نام کی بھی تشہیر نہیں چاہتے۔

یہ تحریک صدیوں مصروف عمل رہی لیکن اس تحریک کا کوئی باضابطہ نام نہ تھا۔ اربری کہتا ہے کہ "Orientalist" کا لفظ پہلی مرتبہ 1630ء میں مشرقی یا یونانی کلیسا کے ایک پادری کے لئے استعمال ہوا۔(1)

روڈنسن کہتا ہے کہ "Orientalism" یعنی استشراق کا لفظ انگریزی زبان میں 1779ء میں داخل ہوا اور فرانس کی کلاسیکی لغت میں استشراق کے لفظ کا اندراج 1838ء میں ہوا۔ حالانکہ عملی طور پر تحریک استشراق اس سے کئی صدیاں پہلے وجود میں آچکی تھی اور پورے

1۔ "الاستشراق، رسالۃ الاستعمار"، صفحہ 142

زور و شور سے مصروف عمل تھی۔

جن لوگوں نے تحریک استشراق کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ ان کے اغراض و مقاصد، ان کی تاریخ اور ان کے علمی کارناموں کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے، انہوں نے مستشرقین کے مختلف نظریات اور مساعی کے پیش نظر استشراق کی کچھ تعریفیں کی ہیں۔

ڈاکٹر احمد عبد الحمید غراب نے اپنی کتاب "رویة اسلامیة للاستشراق" میں کچھ تعریفیں لکھی ہیں۔ جن میں سے چند ایک پیش خدمت ہیں۔

(1) استشراق مغربی اسلوب فکر کا نام ہے۔ جس کی بنیاد مشرق و مغرب کی نسلی تقسیم کے نظریہ پر قائم ہے جس کی رو سے اہل مغرب کو اہل مشرق پر نسلی اور ثقافتی برتری حاصل ہے۔ (1)

یہ تعریف گو ہر مستشرق کی ذہنی کیفیت کو ظاہر کرتی ہے لیکن اس تعریف کی رو سے اگر دیکھا جائے تو آج سارا یورپ اور امریکہ مستشرق کہلائے گا کیونکہ جب سے مغرب نے صنعتی اور عسکری میدان میں ترقی کی ہے اور ایک عرصہ انہوں نے اہل مشرق کو زیر نگیں رکھا ہے، اس وقت سے سارا مغرب اسی انداز میں سوچتا ہے۔ اس صورت میں یہ تعریف استشراق کی تحریک کو سمجھنے کے لئے مفید ثابت نہیں ہو سکتی۔

(2) استعماری مغربی ممالک کے علماء اپنی نسلی برتری کے نظریے کی بنیاد پر، مشرق پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے اس کی تاریخ، تہذیبوں، ادیان، زبانوں، سیاسی اور اجتماعی نظاموں، ذخائر دولت اور امکانات کا جو تحقیقی مطالعہ غیر جانبدارانہ تحقیق کے بھیس میں کرتے ہیں اسے استشراق کہا جاتا ہے۔ (2)

(3) استشراق اس مغربی اسلوب کا نام ہے جس کا مقصد مشرق پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے، اس کی فکری اور سیاسی تشکیل نو کرنا ہے۔ (3)

آخری دونوں تعریفیں گو مستشرقین کے استعماری اور استحصالی ارادوں کا پتہ دیتی ہیں لیکن ان کے سینوں میں چھپی ہوئی اس حقیقی خواہش کی طرف اشارہ نہیں کرتیں جس کا پردہ ہمارے علیم و خبیر رب نے صدیوں پہلے چاک کر دیا تھا۔

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ۚ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ

1۔ دکتور احمد عبد الحمید غراب، "رویة اسلامیة للاستشراق"، (ریاض۔ 1988) صفحہ 7

2۔ ایضاً، صفحہ 8

3۔ ایضاً

اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ (1)

"دل سے چاہتا ہے ایک گروہ اہل کتاب سے کہ کسی طرح گمراہ کر دیں تمہیں۔ اور نہیں گمراہ کرتے مگر اپنے آپ کو اور وہ (اس حقیقت کو) نہیں سمجھتے۔"

ڈاکٹر احمد عبد الحمید غراب نے مندرجہ بالا تعریفیں معہ تبصرہ ذکر کرنے کے بعد استشراق کی جو تعریف خود کی ہے وہ یہ ہے:

"مغربی اہل کتاب، مسیحی مغرب کی اسلامی مشرق پر نسلی اور ثقافتی برتری کے زعم کی بنیاد پر، مسلمانوں پر اہل مغرب کا تسلط قائم کرنے کے لئے مسلمانوں کو اسلام کے بارے میں گمراہی اور شک میں مبتلا کرنے اور اسلام کو مسخ شدہ صورت میں پیش کرنے کی غرض سے، مسلمانوں کے عقیدہ، ثقافت، شریعت، تاریخ، نظام اور وسائل وامکانات کا جو مطالعہ غیر جانبدارانہ تحقیق کے دعوے کے ساتھ کرتے ہیں اسے استشراق کہا جاتا ہے۔" (2)

یہ تعریف گو مستشرقین کے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں عزائم کا پردہ چاک کرتی ہے لیکن اس تعریف میں ایک تو مشرق کے لفظ کو وہ اہمیت نہیں دی گئی جس کا وہ مستحق ہے کیونکہ اسی کی بنیاد پر مستشرقین کو مستشرقین کہا جاتا ہے۔ اس تعریف میں دوسری خامی یہ ہے کہ اس کی رو سے تمام مستشرقین ایک ہی زمرے میں شمار ہو جاتے ہیں حالانکہ مستشرقین کو بڑی آسانی سے کئی گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اس تعریف میں تیسری خامی یہ ہے کہ جو مستشرقین اسلام کے علاوہ دیگر مشرقی علوم اور تہذیبوں کے میدان میں مصروف عمل ہیں وہ مستشرقین کے دائرے سے خارج ہو جاتے ہیں حالانکہ معروف معنوں میں وہ مستشرق ہیں۔

مستشرقین اور استشراق کی صحیح تعریف کرنے کے لئے لفظ "مشرق" کا وہ مفہوم بڑا معاون ثابت ہو سکتا ہے جو رودی بارت نے بیان کیا ہے۔

ڈاکٹر محمد ابراہیم الفیومی رودی بارت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ مستشرقین کے عرف میں لفظ "مشرق" کا جغرافیائی مفہوم مراد نہیں بلکہ ان کے ہاں مشرق سے مراد زمین کے وہ

1۔ سورۃ آل عمران: 69

2۔ "رویہ اسلامیہ للاستشراق"، صفحہ 9

خطے ہیں جن پر اسلام کو فروغ حاصل ہوا۔(1)

گویا مستشرقین کے نزدیک لفظ مشرق سے مراد اسلامی ممالک ہیں اور دنیائے اسلام کو وہ مشرق کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

مشرق کے اس مفہوم کے تحت، مستشرقین کی عملی جدوجہد جن خفیہ مقاصد کی غمازی کرتی ہے اور جن کا اظہار کبھی کبھی بعض مستشرقین کی طرف سے ہوتا بھی رہتا ہے، ان کو اور مستشرقین کے بے شمار علمی کارناموں اور ان کے مختلف طبقات کو پیش نظر رکھتے ہوئے مستشرقین کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے۔

اہل مغرب بالعموم اور یہود و نصاریٰ بالخصوص، جو مشرقی اقوام خصوصاً ملت اسلامیہ کے مذاہب، زبانوں، تہذیب و تمدن، تاریخ، ادب، انسانی قدروں، ملی خصوصیات، وسائل حیات اور امکانات کا مطالعہ معروضی تحقیق کے لبادے میں اس غرض سے کرتے ہیں کہ ان اقوام کو اپنا ذہنی غلام بنا کر ان پر اپنا مذہب اور اپنی تہذیب مسلط کر سکیں اور ان پر سیاسی غلبہ حاصل کر کے ان کے وسائل حیات کا استحصال کر سکیں، ان کو مستشرقین کہا جاتا ہے اور جس تحریک سے وہ لوگ منسلک ہیں وہ تحریک استشراق کہلاتی ہے۔

ہم اس کتاب میں جہاں استشراق اور مستشرق کا لفظ استعمال کریں گے وہاں اس سے یہی مفہوم مراد ہو گا جس کا یہاں ذکر کیا گیا ہے۔

تحریک استشراق کا آغاز

جس طرح پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ "Orientalism" کا لفظ یورپی زبانوں میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں رائج ہوا۔ استشراق کی اصطلاح رائج ہونے سے کتنا عرصہ پہلے عملاً یہ تحریک معروف کار تھی؟ اس سوال کا جواب مختلف طریقوں سے دیا گیا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ تحریک استشراق کا آغاز 1312ء میں ہوا جب فینا میں کلیسا کی کانفرنس منعقد ہوئی اور اس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ یورپ کی مختلف یونیورسٹیوں میں عربی زبان کی تدریس کے لئے باقاعدہ (Chairs) قائم کی جائیں۔(2)

بعض لوگ کہتے ہیں کہ تحریک استشراق کا آغاز تیرہویں صدی عیسوی میں ہوا جب

1۔ "الاستشراق، رسالۃ الاستعمار"، صفحہ 144

2۔ ڈاکٹر محمود حمدی زقزوق، "الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری" (قاہرہ، 1989ء)، صفحہ 25

کشتالہ کے بادشاہ "الفونس دہم" نے 1269ء میں مرسیلیا میں اعلیٰ تعلیمات کا ادارہ قائم کیا۔ اس ادارے نے ابو بکر القرطبی کی سربراہی میں اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان، عیسائی اور یہودی عالم مقرر کیے اور انہیں تصنیف، ترجمے اور تلخیص کے کام پر مامور کیا۔ اس ادارے نے انجیل تلمود اور قرآن کا ہسپانوی زبان میں ترجمہ کیا۔

اسی صدی میں سسلی کے بادشاہ فریڈرک ثانی نے مائیکل سکاٹ کی سرکردگی میں دارالترجمہ قائم کیا۔ اس ادارے نے مائیکل سکاٹ کی نگرانی میں بعض اسلامی علوم کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ شاہ سسلی نے ان ترجمہ شدہ کتابوں کے کئی نسخے تیار کرائے اور انہیں یورپ کی جامعات، مدارس اور دیگر علمی اداروں کو بطور تحفہ بھجوایا۔ ان میں سے کچھ کتابیں یورپ میں سترھویں صدی عیسوی تک پڑھائی جاتی رہیں۔(1)

بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ تحریک استشراق کا آغاز بارہویں صدی عیسوی میں ہوا جب 1143ء میں پطرس محترم کے ایماء پر پہلی مرتبہ قرآن حکیم کا لاطینی زبان میں ترجمہ مکمل ہوا۔ پطرس محترم دیر کلونی کا رئیس تھا۔ یہ اپنے دل میں اسلام کے خلاف شدید تعصب رکھتا تھا۔ وہ عیسائیوں کو مسلمانوں کے ساتھ مصالحانہ رویہ اپنانے سے روکتا اور انہیں مسلمانوں سے متنفر کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

پطرس محترم نے علوم اسلامیہ کے مغربی زبانوں میں تراجم کے لئے ایک جماعت تیار کی۔ ان میں ایک انگریز عالم رابرٹ آف کیٹن (robert of Ketton) تھا جس نے قرآن حکیم کا پہلا لاطینی ترجمہ کیا۔ پطرس محترم نے قرآن حکیم کے اس ترجمہ پر مقدمہ بھی لکھا۔ اس کے علاوہ اس کی قائم کردہ جماعت نے کچھ اور عربی کتابوں کے ترجمے بھی کیے۔ اور ان کتابوں کا مجموعہ، مجموعہ کلونی کے نام سے مشہور ہوا۔

ان تراجم سے پطرس محترم اور اس کے ساتھیوں کا مقصد دین اسلام کی محبت یا اسے سمجھنے کی کوشش نہ تھا بلکہ ان تراجم کا مقصد اسلام کی مخالفت کے لئے عیسائیوں کو مواد فراہم کرنا تھا جس کا اعتراف خود پطرس محترم نے کیا تھا۔(2)

اسی صدی میں ایک پادری فیرابل نے پہلی عربی لاطینی ڈکشنری تیار کی تھی۔(3)

1۔ "اضواء علی الاستشراق والمستشرقین"، صفحہ 14
2۔ "الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری"، صفحہ 32
3۔ اضواء علی الاستشراق والمستشرقین"، صفحہ 13

بعض لوگ کہتے ہیں کہ تحریک استشراق کا آغاز دسویں صدی عیسوی میں ہوا جب فرانس کا ایک راہب جر یر دی اور الیاک (940-1003) حصول علم کی خاطر اندلس گیا۔ اشبیلیہ اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں میں علم حاصل کیا اور یورپ بھر میں عربی زبان وادب اور ثقافت کا سب سے بڑا عالم شمار ہوا اور بعد میں 999ء سے لے کر 1003ء تک سلفسٹر ثانی کے لقب سے پاپائے روم کے منصب پر فائز رہا۔(1)

تحریک استشراق کے آغاز کے متعلق جتنی آرا کا مندرجہ بالا سطور میں ذکر ہوا ہے۔ انہیں تحریک استشراق کی تاریخ کے مختلف مراحل تو قرار دیا جاسکتا ہے لیکن انہیں تحریک استشراق کا نقطہ آغاز قرار دینا قطعاً صحیح نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس کام کا بیڑا مستشرقین نے اٹھار کھا ہے وہ دسویں صدی عیسوی سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔

نویں صدی عیسوی کا مورخ بارو قرطبی لکھتا ہے: اہل بالقریا تو مسلمانوں کی ثقافت سے استفادہ کرنے کے لئے اور یا اس کی تردید کرنے کے لئے ادب، فقہ اور فلسفہ کے موضوع پر مسلمان مصنفین کی تصانیف کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ وہ عربی تصنیفات کے کتب خانے قائم کرنے کے لئے کثیر اموال خرچ کرتے ہیں۔(2)

ڈاکٹر محمد احمد دیاب کہتے ہیں کہ بارو کی یہ بات اندلس کے ان مقامی لوگوں پر صحیح صحیح منطبق ہوتی ہے جنہوں نے مسلمانوں کی عادات کو اپنالیا تھا۔ وہ مسلمانوں کی طرح اپنے خانگی معاملات کو چلاتے۔ مسلمانوں کی طرح اپنے بچوں کا ختنہ کرتے۔ عربی زبان میں کمال حاصل کرتے اور لاطینی زبان کی کتابت کے لئے عربی رسم الخط کو استعمال کرتے۔ عیسائیوں کے مذہبی راہنما عربی ناموں، عربی زبان اور عربی ثقافت کو ترجیح دیتے۔ وہ مسلمانوں کے مدارس، جامعات اور کتب خانوں کا رخ کرتے۔ وہاں تحصیل علم کرتے۔ پھر اپنے گرجوں اور خانقاہوں میں بیٹھ جاتے، مسلمانوں کی علمی میراث کا ترجمہ کرتے، اس کی تفسیر کرتے، ان موضوعات پر خود کتابیں تصنیف کرتے اور انہیں اپنے راہبوں اور طلبہ علم میں پھیلا دیتے۔ اس طرح ان کے مختلف مدارس اور مختلف علماء کی انتھک کوششوں سے یورپ میں علم کی روشنی انتہائی سرعت سے پھیلنے لگی۔(3)

1۔ "اضواء علی الاستشراق والمستشرقین"، صفحہ 13
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً، صفحہ 16

جب نویں صدی عیسوی کا ایک مورخ عیسائیوں کے علوم اسلامیہ کی طرف اس شدید میلان کا ذکر کرتا ہے تو پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ تحریک استشراق کے آغاز کا زمانہ اس سے بعد قرار دیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ مستشرقین کے کام کا آغاز دسویں صدی عیسوی سے بہت پہلے ہو گیا تھا۔ گو اہل کتاب کی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف معاندانہ کاروائیاں تو اس وقت سے شروع ہو گئی تھیں جب اس دنیا پر اسلام کا آفتاب طلوع ہوا تھا۔ اسی وقت سے وہ اسلام اور مسلمانوں پر مختلف جہتوں سے حملوں کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

ہلال وصلیب کا یہ معرکہ اسی وقت سے جاری ہے اور اس کی شدت میں ہمیشہ اضافہ ہی ہوتا رہا ہے۔ لیکن استشراق مسلمانوں کے خلاف یہودی ونصاریٰ کی قلمی جنگ کا نام ہے اور یہ ذرا بعد میں شروع ہوئی۔

استشراق کی تحریک کو مشرق اور مغرب کے اہل کتاب نے مل کر آٹھویں صدی عیسوی میں شروع کیا۔ مشرقی اہل کتاب کا نمائندہ یوحنا دمشقی (676-749) تھا جو خلیفہ ہشام کے زمانے میں بیت المال میں ملازم تھا۔ اس نے ملازمت ترک کر دی اور فلسطین کے ایک گرجے میں بیٹھ کر مسلمانوں کی تردید میں کتابیں لکھنے لگا۔

اس نے اسلام کے خلاف دو کتابیں لکھیں جن میں سے ایک کا نام "محاورہ مع المسلم" اور دوسری کا نام "ارشادات النصاریٰ فی جدل المسلمین" تھا۔(1)

یہ دونوں تصنیفات اسی مقصد کے تحت لکھی گئی تھیں جس کے تحت مستشرقین نے تصنیفات کے انبار لگا دیے ہیں۔ اس لئے ہم یوحنا دمشقی کی مساعی کو تحریک استشراق کا نقطہ آغاز قرار دے سکتے ہیں۔ گو کچھ لوگ مشرق کا باشندہ ہونے کی بنا پر یوحنا دمشقی کو مستشرق تسلیم نہیں کرتے اور نہ ہی اس کی تصنیفات کو تحریک استشراق کا حصہ قرار دینے کیلئے تیار ہیں لیکن ہم نے مستشرقین کی جو تعریف کی ہے اس کی رو سے وہ مستشرق ہی شمار ہو گا۔

اگر یوحنا دمشقی کو مستشرق شمار نہ کیا جائے تو بھی تحریک استشراق کا آغاز آٹھویں صدی عیسوی ہی سے ماننا پڑے گا کیونکہ اسی صدی میں مسلمانوں نے اندلس کو نہ صرف عسکری طور پر فتح کیا تھا بلکہ مسلمانوں کی تہذیب اور ان کے مذہب نے بھی وہاں پر اپنا تسلط

1۔ "اضواء علی الاستشراق والمستشرقین" صفحہ 15

قائم کر لیا تھا۔ اور اہل مغرب مسلمانوں کے علوم وفنون اور ان کی ثقافت کی طرف دو متضاد وجوہات کی بنا پر متوجہ ہوئے تھے۔

کچھ تو وہ تھے جن کو اسلامی علوم اور اسلامی تہذیب نے اتنا متاثر کیا تھا کہ وہ مسلمانوں کی تہذیب کو اپنی تہذیب پر ترجیح دیتے تھے اور زندگی کو اسی تہذیب کے رنگ میں رنگنے پر فخر محسوس کرتے تھے۔ ان میں کچھ وہ بھی تھے جو مذہب عیسائیت پر قائم رہتے ہوئے اسلامی تہذیب و ثقافت سے متاثر تھے اور اسلامی جامعات میں حصول علم کے لئے بڑے شوق سے داخل ہوتے تھے۔

اسی قسم کے لوگوں کے متعلق متعصب عیسائی مورخ بارو قرطبی نے بڑی حسرت سے لکھا ہے:

میرے دینی بھائی عربی شاعری اور عربی حکایات میں بڑی لذت محسوس کرتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے فلاسفہ اور فقہاء کی کتابوں کا مطالعہ بڑے شوق سے کرتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ وہ اس مطالعہ کے ذریعے مسلمانوں کی تردید کریں بلکہ اس لئے کہ وہ اس عربی ادب کا مطالعہ کر کے عربی زبان میں کمال حاصل کر سکیں۔ آج ہمیں پادریوں اور راہبوں کے علاوہ ایسے عیسائی کہاں مل سکتے ہیں جو انا جیل مقدسہ کی لاطینی تشریحات کا مطالعہ کرنا پسند کرتے ہوں۔ ہائے افسوس! ہمارے باصلاحیت عیسائی نوجوان عربی لغت وادب پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس کی کتابوں پر زر کثیر صرف کرتے ہیں۔ اور ہر جگہ عربی زبان وادب کی عظمتوں کا ڈھنڈورا پیٹتے نظر آتے ہیں۔ لیکن جب ان سے کتب عیسوی کے متعلق پوچھا جائے تو بڑی نفرت سے کہتے ہیں کہ عیسائی کتابیں اس قابل نہیں کہ ان کی طرف توجہ مبذول کی جائے۔(1)

ان کے علاوہ کچھ لوگ وہ تھے جو عربی زبان کا مطالعہ بالکل اسی غرض سے کرتے تھے جو بارو مذکور کی خواہشات کے عین مطابق تھی۔ ان میں اکثریت عیسائی پادریوں اور راہبوں کی تھی جو مسلمانوں کی اس قوت کا راز معلوم کرنا چاہتے تھے جس کی سطوت کے سامنے قیصر و کسریٰ کے جھنڈے سرنگوں ہو گئے تھے۔ وہ اس تہذیب و ثقافت کی ترقی کے اسباب معلوم کرنا چاہتے تھے جس نے کئی تہذیبوں اور ثقافتوں کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔ جس تہذیب

1۔ "اضواء علی الاستشراق والمستشرقین"، صفحہ 17

کی عظمت کا عالم یہ تھا کہ جس دور میں یورپ میں چند پادریوں اور راہبوں کے علاوہ کوئی لکھنا پڑھنا نہ جانتا تھا اس دور میں بقول "دوزی" اندلس کا بچہ بچہ علم کے زیور سے بہرہ ور تھا۔(1)

یہ پادری اور راہب اپنی خانقاہوں اور گرجوں سے نکلے اور حصول علم کے لئے مرکز علم و معرفت اندلس کا رخ کیا۔ ان راہبوں کو حصول علم کے راستے پر علم و معرفت کی محبت نے نہیں ڈالا تھا بلکہ ان کے سینوں میں اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف بغض و کینہ کا جو سمندر موجزن تھا، اس نے انہیں اپنی عبادت گاہوں سے نکال کر مسلمانوں کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے پر مجبور کیا تھا۔ اور ان کا یہ حسد و بغض ہر زمانے میں اپنا رنگ دکھاتا رہا ہے۔

اندلس کے جن لوگوں نے عربی طرز حیات اپنا لیا تھا، ان میں بھی ایسے عیسائی راہب اور پادری موجود تھے جنہوں نے مسلمانوں کی جاسوسی کے لئے بھیس بدلا تھا۔ ان کا مقصد بھی مسلمانوں کی قوت کا راز معلوم کر کے اور ان کی خامیوں اور کمزوریوں کا سراغ لگا کر انہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرنا تھا۔(2) پادریوں اور راہبوں نے مختلف بھیس بدل کر اندلس سے علوم حاصل کئے اور پھر انہوں نے اپنی زندگیاں اسلام کی تردید کے لئے وقف کر دیں۔

اس بحث سے ہم مندرجہ ذیل نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔

(1) استشراق کی تحریک کا آغاز عملاً آٹھویں صدی عیسوی سے ہو چکا تھا اگرچہ اس تحریک کو یہ نام کئی صدیاں بعد دیا گیا۔

(2) اس تحریک کو شروع کرنے والوں کی اکثریت راہبوں اور پادریوں پر مشتمل تھی جن میں مشرق سے تعلق رکھنے والے بھی تھے اور مغرب سے تعلق رکھنے والے بھی۔

(3) استشراق کا قافلہ ابتدا ہی سے دو مختلف راستوں پر گامزن ہے۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو اسلامی علوم سے متاثر ہوئے اور معرفت و حکمت کی جو روشنی ان علوم کی وجہ سے اسلامی مشرق کو بقعہ نور بنا رہی تھی، انہوں نے مغرب کی فضاؤں میں بھی اسی شمع کو روشن کرنے کا تہیہ کیا۔ انہوں نے اسلامی علوم سے کما حقہ استفادہ کیا۔ ان ہی لوگوں کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج علم کے پیاسے یورپ کی طرف دیکھنے پر مجبور ہیں اور یورپ مادی ترقی کی اس منزل تک جا پہنچا ہے جہاں انسانی معاشرہ پہلے کبھی نہیں پہنچا تھا۔

دوسری طرف وہ لوگ ہیں جن کی کوششوں کا محرک سوائے اسلام دشمنی کے اور کچھ

1۔ "اضواء علی الاستشراق والمستشرقین"، صفحہ 15

2۔ ایضاً

بھی نہیں۔ ایسے لوگ جس چیز کو خود روشنی سمجھتے ہیں، اس کے علاوہ کسی دوسری روشنی کا وجود تسلیم کرنے کے لئے قطعاً تیار نہیں۔ وہ اسلامی تعلیمات کی طرف محض اس لئے متوجہ ہوتے ہیں تاکہ مسلمانوں کی کمزوریوں کو تلاش کر کے انہیں نقصان پہنچا سکیں اور مسلمانوں کے مقابلے میں انہی ہتھیاروں سے مسلح ہو سکیں جن کی بدولت مسلمانوں نے دنیا کا نقشہ بدل دیا تھا۔

مستشرقین کی اکثریت اسی طبقے پر مشتمل ہے۔ ان کے مقاصد میں وقت کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں آتی رہتی ہیں لیکن اسلام دشمنی کا بنیادی مقصد کبھی ان کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ یہ لوگ کبھی مصر پر حملے کے وقت نپولین بوناپارٹ کے ہمرکاب نظر آتے ہیں۔ کبھی اسلامی ممالک میں مغربی استعمار کے قیام کی راہ ہموار کرتے نظر آتے ہیں۔ کبھی استعمار کے خلاف اٹھنے والی آزادی کی تحریکوں میں استعماری حکومتوں کے مشیر بن کر حق نمک ادا کرتے نظر آتے ہیں۔

مستشرقین کا یہ طبقہ مسلمانوں کے خلاف صیہونی تحریک سے بھی الحاق کر لیتا ہے اور الحادی طاقتیں بھی اسے اسلام کے مقابلے میں کم خطرہ نظر آتی ہیں۔ مستشرقین کے اس طبقہ کا پھیلایا ہوا زہر ملت اسلامیہ کی اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ میں سرایت کر چکا ہے اور ملت مسلمہ اس خطرے کا احساس جتنی جلدی کرلے اتنا ہی اس کے حق میں بہتر ہے۔

استشراق کی تاریخ

جیسے کہ استشراق کے آغاز کے بیان میں لکھا جا چکا ہے کہ استشراق کی تحریک آٹھویں صدی عیسوی میں شروع ہوئی۔ بارہ سو سال سے یہ تحریک پورے زور و شور سے اپنے کام میں مصروف ہے۔ اس تحریک کا سب سے بڑا مقصد اسلام کے خطرے کا مقابلہ کرنا ہے۔

ساؤدرن "Southern" کہتا ہے:

یورپ کے عیسائیوں کیلئے اسلام ہر سطح پر ایک بہت بڑا خطرہ بن چکا ہے۔(1)

چونکہ امت مسلمہ کی تاریخ میں نشیب و فراز آتے رہے ہیں۔ کبھی مسلمانوں کی سطوت و شوکت سے ساری دنیا کانپ رہی ہوتی تھی اور کبھی وہ وقت بھی آ جاتا تھا جب مسلمانوں کو جرم ضعیفی کی وہ عبرت ناک سزا مل رہی ہوتی تھی جس کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہو

1۔ "الاستشراق والخلفیۃ الفکریہ للصراع الحضاری"، صفحہ 28

جاتے ہیں۔

سیاسی عروج و زوال کے علاوہ ملت اسلامیہ مختلف قسم کے دوسرے انقلابات کا بھی شکار رہی ہے۔ اس کے مقابلے میں مغرب کے حالات میں بھی تبدیلیاں واقع ہوتی رہی ہیں۔ ان تبدیلیوں کا اثر اہل مشرق و مغرب کے باہمی تعلقات کی نوعیت پر بھی پڑتا رہا اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ، تحریک استشراق اپنے اہداف اور طریقہ کار میں ضروری تبدیلیاں بھی کرتی رہی ہے۔

تحریک استشراق کی تاریخ کو سمجھنے کے لئے اسے مختلف ادوار میں تقسیم کرنا ضروری ہے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب نے اپنے ایک مقالے میں (جوانہوں نے 1982ء میں اعظم گڑھ میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر منعقد ہونے والے سیمینار میں پڑھا تھا) مستشرقین کی تاریخ کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے۔

پہلے دور کا تعلق اس زمانے سے ہے جب مسلمانوں نے اندلس کو علم و حکمت اور تہذیب و تمدن کا مرکز بنادیا تھا اور اہل مغرب اس شمع علم سے اکتساب نور کرنے یا اس شمع کو بجھانے کے لئے جوق در جوق اندلس کا رخ کر رہے تھے۔

دوسرے دور کا تعلق اس زمانے سے ہے جب صلیبی جنگوں میں پے در پے شکستوں نے دنیائے نصرانیت کو اسلام دشمنی میں پاگل پن کی حد تک پہنچادیا تھا اور وہ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف نت نئے انداز میں زہر اگل رہے تھے۔

تیسرے دور کا تعلق اس زمانے سے ہے جب مغرب مضبوط اور عالم اسلام کمزور ہو چکا تھا اور مغربی طاقتیں استعماری اور استبدادی عزائم کے ساتھ مشرق کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

چوتھے دور کا تعلق اس زمانے کے ساتھ ہے جب نو آبادیات کے باشندے غیر ملکی تسلط کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور انہوں نے استعماری طاقتوں کو اپنے اپنے ممالک سے نکالنے کی جدوجہد شروع کر دی تھی۔

پانچویں دور کا تعلق اس زمانے سے ہے جب قدرت نے عالم اسلام کو زر سیال کی دولت سے مالا مال کیا اور اہل مغرب کی حریص نگاہیں اس دولت خداداد پر مرکوز ہو گئیں۔ (1)

ہم تاریخ استشراق کی تاریخ کے ان پانچ ادوار میں ایک دور کا اضافہ کریں گے۔ اس

1۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی، "مستشرقین کے افکار و نظریات کے مختلف دور"، مشمولہ اسلام اور مستشرقین (اعظم گڑھ۔ 1986)، جلد 2، صفحہ 17-11

دور کا تعلق اس زمانے سے ہے جب عالم اسلام میں اسلامی تحریکوں نے زور پکڑا اور انہوں نے عالم اسلام کو مغرب کی ذہنی غلامی سے نجات دلانے اور فرزندان توحید کو اپنے سارے مسائل کے حل کے لئے واشنگٹن اور ماسکو کے بجائے مکہ اور مدینہ کی طرف توجہ مبذول کرنے کی تلقین کی۔

ذیل میں ہم تحریک استشراق کی تاریخ کے ان چھ ادوار پر ذرا تفصیل سے گفتگو کریں گے تاکہ قارئین مستشرقین کی تگ و دو اور ان کے کام کی نوعیت سے آگاہ ہو سکیں۔

پہلا دور

مستشرقین کی تاریخ کا پہلا دور اس زمانے پر مشتمل ہے جب یورپ جہالت کی تاریکیوں میں سر سے پاؤں تک ڈوبا ہوا تھا اور ادھر اندلس اور سسلی میں مسلمانوں نے علم کے وہ چراغ روشن کر دیئے تھے جن کی روشنی اندھیروں میں بھٹکنے والے اہل مغرب کو بھی دعوت نظارہ دینے لگی تھی۔

ہم نے اس کتاب کے تیسرے باب میں ان حالات کو تفصیل سے بیان کیا ہے جو اہل مغرب کے علوم شرقیہ کی طرف مائل ہونے کا سبب بنے تھے۔ اس باب میں بتایا گیا ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی میں جب مسلمانوں نے سپین کو عسکری اور تہذیبی طور پر فتح کیا تھا، اس وقت مسلمانوں اور یہود و نصاریٰ کے علمی، ثقافتی، معاشی، اخلاقی اور سیاسی حالات میں کتنا تفاوت تھا۔

اس دور میں اہل مغرب مسلمانوں کے علوم کی طرف بالکل اسی انداز میں متوجہ ہوئے تھے جس طرح آج پسماندہ اور ترقی پذیر قوموں کے لوگ ترقی یافتہ اقوام سے علم و تہذیب کا درس لینے کے لئے ان کے علمی مراکز کا رخ کرتے ہیں۔

اس دور کی خصوصیت یہ ہے کہ اہل مغرب نے اس زمانے میں اندلس اور سسلی وغیرہ کے علمی مراکز کا رخ کیا۔ وہاں علم حاصل کیا۔ مسلمانوں کے علوم کے یورپی زبانوں میں ترجمے کئے۔ تراجم کے اس کام میں ہر قسم کا مواد شامل تھا۔ فلسفہ، ریاضی، طب، ہیئت اور دیگر علوم عقلیہ کی کتابیں بھی عربی سے مختلف یورپی زبانوں میں منتقل ہوئیں اور اس کے ساتھ ساتھ قرآن حکیم اور دینی موضوعات کی دیگر کتابوں کو بھی یورپی زبانوں میں منتقل کیا گیا۔

مسلمانوں کی دیکھا دیکھی یورپ کے مختلف ممالک میں علمی مراکز بھی قائم ہوئے۔

کلیسا، جس کی تاریخ علم دشمنی کے واقعات سے بھری پڑی ہے، اس نے اپنے رویہ میں تبدیلی کی۔ کلیسا نے نہ صرف مدارس کے قیام کی اجازت دی بلکہ اس نے خود علمی ادارے قائم کئے۔ عیسائیوں نے ایسے ادارے سپین میں بھی قائم کئے تھے اور یورپ کے دیگر ممالک میں بھی۔

یورپ میں علم دوستی کی یہ لہر بھی مسلمانوں کی مرہون منت ہے۔ کیونکہ اہل یورپ نے مسلمانوں کی قوت و شوکت کا راز معلوم کرنا چاہا تو انہیں معلوم ہو گیا کہ اس امت وسط کی شوکت کا راز علم میں مضمر ہے۔ اس حقیقت کو جان لینے کے بعد اہل یورپ نے عموماً اور کلیسا نے خصوصاً یورپ کو علم کے زیور سے آراستہ کرنے کے لئے کارروائیاں شروع کر دیں۔ یورپ میں جو تعلیمی اور تدریسی کوششیں شروع ہوئیں ان کے نتیجے میں بڑے بڑے علماء سامنے آئے جنہوں نے بعد میں یورپ کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔

ہم یہاں اس دور کی چند شخصیات اور اداروں کا ذکر اختصار سے کرتے ہیں۔

جر بری دی اور الیاک

یہ فرانسیسی راہب تھا۔ وہ فرانس سے اندلس آیا اور وہاں علوم و فنون حاصل کئے۔ اشبیلیہ اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم رہا اور عربی زبان و ادب، ریاضی اور علم الفلک میں مہارت حاصل کی۔

یہ شخص کلیسا میں مختلف خدمات سرانجام دیتا رہا اور آخر کار ترقی کرتے کرتے پاپائے روم کے منصب پر فائز ہوا۔ یہ شخص سلفسٹر ثانی کے لقب سے مشہور ہے۔ یہ 999ء سے لیکر 1003ء تک پاپائیت کے منصب پر فائز رہا۔(1)

طلیطلہ کا دار الترجمہ

طلیطلہ کے رئیس الاساقفہ ڈان ریمنڈ نے 1130ء میں طلیطلہ میں دار الترجمہ قائم کیا۔ اس دار الترجمہ میں مسلم، عیسائی اور یہودی علماء نے ریاضی، فلک، طب، کیمیا، طبعیات، تاریخ، نفسیات اور سیاسیات کی اہم کتابوں کے ترجمے لاطینی زبان میں کئے۔ اس ادارے کے مترجمین میں یہ نام قابل ذکر ہیں:

جون ثالث، یوحنا بن داؤد اندلسی، یوحنا اشبیلی، رابرٹ آف تستر، ہرمان الدلماطی، اوجو

1۔ "الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری"، صفحہ 26

دی سانتلا، افلاطون التیفولی اور سارا شل وغیرہ۔ اس دارالترجمہ کی بدولت طلیطلہ دو سو سال تک برطانیہ، اٹلی اور جرمنی کے طلبہ کا مرکز رہا۔ وہ طلیطلہ میں آتے، عربی ثقافت کو سیکھتے، پھر اپنے ممالک میں واپس جا کر اس ثقافت کے نور کو پھیلانے میں مصروف ہو جاتے۔ (1)

دیرکلونی اور پطرس محترم

پطرس محترم فرانسیسی راہبوں میں سے تھا جسے اس کی وسعت علم کی بنا پر 1123ء میں دیر کلونی کا رئیس بنایا گیا۔ دیر کلونی کی بنیاد فرانس میں 910ء میں رکھی گئی تھی اور اس سے ایک اصلاحی تحریک اٹھی جس نے یورپ بھر کی عیسائیت پر اپنے اثرات چھوڑے۔ (2)

کچھ راہب جنہوں نے سپین سے علوم حاصل کیے تھے انہوں نے بارہویں صدی عیسوی میں دیر کلونی کو عربی ثقافت کی نشر و اشاعت کا مرکز بنا دیا۔

دیر کلونی کا رئیس پطرس محترم مزید علوم حاصل کرنے کی خاطر اندلس میں رہا۔ جب وہ اپنے دیر میں واپس آیا تو اس نے مترجمین کی ایک انجمن بنائی جس کے ارکان ایک جماعت کی شکل میں ترجمے کے کام میں مصروف ہو گئے۔

انگریز عالم "رابرٹ آف تستر" نے 1143ء میں قرآن حکیم کا لاطینی میں ترجمہ کیا۔ اس جماعت نے عربی کی کئی کتابوں کے ترجمے کیے۔ ان کے تراجم کا مجموعہ، مجموعہ کلونی کے نام سے مشہور ہوا۔ اس مجموعے میں پطرس محترم کی اپنی تالیفات بھی شامل تھیں۔ اس نے ترجمہ قرآن پر مقدمہ بھی لکھا تھا۔ اس مجموعے کو یورپ میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔

دیر کلونی قرون وسطی کی یورپی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس دیر نے پطرس محترم کی قیادت میں یورپ میں دینی اصلاحی تحریک کو منظم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس دیر کے کئی راہب پاپائے روم کے منصب پر فائز ہوئے۔

پطرس محترم یہ سمجھتا تھا کہ قدرت نے اسے تین محاذوں پر لڑنے کا فریضہ سونپا ہے۔

(1) یہودیت اور اسلام کا قلع قمع کرنا۔

(2) یورپ میں بیداری کی لہر نے کلیسا کو جس فکری اضطراب اور انتشار میں مبتلا کر دیا ہے اس کا مقابلہ کرنا۔

1۔ "اضواء علی الاستشراق والمستشرقین"، صفحہ 18

2۔ ایضاً، صفحہ 21

(3) ہر قسم کے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے کلیسا کو تیار کرنا۔(1)

پطرس محترم نے ایک طرف مترجمین کی جماعت منظم کی اور دوسری طرف صلیبی حملوں کی دعوت کو عام کیا۔(2) اس نے قرآن حکیم اور دوسری عربی کتابوں کے تراجم کا جو کام شروع کیا تھا اس کا جواز ثابت کرنے اور ان تراجم کو اپنے ابنائے ملت میں مقبول بنانے کے لئے کہتا ہے:

> "گو میری یہ کوششیں بے فائدہ نظر آتی ہیں کیونکہ اس قسم کے اسلحہ (یعنی تراجم وغیرہ) سے دشمن کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن میرا موقف یہ ہے کہ ایک عظیم بادشاہ اپنے ملک میں جو چیزیں جمع کرتا ہے، ان میں سے کچھ دفاع کے لئے ہوتی ہیں، کچھ زیب و زینت کے لئے اور کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو یہ دونوں مقاصد پورے کرسکتی ہیں۔ گو ضروری نہیں کہ ان میں سے ہر چیز ہر زمانے میں استعمال ہو۔ میری ان کوششوں کی مثال بھی یہی ہے۔ ان کوششوں کے ذریعے اگرچہ مسلمانوں کو دین عیسوی میں داخل کرنا ممکن نہیں لیکن ایک عالم کا کم از کم یہ فرض تو بنتا ہے کہ وہ اپنے ان ہم مذہب بھائیوں کی مدد کے لئے کچھ کرے جو کمزور ہیں اور انہیں تھوڑی سی کوشش سے اپنے دین سے بدظن کیا جاسکتا ہے۔"(3)

یہ پطرس ایک متعصب اور کینہ پرور عیسائی تھا۔ اس نے تاریخ میں جو کردار ادا کیا ہے وہ ایک متعصب آدمی کا کردار ہے۔ بارہویں صدی عیسوی سے لیکر زمانہ حال تک مسلمانوں پر جو مصائب نازل ہوئے ہیں، ہزاروں کلمہ گو صلیبی جنگوں کی نذر ہوئے ہیں، مسلمانوں کے دلوں میں اپنے دین سے محبت اور لگن کمزور ہوئی ہے، مسلمان اپنے دین سے دور ہو کر ملحد تہذیب کی جھولی میں گرے ہیں، ان سب المیوں میں پطرس کی کوششوں کا دخل ہے۔

پطرس کے بارے میں جوسٹاف بولون کہتا ہے:

یہ ایک پرانا فوجی تھا۔ بعض وجوہات کی بنا پر اس کی روحانی زندگی اضطراب کا شکار ہوگئی

1۔ "اضواء علی الاستشراق والمستشرقین"، صفحہ 22

2۔ نوٹ۔ دکتور محمد احمد دیاب نے ایک ہی شخص کو کبھی پطرس محترم اور کبھی پطرس ناسک لکھا ہے۔ "المنجد فی الاعلام"، میں ان کو دو مختلف شخصیات قرار دیا گیا ہے۔ اگر یہ دو علیحدہ شخصیتیں ہیں تو بھی اسلام دشمنی میں ایک دوسرے سے بڑھ کر ہیں اور اسلام کا قلع قمع کرنے کے لئے معروف رہی ہیں۔

3۔ "الاستشراق والخلفیۃ الفکریہ للصراع الحضاری"، صفحہ 32

تو اس نے رہبانیت اختیار کرلی۔ یہ راہب پطرس متعصب کے نام سے مشہور تھا لیکن تاریخ نے اس کو پطرس محترم بنادیا۔(1)

پطرس نے اپنی اسلام دشمنی کو خفیہ نہیں رکھا بلکہ وہ اعتراف کرتا ہے کہ تراجم کا کام اس نے اسلام کی مخالفت کے لئے شروع کیا ہے۔ اس نے اعلان کیا کہ وہ اسلام کو کفر سمجھتا ہے اور قرآن کے ترجمے کا مقصد یہ ہے کہ عیسائیوں کو مسلمانوں اور اسلام کے خلاف مضبوط دلائل میسر آسکیں اور ان دلائل کے زور پر وہ اپنے ایمان اور عقیدے پر ثابت قدم رہ سکیں۔

پطرس محترم کے ان تمام اعلانات کے باوجود عیسائیوں کے مذہبی حلقوں نے ترجمہ قرآن کی اشاعت کو اپنے لئے تباہ کن سمجھا اور اس کی اشاعت پر پابندی لگادی۔ یہ ترجمہ چار سو سال تک دیر کلونی میں ایک مخطوطے کی شکل میں محفوظ رہا اور اس کی اشاعت نہ ہو سکی۔(2)

پطرس محترم کی نگرانی میں قرآن حکیم کا جو ترجمہ ہوا، اس میں حقائق کو اتنا مسخ کیا گیا تھا کہ "بلاشیر" جس نے بیسویں صدی عیسوی میں قرآن حکیم کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا وہ پطرس کے ترجمے کو قرآن کا ترجمہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ لاطینی عبارت چند مقامات کو چھوڑ کر باقی مقامات پر قرآن کی عربی عبارت سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔(3)

"بلاشیر" کی اس وضاحت کے باوجود عالم عیسائیت کے لئے یہ ترجمہ، قرآن فہمی کا بہت بڑا ذریعہ رہا ہے۔ چار صدیاں پردۂ خفا میں رہنے کے بعد "تھیوڈور بیلیاندر" نے 1543ء میں اسے شائع کیا اور اس کے بعد قرآن حکیم کے مختلف یورپی زبانوں میں تراجم کے لئے یہ ترجمہ ایک اہم مصدر کی حیثیت اختیار کر گیا۔(4)

جیرارڈ دی کریمون (1114-1187ء)

یہ اطالوی الاصل ہے۔ اس کا تعلق وینسی راہبوں کے ساتھ ہے۔ (5) یہ طلیطلہ گیا۔ وہاں عربی زبان و ادب میں مہارت حاصل کی اور کندی، فارابی اور ابن سینا کے فلسفے کو عربی سے لاطینی زبان میں منتقل کیا۔ اس نے رازی کی بعض کتابوں کے ترجمے بھی کئے۔ اس نے

1۔ "اضواء علی الاستشراق والمستشرقین"، صفحہ 23
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً
4۔ ایضاً، 24
5۔ ایضاً

ارسطو کی "کتاب الاحجار" کو لاطینی میں منتقل کیا۔ اقلیدس کی علم الفلک کی ایک کتاب کا ترجمہ کیا۔ جابر بن افلح کی علم النجوم پر ایک کتاب اور یحییٰ بن سرابی کی کتاب الادویہ کے تراجم کیے۔

کہا جاتا ہے کہ اس نے مختلف علوم و فنون کی ستر (70) سے زیادہ کتابوں کے ترجمے کیے جن کے اصل عربی متن نایاب ہو گئے اور ان کے لاطینی تراجم محفوظ رہے، جنہوں نے یورپ میں علوم کی اشاعت میں اہم کردار ادا کیا۔ جیرار دی کریمون طلیطلہ کے دار الترجمہ ہی میں کتابوں کے ترجمے کیا کرتا تھا اور وہیں اس کا انتقال ہوا۔(1)

رابرٹ آف تشتر

یہ کیٹن کا رہنے والا تھا۔ اس نے تشتر میں علم حاصل کیا اور اسی کی نسبت سے مشہور ہوا۔ یہ ویلسی راہبوں کی جماعت میں شامل ہوا۔ اندلس گیا اور وہاں علوم عربیہ میں کمال حاصل کیا۔ عربی زبان کے علاوہ اس نے ریاضی اور علم الافلاک میں کمال حاصل کیا۔ 1143ء میں بامپلیانہ کا اسقف مقرر ہوا۔ اس نے اپنے دوست ھرمان الدلماطی سے مل کر عربی کتب کے ترجمے شروع کر دیے۔ اس کی ملاقات پطرس محترم سے ہوئی تو اس نے اسے علم نجوم وغیرہ کو چھوڑ کر قرآن حکیم کا لاطینی زبان میں ترجمہ کرنے کی ترغیب دی جس پر اس نے قرآن حکیم کا وہ لاطینی ترجمہ کیا جس کا ذکر پطرس محترم کے بیان میں گزر چکا ہے۔ قرآن کے ترجمے کے بعد اس نے 1144ء میں خوارزمی کی الجبرے کی ایک کتاب کا ترجمہ کیا جو یورپ میں الجبرے کے علم کی اشاعت کی تمہید بن گیا۔ اس نے علم الکیمیا کی ایک قدیم کتاب کا بھی لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ یہ علم الکیمیا کی وہ پہلی کتاب تھی جس سے مغربی یورپ متعارف ہوا۔ رابرٹ نے خود بھی کئی رسائل تالیف کیے۔ اس نے 1150ء میں خوارزمی کی ایک کتاب کی تنقیح بھی کی اور اس نے مشرقی علوم و قوانین کو مغربیت کا رنگ دینے کی کوشش بھی کی۔(2)

ایڈلرڈ آف باتھ۔(1125ء)

یہ اپنی عمر کے ابتدائی حصے میں شام اور ہسپانیہ گیا اور عربی علوم و آداب سیکھے۔ اس نے

1۔ عبد المتعال محمد الجبری، "الاستشراق۔ وجہ للاستعمار الفکری"، (قاہرہ۔1995ء)، صفحہ 55

2۔ ایضاً، 56

عربی کی کئی کتابوں کو لاطینی زبان میں منتقل کیا جن سے اس کے ہم عصروں نے خوب استفادہ کیا۔ اس نے جن کتابوں کے ترجمے کئے تھے ان میں سے بہت سی کتابیں فلک اور ریاضی کے موضوعات پر تھیں۔ عربی علوم میں مہارت کی وجہ سے اس کو ھنری کا اتالیق مقرر کیا گیا جو بعد میں ھنری دوم کے لقب سے برطانیہ کا بادشاہ بنا۔ (1)

ھرمان الدلماطی المتوفی 1172ء

یہ رابرٹ آف تشتر مذکور کا رہبانیت، تعلیم اور تراجم میں ہم سفر تھا۔ یہ کلیسا کے مختلف عہدوں پر فائز رہا اور 1143ء میں "استورجہ" کا اسقف مقرر ہوا۔ اس نے علم الھیئت، علم الاخلاق اور کیمیا کی کچھ کتابوں کے ترجمے کئے اور عرب علماء سے استفادہ کر کے بلاغت اور شاعری پر کچھ کتابیں تصنیف کیں۔ (2)

مائیکل سکاٹ (1175ء۔1235ء)

یہ سکاٹ لینڈ کا رہنے والا تھا اور اس کا تعلق بھی دینی راہبوں کے ساتھ تھا۔ اس نے پیرس یونیورسٹی میں ریاضی کی تعلیم حاصل کی۔ پھر بلرمہ اور طلیطلہ گیا جو عربی ثقافت کے مرکز تھے۔ اس نے جو کتابیں تالیف کیں ان میں سے ایک "خلاصۃ الفلسفہ لابن سینا" تھی۔ مائیکل سکاٹ ابن رشد کا ہم عصر تھا۔ ابن رشد نے زمین، آسمان اور نفس کے موضوعات پر ارسطو کے خیالات کی تردید میں جو کتابیں لکھی تھیں مائیکل سکاٹ نے ان کے ترجمے کئے۔ اس نے ارسطو کی کتاب "الحیوان" کے علاوہ یونانی فلسفے کی اور کتابوں کو بھی ترجمہ کر کے اہل یورپ کے سامنے پیش کیا۔ مائیکل سکاٹ نے یہ یونانی علوم بھی عربوں کی وساطت سے حاصل کئے تھے۔

مائیکل سکاٹ نے سسلی میں فریڈرک دوم کے قائم کردہ دارالترجمہ میں بھی کام کیا۔ پہلے ذکر گزر چکا ہے کہ مائیکل سکاٹ اور اس کے ساتھیوں نے جو کتابیں ترجمہ کی تھیں فریڈرک ثانی نے ان کے کئی نسخے تیار کروائے اور پھر انہیں یورپ بھر میں پھیلا دیا۔ (3)

1۔ "الاستشراق۔ وجہ للاستعمار الفکری"، صفحہ 56

2۔ "اضواء علی الاستشراق والمستشرقین"، صفحہ 25

3۔ "الاستشراق۔ وجہ للاستعمار الفکری"، صفحہ 55 نیز اضواء علی الاستشراق والمستشرقین، صفحہ 14

راجر بیکن

اس کا تعلق انگلستان سے تھا۔ اس نے پیرس کے مدارس میں بڑی محنت سے علم نجوم اور علم کیمیا پر عبور حاصل کیا۔ پھر فرانس کے ایک گرجے میں ڈیرے ڈال دیئے اور ابن الھیثم کی کتابوں کے مطالعہ میں مشغول ہوگیا۔ اس مطالعہ اور تحقیق کے نتیجے میں وہ "مائکرو سکوپ" ایجاد کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ راجر بیکن کہتا ہے کہ کندی اور بطلیموس کا شمار صف اول کے فلسفیوں میں ہوتا ہے۔ اس نے کیمیا کی کتاب "مراۃ الکیمیا" کو عربی سے لاطینی زبان میں منتقل کیا۔

راجر بیکن ان لوگوں میں سے تھا جو مسلمانوں کو دین عیسوی میں داخل کرنے کیلئے مسلمانوں کی زبانیں سیکھنے کی دعوت دیتے تھے۔ وہ کہتا تھا: عالم نصرانیت کی توسیع کے لئے مسلمانوں کو عیسائی بنانا ضروری ہے اور مسلمانوں کو عیسائیت کی طرف راغب کرنے کیلئے ان کی زبان اور ان کے علوم سیکھے بغیر چارہ نہیں۔ (1)

ریمنڈ لل Raymondlull (1235-1316ء)

یہ سپین کے جزیرہ میورقہ میں پیدا ہوا۔ اس نے ایک عرب غلام سے عربی سیکھی۔ اس کے خیالات راجر بیکن کے خیالات سے ملتے جلتے تھے۔ یورپ میں مختلف مقامات پر عربی کی تدریس کے لئے (Chairs) قائم کرنے میں راجر بیکن اور ریمنڈ لل کی کوششوں کا بڑا حصہ تھا۔

یہ راہب اس قسم کی جتنی کوششیں کر رہے تھے ان کا مقصد اس زمانے میں بھی اور بعد کے زمانوں میں بھی مسلمانوں کو عیسائی بنانا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے ساتھ ان کی اپنی زبان میں ان کے مروجہ علوم کے ذریعے بحث کر کے انہیں نصرانیت کی دعوت دی جائے۔ راجر بیکن اور ریمنڈ لل نے جو خواب دیکھا تھا اسے 1312ء میں فینا کی کلیسائی کونسل نے پورا کر دیا۔ یہ کانفرنس اس بات پر متفق ہوگئی کہ پوپ کی یونیورسٹی کے علاوہ یورپ کی پانچ یونیورسٹیوں میں عربی زبان کی تعلیم کا بندوبست کیا جائے۔ ان میں پیرس، آکسفورڈ، بولونیا اور سلمنکا کی یونیورسٹیاں شامل تھیں۔ ریمنڈ لل کو یقین تھا کہ تنصیر کے ذریعے مسلمانوں کو کمزور کرنے کا وقت قریب آگیا ہے۔ اسے یقین تھا کہ مسلمانوں کو عیسائی بنانے

1۔ "الاستشراق والخلفیۃ الفکریہ للصراع الحضاری"، صفحہ 35، نیز الاستشراق وجہ للاستعمار الفکری، صفحہ 55

کے ذریعے وہ سب سے بڑی رکاوٹ ختم ہو جائے گی جو ساری انسانیت کو کیتھولک مذہب پر اکٹھا کرنے کے راستے میں حائل ہے۔(1)

فریڈرک ثانی (1220-1236ء)

یہ سسلی کا بادشاہ تھا۔ عربی علم و ادب اور تہذیب و تمدن کا دلدادہ تھا۔ اس نے مائیکل سکاٹ جیسے کئی علماء کو عربی ادب کو لاطینی زبان میں منتقل کرنے کے کام پر مامور کیا اور پھر ان کے کام کو یورپ بھر میں پھیلا دیا۔(2)

الفانسو دہم (1254-1284ء)

یہ قشتالہ کا بادشاہ تھا اور "حکیم" کے لقب سے مشہور تھا۔ اس نے بھی مسلمان، یہودی اور عیسائی علماء کو عربوں کے علمی ورثے کو یورپی زبانوں میں منتقل کرنے کے کام پر مامور کیا اور خود بھی ان کے ساتھ اس کام میں حصہ لیا۔(3)

مدرسہ میرامار (1276ء)

اس مدرسے میں رائمنڈلیون کئی سال تک تدریسی خدمات سرانجام دیتا رہا۔ کئی راہبوں نے اس مدرسے سے عربی علوم حاصل کیے۔ اس کام میں رائمنڈ مارٹنی بھی رائمنڈ لیون کی معاونت کرتا رہا۔ فرانسسکن راہب "دی لیرا" نے چودھویں صدی عیسوی میں اس مدرسے کو جدید بنیادوں پر استوار کیا۔(4)

اس کے علاوہ 1250ء میں طلیطلہ کی کلیسائی کانفرنس میں فیصلہ کیا گیا کہ آٹھ ڈومینکی راہبوں کو (جنہوں نے اپنے آپ کو علوم عربیہ کے لئے وقف کر رکھا تھا اور ان میں سے ایک نے عربی ہسپانوی لغت بھی تیار کی تھی) یونانی، عبرانی اور عربی زبانیں سیکھنے کے لئے پیرس بھیجا جائے۔ انہوں نے پیرس میں متذکرہ بالا زبانیں سیکھیں اور 1259ء کی بلنسیہ کی کانفرنس نے ان راہبوں کو تطلونیا میں عربی اور عبرانی زبانیں سکھانے کے لئے ایک مدرسہ قائم کرنے پر مامور کیا۔ ان میں سے ایک راہب جس کا نام گلیوم طرابلسی تھا اس نے اسلام

1۔ "الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری"، صفحہ 36
2۔ اضواء علی الاستشراق والمستشرقین، صفحہ 14
3۔ ایضاً
4۔ ایضاً، صفحہ 18

کے متعلق ایک کتاب لکھی اور وہ کتاب "گر یگوری" کو ہدیۃً پیش کی جو بعد میں پاپائے روم کے منصب پر فائز ہوا۔(1)

ہم نے نمونے کے طور پر چند ایسے لوگوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے اپنی زندگیاں اسلامی عربی ورثے کو یورپی زبانوں میں منتقل کرنے کے لئے وقف کر رکھی تھیں۔ اس کام میں ایک طرف بادشاہ دلچسپی لے رہے تھے اور دوسری طرف عیسائی راہبوں کی کثیر تعداد نے بھی اپنی زندگیاں مخلف مقاصد کے تحت اسلامی علوم کو حاصل کرنے کیلئے وقف کر رکھی تھیں۔ گویا جس طرح مامون الرشید اور دیگر عباسی خلفاء نے اجنبی زبانوں کے علمی سرمایہ کو عربی زبان میں منتقل کرنے کے لئے دریادلی سے رقم خرچ کی تھی، دسویں صدی عیسوی اور اس کے بعد کے زمانوں میں یورپ کے بادشاہ اسی دریادلی سے عربی علمی سرمایہ کو مغربی زبانوں میں منتقل کرنے کے لئے، روپیہ خرچ کر رہے تھے اور پادری اور راہب پوری دل لگی سے اس کام میں حصہ لے رہے تھے۔

کتابوں کے ترجمے ہو رہے تھے۔ عربی ورثے کی روشنی میں نئی کتابیں تالیف ہونے لگی تھیں۔ مدارس قائم ہو رہے تھے۔ کلیسا، جس نے کبھی علم کے راستے میں مزاحم ہونے کے لئے پورا زور لگایا تھا، اسے اس حقیقت کا ادراک ہو چکا تھا کہ قوموں کی قوت کا راز جہالت کی تاریکیوں میں نہیں بلکہ علم کے نور میں مضمر ہے۔ اس طرح کلیسا خود مدارس قائم کرنے اور انہیں ترقی دینے کے کام میں مشغول ہو گیا تھا۔

راہبوں کے عربی مدارس ہر طرف پھیلنے لگے۔ 1250ء میں اشبیلیہ، 1259ء میں بار سلونا، 1276ء میں میورقہ، 1281ء میں بلنسیا اور 1291ء میں جنیوا میں مدارس قائم ہوئے اور کلیسا کے مدارس میں سے کچھ ترقی کر کے یونیورسٹیوں کی شکل اختیار کر گئے۔ پوپوں اور بادشاہوں نے دل کھول کر مدارس کی مدد کی۔ ان میں سے بلنسیہ کا مدرسہ بہت مشہور ہوا۔ اس کے علاوہ بالما، لشبونہ، لریدا اور بلدالولید کی یونیورسٹیاں بہت مشہور ہوئیں اور انہوں نے اسلامی علوم کو یورپ میں پھیلانے کے لئے انتہائی اہم کردار ادا کیا۔(2)

1۔ "اضواء علی الاستشراق والمستشرقین"، صفحہ 18

2۔ ایضاً

دوسرا دور

استشراق کی تاریخ کے دوسرے دور کا تعلق اس زمانے سے ہے جب صلیبی جنگوں نے پورے مغرب میں اسلام دشمنی کو اپنے عروج پر پہنچا دیا تھا۔ اس دور کی خصوصیت یہ ہے کہ اس زمانے میں مستشرقین نے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کو اپنی علمی تحقیق کا نہیں بلکہ اپنی الزام تراشیوں کا ہدف بنایا اور تاریخی حقائق کی بنیاد پر نہیں بلکہ اپنے تخیل کی بلند پروازی کے ذریعے اسلام کو بدنام کرنے کی کوشش کی۔

اسلام کے خلاف کارروائیوں میں ان کا بنیادی شکار حضور ﷺ کی ذات بابرکات رہی۔ اس دور میں انہوں نے فرضی تصویری کہانیوں، افسانوں، ناولوں اور ڈراموں کے ذریعے حضور ﷺ کی ذات بابرکات، آپ کی تعلیمات اور آپ کے پیروکاروں کی کردار کشی کی۔

ایک بات ہمیشہ ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اسلام دشمنی میں غیر علمی اور متعصبانہ رویہ صرف اسی دور کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ مستشرقین کے اس رویے کی جھلک ہر دور کے مستشرقین کے کام میں نظر آتی ہے۔

تحریک استشراق کے پہلے دور میں جب مستشرقین اسلامی علوم کو اپنی زبانوں میں منتقل کرنے اور انہیں اپنی قوم میں پھیلانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے، اس دور میں بھی تعصب اپنے پورے جوبن پر تھا۔ یوحنا دمشقی نے بھی اسلام کو نقصان پہنچانے کی غرض ہی سے کتابیں لکھی تھیں اور قرآن حکیم کا ترجمہ پطرس محترم نے بھی اسی غرض سے کرایا تھا۔ لیکن پہلے دور اور دوسرے دور میں فرق یہ ہے کہ پہلے دور کے مستشرقین اسلام پر اعتراض کرنے کے لئے اسلام کی تاریخ اور تعلیمات میں ہی اس اعتراض کی بنیاد تلاش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ جبکہ دوسرے دور کے مستشرقین کا تکیہ صرف اپنے تخیل کی پرواز پر تھا۔ انہیں اسلام کے خلاف لکھنے کیلئے نہ عربی زبان سیکھنے کی ضرورت تھی اور نہ دین اسلام کی تعلیمات کی حقیقت سے آگاہ ہونا ان کے لئے ضروری تھا۔ وہ تو اسلام کو سب سے بڑی برائی سمجھتے تھے اور پیغمبر اسلام ﷺ کو وہ ہر برائی کا منبع سمجھتے تھے۔ اس لئے ان کا عقیدہ تھا کہ وہ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف جو چاہیں لکھیں اس میں کوئی ہرج نہیں ہے۔

ایک اور بات ذہن نشین رہنی ضروری ہے، وہ یہ کہ مستشرقین کی تاریخ کے جو

مختلف ادوار بنائے گئے ہیں، ان کے زمانوں کو متعین کرنا ممکن نہیں، کیونکہ مشرق سے مغرب کی طرف علوم کی منتقلی کا کام بھی صدیوں جاری رہا اور صلیبی جنگوں کا زمانہ بھی صدیوں پر محیط ہے۔ اس لئے مستشرقین کا جو رویہ گیارہویں اور بارہویں صدی میں صلیبی جنگوں کے رد عمل کے طور پر شروع ہوا ممکن ہے اس کی جھلک نویں اور دسویں صدی میں بھی نظر آ جائے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ جس زمانے میں مستشرقین اسلام کے خلاف فرضی داستان سرائیوں میں مشغول تھے، اسی زمانے میں ایسے لوگ بھی نظر آ جائیں جو اسلام دشمنی کی غرض سے قرآن و حدیث اور تاریخ اسلام کے مطالعہ میں مگن ہوں۔ اس لئے تاریخی ادوار کی یہ تقسیم، مستشرقین کے رویوں کے پیش نظر ہے زمانے کے پیش نظر نہیں ہے۔

تحریک استشراق کے دوسرے دور میں اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف جو کچھ لکھا گیا، اس پر بعد کے مستشرقین خود بھی شرمندگی کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی طرف سے اپنے متقدمین کے اس رویے پر شرمندگی کا اظہار اس وجہ سے نہیں کہ وہ اسلام کے بارے میں منصفانہ رویے کو ضروری سمجھتے ہیں بلکہ اس لئے ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ علمی ترقی کے اس دور میں اس قسم کی فرضی داستانیں اور الزام تراشیاں، اسلام کی نسبت ان کی تحریک کو زیادہ نقصان پہنچائیں گی اور یہ غیر علمی اور غیر منطقی رویہ مستشرقین اور ان کی تحریک کے متعلق منفی تاثرات پیدا کرے گا۔

اس دور میں مستشرقین نے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں جس رویے کو اختیار کیا وہ ہم بعد کے مستشرقین کے الفاظ میں قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

مشہور مستشرق منٹگمری واٹ (Montgomery Watt)، جس نے خود بھی اسلام کی تصویر کو مسخ کر کے پیش کرنے کی بھرپور کوششیں کی ہیں، وہ اپنی کتاب (Muhammad Prophet and statesman) میں لکھتا ہے:

> of all the world's great men none has been so much maligned as Muhammad .... for centuries, Islam was the great enemy of Christendom, since christendom was in direct contact with no other organized states comparable in power to the Muslims. The Byzantine empire, after lozing some of its best pro-

vinces to the Arabs, was being attacked in Asia Minor, While western Europe was threatened through spain and Sicily. Even before the crusades focused attention on the expulsion of the soracens from the Holy Land, medieval Europe was building up a conception of a Great enemy. At a point Muhammad was transformed into Mahound, the prince of darkness. By the twelfth century, the ideas about Islam and Muslims current in the crusading armies were such travesties that they had a bad effect on morale. (1)

"محمد ﷺ کو بدنام کرنے کی جتنی کوششیں کی گئی ہیں اتنی کوششیں تاریخ انسانی کی کسی دوسری عظیم شخصیت کو بدنام کرنے کے لئے نہیں کی گئیں۔ صدیوں اسلام کو عیسائیت کا سب سے بڑا دشمن تصور کیا جاتا رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عیسائیت کو اسلام کے علاوہ کسی منظم طاقت سے واسطہ نہ پڑا تھا اتنی ہی طاقتور ہو جتنے مسلمان تھے۔ عربوں کے ہاتھوں اپنے چند بہترین صوبوں سے ہاتھ دھونے کے بعد بیزنطینی حکومت کو ایشیائے کوچک، سپین اور سسلی میں اسلام کا چیلنج درپیش تھا۔ مسلمانوں کو ارض مقدس سے نکالنے کی صلیبی کوششوں سے پہلے ہی یورپ میں "دشمن اعظم" کا تصور جڑ پکڑ چکا تھا۔ ایک وقت وہ بھی تھا جب محمد کو "Mahound" کی شکل میں پیش کیا گیا جس کا مطلب تھا "برائی کا شہزادہ"۔ بارہویں صدی عیسوی میں صلیبی فوجوں کے اذہان میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں جو تصورات تھے وہ بڑے مضحکہ خیز تھے اور انہوں نے اخلاق پر منفی اثرات مرتب کئے۔

ایک اور مستشرق فلپ کے۔ ہٹی "Philip.K.Hitti" اپنی کتاب "Islam a way of life" میں لکھتا ہے:

Christians of medieval times misunderstood Muhammad and considered him a despicable character.

1۔ منگمری واٹ، "محمد، پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین" (آکسفورڈ۔ 1961) ص 231

The reasons, as will be shown later, were more historical- that is, economic and political- than ideological. His earliest Portrait as a false Prophet and imposter, sketched by a ninth-century Greek chronicler, was later embellished with the bright colors of oversexuality, dissoluteness, bloodthirstiness, and brigandage. In clerical circles Muhammad became the antichrist. His dead body was suspended somewhere between heaven and earth until an Italian convert in 1503 visited Medina and was evidently surprised not to find it in that position. Dante bisected the trunk of Muhammad's body and consigned it to the ninth hell as befits the chief of the damned souls, bringers of schism into religion.

Western fablers used Maumet- one of forty-one variants of Muhammad's name listed in the Oxford English Dictionary- in the sense of idol. It came to mean "Puppet" or "doll". In this sense Shakespeare used the word in "Romeo and Juliet". Another variant of the same name Mahoun, was used in english medieval encyclical plays as an object of worship. Ironically the greatest inconoclast and the leading champion of the oneness of God in history was metmorphosed into an object of worship. (1)

"قرون وسطیٰ کے عیسائیوں نے محمد (ﷺ) کو سمجھنے میں غلطی کی اور انہیں (نعوذ باللہ) حقیر کردار کا مالک تصور کیا۔ اس منفی سوچ کے اسباب نظریاتی سے زیادہ معاشی اور سیاسی تھے۔ نویں صدی عیسوی کے ایک یونانی قصہ گو نے محمد (ﷺ) کی تصویر کشی ایک جھوٹے مدعی نبوت اور دغاباز کے طور پر کی تھی۔ اسی تصویر کو بعد میں جنس پرستی، بد چلنی، خون آشامی اور قزاقی کے چمکدار رنگوں سے مزین کیا گیا۔ مذہبی حلقوں میں محمد (ﷺ) کو دشمن مسیح کے طور پر پیش کیا گیا۔ یہ

1۔ فلپ۔ کے۔ ہٹی، "اسلام۔ اے وے آف لائف" (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔ 1971)، صفحہ 22-23

تصور پیش کیا گیا کہ محمد (ﷺ) کی نعش زمین اور آسمان کے درمیان معلق ہے۔ اس افسانے نے اتنی شہرت حاصل کی کہ جب 1503ء میں ایک اطالوی نومسلم مدینہ گیا تو وہ محمد (ﷺ) کی نعش کو مذکورہ مقام پر نہ پا کر متحیر ہوا۔ ڈانٹے نے محمد (ﷺ) کے دھڑ کو دو حصوں میں تقسیم کر کے یہ دکھانے کی کوشش کی کہ وہ جسم جہنم کے نویں درجے میں پڑا ہے جو ایسی ملعون روحوں کے لئے مناسب مقام ہے جو مذاہب میں فرقہ بندیوں کے ذمہ دار ہیں۔ مغربی قصہ گووؤں نے "Maumet" کو (جو لفظ محمد کی بگڑی ہوئی ان چالیس شکلوں میں سے ایک ہے جن کا ذکر آکسفورڈ ڈکشنری میں ہوا ہے) بت بنا کر پیش کیا۔ یہ لفظ پتلی اور گڑیا کا ہم معنی بن گیا۔ شیکسپیئر نے "Romeo and Juliet" میں اس لفظ کو اسی مفہوم میں استعمال کیا۔ محمد کے نام کی ایک اور بگڑی ہوئی شکل "Mahoun" کو قرون وسطیٰ کے ایک کشتی ڈرامے میں ایک ایسی چیز کے طور پر پیش کیا گیا جس کی عبادت کی جاتی تھی۔ یہ حقیقت کے ساتھ کتنا بڑا مزاح ہے کہ ایک بت شکن اور تاریخ انسانی میں توحید خداوندی کے سب سے بڑے چیمپئن کو معبود بنا کر پیش کیا گیا۔"

فلپ۔ کے۔ ہٹی نے حضور ﷺ کی ذات پر ان بے بنیاد الزامات کو اپنے پیشروؤں کی غلط فہمی کہہ کر ان کے جرم کی شناعت کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ کسی قسم کی غلط فہمی کا شکار نہ تھے۔ بلکہ وہ حضور ﷺ کو پہچانتے تھے۔ کیونکہ اس بات میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی مخالفت کی، ہر دور میں ان کی اکثریت مذہبی لوگوں پر مشتمل تھی اور اہل کتاب کے مذہبی راہنما حضور ﷺ کے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہ تھے۔ ہمارے رب نے صدیوں پہلے اس حقیقت کا اعلان فرما دیا تھا:

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ

1۔ سورۃ البقرۃ: 146

"جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ پہچانتے ہیں انہیں جیسے پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو اور بے شک ایک گروہ ان میں سے چھپاتا ہے حق کو جان بوجھ کر۔"

مستشرقین کا اسلام کے متعلق یہ رویہ لاعلمی کی بنیاد پر تھا یا بدنیتی کی بنیاد پر، اس کو سمجھنے کے لئے "رودی بارت" کی یہ عبارت ملاحظہ فرمائیے:

"حقیقت یہ ہے کہ قرون وسطیٰ میں علمائے مغرب اور کلیسا کے راہنماؤں کی رسائی اسلام کے اصل مصادر تک بڑی وسیع تھی۔ لیکن ان مصادر کا معروضی مطالعہ کرنے کی کوشش اس سابقہ عقیدے کے ساتھ ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی تھی کہ اسلام عیسائیت کا دشمن ہے اور اس میں کسی خیر کا وجود ممکن نہیں۔ اس لئے لوگ صرف ان معلومات کو اہمیت دیتے تھے جو اس نظریے کی تقویت کا باعث ہوتی تھیں۔ اس لئے وہ ایسی خبر کی طرف جھپٹتے تھے جس میں دین اسلام یا پیغمبر اسلام (علیہ السلام) کے متعلق برائی کا کوئی پہلو نظر آتا۔"(1)

حقیقت یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ نے اسلام اور پیغمبر اسلام علیہ السلام کے خلاف یہ متعصبانہ بلکہ غیر انسانی رویہ اس لئے اپنایا تھا کہ تحریف شدہ یہودیت و نصرانیت کی کھوکھلی تعلیمات اس قابل نہ تھیں کہ وہ اسلام کی واضح اور عقلی تعلیمات کے سامنے ٹھہر سکیں۔ انہیں یقین تھا کہ اگر اسلام کی تعلیمات اپنی اصل شکل میں اور پیغمبر اسلام علیہ السلام کی سیرت طیبہ کے پاکیزہ حالات اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ یہود و نصاریٰ تک پہنچ گئے تو انہیں اسلام کے دامن میں پناہ لینے سے کوئی چیز روک نہیں سکے گی۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اسلام کی تعلیمات کو بگاڑ کر پیش کیا، پیغمبر اسلام علیہ السلام کی کردار کشی کی اور اندھیروں میں بھٹکتی ہوئی انسانیت کو نور ہدایت سے محروم کرنے کے لئے اپنا سارا زور صرف کر دیا۔

ایک مستشرقہ "Keren Armstrong" نے اپنی کتاب "Muhammad: A Western Attempt to Understand Islam" میں ایک پورے باب میں اہل مغرب کی اسلام دشمنی کی کہانی لکھی ہے۔ اس نے اپنی کتاب کے اس باب کا نام "Muhammad: the Enemy" رکھا ہے۔ ہم ذیل میں اس باب کے چند اقتباسات کا اردو ترجمہ قارئین کی خدمت میں پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ

1۔ "الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری"، صفحہ 33

لکھتی ہے:

850ء میں پرفیکٹس نامی ایک راہب بازار میں گیا۔ چند مسلمانوں نے اس سے سوال کیا کہ آیا محمد ﷺ عظیم پیغمبر ہیں یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ وہ اس سوال کے جواب سے گھبرا گیا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ محمد (ﷺ) کی توہین کو مسلمان بہت بڑا جرم سمجھتے ہیں۔ تھوڑی دیر ہچکچانے کے بعد اس نے محمد (ﷺ) پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اس نے پیغمبر اسلام ﷺ پر جھوٹا مدعیٔ نبوت، جنسی بے راہرو اور دشمن مسیح ہونے کے الزامات لگائے۔ اس کو فوراً جیل بھیج دیا گیا۔ قرطبہ میں اس واقعہ کا پیش آنا خلاف معمول تھا کیونکہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے باہمی تعلقات بہت اچھے تھے اور یہودیوں کی طرح عیسائیوں کو بھی اسلامی سلطنت میں مکمل مذہبی آزادی حاصل تھی اور اکثر ہسپانوی اس عظیم تہذیب کا حصہ ہونے پر فخر کرتے تھے...... پرفیکٹس کی اس حرکت نے اسے اس دور کے مورخ پال الورو "Paul Alvaro" کی نظر میں مذہبی ہیرو بنا دیا۔ پرفیکٹس کی تقلید میں ایک چھوٹا سا طبقہ پیدا ہو گیا جنہوں نے محمد (ﷺ) کو گالیاں دینا اپنا معمول بنا لیا۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ جب پرفیکٹس کو قاضی کی عدالت میں پیش کیا گیا تو وہ سخت ڈرا ہوا تھا۔ قاضی نے اس بنا پر فیکٹس کو سزائے موت نہ سنائی کہ اس کو غلط انداز میں اشتعال دلایا گیا تھا اس لئے اس نے یہ رویہ اختیار کیا۔ لیکن رہائی کے چند دن بعد پرفیکٹس نے پھر اسی جرم کا اعادہ کیا۔ اس بار قاضی کے لئے اس کے سوا چارہ کار نہ تھا کہ وہ اس کے خلاف قانون کو پوری سختی سے استعمال کرتا۔ پرفیکٹس کو سزائے موت دی گئی۔ عیسائیوں کے ایک گروپ نے اسے شہید قرار دے دیا۔ اس کے جسم کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے ان کی بطور تبرک تعظیم شروع کر دی۔ چند دن بعد ایک اور راہب جس کا نام اسحاق تھا، اس نے بھی وہی حرکت کی جو پرفیکٹس نے کی تھی۔ اسے قاضی کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ قاضی نے اسے ہوش میں آنے کی تلقین کی لیکن وہ اپنی بات پر ڈٹا رہا۔ قاضی کے لئے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ اس برملا قانون شکنی کو برداشت کر سکے۔ قاضی اور امیر دونوں پرفیکٹس اور اسحاق کو سزائے موت دینے کے بارے میں بہت محتاط تھے لیکن وہ اس طرح قانون شکنی کی اجازت نہ دے سکتے تھے۔ ان دونوں کی موت کے بعد اور کئی راہبوں نے ان کی تقلید کی اور تقریباً پچاس آدمیوں نے اسی طرح جانیں دے کر اپنے ہم مذہب لوگوں کی نظر میں "شہید" کا مقام حاصل کیا۔ قرطبہ کے بشپ اور دوسرے

عیسائیوں نے اس تحریک کو انتہائی خطرناک سمجھتے ہوئے اس کی مذمت کی لیکن "Eulogio" نامی ایک پادری اور "Paul Alvro" نے انہیں خدا کے سپاہی قرار دیا اور کہا کہ یہ لوگ اپنے دین کی خاطر جانیں دے رہے ہیں۔ "Eulogio" ایک قریبی عیسائی ریاست پمپلونا گیا اور وہاں سے اہلِ مغرب کی کچھ کتابیں لے آیا۔ ان میں مذہبی کتابیں بھی تھیں اور رومن ادب کے کچھ شاہپارے بھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ سپین کے عیسائیوں کو عربی تہذیب سے ہٹا کر رومن تہذیب کی طرف موڑا جا سکے۔ آخر کار یہ تحریک "Eulogio" کی موت کے ساتھ ہی مرگئی۔ یولوجیو کو قاضی نے اپنے رویے میں تبدیلی کر کے بچنے کی تلقین کی لیکن وہ اپنی ضد پر ڈٹا رہا اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ یولوجیو اور الورو دونوں کو یقین تھا کہ اسلام کے ارتقاء کی شکل میں وہ دشمن مسیح ظاہر ہو رہا تھا جس کا ذکر عہد نامہ جدید میں موجود ہے۔ عہد نامہ جدید میں بتایا گیا ہے کہ یہ دشمن مسیح ایک کذاب ہو گا جس کی حکومت قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہو گی۔ تھیسلونینز کے نام دوسرے مکتوب کے مصنف نے لکھا تھا کہ مسیح (علیہ السلام) اس وقت تک دنیا میں واپس نہیں آئیں گے جب تک ارتداد کا بہت بڑا فتنہ ظاہر نہ ہو۔

ایک باغی یروشلم میں اپنا اقتدار قائم کر کے بہت سے عیسائیوں کو گمراہ کرے گا۔ کتاب مکاشفہ میں بھی ایک بہت بڑے چوپائے کا ذکر موجود تھا جس پر "666" کے پراسرار ہندسے کا نشان ہو گا۔ یہ چوپایہ زمین کے اندر سے ظاہر ہو گا اور مقامات مقدسہ پر غلبہ حاصل کر کے ساری دنیا پر حکومت کرے گا۔ اسلام عیسائیوں کو ان پرانی پیشینگوئیوں پر صحیح صحیح پورا اترتا محسوس ہوتا تھا۔ مسلمانوں نے 638ء میں یروشلم کو فتح کیا۔ وہاں کے مقدس مقامات پر دو عظیم مسجدیں تعمیر کیں۔ مسلمان اپنی شوکت وسطوت کے سبب ساری دنیا کے حکمران نظر آتے تھے۔ عیسائیوں کا خیال تھا کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بعد کسی نبی کی ضرورت نہ تھی اس کے باوجود محمد (ﷺ) نے نبوت کا دعویٰ کیا اور بہت سارے عیسائی اپنا دین چھوڑ کر ان کے پیروکار بن گئے۔ "یولوجیو" اور "الورو" کے قبضے میں محمد (ﷺ) کے سوانح پر مشتمل ایک مختصر سی کتاب تھی جس میں محمد (ﷺ) کی تاریخ وفات ہسپانوی کیلنڈر کے سال 666 میں قرار دی گئی تھی جو ان کی روایتی تاریخ وفات سے اڑتیس سال آگے تھی۔ محمد (ﷺ) کی یہ مغربی سوانح حیات پمپلونا کے نزدیک "Leyre" کی خانقاہ میں تیار کی گئی

تھی۔ یہ علاقہ عیسائی دنیا کے ایک کونے میں واقع تھا جو اسلام کی شوکت و سطوت کے سامنے بے بس نظر آ رہا تھا۔ سیاسی فتوحات کے علاوہ اسلام نے ایک نظریاتی سوال کھڑا کر دیا تھا۔ وہ سوال یہ تھا کہ عیسائی سوچتے تھے کہ خدا نے اس جھوٹے دین کو پنپنے کی اجازت کیونکر دے دی ہے؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے اپنے مخصوص بندوں کا ساتھ چھوڑ دیا ہے؟

قرطبہ کے شہیدوں نے محمد (ﷺ) پر جو الزامات لگائے تھے ان کی بنیاد یہی سوانح عمری تھی۔ خوف کی بنیاد پر لکھی گئی اس فرضی کہانی میں محمد (ﷺ) کو ایک دھوکا باز اور کذاب ظاہر کیا گیا تھا جس نے لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ اس کتاب کی رو سے وہ (نعوذ باللہ) ایک عیاش تھا جو خود بھی عیاشی کے مکروہ دھندے میں مست تھا اور وہ اپنے پیروکاروں کو بھی اسی عیاشی کی ترغیب دیتا تھا۔ اس نے لوگوں کو تلوار کے زور پر اپنے دین میں شامل کیا۔ اس کتاب کی رو سے اسلام ایک مستقل الہامی دین نہیں تھا بلکہ یہ ایک بدعت تھی۔ یہ عیسائیت کی ایک بگڑی ہوئی شکل تھی۔ یہ ایک تشدد پسند مذہب تھا جو جنگ اور خون ریزی کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ قرطبہ کے شہیدوں کی اس تحریک کے خاتمے کے بعد یورپ کے دوسرے علاقوں کے لوگوں نے ان کے متعلق سنا لیکن کسی بڑے ردعمل کا اظہار نہ ہوا۔ تاہم اس کے اڑھائی سو سال بعد جب یورپ بین الاقوامی سٹیج پر دوبارہ ظاہر ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا، اس وقت عیسائی قصوں میں محمد (ﷺ) کی ایسی خیالی تصویر کشی کی جا رہی تھی جو اس تصویر کے بالکل مشابہ تھی جو قرطبہ کے شہیدوں کے ذہنوں میں تھی۔ کچھ سنجیدہ علماء نے پیغمبر (ﷺ) اور ان کے دین کے بارے میں معروضی نقطہ نگاہ پیش کرنے کی کوشش کی لیکن "Mahound" کی اس خیالی تصویر کو ہی مقبولیت حاصل رہی۔ محمد (ﷺ) مغربی تشخص کے سب سے بڑے دشمن قرار پائے اور ہر اس برائی کو ان کی طرف منسوب کیا گیا جس سے اہل مغرب اپنے آپ کو ملوث دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ محمد (ﷺ) کے بارے میں ان پرانے توہمات کے آثار آج بھی تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ آج بھی یورپ میں لوگ ان خیالات پر یقین رکھتے ہیں کہ محمد (ﷺ) نے دنیوی کامرانیوں کے لئے مذہب کو استعمال کیا۔ آج بھی یہ خیال عام ہے کہ اسلام تلوار کا دین ہے۔ اگرچہ ایسے لوگ موجود ہیں جو اب "Mahound" کے افسانے کو غلط ثابت کر کے اسلام کے علمی اور غیر جانبدارانہ مطالعہ کے علمبردار ہیں......

گیارہویں صدی کے آخر میں یورپ ایک مرتبہ پھر قوت حاصل کرنے لگا۔ مسلمانوں سے کچھ دوسرے علاقے واپس لینے کے بعد انہوں نے 1099ء میں یروشلم کو فتح کیا اور مشرق میں پہلی مغربی نو آبادی قائم کی..... اس نئی مغربی کامیابی نے اسلام کے خلاف کھلی جنگ کی شکل اختیار کرلی۔ "The song of Roland" جو پہلے صلیبی حملے کے زمانے میں لکھی گئی تھی، اس نظم میں صلیبیوں نے دشمن مسلمانوں کو بت پرستوں کی شکل میں پیش کیا گیا تھا جو خداؤں کی تثلیث (اپالو، ٹرواجنٹ اور ماہومٹ) کے سامنے جھکتے تھے البتہ اس نظم کی رو سے مسلمان بہادر سپاہی تھے جو لڑنے میں لذت محسوس کرتے تھے..... مغرب میں محمد (ﷺ) کی تمثیلی حیثیت نے لوگوں کے لئے اس بات کو مشکل بنادیا ہے کہ وہ آپ کو ایک ایسے تاریخی کردار کی شکل میں دیکھیں جو اس طرح کے سنجیدہ سلوک کا مستحق ہے جس کے مستحق نپولین اور سکندر اعظم تھے۔ سلمان رشدی کی "Satanic Verses" میں "Mahound" کی جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ انہی مغربی داستانوں کی صدائے بازگشت ہے۔ محمد (ﷺ) کی فتوحات کی تشریح کیلئے ان داستانوں میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ محمد (ﷺ) ایک جادوگر تھے جنہوں نے عربوں کو اپنے گرد جمع کرنے اور افریقہ اور مشرق وسطیٰ کے کلیساؤں کو تباہ کرنے کیلئے جھوٹے معجزات کا سہارا لیا تھا۔ ایک داستان میں ایک سفید بیل کا ذکر تھا جس نے لوگوں کو دہشت زدہ کر دیا تھا۔ اور آخر کار اسی بیل کے سینگوں کے درمیان پراسرار طور پر لہراتے ہوئے قرآن ظاہر ہوا جس کو محمد (ﷺ) نے عربوں کے سامنے پیش کیا۔ یہ بھی مشہور کیا گیا کہ محمد (ﷺ) نے ایک فاختہ پال رکھی تھی جو آپ کے کانوں سے دانے چنتی تھی تاکہ یہ ظاہر ہو کہ روح القدس اس کے کانوں میں سرگوشی کر رہا ہے۔ ان کے روحانی تجربات کی تشریح اس دعوے کے ساتھ کی جاتی تھی کہ وہ مرگی کے مریض تھے۔ اس دعوے کو طول دے کر کبھی یہاں تک پہنچادیا جاتا تھا کہ ان پر بدروحوں کا سایہ تھا۔ ان کی جنسی زندگی کی تفصیلات کو بیہودہ انداز میں پیش کیا جاتا تھا۔ ہر گمراہی جو بنی نوع انسان کے علم میں تھی اس کو ان کی طرف منسوب کیا جاتا تھا اور یہ دعویٰ کیا جاتا تھا کہ محمد (ﷺ) نے لوگوں کو، حیوانی خواہشات کی تکمیل کی حوصلہ افزائی کے ذریعے، اپنے دین کی طرف راغب کیا تھا..... یہ ظاہر کیا گیا کہ اسلام کوئی مستقل مذہب نہیں بلکہ یہ عیسائیت سے علیحدہ ہونے والا ایک فرقہ ہے۔ یہ دعویٰ کیا گیا کہ ایک بدعتی راھب "سرجیس" کو دنیائے

عیسائیت سے بھاگ جانے پر مجبور کر دیا گیا۔ اس نے عرب میں محمد (ﷺ) سے ملاقات کی اور عیسائیت کو مسخ شدہ شکل میں پیش کرنے میں ان کی راہنمائی کی۔ یہ بتایا گیا کہ دین محمدی تلوار کے بغیر کبھی نہیں پھیل سکتا تھا۔ یہ دعویٰ کیا گیا کہ اسلامی مملکت میں مسلمانوں کو اب بھی دین کے متعلق آزادانہ گفتگو کرنے کی اجازت نہیں۔ اور یہ جھوٹا افسانہ بھی گھڑا گیا کہ محمد (ﷺ) کا خاتمہ ایسا ہی ہوا جس کے وہ مستحق تھے جب کہ تشنج کے ایک دورے کے دوران خنزیروں کے ایک گلے نے ان کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ ڈانٹے نے اپنی "The devine Comedy" میں محمد (ﷺ) کو تفرقہ بازوں کے ساتھ جہنم کے آٹھویں درجے میں دکھایا تھا.......... مغرب میں آج بھی بعض لوگ یہ سن کر حیران ہوتے ہیں کہ مسلمان اسی خدا کی عبادت کرتے ہیں جس کی عبادت یہودی اور عیسائی کرتے ہیں۔ وہ یہ تصور کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا "اللہ" بھی بت پرستوں کی دیویوں کی طرح ایک دیوی کا نام ہے۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ مسلمان محمد (ﷺ) کو وہی مقام دیتے ہیں جو عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیتے ہیں..........

قرون وسطیٰ میں جب لوگ اسلام کے بارے میں منصفانہ اور غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کرنے کی کوشش کر رہے تھے یا عیسائیت کے پیغام کو مسلمانوں تک پہنچانے کی کوشش کر رہے تھے، ان کوششوں کے دوران بھی بعض اوقات اسلام دشمنی پورے زور و شور سے ظاہر ہو جاتی تھی۔ تیرہویں صدی کے آخر میں ایک ڈومینکن عالم "ریکالڈو ڈی مونٹے کروس" نے مسلم ممالک کا سفر کیا۔ وہ مسلمانوں کی پاکبازی سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے لکھا کہ مسلمان اپنے عمدہ اخلاق کی وجہ سے عیسائیوں کے لئے شرمندگی کا باعث ہیں لیکن وہی عالم جب وطن واپس آیا اور اس نے مسلمانوں کے بارے میں کتاب لکھی تو اس میں اس نے انہی فرضی داستانوں کو دہرایا جو صدیوں سے یورپ میں مشہور چلی آتی تھیں۔ اسلام کے بارے میں مغرب نے جو تصور پیش کیا وہ مقبول ہونے لگا اور اس کے مقابلے میں اسلام اور مسلمانوں کے صحیح حالات بیان کرنے کی کسی کوشش کو مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔" (1)

ہم نے "کیرن آرمسٹرانگ" کی کتاب کے جو اقتباسات سطور بالا میں پیش کئے ہیں انہیں نقل کرتے ہوئے ایک مسلمان کا قلم اور دل دونوں کانپتے ہیں اور انہیں پڑھنے کے

1۔ کیرن آرمسٹرانگ، "اے ویسٹرن اٹیمپٹ ٹو انڈرسٹینڈ اسلام"، (لندن۔ 1991)، صفحہ 44-22

لئے بھی ایک مسلمان کو خون کے گھونٹ پینے پڑیں گے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہم اسلام کے ان دشمنوں کے خبث باطن کو ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جن کو ملت اسلامیہ کی ایک معقول تعداد بڑے احترام کی نظر سے دیکھتی ہے۔ انہیں بے لاگ محقق، غیر جانبدار تبصرہ نگار اور علم و معرفت کے میدانوں میں دنیا کا امام سمجھتی ہے۔ حالانکہ ان کی تحقیق اور غیر جانبداری کا عالم یہ ہے کہ "Guibert De Nogent" جو قرون وسطی کا بہت بڑا مصنف ہے وہ اعتراف کرتا ہے کہ اسلام کے بارے میں لکھتے ہوئے وہ تحریری مصادر پر اعتماد نہیں کرتا اور اس کے پاس صحیح اور غلط میں تمیز کرنے کا کوئی وسیلہ نہیں۔ وہ اسلام کے بارے میں اپنی غیر علمی تصنیفات کا جواز ثابت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ انسان اگر کسی ایسے شخص کی برائیوں کو بیان کرنا چاہے جس کی برائی ہر ممکنہ برائی سے بڑھ کر ہو تو وہ اس کے متعلق جو چاہے کہہ لے اس میں کوئی حرج نہیں۔ جس دور میں تحقیق اور غیر جانبداری کا یہ عالم تھا جو اس یورپی مصنف کے قول سے ظاہر ہے "ساؤدرن" اس دور کو عصر جہالت سے تعبیر کرتا ہے۔(1)

مسلمانوں کو حقائق سے آگاہ کرنے کے لئے ان مستشرقین کی اپنی کتابوں سے، ان کے اصل خدوخال ہم نے پیش کر دیئے ہیں۔ ان اقتباسات کے مطالعہ سے انسان آسانی کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ مستشرقین کئی سو سال تک اسلام کے خلاف زہر اگلتے رہے ہیں اور ان کا پھیلایا ہوا زہر اہل مغرب کے ساتھ ساتھ کئی ان لوگوں کے ذہنوں میں بھی سرایت کر چکا ہے جو مسلمان کہلاتے ہیں۔

اسلام کے خلاف ان الزام تراشیوں کے لئے قرون وسطی کے قلم کاروں کو ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے لیکن سلمان رشدی جو ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا اور اس کا نام بھی مسلمانوں والا ہے اس نے بھی بیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں اپنی کتاب میں وہی رویہ اختیار کیا ہے جو رویہ قرون وسطی کے مصنفین نے اختیار کیا تھا۔

یورپ اور امریکہ میں سلمان رشدی کی کتاب کو جو مقبولیت حاصل ہوئی ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اہل مغرب آج بھی اسلام کے بارے میں اسی لٹریچر کو پڑھنا چاہتے ہیں جس میں اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ پر دل کھول کر کیچڑ اچھالا گیا ہو۔

گو ہم نے مستشرقین کے اس رویہ کو صلیبی جنگوں کا رد عمل قرار دیا ہے، لیکن حقیقت یہ

1۔ "الاستشراق والخلفية الفكرية للصراع الحضاري"، صفحہ 30-29

ہے کہ اس طرز عمل کی جڑیں صلیبی جنگوں سے پہلے بھی موجود تھیں۔ صلیبی جنگوں نے اس طرز عمل کو عروج پر پہنچایا اور بعد کی صدیوں میں گو اس طرز عمل کو ختم کر کے اسلام کے بارے میں مثبت رویہ اپنانے کی کوششیں ہوئیں لیکن یہ طرز فکر اور طرز عمل ختم نہیں ہوا بلکہ موجود ہے اور کبھی کبھی اس کا اظہار پوری شدت کے ساتھ ہوتا رہتا ہے۔

تیسرا دور

تحریک استشراق کی تاریخ کے تیسرے دور کا تعلق اس زمانے سے ہے جب دنیا میں طاقت کا توازن اہل مغرب کے حق میں بدل گیا تھا اور وہ مسلمانوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر عالم اسلام کو اپنے استعماری شکنجے میں کسنے کے خواب دیکھنے لگے تھے۔

دنیائے اسلام پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے انہوں نے بڑی محنت سے منصوبہ بندی کی۔ انہوں نے بروقت اس حقیقت کو محسوس کر لیا تھا کہ مسلمانوں کے علاقوں پر تسلط قائم کرنے اور اس تسلط کو دوام بخشنے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں کے سیاسی، سماجی، دینی، اخلاقی اور معاشی حالات کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے۔ ان کی خوبیوں اور خامیوں سے مکمل آگاہی حاصل کی جائے تاکہ ان کی خامیوں سے فائدہ اٹھا کر اور ان کی خوبیوں کو خامیوں سے بدل کر انہیں کمزور کیا جاسکے۔ انہوں نے مسلمانوں کی تاریخ اور ان کے ممالک کے جغرافیائی حالات کے مطالعہ کو بھی ضروری سمجھا۔ انہیں اس بات کا بھی احساس ہو چکا تھا کہ عالم اسلام کے کونے کونے میں علم و معرفت کے موتی بکھرے پڑے ہیں جن میں قوموں کی قسمت بدلنے کی صلاحیت موجود ہے۔ انہوں نے ان علمی خزائن کو تلاش کرنے، انہیں یورپ منتقل کرنے اور ان سے استفادہ کرنے کو بھی ضروری سمجھا۔

ان تمام ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ضروری تھا کہ مغرب میں اسلامی تہذیب و تمدن اور عربی زبان کو سمجھنے والے لوگوں کی کثیر تعداد موجود ہو جن کی کوششیں عالم اسلام پر مغرب کے استعماری تسلط کی راہ ہموار کر سکیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے متعدد اقدامات کئے جن میں سے چند ایک حسب ذیل تھے۔

1. مسلمانوں کے علمی شاہپاروں کی نشر و اشاعت کا بندوبست۔
2. عالم اسلام سے مخطوطات اور کتابوں کو جمع کر کے انہیں یورپ منتقل کرنا۔
3. عربی علوم اور مشرقی تہذیب و تمدن کو سمجھنے کے لئے مراکز کا قیام۔

4۔ عالم اسلام میں علمی مہمیں بھیجنے کا بندوبست۔

5۔ یونیورسٹیوں میں عربی اور سامی زبانوں کی تدریس کے لئے (Chairs) کا قیام۔

6۔ السنہ شرقیہ کی تدریس کے لئے مختلف تعلیمی اداروں کا قیام۔

7۔ متعدد کانفرنسوں کے ذریعے تحریک کے کام کو منظم کرنے کی کوششیں۔

اسی دور میں فرانس، ہالینڈ، جرمنی، انگلینڈ اور دوسرے یورپی ممالک میں بڑے مشہور مستشرق ظاہر ہوئے جنہوں نے عالم اسلام پر اہل مغرب کے استعماری تسلط کا راستہ ہموار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

ذیل میں ہم مستشرقین کے متذکرہ بالا اقدامات کا ذرا تفصیل سے جائزہ لیتے ہیں۔

کتابوں کی نشر و اشاعت

مستشرقین نے مسلمانوں کی کتابوں کے مغربی زبانوں میں ترجمے کر کے شائع کئے اور عربی علمی مصادر کو اصلی شکل میں بھی شائع کیا۔ جو کتابیں مستشرقین نے شائع کیں ان میں علم الافلاک، جغرافیہ، تاریخ، طب، حکایات، ریاضی، فلسفہ اور دوسرے ہر قسم کے علوم کی کتابیں شامل تھیں۔ انہوں نے جو کتابیں شائع کیں ان کی فہرست بڑی طویل ہے۔ ہم صرف نمونے کے طور پر چند کتابوں کا ذکر کرتے ہیں۔(1)

جغرافیہ

محمد بن جابر البتانی کی "صورة الارض" ابو الفداء کی "جغرافیہ ابو الفداء" رحلہ ابن جبیر اور یعقوبی کی "البلدان" وغیرہ

تاریخ

نوری کی "تاریخ سیطرة العرب علی الاسبانیا" ملک منصور کی "اخبار الملوک" ابن العبری کی "مختصر الدول" مسعودی کی "مروج الذہب" ابن اثیر الجزری کی "تاریخ الدول الاتابکیہ" عبد الواحد مراکشی کی "تاریخ الموحدین، مقریزی کی "الخطط" محمد بن شاکر کی "عیون التواریخ"، اور ابن اثیر کی "کامل التواریخ"۔

1۔ مستشرقین کی طرف سے شائع کی جانے والی کتابوں کی جو فہرست یہاں دی جا رہی ہے وہ "الاستشراق" وجہ للاستعمار الفکری، صفحہ 17 تا 22 سے ماخوذ ہے۔

طب

ابن عوام کی ”اسماء النباتات المختلفہ “ مفردات ابن البیطار، ابن ابی اصیبعہ کی طبقات الاطباء، ابن میمون کی رسالہ فی السموم، ابن بیطار کی فخص الجامع الکبیر اور ابن قوتیہ کی الاشربہ۔

داستانیں

مستشر قین نے ”الف لیلہ ولیلہ “ کو عربی سے انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں منتقل کیا۔ اس کتاب کے تین سوایڈیشن صرف انیسویں صدی عیسوی میں شائع ہوئے۔ مستشر قین نے اس کتاب کو اپنی تخلیقی کاوشوں کا مر کز بنایا۔ مغرب میں یہ کتاب "Arabian nights" کے نام سے مشہور ہے۔ مغرب کے اکثر کہانی نگار اس کتاب سے استفادہ کرتے ہیں اور ان کے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں بھی ”الف لیلہ ولیلہ “ کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ کتاب ھندی الاصل ہے۔ ھندی سے اس کا ترجمہ فارسی میں ہوا اور مسلمانوں نے اس کو فارسی سے عربی میں منتقل کیا۔

مستشر قین اس کتاب کو شائع کر کے اہل مغرب کو یہ تاثر دینے کی کوشش بھی کرتے ہیں کہ اس کتاب کی کہانیاں جس قسم کے معاشرے کی عکاسی کرتی ہیں وہی اسلامی معاشرے کی اصل تصویر ہے۔ ان کی یہ کوششیں مغرب میں اسلام کے بارے میں منفی تاثرات کو پھیلانے کا سبب بنتی ہیں۔

ریاضی اور فلسفہ

مخطوطات الریاضیین الاسلامیین، الریاضیون المسلمون اور رسالہ حی ابن یقظان۔

ہم نے یہاں انتہائی اختصار سے چند کتابوں کے نام گنوائے ہیں جن کو شائع کرنے کا اہتمام مستشر قین نے کیا ہے ورنہ ان کی شائع کر دہ اسلامی کتابوں کی فہرست بہت طویل ہے۔

مستشر قین کی طرف سے اسلامی کتابوں کے ترجمے، تحقیق اور نشر واشاعت کا کام جو مسلمانوں کے سپین میں قدم رکھنے کے ساتھ شروع ہوا وہ آج تک جاری ہے اور اس میں مسلسل تیزی آرہی ہے۔ امریکہ کی مشرقی سوسائٹی ہر سال اسلام کے متعلق کئی بحثیں شائع کرتی ہے۔ واشنگٹن میں امریکی کانگرس کی لائبریری میں عربی، فارسی، اور ترکی وغیرہ، اسلامی زبانوں، میں لکھی ہوئی پانچ لاکھ کے قریب کتابیں موجود ہیں۔ یہی حال بڑی

یونیورسٹیوں کی لائبریریوں کا ہے۔(1)

کتبے اور مخطوطے جمع کرنا

1671ء میں فرانس کے بادشاہ لوئی چہار دھم نے تمام اسلامی ممالک سے مخطوطات خریدنے کے لئے اپنے کارندے بھیجے اور انہیں فرانس کے تمام سفارت خانوں کے نام یہ شاہی فرمان لکھ کر دیا کہ تمام سفارت خانے اپنے مالی اور افرادی وسائل کو اس مقصد کے لئے استعمال کریں۔ مستشرقین (بلکہ مغربی حکومتوں) نے عربوں کے علمی ورثے اور مشرقی اور اسلامی کتابوں کو جمع کرنے میں ایک دوسرے سے مقابلہ کیا۔ انہوں نے اہل مشرق کی کمزوری اور عالم مشرق پر اپنے تسلط کو غنیمت سمجھا۔ مساجد اور دوسرے مقامات پر انہیں جو قیمتی مخطوطات ملے انہوں نے انہیں ردی کے بھاؤ خریدا اور ان کے مختلف ادارے اس علمی ورثے کو اہل مغرب کے مفادات کے لئے قابل استعمال بنانے کی کوششوں میں لگ گئے۔

ڈاکٹر منجن نے 1924 سے 1929ء تک مشرق قریب سے بیشمار مخطوطات جمع کئے اور پھر دوسرے لوگوں کے جمع کردہ مخطوطات کے ساتھ ملا کر ان کی ایک فہرست تیار کی۔ اسی طرح "مارگولیتھ" نے بھی مخطوطات کی ایک فہرست مرتب کی۔ برلن، پیرس، میلانو، روم، لندن، لیبزج، لیڈن، آکسفورڈ، کیمبرج، میونخ، ڈبلن، ایڈنبرا، لینن گراڈ، برٹش ایشیاٹک سوسائٹی اور اسکوریال کی لائبریریاں مخطوطات کی شکل میں مسلمانوں کے علمی ورثے سے بھری پڑی ہیں۔(2)

مذکورہ بالا لائبریریوں میں اڑھائی لاکھ کے قریب مخطوطے ہیں اور ان کو طاق نسیان کی زینت نہیں بنایا گیا بلکہ بے شمار عالم اس علمی ورثے کی فہرستیں مرتب کرنے، مخطوطات کو ترتیب دینے، ان مخطوطات کی افادیت اور اوصاف کی تفصیلات تحریر کرنے اور ان کے مصنفین کے حالات زندگی مرتب کرنے کے کام پر مامور ہیں۔ "بودلی" کی لائبریری مخطوطات کے لئے خصوصی طور پر مشہور ہے۔ یہ لائبریری 1603ء میں قائم ہوئی اور اس میں 3274 مخطوطے محفوظ ہیں۔(3)

1۔ "الاستشراق وجہ للاستعمار الفکری"، صفحہ 22

2۔ ایضاً، صفحہ 23

3۔ ایضاً، صفحہ 24

برٹش میوزیم کی لائبریری میں بھی بے شمار مخطوطے محفوظ ہیں۔ "دی کاسٹل برانکو" نے عربی مخطوطات کے لئے ایک مخصوص لائبریری قائم کی۔ اس کے پانچ بیٹے تھے اور ہر ایک عربی زبان کا ماہر تھا۔ بشپ جوسٹنین نے اپنی ساری دولت عربی مخطوطات جمع کرنے کیلئے خرچ کر دی۔ اٹلی کی کئی لائبریریوں میں بے شمار مخطوطے محفوظ ہیں۔ 1917ء کے انقلاب کے وقت روس کی لائبریریوں میں پچاس ہزار مخطوطے جمع تھے۔(1)

عربی اور سامی زبانوں کی تدریس کے شعبے

مستشرقین نے عربی زبان کی اہمیت کو بہت پہلے سمجھ لیا تھا اور جیسے پہلے گزر چکا ہے کہ 1312ء کی فینا کی کلیسائی کانفرنس نے مختلف یونیورسٹیوں میں عربی کی تدریس کے لئے (Chairs) قائم کرنے کی منظوری دی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کام میں تیزی آتی گئی اور یورپ اور امریکہ میں عربی کی تدریس کے اداروں کا جال بچھ گیا۔

1539ء میں فرانسو اول نے پیرس میں کالج آف فرانس کی بنیاد رکھی۔ اور اس میں عربی اور یونانی کی تدریس کے شعبے قائم کئے۔ 1587ء میں ہنری ششم نے "کالج آف فرانس" میں عربی کے شعبے کو نئی بنیادوں پر استوار کیا۔ سترھویں صدی عیسوی میں آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیوں میں ایسے لوگوں نے شہرت حاصل کی جو عربی زبان میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ ان میں سے تھامس جریوز، ابراھام ویلوک، صموئیل کلارک اور برائن ولٹن خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اٹھارہویں صدی عیسوی کے اختتام سے قبل آکسفورڈ یونیورسٹی نے ایک مطبع قائم کیا تھا جس کا مقصد عربی کے قیمتی مخطوطات کو شائع کرنا تھا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں لندن یونیورسٹی میں عربی کا شعبہ قائم ہوا۔ فرانس کے مستشرقین نے ان تمام ممالک میں، جو فرانس کے زیر اثر تھے، عربی کی تدریس کا وسیع پیمانے پر بندوبست کیا۔ ان ممالک میں الجزائر، مراکش، مصر، شام اور لبنان شامل تھے۔ اسی طرح روس کی مختلف یونیورسٹیوں میں عربی کی تدریس کے لئے (Chairs) قائم ہوئیں۔ سپین میں کئی تنظیمیں قائم ہوئیں جن کا مقصد عربی زبان اور علوم اسلامیہ کی تحصیل کے مواقع فراہم کرنا تھا۔(2)

"عربی کی تدریس کو عام کرنے میں جن لوگوں کی مساعی خصوصی طور پر قابل

1۔ "الاستشراق وجہ للاستعمار الفکری"، صفحہ 24 2۔ ایضاً، صفحہ 27

ذکر ہیں ان میں سے ایک گلیوم پوسٹل (Guillaume Postel) ہے۔ اس شخص کو پہلا حقیقی مستشرق کہا جاتا ہے۔ کالج آف فرانس میں عربی کی جو (Chair) قائم ہوئی تھی، اس کا یہ پہلا سربراہ مقرر ہوا۔ اس نے یورپ میں مشرقی زبانوں اور مشرقی اقوام کے تہذیب و تمدن کو متعارف کرانے کے لئے اہم کردار ادا کیا۔ تدریسی کاوشوں کے ساتھ ساتھ اس نے مشرق سے مخطوطات کا بہت بڑا ذخیرہ بھی جمع کیا اور اس کے بعد اس کے شاگرد جوزف سکالیجر (Joseph Scaliger) نے بھی اپنے استاد کی پیروی کی۔ گلیوم پوسٹل، مسلمانوں کے علمی ورثے کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے: "کوئی شخص عربوں کے طریقہ علاج کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ "جالینوس" جو بات پانچ چھ ضخیم جلدوں میں کہتا ہے وہی بات ابن سینا ایک یا دو صفحوں میں کہہ دیتا ہے۔"

عربی زبان سیکھنے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے گلیوم پوسٹل کہتا ہے:

"عالمی زبان ہونے کی وجہ سے عربی زبان افریقیوں، مصریوں، شامیوں، ایرانیوں، ترکوں، تاتاریوں اور اهل ہندوستان کے ساتھ رابطے میں مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ زبان اپنے دامن میں ادب کا ایک قیمتی ذخیرہ رکھتی ہے۔ جو شخص عربی زبان میں مہارت رکھتا ہو وہ کتاب مقدس کی تلوار سے دین مسیحی کے تمام دشمنوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ وہ دشمنان مسیحیت کے عقائد کو ان ہی کے عقائد کے ذریعہ جھٹلا سکتا ہے۔ گویا انسان عربی زبان سیکھ کر ساری دنیا سے معاملہ کر سکتا ہے۔" (1)

گلیوم پوسٹل کے علاوہ ہالینڈ کے مستشرق تھامس ارپینیس (Thomas Erpenius) نے بھی علوم عربیہ کی اشاعت کے لئے زبردست کام کیا۔ وہ 1613ء میں لیڈن یونیورسٹی کے شعبہ عربی کا سربراہ مقرر ہوا۔ اس نے اپنی تدریسی اور تالیفی کاوشوں کے ذریعے ہالینڈ کو یورپ بھر میں عربی کی تدریس کا مرکز بنا دیا اور ہالینڈ کی یہ علمی حیثیت دو سو سال تک قائم رہی۔ (2)

1۔ "الاستشراق وجہ للاستعمار الفکری"، صفحہ 37

2۔ "الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری"، صفحہ 39

مستشرقین نے یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے شہروں میں مشرقی زبانوں کی تدریس کے لئے مدارس قائم کئے۔ ان مدارس میں اہل مغرب بھی علوم شرقیہ حاصل کرتے اور کئی مشرقی لوگ بھی ان مدارس میں مستشرق اساتذہ سے مشرقی آداب کا درس لینے کے لئے داخل ہوتے۔

لندن، پیرس اور برلن کے مدارس عربی کی تدریس کے لئے مشہور ہیں۔ ان مدارس میں سے ہر ایک کے ساتھ ایک بہت بڑی لائبریری بھی ہے۔ یہ مدارس مختلف مشرقی زبانوں اور ان کے مختلف لہجوں کی تدریس کا خصوصی بندوبست کرتے ہیں۔ صرف سکول آف لندن میں تیس سے زیادہ مشرقی زبانیں پڑھائی جاتی ہیں۔

1732ء میں ایک پادری "ماتیوریپا" نے اٹلی کے شہر "ناپولی" میں مشرقی زبانوں کی تدریس کے لئے ایک ادارہ قائم کیا۔ اس کے بعد مشرقی زبانوں کی تدریس کے لئے پوپ کا مدرسہ قائم ہوا اور اس کے ساتھ ایک لائبریری قائم کی گئی جس میں بے شمار مخطوطات جمع تھے۔ 1967ء میں امریکہ میں ساٹھ یونیورسٹیاں، چالیس لائبریریاں اور اٹھارہ مراکز تھے جو مشرق وسطیٰ کے امور کی تدریس میں مشغول تھے۔(1)

علمی مہمیں

علم کی خاطر سفر، مسلمانوں کا طرہ امتیاز رہا ہے۔ مسلمانوں کے اکثر اکابر نے حصول علم کے لئے دور دراز کے سفر اختیار کئے۔ اس سفر کی وجہ یہ تھی کہ ان کا دین انہیں بتاتا تھا کہ حکمت مومن کی متاع گم گشتہ ہے۔ مسلمانوں نے اس متاع گم گشتہ کی تلاش میں دنیا کا چپہ چپہ چھان مارا۔ یورپ میں یہ اسلوب تعلیم پہلی دفعہ پندرھویں صدی عیسوی میں نظر آتا ہے جب ایک اطالوی باشندے نے دمشق میں عربی سیکھی اور پھر علم کی تکمیل کے لئے لبنان، مصر، فارس اور ایشیائے کوچک کا سفر اختیار کیا۔ پھر "بادوی" کے مدرسہ میں واپس آیا جس کو عربوں نے قائم کیا تھا اور وہاں اس نے ابن سینا کے فلسفہ کی تشریح کی۔ اس کے بعد کئی لوگ علمی مہموں پر روانہ ہوئے۔ "روجر سبتیہ" حصول علم کے لئے لبنان گیا۔ "شار توبریان" القدس گیا اور "رینان" نے علمی مقاصد کی خاطر لبنان کی سیر کی۔ ان کے علاوہ اور کئی لوگوں نے بھی اس غرض سے مشرق کا سفر کیا۔(2)

1۔ "الاستشراق وجہ للاستعمار الفکری"، صفحہ 32-28

2۔ ایضاً، صفحہ 26

نیبھر 1761ء سے 1767ء تک اسی مقصد سے مشرقی ممالک میں پھر تا رہا۔ نیبھر کا تعلق ڈنمارک سے تھا۔ اس کی مہم کے بارے میں کوپن ہیگن پوسٹ نے اپنی 1761-1-20 کی اشاعت میں لکھا۔

"نیبھر کی مہم کا مقصد مشرق کے قیمتی مخطوطات جمع کرنا ہے۔ ان مخطوطات کو جمع کرنے کا ایک مقصد تو عام معلومات کا حصول ہے اور دوسرا یہ کہ مشرقی مخطوطات کتاب مقدس کا صحیح ترجمہ کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوں گے۔ مثلاً تورات میں جن درختوں، حیوانات اور شہروں کا ذکر ہے ان کے متعلق صحیح صحیح معلومات حاصل ہو سکیں گی۔" (1)

حقیقت یہ ہے کہ استعماری طاقتوں کے لئے جتنی مفید اس قسم کی علمی مہمیں ہو سکتی تھیں، اتنی کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی تھی۔ ان مہموں کے ذریعے انہیں مشرقی لوگوں سے ملنے، ان کے ساتھ رہ کر ان کی عادات و خصائل کا مطالعہ کرنے اور ان کی خوبیوں اور خامیوں کا تجزیہ کرنے کا موقعہ مل سکتا تھا۔ مشرقی ممالک کو قدرت نے جن قدرتی وسائل سے مالا مال کیا تھا، یہ مہمیں ان وسائل سے اپنی حکومتوں کو آگاہ کر سکتی تھیں۔ اور اہل مغرب نے عملاً مشرق کو سمجھنے کیلئے اس طریقے کو صحیح صحیح استعمال کیا۔

انجمنیں

مستشرقین نے اپنے کام کو منظم کرنے اور اس کے دائرہ کار کو وسیع کرنے کے لئے مختلف علاقوں اور مختلف زمانوں میں کئی انجمنیں قائم کیں۔ سپین میں اسکوریال کے مقام پر ایک حلقہ قائم ہوا جس کا مقصد دنیائے عرب کے حالات کا مطالعہ کرنا تھا۔ اس حلقے کی اہم ترین کارکن "ڈاکٹر کارمن رویث برابو" تھی۔ ڈاکٹر کارمن نے عربی تہذیب اور مسئلہ فلسطین کے موضوع پر کئی کتابیں لکھیں۔ اس نے دنیائے عرب کے مختلف مصنفین کی کتابوں کے ترجمے بھی کئے۔ "منسوتا" یونیورسٹی میں ایک انجمن قائم ہوئی جس نے دنیا کے بڑے بڑے مذاہب مثلاً بدھ مت، عیسائیت اور اسلام کی تدریس کے لئے ایک مخصوص پروگرام وضع کیا۔ اس تنظیم نے پہلے اپنی کوششیں ثانوی مدارس کے طلبہ تک محدود رکھیں لیکن کچھ عرصہ بعد ان کو کالج اور یونیورسٹی کی سطح تک پھیلا دیا۔ اس پروگرام میں دینی

1۔ "الاستشراق وجہ للاستعمار الفکری"، صفحہ 14

معلومات کے ساتھ ساتھ طلبہ کو ایسی معلومات بھی بہم پہنچائی جاتی تھیں جو امریکیوں کیلئے مشرق وسطیٰ کے ساتھ بہتر رابطوں کیلئے ضروری سمجھی جاتی تھیں۔ یہ بات واضح ہے کہ اس قسم کی سوسائٹیوں کے مقاصد سیاسی تھے جو ان بڑی تنظیموں کے مقاصد کے ساتھ ہم آہنگ تھے جن کے مفادات عالم اسلام کے ساتھ وابستہ تھے۔ یہ سوسائٹیاں ان طلبہ کی مدد اور حوصلہ افزائی کرتی تھیں جو اسلامی تہذیب، تاریخ اور دیگر علوم اسلامیہ میں تخصص حاصل کرنا چاہتے تھے۔(1)

کانفرنسیں

مستشرقین نے اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا کہ زندگی کے کسی بھی شعبے میں انفرادی کوششوں سے زیادہ اجتماعی کوششیں مفید ثابت ہوتی ہیں۔ استشراق کے کام کا جامع پروگرام وضع کرنے، ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ اٹھانے اور اپنی کوششوں کو تقسیم کار کے اصول پر منظم کرنے کے لئے مستشرقین نے کئی کانفرنسیں منعقد کیں۔ ان کانفرنسوں میں ہر مستشرق نے اپنی تحقیق کا نچوڑ اپنے دوسرے تحریکی ساتھیوں کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے اپنی گزشتہ کارروائیوں کا جائزہ لیا اور آئندہ کے لئے پروگرام وضع کیا۔ اس طرح یہ کانفرنسیں تحریک استشراق کے کام کی رفتار کو تیز کرنے میں بہت مفید ثابت ہوئیں۔

مستشرقین کی پہلی کانفرنس 1873ء میں پیرس میں منعقد ہوئی۔ یہ کانفرنسیں مختلف وقفوں کے بعد مسلسل منعقد ہوتی رہیں۔ 1964ء تک مستشرقین کی ان کانفرنسوں کی تعداد بیس تک پہنچ گئی۔ آکسفورڈ میں مستشرقین کی جو کانفرنس منعقد ہوئی، اس کے مندوبین کی تعداد نو سو 900 تھی۔ جو پچیس ممالک، پچاسی یونیورسٹیوں اور انہتر علمی تنظیموں کی نمائندگی کر رہے تھے۔(2)

مستشرقین کی بین الاقوامی کانفرنسوں کے علاوہ مختلف ممالک کے مستشرقین کی قومی کانفرنسیں بھی منعقد ہوتی رہیں۔ جرمنی کے مستشرقین کی کانفرنس ہر چار سال بعد منعقد ہوتی ہے۔ 1980ء میں برلن کے شہر میں ان کی اکیسویں کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں بیسیوں موضوعات زیر بحث آئے۔ اس کانفرنس میں ایک ایسی آواز بھی بلند

1۔ "الاستشراق وجہ للاستعماری الفکری، صفحہ 37-33

2۔ ایضاً، صفحہ 46

ہوئی جو عام مستشرقین کے مزاج کے بالکل خلاف تھی۔ یہ آواز "فریٹز شٹیات" کی تھی۔ اس نے برلن یونیورسٹی کے وسیع و عریض لان میں باآواز بلند کہا:

"سامعین! ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم زمانہ حال کے مسلمانوں کے کردار اور حقیقی اسلام میں تمیز کریں۔ اسلام ایک عظیم دین ہے جو عزت، آزادی، انصاف، علم اور ترقی کا علمبردار ہے، لیکن دور حاضر کے مسلمان سیاستدانوں نے اپنی قومی زندگی میں اسلام کی روح کو نافذ نہیں کیا۔ ان کی اس کوتاہی کا نتیجہ ہے جس کا آپ آج مشاہدہ کر رہے ہیں۔"(1)

اس قسم کی ہمہ جہتی کانفرنسوں کے علاوہ ایسی کانفرنسیں بھی مستشرقین منعقد کرتے رہے ہیں جو کسی خاص علم یا فن کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں۔

ایشیائی سوسائٹیاں

اہل مشرق کے انداز حیات کو سمجھنے اور مشرقی خصوصیات کے ادراک کے لئے مستشرقین نے متعدد سوسائٹیاں قائم کیں۔ اس قسم کی پہلی سوسائٹی جاوا کے دارالخلافہ "بتافیا" میں 1781ء میں قائم ہوئی۔ 1784ء میں "سر ولیم جونس" نے کلکتہ میں بنگال ایشیائی سوسائٹی قائم کی جس کے تمام ارکان انگریز تھے۔ اس سوسائٹی نے اپنی 1788ء سے لے کر 1836ء تک کی تحقیقات کو بیس جلدوں میں شائع کیا۔ بنگال ایشیائی سوسائٹی کے میگزین میں جو مقالے شائع ہوئے وہ ان کے علاوہ ہیں۔ اس رسالے کا پہلا شمارہ 1832ء میں شائع ہوا اور اس کے بعد آج تک شائع ہو رہا ہے۔(2)

1787ء میں فرنچ سوسائٹی قائم ہوئی جس کا مقصد مشرقی مخطوطات کی اشاعت تھا۔ اس سوسائٹی نے مسعودی کی مروج الذھب، رحلہ ابن بطوطہ، جغرافیۃ الادریسی، تفسیر بیضاوی اور سیرت ابن ہشام جیسی کتابیں شائع کیں۔ 1820ء میں فرنچ ایشیاٹک سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس سوسائٹی نے ایک ایشین میگزین جاری کیا جس نے مسلمانوں کے گمراہ فرقوں کو خاص اہمیت دی تاکہ مغرب میں اسلام کی تصویر کو مسخ کر کے پیش کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ اس مجلے میں عربی علوم مثلاً فلسفہ، طبعیات، ادب اور جغرافیہ کے

1۔ "الاستشراق وجہ للاستعماری الفکری"، صفحہ 48

2۔ ایضاً، صفحہ 50-49

موضوعات پر بھی مضامین شائع ہوتے ہیں۔

1823ء میں لندن میں "شاہی ایشیائی سوسائٹی" کا قیام عمل میں آیا جس نے حریری کی "مقامات" اور ابن عربی کی "ترجمان الاشواق" کو شائع کیا۔

1834ء میں بمبئی میں ایشیائی سوسائٹی قائم ہوئی۔ 1842ء میں امریکہ اور جرمنی بھی فرانس اور برطانیہ کے راستے پر چلے اور انہوں نے بھی ایشیائی سوسائٹیاں قائم کیں اور ایشیائی مجلے جاری کئے۔ آسٹریا، اٹلی اور روس سے بھی ایسے مجلے جاری ہوئے اور 1840ء میں امریکہ میں امریکی مشرقی سوسائٹی قائم ہوئی۔(1)

تحریک استشراق کی تاریخ کے اس دور میں چند ایسے لوگ ظاہر ہوئے جنہوں نے اپنی علمی کاوشوں کی بدولت بہت شہرت حاصل کی۔ فرانس کے سلفستر دی ساسی (Silvestre de sacy) نے بہت کام کیا۔ اس کو اپنے زمانے کے مستشرقین کا امام کہا جاتا ہے۔ اسی کی کوششوں سے پیرس علوم عربیہ کا مرکز بنا اور یورپ کے مختلف ممالک سے طلباء اور علماء سلفستر دی ساسی سے علوم عربیہ سیکھنے کے لئے پیرس کا رخ کرتے رہے۔(2)

اسی دور میں جرمنی میں ریسکے Reiske (م1774ء) سوئٹزرلینڈ میں بورہرڈ Burhard (م1817ء) اور برطانیہ میں ایڈورڈ پوکاک (Edward Pococke) نے تحریک استشراق کی ترقی کیلئے سخت محنت کی۔(3)

اس دور کے مستشرقین کے مزاج کو سمجھنے کے لئے نپولین کی مثال پر غور کرنا ضروری ہے۔ نپولین نے جب 1798ء میں مصر پر حملہ کیا تو یہ حملہ صرف عسکری نہیں تھا بلکہ نپولین کے ساتھ علماء کی ایک بہت بڑی جماعت بھی تھی جنہوں نے مصری زندگی کے تمام پہلوؤں کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ اس مطالعہ کے نچوڑ کو ایک کتاب کی صورت میں شائع کیا جس کا نام "وصف مصر" رکھا۔

نپولین نے اسلام کے بارے میں اچھے خیالات کا اظہار کر کے اور جامعہ الازھر کے علماء سے رابطہ قائم کر کے مسلمانوں کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ وہ مسلمانوں کا دوست اور خیر خواہ ہے۔ نپولین نے مصر کے علمی خزانوں کو فرانس منتقل کیا۔ انگریزوں نے بھی

1۔ "الاستشراق وجہ للاستعمار الفکری"، صفحہ 50-49

2۔ "الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری"، صفحہ 48

3۔ مستشرقین کے افکار و نظریات کے مختلف دور، مشمولہ اسلام اور مستشرقین، جلد 2، صفحہ 14

نپولین کی پیروی کی اور ہندوستان سے بے شمار قلمی نسخے یورپ منتقل کیے۔ اسی قسم کے علمی شاہپاروں کو یورپ کی لائبریریوں میں دیکھ کر اقبال خون کے آنسو رویا تھا۔(1)

جب استعماری طاقتوں نے مشرقی ممالک پر تسلط قائم کرنے کا ارادہ کیا تو ہر جگہ ان کا طریقہ کار ایک تھا۔ سیاسی تسلط سے پہلے انہوں نے علمی مہموں اور تجارتی کمپنیوں کے ذریعے اپنے قدم مضبوط کیے۔ مختلف حیلوں بہانوں سے ان ممالک کے لوگوں کو اپنے تزویری پنجوں میں کسا۔ ان کی صفوں میں انتشار وافتراق کے بیج بو کر ان کی ملی وحدت کو پارہ پارہ کیا۔ اور وہ قومیں جب انتشار کے روگ میں مبتلا ہو کر کمزور ہو گئیں تو تلوار کے زور پر ان کو اپنا سیاسی غلام بنالیا۔

مغرب نے جب سے ممالک اسلامیہ کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنا شروع کیا ہے، اس وقت سے ان کی علمی کاوشیں اسی نقطے کے گرد گردش کرتی ہیں کہ وہ ان ممالک کے استحصال کے لئے کون سا طریقہ اختیار کریں کہ انہیں تلوار بھی نہ اٹھانی پڑے اور ان کا دشمن بھی مغلوب ہو جائے۔ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

چوتھا دور

تحریک استشراق کی تاریخ کے چوتھے دور کا تعلق اس زمانے سے ہے جب نوآبادیاتی نظام کے شکنجے کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی اور مسلم ممالک میں آزادی کی تحریکوں نے استعماری طاقتوں کے لئے خطرے کی گھنٹی بجادی۔ اہل مغرب نے مسلمانوں سے تلوار کے ذریعے معاملات طے کرنے کی کوششیں بار بار کی تھیں لیکن انہیں ہمیشہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ مسلمانوں سے نمٹنے کے لئے تلوار کی کامیابی سے ناامید ہو کر ہی انہوں نے دوسرے راستے اختیار کئے تھے۔ نوآبادیاں قائم کرنے کے لئے بھی انہوں نے تلوار کا استعمال صرف اس مرحلے پر کیا تھا جب ان کی دوسری چالوں کے ذریعے مسلمان تلوار اٹھانے کے قابل نہ رہے تھے۔ اب جب طویل غلامی کے بعد مسلمانوں کے آزاد ضمیر نے انگڑائی لینا شروع کی، انہوں نے غلامی پر موت کو ترجیح دینے کے بارے میں سوچنا شروع کیا اور ان میں ایسے مردان حق پیدا ہوئے جنہوں نے سلطان ٹیپو شہید کی روح کو سلام کرتے ہوئے یہ نعرہ لگایا

1۔ "مستشرقین کے افکار و نظریات کے مختلف دور" مشمولہ اسلام اور مستشرقین، جلد 2، صفحہ 14، نیز "الاستشراق، رسالة الاستعمار"، صفحہ 214

کہ "شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی ہزار سالہ زندگی سے بہتر ہوتی ہے" تو استعماری طاقتیں ایک نئی صورت حال سے دوچار ہو گئیں۔ اب ان کے لئے صرف دو راستے رہ گئے تھے۔ ایک راستہ تو یہ تھا کہ آزادی کی اٹھتی ہوئی تحریکوں کو بزور شمشیر کچل دیں اور دوسرا طریقہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے علاقوں کو خالی کر کے اپنے ممالک میں واپس چلی جائیں۔

پہلے راستے کو اختیار کرنے کی ان میں جرات نہ تھی۔ وہ مسلمانوں کو میدان جنگ میں آزما چکے تھے اور انہیں یقین تھا کہ یہ قوم موت کو خاطر میں نہیں لاتی۔ صلیبی جنگوں کی طویل تاریخ کے ہولناک مناظر انہیں اس راستے کو اختیار کرنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ اس لئے انہوں نے نو آبادیات کو آزادی دینے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن جن علاقوں پر انہوں نے اتنا عرصہ حکومت کی تھی انہیں یوں ہی چھوڑ کر چلے جانا آسان نہ تھا۔ وہ اب تک مسلمانوں کے حکمران تھے اور مسلمانوں کو دوسرے درجے کی مخلوق سمجھتے ہوئے ان کے ساتھ برتاؤ کرتے تھے۔ لیکن اب انہوں نے مسلمانوں کی دوستی اور خیر خواہی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ انہوں نے پوری کوشش کی کہ مسلمان جسمانی طور پر ان کے غلبے سے آزاد ہو کر بھی ان کی ذہنی غلامی سے آزاد نہ ہونے پائیں۔

اس مقصد کے لئے ضروری تھا کہ ایسی تمام چیزیں جو مسلمانوں کے دلوں میں اہل مغرب کے خلاف نفرت پیدا کرتی تھیں، ان کے اثرات کو کم کرنے کی کوشش کی جائے۔ ان کے پیشرووں نے کئی سو سال تک اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف زہر اگلا تھا۔ عیسائیوں سے مسلمانوں کو متنفر کرنے کیلئے مستشرقین کی یہ کتابیں بہت خطرناک ثابت ہو سکتی تھیں اس لئے تحریک استشراق کے گرگٹوں نے ایک رنگ اور بدلا۔ اب ایسے مصنفین منظر عام پر آنے لگے جنہوں نے اپنے پیشرووں کی تحریروں پر شدید تنقید کی۔ انہوں نے اسلام کے بارے میں ایسی کتابیں لکھنا شروع کیں جن میں اسلام کے کچھ شعبوں کی تعریف کی گئی تھی۔

اس قسم کے مصنفین کی تحریروں میں گو انصاف کی جھلک نظر آتی ہے لیکن نسلی اور دینی تعصب نے ان کو بھی انصاف کے آئینے میں حقائق کو دیکھنے کی مہلت نہ دی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان مصنفین کا مقصد حق کی جستجو تھا ہی نہیں۔ ان کا مقصد تو صرف مسلمانوں کی حمایت حاصل کرنا تھا اور اپنے رویے میں معمولی سی تبدیلی سے انہوں نے یہ مقصد حاصل کر لیا۔

منٹگمری واٹ اور تھامس کارلائل جیسے لوگوں نے اسلام کے متعلق چند کلمات خیر لکھ دیئے تو مسلمانوں کے بڑے بڑے ادیبوں اور مصنفوں نے ان کی تعریف میں بڑھ چڑھ کر اپنا زور قلم صرف کیا۔ انہیں منصف مزاج عالم، بے لاگ مبصر اور غیر جانبدار محقق کے خطابات دیئے۔ حالانکہ ان لوگوں نے بھی اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ پر حملہ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ یہ سب لوگ حضور ﷺ پر الزام لگاتے ہیں کہ آپ نے قرآن خود گھڑا تھا۔ تھامس کارلائل قرآن حکیم کو (نعوذ باللہ) دنیا کی سب سے زیادہ بور کتاب کہتا ہے اور منٹگمری واٹ نے حضور ﷺ کی حیات طیبہ کے مختلف گوشوں پر بڑھ چڑھ کر حملے کئے ہیں۔

تحریک استشراق کی تاریخ کے اس دور میں مستشرقین اپنی حکومتوں کے دست راست بن گئے۔ وہ اپنے اپنے ملک کی وزارت خارجہ کے مشیر بنے اور انہوں نے اپنے وسیع تجربے اور مطالعے سے فائدہ اٹھا کر ایسی پالیسیاں وضع کیں کہ استعماری طاقتوں کے چلے جانے کے بعد بھی مسلمان ان کی ضرورت محسوس کریں۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد برطانیہ میں سکاربورو رپورٹ (Scarbrough Report) تیار کی گئی۔ اس رپورٹ میں مشرق میں برطانوی مفادات کے تحفظ کے لئے نیا لائحہ عمل پیش کیا گیا۔ مشہور مستشرق ایچ۔ اے۔ آر گب (H.A.R.Gibb) نے اپنی کتاب (Modern trends in Islam) میں نئے تقاضوں کے پیش نظر مسلمانوں کے حالات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔(1)

استعماری طاقتوں نے دم واپسیں مستشرقین کے مشوروں کے مطابق مسلمانوں پر جو وار کئے ان کے اثرات ہم آج بھی دیکھ سکتے ہیں۔ نصاب تعلیم قوموں کی زندگی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم اپنے مدارس میں آج تک وہ نصاب پڑھا رہے ہیں جو مستشرقین ہمیں عطا فرما گئے ہیں۔

اس نظام تعلیم نے دین کو دنیا سے اور علوم جدیدہ کو مسلمانوں کے روایتی علوم سے علیحدہ کر دیا ہے۔ نصاب کی اس تقسیم نے ملت کو تقسیم کر دیا ہے اور امت مسلمہ جس کی بنیاد ہی علم پر قائم تھی وہ علم کے میدان میں اقوام عالم سے بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ مستشرقین نے جو زہر پھیلایا تھا، اسی کا اثر ہے کہ آج مسلمان عربی اور اسلامیات سیکھنے کے لئے یورپ

1۔ "مستشرقین کے افکار و نظریات کے مختلف ادوار"، مشمولہ "اسلام اور مستشرقین"، جلد 2، صفحہ 16

اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں داخلہ لیتے ہیں اور دین کو سمجھنے کے لئے ان علمی مصادر کی طرف رجوع کرتے ہیں جو مستشرقین نے اپنے خصوصی مقاصد کے تحت تیار کئے ہیں۔ مستشرقین کے ان مقاصد میں اسلام کی تصویر کو مسخ کرکے پیش کرنا سرفہرست ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ استعماری طاقتوں کے چلے جانے کے بعد بھی مسلمان عملاً ان کے غلام ہیں۔ استعماری طاقتیں اب کمزور اقوام کو قرضے فراہم کرکے انہیں اپنے سودی شکنجوں میں کستی ہیں اور پھر ان ممالک کی داخلی اور خارجہ پالیسیاں انہی کے اشارے پر بنتی ہیں۔ ووٹ اسلامی ممالک کے شہری دیتے ہیں لیکن اقتدار اسے ملتا ہے جس کو امریکہ دینا چاہتا ہے۔

اگر ذرا دقت نظر سے دیکھا جائے تو انسان اس حقیقت کا فوراً ادراک کر لیتا ہے کہ اس دور کے مستشرقین کا پھیلایا ہوا زہر، ہر دور کے مستشرقین کے پھیلائے ہوئے زہر سے زیادہ مہلک اور خطرناک ہے۔

پانچواں دور

تحریک استشراق کی تاریخ میں ایک اور اہم موڑ اس وقت آیا جب اسلامی ممالک کو قدرت نے زر سیال کی دولت سے مالا مال کیا۔ قدرت نے ملت اسلامیہ کو یہ نعمت اس دور میں عطا کی تھی جب اقتصادی تقاضوں نے انسانی زندگی کے دیگر تمام تقاضوں کی اہمیت کو کم کر دیا تھا۔ اقتصادی خوش حالی ہی عزت، شہرت اور تہذیب کا معیار بن چکی تھی۔

استعماری طاقتوں نے نو آبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد مسلمانوں پر اپنے اثر و نفوذ کو قائم رکھنے کے لئے اقتصادیات ہی کا سہارا لیا تھا۔ مسلم ممالک نے گو آزادی حاصل کر لی تھی لیکن وہ اقتصادی شعبے میں مغرب کی طرف دیکھنے پر مجبور تھے۔ مستشرقین نے مسلمانوں کو تباہ کرنے کی جو طویل المیعاد منصوبہ بندی کی تھی اس کا نتیجہ تھا کہ مسلمان اس بات پر مجبور تھے کہ وہ اپنا خام مال کوڑیوں کے بھاؤ اہل مغرب کے ہاتھوں فروخت کریں اور پھر اس خام مال سے تیار شدہ اشیاء مہنگے داموں خرید کر اپنی نالائقی کا ماتم کریں۔

ناقص نظام تعلیم کی وجہ سے مسلمانوں کی یونیورسٹیوں سے انجینئر، سائنسدان، ٹیکنالوجی کے ماہرین اور ایسے لوگ فارغ نہیں ہو رہے تھے جو اپنے ممالک کے بے پناہ قدرتی وسائل کو کام میں لا کر اقوام عالم کو اپنا دست نگر بنا سکتے بلکہ ان کے مدارس اور یونیورسٹیوں سے وہی لوگ فارغ ہو رہے تھے جو کلرکی کریں یا سیاست اور تعلیم کے

میدانوں میں آکر مسلمانوں کو تہذیب مغرب کا دلدادہ بنانے کے لئے اپنی ساری صلاحیتیں وقف کریں۔

مسلمان اپنے وسائل کو خود اپنے خلاف اور اہل مغرب کے حق میں استعمال کر رہے تھے۔ اگر مسلمان اس قابل ہوتے کہ وہ اپنے خام مال کو خود مصنوعات کی شکل میں تبدیل کر سکتے تو یورپ کی فیکٹریاں بند ہو جاتیں۔ یورپ اقتصادی طور پر کمزور ہوتا تو اس کی سیاسی چودھراہٹ بھی اپنی موت آپ مرجاتی لیکن افسوس کہ مسلمان ایسا نہ کر سکے۔

جس زمانے میں اہل مغرب مسلمانوں کی نالائقی کی وجہ سے ان کی اقتصادی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے میں مصروف تھے، اسی زمانے میں قدرت نے مسلمانوں کو زرسیال کی دولت عطا کر دی۔ یہ صورت حال اہل مغرب کے لئے بڑی تشویشناک تھی۔ اس دولت کے ذریعے مسلمانوں کا اقتصادی طور پر مضبوط ہونا یقینی تھا۔ مسلمان اس اقتصادی طاقت کو سیاسی، سماجی اور مذہبی معاملات میں بھی استعمال کر سکتے تھے۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ یہ نئی دولت مسلمانوں کو ایک مرتبہ پھر ایک زندہ اور غیور قوم بنادے۔ اہل مغرب سوچ رہے تھے کہ اگر مسلمان جاگ اٹھے تو مغرب کی ذہنی غلامی سے آزاد ہو جائیں گے۔ وہ اپنے مذہب، اپنی تہذیب، اپنی زبان اور اپنے طرز حیات پر فخر کرنے لگیں گے اور مشرق کا یہ نخچیر زبوں ان کے شکنجے سے آزاد ہو جائے گا۔ ساری دنیا کو عیسائی بنانے کا خواب چکنا چور ہو جائے گا اور مشرقی اقوام کے مقابلے میں اقوام مغرب کی نسلی برتری کا تخیلاتی محل دھڑام سے زمین بوس ہو جائے گا۔

اس سنگین صورت حال کو خاموش تماشائی بن کر دیکھنا اہل مغرب کے لئے ممکن نہ تھا۔ انہوں نے کچھ کرنے کا فیصلہ کیا اور ہمیشہ کی طرح اس بار بھی مستشرقین ہی ان کے کام آئے۔ مستشرقین نے اب اسلام کے روایتی مطالعے پر توجہ کم کر دی اور دور حاضر کے مسلمان معاشروں میں پائے جانے والے رجحانات کا تفصیلی مطالعہ شروع کر دیا۔ اب ان کے مطالعہ کا مرکز توجہ پورا مشرق نہ تھا بلکہ صرف وہ ممالک تھے جہاں قدرت نے تیل کے وافر ذخائر پیدا فرمائے تھے۔ اب مستشرقین نے ایشیائی سوسائٹیوں کی بجائے مشرق وسطیٰ کے نام سے سوسائٹیاں قائم کرنا شروع کر دیں۔

1966ء میں امریکہ نے جنوبی امریکہ کی مطالعاتی ایسوسی ایشن برائے مشرق وسطیٰ

(The middle east studies association of North America) قائم کی۔1976ء میں برطانیہ کی مطالعاتی سوسائٹی برائے مشرق وسطیٰ (British Society of Middle east studies) قائم ہوئی۔(1) مستشرقین اس دور میں جو کام کر رہے ہیں گو وہ خفیہ ہے لیکن اس کے اثرات روز روشن کی طرح ظاہر ہیں۔ وہ اسلامی ممالک جن میں زر سیال کی دولت موجود ہے، ان پر وہ لوگ حکمران ہیں جن کا مرکز قوت امریکہ ہے۔ اہل مغرب جمہوریت کے پرچارک اور شہنشاہیت اور آمریت کے دشمن ہیں لیکن تیل پیدا کرنے والے مسلمان ممالک کے لئے وہ جمہوریت کو نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اگر وہاں جمہوریت ہو گی تو ان ممالک کی پالیسیوں پر مغرب کا کنٹرول کمزور پڑ جائے گا۔ ایران اور عراق کے درمیان جنگ کے جو شعلے بھڑکائے گئے اور عراق کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے لئے امریکہ نے اقوام متحدہ کی نگرانی میں جو کردار ادا کیا وہ تیل کے اسی خطرے سے نمٹنے کی ایک صورت تھی۔ مسلمانوں کو اس بات میں کسی قسم کی غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ اہل مغرب مسلمانوں کو آسانی سے کبھی یہ اجازت نہیں دیں گے کہ وہ تیل کی اس خداداد دولت کو اپنی مرضی سے اپنی ملت کی فلاح و بہبود اور ان کے معیار زندگی کو بلند کرنے کے لئے استعمال کریں۔ اہل مغرب کی یہ غنڈہ گردی اس وقت تک جاری رہے گی جب تک مسلمان اپنے دوست اور دشمن میں تمیز نہیں کرتے اور ایک آزاد قوم کی طرح دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا حوصلہ اپنے اندر پیدا نہیں کرتے۔

چھٹا دور

ہم جس دور سے گزر رہے ہیں، اس دور نے مستشرقین کیلئے ایک نیا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ اسلام کے شجرہ طیبہ کو جڑوں سے اکھیڑ پھینکنے اور ہدایت کی اس شمع کو گل کرنے کیلئے عالم کفر نے ہر دور میں زبردست کوششیں کیں۔ مسلمانوں کو تلوار اور قلم کے ساتھ گھائل کرنے کی کوششیں صدیوں تک جاری رہیں اور ایک وقت وہ آیا جب اسلام دشمن قوتوں کو یقین ہو گیا کہ اب مسلمانوں کا اپنے مرکز قوت سے رابطہ ٹوٹ چکا ہے جس کے بحال ہونے کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ مستشرقین نے صدیوں اسی مقصد کے لئے کوششیں کی تھیں۔ انہوں نے اسلام کی تعلیمات کو ایسے بھونڈے انداز میں پیش کیا تھا کہ

1۔ "مستشرقین کے افکار و نظریات کے مختلف ادوار"، مشمولہ اسلام اور مستشرقین"، جلد 2، صفحہ 17

ہر سلیم الفطرت انسان ان سے نفرت کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کا رشتہ اپنے عظیم نبی سے توڑنے کے لئے خدا کے اس عظیم پیغمبر کو ایک افسانوی کردار بتادیا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ ان کی تہذیب کے مقابلے میں مغربی تہذیب کہیں بہتر ہے۔ انہیں یہ باور کرانے کی کوشش بھی کی تھی کہ اگر وہ دنیا میں ترقی کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسلام سے رابطہ منقطع کر لیں۔ انہوں نے اسلام کو ایک ایسی افیون قرار دیا جو انسان کی قوت عمل کو مضمحل کر کے رکھ دیتی ہے۔ کیمونسٹوں نے اپنے زیر تسلط علاقوں میں مسلمانوں کے تشخص کو ختم کرنے اور انہیں اپنے دین سے دور رکھنے کے لئے ظلم و ستم کا ہر تیر آزمایا تھا۔

اسلام دشمن قوتوں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے یہ دیکھا کہ ان کے اس تخریبی زبوں میں زندگی کے آثار پھر سے نظر آنے لگے ہیں اور مسلمان ایک مرتبہ پھر صحیح معنوں میں مسلمان بننے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ درحقیقت یہ اسلام دشمن قوتوں کی بھول تھی کہ انہوں نے مسلمانوں کے دلوں میں اپنے دین کی محبت کے چراغ کو گل کر دیا تھا کیونکہ یہ نشہ وہ نہیں جسے ترشی اتار دے۔

ہدایت کا نور جب کسی دل میں گھر کر لیتا ہے تو پھر اس دل کو اس نور سے بے نیاز کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں کے دلوں میں بھی ابھی ہدایت کی وہ شمع ٹمٹمار ہی تھی جو ہر قسم کی ظلمتوں کے لئے پیغام موت تھی۔ مستشرقین اور دیگر اہل مغرب نے اندازہ لگالیا کہ ہدایت کی وہ شمع جسے وہ اپنے خیال میں گل کر چکے تھے وہ ابھی گل نہیں ہوئی بلکہ اس میں زندگی کی رمق ابھی باقی ہے۔

مستشرقین نے دیکھا کہ دین اسلام ابھی زندہ ہے۔ اور یہ دین زندہ کیوں نہ ہو تا جب کہ اس کی حفاظت اس ہستی نے اپنے ذمہ قدرت پر لے رکھی ہے جو علی کل شی قدیر ہے۔ اس نے اعلان کر رکھا ہے:

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ (1)

"بے شک ہم ہی نے اتارا ہے اس ذکر (قرآن مجید) کو اور یقیناً ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔"

1۔ سورۃ الحجر: 9

اس دور میں اسلامی تحریکیں زور پکڑنے لگیں۔ برصغیر میں ایک ایسی تحریک اٹھی جس نے اسلام کے نام پر ایک نئی ریاست کے قیام کی کوششیں کیں اور وہ اس میں کامیاب ہو گئی۔ وہ تحریک، تحریک پاکستان کے نام سے مشہور ہے اور اس تحریک کا نعرہ ہی یہ تھا۔ پاکستان کا مطلب کیا؟ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللہُ

جو ممالک اسلامیہ استعماری تسلط سے آزاد ہوئے، ان ممالک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے مطالبے ہونے لگے۔ برصغیر، مصر اور افریقہ کے مسلم ممالک میں ایسی تحریکوں نے زور پکڑا۔ افغانستان اور ایران کے مسلمان اپنے دوسرے ملی بھائیوں سے بھی چند قدم آگے تھے۔

اس صورت حال نے اہل مغرب کا سکون برباد کر دیا۔ اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک مرتبہ پھر مستشرقین کو نیا لائحہ عمل وضع کرنے پر مامور کیا گیا۔ ملت اسلامیہ کا یہ نیا رجحان یہودیوں کے لئے بھی بہت بڑا خطرہ تھا۔ ان کی مملکت "اسرائیل" کی بنیاد ہی عالم اسلام کے مسلمانوں کے جذبات کے کھنڈروں پر رکھی گئی تھی اور مسلمانوں کے سچا مسلمان بن جانے کی صورت میں اس ناجائز ریاست کے بقا کی کوئی صورت نہ تھی۔

مستشرقین ایک مرتبہ پھر استشراقی، صیہونی، تبشیری اور استعماری آرزوؤں کے محل کی حفاظت کے لئے میدان میں آ گئے۔ انہوں نے مسلمانوں کے لئے دہشت گرد اور بنیاد پرست کی اصطلاحیں ایجاد کیں۔ الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے ان اصطلاحوں کی اتنی تشہیر کی کہ مسلمان زعماء کی زبانوں سے بھی بنیاد پرستی کی مذمت ہونے لگی۔ مسلمانوں کا طبقہ دہشت گردی کے الزام سے بچنے کیلئے اپنے مسلمان ہونے پر شرمندگی محسوس کرنے لگا۔ الجزائر میں انتخابات میں فتح حاصل کر لینے کے باوجود اسلام پسند عناصر کو اقتدار سے محروم رکھنے کی سازش کی گئی۔ مختلف اسلامی ممالک میں اسلام کے حق میں اٹھنے والی آوازوں کو کچلا گیا۔ اسلام کا نام لینے کے جرم میں ایران کو سارے مغرب کا سب سے بڑا دشمن سمجھا گیا۔ مسلمانوں کی طرف سے ایٹم بم بنانے کی کوششوں کو اسلامی بم کا نام دیا گیا اور عراق کے ایٹمی پلانٹ پر حملہ کیا گیا۔

یہ تفصیل بڑی طویل ہے۔ استشراق کی تحریک ابھی اس راستے پر پوری تیز رفتاری سے دوڑ رہی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ سلمان رشدی کی (Satanic Verses) بھی اسی

سلسلے کی ایک کڑی ہے۔اب ایک مرتبہ پھر مغرب میں صلیبی روح انگڑائی لے رہی ہے۔ بوسنیا، چیچنیا، افغانستان، فلسطین اور کشمیر میں لوگوں کا خون صرف اسی جرم میں بہ رہا ہے کہ وہ مسلمان ہیں۔

امریکہ نے خلیج کی جنگ میں لاکھوں انسانوں کے خون سے ہولی کھیلی لیکن اتنی بڑی دہشت گردی کے باوجود امریکہ امن پسند ہے اور عراق اور لیبیا بلکہ سارے مسلمان دہشت گرد ہیں۔ سلمان رشدی نے کروڑوں مسلمانوں کے جذبات کا خون کیا ہے لیکن وہ امن پسند اور مہذب ہے لیکن اس قلمی دہشت گردی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے والے دہشت گرد ہیں۔

نیٹو کا وزیر دفاع کہہ چکا ہے اور علی الاعلان کہہ چکا ہے کہ اشتراکیت کے خاتمے کے بعد یورپ اور امریکہ کا سب سے بڑا دشمن اسلام ہے۔ کہیں یہ اعلان ایک اور صلیبی حملے کا پیش خیمہ تو نہیں؟ کہیں اس اعلان کے پیچھے ان مستشرقین کا مکر و فریب تو کار فرما نہیں جنہوں نے قلم اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے اسلام کو ختم کرنے کی کوششوں میں ناکامی کو دیکھ کر ایک مرتبہ پھر تلوار اٹھانے کا فیصلہ کر لیا ہے؟

تحریک استشراق کی تاریخ کے اتار چڑھاؤ کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ مستشرقین نے اپنے کام کا آغاز دو جہتوں میں کیا تھا۔ انہوں نے ایک طرف تو مسلمانوں کے علمی ذخائر کو اپنے ممالک میں منتقل کرنے اور انہیں استعمال میں لا کر مادی اور تہذیبی میدانوں میں ترقی کرنے کی کوششیں شروع کیں اور دوسری طرف مسلمانوں کے دین، ان کی تاریخ اور ان کی تہذیب کو مسخ کرنے، مسلمانوں کو اپنے دین سے بیگانہ کرنے اور غیر مسلم لوگوں کو اس دین سے متنفر کرنے کی بھرپور مہم چلائی۔

زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ ان کے طریقہ ہائے واردات میں تو تبدیلیاں آتی رہیں لیکن جس مقصد کے تحت اس تحریک کا آغاز ہوا تھا وہ مقصد مستشرقین کی آنکھوں سے کبھی اوجھل نہیں ہوا۔ مستشرقین نے کبھی طالب علموں کا روپ اختیار کیا۔ کبھی جسموں پر صلیبیں سجائیں۔ کبھی تحقیق اور جستجو کے نام پر ممالک اسلامیہ کے کونے کونے تک پہنچے۔ کبھی مسلمانوں کے ہمدرد اور خیر خواہ بن کر منظر عام پر آئے اور کبھی پسماندہ اقوام کیلئے مشفق و مربی کا روپ دھارا۔ لیکن اتنے روپ بدلنے کے باوجود ان کا

مقصد ہمیشہ ایک ہی رہا اور وہ مقصد اسلام کی بیخ کنی کے سوا کچھ نہ تھا۔

استشراق، تبشیر اور استعمار

اہل مغرب جو اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت میں صدیوں سے مصروف عمل ہیں، وہ تین منظم تنظیموں میں منقسم ہیں۔ ایک وہ ہیں جنہوں نے عیسائیت کی تبلیغ واشاعت کو اپنی زندگی کا مقصد بنا رکھا ہے۔ یہ لوگ دیگر ادیان کے مقابلے میں بالعموم اور اسلام کے مقابلے میں بالخصوص عیسائیت کی فوقیت ثابت کرنے کے لئے کوششیں کرتے ہیں۔ یہ کھل کر اسلام کی تعلیمات اور تاریخ اسلام کی مقتدر شخصیات کے کردار پر بحث کرتے ہیں۔ یہ لوگ مبشر اور منصر کہلاتے ہیں۔ اور ان کی تحریک کو تبشیر یا تنصیر کی تحریک کہا جاتا ہے۔

مغربی سیاستدان، سفارت کار اور فوجی جو مشرقی ممالک پر استعماری غلبے کی کوششوں کا حصہ بنے وہ مستعمرین کہلاتے ہیں اور جس تحریک سے ان لوگوں کا تعلق ہے اس تحریک کو تحریک استعمار کہا جاتا ہے۔ اور جو لوگ علم کی خدمت کا لبادہ اوڑھ کر مصروف عمل ہیں وہ مستشرقین کہلاتے ہیں۔

عموماً یہ تاثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ تینوں تنظیمیں ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہیں، یہ نہ ایک دوسری پر انحصار کرتی ہیں اور نہ ان کے کام کا میدان ایک ہے بلکہ یہ سب اپنے اپنے میدان میں کام کر رہی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑا دھوکا ہے۔ یہ تینوں تنظیمیں دراصل ایک ہیں اور ان کے کام میں بھی زبردست ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

استشراق، مشرق اور بالخصوص اسلام کے تفصیلی مطالعہ کا نام ہے اور جن لوگوں نے اس کام کا آغاز کیا، ان میں اکثریت راہبوں اور پادریوں کی تھی۔ کلیسا صدیوں علم کا دشمن رہا۔ اس کے دور اقتدار میں کتابیں جلتی رہیں۔ علماء کلیسا کی جہالت کی بھینٹ چڑھتے رہے اور مدرسے بند ہوتے رہے لیکن جب مسلمانوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ قوموں کی ترقی کا راز علم میں مضمر ہے تو علوم اسلامیہ کو مغرب میں منتقل کرنے کا بیڑا بھی انہی لوگوں نے اٹھایا جن کے لئے مستشرقین سے زیادہ مبشرین کی اصطلاح موزوں ہے۔ راہبوں نے عربی سیکھی، کتابوں کے تراجم کئے، مدارس قائم کئے اور ممالک اسلامیہ سے قیمتی مخطوطے اکٹھے کرنے کے لئے اپنی زندگی بھر کی کمائیاں صرف کیں۔ مغربی یونیورسٹیوں میں عربی کی تدریس کا فیصلہ سب سے پہلے کلیسا کی کانفرنس میں ہوا۔

یہ تمام حقائق اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ استشراق اور تبشیر دو علیحدہ تحریکیں نہیں بلکہ یہ ایک ہی تحریک کے دو مختلف روپ ہیں۔

اسی طرح مبشرین اور مستشرقین کے بارے میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ان کا استعماری طاقتوں سے کوئی تعلق نہیں، وہ تو امن پسند اور صلح جو لوگ ہیں جو دین اور علم کی خدمت میں مگن ہیں لیکن یہ تاثر بھی بالکل غلط ہے۔ جس طرح استشراق کی تحریک کو تبشیر سے علیحدہ کرنا ناممکن ہے اسی طرح استشراق اور تبشیر دونوں کو استعمار سے علیحدہ کرنا بھی ممکن نہیں۔ ان تحریکوں کی تاریخ اس حقیقت سے پردہ اٹھاتی ہے کہ مبشرین اور مستشرقین استعماری طاقتوں کے لئے راستہ ہموار کرتے رہے۔ انہیں مشرق کے متعلق پالیسیاں وضع کرنے کے لئے ضروری معلومات مہیا کرتے رہے۔ استعمار کے قیام کے لئے مستشرقین اپنی حکومتوں کے مشیر کا کام کرتے رہے۔ اور ان خدمات کے بدلے میں مستعمرین نے دل کھول کر ان کی مالی مدد کی۔ ان کے علمی منصوبوں کے لئے سرمایہ فراہم کیا اور ان کی تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے ماحول کو سازگار بنایا۔

گویا مستشرقین، مستعمرین کے فکری راہنما تھے اور مستعمرین، مستشرقین کے پشت پناہ اور محافظ۔ ان کے مقاصد بھی ایک تھے اور ان مقاصد کی تکمیل کے لئے ان کی مساعی میں بھی ہم آہنگی موجود تھی۔ استعماری طاقتوں نے مستشرقین کے علم کو اپنے استبدادی مقاصد کے لئے دل کھول کر استعمال کیا۔ خود کئی مستشرقین اپنے پیشروؤں کے اس طرز عمل اور علم فروشی پر ندامت کا اظہار کرتے ہیں۔

جرمن مستشرق سٹیفن وائلڈ (Stephan Wild) اس سلسلے میں کہتا ہے:

"سب سے بری بات یہ ہے کہ لوگوں کی ایک ایسی جماعت موجود ہے جو مستشرق ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن انہوں نے اسلام اور اس کی تاریخ کے متعلق اپنی معلومات کو اسلام دشمنی کے لئے استعمال کیا۔ یہ واقعہ بڑا افسوسناک ہے اور ایسے مستشرق جو اپنے مقصد سے مخلص ہیں انہیں صراحت سے اس کا اعتراف کرنا چاہئے۔" (1)

کارل ہیز چ بیکر (Karl Heinrich Becker) جو جرمنی کا ایک بہت بڑا مستشرق ہے

1۔ "الاستشراق والخلفیۃ الفکریہ للصراع الحضاری"، صفحہ 55

اور جرمنی کے مجلۃ الاسلام کا مؤسس ہے، اس نے افریقہ میں جرمن استعمار کا راستہ ہموار کرنے کی زبردست کوششیں کیں جن کے نتیجے میں افریقہ کے کئی علاقوں پر جرمنی کا تسلط قائم ہوگیا۔ "کارل بیکر" مذکور کے کام کے بارے میں ایک دوسرا جرمن مستشرق "اولرچ ہارمان" (ulrich Harmann) کہتا ہے:

1919ء سے پہلے اسلام کے متعلق جرمنوں کا مطالعہ حسن نیت پر مبنی نہیں تھا۔ "کارل ہینرچ بیکر" جو بہت بڑا مستشرق ہے وہ سیاسی سرگرمیوں میں ملوث تھا۔ اس نے 1914ء میں برطانیہ کے مقابلے میں اسلام کو سیاسی ڈھال کے طور پر استعمال کرنے میں زبردست سرگرمی دکھائی۔(1)

روسی مستشرق بارتھلڈ (Barthold) جو روس کے مجلۃ الاسلام کا بانی ہے اس نے وسطی ایشیا میں روسی حکومت کے مفادات کے لئے کام کیا۔ ہالینڈ کا مستشرق "سنوک ھر گرونجہ" استعماری اغراض کی تکمیل کے لئے مکہ مکرمہ گیا۔ اس نے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا۔ عبدالغفار کا نام اختیار کیا۔ یہ عربی کا ماہر تھا۔ اس شخص نے مشرق میں ہالینڈ کی نو آبادیاں قائم کرنے کے لئے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ یہ شخص انڈونیشیا میں ہالینڈ کی استعماری حکومت کے اہم عہدوں پر فائز رہا۔ فرانس کے کئی مستشرق فرانس کی نو آبادیوں کے معاملات کے لئے وزارت خارجہ کے مشیر کے عہدے پر فائز رہے۔ مثلاً "دی۔ ساسی" جو فرانس کا سب سے بڑا مستشرق ہے وہ مشرق کے متعلق تمام معاملات میں وزارت خارجہ کے مشیر کے طور پر کام کرتا تھا۔ مخصوص حالات میں وہ وزارت دفاع کو بھی مشورے دیتا تھا۔ "ماسینیون" بڑا عرصہ فرانس کی استعماری حکومتوں کا، اسلام کے متعلق معاملات میں، مشیر رہا۔(2)

فرانسیسی مستشرق "ھانوتو" نے اپنی ایک کتاب میں خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اس نے افریقہ کی اسلامی نو آبادیات میں فرانس کی سیاست کی جڑیں مضبوط کرنے کے لئے فکری مواد اختراع کیا۔ اس قسم کا مواد اختراع کرنے کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو عقیدے کے معاملے میں کمزور کیا جائے۔ تاکہ ان پر آسانی سے حکمرانی کی جاسکے۔(3)

1۔ "الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری"، صفحہ 56

2۔ ایضاً، صفحہ 57

3۔ ایضاً

برطانیہ کے لارڈ کرزن (Curzon) نے برطانوی راج کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کیلئے ہی بیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں برطانیہ میں علوم شرقیہ کا مدرسہ قائم کرنے پر زور دیا تھا۔ یہی مدرسہ بعد میں لندن یونیورسٹی میں تبدیل ہوا۔(1)

برطانوی حکومت اپنے استعماری مقاصد پورے کرنے کیلئے مشرق کے بارے میں فیصلہ کرنے سے پہلے مستشرقین کی ایک جماعت سے مشورہ کیا کرتی تھی، جو حکومت برطانیہ کو ضروری معلومات مہیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں "ڈاکٹر ابراہیم اللبانی" لکھتے ہیں:

حقیقت یہ ہے کہ مغرب کے اہل سیاست کا یورپ کے السنہ شرقیہ کے تدریسی اداروں کے اساتذہ کے ساتھ گہرا رابطہ ہوتا ہے۔ اور اسلامی ممالک سے متعلقہ امور کا فیصلہ کرنے سے پہلے وہ مستشرقین کی آراء کو وقت نظر سے دیکھتے ہیں۔ میں نے خود ایک مستشرق کی زبانی سنا ہے جو کہہ رہا تھا کہ مسٹر "ایڈن" مشرق وسطی کے متعلق فیصلہ کرنے سے پہلے مستشرقین کو جمع کرتا تھا، ان کی آراء کو سنتا تھا اور پھر ان کی آراء کی روشنی میں فیصلہ کرتا تھا۔(2)

ان چند مثالوں سے اس بات میں شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے کہ استعمار اور استشراق ایک ہی چیز ہے۔ صرف روپ مختلف ہیں۔ محکوم اقوام پر حکومت کو آسان بنانے کے لئے ان کے حالات کے تفصیلی علم استعماری طاقتوں کی مجبوری تھی۔ ان کی اس ضرورت کو مستشرقین پورا کرتے تھے۔ معلومات میں اضافے سے استعماری طاقتیں مزید مضبوط ہوتی تھیں اور پہلے سے بھی زیادہ معلومات جمع کرنے کی طرف متوجہ ہوتی تھیں۔ یہاں پھر مستشرقین ان کے کام آتے تھے۔ مستشرقین کی ان خدمات کے صلے میں مستعمرین ان کو اتنی مراعات دیتے تھے جن سے ان کو اپنے کام کو مزید وسعت دینے کا موقعہ مل جاتا تھا۔

یہودی اور تحریک استشراق

عموماً تحریک استشراق کو دنیائے عیسائیت کی ایک تنظیم تصور کیا جاتا ہے۔ تبشیر اور استعمار جو اغراض و مقاصد اور طریقہ کار میں تحریک استشراق کی شریک کار ہیں، ان کو بھی عیسائیت سے ہی متعلق سمجھا جاتا ہے۔ استشراق کے ذکر کے وقت یہودیت کی طرف ذہن بہت کم مائل ہوتا ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں اور سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ

1۔ "الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری"، صفحہ 57

2۔ ایضاً، صفحہ 58

عیسائیوں اور یہودیوں کے باہمی تعلقات کی تاریخ رقابت، دشمنی اور ایک دوسرے کے خلاف مظالم کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ عیسائیت کو اپنے ظہور کے ساتھ ہی جس قوم کی طرف سے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا وہ یہودی ہی تھے۔ یہودیوں نے عیسائیوں پر بے شمار مظالم ڈھائے اور جب عیسائیوں کو دنیا میں اقتدار حاصل ہوا تو انہوں نے یہودیوں سے چن چن کر بدلے لئے۔ ہٹلر نے جرمنی میں یہودیوں کے خون کی ندیاں بہائیں۔ صلیبی لشکر، جو مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لئے یورپ سے روانہ ہوتے تھے، وہ یہودیوں کو بھی معاف نہیں کرتے تھے۔ جب سپین مسلمانوں کے زیر نگین تھا تو یہودی یورپ کے پادریوں اور بادشاہوں کے مظالم سے بچنے کے لئے مسلمانوں کی پناہ حاصل کرتے تھے۔

عیسائیت کے ساتھ یہودیوں کی دشمنی کی اس طویل تاریخ کو دیکھ کر یہ بات بڑی عجیب سی نظر آتی ہے کہ ایسے دو دشمن جن کی دشمنی ابھی ختم نہیں ہوئی وہ کسی تنظیم میں اکٹھے کام کر رہے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ استشراق کی تحریک میں جس طرح عیسائی سرگرم عمل نظر آتے ہیں، اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ یہودی سرگرم عمل ہیں۔

"گولڈ زیہر" مشہور مستشرق ہے۔ دوسرے مستشرق تحریک استشراق کے لئے اس کی کوششوں کی تعریف کرتے ہیں اور اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اس نے عربی اسلامی علوم کے مطالعے کو ایک نیا رنگ عطا کیا ہے۔ یہ شخص ایک یہودی تھا۔ تحریک استشراق میں بے شمار ایسے لوگ موجود ہیں جو در اصل یہودی تھے لیکن ان کو شہرت ایک یہودی عالم کے طور پر نہیں بلکہ صرف ایک مستشرق کے طور پر حاصل ہوئی۔

علی بن ابراہیم النملہ نے اپنی کتاب "الاستشراق فی الادبیات العربیہ" میں ایسے بیالیس مستشرقین کے نام گنوائے ہیں جو یہودی تھے۔ لیکن انہوں نے یہودی مستشرق کے طور پر نہیں بلکہ یورپ یا اپنے متعلقہ ممالک کے حوالے سے اپنے آپ کو متعارف کرایا۔ ان لوگوں میں گولڈ زیہر کے علاوہ غرونباوم، سلیمان مونک، ایڈورڈ غلازر، ا۔ی۔ فنسنک، ڈیوڈ صموئیل، مارگولیتھ، ا۔ شادہ، کارل بروکلمان، لیفی بروفنسال، لوئی ماسینیون، جوزف شاخت، مکسیم روڈنسن اور برنارڈ لوئس جیسے لوگ شامل ہیں جنہوں نے تحریک استشراق کے کام کو آگے بڑھانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔(1)

مندرجہ بالا تفصیلات کے مطالعہ سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ یہودی بھی

1۔ علی بن ابراہیم النملہ، "الاستشراق فی الادبیات العربیہ"، (مرکز الملک الفیصل۔ 1993) صفحہ 100-93

استشراق کی تحریک میں عیسائیوں کی طرح پورے زور وشور سے شریک تھے۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ تحریک استشراق کے مقاصد بعینہٖ وہی تھے جو یہودیوں کے تھے۔

تحریک استشراق کے مقاصد، جیسے کہ بعد میں تفصیل سے بیان ہوگا، تجارتی، ثقافتی، سیاسی اور دینی تھے۔ مستشرقین مسلمانوں کا رشتہ اپنے دین سے توڑنا چاہتے تھے اور ان کا یہ مقصد یہودیوں کے دل کی آواز تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہودیوں کی تاریخ اسلام دشمنی سے بھری پڑی ہے۔ ان کی اسلام دشمنی کو رب قدوس نے خود ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا (1)

"ضرور پائیں گے آپ سب لوگوں سے زیادہ دشمنی رکھنے والے مومنوں سے یہود کو اور مشرکوں کو۔"

اسی لئے جب یہودیوں کو مسلمانوں کی مخالفت کے لئے ایسا پلیٹ فارم ملا جو ان کے دشمن عیسائیوں نے قائم کیا تھا تو انہوں نے اسلام کے شجرہ طیبہ کی بیخ کنی کے لئے اپنے دشمنوں سے تعاون کرنے میں بھی کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ سچ ہے "اَلْكُفْرُ مِلَّةٌ وَّاحِدَةٌ" کہ سارا عالم کفر ایک ہی ملت ہے۔ ان میں باہم کتنی دشمنیاں ہوں، انہوں نے ایک دوسرے پر کتنے مظالم کئے ہوں، لیکن جب اسلام کی باری آتی ہے تو وہ سارے یک جان ہو جاتے ہیں۔

اسلام دشمنی کے علاوہ یہودیوں کے تحریک استشراق میں شامل ہونے کی ایک وجہ سیاسی بھی تھی۔ یہودی اپنے آپ کو شعب مختار سمجھتے تھے۔ وہ خدا کی لاڈلی قوم ہونے کے زعم میں مبتلا تھے۔ ان کے ہاتھوں میں اس وقت جو تورات ہے اس کی رو سے فلسطین سے لے کر وادی فرات تک کے تمام علاقوں کو اپنی وراثت سمجھتے ہیں۔ (2) بلکہ ان کا مذہبی ادب انہیں بتاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی لاڈلی قوم ہیں اور ساری دنیا پروردگار عالم نے ان کی خاطر تخلیق کی ہے۔ ان کا دعویٰ فلسطین تک محدود نہیں بلکہ ان کی نظریں خیبر اور مدینہ منورہ پر بھی ہیں۔

1968ء میں جب القدس پر یہودیوں کا قبضہ ہوا تو اس وقت کا اسرائیلی وزیر دفاع موشے دایان یہودیوں کے حاخام اکبر (1) "شلوموغورین" کے ساتھ القدس میں داخل

1۔ سورۃ المائدہ: 82

2۔ کتاب یشوع باب اول آیات 4-2

ہوا۔ دیوار براق کے نزدیک نماز شکرانہ ادا کرنے کے بعد اس نے کہا: "آج بابل اور یثرب کی طرف جانے والے راستے کھل گئے ہیں۔"(2)

اسرائیل کی سابقہ وزیر اعظم "گولڈا مئر" نے کہا تھا: "میں خیبر میں اپنے آباؤ اجداد کی خوشبو سونگھ رہی ہوں۔"(3) ایک مسلمان عورت کے لئے یہودیوں نے فلسطین میں رہنا ناممکن بنا دیا تو اس نے فلسطین سے سعودی عرب ہجرت کر کے چلے جانے کا فیصلہ کیا۔ جب وہ وہاں سے روانہ ہونے لگی تو ایک یہودی "مر تروغ" نے اس سے کہا: شاہ فیصل سے ملاقات ہو تو اس سے کہہ دینا کہ ہم اس کی طرف آرہے ہیں۔ ہماری املاک اس کے قبضے میں ہیں۔ کعبہ کو ہمارے باپ ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا۔ وہ ہماری ملکیت ہے اور ہم ہر صورت میں وہاں لوٹ کر آئیں گے۔(4)

چند یہودیوں کے متذکرہ بالا جملے قوم یہود کے عزائم کو ظاہر کرتے ہیں اور یہودی قوم نے اپنے ان عزائم کو پورا کرنے کیلئے زبردست کوششیں شروع کر رکھی ہیں۔ ان کا دعویٰ خیبر اور یثرب تک بھی محدود نہیں بلکہ وہ تو ساری دنیا پر حکومت کرنے کے خواب دیکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ حکومت کے لئے تو صرف بنو اسرائیل کی قوم تخلیق ہوئی ہے باقی ساری قومیں ان کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ یہودی اپنے ان سیاسی مقاصد کے لئے زبردست کوششوں میں مصروف ہیں۔ استشراق کی شکل میں انہیں ایک ایسا پلیٹ فارم نظر آیا جس کے ذریعے وہ اپنے مقاصد حاصل کر سکتے تھے، لیکن یہودی اس تحریک میں اعلانیہ شامل نہیں ہوئے کیونکہ اعلانیہ تحریک استشراق کا حصہ بننے کی صورت میں یہودیوں کو ڈر تھا کہ ان کا اعتماد مجروح ہوگا۔ کیونکہ وہ صرف مسلمانوں ہی کے نہیں بلکہ دوسرے مذاہب کے بھی دشمن تھے۔ اگر وہ یہودیوں کے طور پر استشراق کے پروگرام میں شامل ہوتے تو ان کے کام کو ایک غیر جانبدار اور مذہبی تعصب سے آزاد عالم کی تحقیق نہ سمجھا جاتا بلکہ ان کی تحقیقات کو دیکھنے والے انہیں متعصب یہودیوں کی تحقیق سمجھتے اور ان کا کام پایہ اعتبار سے گر جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ یہودی علماء خالص مستشرق کے طور پر سامنے آئے اور اس طرح وہ ایک تیر سے دو شکار کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ ایک طرف تو انہوں

1۔ یہودیوں کے سب سے بڑے مذہبی راہنما کا لقب
2۔ "الاستشراق فی الادبیات العربیہ"، صفحہ 89
3۔ ایضاً
4۔ ایضاً

نے پوری تحریک استشراق پر اپنا اثر قائم کر لیا اور دوسری طرف مستشرقین کے لبادے میں انہیں اسلام کی شکل کو مسخ کرنے کا بہترین موقعہ ہاتھ آگیا۔ اسلام پر مستشرقین نے جو اعتراضات کئے ہیں ان میں سے ایک بہت بڑا اعتراض یہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات تورات وانجیل سے ماخوذ ہیں۔ یہ شوشہ یہودیوں کا چھوڑا ہوا ہے اور اس کے ذریعے وہ دو مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ایک طرف وہ دین یہودیت کی دین اسلام پر فوقیت ثابت کرتے ہیں اور دوسری طرف وہ دین اسلام کے مستقل الہامی دین ہونے کا انکار کرتے ہیں۔

مستشرقین تقریباً سب ہی اسلام اور مسلمانوں کے مخالف ہیں لیکن ان کی مخالفت میں مختلف افراد اور طبقات کے لحاظ سے کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ وہ مستشرقین جو اسلام کے خلاف تعصب میں سب سے آگے ہیں اور جنہوں نے اسلام کے خلاف ایسے ایسے افسانے گھڑے ہیں جن کی کوئی بنیاد نہیں، ان میں یہودیوں کا حصہ بہت زیادہ ہے۔

آج کے عالمی حالات پر اگر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی جائے تو اس بات میں کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ گو بظاہر یہودی اسرائیل کی ایک چھوٹی سی ریاست کے مالک ہیں لیکن عملاً وہ اس وقت دنیا پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ دنیا کی مالیات پر ان کا قبضہ ہے۔ الیکٹرانک میڈیا ان کے کنٹرول میں ہے۔ امریکہ اور اقوام متحدہ کا ادارہ ان کی مٹھی میں ہیں۔ دنیا بھر میں بے شمار روزنامے اور مجلے یہودیوں کے زیر تصرف ہیں اور یہودی اپنی دولت اور اپنے دیگر وسائل کو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے ٹھیک طور پر استعمال کرنے میں ماہر ہیں۔

یہودی گو تحریک استشراق کا حصہ ہیں لیکن ان کے عزائم مستشرقین سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔ وہ ان لوگوں کے بھی دوست نہیں جو جادۂ استشراق پر ان کے ہم سفر ہیں۔ صیہونیت اور ماسونیت جیسی تحریکیں یہودیوں کے زیر اثر زور و شور سے سرگرم عمل ہیں۔ ان تحریکوں کے منصوبے اور پروگرام ساری انسانیت کے لئے خطرناک ہیں۔

ہم یہاں صیہونیت اور ماسونیت کی تحریکوں کی تفصیل میں جانے کو اپنے موضوع سے متعلق نہیں سمجھتے۔ ان سطور میں صرف یہ وضاحت مقصود ہے کہ یہودی تحریک استشراق میں اسی طرح شامل اور متحرک ہیں جس طرح عیسائی اور کئی ملحدین اس تحریک میں شامل ہیں۔ اور یہ تمام طبقے اپنے بے شمار باہمی اختلافات کے باوجود مسلمانوں کے خلاف یک جان ہیں۔ اور اب ان مستشرقین کے کئی مسلمان شاگرد بھی اپنے مستشرق اساتذہ اور مربیوں کے پروگرام کو آگے بڑھانے کے لئے پورا زور صرف کر رہے ہیں۔

مستشرقین کی قسمیں

مستشرقین کی قسمیں

مستشرقین کی تاریخ صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ مختلف مذاہب اور نظریات سے تعلق رکھنے والے لوگ اس تحریک میں شامل ہیں۔ اس تحریک کے پیش نظر متعدد مقاصد ہیں اور ان مقاصد کے حصول کے لئے وہ جو طریقہ کار اپناتے ہیں وہ بھی زمانے اور افراد کے اعتبار سے بدلتا رہتا ہے۔ ایک مستشرق اسلام کو بدنام کرنے کیلئے افسانے تراشتا ہے اور دوسرا اسی مقصد کے لئے اسلامی ادب سے ایسے مقامات تلاش کرنے کے لئے زندگی وقف کر دیتا ہے جن کے ذریعہ وہ اسلام پر حملہ کر سکے۔ مستشرقین میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنہوں نے دنیا کو علم کے نور سے منور کرنے کے لئے اپنی زندگیاں صرف کر دیں اور اس تحریک میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جن کی زندگیوں کا مقصد حق کے رخ زیبا پر شکوک و شبہات کے دبیز پردے تاننے کے سوا کچھ نہیں۔

اس صورت حال میں کسی انسان کیلئے یہ فیصلہ کرنا ممکن نہیں رہتا کہ استشراق کی تحریک اپنے دامن میں بنی نوع انسان کیلئے خیر کی سوغات لئے پھرتی ہے یا یہ تحریک نسل انسانی کو گمراہی کے گڑھے میں پھینکنے کے لئے مصروف تگ و دو ہے۔

دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو مستشرقین کو دنیا کا بہت بڑا محسن سمجھتے ہیں اور ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اس تحریک کو تاریکیوں کا علمبردار سمجھتے ہیں۔ اس قسم کی دونوں آرا کو صحیح قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ مستشرقین نے کئی مفید کام بھی کئے ہیں اور ان گراں مایہ کاموں کی وجہ سے وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کو اور ان کے کام کو قدر کی نظر سے دیکھا جائے۔ دوسری طرف مستشرقین نے وہ کام بھی کئے ہیں جو بنی نوع انسان کیلئے فکری بے اعتدالی، نظریاتی بے راہروی اور مادی تباہی کا باعث بنے ہیں۔ اس قسم کی غلط کاریوں پر یہ لوگ مذمت کے مستحق ہیں۔ اس قسم کی غلط کاریوں پر مستشرقین کی مذمت کرنا اور ان کی اصلیت کو اجاگر کرنا انتہائی ضروری ہے تاکہ انسانیت کو ان کی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھا جاسکے۔

مستشرقین کس قسم کے لوگ ہیں اور ان کے کام کی نوعیت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کیلئے مستشرقین کو مختلف طبقوں میں تقسیم کرنا ضروری ہے۔

مستشرقین کی تاریخ کے بغور مطالعہ کی بنا پر ان لوگوں کو مندرجہ ذیل طبقات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

1۔ خالص علم کے شیدائی مستشرقین
2۔ متعصب یہودی اور عیسائی مستشرقین
3۔ ملحد مستشرقین
4۔ اپنے علم کو پیشہ بنانے والے مستشرقین
5۔ ایسے مستشرقین جن کی تحریروں میں اسلام کے متعلق انصاف کی جھلک نظر آتی ہے۔
6۔ وہ لوگ جو مستشرق تھے لیکن حق کا نور دیکھ کر اس کے حلقے میں شامل ہوگئے۔

مستشرقین کے ان تمام طبقات کا مختصر تعارف اور ان کے کام کی نوعیت پیش خدمت ہے۔

خالص علم کے شیدائی مستشرقین

اس وقت یورپ اور امریکہ کی لائبریریوں میں کروڑوں کی تعداد میں کتابیں موجود ہیں۔ یہی وہ کتابیں ہیں جنہوں نے دنیا کا بالعموم اور یورپ کا بالخصوص نقشہ بدلا ہے۔ ان کتابوں میں بیشمار کتابیں وہ ہوں گی جن کے مصنفین کو مستشرق نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ یورپ اور امریکہ میں بیشمار ایسے مصنفین ہیں جن کا موضوع مشرق یا اسلام نہیں اس لئے ان کو مستشرق کہنا صحیح نہیں۔ لیکن جس طرح پہلے بیان ہو چکا ہے کہ علوم وفنون کے اس ذخیرے نے مغرب میں جنم نہیں لیا بلکہ اس کا منبع مشرق ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتابیں مستشرقین ہی کی مرہون منت ہیں۔

ہم گزشتہ ابواب میں تفصیل سے ذکر کر چکے ہیں کہ جب ہسپانیہ سے علوم وفنون کی لہریں اٹھ کر ایک عالم کو بقعہ نور بنا رہی تھیں، اس وقت یورپ جہالت کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ سارے یورپ کا کل علمی ذخیرہ چند ہزار کتابوں پر مشتمل تھا۔ اور ان کتابوں میں سے بھی اکثر کتابیں قصے کہانیوں اور مذہبی دعاؤں وغیرہ پر مشتمل تھیں۔

جب مشرق سے علم کا آفتاب طلوع ہوا تو ابتدا میں تاریکیوں کے سودائی اہل مغرب کی آنکھیں علم کے اس تیز نور سے چندھیانے لگیں۔ انہوں نے اس نور کو نفرت کی نظر سے

دیکھا اور اسے اپنے ممالک کی حدود میں داخل ہونے سے روکنے کی کوششیں کیں۔ انہوں نے ہر اس راستے کو بند کرنے کی کوشش کی جس راستے سے علم یورپ میں داخل ہو سکتا تھا۔ تاریکیوں کے متوالے ظلمتوں کو دوام بخشنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے رہے لیکن جن دلوں نے علم کے نور کا جلوہ دیکھ لیا تھا وہ ہر ظلم سہہ گئے لیکن انہوں نے دوبارہ تاریکیوں کی طرف پلٹنا گوارا نہ کیا۔

یورپ میں مذہب اور علم کے مابین معرکہ برپا ہوا۔ مذہب کے پاس کلیسا کی طاقت تھی۔ حکومتوں کے بے پناہ وسائل مذہب کی تحویل میں تھے۔ اس کے مقابلے میں علم کے پاس شمع علم کے متوالوں کے بے باک جذبوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ دنیا جانتی ہے کہ یورپ کے معرکہ مذہب و علم میں علم کے متوالوں کے جذبے کلیسا اور بادشاہوں کی طاقت پر غالب آگئے اور مشرق سے طلوع ہونے والے آفتاب علم کی کرنوں نے یورپ کے چپے چپے کو منور کر دیا۔

وہ اصحاب علم جو بادشاہوں اور کلیسا کی متحدہ طاقت سے ٹکرا گئے تھے وہ اہل مشرق کے شاگرد تھے۔ وہ لوگ جو کتابیں پڑھتے تھے، جن کتابوں کے تراجم کرتے تھے، جن کی بنیاد پر نئی کتابیں تصنیف کرتے تھے وہ ساری اہل مشرق اور مسلمانوں کی تصنیفات تھیں۔ اس لئے یہ لوگ استشراق کی ہر تعریف کے لحاظ سے مستشرق تھے۔

مستشرقین کا یہ طبقہ ہمیشہ موجود رہا ہے اور آج بھی موجود ہے اور یہ طبقہ اس وقت تک موجود رہے گا جب تک ممالک شرقیہ اسلامیہ میں ایک بھی ایسی چیز موجود ہے جس سے اہل مغرب استفادہ کر سکتے ہیں اور جس کو بنیاد بنا کر انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کو ترقی دی جا سکتی ہے۔

مستشرقین کا یہ طبقہ مختلف طریقوں سے مشرق کے چپے چپے کو چھاننے میں مصروف ہے۔ یہ لوگ کھدائیوں کے ذریعے عالم مشرق کے مختلف علاقوں میں آثار قدیمہ تلاش کرنے میں مصروف ہیں۔ بے پناہ علمی سرمایہ جس کو مسلمانوں نے اپنی نالائقی کی وجہ سے طاق نسیاں کی زینت بنا دیا تھا، یہ لوگ اس علمی سرمائے کی حفاظت، اس کی ترتیب و تدوین اور اس کی اشاعت کا بندوبست کر رہے ہیں۔ مسلمانوں نے جو کتابیں لکھی تھیں، مستشرقین کا یہ طبقہ ان کتابوں سے استفادے کو آسان بنانے کے لئے ان کی فہرستیں مرتب کر رہا ہے،

ان پر حاشیے لکھ رہا ہے اور ان کے اشاریئے مرتب کر رہا ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں مخطوطے جو دورِ زوال کے مسلمانوں کی نگاہوں میں ردی کاغذ سے زیادہ کچھ نہ تھے، مستشرقین نے انہیں جمع کر کے یورپ کے لئے علم کا بے پناہ ذخیرہ اکٹھا کیا ہے۔ اس ذخیرہ کی حفاظت کے لئے مستشرقین تعریف کے مستحق ہیں۔ ہم کسی غیر مسلم سے یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ عالم اسلام کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے علم کے موتی جمع کرے اور اس کوشش سے اس کا مقصد مسلمانوں کو فائدہ پہنچانا ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جن لوگوں نے مسلمانوں کے علمی سرمائے کو مغرب میں منتقل کیا، ان کے پیش نظر اپنے قومی مفادات تھے۔ وہ یورپ کو علم کے اسی ہتھیار سے مسلح دیکھنا چاہتے تھے جس کے بل بوتے پر مسلمانوں نے دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کا غرور خاک میں ملا دیا تھا۔

انہوں نے مسلمانوں کے علمی سرمائے کو اپنے قومی مفادات کے لئے اپنی زبانوں میں منتقل کیا اور اس بات پر ان کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ ہر قوم کا فرد فطرتاً اپنی قوم کے مفادات کے بارے میں سوچتا ہے اور اسے یہی کچھ کرنا چاہئے۔ البتہ اس طبقے کے مستشرقین نے اس علمی بددیانتی کا مظاہرہ ضرور کیا ہے کہ انہوں نے مسلمانوں سے علم کا یہ انمول ذخیرہ حاصل کرنے کے باوجود یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ علم کی ترقی میں مسلمانوں کا کوئی ہاتھ نہیں، بلکہ یہ سب کچھ مغرب کے تحقیقی ذہن کے کمالات ہیں جن کے آثار آج انسان کی مادی ترقی کی شکل میں نظر آ رہے ہیں۔

اہل مغرب کے مسلمانوں کی تاریخ پر اس خطرناک وار کے متعلق پروفیسر اشفاق علی خان صاحب یوں تبصرہ فرماتے ہیں: (1)

> "آج جن کتابوں کا ایک بے پناہ طوفان مغرب سے اٹھ کر مشرق کو لپیٹ میں لے رہا ہے ان میں سے کوئی یہ نہیں بتاتی کہ وہ راجر بیکن جسے انگلستان میں بابائے سائنس سمجھا جاتا ہے وہ عربوں کا شاگرد تھا اور وہ اپنے شاگردوں سے کہا کرتا تھا کہ علم حاصل کرنا ہے تو عربی پڑھو۔ مورخین مغرب یونانیوں کو علم کا سرچشمہ بتاتے ہیں لیکن یہ نہیں بتاتے کہ انکی کتابیں چھ سو برس تک اسکندریہ، ایتھنز اور

1۔ پروفیسر اشفاق علی خان، مقدمہ نگار، "یورپ پر اسلام کے احسان"، صفحہ 21-20

قسطنطنیہ میں مقفل پڑی رہیں۔ عربوں نے انہیں نکالا، عربی میں ترجمہ کیا اور یہی تراجم مسلمانوں کے ساتھ یورپ میں پہنچے۔ یورپ میں سائنس اڑھائی سو برس میں اسحاق نیوٹن سے آئن سٹائن تک جا پہنچی لیکن عربوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ہزار سال تک یونانیوں کا ترجمہ ہی کرتے رہے اور انہوں نے علوم وفنون میں کوئی قابل قدر اضافہ نہیں کیا۔ چنانچہ آج کے یہودی اور عیسائی مورخ اسلامی علوم وفنون کا ذکر نہیں کرتے اور نہ دنیا کو یہ بتاتے ہیں کہ گلیلیو، کیپلر، برونو، جیرارڈ اور راجر بیکن عربوں کے نقال تھے۔ ہمارے مدارس کے بچوں کو یہ تاثر دیا گیا ہے کہ امریکہ کو لمبس نے اور افریقہ "لونگ سٹون" نے دریافت بلکہ ایجاد کیا تھا۔ ان بچوں کو یہ نہیں بتایا جاتا کہ کولمبس نے بحر پیمائی کی تعلیم اسلامی درس گاہوں میں حاصل کی تھی۔ اس کے پاس راہنمائی کے لئے کمپاس تھا جو عربوں نے ایجاد کیا تھا۔ اور افریقہ جانے والوں کے پاس وہ نقشے تھے جو عرب بحیرہ روم، بحیرہ قلزم، بحر ہند اور بحر الکاہل کے سفر میں صدیوں سے استعمال کر رہے تھے۔"

اسی سلسلے میں ڈاکٹر غلام جیلانی برق رقم طراز ہیں:

"یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اگر عرب نہ ہوتے تو آج یورپ کا حال افریقہ سے بھی بدتر ہوتا۔ ہم نے یورپ کے باشندوں کو لکھنا پڑھنا سکھایا۔ نشست و برخاست کے آداب بتائے۔ کھانے پینے اور نہانے کا سبق دیا۔ ان کے ذہنوں کو اوہام واباطیل کی گرفت سے آزاد کیا اور ان کی درس گاہوں میں علوم وفنون کے دریا بہائے۔ لیکن ہمیں یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ ان کے بیشتر تاریخ نگار یورپ کی ذہنی و ثقافتی تاریخ لکھتے وقت ہمیں کوئی مقام ہی نہیں دیتے۔ 1992ء میں امریکہ کی اورینٹل سوسائٹی کے ایک اجلاس میں پروفیسر شمٹ (Shmidt) نے "یورپ میں مشرقی علوم" کے عنوان پر ایک مقالہ پڑھا اور مسلمانوں کا نام تک نہ لیا۔ 1938ء میں ایک امریکی پروفیسر "واٹر مین"، نے مشرقی علوم پر چھ لیکچر دیئے اور اسلامی علوم کا ذکر تک نہ کیا۔ اسلام کے مشہور مورخ ابو الفداء 1331ء نے اپنے سے پہلے ساٹھ جغرافیہ دانوں کے نام لئے

تھے لیکن موسیو (Vivien Dest Martin) کا کمال دیکھئے کہ اپنی علمی تاریخ میں کسی عرب جغرافیہ دان کا ذکر تک نہیں کیا۔ کیمبرج مڈیول ہسٹری پانچ ہزار صفحات کی ایک مبسوط تاریخ ہے، جس میں اسلام کی چودہ سو سالہ سیاسی، علمی اور ثقافتی تاریخ کو صرف پچیس ورق دیئے گئے ہیں۔ جیمز ہنری رابنسن کی تاریخ "مڈیول اینڈ ماڈرن ٹائمز" آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے اور مشرق و مغرب کی درس گاہوں میں بطور نصاب رائج ہے لیکن اس میں اسلام کا کوئی ذکر نہیں صرف بدھ راہبوں کے تحت مسلمانوں کا نام ضمناً لیا ہے۔"(1)

ڈاکٹر غلام جیلانی برق مزید لکھتے ہیں:

"یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمان بارود، قطب نما، الکحل، عینک اور دیگر بیسیوں اشیاء کے موجد تھے لیکن بقول رابرٹ بریفالٹ مورخین یورپ نے عربوں کی ہر ایجاد اور انکشاف کا سہرا اس یورپی کے سر باندھ دیا ہے جس نے پہلے پہل اس کا ذکر کیا تھا۔ مثلاً قطب نما کی ایجاد ایک فرضی شخص فلویو گوجہ، کی طرف منسوب کر دی۔ "ولے ناف۔ کے۔ آرنلڈ" کو الکحل اور بیکن کو بارود کا موجد بنا دیا۔ اور یہ بیانات وہ خوف ناک جھوٹ ہیں جو یورپی تہذیب کے ماخذ کے متعلق بولے گئے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ بعض اوقات عربوں کی تصانیف پر اپنا نام بطور مصنف جڑ دیا۔ انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا میں لفظ جبر (جابر) کے تحت ایک مترجم کا نام دیا ہوا ہے جس نے اسلام کے مشہور ماہر کیمیا جابر بن حیان کے ایک لاطینی ترجمے کو اپنی تصنیف بنا لیا تھا۔ یہی حرکت سلر نو کالج کے پرنسپل قسطنطین افریقی (1060ء) نے بھی کی تھی کہ ابن الجزار کی زاد المسافر کا لاطینی ترجمہ (Vi-aticum) کے عنوان سے کیا اور اس پر اپنا نام بطور مصنف لکھ دیا۔"(2)

موسیو لیبان خود اہل مغرب کے اس رویے پر تنقید کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"ہمیں اسلام اور پیروان اسلام سے تعصب ورثے میں ملا ہے، جو اب ہماری فطرت کا جزو بن چکا ہے...... ہماری کم بخت تعلیم نے ہمارے ذہنوں میں یہ بات راسخ کر دی ہے کہ ہمارے تمام علوم و فنون کا ماخذ یونان ہے اور یورپ کی

1۔ "یورپ پر اسلام کے احسان"، صفحہ 28-27

2۔ ایضاً، صفحہ 28

تہذیب میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں۔ ہم میں سے بعض کو یہ بات کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ ہماری ترقی و تہذیب کا باعث ایک کافر قوم تھی۔"(1)

رابرٹ بریفالٹ کہتا ہے:

"یورپی مورخ مسلمانوں کو کافر کتا سمجھتا ہے اور اس کا احسان ماننے کو تیار نہیں ...... یورپ کے احیائے نو کی تاریخیں برابر لکھی جا رہی ہیں لیکن ان میں عربوں کا ذکر موجود نہیں۔ اس کی مثال یوں ہے کہ شہزادہ ڈنمارک کی تاریخ میں ہیملٹ کا ذکر نہ آئے...... ڈاکٹر اوز برن ٹیلر نے تو کمال ہی کر دیا کہ قرون وسطیٰ میں ذہنی ارتقاء پر دو جلدیں لکھیں اور اسلامی تہذیب کی طرف اشارہ تک نہ کیا۔"(2)

مستشرقین کے جس رویے کا سطور بالا میں ذکر کیا گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایک مسلمان اور ایک غیر مسلم کے کردار میں بنیادی فرق کیا ہوتا ہے۔

مسلمانوں نے بھی دوسری قوموں سے علوم حاصل کئے تھے۔ انہوں نے بھی یونانی فلسفے کو عربی میں منتقل کیا تھا لیکن انہوں نے یونانیوں کی علمی کاوشوں اور کارناموں کا سہرا اپنے سر باندھنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ انہوں نے جو کچھ یونانیوں سے لیا تھا، اس کا برملا اعلان کیا کہ یہ ہمارے ذہن کی تخلیق نہیں بلکہ علم کا یہ موتی ہم نے یونانیوں سے حاصل کیا ہے۔ لیکن جب تہذیب و تمدن کے ٹھیکیداروں یعنی اہل مغرب کی باری آئی تو انہوں نے مسلمانوں کی علمی کاوشیں اپنے نام منسوب کر کے اس بات کو ثابت کر دیا کہ دل ایمان کی دولت سے خالی ہو تو انسان اپنی شخصیت کو اعلیٰ انسانی اقدار سے مزین نہیں کر سکتا۔ بھلا جو لوگ خدا کی ان گنت نعمتوں کو خداداد نعمتیں تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں، وہ کسی دوسری قوم سے لئے ہوئے ورثے پر اس کا شکریہ کیسے ادا کریں گے؟

مستشرقین کا یہی طبقہ ایسا ہے جس کی کوششوں میں عام لوگوں کو اسلام دشمنی کا شائبہ نظر نہیں آتا۔ لیکن سطور بالا میں جو حقائق پیش کئے گئے ہیں ان سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مستشرقین کا بظاہر یہ بے ضرر طبقہ بھی اپنے سینوں میں اسلام کے خلاف زبردست تعصب رکھتا ہے۔ البتہ اس صورت حال کے ذمہ دار مسلمان خود بھی ہیں۔ اگر وہ خود اپنے اسلاف کے علمی ورثے کی حفاظت کرتے، اس سے استفادہ کرتے تو یقیناً اہل یورپ اس

1۔ "یورپ پر اسلام کے احسان" صفحہ 29، بحوالہ تمدن عرب

2۔ ایضاً، صفحہ 29، بحوالہ تشکیل انسانیت

ورثے کو حاصل کرنے کے لئے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرتے اور ان کو مسلمانوں کے اسلاف کے علمی کارناموں کو اپنے ناموں کے ساتھ منسوب کرنے کا موقعہ نہ ملتا۔

مستشرقین کے اس طبقے نے بعض بڑے قیمتی کام کیے ہیں جن سے اہل مغرب کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔ ان کا اس قسم کا کام لغات کی کتابوں اور انسائیکلوپیڈیاز وغیرہ پر مشتمل ہے۔ گو ان کتابوں میں بھی ایسا مواد وافر مقدار میں موجود ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے مصنفین کے دل بھی اسلام کے خلاف تعصب سے خالی نہیں لیکن ایک غیر مسلم سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ جب اسلام کے متعلق لکھے گا تو ان عقائد و نظریات سے آزاد ہو کر لکھے گا جو غیر اسلامی ماحول سے اس کو ورثے میں ملے ہیں۔

مستشرقین کی اس قسم کی کوششوں میں سے ہالینڈ کے مستشرق "فنسنک" کی تالیف "مفتاح کنوز السنہ" اور اسی مستشرق کی زیر نگرانی تیار ہونے والی "المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث" ہیں۔ موخر الذکر کتاب صحاح ستہ کے علاوہ مسند دارمی، موطا امام مالک اور مسند امام احمد بن حنبل میں مذکورہ احادیث طیبہ کا ایک جامع اشاریہ ہے جس کی مدد سے مذکورہ کتب سے متعلقہ احادیث کو تلاش کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔

اس قسم کی کتابوں کا مطالعہ کرتے وقت مسلمانوں کو ایک بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ یہ کتابیں ان لوگوں نے تیار کی ہیں جن کا مقصد اسلام کی خدمت کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے مسلمان ان کتابوں میں مذکور ہر بات کو بلا تحقیق تسلیم کرنے سے احتراز کریں اور ہر بات کو اسلام کے روایت اور درایت کے اصولوں پر پرکھ کر اس کو قبول یا رد کرنے کا فیصلہ کریں۔

اس قسم کے مستشرقین کا مطالعہ غیر جانبدارانہ اور معروضی انہی میدانوں میں ہوتا ہے جن کا تعلق مسلمانوں کے عقائد، تاریخ اور تہذیب وغیرہ سے نہ ہو۔ لیکن جب خالص اسلامی موضوعات کی باری آتی ہے تو غیر جانبدار مستشرقین کا قلم بھی اسلام کے خلاف زہر اگلنے لگتا ہے۔

میکسیم روڈنسن کہتا ہے:

مستشرقین کا رویہ غیر جانبدارانہ صرف انہی موضوعات پر نظر آتا ہے جن کا اسلام سے بہت دور کا تعلق ہو۔(1)

1۔ "الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری"، صفحہ 30

البتہ اس طبقے میں ایک قلیل تعداد ان لوگوں کی بھی ہے جو علوم وفنون کی ترقی میں مسلمانوں کے کردار کو تسلیم کرتے ہیں اور اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ میں مسلمانوں کے علوم وفنون کا بڑا حصہ ہے۔

مستشرقین کا یہ طبقہ اسلام کے علاوہ دیگر مشرقی تہذیبوں اور مذاہب کے بارے میں بھی ریسرچ کرتا ہے۔

متعصب یہودی اور عیسائی مستشرقین

استشراق کی تحریک کو شروع کرنے، اسے پروان چڑھانے اور زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ ساتھ اس کی سمتیں متعین کرنے میں ان لوگوں کا کردار بڑا واضح ہے جو عیسوی اور یہودی ادیان سے گہرا ذہنی اور قلبی رابطہ رکھتے ہیں۔ تحریک استشراق کی تاریخ کے کسی بھی دور کا مطالعہ کیا جائے اور اس کے مختلف طریقہ ہائے کار میں سے جس کا بھی تجزیہ کیا جائے وہاں متعصب یہودی اور عیسائی مختلف بھیسوں میں مصروف کار نظر آتے ہیں۔

مستشرقین نے اسلام پر مختلف محاذوں سے حملے کئے ہیں اور ان کا یہ طبقہ ہر قسم کے حملوں میں صف اول میں رہا ہے۔

یوحنا دمشقی کی اسلام کے خلاف کتابیں، قرطبہ کے شہیدوں کی پیغمبر اسلام ﷺ کی شان میں گستاخی کی منظم تحریک، پمپلونا کی ایک خانقاہ میں لکھی جانے والی حضور ﷺ کی فرضی سوانح عمری، جس نے قرون وسطی کے مستشرقین کو توہین رسول کے لئے بنیادی مواد فراہم کیا، پطرس محترم کی نگرانی میں ہونے والا ترجمہ قرآن جس کو بعد کے مستشرق مترجمین قرآن نے ترجمہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، علوم اسلامیہ کو یورپ کی زبانوں میں منتقل کرنے کی تحریک، یورپی یونیورسٹیوں میں عربی زبان کی تدریس کے لئے ادارے قائم کرنے کی مہم، صلیبی جنگوں کا مہیب سلسلہ، حضور ﷺ کی پاکیزہ شخصیت کو داغدار کرنے کی متعدد کوششیں، قرآن حکیم کی حیثیت میں تشکیک، احادیث طیبہ پر حملے، مسلمانوں کا رشتہ اپنے نبی اور اپنے دین سے توڑنے کی کوششیں، مسلمانوں کے دلوں سے اپنے دین کی محبت کم کر کے وہاں عیسائیت کی محبت کا بیج بونے کے حیلے، مسلمانوں کو عیسائی بنانا ممکن نہ ہو تو ان کو اپنے دین سے بیگانہ کرنے کی تدبیریں، اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ پر بے بنیاد حملے اور پھر

ان حملوں میں کمی کرنے کی تدبیریں، مستشرقین کی ان تمام کوششوں کے پیچھے عیسائی راہبوں، پادریوں اور یہودی علماء کا ہاتھ کار فرما نظر آتا ہے۔

اس قسم کے لوگ اسلام کا مطالعہ نہ تو حقائق تک پہنچنے کے لئے کرتے ہیں اور نہ ہی وہ اسلام کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے اسلامی تعلیمات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ان کے ذہن مذہبی تعصب کی آگ میں جل رہے ہیں اور مذہبی تعصب اتنی ظالم شے ہے کہ یہ انسان کو حق کی طرف دیکھنے کی اجازت نہیں دیتا اگرچہ حق روز روشن کی طرح عیاں ہو۔

اس طبقے کے مستشرقین نے غیر جانبداری اور بے لاگ علمی تحقیق کے لبادے میں اسلام کے متعلق جو تحقیق کی ہے اس کے چند نمونے درج ذیل ہیں۔

ایک فرانسیسی مستشرق "کیمون" اپنی ایک کتاب میں رقمطراز ہے:

"دین محمدی جزام کا مرض ہے جو لوگوں میں پھیل رہا ہے۔ اس مرض نے لوگوں کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ بلکہ یہ ایک خوفناک مرض، ایک عام فتنہ اور ایک ایسا جنون ہے جو سب کچھ فراموش کرا دیتا ہے۔ جو انسان کو سستی اور کاہلی پر ابھارتا ہے۔ جو آدمی اس مرض میں مبتلا ہو اسے قتل و غارت، شراب نوشی اور بدکاری کی دعوت کے سوا کوئی چیز سستی اور کاہلی کی اس حالت سے نہیں نکال سکتی۔" (1)

یہی مستشرق اپنے خبث باطن کا مزید اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے:

"محمد (ﷺ) کی قبر کی مثال بجلی کے ایک کھمبے جیسی ہے جو مسلمانوں کے سروں میں جنون پیدا کرتا ہے اور انہیں ایسے کام کرنے پر مائل کرتا ہے جو مرگی کے مریض اور مخبوط الحواس لوگ کرتے ہیں۔ اس کے اثر سے مسلمان مسلسل لفظ "اللہ" کا تکرار کرتے رہتے ہیں۔ اور وہ ایسی چیزوں کے عادی بن جاتے ہیں جو سادہ طبیعتوں کا خاصہ ہیں۔ مثلاً خنزیر کا گوشت کھانے، شراب نوشی اور موسیقی سے نفرت اور جو چیزیں سفاکی اور بدکاری کے خیالات کے جنم لیتی ہیں ان سے محبت۔" (2)

پھر یہی مستشرق اپنے ناپاک اور مکروہ جذبات کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

"میرا اعتقاد ہے کہ مسلمانوں کی ساری آبادی کے پانچویں حصے کو نیست و نابود

1۔ محمد محمد الدھان، "قوی الشر المتحالفہ و موقفھا من الاسلام والمسلمین" (قاہرہ۔1988ء)، صفحہ 52

2۔ "قوی الشر المتحالفہ"، صفحہ 52

کر دیا جائے اور جو باقی بچ جائیں انہیں مشقت طلب کاموں پر لگا دیا جائے۔ کعبہ کو گرا دیا جائے اور (نعوذ باللہ) محمد (ﷺ) کی قبر اور ان کے جسم کو "لوفر" کے عجائب گھر میں رکھا جائے۔" (1)

میں اس قسم کی مزید عبارتیں نقل کر کے مسلمان قارئین کے جذبات کو مجروح نہیں کرنا چاہتا۔ یہ تحریریں اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ ان کے لکھنے والے نہ تو علم کے شائقین ہیں اور نہ ہی تحقیق سے ان کا کوئی واسطہ ہے۔ وہ علم اور تحقیق کے لبادے میں اسلام پر حملے کرنا چاہتے ہیں۔ اسلام کے متعلق کچھ مطالعہ کرنے سے پہلے ان کے ذہن میں یہ عقیدہ پختہ ہو تا ہے کہ سچا دین تو ان کا اپنا دین ہے۔ اسلام تو محض ایک گمراہی ہے اور یہ ایک باطل فرقے کا نام ہے۔ وہ جب اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس مطالعہ سے ان کا مقصد یہ ہو تا ہے کہ وہ اس عقیدے کو صحیح ثابت کرنے کے لئے دلائل تلاش کریں جو عقیدہ ان کے ذہنوں میں پہلے سے راسخ ہو تا ہے۔

اس قسم کے دلائل انہیں مسلمانوں کے گمراہ فرقوں کی تحریروں سے ملیں یا کچھ موضوع احادیث ان کو اپنے مطلب کی مل جائیں، وہ ان کی طرف جھپٹتے ہیں اور پھر ان بے بنیاد دلائل کو بنیاد بنا کر وہ اپنے تخیل کے زور پر اسلام کو بدنام کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ اور تاثر یہ دیتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کے لئے ان کے پاس بڑے معتبر دلائل ہیں۔ وہ ان بے بنیاد دلائل کے مقابلے میں قرآن حکیم کی نصوص، معتبر احادیث اور مسلم علماء کے اقوال کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

مستشرقین کے اس طبقے نے جو رویہ اپنایا ہے، اس کے اسباب تاریخی ہیں۔ تحریک استشراق میں مستشرقین کے اس طبقے کا کردار بہت واضح ہے۔ اس کتاب کے دوسرے باب میں ہم نے تفصیل سے ان اثرات کا ذکر کیا ہے جو اسلام کی وجہ سے یہودیوں اور عیسائیوں کی دینی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی حیثیت پر مترتب ہوئے تھے۔ اسلام نے یہود و نصاریٰ کو عسکری میدانوں میں شکستیں دی تھیں۔ عیسائیت اور یہودیت کے جزیرہ عرب اور گردونواح میں پھیلنے کے جو واضح امکانات موجود تھے، اسلام نے ان کو ختم کر دیا تھا۔ بت پرستوں کے مقابلہ میں اہل کتاب ہونے کی وجہ سے یہود و نصاریٰ کو سماجی برتری حاصل

1۔ "قوی الشر المتحالفہ"، صفحہ 53

تھی، بت پرستوں کے مسلمان ہو جانے سے وہ بھی ختم ہو گئی۔ اہل کتاب کے علماء اور راہبوں کو جو سماجی حیثیت حاصل تھی اور اس سماجی حیثیت کے سہارے وہ جس اقتصادی خوش حالی سے لطف اندوز ہو رہے تھے، اسلام نے اس کا خاتمہ کر دیا تھا۔

اسلام نے نہ صرف عرب و حجاز میں یہود و نصاریٰ کا وقار ختم کیا بلکہ ان سے کئی ممالک چھینے اور ممالک کے ساتھ ساتھ ان کے عوام کی اکثریت کے دلوں کو بھی فتح کر لیا۔

یہود و نصاریٰ نے اسلام دشمنی کا بیج تو اپنے دلوں میں اسی دن بو لیا تھا، جب انہوں نے محسوس کیا تھا کہ نبوت و رسالت کا منصب اعظم بنو اسرائیل سے منتقل ہو کر بنو اسماعیل کے پاس چلا گیا ہے۔ انہوں نے شجر اسلام کی بیخ کنی کی کوششیں بھی پہلے ہی دن سے شروع کر دی تھیں لیکن ان کی دشمنیاں جتنی شدید ہوتی گئیں، اسلام کے شجرہ طیبہ کی جڑیں اتنی ہی مضبوط ہوتی گئیں۔

ان کی مسلسل ناکامیوں نے اسلام دشمنی کے اس پودے کو تناور درخت بنا دیا جس کا بیج طلوع اسلام کے ساتھ ہی ان کے دلوں میں بو دیا گیا تھا۔ ان کے حسد، کینہ، بغض اور سفلہ پن کی اس وقت تو کوئی انتہا نہ رہی جب اسلام اس رنگ میں جلوہ گر ہوا جس کو پروردگار عالم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

اَلَمْ تَرَ كَیْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَیِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَیِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِی السَّمَآءِۙ تُؤْتِیْۤ اُكُلَهَا كُلَّ حِیْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَاؕ وَ یَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ(1)

"آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ کیسی عمدہ مثال بیان کی ہے اللہ تعالیٰ نے کہ کلمہ طیبہ ایک پاکیزہ درخت کی مانند ہے۔ جس کی جڑیں بڑی مضبوط ہیں اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ وہ دے رہا ہے اپنا پھل ہر وقت اپنے رب کے حکم سے اور بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ مثالیں لوگوں کے لئے تاکہ انہیں خوب ذہن نشین کر لیں۔"

یہ بات یہود و نصاریٰ کے لئے کتنی تکلیف دہ تھی کہ اسلام کے جس پودے کو جڑوں سے اکھیڑ پھینکنے کے لئے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے وہ ایک تناور درخت بن گیا تھا۔

1۔ سورۃ ابراہیم: 25-24

اسلام کو ختم کرنے کی انہوں نے اس وقت بھی کوششیں کیں جب مسلمانوں کو غیر مسلم طاقتیں کمزور سمجھتی تھیں۔ انہوں نے اسلام کے خلاف سازشیں بھی کیں۔ مسلمانوں کے خلاف انہوں نے مختلف حربے استعمال کئے۔ اور جب انہوں نے دیکھا کہ اسلام نے ان سے بیت المقدس چھین لیا ہے، اس کے جھنڈے سپین اور سسلی پر لہرا رہے ہیں اور اس کی فوجیں قلب یورپ کے دروازوں پر دستک دے رہی ہیں تو انہوں نے صلیبیں اپنے گلوں میں لٹکائیں اور تلواریں ہاتھوں میں لئے مسلمانوں کے مقابلے میں آ گئے۔ صلیبی جنگوں میں کئی صدیوں کی مسلسل ناکامیوں کے بعد انہوں نے صلیب اور تلوار ہاتھ سے رکھ دی اور قلم اور کاغذ کے ذریعے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مصروف جہاد ہو گئے۔ جب ان کے تیار کردہ زہریلے لٹریچر نے مسلمانوں کو اپنے دین سے بیگانہ کر دیا اور وہ کمزور ہو گئے تو یہی لوگ پھر عادل اور رحم دل حکمرانوں کے روپ میں اسلامی ممالک پر چھا گئے۔ انہوں نے مسلمانوں کو اپنے دین سے دور اور عیسائیت سے قریب کرنے کے لئے کتابیں لکھیں۔ سکول اور کالج قائم کئے۔ ہسپتال قائم کئے اور ان میں مریضوں کا مفت علاج کرنے کا ڈھونگ رچایا۔ خیراتی ادارے اور تنظیمیں قائم کیں اور اپنے آپ کو دکھی انسانیت کا سب سے بڑا ہمدرد ظاہر کر کے دنیا کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ صرف ان کا دین ہی اپنے دامن میں دکھی انسانیت کے لئے نجات اور فلاح کی خوش خبری لے کر جلوہ گر ہوا ہے۔

انہوں نے ہسپتالوں میں مریضوں کی جسمانی بیماریوں کا علاج کیا لیکن انہیں روحانی مریض بنا دیا۔ انہوں نے سکولوں میں بچوں کو تعلیم کے نام پر جہالت کا درس دیا اور دکھی انسانیت کو ایمان کے بدلے چند سکے دے کر خوش کرنے کی کوشش کی۔

مستشرقین کا یہ طبقہ پہلے بھی مصروف عمل تھا اور آج بھی مصروف عمل ہے۔ کبھی اس نے اعلانیہ مسلمانوں کو زہر کا پیالہ پلانے کی کوشش کی اور کبھی اسی زہر کو شہد میں ملا کر بڑی شفقت سے مسلمانوں کے سامنے رکھا۔ دشمنوں کے اس گروہ سے محتاط رہنا مسلمانوں کے لئے انتہائی ضروری ہے۔

ملحد مستشرقین

یورپ کی تاریخ میں ایک ایسی خصوصیت ہے جو شاید کسی دوسری قوم کی تاریخ میں نہ مل سکے۔ وہ خصوصیت یہ ہے کہ قرون وسطیٰ میں یورپ میں مذہب اور سائنس کے

درمیان باقاعدہ جنگ رہی ہے۔ یورپ کا اقتدار کلیسا کے قبضے میں تھا اور کوئی ایسی آواز جو کلیسا کے معتقدات کے مخالف ہوتی تھی، اسے کچل دیا جاتا تھا۔

انسان فطرۃً علم کے لئے پیاس محسوس کرتا ہے اور جہاں اسے علم کی کوئی مشعل فروزاں نظر آتی ہے وہ اس کی طرف لپکتا ہے۔ یورپ میں بھی ایسے لوگ موجود تھے جو علم کے پیاسے تھے لیکن ان کے ساتھ پاپائے روم کا جو سلوک تھا وہ ڈاکٹر ڈریپر کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے:

پاپائے روم کے ہاں ہر وہ عیسائی کافر تھا جو کلیسائی ذہن سے بالاتر ہو کر سوچتا، علمی کتابیں لکھتا، سائنسی نظریات پیش کرتا، مسلمانوں کی تہذیب یا کسی اور بات کو اچھا سمجھتا یا ہر روز نہاتا تھا۔ ایسے کافروں کو سزا دینے کے لئے پاپا نے 1478ء میں ایک مذہبی عدالت (انکوائزیشن) قائم کی۔ اس نے پہلے سال دو ہزار اشخاص کو زندہ جلایا اور ستر ہزار کو قید و جرمانہ کی سزا دی۔ دس برس میں اس نے سترہ ہزار کو آگ میں پھینکا۔ ستانوے ہزار تین سو کس کو قید و بند کی سزا دی اور ساتھ ہی مختلف علوم کی چھ ہزار کتابیں جلا دیں۔ یورپ کی مرکزی مذہبی عدالت نے 1481ء اور 1808ء کے درمیانی عرصے میں تین لاکھ چالیس ہزار نفوس کو نہایت المناک سزائیں دیں۔ ان میں سے بتیس ہزار کو زندہ جلایا۔ (1)

اس ظلم کا ردعمل یہ ہوا کہ علم کے شیدائی مذہب کے دشمن ہو گئے اور انہوں نے علمی ترقی کے لئے مذہبی پابندیوں سے آزاد ہونا ضروری سمجھا۔ مذہب اور کلیسا کے خلاف ایک طوفان اٹھا اور یہ طوفان پوپ اور کلیسا کے اختیارات کو بہا کر لے گیا۔

یورپ میں علم کی ترقی کلیسا کی اسی شکست کی مرہون منت ہے۔ کلیسا کی اسی علم دشمنی کا نتیجہ تھا کہ اہل مغرب نے مذہب کو زندگی کے عام معاملات سے فارغ کر کے گرجے میں بند کر دیا جہاں ہر اتوار کے روز چند عیسائی اپنے محبوس مذہب کی زیارت کے لئے چلے جاتے ہیں۔

مسلم ممالک میں بھی مذہب کو انفرادی معاملہ قرار دینے اور اسے ملی زندگی سے لاتعلق کرنے کی کوششیں، یورپ کے اسی تجربے کی صدائے بازگشت ہیں حالانکہ اسلام کلیسا کی طرح علم کا دشمن نہیں بلکہ وہ تو مہد سے لے کر لحد تک علم حاصل کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

1۔ "یورپ پر اسلام کے احسان"، صفحہ 90، بحوالہ معرکہ مذہب و سائنس

عیسائیوں کی مذہب بیزاری کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ برطانیہ جو عیسائیت کا مرکز ہے وہاں گرجے فروخت ہو رہے ہیں اور کئی گرجوں کو مسلمانوں نے خرید کر مسجدوں میں بدل دیا ہے۔ عیسائیوں کے مذہبی راہنما شکوہ سنج ہیں کہ ان کی آبادی کی اکثریت برائے نام عیسائی ہے عملاً وہ مذہب کو خیر باد کہہ چکی ہے۔

اس صورت حال میں یورپ میں الحاد کی تحریک نے زور پکڑا۔ اہل یورپ کی قومی زندگی کا ہر شعبہ عملاً ان لوگوں کے قبضے میں چلا گیا جو عیسائی کہلاتے تھے لیکن ان کی سوچ بھی ملحدانہ تھی اور ان کا عمل بھی ملحدانہ۔ زندگی کے دیگر تمام شعبوں کی طرح استشراق کی تحریک میں بھی ملحد شامل ہوگئے۔ یہ ملحد مستشرقین، استشراقی جدوجہد میں عیسائی راہبوں اور پادریوں کے شانہ بشانہ مصروف کار تھے۔ ان لوگوں کی عیسائیت یا یہودیت سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ وہ عیسائیت کے بھی دشمن تھے اور کلیسا کے بھی۔ لیکن جس طرح ہزاروں اختلافات کے باوجود استشراق کی تحریک میں یہودی اور عیسائی کندھے سے کندھا ملا کر چل رہے تھے اسی طرح ملحد مستشرقین بھی پادریوں اور راہبوں کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

ان ملحدین کو استشراق کی شکل میں ایک آڑ میسر آگئی جس کے پیچھے سے انہوں نے مذہب کے خلاف اپنی کاروائیاں جاری رکھیں۔ اس قسم کے مستشرقین کے طریقہ کار اور ان کے مزاج کو سمجھنے کے لئے فولٹیئر کی مثال کافی ہے۔

"فولٹیئر" ایک ملحد تھا۔ وہ مذہب اور کلیسا سب کا مخالف تھا۔ لیکن وہ نہ کھل کر بنو اسرائیل کے کسی نبی پر حملہ کرنے کی جرأت کر سکتا تھا اور نہ ہی کسی پوپ وغیرہ کو براہ راست اپنی تنقید کا نشانہ بنا سکتا تھا، کیونکہ اس صورت میں اسے کلیسا، عوام اور حکومت سب کی طرف سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس مشکل کا حل اس نے یہ نکالا کہ اس نے تمام ادیان اور ان کے بانیوں پر کیچڑ اچھالنے کے لئے حضور ﷺ کی ذات بابرکات کو بطور رمز استعمال کیا۔ اس نے حضور ﷺ کی ذات پر ایسے رکیک حملے کئے جن کی ہمت اس سے پہلے کسی کو نہ ہوئی تھی۔

اس ملحد مستشرق کی عیاری کی انتہا یہ تھی کہ اگرچہ اس نے اپنی تحریروں میں حضور ﷺ کے علاوہ دوسرے مذاہب کی مقدس ہستیوں پر بھی کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی تھی لیکن چونکہ اس نے حضور ﷺ کا نام لے کر یہ حملے کئے تھے اس لئے اس نے اپنے اس کارنامے پر پوپ کی

خوش نودی حاصل کرنے کے لئے یا کم از کم اس کی ناراضگی سے بچنے کے لئے اپنی ایک کتاب کا انتساب پوپ کے نام کر دیا۔ اس طرح اس ملحد مستشرق نے کلیسا اور اسلام دونوں کے خلاف اپنے دل کی بھڑاس بھی نکال لی اور اسے کسی خطرے کا سامنا بھی نہ کرنا پڑا۔ (1)

یہ بات صرف فولٹیئر تک ہی محدود نہیں بلکہ جن لوگوں نے افسانوں اور ناولوں کے ذریعے اسلام اور مسلمانوں کے کردار کو مسخ کر کے پیش کرنے کی کوشش کی ہے، ان میں کثیر تعداد اسی قسم کے لوگوں کی ہے۔

موجودہ دور میں مغرب کا الیکٹرانک میڈیا اور پریس جو اسلام کے خلاف پروپیگنڈے کا طوفان اٹھا رہا ہے ان میں بھی اکثریت انہی لوگوں کی ہے۔ گویہ لوگ عیسائیت کے بھی خیر خواہ نہیں لیکن اسلام دشمنی ان کو ورثے میں ملی ہے۔ انہوں نے اسلام کو سمجھنے کے لئے اور اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے جس قسم کے لٹریچر کا مطالعہ کیا ہے، اس لٹریچر میں ہر برائی کو اسلام کی پہچان قرار دیا گیا ہے۔ ان حقائق کے باوجود مسلمانوں کی بے حسی کی انتہا ہے کہ انہوں نے اس قسم کے دین بیزار اور اسلام دشمن لوگوں کو اپنا سب سے بڑا خیر خواہ سمجھ رکھا ہے اور ان سے بھلائی کی توقع رکھتے ہیں حالانکہ ان ملحدین کی نظروں میں اسلام ہی ان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔

علم کو پیشہ بنانے والے مستشرقین

مستشرقین کی صفوں میں جہاں متعصب عیسائی اور یہودی لوگ شامل ہیں جو اپنے اپنے ادیان کو دنیا کے دیگر ادیان پر فائق ثابت کرنے کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار ہیں، وہاں اس تحریک میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کا دین، پارہ نان کے سوا کچھ نہیں۔

چونکہ استشراق کی تحریک نے ہمیشہ تبشیر یا استعمار کی طرف سے ملنے والی مالی امداد اور سماجی حیثیت پر بھروسہ کیا ہے اور اس تحریک کے اندر بھی اکثریت ان ہی لوگوں کی ہے جن کے عزائم مذہبی یا سیاسی ہیں، اس لئے اس تحریک کے پلیٹ فارم کو استعمال کر کے وہی لوگ ترقی کر سکتے ہیں جو اپنی تحقیقات کو اسی رنگ میں پیش کریں جو تبشیری اور استعماری طاقتوں کی مرضی کے مطابق ہو۔

مستشرقین کو یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں، تحقیقی اداروں، مجلوں، اخبارات،

1۔ "اضواء علی الاستشراق"، صفحہ 29-28

ریڈیو اور ٹیلی وژن کے بڑے بڑے عہدوں کی شکل میں اپنی کوششوں کا انعام ملتا ہے۔ اس قسم کے گراں بہا انعامات کا مستحق صرف ان ہی مستشرقین کو قرار دیا جاتا ہے جو وہی کچھ لکھ کر پیش کریں جو ان لوگوں کی مرضی اور پالیسی کے مطابق ہو جو انعام دے سکتے ہیں۔

ان حالات میں ایک طبقہ ایسے لوگوں کا پیدا ہو گیا جو اپنے علم کو مستعمرین اور مبشرین کے خوف ناک عزائم کے لئے استعمال کر کے اونچے اونچے عہدوں اور مالی مفادات حاصل کرنے کی تگ و دو میں مصروف ہو گیا۔

ان لوگوں نے پادریوں اور پوپوں کو راضی کرنے کے لئے اسلام کے خلاف وہ زہر اگلا جو علم و تحقیق کے نام پر بدنما دھبے کی حیثیت رکھتا ہے۔ مستشرقین کے اس طبقے نے استعماری طاقتوں کے استبدادی عزائم کی تکمیل کے لئے اپنی علمی صلاحیتیں صرف کیں۔ مغلوب اقوام کی تباہی و بربادی کے فیصلے مغربی رجال سیاست نے ان لوگوں کے مشوروں کے مطابق کئے جنہوں نے قبائے علم زیب تن کر رکھی تھی۔

تمام اہل مغرب خواہ وہ یہودی ہوں، عیسائی ہوں، ملحد ہوں، ان کے عزائم دینی ہوں، سیاسی ہوں، اقتصادی ہوں یا سماجی، ان کی تکمیل کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اسلام ہے۔ استعماری طاقتوں کی نظریں اسلامی ممالک پر تھیں۔ یہود و نصاریٰ کے سینوں میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بغض و عناد کا لاوا ابل رہا تھا۔ مغرب کے اہل تجارت کی نظریں دولت اسلامیہ کی منڈیوں پر تھیں۔ اور ان میں سے ہر ایک کے ارادوں کے راستے میں امت مسلمہ ایک دیوار کی مانند کھڑی تھی۔

اس دیوار کو منہدم کئے بغیر نہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عزائم پورے ہو سکتے تھے، نہ پاپائے روم کی دنیا بھر پر عیسائیت کا پرچم لہرانے کی خواہش پوری ہو سکتی تھی اور نہ ہی مغرب کے قسمت آزما اصحاب سیاست کا اسلامی ممالک پر حکمرانی کا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکتا تھا۔

اس لئے ہر وہ شخص جو اس دیوار کو منہدم کرنے کی کارروائیوں میں کسی بھی حیثیت میں شریک ہوتا وہ پادریوں کا بھی منظور نظر قرار پاتا، سیاستدان بھی اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے اور مغرب کے بنیے بھی اس کے لئے اپنی تجوریوں کے منہ کھول دیتے۔ لاتعداد مدعیان علم دولت، شہرت اور حشمت کی اس دیوی کی خاطر اسلام کی اس دیوار کو منہدم کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔

انہوں نے عالم اسلام کو اسی عینک سے دیکھنا شروع کر دیا جو ان کے ان داتاؤں نے لگا رکھی تھی۔ انہوں نے اسلامی ادب کے ذخیرے کو کھنگال مارا تا کہ کوئی ایسی چیز مل جائے جس کے ذریعے مسلمانوں کے کردار کو داغ دار کیا جا سکے۔ انہوں نے ممالک اسلامیہ کے چپے چپے کو چھان مارا۔ مسلمان ممالک میں پھیلے ہوئے بے پناہ قدرتی وسائل کی فہرستیں مرتب کیں۔ مسلمانوں کی ان خامیوں کو نوٹ کیا جن کے ذریعے انہیں باہم لڑا کر ان کو کمزور کیا جا سکتا تھا تا کہ ان کو اپنے پنجہ استبداد میں کسنا آسان ہو۔

یہ طبقہ اتنی ہی طویل تاریخ رکھتا ہے جتنی طویل استشراق کی تاریخ ہے۔ کبھی یہ طبقہ پاپائے روم کی اشیرباد حاصل کرنے کے لئے مصروف جدوجہد رہا، کبھی اپنی علم فروشی کے کارناموں پر انہوں نے مغربی حکمرانوں کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھا اور کبھی تجارتی کمپنیوں کے ڈائرکٹروں سے حق خدمت وصول کرنے کے لئے انہوں نے بل پیش کیا۔

آج اس قسم کے ضمیر فروشوں کی توجہات کا مرکز امریکہ ہے۔ مسلمانوں کی ایک معقول تعداد بھی اس طبقے میں شامل ہو کر اپنے ہی دین کی بنیادوں پر کدالیں چلانے میں مصروف ہے۔ اس طبقے کا کوئی دین نہیں۔ یہ لوگ صرف چند نقوں کی خاطر علم بیچتے ہیں۔ اسی قسم کے لوگوں کے تحریک استشراق کی صفوں میں موجود ہونے پر "سٹیفن وائلڈ" نے ندامت کا اظہار کیا ہے۔-(1)

مستشرقین، جن کی تحریروں میں اسلام کے متعلق انصاف کی جھلک نظر آتی ہے

حقیقت کو شکوک و شبہات کے غبار میں چھپانے کی کوششیں زیادہ دیر تک کامیاب نہیں رہ سکتیں۔ مستشرقین نے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی کردار کشی کے لئے صدیوں کے عرصے پر محیط جو مہم چلائی، اس کا ردعمل بھی خود مستشرقین کی تحریک کے اندر سے شروع ہوا۔ سولہویں صدی عیسوی کے اواخر میں یورپ میں ایسے لوگ منظر عام پر آئے جنہوں نے کلیسا کی اندھی تقلید کا پٹہ اپنی گردنوں سے اتار پھینکا اور صدیوں سے مشہور روایات کو عقل کے پیمانوں پر پرکھنے کی طرح ڈالی۔ انہوں نے عیسائیت کے عقائد کو تنقید کی نظر سے دیکھا۔ پاپائے روم اور پادریوں کے اختیارات کو چیلنج کیا اور آخر کار یہی تحریک

1۔ "الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری"، صفحہ 55

پاپائی اقتدار کے خاتمے اور یورپ کی نشاۃ ثانیہ پر منتج ہوئی۔

اس مثبت رجحان نے کئی مستشرقین کو ہمت دلائی کہ وہ اسلام کے رخِ زیبا پر پڑے ہوئے شکوک و شبہات کے اندر سے اس دین کے اصلی رخ کو دیکھنے کی کوشش کریں۔ انہوں نے کوشش کی کہ وہ اس دین کو اس شکل میں دیکھیں جس شکل میں یہ دین پیغمبر عربی ﷺ نے اپنی امت کے سامنے پیش کیا تھا۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ اس فصل میں ہم جن مستشرقین کا ذکر کر رہے ہیں یہ وہ مستشرقین ہیں جو مسلمان نہیں ہیں۔ ان لوگوں کا تعلق مغرب سے ہے اس لئے قدرتی طور پر وہ مسلمانوں اور اقوام مشرق کا مطالعہ اور تجزیہ ان پیمانوں سے کرتے ہیں جو مغرب میں رائج ہیں۔ چونکہ انہوں نے اسلام کے حلقے میں شامل ہونے کا فیصلہ نہیں کیا اس لئے ان کا اپنے آبائی ادیان کے زیر اثر ہونا بھی ایک قدرتی بات ہے۔ اس لئے ہم ان لوگوں سے یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کو بالکل اسی نظر سے دیکھیں جس نظر سے ہم دیکھتے ہیں۔ اور یہ لوگ اگر اس سطح پر پہنچ جائیں تو مستشرق نہیں رہتے بلکہ ملت اسلامیہ کے فرد بن جاتے ہیں، جیسا کہ کئی مستشرقین کو قدرت نے ہدایت کی دولت عطا فرمائی اور آج وہ تحریک استشراق کے پودے کی آبیاری کے لئے نہیں بلکہ اسلام کی خاطر اپنی صلاحیتیں صرف کر رہے ہیں اور ان لوگوں کی نسبت کہیں زیادہ خلوص اور جذبے کے ساتھ اعلاء کلمۃ الحق کی کوششوں میں مصروف ہیں جن کو اسلام کی دولت ورثے میں ملی ہے۔

اس قسم کے لوگوں نے ان مستشرقین پر شدید تنقید کی ہے جنہوں نے استشراق کے پردے میں علم و تحقیق کا لبادہ اوڑھ کر اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف الزام تراشیاں کی ہیں۔

مستشرقین کے اس طبقے کی تحریروں میں بھی بے شمار غلطیاں موجود ہیں۔ ان کی تحریروں میں بعض ایسی باتیں بھی موجود ہیں جو اسلام کے لئے ان کے پیشروؤں کے بے بنیاد الزامات سے بھی زیادہ تباہ کن ہیں۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان میں سے اکثریت کا اعتماد اپنے پیشروؤں کی تحریروں پر ہے یا ان کا اعتماد مسلمانوں کی کتابوں کے ان تراجم پر ہے جو متعصب مستشرقین نے کئے ہیں اور مترجمین نے قاری پر اپنا نقطہ نظر مسلط کرنے کے لئے ان تراجم کی ابتداء میں لمبے چوڑے مقدمے تحریر کئے ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اہل مغرب نے تاریخی حقائق کو پرکھنے کے لئے جو معیار وضع

کئے ہیں، ان معیاروں پر تاریخ اسلام کے بے شمار حقائق کو پرکھنا ممکن ہی نہیں۔

جو مورخ تاریخ کے ہر واقعے کو مادی محرکات کے پیمانے پر پرکھتا ہے، وہ کیسے یقین کر سکتا ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر کی ہر چیز بارگاہ رسالت میں پیش کر دی تھی اور اپنے گھر کے لئے خدا اور رسول کے سوا کسی چیز کو ضروری نہ سمجھا تھا۔

یہ لوگ اپنے مغربی پیمانوں پر تاریخ اسلام کے واقعات کو پرکھتے ہیں۔ جب تاریخ اسلام کے کئی واقعات ان پیمانوں پر پورے نہیں اترتے تو یہ لوگ اس راستے پر چل نکلتے ہیں جس راستے پر چلنے والوں کے متعلق قرآن حکیم نے بار ہا فرمایا ہے:

اِنْ ھُمْ اِلاَّ یَظُنُّوْنَ   اِنْ ھُمْ اِلاَّ یَخْرُصُوْنَ

"یعنی یہ لوگ علم کی بنیاد پر نہیں بلکہ ظن و تخمین کی بنیاد پر بات کہتے ہیں۔"

تیسری وجہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے اسلام کے بارے میں کچھ مثبت باتیں لکھی ہیں، ان میں کثیر تعداد ان لوگوں کی ہے جنہوں نے اپنے اسلاف کے رویے کو چھوڑنے کا فیصلہ اس لئے کیا کیونکہ ان کو یقین ہو چکا تھا کہ ذہنی بیداری کے اس دور میں، اسلام کے بارے میں ان کے اسلاف کا رویہ خود ان کی تحریک کے لئے زیادہ تباہ کن ہے۔

اس حکمت عملی کے پیش نظر انہوں نے اپنے اسلاف کی طرف سے اسلام کے خلاف کی جانے والی الزام تراشیوں پر شدید تنقید کی لیکن انہوں نے خود بھی اسلام کے خلاف ایسے حملے کئے جو ان کے اسلاف کے حملوں سے بھی زیادہ خطرناک تھے۔

ان لوگوں کے رویے میں تبدیلی حکمت عملی میں تبدیلی کی وجہ سے تھی، ان کا رویہ اس لئے نہیں بدلا تھا کہ اسلام کے متعلق ان کے موقف میں تبدیلی آگئی تھی۔ اس لئے مسلمان جب ان لوگوں کی تحریروں کو پڑھیں تو صرف یہ بات ذہن میں نہ رکھیں کہ یہ تحریریں منصف اور غیر جانبدار مستشرقین کی ہیں بلکہ وہ یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ ان تحریروں کے لکھنے والے غیر مسلم ہیں۔ ان سے نادانستہ طور بھی غلطی ہو جانے کے بے شمار امکانات ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ بظاہر منصف مستشرق، جس کی تحریر آپ پڑھ رہے ہیں، اس کا دل بھی آپ کے خلاف حسد و بغض سے پر ہو اور وہ آپ کو شہد میں ملا کر زہر پلانا چاہتا ہو۔

ان چند معروضات کے بعد ہم اس طبقے سے تعلق رکھنے والے چند مستشرقین کے اسماء اور اسلام کے متعلق انکی آراء قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

رچرڈ سائمن (Richard Simon)

اس مستشرق نے اپنی ایک کتاب "اقوام مشرق کے عقائد و عادات کی تاریخ" میں اسلامی مصادر کی بنیاد پر مسلمانوں کے عقائد اور عادات کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اس نے اسلامی عادات کو بڑی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اسلام کے بارے میں سائمن کے اس غیر جانبدارانہ رویے کا ردعمل یہ ہوا کہ ایک دوسرے مستشرق آرنلڈ (Arnold) نے اس پر یہ الزام لگایا کہ اس نے اسلام کے متعلق ضرورت سے زیادہ غیر جانبداری کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس کے جواب میں رچرڈ سائمن نے اس کو نصیحت کی کہ وہ اسلامی اخلاق کا دقت نظر سے مطالعہ کرے۔ (1)

پیئر بائیل (Pierre Bayle)

مشہور فلسفی پیئر بائیل اسلامی رواداری کا مداح تھا۔ اس کے اس رویے کی جھلک اس کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔ (2)

سائمن اوکلے (Simon Okley)

سائمن اوکلے کی تحریر "تاریخ السراسنہ" کو نسبتاً غیر متعصبانہ تحریر سمجھا جاتا ہے۔ اس نے اپنی کتاب میں اسلامی مشرق کی تعریف کی ہے اور اس کو مغرب پر فوقیت دی ہے۔ (3)

ھادریان ریلانڈ (Hadrian Reland)

ھادریاں ریلانڈ ہالینڈ کی ایک یونیورسٹی میں السنہ شرقیہ کا استاد تھا۔ اس نے 1705ء میں "دین محمدی" کے نام سے لاطینی زبان میں ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب کے لئے اس نے عربی اور لاطینی مصادر پر بھروسہ کیا۔ اس کتاب کے پہلے حصے میں اس نے عربی مصادر پر اعتماد کرتے ہوئے اسلام کے عقائد کو بیان کیا اور دوسرے حصے میں اسلام کے متعلق اہل

1۔ "الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری"، صفحہ 40

2۔ ایضاً

3۔ ایضاً، صفحہ 41

مغرب کی ان آراء کی تصحیح کی کوشش کی جو اس وقت مغرب میں رائج تھیں۔

ہادریاں کی اس کوشش نے مستشرقین کی صفوں میں تہلکہ مچادیا۔ اس کے متعلق یہ مشہور کیا گیا کہ وہ اسلام کی تبلیغ کا فریضہ سرانجام دے رہا ہے۔ حالانکہ ہادریان کا موقف یہ تھا کہ وہ بھی اسلام کے خلاف مصروف جہاد ہے لیکن اس جہاد کے لئے اس نے وہ طریقہ اختیار کیا ہے جس کو وہ زیادہ مفید سمجھتا ہے۔ کیتھولک چرچ نے ہادریان کی اس کتاب کو ممنوعہ کتب کی فہرست میں شامل کر دیا لیکن پابندی کے باوجود اس کتاب کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور کئی زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔

ہادریان کہتا ہے کہ ہر دین کو اپنے مخالفین کی طرف سے، جہالت یا بدنیتی کی بناپر، سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن اسلام کی تحقیر اور اس کو ہر برائی کا منبع ثابت کرنے کے لئے اس کے مخالفین کی طرف سے جو کوششیں کی گئیں اس قسم کی کوششیں کسی زمانے میں کسی دوسرے دین کے خلاف نہیں کی گئیں۔

وہ کہتا ہے کہ اسلام کی کردار کشی کی کوششیں اس حد تک پہنچ گئی ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی نظریے کے ساتھ کوئی برائی منسوب کرنا چاہتا ہے تو وہ صرف یہ کہہ دیتا ہے کہ یہ محمدی نظریہ ہے۔ گویا محمدی تعلیمات میں کسی صحیح شے کا وجود ہے ہی نہیں اور اس دین کی ہر چیز غلط اور فاسد ہے۔ اور اگر کوئی شخص اسلام کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کا واسطہ ان کتابوں سے پڑتا ہے جو تضادات اور گمراہ کن خیالات سے پر ہوتی ہیں۔ ہادریان مزید کہتا ہے: "اس کے برعکس آدمی کو چاہئے کہ وہ عربی زبان سیکھے اور محمد (ﷺ) کو ان کی اپنی زبان میں گفتگو کرتے ہوئے سنے اور ان کو دوسروں کی نظروں سے دیکھنے کی بجائے اپنی نگاہوں سے دیکھنے کی کوشش کرے۔ اس طرح یہ بات واضح ہو جائے گی کہ مسلمان اتنے پاگل نہیں جتنا پاگل ہم انہیں سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو عقل عطا کی ہے۔ میری ہمیشہ سے یہ رائے رہی ہے کہ یہ دین جو ایشیا، افریقہ اور یورپ میں اتنی تیزی سے پھیلا وہ اتنا غیر مہذب اور غیر معقول دین نہیں ہو سکتا جتنا کہ عیسائی سمجھتے ہیں۔"

اسلام کے بارے میں یہ نرم کلمات کہنے کے بعد وہ اپنے ہم مذہبوں کو خوش کرنے یا اپنے دل میں چھپے ہوئے جذبات کو ظاہر کرنے کے لئے کہتا ہے: "یہ صحیح ہے کہ اسلام بہت برا دین ہے اور عیسائیت کے لئے سخت مضر ہے لیکن کیا یہ ایک آدمی کا حق نہیں کہ وہ

اس کی تحقیق کرے؟ کیا ایک انسان کے لئے یہ بات مناسب نہیں کہ وہ شیطان کے حیلوں اور اس کے اسرار کو سمجھنے کی کوشش کرے؟ مناسب یہ ہے کہ آدمی اسلام کا صحیح تعارف حاصل کرے تاکہ وہ زیادہ قوت اور بے خوفی سے اس کا مقابلہ کرسکے۔(1)

یوہان۔ جے۔ ریسکے

یوہان۔ جے۔ ریسکے جرمنی کا مشہور مستشرق تھا۔ وہ اپنے دور کے عربی دانوں میں سر فہرست تھا اور پہلا قابل ذکر جرمن مستشرق تھا۔ اہل کلیسا نے اس کو زندیق قرار دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اپنی ایک کتاب میں اسلام کی تعریف کی تھی۔ اس نے گمراہی اور جھوٹ وغیرہ کے ان الزمات کی تردید کی تھی جو مستشرقین نے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف لگائے تھے۔ یہ شخص اپنے اس معتدل رویے کی وجہ سے، اپنے علم و فضل کے باوجود انتہائی کسمپرسی کے عالم میں اپنی زندگی کے ایام پورے کر کے اس دنیا سے رخصت ہوا۔(2)

مائیکل۔ ایچ۔ ہارٹ (Michael.H.Hart)

مائیکل۔ ایچ۔ ہارٹ نے ایک کتاب تالیف کی ہے جس کا نام اس نے "The 100- A Ranking of the Most Influential Persons in History" رکھا ہے۔ اس کتاب میں اس نے تاریخ انسانی کی ایک سو موثر ترین شخصیات کی فہرست مرتب کی ہے۔ اور اس نے اس فہرست میں حضور ﷺ کا نام سر فہرست رکھا ہے۔ اس نے حضور ﷺ کو تاریخ انسانی کی موثر ترین شخصیت کے طور پر منتخب کرنے کی وجہ یہ بتائی ہے۔ وہ کہتا ہے:

"محمد (ﷺ) نے تاریخ انسانیت پر جو بے مثال دینی اور دنیوی اثرات ڈالے ہیں وہ میری نظر میں انہیں اس بات کا مستحق قرار دیتے ہیں کہ انہیں تاریخ انسانی کی موثر ترین شخصیت قرار دیا جائے۔"(3)

لیکن پیغمبر اسلام ﷺ کے متعلق ان مثبت خیالات کا اظہار کرنے والا مستشرق بھی لکھتا ہے:

1۔ "الاستشراق والخلفیۃ الفکریہ للصراع الحضاری"، صفحہ 43-41

2۔ ایضاً، صفحہ 44

3۔ مائیکل۔ ایچ۔ ہارٹ، "دی ہنڈرڈ۔ اے رینکنگ آف دی موسٹ انفلوئنشل پرسنز ان ہسٹری"، (نیویارک۔ 1978)، صفحہ 40

"Moreover, he is the author of the muslim holy scriptures, the Koran, a collection of certain of Muhammad's insights that he believed had been directly revealed to him by Allah." (1)

"مزید برآں وہ (محمد ﷺ) مسلمانوں کی مقدس کتاب قرآن کے مصنف ہیں۔ جو محمد (ﷺ) کے خیالات کا مجموعہ ہے۔ اور جس کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہ ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہ راست نازل ہوئی۔"

مسلمان جب مائیکل۔ ایچ۔ ہارٹ کے ان جملوں کو پڑھیں جن میں حضور ﷺ کی تعریف ہے تو یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ اسلام کا بڑا ہمدرد ہے بلکہ ساتھ ہی اس کے ان جملوں کو بھی دیکھ لیں جن میں وہ حضور ﷺ پر یہ الزام لگا رہا ہے کہ آپ نے قرآن خود تصنیف کر کے اس کے منزل من اللہ ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔

ڈاکٹر موریس بکائیلے (Dr. Maurice Bucaille)

فرانسیسی مستشرق ڈاکٹر موریس بکائیلے نے کائناتی حقائق کے متعلق قرآن حکیم اور بائبل کے بیانات کو جدید سائنس کے ثابت شدہ نظریات کے پیمانے پر پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے اس تجزیے میں وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ قرآن حکیم نے بے شمار سائنسی موضوعات کو بیان کیا ہے لیکن جدید سائنس قرآن حکیم کے کسی ایک بیان کو بھی غلط ثابت نہیں کر سکتی۔ جب کہ بائبل میں بے شمار ایسے بیانات ہیں جو جدید سائنسی معلومات کی روشنی میں غلط قرار پاتے ہیں۔

ڈاکٹر بکائیلے نے اپنی اس تحقیق کو اپنی کتاب "بائبل، قرآن اور سائنس" (The Bible, the Quran and Science) میں بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر بکائیلے کہتے ہیں:

"جب میں نے پہلی مرتبہ قرآن کا تجزیہ کیا تو یہ تجزیہ بالکل معروضی اور غیر جانبدارانہ تھا۔ میں صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ قرآن اور جدید سائنس میں کس حد تک ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ مجھے قرآن کے تراجم کے ذریعے معلوم تھا کہ قرآن مظاہر فطرت کا اکثر ذکر کرتا ہے لیکن اس سلسلے میں میرا علم بالکل محدود

1۔ مائیکل۔ ایچ۔ ہارٹ، "دی ہنڈرڈ۔ اے رینکنگ آف دی موسٹ انفلوئنشل پرسنز ان ہسٹری"، (نیویارک۔ 1978ء)، صفحہ 39

تھا۔ میں نے قرآن کے عربی متن کا غور سے مطالعہ کیا۔ میں اپنے مطالعہ میں جن چیزوں سے آگاہ ہوا ان کی باقاعدہ فہرست بنائی۔ آخر کار میرے سامنے دلائل کا جو انبار جمع تھا مجھے اس کو تسلیم کرنا پڑا۔ قرآن حکیم میں ایک بھی بیان ایسا نہ تھا جس پر جدید سائنس کے نقطہ نظر سے حملہ کیا جا سکتا ہو۔ میں نے عہد نامہ قدیم اور انجیلوں کو بھی اسی معیار پر پرکھا۔ اب بھی میرا مطالعہ پہلے کی طرح بالکل معروضی تھا۔ عہد نامہ قدیم میں، میں ابھی کتاب پیدائش سے بھی آگے نہ بڑھا تھا کہ میرے سامنے کئی ایسے بیانات آئے جو جدید سائنس کے ثابت شدہ حقائق سے متصادم تھے۔ انجیل کو کھولا تو فوراً ایک مسئلہ سامنے آ کھڑا ہوا۔ پہلے صفحے پر ہی ہماری نظر حضرت عیسٰی علیہ السلام کے نسب نامے پر پڑتی ہے۔ لیکن متی اور لوقا کی انجیلوں میں جو نسب نامے درج ہیں وہ باہم متضاد ہیں۔ لوقا کی انجیل میں زمین پر نسل انسانی کی جو عمر بتائی گئی ہے وہ علم جدید سے بالکل متصادم ہے۔"(1)

تھامس کارلائل (Thomas Carlyle)

انگریز فلسفی تھامس کارلائل نے اپنے لیکچر "آن ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" (On Heroes and Heroworship) میں اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کو انصاف کی نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ مستشرقین نے صدیوں اسلام اور نبی اسلام ﷺ کے کردار پر جو کیچڑ اچھالا ہے، کارلائل نے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کو اس سے بری ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے حضور ﷺ اور آپ کے دین کی عظمتوں کا اعتراف بھی کیا ہے وہ کہتا ہے:

"گلہ بانوں کی ایک قوم روز ازل سے صحراؤں میں سرگرداں تھی۔ کوئی انہیں اہمیت نہ دیتا تھا۔ ایک عظیم پیغمبر ان کی طرف مبعوث ہوا۔ وہ ایک ایسا پیغام لے کر آیا جس پر وہ یقین کر سکتے تھے۔ جس کی عظمت کا وہ مشاہدہ کر سکتے تھے۔ اس پیغام کی تاثیر سے وہ لوگ جن پر کوئی توجہ نہ دیتا تھا وہ دنیا کی توجہات کا مرکز بن گئے۔ جو کمزور تھے وہ دنیا کی عظیم ترین قوم بن گئے۔ اس کے بعد ایک صدی کے اندر اندر عربوں کی مملکت کی سرحدیں ایک طرف غرناطہ اور دوسری

1۔ ڈاکٹر موریس بکائیے، "دی بائبل، دی قرآن اینڈ سائنس"، (لاہور۔)، صفحہ 19-18

طرف دہلی تک پھیلی نظر آتی ہیں۔ طویل مدت تک دنیا کے ایک بڑے حصے پر عربوں کی شان و شوکت اور علم و معرفت کا آفتاب ضوفشاں نظر آتا ہے۔ عرب قوم، محمد اور اس ایک صدی پر غور کرو، کیا یوں محسوس نہیں ہوتا جیسے سیاہ ریت کے ایک غیر معروف ٹیلے پر ایک چنگاری پڑی ہو جس سے وہ ٹیلا آتش گیر مادہ بن کر پھٹ پڑا ہو اور اس سے جو شعلے نکلے ہوں انہوں نے غرناطہ سے لے کر دہلی تک کو روشن کر دیا ہو۔"(1)

کارلائل کے مذکورہ بالا خیالات کو پڑھ کر فطری طور ایک مسلمان کو مسرت ہوتی ہے لیکن اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے متعلق ان منصفانہ خیالات کا اظہار کرنے کے باوجود اس انگریز فلسفی کے قلم سے بھی اسی لیکچر میں ایسے الفاظ نکلے ہیں جو ایک مسلمان قاری کے دل پر نشتر بن کر گرتے ہیں۔ اس نے قرآن حکیم کے بارے میں اپنی کتاب کے صفحہ نمبر 299 پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ اس کے اندر چھپے ہوئے مستشرق کی غمازی کرتے ہیں۔

تھامس کارلائل کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے قرآن حکیم کو اس کے عربی متن سے نہیں بلکہ جارج سیل کے ترجمے کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اور جارج سیل کے ترجمے کے ذریعے قرآن کا مطالعہ کر کے اس نے اربوں انسانوں کے دلوں پر حکومت کرنے والی کتاب کو ایک بور کتاب قرار دے دیا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی کتاب کے اصل متن کو اس کی زبان میں سمجھے بغیر اس کتاب کی ادبی خصوصیات پر تبصرہ کرنے بیٹھ جانا اور اس کتاب پر بوریت کا الزام لگانا غیر جانبدارانہ اور بے لاگ تنقید کے زمرے میں آتا ہے یا اس سے تعصب کی بو آتی ہے؟

لامارتین

فرانسیسی فلسفی "لامارتین" اپنی قوم سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

"کیا تم سمجھتے ہو کہ محمد دھوکا باز، شاطر اور جھوٹا تھا؟ لیکن میں تمہارے روبرو اعلان کرتا ہوں کہ محمد (ﷺ) کی زندگی اور تاریخ کے مطالعہ کے بعد ان کے متعلق اس قسم کے خیالات نہیں رکھے جاسکتے۔"(2)

1۔ تھامس کارلائل، "آن ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" (نیویارک۔ 1973)، صفحہ 311

2۔ ڈاکٹر عبداللہ مبشر الطرازی، "رؤیۃ اسلامیۃ للاستشراق" بعض المستشرقین المنصفین" مشمولہ "الاسلام والمستشرقون"، (جدہ 1985ء)، صفحہ 307

وہی لامارتین کہتا ہے:

"فلسفی، خطیب، رسول، شارع، قائد، فکر و نظر کے دروازے کھولنے والا، انسانوں کو عقل کی طرف راغب کرنے والا، ایسے عقائد کا مبلغ جو دل اور ذہن دونوں کے موافق ہوں، ایسے دین کا بانی جس میں بت پرستی کا کوئی شائبہ نہیں، کرۂ ارضی پر بیس مادی سلطنتوں اور ایک عظیم روحانی سلطنت کا بانی، یہ ہے محمد (ﷺ)۔ (1)

لامارتین ایک اور مقام پر کہتا ہے:

"کون سا شخص ایسا ہے، جس کو ان معیارات پر پرکھا جائے جو عظمت انسانی کو پرکھنے کے لئے وضع ہوئے ہیں، تو وہ محمد (ﷺ) سے بڑا نظر آئے۔ محمد (ﷺ) کے سواوہ کون ہے، جس میں ہر انسانی عظمت اپنے عروج پر نظر آتی ہو۔"

لامارتین اپنے اس تبصرے کا اختتام ان الفاظ پر کرتا ہے:

"محمد ﷺ خدا سے کم ہیں اور انسان سے برتر ہیں۔ یعنی وہ خدا کے نبی ہیں ﷺ" (2)

پروفیسر لیک

یورپ کا مشہور مصنف پروفیسر "لیک" کہتا ہے:

"محمد (ﷺ) کی تاریخی زندگی کو اس سے بہتر طور پر بیان نہیں کیا جاسکتا جس طرح کہ خود اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (3) "اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو، مگر سراپا رحمت بنا کر سارے جہانوں کے لئے" ...... یتیم آمنہ نے اپنے عمل سے ثابت کیا کہ وہ ہر ضعیف اور محتاج کے لئے رحمت ہیں ...... محمد ﷺ یتیموں، مسافروں، پریشان حال لوگوں، مقروضوں اور تمام فقراء و مساکین کے لئے حقیقی رحمت تھے۔ آپ عورتوں کے لئے بھی رحمت تھے جن کو اس زمانے میں اشیائے ضرورت سے زیادہ حیثیت حاصل نہ تھی۔ آپ نے ساری دنیا میں تمام دینوں اور

1۔ دکتور عبداللہ مبشر الطرازی، "نبی الاسلام فی مرآۃ بعض المستشرقین المصنفین" مشمولہ "الاسلام و المستشرقون" (جدہ۔ 1985ء)، صفحہ 308

2۔ "نبی الاسلام فی مرآۃ بعض المستشرقین المصنفین"، مشمولہ "الاسلام و المستشرقون"، صفحہ 9-308

3۔ سورۃ الانبیاء: 107

تمام نظاموں سے پہلے عورتوں کو عزت کا مقام عطا کیا۔ اس لئے آؤ ہم پورے اخلاص، دردمندی اور عاجزی سے پڑھیں: اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اَتْبَاعِهٖ وَمُحِبِّيْهِ اَجْمَعِيْنَ۔ حضور ﷺ کی تعریف میں یہ کلمات لکھنے کے بعد پروفیسر لیک لکھتا ہے:

"میں آخر میں یہاں اس عالمی خیر کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو حرمت شراب کی شکل میں بنی نوع انسان کو نبی ﷺ نے عطا کی۔ اور اس ایک حکم کی وجہ سے چودہ صدیوں کے درمیان کروڑوں لوگوں کو ذلت کی زندگیوں سے بچالیا۔ امریکہ میں لوگوں کو شراب نوشی سے روکنے کے لئے جو کوششیں ہو رہی ہیں ان کو سامنے رکھو اور پھر قیاس کرو کہ کیا یہ ایک عظیم معجزہ نہیں کہ شراب نوشی معاشرے کو جن تباہیوں سے دوچار کرتی ہے ان سے محمد (ﷺ) نے اپنی امت کو صرف موعظہ حسنہ اور ایک جملے کے ذریعے محفوظ کرلیا۔"(1)

پروفیسر ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ

انگریز مورخ پروفیسر ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ اسلام کے، اپنی تعلیمات کے اثر و قوت کی بنا پر پھیلنے کے، متعلق کہتا ہے:

"یہ امر قابل غور ہے کہ اسلام کو اپنے سیاسی زوال اور انحطاط کے زمانے میں بعض نہایت شاندار روحانی فتوحات حاصل کی ہیں۔ مثلاً اسلام کی تاریخ میں دو موقعے ایسے آئے جبکہ وحشی کفار نے مسلمانوں کو سختی کے ساتھ پامال کیا۔ سلجوقی ترکوں نے گیارہویں صدی میں اور تاتاریوں نے تیرہویں صدی میں۔ مگر ان دونوں موقعوں پر فاتحین نے اسی قوم کا مذہب اختیار کرلیا جس کو انہوں نے مغلوب کیا تھا۔ مسلمان مبلغین نے اپنا مذہب وسطی افریقہ، چین اور جزائر ہند چینی میں پھیلایا ہے۔ حالانکہ ان کو وہاں کسی دنیوی حکومت کی حمایت حاصل نہ تھی۔"(2)

1۔ "نبی الاسلام فی مرآۃ بعض المستشرقین المصنفین"، مشمولہ "الاسلام والمستشرقون"، صفحہ 3-332

2۔ پروفیسر ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ، "دعوت اسلام اردو ترجمہ"، (لاہور۔ 1972)، صفحہ 6

برنارڈ شاہ

برطانوی مفکر اور مورخ "برنارڈ شاہ" کہتا ہے:

"مجھے یقین ہے کہ اگر آج دنیا کی قیادت محمد (ﷺ) جیسے کسی آدمی کے ہاتھ میں دے دی جائے تو وہ دنیا کو درپیش تمام مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہو جائے اور اسے امن، سلامتی اور سعادت کا گہوارہ بنادے۔" (1)

"برنارڈ شاہ" ایک اور مقام پر کہتا ہے:

"میں کسی ایسے دین یا اجتماعی نظام کو نہیں جانتا جو اسی قسم کے عمدہ قوانین اور تعلیمات پر مشتمل ہو جن پر اسلام مشتمل ہے۔" (2)

یہی مستشرق اسلام کے روشن مستقبل کے بارے میں پیشگوئی کرتے ہوئے کہتا ہے:

"برطانیہ اور یورپ تباہی کے جس گڑھے کی طرف جا رہے ہیں اگر اس سے بچنے کے لئے کسی دین کی پیروی کی ضرورت محسوس کریں تو اس غرض کیلئے ان کے سامنے صرف دین اسلام ہو گا اور میں دیکھ رہا ہوں کہ آئندہ سو سال میں برطانیہ اور یورپ اسلام کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہو جائیں گے۔" (3)

مندرجہ بالا سطور میں ہم نے ان لوگوں کی آراء بیان کی ہیں جو مسلمان نہیں ہیں۔ اسلام کے خلاف فرضی داستانیں وہ بچپن سے سنتے رہے ہیں، لیکن جب انہوں نے اسلام کو آبائے کلیسا کی نظروں سے نہیں بلکہ اپنی آزاد نظروں سے دیکھا تو انہوں نے محسوس کیا کہ اسلام کے متعلق جو تصور بچپن سے ان کے ذہنوں میں راسخ تھا وہ غلط تھا۔ انہوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی خوبیوں کا اعتراف کیا اور اپنے آباؤ اجداد کی روایات سے بغاوت کرتے ہوئے دین اسلام کی خوبیوں کو اعلانیہ اپنی تحریروں میں بیان کیا۔ اور ان لوگوں کی بدنیتی اور علمی خیانت کا پردہ چاک کیا جو صدیوں سے اسلام کے رخ زیبا پر شکوک و شبہات کا غبار ڈالنے میں مصروف رہے تھے۔

ان کی اس جرأت کے رد عمل کے طور پر ان کو مستشرقین اور آبائے کنیسہ کی طرف

1۔ "نبی الاسلام فی مرآۃ بعض المستشرقین المنصفین"، مشمولہ "الاسلام والمستشرقون"، صفحہ 346

2۔ ایضاً، صفحہ 347

3۔ ایضاً

سے شدید ردعمل کا سامنا کرنا پڑا لیکن انہوں نے کسی چیز کی پروانہ کی۔

حقیقت یہ ہے کہ ان مستشرقین کے رویے میں جو یہ تبدیلی رونما ہوئی ہے، اس میں مسلمانوں کی تبلیغی کوششوں کا دخل نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان لوگوں نے مستشرقین کی اسلام دشمن تحریروں کے اندر سے اسلام کی اصلیت کو تلاش کرنے کی خود کوشش کی اور وہ اس میں کافی حد تک کامیاب ہوئے اور اسلام کا حسن اپنی پوری آب و تاب سے ان کے سامنے جلوہ گر ہو گیا۔

اگر علم اور ہدایت ایک ہی چیز کے دو نام ہوتے تو یقیناً یہ جان لینے کے بعد کہ اسلام ایک عظیم انقلابی دین ہے، یہ لوگ کلمہ طیبہ پڑھ کر حلقہ اسلام میں شامل ہو جاتے لیکن۔

این سعادت بزور بازو نیست　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

جن لوگوں نے اسلام دشمن ماحول میں پرورش پائی، ان کا حلقہ اسلام میں شامل ہوئے بغیر اسلام کی عظمت کا اعتراف کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ یہ قدرت خداوندی کا کرشمہ ہے۔ جس ذات نے کبھی ان تاتاریوں کی تلواروں کو حفاظت حرم پر مامور کر دیا تھا جنہوں نے ممالک اسلامیہ کی اینٹ سے اینٹ بجائی تھی، اسی ذات نے مستشرقین کے ایک طبقے کے قلموں سے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی تعریف کرائی ہے۔

یہ سب کچھ اسلام کی تعلیمات کی قوت اور کشش کی وجہ سے ہوا۔ اگر امت مسلمہ نے مستشرقین اور دیگر اہل مغرب کو اسلام کی حقیقت سے آگاہ کرنے کے لئے اپنا دینی اور ملی فریضہ کما حقہ ادا کیا ہوتا تو آج یورپ اور امریکہ کی فضائیں کلمہ توحید کی صداؤں سے گونج رہی ہوتیں۔

مستشرقین، جو حق کے نور کو دیکھ کر اس کے حلقے میں شامل ہو گئے

گزشتہ فصل میں ہم نے ان مستشرقین کا ذکر کیا ہے جنہوں نے اسلام قبول کئے بغیر اسلام کی تعلیمات کی تعریف کی ہے۔ اسلام کی تعلیمات نے صرف مخالفوں سے اپنی تعریف ہی نہیں کرائی بلکہ ان میں سے بے شمار لوگوں کو اپنے حلقے میں شامل ہونے پر مجبور بھی کیا ہے۔

بے شمار لوگ ایسے ہیں جنہوں نے یورپ اور امریکہ میں آنکھیں کھولیں، مستشرقین سے تعلیم حاصل کی لیکن آخر کار توفیق خداوندی نے انہیں ملت اسلامیہ کا جزو لاینفک بنا دیا۔

ذیل میں ہم ایسے چند خوش نصیب لوگوں کا ذکر کرتے ہیں جن کو ان کی تحقیق و جستجو نے منزل مراد تک پہنچایا اور انہوں نے کلمہ توحید پڑھ کر دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی کی سعادت حاصل کی۔

عبداللہ بن عبداللہ

ان کے قبول اسلام کا حال پروفیسر ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ نے اپنی کتاب "دعوت اسلام" میں تفصیل سے لکھا ہے۔ ہم اس کا خلاصہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

پروفیسر آرنلڈ نے عبداللہ بن عبداللہ کا پرانا عیسائی نام ذکر نہیں کیا کیونکہ پروفیسر موصوف نے ان کے حالات ان کی خود نوشت سے نقل کئے ہیں جس میں ان کا صرف اسلامی نام مذکور ہے۔

عبداللہ جزیرہ میورقہ میں ایک خوش حال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت اس انداز میں ہوئی کہ وہ بڑے ہو کر عیسائی پادری بن سکیں۔ مختلف یونیورسٹیوں سے دینیات کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ ایک عمر رسیدہ پادری کی خدمت میں گزارا۔ اس پادری کو عالم عیسائیت میں بڑی شہرت حاصل تھی اور لوگ اس کے بڑے قدردان تھے۔ پادری کو اپنے اس شاگرد پر بڑا بھروسہ تھا اور اس نے اپنے مال و متاع کی کنجیاں اس کے حوالے کر رکھی تھیں۔

ایک دن پادری اپنی درس گاہ نہ جاسکا۔ اس کی عدم موجودگی میں اس کے شاگرد دیر تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس قول پر بحث کرتے رہے کہ "میرے بعد ایک نبی آئے گا جس کا نام فارقلیط ہوگا۔" وہ یہ بحث کرتے رہے کہ اس کلام میں فارقلیط سے مراد کون ہے، لیکن وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔

عبداللہ نے واپس جا کر پادری کے سامنے اس بحث کا ذکر کیا اور اپنے استاد سے درخواست کی کہ جس طرح انہوں نے اسے علم کے بے بہا موتی عطا فرمائے ہیں اسی طرح اس عقدے کو بھی حل کر دیں۔ پادری نے رونا شروع کر دیا اور کہا میرے بیٹے! بے شک تم مجھے بہت عزیز ہو کیونکہ تم نے میری بہت خدمت کی ہے۔ فی الواقع اس مبارک نام کے معنی دریافت کرنے میں بڑا فائدہ ہے مگر مجھے خوف ہے کہ اگر میں نے اس کے معنی تم پر ظاہر کر دیئے تو عیسائی تجھے فوراً مار ڈالیں گے۔ عبداللہ نے راز کو افشا نہ کرنے کا وعدہ کیا تو

پادری نے کہا: میرے فرزند! تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ فارقلیط پیغمبر اسلام محمد ﷺ کے اسمائے مبارکہ میں سے ایک نام ہے۔ اور یہ وہی پیغمبر ہیں جن پر وہ چوتھی کتاب نازل ہوئی جس کا اعلان دانیال کی زبان سے ہوا تھا۔ پیغمبر اسلام ﷺ کا دین یقیناً سچا دین ہے اور ان کا مذہب وہی شاندار اور پرنور مذہب ہے جس کا ذکر انجیل میں آیا ہے۔

پادری نے عبداللہ کو دین اسلام قبول کر لینے کی نصیحت کی لیکن خود عبداللہ کی منت سماجت کے باوجود اس نعمت کو اپنے دامن میں سجانے سے محروم رہا۔

عبداللہ اپنے استاد سے رخصت ہوا۔ مختلف ممالک سے ہوتا ہوا تیونس جا پہنچا۔ وہاں کے عیسائیوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا کیونکہ عبداللہ کے علم کی شہرت عالم عیسائیت میں دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ چار مہینے عیسائیوں کے پاس رہا۔ اس کی بڑی خاطر مدارات کی گئی۔ آخر وہ تیونس کے سلطان ابوالعباس احمد کے پاس پہنچے اور اسلام قبول کرنے کے ارادے کا اظہار کیا۔ سلطان نے انہیں خوش آمدید کہا۔

عبداللہ نے درخواست کی کہ سلطان ان کے اسلام قبول کرنے کے اعلان سے پہلے عیسائیوں کی ان کے متعلق رائے دریافت کر لیں کیونکہ جو شخص اپنا مذہب تبدیل کرتا ہے اس پر اس کے ہم مذہب ہر قسم کی الزام تراشیوں کو روا رکھتے ہیں۔ سلطان نے کہا: تم نے تو بالکل وہی بات کہی ہے جو حضرت عبداللہ بن سلام نے اسلام قبول کرنے سے پہلے کہی تھی۔

سلطان نے عبداللہ کی درخواست کے مطابق عیسائیوں کو شاہی دربار میں جمع کیا اور ان سے عبداللہ کے بارے میں پوچھا۔ جب سلطان عیسائیوں سے یہ سوال جواب کر رہے تھے، عبداللہ برابر والے کمرے میں بیٹھے تھے۔ عیسائیوں نے جواب دیا: وہ ہمارے بہت بڑے عالم ہیں۔ ہمارے علماء کہتے ہیں کہ انہوں نے علم و فضل اور پرہیزگاری میں عبداللہ سے بڑھ کر کسی کو نہیں دیکھا۔ سلطان نے عیسائیوں سے پوچھا کہ اگر تمہارا یہ پادری مسلمان ہو جائے تو تم اس کی نسبت کیا خیال کرو گے؟ انہوں نے جواب دیا:

معاذ اللہ! وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتا۔ سلطان نے عبداللہ کو اپنے پاس بلایا۔ عبداللہ دوسرے کمرے سے اٹھ کر سلطان کے پاس آئے اور کلمہ شہادت پڑھ کر حلقہ اسلام میں شامل ہو گئے۔

عیسائیوں نے عبداللہ کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا اور کہا۔ اس شخص نے صرف شادی

کے شوق میں یہ حرکت کی ہے کیونکہ پادری کی حیثیت میں وہ شادی نہیں کر سکتا تھا۔

عبد اللہ نے مسلمان ہونے کے بعد 1440ء میں عیسائیوں کے رد میں ایک کتاب لکھی۔ جس کا نام "عدیہ الاریب فی الرد علی احل الصلیب" رکھا۔ پروفیسر آرنلڈ نے عبد اللہ کے حالات اسی کتاب کے مقدمے سے نقل کئے ہیں۔(1)

مسٹر ڈبلیو۔ ایچ کیولیم (W.H.Quilliam)

مسٹر ڈبلیو۔ ایچ۔ کیولیم ایک انگریز قانون دان تھا۔ اس نے قرآن مجید اور دیگر اسلامی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اس کی توجہ اسلام کی طرف اس وقت مبذول ہوئی جب اس نے 1884ء میں مراکش کا سفر کیا۔ اسے یہ بات دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ پیروان اسلام بڑے مخلص لوگ ہیں اور شراب نوشی اور دوسری برائیوں سے پاک ہیں جو انگلستان کے بڑے شہروں میں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔

"کیولیم" نے اسلام قبول کر کے لورپول میں ایک مسلم مشن قائم کیا اور تبلیغی کوششیں شروع کر دیں۔ اس نے عام لوگوں کو لیکچر دیئے۔ چھوٹی چھوٹی کتابیں شائع کیں۔ ایک رسالہ جاری کیا۔ انگریزوں نے اس کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنا شروع کر دیا۔

انگلستان سے اٹھنے والی تبلیغ اسلام کی اس تحریک نے اسلامی ممالک میں جوش پیدا کر دیا۔ 1891ء میں ترکی سلطان نے "کیولیم" کو ملاقات کے لئے قسطنطنیہ بلایا۔ اور پھر تین سال بعد سلطان نے ایک مسلمان تاجر کو کیولیم کے پاس تحائف دے کر بھیجا۔(2)

رسل ویب (Russel Webb)

ان کا پورا نام محمد الیگزینڈر رسل ویب ہے۔ ان کا تعلق امریکہ سے ہے۔ یہ ادیب، مصنف اور صحافی تھے۔ سینٹ جوزف گزٹ اور "میسوری ریپبلکن" کے ایڈیٹر رہے۔ 1887ء میں منیلا (فلپائن) میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے قونصل مقرر ہوئے۔ وہاں انہوں نے اسلام کا گہرا مطالعہ کیا۔ وہ ابتدا میں عیسائی مذہب کے پیروکار تھے، پھر مادہ پرست بنے اور آخر کار توفیق خداوندی نے انہیں دولت اسلام سے مالا مال کر دیا۔

وہ پہلے منیلا سے ہندوستان آئے۔ وہاں بڑے بڑے شہروں میں اسلام پر لیکچر دیئے۔

1۔"دعوت اسلام"، صفحہ 20-415

2۔ایضاً، صفحہ 424

پھر وہ امریکہ گئے اور ایک عرب تاجر حاجی عبداللہ کے تعاون سے نیویارک میں ایک اسلامی مشن قائم کیا۔ انہوں نے ایک رسالہ بھی مسلم ورلڈ (The Muslim World) کے نام سے جاری کیا۔

"رسل ویب" فرماتے ہیں۔

"میں گہرے اور وسیع مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ اسلام وہ واحد اور بہترین نظام حیات ہے جو انسان کی روحانی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے...... بعض نوجوانوں کے برعکس میں ابتداہی سے مذہب کے ساتھ اچھا خاصا لگاؤ رکھتا تھا۔ مگر بیس سال کی عمر میں، میں جوں ہی شعور مند ہوا، چرچ کی خشک اور بے معنی رسومات وقیود سے سخت بیزار ہو گیا۔ عیسائیت سے بیزار ہو کر میں نے مختلف مذاہب کا مطالعہ کیا لیکن کوئی مذہب مجھے مطمئن نہ کر سکا۔ آخر اسلام کو پڑھنے کا موقعہ ملا تو حق واضح ہو کر سامنے آگیا۔

یاد رہے! میں نے اسلام کسی جذباتی رد عمل، اندھی عقیدت یا محض سطحی جوش سے متاثر ہو کر قبول نہیں کیا بلکہ اس کے پیچھے ایک طویل، مخلصانہ، دیانتدارانہ اور قطعی غیر متعصبانہ مطالعہ اور تحقیق کار فرما ہے۔" (1)

ڈاکٹر مارٹن لنگز (Dr. Martin lings)

مشہور برطانوی مستشرق ڈاکٹر مارٹن لنگز مصر یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر رہے۔ پھر "برٹش میوزیم لائبریری" کے سربراہ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ انہوں نے اسلام کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ اسلام کی تعلیمات کا دوسرے ادیان کی تعلیمات سے موازنہ کیا۔ اسلامی تصوف خصوصی طور پران کے زیر مطالعہ رہا۔ آخر کار قسمت نے یاوری کی اور بقول علامہ زکریا ہاشم زکریا: "وہ تصوف کی سیڑھی کے ذریعے خدا تک جا پہنچے۔"

انہوں نے ابو بکر سراج الدین کا اسلامی نام اختیار کیا اور اسلام کی نورانی اور حیات بخش تعلیمات کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچانے کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی۔

انہوں نے سیرت رسول ﷺ پر ایک کتاب لکھی۔ وہ اپنے اسلام قبول کرنے کے متعلق لکھتے ہیں:

1۔ عبدالغنی فاروق، "ہم کیوں مسلمان ہوئے" (لاہور۔ 1987)، صفحہ 4-213، نیز "دعوت اسلام"، صفحہ 5-424

"مجھے اسلامی تصوف کی انسان دوستی، ذوق و وجدان، خدا سے بندوں کے تعلق اور انسانوں کے باہمی تعلقات کے متعلق واضح احکامات نے اسلام کی طرف مائل کیا۔"(1)

ڈاکٹر ارتھر کین

امریکی ماہر نفسیات "ڈاکٹر ارتھر کین" نے توفیق خداوندی سے اسلام قبول کیا اور علی عمر کریم نام اختیار کیا۔ وہ اپنے اسلام قبول کرنے کے متعلق لکھتے ہیں:

"بیس سال کی عمر تک میرا خدا پر ایمان نہ تھا۔ میرا گھرانہ مذہبی تھا اور میں اپنے اہل خانہ کا دل رکھنے کیلئے گرجے جایا کرتا تھا لیکن میرے ذہن میں مادے کے سوا کسی چیز کا وجود نہ تھا۔ میری زندگی روحانی عنصر سے مطلقاً بے بہرہ تھی۔ ایک وقت آیا کہ مجھے اپنی اس بے کیف زندگی کے متعلق بے چینی محسوس ہونے لگی۔ کاغذ کا ایک پرزہ میرے ہاتھ لگا جس پر قرآن حکیم کی چند آیات بمعہ ترجمہ لکھی ہوئی تھیں۔ میں نے ان کو پڑھا اور محسوس کیا کہ یہ کلام مجھے اپنی جانب کھینچ رہا ہے۔

میں نے مختلف ادیان کا مطالعہ شروع کر دیا۔ میں نے عیسائیت، یہودیت، بدھ مت اور اسلام کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ مجھے گو تمام ادیان میں کچھ چیزیں ایسی ملیں جن کے حق ہونے کے متعلق مجھے قلبی اطمینان حاصل ہوا لیکن اسلام میں مجھے بڑی عظیم چیزیں نظر آئیں۔ اسلام کی شکل میں حق کی بعض چیزیں نہیں بلکہ حق کا پورا نظام نظر آ گیا۔ اسلام کی تعلیمات میں مجھے صراحت، عظمت و برتری اور عظیم روحانیت نظر آئی۔

دس سال کے مطالعہ سے مجھے عقلی اور روحانی طور پر یقین ہو گیا کہ اسلام سچا دین ہے۔ میں نیویارک کی مسجد میں پہنچا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے اندر کا انسان مجھے نمازیوں کے ساتھ مل کر نماز پڑھنے کی طرف کھینچ رہا ہے۔ میں نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر نماز ادا کی اور میرے رب نے میرے دل کو ہدایت کے نور سے بھر دیا۔"

1۔ ذکریا ہاشم ذکریا، "المستشرقون والاسلام" (1968)، صفحہ 40-439

ڈاکٹر علی کریم قرآن حکیم کے متعلق کہتے ہیں:

"یہ مقدس ربانی کتاب ہے جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی کتاب نہیں کر سکتی۔"

ڈاکٹر موصوف اسلامی شخصیات میں حضور ﷺ کے بعد امام غزالی کو اپنی محبوب ترین شخصیت قرار دیتے ہیں جن کی تحریریں عقل اور روح دونوں کو متاثر کرتی ہیں۔(1)

جان سنت

انگریز مبشر "جان سنت" نے اسلام قبول کیا اور "محمد جان" نام اختیار کیا۔ اس نے پندرہ سال کی عمر میں ادیان کا مطالعہ شروع کیا۔ اس کا تعلق برطانیہ کی "سالویشن آرمی" کے ساتھ تھا جس کا مشن عیسائیت کی تبلیغ ہے۔

وہ کہتا ہے:

"میں نے عیسائیت کا گہرا مطالعہ کیا لیکن مجھے عیسائیت میں انسانی زندگی کے بے شمار مسائل کا شافی حل نظر نہ آیا۔ میرے دل میں عیسائیت کے متعلق شکوک پیدا ہوگئے۔ میں اشتراکیت کی طرف متوجہ ہوا لیکن اس نظام میں میری روح کے لئے کچھ نہ تھا۔ پھر بدھ مت اور دیگر ادیان کے مطالعہ کے بعد 1950ء میں آسٹریلیا کے ایک تبلیغی مشن کے دوران اسلام کی طرف متوجہ ہوا۔ میں نے حضور ﷺ کی سیرت طیبہ کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ اسلام کے مطالعہ سے مجھے اپنی زندگی کے تمام مسائل کا حل پوری وضاحت کے ساتھ مل گیا۔

میں نے دیکھا کہ اسلام میں فرد اور معاشرے دونوں کی فلاح کے لئے قوانین موجود ہیں اور اسلام معاشرے کو مساوات اور توحید کی بنیادوں پر استوار کرنے کا علمبردار ہے تو میں نے اسلام کی طرف عقلی اور روحانی کشش محسوس کی۔

میں نے اسی دن اپنے رب سے عہد کر لیا کہ اپنی زندگی اسلامی ہدایت کے نور کو اکناف عالم میں پھیلانے کے لئے وقف کر دوں گا۔ برطانیہ واپس پہنچ کر میں نے "برٹش مسلم ایسوسی ایشن" قائم کی اور تبلیغ اسلام کے کام میں ہمہ تن مصروف ہوگیا۔ میرے کثیر ہم وطن انگریزوں نے اسلام کی تعلیمات کو سمجھ لینے کے بعد اسلام قبول کر لیا۔"

1۔ "المستشرقون والاسلام"، صفحہ 51-450

2۔ ایضاً، صفحہ 52-451

علاء الدین شلمی

علاء الدین شلمی جرمن مفکر ہیں۔ وہ اپنے اسلام قبول کرنے کے متعلق فرماتے ہیں:
"میں نے مغرب کی گمراہی کو محسوس کرنا شروع کیا۔ مغرب الحادیت اور سرمایہ داری کے مادی نظاموں میں سرگرداں تھا۔ وہ لوگ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے دوسروں کے حقوق غصب کرنے، ان کا خون چوسنے اور خون بہانے میں مصروف تھے۔ لالچ اور ظلم کی مشترک قدروں نے ہزار اختلافات کے باوجود ظالموں کو جمع کر دیا تھا۔

اس تاریک ماحول میں، میں نے محسوس کیا کہ اسلام تمام ادیان کا نچوڑ ہے۔ اس کی بنیاد عقیدہ توحید پر ہے، اس کے ستون وہ حقائق ہیں جو عقل اور روح دونوں کو مطمئن کرتے ہیں۔ یہ دین خدا کے مختار اور برگزیدہ بندوں کے ذریعے ملائکہ، الہامی کتابوں اور رسولوں پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے۔ یہ لوگوں کو اعمال حسنہ کی تعلیم دیتا ہے تاکہ قیامت کے دن، جب اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (1) کے اصولوں پر فیصلے ہوں گے، ان کے چہرے نور سے معمور ہوں۔
مجھے اس بات پر شدید ندامت محسوس ہوئی کہ میں گوری نسل سے ہوں۔ وہ گوری نسل جس نے اپنے ظلم و عدوان اور کفر و طغیان کی وجہ سے انسانیت کے اعمالنامے کو سیاہ کر دیا تھا۔ یہ نسل انسانی قدروں سے آزاد ہو گئی، انسانوں کو رنگ اور نسل کی بنیاد پر تقسیم کیا اور اس راستے پر ایسے مظالم کا ارتکاب کیا جن سے انسانیت اپنی اصلیت سے محروم ہو گئی۔
یہ نسل اس سفید پتھر کی مانند ہے جس کا رنگ تو سفید ہوتا ہے لیکن وہ رحمت و محبت کے جذبات سے محروم ہوتا ہے۔
میں اسی کشمکش میں مبتلا تھا کہ ایک روز میری نظر تلاوت قرآن کے دوران اس آیۂ کریمہ پر پڑی: فَفِرُّوْا اِلَی اللّٰہِ۔ دوڑو اللہ تعالیٰ کی طرف۔ میں نے سوچا کہاں جاؤں؟ آخر قاہرہ جانے کا فیصلہ کیا۔ ایک مجلس میں پہنچا جہاں اکناف عالم سے آئے ہوئے مسلمان رنگ و نسل کی تمیز کے بغیر ذکر "اللہ" میں مصروف

1۔ ترجمہ۔ تم میں خدا کے نزدیک معزز ترین وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو۔

تھے۔ میں بھی اس مجلس میں شامل ہو گیا۔ میں اس وقت اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین آدمی سمجھ رہا تھا جب میرا ہاتھ ایک سیاہ فام مسلمان بھائی کے ہاتھ میں تھا اور ہم یک زبان ہو کر اَللّٰهُ اَحَدٌ کا نعرہ مستانہ بلند کر رہے تھے۔ سچ ہے اسلام وہ دین ہے جو کبھی مغلوب نہ ہوگا۔ یہ دین باقی رہے گا خواہ لالچ کے مارے ہوئے کم فہم لوگ اس کو نقصان پہنچانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگالیں۔"(1)

الفونس اتیین

مشہور فرانسیسی مستشرق "الفونس اتیین" (2) ایک سلیم الفطرت انسان تھے۔ وہ ایک ماہر آرٹسٹ تھے۔ وہ مدتوں مظاہر فطرت میں رب کائنات کی شان خلاقیت کا مشاہدہ کرنے میں مصروف رہے۔ آخر کار اسلام کے نور ہدایت نے ان کی راہنمائی کی اور وہ مسلمان ہو گئے۔ انہوں نے ناصر الدین کا نام اختیار کیا اور پھر اپنی زندگی اپنے نام کی لاج رکھتے ہوئے خدمت دین میں گزار دی۔ انہوں نے مستشرقین کی طرف سے اسلام پر کئے جانے والے اعتراضات کے شافی جواب دیئے اور ثابت کیا کہ اہل مغرب علم، ثقافت یا شجاعت کسی میدان میں بھی مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

لارڈ ہیڈلے الفاروق (Lord Headley Al-Farooq)

ان کا پہلا نام "وائٹ آنریبل سر رولینڈ جارج ایلن سن" تھا۔ وہ انگلستان کے طبقہ امراء میں بلند مقام رکھتے تھے۔ وہ سیاستدان بھی تھے اور مصنف بھی۔ وہ کچھ عرصہ سالسبری جنرل کے مدیر بھی رہے۔ انہوں نے فوجی افسر کی حیثیت سے بھی خدمات سرانجام دیں۔

انہوں نے 1918ء میں اسلام قبول کر لیا اور شیخ رحمت اللہ الفاروق کے اسلامی نام سے موسوم ہوئے۔ ان کی کتابوں میں سے ایک کتاب "اے ویسٹرن اویکنگ ٹو اسلام" (A Western Awakening to Islam) کافی مشہور ہے۔

جناب شیخ رحمت اللہ الفاروق اپنے اسلام لانے کے متعلق لکھتے ہیں:

"ممکن ہے میرے کچھ دوست سمجھیں کہ میں نے مسلمانوں سے متاثر ہو کر

1۔ المستشرقون والاسلام، صفحہ 52-451

2۔ ایضاً، صفحہ 453

اسلام قبول کیا ہے۔ لیکن میرے اسلام قبول کرنے کا سبب یہ نہیں۔ میرا اسلام تو کئی سالوں کے مسلسل مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ میں نے جب مسلمانوں سے اسلام کے موضوع پر گفتگو شروع کی تو مجھے اس بات سے خوشی اور قلبی سکون ملا کہ میرے خیالات اور افکار اسلام کی تعلیمات سے ہم آہنگ ہیں۔

قرآن کی تعلیمات کے مطابق انسان دین اسلام اسی صورت میں قبول کر سکتا ہے جب اس کا دل اس کی صداقت پر مطمئن ہو جائے۔ جبر و اکراہ سے کسی کو اس دین کے حلقے میں داخل نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات کا بھی یہی مفہوم ہے...... دین اسلام کی تعلیمات مروجہ عیسائیت کی نسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کے زیادہ قریب ہیں۔ کیونکہ نیکی، حلم اور وسیع النظری جو اسلام کا طرہ امتیاز ہیں، وہ مروجہ عیسائیت کی نسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کے زیادہ قریب ہیں......

حقیقت یہ ہے کہ میں اسلام قبول کرنے کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات سے دور نہیں ہوا بلکہ صحیح عیسائیت کے قریب آیا ہوں۔ اور اپنے آپ کو پہلے سے بہتر عیسائی محسوس کرتا ہوں۔ میں توقع کرتا ہوں کہ میرے سابق ہم مذہب اس مثال کی تقلید کریں گے کہ یہی میرے خیال میں بہتر رویہ ہے۔ اس اقدام سے انہیں وہی مسرت حاصل ہو گی جو عیسائیت سے دور جانے والے کے مقابلے میں اس کے قریب آنے والے کو حاصل ہوتی ہے۔"(1)

علامہ محمد اسد (پولینڈ)

ان کا پہلا نام "لیوپولڈ ویس" تھا۔ وہ 1900ء میں پیدا ہوئے۔ بائیس سال کی عمر میں مشرق وسطیٰ کا سفر کیا۔ جرمنی کے ایک اخبار "فرانکفرٹر" نے ان کو مشرق وسطیٰ کے لئے اپنا خصوصی نمائندہ مقرر کیا۔ اس منصب کی وجہ سے انہیں مشرق وسطیٰ کے مختلف علاقوں کا سفر کرنے کا موقعہ ملا۔ انہوں نے مسلمانوں کی زندگی کو بڑے قریب سے دیکھا۔ انہیں مغرب کی مشینی زندگی کی بے چینی اور خود غرضی کے مقابلے میں مسلمانوں کی زندگی میں

1۔ "لماذا اسلمنا۔ "مجموعہ مقالات لنخبۃ من رجال الفکر فی مختلف الاقطار عن سبب اعتناقھم الاسلام" (مکتبۃ البحرین)، صفحہ 55-51، نیز "ہم کیوں مسلمان ہوئے"، صفحہ 3-272

غربت کے باوجود خلوص اور بے تکلفی نظر آئی جس نے انہیں اسلام کا مطالعہ کرنے کی طرف متوجہ کیا۔

انہوں نے تفصیل سے اسلام کا مطالعہ کیا۔ اس مطالعہ نے اسلام کی حقانیت ان پر روز روشن کی طرح واضح کر دی اور انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔

قبول اسلام کے بعد وہ تقریباً چھ برس تک مدینہ منورہ اور سعودی عرب کے دیگر شہروں میں مقیم رہے۔ پھر برصغیر آ گئے اور سالہاسال شاعر مشرق علامہ اقبال کے قریب رہنے کا شرف حاصل کیا۔

قیام پاکستان کے بعد انہیں حکومت کی زیر سرپرستی ایک جدید محکمہ "اسلامی تعمیر جدید" کی تنظیم و نگرانی پر مامور کیا گیا۔ بعد میں ان کی خدمات محکمہ خارجہ کو منتقل کر دی گئیں اور ان کا تقرر وزارت خارجہ میں مشرق وسطیٰ کے افسر اعلیٰ کی حیثیت سے ہوا۔ بعد میں وہ اقوام متحدہ میں پاکستان کے مندوب بھی رہے۔

ان کا قیام پاکستان کے علاوہ مراکش میں بھی رہا۔ انہوں نے اپنی زندگی تصنیف و تالیف کے لئے وقف کر دی۔ ان کی دو کتابیں: "اسلام آن کراس روڈز" اور "اے روڈ ٹو مکہ" بہت مشہور ہیں۔

علامہ محمد اسد نے "اے روڈ ٹو مکہ" میں اپنے اسلام لانے کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

"میں اسلام کی تعلیمات میں سے کسی ایک تعلیم کو متعین نہیں کر سکتا جس نے میرے دل کو اپنی طرف مائل کیا ہو۔ اسلامی تعلیمات کے حسین اور مکمل مجموعے نے جو ایک طرف روحانی عظمتوں کا امین اور دوسری طرف عملی زندگی گزارنے کا بہترین پروگرام ہے، مجھے اپنی طرف مائل کیا۔"

علامہ محمد اسد فرماتے ہیں:

"جب اسلامی تعلیمات کی غیر محدود قوت اور عملی زندگی سے ان کی تطبیق کی صلاحیت مجھ پر منکشف ہوئی تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ آخر آج کا مسلمان اس حیات بخش اور قوت بخش نظام سے دور کیوں ہو رہا ہے؟ میں نے اس سوال کا جواب کئی مسلمانوں سے پوچھا لیکن مجھے کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا۔ یہ سوال

میرے ذہن پر یوں سوار ہوا کہ میں مسلمانوں سے اس بات پر جھگڑا شروع کر دیتا کہ وہ اپنے دین سے دور کیوں ہو رہے ہیں۔ گویا میں، جو ابھی ایک غیر مسلم تھا، مسلمانوں کے سامنے اسلام کے دفاع میں مصروف تھا۔ اور آخر کار قدرت نے راہنمائی کی اور میں نے اسلام قبول کر لیا۔"(1)

ڈاکٹر عبداللہ علاؤالدین (جرمنی)

والدین نے ڈاکٹر عبداللہ علاء الدین کو پروٹسٹنٹ طریقے کے مطابق کلیسا میں داخل کیا لیکن تثلیث اور کفارہ کے عقائد کو ان کے ذہن نے قبول نہ کیا۔ انہوں نے پادری سے ان مسائل کی وضاحت کرنے کی درخواست کی تو ان پر منکر خدا ہونے کا فتویٰ جڑ دیا گیا۔ پادریوں سے مایوس ہو کر انہوں نے حقیقت کی تلاش کے لئے مطالعہ کا سہارا لیا۔ ان کا جذبہ جستجو اتنا شدید تھا کہ وہ چوبیس گھنٹے میں صرف دو گھنٹے سوتے تھے۔ وہ خود کہتے ہیں:

"اس مسلسل مطالعہ سے میری صحت خراب ہونے لگی لیکن مجھے کچھ حاصل نہ ہوا۔ لیکن جب میں نے اپنی قوت ارادی پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیا تو رحمت ربی نے میری دستگیری اور راہنمائی کی۔ کسی جہازران کے سفرنامے کا مطالعہ کرتے ہوئے میری نظر سورۃ اخلاص اور اس کے ترجمے پر پڑی۔ میں حقیقت کو اس طرح سامنے پا کر دنگ رہ گیا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار پڑھا کہ نہ اللہ کو کسی نے پیدا کیا اور نہ ہی اللہ نے اپنا کوئی بیٹا پیدا کیا۔ یہ آیت پوری طرح میری سمجھ میں آ گئی۔ مجھے اسلام کا کوئی علم نہ تھا۔ میں نے اسلام کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے جرمنی سے استنبول تک سائیکل پر سفر کیا۔

میں نے قرآن شریف کو اس خیال سے پڑھنا شروع کیا کہ جس طرح کتاب مقدس کی غلطیاں تلاش کرتا رہا ہوں، اسی طرح اس کتاب کی غلطیاں بھی ڈھونڈوں گا۔ لیکن جوں جوں اس کی تلاوت اور مطالعہ سے مستفیض ہوتا گیا، میرے ایمان میں اضافہ ہوتا گیا کہ یہی وہ آخری اور سچی ہدایت ہے جس کی مجھے تلاش تھی اور مجھے یقین ہو گیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ میں 1954ء میں استنبول میں مسلمان ہو گیا۔

1۔ "ہم مسلمان کیوں ہوئے"، صفحہ 200-194، نیز "لمعات اسلام"، صفحہ 61-56

الحمد للہ کہ مجھے یہ دولت نصیب ہوئی۔"(1)

ڈاکٹر عمر رولف ایرنفلس (Dr. Umar Rolf Ehrenfels)

ان کا تعلق آسٹریا سے تھا۔ پہلی عالمی جنگ چھڑی تو ڈاکٹر عمر رولف ابھی بچے تھے۔ جنگ نے ان کو ترکوں کے حالات جاننے کی طرف مائل کیا۔ انہوں نے ترکوں اور عربوں کے متعلق کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کا مطالعہ شروع کیا۔ پھر وہ اپنے والد اور ان کے ایک دوست کی نگرانی میں مشرقی مذاہب اور مشرقی زبانوں کی تعلیم میں باقاعدہ مشغول ہو گئے۔

بعد میں انہوں نے اپنے ایک بہترین دوست کے ہمراہ ترکی کا سفر کیا۔ ترکوں کے برتاؤ نے انہیں بہت متاثر کیا۔ وہ اسلام قبول کئے بغیر مسجدوں میں چلے جاتے اور مسلمانوں کے ساتھ نماز باجماعت میں شامل ہو جاتے۔ مسلمانوں کی زندگی کے تفصیلی مطالعہ اور ان کے رویہ نے ان کو یہ رائے قائم کرنے پر مجبور کر دیا کہ اسلام اپنے اندر ہر قسم کے عصری مسائل کا مقابلہ کرنے کی سکت رکھتا ہے۔ یہ وہ نظام زندگی ہے جو انسان کی فطرت کے عین مطابق ہے اور توہمات کی بجائے سائنسی بنیادیں رکھتا ہے۔

ترکی سے اپنے وطن واپس آکر انہوں نے ترکی کے بارے میں ایک کتاب لکھی جو برلن کے رسالے "مسلم ریویو" میں قسط وار چھپی۔ اسی رسالے کی وساطت سے ان کی ملاقات سیالکوٹ کے ایس۔ این۔ عبداللہ سے ہوئی جن کے ساتھ انہوں نے برصغیر کا سفر کیا۔ وہ کہتے ہیں:

"یہ سفر میری زندگی کا فیصلہ کن موڑ ثابت ہوا اور میں نے بالآخر وہ فیصلہ کر ہی لیا جس کی طرف قدرت ایک مدت سے میری راہنمائی کر رہی تھی۔ اسلام کی مندرجہ ذیل باتوں نے مجھے خصوصی طور پر اپنی طرف متوجہ کیا:

1۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ تمام انبیائے کرام ایک ہی پیغام لے کر آتے رہے۔ روشنی کا منبع ہمیشہ ایک ہی رہا ہے اور ہر نبی نے نسل انسانی کے سامنے جو پروگرام پیش کیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ خالق کائنات کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جائے۔

2۔ اسلام سارے مذاہب کی کامل ترین شکل ہے۔

3۔ حضور ﷺ کے بے مثال کارناموں کے باوجود آپ کو مافوق الفطرت

1۔ "ہم کیوں مسلمان ہوئے"، صفحہ 51-149

حیثیت نہیں دی جاتی۔

4۔ اسلام قبول کرنے والا اپنے پرانے مذہب کی کسی سچائی کی نفی نہیں کرتا۔

5۔ اسلام انسانی اخوت کا علمبردار ہے اور نسلی یا لسانی تفریق کا قائل نہیں۔

6۔ اسلام پوری انسانیت کے لئے سراپا رحمت ہے۔" (1)

ڈاکٹر غریبیہ (فرانس)

ڈاکٹر غریبیہ کو بحری سفروں اور کتابوں کے مطالعہ کا انتہائی شوق تھا۔ اسی شوق نے انہیں آخر کار ساحل مراد تک پہنچادیا۔

وہ اپنے قبول اسلام کے متعلق بتاتے ہوئے کہتے ہیں:

"میں قرآن حکیم کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ میری نظریں سورۂ نور کی ایک آیت پر جم گئیں۔ وہ آیت یہ تھی۔

اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ یَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍؕ اِذَاۤ اَخْرَجَ یَدَهٗ لَمْ یَكَدْ یَرٰىهَاؕ وَ مَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ۠ (2)

یا (اعمال کفار) ایسے اندھیروں کی طرح ہیں جو گہرے سمندر میں ہوتے ہیں۔ چھا رہی ہوتی ہے اس پر موج۔ اس کے اوپر اور موج (اور) اس کے اوپر بادل (تہ در تہ) اندھیرے ہیں ایک دوسرے کے اوپر۔ جب وہ نکالتا ہے اپنا ہاتھ تو نہیں دیکھ پاتا اسے۔ اور (سچ تو یہ ہے کہ) جس کے لئے اللہ تعالیٰ نور نہ بنائے تو اس کے لئے کہیں نور نہیں۔

جب میں نے یہ آیت پڑھی تو میرا دل تمثیل کی عمدگی اور انداز بیان کی واقعیت سے بے حد متاثر ہوا اور میں نے خیال کیا کہ محمد (ﷺ) ضرور ایسے شخص ہوں گے جن کے دن رات میری طرح سمندروں میں گزرے ہوں گے۔ لیکن اس خیال کے باوجود مجھے حیرت تھی اور پیغمبر اسلام (ﷺ) کے کمال اسلوب کا اعتراف تھا کہ انہوں نے گمراہوں کی آوارگی اور ان کی جدوجہد کی بے حاصلی کو

1۔ "ہم کیوں مسلمان ہوئے"، صفحہ 72-168

2۔ سورۂ نور: 40

کیسے مختصر مگر بلیغ اور جامع الفاظ میں بیان کیا ہے۔ گویا وہ خود رات کی تاریکی، بادلوں کی دبیز سیاہی اور موجوں کے طوفان میں ایک جہاز پر کھڑے ہیں اور ایک ڈوبتے ہوئے شخص کی بدحواسی کو دیکھ رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ سمندری خطرات کا کوئی بڑے سے بڑا ماہر بھی اس قدر گنتی کے لفظوں میں ایسی جامعیت کے ساتھ خطرات بحر کی صحیح کیفیت بیان نہیں کر سکتا۔

لیکن اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد مجھے معلوم ہوا کہ محمد عربی (ﷺ) امی محض تھے اور انہوں نے زندگی بھر کبھی سمندر کا سفر نہیں کیا تھا۔

اس انکشاف کے بعد میرا دل روشن ہو گیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ یہ محمد (ﷺ) کی آواز نہیں بلکہ ان کے خدا کی آواز ہے جو رات کی تاریکی میں ہر ڈوبنے والے کی بے حاصلی کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔

میں نے قرآن کا دوبارہ مطالعہ کیا اور خصوصاً متعلقہ آیت کا خوب غور سے تجزیہ کیا۔ اب میرے سامنے مسلمان ہوئے بغیر کوئی چارہ کار ہی نہ تھا۔ چنانچہ میں نے شرح صدر کے ساتھ کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا۔"(1)

ڈاکٹر خالد شیلڈرک (Dr. Khalid Sheldrick)

ڈاکٹر خالد شیلڈرک کا تعلق انگلستان سے تھا۔ یہ ایک مشہور اور باصلاحیت صحافی تھے۔ انہوں نے عیسائیت کے مذہبی ماحول میں پرورش پائی لیکن عیسائیت کے غیر عقلی عقائد انہیں مطمئن نہ کر سکے۔ انہوں نے مختلف مذاہب کا مطالعہ کیا۔ اسلام کے متعلق مستشرقین کی کتابیں پڑھیں جو اسلام کے خلاف الزامات سے پر تھیں اور یہی کتابیں ان کے لئے ہدایت کا سبب بن گئیں۔ وہ خود فرماتے ہیں:

"مذاہب عالم پر انگلستان کی لائبریریوں میں مجھے جتنی کتابیں بھی ملیں، میں نے وہ پڑھ ڈالیں۔ اس مرحلے میں ایک عجیب انکشاف ہوا۔ وہ یہ کہ ان کتابوں میں یہودیت، ہندومت اور بدھ مت وغیرہ کے بارے میں تو صرف معلومات ہی تھیں مگر اسلام کا جہاں بھی ذکر آتا کوئی بھی مصنف طعن و تشنیع کے بغیر نہیں گزرتا تھا۔ اسلام کے بارے میں ان کتابوں کا ماحصل یہ تھا کہ اسلام بذاتہ کوئی مستقل

1۔ "ہم کیوں مسلمان ہوئے"، صفحہ 9-186

مذہب نہیں ہے بلکہ وہ محض عیسائی لٹریچر سے ماخوذ چند اقوال کا مجموعہ ہے۔ قدرتاً میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر واقعی اسلام ایسا بے حقیقت مذہب ہے جیسا کہ ہمارے مصنفین ظاہر کرتے ہیں تو پھر اس پر اس قدر اعتراضات، طعن و تشنیع اور شور و واویلا کی اتنی ضرورت کیوں ہے اور اس کے مقابلہ و مدافعت پر اتنا زور کیوں دیا جاتا ہے؟

اس احساس نے غور و فکر کی راہیں مزید کھول دیں اور یہ بات میرے دل میں بیٹھتی چلی گئی کہ اگر عیسائی مصنفین مذہب اسلام سے خائف نہ ہوتے اور اس کی قوت و حرکت سے مرعوب نہ ہوتے تو اس سے مقابلہ و مجادلہ کی اس قدر فکر نہ کرتے۔ نہ اٹھتے بیٹھتے اس کی تذلیل کے درپے ہوتے۔

اب میں نے طے کر لیا کہ اسلام پر خود مسلمانوں کی کتابیں پڑھوں گا اور اسے اس کے صحیح آئینے میں دیکھنے کی کوشش کروں گا۔ چنانچہ میں نے سارا وقت اسلام کو پڑھنے اور سمجھنے میں لگا دیا اور خدا کا شکر ہے کہ حقیقت تک پہنچنے میں مجھے زیادہ دیر نہ لگی۔

میں نے خوب دیکھ لیا کہ اسلام کے خلاف اعتراضات کی جو بوچھاڑ کی جاتی ہے وہ قطعی بے بنیاد ہے۔ اسلام ہی دین فطرت ہے اور سلامت طبع رکھنے والا کوئی فرد اس سے زیادہ عرصہ تک دور نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ میں نے باقاعدہ اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے اپنے قبول اسلام کی اطلاع اپنے والد کو دی۔ عجیب بات یہ ہے کہ انہیں میرے عیسائیت کو خیرباد کہنے سے تو کوئی رنج نہ ہوا مگر میرے قبول اسلام کی خبر سے ان کے دل پر سخت چوٹ لگی اور ان کے ساتھ خاندان نے بھی شدید صدمہ محسوس کیا۔"(1)

محترمہ مریم جمیلہ (امریکہ)

محترمہ مریم جمیلہ امریکہ کے ایک یہودی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ قبول اسلام سے پہلے بھی وہ پاکیزہ اور باوقار زندگی کی حامل تھیں۔ انہوں نے مسلمان ہونے کے بعد تصنیف و تالیف کے میدان میں اسلام کی خدمت میں زبردست کوششیں کی ہیں۔ ان کی کئی

1۔"ہم کیوں مسلمان ہوئے"، صفحہ 89-85

کتابیں مشہور ہیں جن میں "اسلام اینڈ ماڈرنزم" اور "اسلام ان تھیوری اینڈ پریکٹس" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

بچپن میں موسیقی کے شوق نے انہیں عربی موسیقی کا دلدادہ بنا دیا۔ وہ عربی موسیقی کے ریکارڈ اکٹھے کرتیں اور انہیں سن کر ان کو انتہائی سکون میسر آتا۔

ان ریکارڈز میں سے ایک میں قرآن حکیم کی سورۃ مریم کی تلاوت بھی تھی۔ اس تلاوت کو سن کر وہ جھوم اٹھتیں۔ وہ نہ عربی گانوں کو سمجھ سکتی تھیں اور نہ ہی قرآن حکیم کو لیکن اس کے باوجود وہ ان کو سن کر قلبی سکون محسوس کرتیں۔

اسی شوق نے انہیں قرآن حکیم کے مطالعے کی طرف متوجہ کیا۔ انہیں جارج سیل کا ترجمہ قرآن ملا۔ انہوں نے اس ترجمہ کو پڑھا لیکن اس کے مسلسل مطالعہ کے باوجود کچھ سمجھ نہ سکیں۔ اس کے بعد خوش قسمتی سے انہیں "محمد مارمڈیوک پکتھال" کا ترجمہ قرآن مل گیا۔ اس ترجمہ قرآن کے مطالعہ کے متعلق ان کے جو تاثرات تھے انہیں وہ خود یوں بیان کرتی ہیں:

"جوں ہی میں نے اس کتاب کو کھولا، ایک زبردست انکشاف نے میرا استقبال کیا۔ زبان کا حسن اور بیان کی فصاحت مجھے اپنے ساتھ بہالے گئی۔ دیباچے کے پہلے ہی پیرے میں مترجم نے بہت خوب صورت طریقے سے وضاحت کی ہے کہ یہ قرآنی مفاہیم کو، جیسا کہ عام مسلمان اسے سمجھتے ہیں، انگریزی زبان میں پیش کرنے کی ایک کوشش ہے۔ اور جو شخص قرآن پر یقین نہیں رکھتا، اس کے ترجمے کا حق ادا نہیں کر سکتا...... میں فوراً سمجھ گئی کہ جارج سیل کا ترجمہ قرآن ناگوار کیوں تھا...... دراصل جارج سیل اٹھارہویں صدی کا عیسائی عالم اور مبلغ تھا، مگر سخت متعصب اور تنگ نظر۔ اس کے ترجمے کی زبان مغلق ہے اور حاشیے بلا ضرورت۔ سیاق و سباق سے ہٹ کر بیضاوی اور زمخشری کے حوالے دیئے گئے ہیں تاکہ عیسوی نقطہ نظر سے انہیں غلط ثابت کیا جا سکے۔"

قرآن حکیم کے مطالعہ کے بعد مریم جمیلہ نے کتب احادیث خصوصاً "مشکوٰۃ المصابیح" کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ اس کے مطالعہ سے وہ جس نتیجے پر پہنچیں وہ ان کے اپنے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔ کہتی ہیں:

"مشکوۃ کے مطالعے کے بعد مجھے اس حقیقت میں ذرہ برابر شبہ نہ رہا کہ قرآن حکیم وحی الٰہی ہے۔ اس بات نے اس امر کو تقویت دی کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور یہ محمد ﷺ کی دماغی کاوش کا نتیجہ نہیں۔ یہ ایک ابدی حقیقت ہے کہ قرآن زندگی کے بارے میں تمام بنیادی سوالات کا ایسا مسکت، ٹھوس اور اطمینان بخش جواب دیتا ہے جس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔"

محترمہ مریم جمیلہ نے برسوں کے مطالعہ کے بعد، اور اسلام کے عقائد، عبادات اور دیگر تعلیمات کو پوری طرح پرکھ کر اور دیگر ادیان کی تعلیمات سے ان کا موازنہ کر کے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔ قبول اسلام کے بعد وہ امریکہ سے پاکستان منتقل ہو گئیں اور اپنی زندگی کو اپنے دین کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔(1)

وہ لوگ جنہوں نے یورپ اور امریکہ میں آنکھ کھولی، عیسائی اور یہودی گھرانوں میں پروان چڑھے، اسلام کے متعلق انہیں بچپن سے یہ تصور دیا گیا کہ اسلام عیسائیت اور یہودیت کی بگڑی ہوئی شکل کے سوا کچھ نہیں، جن کو بتایا گیا کہ دنیا کی ہر برائی دین اسلام میں موجود ہے اور یہ دین اپنے پیروکاروں کو درندوں سے بدتر بنا دیتا ہے، ایسے لوگ مسلمان ہوئے، ایک نہیں ہزاروں اور یہ عمل مسلسل جاری ہے۔

اس اسلام دشمن ماحول میں اسلام قبول کرنے والوں میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔ عیسائیت اور یہودیت کے کٹر پیروکار بھی ہیں اور ملحد بھی۔ سائنس کی دنیا کے عالمی شہرت یافتہ لوگ بھی ہیں اور بحر علم وحکمت کے شناور بھی۔ سیاستدان بھی ہیں اور دفاعی افواج سے تعلق رکھنے والے بھی۔

ایسے خوش نصیبوں کی تعداد بہت ہے۔ ان کے حالات پر کئی مسلمان مولفین نے کتابیں تالیف کی ہیں۔ ہم نے ان میں سے چند ایک کے نام اور ان کا انتہائی مختصر تعارف صرف نمونے کے لئے ذکر کیا ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ صرف انہی لوگوں کا ذکر کیا جائے جنہوں نے اسلامی ادب کے وسیع مطالعہ کے بعد اسلام قبول کیا ہو۔ کیونکہ ہماری بحث مستشرقین سے ہے۔ اور یہ لوگ جب مغرب کی سرزمین پر بیٹھ کر اسلام کے مطالعہ کی طرف مائل ہوئے بلکہ ان میں سے اکثر نے اسلام کے مطالعہ سے پہلے دیگر ادیان مشرق

1۔ "ہم کیوں مسلمان ہوئے"، صفحہ 46-235

کی تعلیمات کا مطالعہ کیا، تو اس وقت وہ لوگ مستشرق کی ہر تعریف کے لحاظ سے مستشرق تھے۔ لیکن اب جب کہ انہوں نے کلمہ توحید پڑھ کر مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا ہے تو اب وہ مستشرق نہیں بلکہ ملت اسلامیہ کا جزو لاینفک ہیں۔

اسلام کی دہلیز پر جبین فرسائی کرنے والوں میں صرف اہل مغرب ہی نہیں بلکہ مشرقی اقوام کے مذاہب ہندومت، بدھ مت اور سکھ مذہب کے پیروکاروں نے بھی مسلسل مطالعہ کے بعد اسلام قبول کرنے کی سعادت حاصل کی لیکن ان میں سے کسی کا ذکر یہاں ہم نے دانستہ نہیں کیا۔

مستشرقین صدیوں سے لوگوں کو اسلام سے متنفر کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے بے پناہ وسائل کو اس مکروہ مقصد کیلئے استعمال کیا ہے لیکن ان کی ان مساعی کے باوجود ان کے اپنے مذاہب اور ان کی اپنی اقوام کے لوگ دھڑا دھڑ اسلام قبول کر رہے ہیں۔ کوئی شخص قرآن حکیم میں کسی بحری سفر کے تجربات کا خوب صورت بیان دیکھتا ہے تو وجد میں آجاتا ہے۔ کسی کو مستشرقین کا اسلام کے خلاف غیر معقول اور معاندانہ رویہ حقیقت کی جستجو کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ مستشرقین جس شمع کو بجھانے کیلئے ہر حربہ استعمال کرتے ہیں اس کی ضو میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور ان کے اپنے ظلمت کدے بھی اس کی تنویرات سے محفوظ نہیں۔

مستشرقین کی ان کوششوں اور ناکامیوں کو قدرت نے چودہ سو سال پہلے کس خوب صورت انداز میں بیان فرما دیا تھا:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ ؕ (1)

"بے شک کافر خرچ کرتے ہیں اپنے مال تاکہ روکیں (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے۔ اور یہ آئندہ بھی (اسی طرح) خرچ کریں گے۔ پھر ہو جائے گا خرچ کرنا ان کے لئے باعث حسرت و افسوس۔ پھر وہ مغلوب کر دیئے جائیں گے۔"

1۔ سورۃ الانفال: 36

مستشرقین
کے مقاصد
اور اُن کا طریقہ کار

مستشرقین کے مقاصد اور ان کا طریقہ کار

حضور ﷺ نے ایک بار حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ میں تورات کا ایک ورق دیکھ کر ان کو تلقین کی تھی کہ وہ اپنی توجہ قرآن حکیم پر مرکوز رکھیں۔

حضور ﷺ کے اس ارشاد گرامی کی وجہ یہ تھی کہ آپ کو یقین تھا کہ قرآن حکیم مسلمانوں کی دینوی اور اخروی کامیابی کا ضامن ہے۔ اور وہ تمام علوم جو انسان کو دیگر الہامی کتابوں کے مطالعہ سے حاصل ہو سکتے ہیں وہ قرآن حکیم میں موجود ہیں۔ جب کہ دیگر الہامی کتابیں، گو وہ علم و معرفت کے اسی منبع سے پھوٹی ہیں جہاں سے قرآن نازل ہوا ہے، لیکن ان کتابوں کو ان کے ماننے والوں نے اپنی طرف سے بے شمار تبدیلیاں اور تحریفات کر کے حق و باطل کا ملغوبہ بنا دیا ہے۔ اس لئے ان کتابوں سے ایسے علم کا حصول ممکن نہیں جو یقینی ہو اور اس پر اطمینان قلب کے ساتھ اعتماد کیا جا سکے۔

فطری طور پر بھی انسان اسی چیز کی تحقیق و تفحص کے لئے اپنی صلاحیتیں، اپنے اوقات اور اپنے وسائل صرف کرتا ہے جس کے متعلق اسے علم ہو کہ اس چیز میں خیر کے خزانے جمع ہیں جنہیں محنت اور جد وجہد سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ کوئی کتاب جس کے متعلق یقین ہو کہ یہ بے سود ہے، اس کتاب کو کوئی نہیں پڑھتا۔ کوئی نظریہ حیات جس کی ناکامی ثابت ہو چکی ہو اس پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔ کوئی علاقہ جو ہر قسم کے قدرتی وسائل سے محروم ہو، اسے کوئی اپنی توجہات کا مرکز نہیں بناتا۔ کوئی قوم جو جہالت، کاہلی، علمی بے مائیگی اور ذہنی و فکری ناپختگی کا شکار ہو، اس کی تاریخ یا تہذیب کسی انسان کی توجہ کو اپنی طرف مبذول نہیں کر سکتی۔

انسان حیرت کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے، جب یہ دیکھتا ہے کہ مستشرقین قرآن حکیم کو (نعوذ باللہ) ایک لغو کتاب سمجھتے ہیں، حضور ﷺ کی طرف ہر ممکن نقص اور برائی کو منسوب کرتے ہیں، دین اسلام کو عیسائیت اور یہودیت کی بگڑی ہوئی شکل سمجھتے ہیں، امت مسلمہ کو غیر مہذب اور پسماندہ قوم سمجھتے ہیں، اقوام مشرق کو پیدائشی طور پر فکری

صلاحیتوں سے عاری اقوام سمجھتے ہیں، لیکن اسلام اور مشرق کے متعلق اس منفی رویے کے باوجود صدیوں سے مستشرقین کے بہترین ذہن سب کچھ چھوڑ کر انہی موضوعات کی تحقیق میں اپنی زندگیاں صرف کر رہے ہیں۔ جن موضوعات کی طرف کسی خیر کو منسوب کرنا وہ مغرب کی توہین سمجھتے ہیں، ان موضوعات پر انہوں نے لاکھوں کی تعداد میں کتابیں لکھی ہیں جن سے یورپ اور امریکہ کی لائبریریاں بھری پڑی ہیں۔ وہی زبانیں اور تہذیبیں ان کی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جا رہی ہیں جن کو وہ ہر خوبی سے خالی سمجھتے ہیں۔ فکر و نظر کی صلاحیتوں سے محروم مسلمانوں کی لکھی ہوئی کتابیں یورپ اور امریکہ میں چھپ رہی ہیں، ان پر تحقیق ہو رہی ہے اور ان سے استفادے کو آسان بنانے کے لئے اشاریے اور فہرستیں مرتب ہو رہی ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس اتنے بڑے تضاد کی وجہ کیا ہے؟

چاہئے تو یہ تھا کہ جب اہل مغرب اسلام کو عیسائیت کی محض ایک بگڑی ہوئی شکل سمجھتے تھے تو اسے کوئی اہمیت ہی نہ دیتے۔ اگر حضور ﷺ کے متعلق ان کا تصور وہی تھا جو ان کی تحریروں میں نظر آتا ہے تو وہ آپ کو اپنی ان گنت تحریروں کا موضوع نہ بناتے۔ اگر وہ سامی نسل کو آریائی نسل کے مقابلے میں کم صلاحیتوں کی مالک نسل سمجھتے تھے، تو اپنی اعلیٰ نسل کے ماضی و حال پر تحقیق کو چھوڑ کر سامی نسل کی زبانوں، تہذیبوں اور دیگر مظاہر حیات کے مطالعے کے لئے اپنی زندگیاں صرف نہ کرتے۔

کم از کم ایک مسلمان کے لئے تو یہ رویہ ناقابل فہم ہے کیونکہ اسے اس کا دین یہ تعلیم دیتا ہے مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهٗ مَا لَا يَعْنِيْهِ کہ اسلام کا حسن یہی ہے کہ انسان کسی فضول اور لایعنی کام کی طرف توجہ ہی نہ دے۔

ہمارے بعض مسلمان بھائی مستشرقین کے شکر گزار نظر آتے ہیں کہ انہوں نے ہماری زبان، تہذیب اور تاریخ کا مطالعہ کر کے اور ہمارے علمی سرمائے کو محفوظ کر کے ہم مسلمانوں پر بہت بڑا کرم فرمایا ہے۔ اس قسم کے مسلمانوں کے نزدیک اہل مغرب کا مشرقی تہذیبوں، مشرقی زبانوں خصوصاً دین اسلام، عربی زبان اور اسلامی تاریخ و تہذیب کی طرف متوجہ ہونا ان کی وسیع النظری، پسماندہ اقوام کیلئے ہمدردی، علم دوستی اور بے لاگ تحقیق کے جذبے کی دلیل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قومیں جب مر جاتی ہیں تو ان کے افراد کی سوچ کا انداز یہی بن جاتا ہے۔ دشمن انہیں دوست نظر آتے ہیں۔ ڈاکو ان کا گھر لوٹ لینے کے بعد ان کے لئے ہمدردی کے رنگ میں رنگے ہوئے دو مصنوعی بول بول کر ان سے رحم دلی کا سرٹیفکیٹ وصول کر لیتے ہیں۔

یہی کچھ ہمارے ساتھ ہوا ہے۔ علامہ اقبال ایک مردہ قوم کے زندہ فرد تھے۔ انہوں نے اپنے آباؤ اجداد کے علمی ورثے کو یورپ کے کتب خانوں میں دیکھا تھا تو ان کی زبان سے اس سرمائے کو لوٹ کر لے جانے والوں کے لئے جذبات تشکر کا اظہار نہیں ہوا تھا بلکہ وہ اپنی قوم کی بے حسی اور بے بسی کے سبب اپنے ورثے کو اغیار کے تصرف میں دیکھ کر خون کے آنسو روئے تھے۔

مستشرقین کے متعلق بعض مسلم زعماء اور اصحاب قلم کے اس رویے کی وجہ سے ہماری قومی سوچ یہ بن گئی ہے کہ ہمارے نزدیک قابل اعتماد بات ہوتی ہی وہ ہے جو کسی مستشرق کے قلم سے نکلی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب آپ مستشرقین کو اپنا مخلص قرار دے لیتے ہیں تو پھر ان کی کسی تحریر کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھنا ممکن ہی نہیں رہتا۔

ہماری اس سوچ کی وجہ سے ہمارے عوام وخواص کی اکثریت ان اصل عزائم و مقاصد سے بے خبر ہے جن کے تحت مستشرقین علوم اسلامیہ کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ اس صورت حال سے مستشرقین زبردست فائدہ اٹھا رہے ہیں اور وہ مسلمانوں کی طرف سے کسی قسم کے ردعمل کے خطرے کے بغیر ان کے دین، ان کے معزز رسول ﷺ اور ان کی ہر مقدس شے پر مسلسل وار کر رہے ہیں۔

برصغیر میں تو صورت حال آج بھی وہی ہے لیکن پوری ملت اسلامیہ کی یہ کیفیت نہیں۔ جامعہ الازہر کی برکت سے اب عربوں میں ایسے لوگ میدان میں آگئے ہیں جنہوں نے مستشرقین کو ان کے اصل روپ میں دیکھا اور پھر پوری بے باکی سے ملت کو ان کے حقیقی عزائم سے آگاہ کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں نہ تو معذرت خواہانہ رویہ اپنایا گیا ہے اور نہ ہی وہ مستشرقین کے اصل عزائم سے پردہ اٹھانے میں کسی قسم کا خوف محسوس کرتے ہیں۔

مستشرقین گو اپنے اصل ارادوں کو خفیہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ان کے پروگراموں، ان کی تحریروں اور کانفرنسوں وغیرہ میں ان کے بیانات سے بخوبی اندازہ لگایا جا

سکتا ہے کہ یہ اہل مغرب جو مشرق خصوصاً اسلام پر اتنی زیادہ توجہ دیتے ہیں ان کے اصل مقاصد کیا ہیں۔

اس باب میں ہم تحریک استشراق کے مقاصد اور اس طریقہ کار کو بیان کریں گے جو مستشرقین ان مقاصد کے حصول کے لئے اختیار کرتے ہیں۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ تحریک استشراق میں مختلف مذاہب اور نظریات سے تعلق رکھنے والے لوگ جمع ہیں۔ ان کا تعلق ایسے ممالک سے ہے جن کے مفادات ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ ان کے کئی طبقات ہیں اور ہر طبقے کا کام دوسرے طبقے کے کام سے قطعی طور پر مختلف نظر آتا ہے۔ اسی طرح اس تحریک کے لوگ جن مقاصد کے تحت مشرقی زبانوں، تہذیبوں، مذاہب، قوموں اور علاقوں پر توجہ دیتے ہیں، وہ مقاصد بھی مختلف اور متعدد ہیں۔

اختصار کے طور پر ہم مستشرقین کے متعدد مقاصد کو مندرجہ ذیل چار عنوانات کے تحت بیان کر سکتے ہیں:

1۔ دینی مقاصد 2۔ علمی مقاصد 3۔ اقتصادی مقاصد 4۔ سیاسی مقاصد

دینی مقاصد

گو آج تحریک استشراق ایک علمی تحریک کے طور پر متعارف ہے لیکن اس تحریک کی تاریخ کے طالب علم کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں کہ اس تحریک کا آغاز جس مقصد کے تحت ہوا تھا وہ مقصد دینی تھا۔

ہلال و صلیب کے درمیان صدیوں جو معرکہ آرائی رہی اس کے بنیادی اسباب دینی تھے اور استشراق کی تحریک چونکہ اس طویل کشمکش کا حصہ ہے اس لئے یہ کہنا غلط نہیں کہ اس تحریک کا آغاز جن مقاصد کے تحت ہوا تھا وہ مقاصد بھی دینی تھے۔

ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی میں اسلام جس سرعت کے ساتھ پھیلا تھا اور جس سرعت کے ساتھ اسلام نے لاتعداد انسانوں، متعدد علاقوں اور کئی تہذیبوں کو مسخر کیا تھا، وہ یہود و نصاریٰ کیلئے لمحہ فکریہ بن گئی تھی۔ انہوں نے سوچنا شروع کر دیا تھا کہ اگر اسلام کی اشاعت اسی رفتار سے جاری رہی تو ساری دنیا پر توحید کا پرچم لہرانے لگے گا، صلیبیں ٹوٹ جائیں گی، گرجوں کی گھنٹیاں خاموش ہو جائیں گی اور بنو اسرائیل کی قوم، جو صدیوں نبوت و

حکومت کے عظیم مناصب پر فائز رہی تھی وہ نہ صرف عظمتوں سے محروم ہو جائے گی بلکہ اس کا وجود بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔

یہ خوف ان کے دلوں میں اس لئے پیدا ہوا کہ انہوں نے اس جرأت، حوصلے اور ایثار کے مظاہرے بارہا اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے جو قرآن حکیم اور دین اسلام نے مسلمانوں کے دلوں میں پیدا کر دیا تھا۔

ان کے سامنے اپنی قومی بقا کا مسئلہ تھا۔ وہ خاموشی سے اس عمل کو نہیں دیکھ سکتے تھے کہ اسلام کی حدود پھیلتی جائیں، یہودیت اور عیسائیت کا دائرہ تنگ ہو تا جائے اور آخر کار ساری دنیا کی فضائیں نعرہ توحید کی صداؤں سے گونجنے لگیں۔

ان خطرات کے پیش نظر یہود و نصاریٰ نے اسلام کے راستے میں بند باندھنے کی کوششیں کیں۔ یہود و نصاریٰ کا اسلام اور مشرق کے علوم کی طرف متوجہ ہونا اسلام کے راستے میں بند باندھنے کی کوششوں کا ہی حصہ تھا۔ علوم اسلامیہ کی طرف متوجہ ہوتے وقت اپنے دین کے حوالے سے تین مقاصد ان کے پیش نظر تھے:

1۔ دین اسلام کو دنیا کی اقوام میں عموماً اور یہودی و عیسائی اقوام میں خصوصاً، پھیلنے سے روکا جائے۔

2۔ مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لئے تگ و دو کی جائے۔

3۔ دین کے حوالے سے عیسائیوں کے عربی زبان اور مشرقی علوم کی طرف متوجہ ہونے کی تیسری وجہ یہ تھی کہ ذہنی بیداری کے زمانے میں نصرانیت کے حلقوں میں بعض ایسے لوگ ظاہر ہوئے جنہوں نے اپنے مذہب کے روایتی عقائد کو خلاف عقل قرار دیا۔ انہوں نے ضروری سمجھا کہ اصل عیسوی عقائد معلوم کرنے کے لئے کتاب مقدس کے یورپی زبانوں میں ترجموں پر اعتماد کی بجائے عبرانی زبان کے نسخوں پر اعتماد کیا جائے۔

کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں فرقے اس کام کی طرف متوجہ ہوئے۔ "یوحنا کلیفن" اور لوتھر وغیرہ اس کام میں پیش پیش تھے۔ لوتھر نے جب کلیسا کے خلاف آواز اٹھائی تو اس کی دعوت کا پہلا مطالبہ یہ تھا کہ تورات کو اس کی اصل زبان عبرانی میں پڑھا جائے۔(1)

1۔ "الاستشراق وجہ للاستعمار الفکری"، صفحہ 83-82

چونکہ عبرانی زبان اس وقت ایک زندہ زبان کے طور پر کہیں مروج نہ تھی اور عبرانی اور عربی زبانیں ایک دوسری کے بالکل قریب تھیں، اس لئے ان حالات میں عبرانی زبان کو سیکھنے کے لئے عربی زبان کا سیکھنا ضروری تھا۔

طریقہ کار

مندرجہ بالا دینی مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے اہل کلیسا نے انتہائی غور و تدبر کے ساتھ منصوبہ بندی کی۔ اشاعت اسلام کے راستے میں بند باندھنا، عیسائیت کو پھیلانا اور صدیوں سے مروج بائبل کی تعلیمات کا اصل عبرانی زبان کی تورات سے موازنہ کر کے اس کی غلطیوں کی تصحیح کرنا، تینوں ایسے مقاصد تھے جن کیلئے عربی زبان کا جاننا ضروری تھا۔

یہی وجہ تھی کہ یورپ اور دنیائے عیسائیت کے طول و عرض میں ایسے اداروں کا جال بچھ گیا جن میں عربی زبان کی تدریس کا بندوبست تھا۔ راجر بیکن اور ریمنڈ لل جیسے عیسائی زعما اس حقیقت سے آشنا ہو چکے تھے کہ عربی سیکھے بغیر علم کا حصول ممکن نہیں اور علم کے بغیر مسلمانوں سے مقابلہ کرنے اور انہیں نیچا دکھانے کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

اپنے اسی عقیدے کی بنا پر انہوں نے اپنے ابنائے وطن و ملت کو اس بات کا احساس دلایا کہ وہ عربی زبان کی اہمیت کو محسوس کریں اور اس کی تدریس کا بندوبست وسیع پیمانے پر کریں۔ ایسے ہی لوگوں کی کوششوں کے نتیجے میں فیناکی کلیسائی کونسل نے 1311ء میں عربی کی تدریس کا انتظام کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت سے لے کر آج تک یورپ کے ممالک عربی زبان کی تدریس کی کوششوں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

جہاں تک کتاب مقدس میں اصلاح کی کوششوں کا تعلق ہے، اس کے لئے دنیائے عیسائیت اس بات پر مجبور تھی کہ وہ مشرق خصوصاً ممالک اسلامیہ کے ان حالات کا معروضی جائزہ لیں جو بائبل کے بیانات کی تفسیر کیلئے مفید ثابت ہو سکیں۔

اس کام کے لئے سطحی نہیں بلکہ ٹھوس علم کی ضرورت تھی۔ جن لوگوں نے علوم شرقیہ میں ٹھوس قابلیت حاصل کی، عربی کتابوں کو یورپی زبانوں میں منتقل کیا، ان کتابوں کی طباعت کا بندوبست کیا، ان سے استفادے کو آسان بنانے کے لئے مختلف کوششیں کیں، ان کے پیش نظر دیگر کئی مقاصد کے علاوہ ایک مقصد یہ بھی تھا۔

کتاب مقدس کی اصلاح کے لئے انہوں نے صرف عربی زبان سیکھنے کو ہی کافی نہیں

سمجھا بلکہ اس مقصد کے لئے انہوں نے ممالک اسلامیہ میں باقاعدہ مہمیں بھیجیں جن کا مقصد مشرقی علاقوں میں ان آثار قدیمہ کو تلاش کرنا تھا جن کا ذکر بائبل میں ہے۔ اس کام کیلئے عیسائی اور یہودی دونوں قومیں سرگرم عمل ہیں۔ اس قسم کی مہموں کے علاوہ کھدائیوں کے ذریعے ایسے آثار تلاش کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں جن کے ذریعے بائبل کے بیانات کی تصدیق ہوسکے۔

اس مقصد کے لئے ایک مہم ممالک شرقیہ میں 1761ء سے لے کر 1767ء تک سرگرم عمل رہی۔ اس مہم کا تعلق ڈنمارک سے تھا۔ تحریک استشراق کے مورخین اس مہم کو "رحلہ نیبھر" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس مہم کے متعلق کوپن ہیگن پوسٹ نے اپنی 20-1-1761 کی اشاعت میں لکھا کہ اس مہم کا مقصد قیمتی مشرقی مخطوطات کو جمع کرنا ہے تاکہ ایک طرف تو معلومات عامہ میں اضافہ ہو اور دوسری طرف ان معلومات کی مدد سے کتاب مقدس کا ترجمہ زیادہ صحت کے ساتھ کرنا ممکن ہو۔(1)

اس مہم کا خیال "جامعہ جوتنجین" کے "میخائیلیس" نے پیش کیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ممالک عربیہ میں بھیجی جانے والی علمی مہم ان امور اور سوالات پر روشنی ڈالے گی جن کا تعلق کتاب مقدس کے لغوی مطالعہ سے ہے۔ مثال کے طور پر تورات میں جن درختوں اور حیوانات کا ذکر آیا ہے، ان کے متعلق معلومات حاصل ہوں گی تاکہ ان کا جائزہ لے کر تورات کے بیانات سے ان کی تطبیق کی جاسکے۔ مزید برآں اس مہم کے ذریعے جزیرہ عرب کے جغرافیے کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ بحیرہ احمر کے مدوجزر کو سمجھنے میں مدد ملے گی جو مصر سے ہجرت کے موضوع کو سمجھنے کے لئے ایک اہم عامل کی حیثیت رکھتا ہے۔ میخائیلیس کو یقین تھا کہ یمن میں ایسے آثار ملنے کے قوی امکانات موجود ہیں جو قدیم اسرائیل میں پائے جانے والے آثار سے مشابہ اور فلسطین میں پائے جانے والے آثار سے زیادہ عمدہ ہوں گے۔(2)

ڈاکٹر محمد متعال الجبری کہتے ہیں:

"غالباً یہی وجہ ہے کہ یہودی مملکت اسرائیل کے قیام تک وہاں مقیم رہے اور اسرائیل کے قیام کے بعد انہوں نے وہاں سے ہجرت کی۔"(3)

1۔"الاستشراق وجہ للاستعمار الفکری"، صفحہ 14
2۔ایضاً
3۔ایضاً

جب یہ مہم روانہ ہوئی تو اس کے ارکان کو حکومت کی طرف سے یہ ہدایات دی گئیں کہ وہ مشرقی علاقوں کی طبعی تاریخ اور جغرافیہ کے متعلق مخطوطات جمع کریں، تورات کے قدیم نسخے خریدیں، تورات کے عربی تراجم خریدیں اور خصوصاً ایسے تراجم جو بہت قدیم ہوں۔ اسی طرح اس مہم کے ارکان کے ذمہ یہ کام بھی لگایا گیا کہ وہ ان علاقوں کے لوگوں کے عادات واطوار کا مطالعہ کریں۔ خصوصاً وہ علاقے جن پر بائبل نے روشنی ڈالی ہے ان کو زیادہ اہمیت دیں۔ مہم کے ارکان کو حکم دیا گیا کہ وہ عربوں، اسرائیلیوں اور شامیوں سے متعلق ہر چیز کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔ اور تورات میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے جو چیز بھی مختلف دیکھیں اسے باقاعدہ نوٹ کریں۔

یہ مہم بری طرح ناکام ہوئی۔ وہ صحرائے سینا میں گئے۔ انہوں نے "جبل المکاتب" کا سروے کیا لیکن انہیں فرعونی آثار کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ وہاں یہودیوں اور عبرانیوں کی کوئی نشانی موجود نہ تھی۔(1)

متعلقہ علاقوں میں ایسی مہمیں ہر دور میں جاتی رہی ہیں۔ اسرائیل کے قیام کے بعد اسرائیلی حکومت نے بھی وہاں آثار قدیمہ دریافت کرنے کے سلسلے میں بہت محنت کی ہے۔ رسالہ (Time) کی دسمبر 1995 کی اشاعت میں بتایا گیا ہے کہ صرف 1995ء کے سال میں اسرائیل میں تقریباً تین سو کے قریب کھدائیاں عمل میں آئیں۔

اس انداز تحقیق نے جو نتائج ظاہر کئے ہیں وہ حیران کن ہیں۔ (Time) کی دسمبر 1995ء کی اشاعت میں ایک مضمون چھپا ہے جس کا عنوان ہے Are the Bible Stories true? یعنی کیا بائبل میں بیان شدہ واقعات صحیح ہیں۔ مضمون نگار کا نام "مائیکل ڈی لیمونک" (Michael-D.Lemonick) ہے۔ اس مضمون کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے: ایک اقتباس اس سوال سے شروع ہوتا ہے۔ Was Ibraham a myth? کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک فرضی شخصیت تھے۔ اس کے تحت لکھا ہے:

He was the father of judaism. The man who was willing to kill his son Isac just because God told him to, But the years of the searching have convinced all but the most conservative experts that Ibraham, and rest of the Patriarchs, were inventions of the bible's au-

---

1۔ "الاستشراق وجہ للاستعمار الفکری"، صفحہ 15

thors."(1)

"آپ یہودیت کے جد اعلیٰ تھے۔ آپ وہ عظیم انسان تھے جو اپنے بیٹے اسحاق (علیہ السلام) کو محض اس لئے قتل کرنے پر تیار تھے کہ ان کے رب کا حکم یہی تھا۔ لیکن کئی سالوں کی تحقیق سے تمام ماہرین کو، سوائے ان کے جو زیادہ ہی قدامت پسند ہیں، یقین ہو گیا ہے کہ ابراہیم (علیہ السلام) اور دیگر بزرگانِ اسرائیل بائبل کے مصنفین کی اختراع ہیں۔"

ایک دوسرا اقتباس اس سوال سے شروع ہوتا ہے۔ ?Was there a Moses کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک حقیقی شخصیت تھے؟ اس سوال کے تحت لکھا ہے۔

"Biblical epics notwithstanding, many scholars contend that Moses was a legendary hero, created by the Hebrews to instill a feeling of national identity and solidarity. Apart from the bible, there is no evidence that such a man ever lived."(2)

"بائبل کے بیانات سے قطع نظر، اکثر علماء کا موقف یہ ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) ایک تمثیلی ہیرو تھے جن کو عبرانیوں نے اپنے قومی تشخص اور یک جہتی کو لوگوں کے ذہن نشین کرانے کے لئے تخلیق کیا تھا۔ بائبل کے علاوہ کوئی اور ایسا ثبوت موجود نہیں جس سے پتہ چلے کہ اس قسم کا کوئی آدمی حقیقتاً کبھی موجود تھا۔"

مضمون نگار نے ابراہیم و موسیٰ (علیہما السلام) کے علاوہ بائبل کی بیان کردہ کئی اور شخصیات اور واقعات کا بھی ذکر کیا ہے جن کو دور حاضر کے ماہرین نے سائنسی ثبوت نہ ملنے کی بنا پر فرضی اور بائبل کے مصنفین کے ذہن کی اختراع قرار دے دیا ہے۔

"Exodus" یعنی مصر سے بنو اسرائیل کا خروج بائبل کا ایک اہم واقعہ ہے لیکن اس جدید تحقیق نے اس کو بھی مشکوک بنا دیا ہے۔ اس واقعہ کے متعلق یہ سوال اٹھایا گیا ہے: Did ?the exodus happen یعنی کیا خروج کا واقعہ واقعی پیش آیا؟ اس کے تحت لکھا ہے:

"If they really spent 40years wandering in the desert after fleeing Egypt, the israelites should have left at

1۔ مائیکل ڈی۔ لیمونک "آرڈی بائبل سٹور یز ٹرو"، ٹائم ایشیا نیو یارک 18 دسمبر 1995ء، صفحہ 48

2۔ "مائیکل ڈی لیمونک"، ٹائم ایشیا، 18، دسمبر 1995

least a few traces. But though scientists have evidence of human occupation in the sinai dating to the stone age, nothing suggests that israelites were ever there.(1)

”اگر اسرائیلیوں نے مصر چھوڑنے کے بعد سچ مچ چالیس سال صحرا میں ادھر ادھر پھرتے ہوئے گزارے تھے تو انہوں نے کچھ نہ کچھ آثار تو وہاں ضرور چھوڑے ہوں گے۔ لیکن گو سائنسدانوں کو اس علاقے میں ایسے آثار ملے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں انسانوں کے موجود ہونے کی تاریخ پتھر کے زمانے تک پھیلی ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود کوئی چیز اس بات کی طرف اشارہ نہیں کرتی کہ بنو اسرائیل بھی کبھی وہاں گئے تھے۔“

لطف کی بات یہ ہے کہ جو لوگ بائبل کی بات پر اعتماد نہیں کرتے، بلکہ ان کا اعتماد صرف آثار قدیمہ پر ہے وہ تو ان تاریخی حقائق کو بھی ماننے کے لئے تیار نہیں جن پر تمام الہامی مذاہب صدیوں سے متفق چلے آرہے ہیں لیکن جو لوگ بائبل کے کسی بیان پر تنقیدی نظر ڈالنے کے لئے تیار نہیں ان کو اسی مذکورہ بالا تحقیق کی مدد سے مشرق کے چپے چپے پر ایسے آثار نظر آتے ہیں جن سے بائبل کے بیانات کی تصدیق ہوتی ہے۔

ڈاکٹر محمد عبدالمتعال محمد الجبری ”علامہ محمد اسد“ کے حوالے سے یہ لطیفہ لکھتے ہیں:

”علامہ محمد اسد فرماتے ہیں: سولہویں صدی سے جتنے لوگ مغرب سے مشرق آتے ہیں، انہیں یہاں تورات کے حادثات اور واقعات کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اہرام مصر کو وہ گندم کے گودام سمجھتے ہیں جن کو یوسف بن اسرائیل علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا۔ ”هلیو بولس“ کی شکل میں انہیں وہ خفیہ مستقر نظر آتا ہے جہاں مقدس خاندان استراحت فرما ہوا تھا۔ سمندر کے کنارے بکھری ہوئی ہڈیاں انہیں فرعون اور اس کے لشکریوں کی ہڈیاں معلوم ہوتی ہیں جو اسرائیلیوں سے مقابلے کے وقت یہاں ہلاک ہوئے تھے۔ یہی نہیں بلکہ اسرائیلیوں کو اپنے آباؤ اجداد کی نشانیاں حدود عرب سے آگے بھی نظر آتی ہیں۔ 1472ء میں وینس کی ایک مہم کو ساسانی بادشاہ ”شاپور اول“ کی شکل میں

1۔ مائیکل۔ ڈی۔ لیمونک، ”ٹائم ایشیا“، 18 دسمبر 1995ء

تورات کا "شمشون" نظر آگیا۔"(1)

اسرائیلیوں کو مشرق میں ہر طرف اپنے آباؤاجداد کے آثار کا نظر آنا محض لطیفہ نہیں اور نہ ہی یہ کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ یہودی جو نہ صرف نیل سے فرات تک کے علاقے کو اپنے اجداد کی میراث سمجھتے ہیں بلکہ ساری دنیا پر حکمرانی کے خواب دیکھ رہے ہیں، یہ سب ان کی سازشیں ہیں۔ جن علاقوں پر ان کی خصوصی نظریں ہیں ان علاقوں پر اپنا دعویٰ ثابت کرنے کیلئے یہودیوں کو اس قسم کے آثار کی ضرورت ہے۔ اس قسم کے سروے، کھدائیوں اور تحقیقات کا منطقی نتیجہ خواہ کچھ بھی نکلتا ہو، یہودی ان سے وہ نتائج برآمد کرنے کے فن میں ماہر ہیں جو نتائج وہ برآمد کرنا چاہتے ہیں۔

یہود ونصاریٰ نے کتاب مقدس کی اصلاح اور تفسیر کے مقصد کے پیش نظر جو کوششیں کیں ان سے ان کے دینی مقاصد تو پورے نہ ہوئے بلکہ ان کی اکثریت کا اعتماد ان کی الہامی کتابوں سے اٹھ گیا البتہ ان تحقیقات سے ان کو سیاسی اور اقتصادی فوائد ضرور حاصل ہوئے۔

اہل مغرب نے بعد میں ان علاقوں میں اپنی نوآبادیاں قائم کرنے اور ان کے وسائل کو مغرب میں منتقل کرنے کیلئے ان تحقیقات سے بہت استفادہ کیا۔ ان تحقیقات نے اسرائیل کی مملکت کے قیام میں بھی اہم کردار ادا کیا اور صیہونی اپنے دیگر کئی عزائم کی تکمیل کے لئے بھی ان تحقیقات پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اور ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ ان تحقیقات سے اپنی مرضی کے نتائج اخذ کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔

گو یہ تحقیقات، سروے اور کھدائیاں وغیرہ بظاہر بے ضرر نظر آتی ہیں لیکن مسلمانوں کے لئے یہ بہت بڑا چیلنج ہیں۔

عیسائیوں نے اصلاح مسیحیت کے لئے بڑی منظم کوششیں کیں۔ اس مقصد کے لئے عیسائی راہبوں نے کئی انجمنیں بنائیں۔ ان انجمنوں میں بندکتی، فرانسسکی، کبوشی، دومینکی، کرملی پادری اور یسوعی پادری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان راہبوں اور پادریوں نے اصلاح مسیحیت کی خاطر علوم شرقیہ کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور یہی لوگ بعد میں اسلام کے خلاف تلوار اور قلم کی جنگوں میں پیش پیش رہے۔(2)

1۔ "الاستشراق وجہ للاستعمار الفکری"، صفحہ 13
2۔ "الاستشراق وجہ للاستعمار الفکری"، صفحہ 85-83

سطور بالا میں ہم نے یہود و نصاریٰ کے صرف ایک مقصد یعنی اصلاح مسیحیت کے طریق کار پر روشنی ڈالی ہے۔ لیکن اس مقصد کی نسبت دوسرے دو مقاصد یعنی اسلام کی اشاعت کو روکنا اور مسلمانوں کو عیسائیت کی طرف مائل کرنا، ان کی نظروں میں زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔

ان دو مقاصد کو حاصل کرنے کے روایتی طریقے تو وہ صدیوں سے استعمال کر رہے تھے۔ انہوں نے عیسائیت کی تبلیغ میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی تھی۔ دلائل کے زور سے اسلام کی تکذیب کے لئے بھی انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا۔ تلوار کے زور سے اسلام کی شمع کو گل کرنے کیلئے بھی انہوں نے اپنے زور بازو کو آزمالیا تھا۔

اسلام کے خلاف انہی ہتھیاروں کو دوبارہ استعمال کرنا ان کے لئے نہ ممکن تھا اور نہ ہی مفید۔ انہوں نے ان دو مقاصد کی خاطر بڑے غور و خوض اور مسلمانوں کی قوت و ضعف کے اسباب کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد ایک جامع پروگرام بنایا۔ یہ پروگرام وضع کرنے سے پہلے چند باتیں ان کے ذہن میں تھیں۔ ان کو اس بات میں ذرہ برابر شک نہ تھا کہ مسلمانوں کی قوت اسلام کی تعلیمات میں پوشیدہ ہے۔ انہیں یقین تھا کہ مسلمانوں کی عسکری فتوحات، ان کی تہذیبی کامرانیاں، علوم و فنون میں ان کی مہارت اور دشمنوں کے دلوں کو اپنا گرویدہ بنانے کی صلاحیت، یہ تمام چیزیں مسلمانوں کو دین اسلام کی تعلیمات کی برکت سے ملی ہیں۔ اس لئے جب تک مسلمانوں کا رشتہ اپنے دین سے قائم ہے، اس وقت تک نہ تو مسلمان مغلوب ہو سکتے ہیں اور نہ ہی ان کے دین پر وار کیا جاسکتا ہے۔ دوسری طرف ان کو یہ بھی یقین تھا کہ علمی انداز میں اسلام کا مقابلہ کرنے کیلئے اسلام کا معروضی اور غیر جانبدارانہ مطالعہ قطعاً ان کے حق میں نہیں کیونکہ اسلام کے معروضی اور غیر جانبدارانہ مطالعہ سے وہ اسلام کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔

آج مستشرقین کے علمی رعب کا سبب یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ غیر جانبدار محقق ہیں۔ دیگر موضوعات میں تو ان کی تحقیقات غیر جانبدارانہ اور معروضی ہو سکتی ہیں لیکن اسلام کے متعلق وہ غیر جانبدارانہ تحقیق کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ غیر جانبدارانہ تحقیق کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اگر وہ صحیح بنیادوں پر کی گئی ہو تو وہ ہمیشہ حق کو حق ثابت کرتی ہے۔ غیر جانبدارانہ تحقیقات سے کبھی باطل کو حق اور حق کو باطل ثابت نہیں کیا جاسکتا۔

مستشرقین کے پیش نظر چونکہ ہدایت کے خدائی نور کو اپنی پھونکوں سے بجھانا تھا، اس لئے غیر جانبداری کے چکر میں پڑنا ان کے مفاد میں نہ تھا۔ انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کو اسی نظر سے دیکھنے کا ارادہ کیا جس نظر سے وہ انہیں دیکھنا پسند کرتے تھے۔

ان لوگوں نے اسلام کا مطالعہ کرنے کیلئے تعصب کی عینک لگانے کو ضروری سمجھا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ باطل ہمیشہ تعصب کی بیساکھی کے سہارے قائم رہتا ہے۔ اس لئے ان کے لئے ضروری تھا کہ وہ تعصبات کو بھڑکائیں کیونکہ یہی ان کا اصل ہتھیار تھا۔ اصلاح مسیحیت کے سلسلے میں جو تحقیقات کرنے کی کوششیں کی گئی تھیں ان کے نتیجے میں صرف وہی عیسائی عیسائیت پر قائم رہ سکتے تھے جنھوں نے تعصب کا سہارا لیا تھا۔ اور جن لوگوں نے اپنے آپ کو تعصب کے شکنجے سے آزاد کر لیا تھا وہ ان تحقیقات کے نتیجے میں بائیبل کی حیثیت کے منکر ہو گئے تھے۔

مستشرقین نے اسلام سے مبارزت کے لئے جو پروگرام وضع کیا اس کی چند اہم شقیں مندرجہ ذیل تھیں۔

1۔ ایسے آدمی تیار کئے جائیں جو مسلمانوں کی زبانوں، ان کے دین، ان کے تہذیب و تمدن، عقائد، تاریخ، اختلافات اور دیگر مظاہر حیات سے پوری طرح آگاہ ہوں۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ ان کی اپنی زبانوں میں گفتگو کر سکیں، ان میں گھل مل سکیں اور وہ مسلمانوں کے عقائد اور مذہبی اعمال کو اس انداز میں دیکھنے اور پیش کرنے کی مہارت رکھتے ہوں جو مستشرقین کے موقف کے مطابق ہو۔

2۔ ان تربیت یافتہ لوگوں کو اسلامی ممالک میں تبلیغی مشنوں پر بھیجا جائے، جہاں وہ مختلف فلاحی اور خیراتی کاموں کے ذریعے مسلمانوں کے دلوں کو عیسائیت کی طرف مائل کر سکیں۔

3۔ ان مساعی میں کامیابی کے لئے مغربی سیاستدانوں سے گٹھ جوڑ کیا جائے تاکہ ان کی حمایت میں تبلیغی کوششیں بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رہ سکیں۔

4۔ تبلیغی کاموں کی خاطر سرمائے کی فراہمی کے لئے حکومتوں کے علاوہ بڑی بڑی تجارتی کمپنیوں کے ساتھ بھی روابط قائم کئے جائیں۔

5۔ اپنے کام کو منظم کرنے، اس کی رفتار تیز کرنے اور تبلیغی کوششوں کا رخ متعین کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً کانفرنسیں منعقد کی جائیں اور ایسی انجمنیں بنائی جائیں جو تبشیری کاموں

کی نگرانی کر سکیں۔
ہم نے سطور بالا میں مستشرقین کے جس پروگرام کا ذکر کیا ہے، یہ ہم نے ان کی کسی دستاویز سے نقل نہیں کیا۔ البتہ صدیوں تک وہ لوگ جن کوششوں میں مصروف رہے، جن کے ذکر سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں، ان کے مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچنا مشکل نہیں کہ مستشرقین کی یہ کوششیں باقاعدہ منظم تھیں اور ان کے پیچھے ایک اور سوچا سمجھا پروگرام تھا۔ کیونکہ انفرادی کوششیں ایسی نہیں ہوتیں جیسی مستشرقین صدیوں تک اسلامی ممالک میں کرتے رہے۔
اب ہم مستشرقین کے اس پروگرام کی مختلف شقوں پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں۔

مشنریوں کی تربیت

اسلام کے خلاف علمی جہاد کیلئے ضروری تھا کہ ایسے آدمی تیار کئے جائیں جو ہر میدان میں مسلمانوں کا مقابلہ کر سکیں۔ اس ضرورت کا احساس کر لینے کے بعد اہل مغرب نے یورپ کے طول و عرض میں ایسے اداروں کا جال بچھا دیا جن میں اسلامی عربی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ عربی کتابوں کے مغربی زبانوں میں ترجمے ہونے لگے۔ عربوں کی کتابیں مغربی مدارس میں پڑھائی جانے لگیں۔ عربی کتابوں کے ترجموں کے ساتھ لمبے چوڑے مقدمے لکھ کر شائع کئے گئے جن کے ذریعے قارئین پر مستشرقین کا نقطہ نظر مسلط کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایسی کتابیں لکھی جانے لگیں جن میں اسلام کی تعلیمات کو انتہائی گھناؤنی شکل میں پیش کیا گیا تھا اور خصوصاً حضور ﷺ کی حیات طیبہ کے نورانی گوشوں کو بدنما بنا کر پیش کرنے کی ایسی مذموم کوششیں کی گئیں جو پوری انسانیت کے لئے باعث عار ہیں۔
اس قسم کی تمام کاروائیوں میں عیسائی راہب اور پادری پیش پیش تھے۔ اور یہودی علما پس منظر میں رہ کر اس پروگرام کو آگے بڑھانے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ جو لوگ اسلام کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار ہو رہے تھے، اسلام کو سمجھنے کے لئے، اسی قسم کی بیہودہ کتابیں ان کے پیش نظر تھیں۔
مبلغین کی تربیت کی اس قسم کی منظم کوششیں گو بعد میں شروع ہوئیں لیکن اس قسم کی انفرادی کوششیں بہت پہلے شروع ہو چکی تھیں۔ استشراق کی تحریک کے آغاز کی طرح مبلغین کو مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کیلئے مسلح کرنے کی کوششوں کا آغاز بھی یوحنا

دمشقی نے ہی کر دیا تھا۔

یوحنا دمشقی کی ولادت دمشق میں ہوئی تھی۔(1)اس کا باپ بھی خلافت عباسیہ کے دور میں حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا تھا اور یوحنا خود بھی اپنے باپ کے بعد بیت المال کا اعلیٰ افسر رہا تھا، اس لئے عربی اس کی مادری زبان تھی۔ اسلامی تہذیب و ثقافت میں وہ پل کر جوان ہوا تھا۔ مسلمانوں کے درمیان رہتے ہوئے اس نے اسلام کی تعلیمات کو بالکل قریب سے دیکھا تھا۔ وہ اسلام کی تعلیمات کے حسن کو بھی جانتا تھا اور مسلمانوں کی رواداری، جس نے اس کے خاندان کو مفتوحہ قوم کا فرد ہونے کے باوجود اتنی عزت دی تھی، وہ بھی اس سے پوشیدہ نہ تھی۔ وہ سب کچھ سمجھتا تھا لیکن چونکہ اس کے دل میں تعصب کے شعلے بھڑک رہے تھے اس لئے اس نے بھی عیسائیوں کو مسلمانوں کے خلاف مناظروں کے لئے تیار کرنے کی خاطر کتابیں لکھیں۔ اس کی جو کتابیں مشہور ہیں ان میں سے محاورہ مع مسلم، ارشاد النصاریٰ فی جدل المسلمین اور حیات محمد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ان کتابوں میں اس نے اپنے ہم مذہب مبلغین کو جس قسم کا مواد فراہم کرنے کی کوشش کی اس کی چند جھلکیاں ملاحظہ فرمائیے:

(1)اس نے اپنی کتاب "حیات محمد" میں اسلام کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

"اسلام عیسائیت کے ایک گمراہ فرقے کا نام ہے۔ جو بیز نطینی بادشاہ ہرقل کے عہد میں ظاہر ہوا۔ اس فرقے کا بانی ایک مدعی نبوت حامد (محمد ﷺ) تھا۔ حامد مذکور عہد نامہ جدید اور عہد نامہ قدیم کی کتابوں سے واقف تھا۔ پھر اس کی ملاقات اریوس کے ایک پیروکار سے ہوگئی۔ اریوس توحید مجرد کا قائل تھا، اس لئے اس کو کلیسا سے خارج کر دیا گیا تھا۔ حامد نے اریوس کے اس معتقد سے توحید کا اصول سیکھا اور پھر اس اصول کی بنیاد پر ایک دین وضع کیا جس کا نام اسلام رکھا۔ یہ مدعی نبوت اپنے ابنائے قوم کو اپنے حلقے میں شامل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے اپنے پیروکاروں کے سامنے ایک کتاب پیش کی، جس کے متعلق اس نے دعویٰ کیا کہ یہ کتاب آسمان سے نازل ہوئی ہے۔ اس نے اس کتاب میں کچھ مضحکہ خیز قسم کے احکام بیان کئے اور دعویٰ کیا کہ یہ شریعت ہے۔"(2)

1۔ المنجد فی الاعلام

2۔ "اضواء علی الاستشراق" صفحہ 67

(ب) یوحنا دمشقی نے حضور ﷺ کے امی ہونے کا انکار کر کے یہ دعویٰ بھی کیا کہ آپ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔

(ج) اس نے حضور ﷺ کے حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کے واقعے کو غلط رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی۔

(د) اس نے اپنے اسلام قبول نہ کرنے کی وجہ یہ بتائی کہ مسلمانوں نے محمد (ﷺ) سے ان کے دعوائے نبوت کا ثبوت طلب کئے بغیر ان کو نبی تسلیم کر لیا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ محمد (ﷺ) نے اپنے دعوائے نبوت کے ثبوت کے طور پر کوئی معجزہ نہیں دکھایا۔ (1)

یوحنا دمشقی نے آٹھویں صدی عیسوی میں اسلام کو جس نظر سے دیکھا تھا، وہ نقطہ نظر تحریک استشراق کی پوری تاریخ میں جاری رہا۔ یہی نقطہ نظر پطرس محترم اور جارج سیل وغیرہ کی تحریروں میں نظر آتا ہے اور آج جن لوگوں کو انصاف پسند مستشرق سمجھا جاتا ہے، ان کی تحریروں میں بھی یوحنا دمشقی کے خیالات کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔

مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں ان لوگوں کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جنہوں نے اپنے آپ کو اسلام کے مقابلے کے لئے وقف کیا۔ ایک قسم ان لوگوں پر مشتمل ہے جو یوحنا دمشقی کی طرح عربی زبان و ادب سے واقف تھے۔ ان کو اسلام کی تعلیمات سے مکمل آشنائی حاصل تھی۔ لیکن وہ اسلام کو اس کی اصل شکل میں اپنے ابنائے وطن کے سامنے پیش کرنے کو ملی اور دینی خودکشی کے مترادف سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے شرافت، انسانیت، انصاف اور تحقیق کے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر اپنے ابنائے مذہب کو اسلام کی وہ تصویر دکھائی جو در اصل اسلام کی تصویر نہیں تھی۔ انہوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی طرف ایسی برائیوں کو منسوب کیا جن سے وہ بری الذمہ تھے۔ لیکن چونکہ یہ لوگ عربی زبان و تہذیب سے واقف تھے اور ان کی رسائی اسلام کے اصل مصادر تک تھی اس لئے وہ اپنے ہم مذہب اور ہم قوم لوگوں کے لئے اتھارٹی کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے لئے عربی زبان و تہذیب کے ان ماہرین کی تحقیقات کو مسترد کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس لئے جو کچھ ان کے قلم سے نکل گیا وہ اہل یورپ کے لئے ایک ناقابل تردید حقیقت کی شکل اختیار کر گیا۔

دوسری قسم ان لوگوں پر مشتمل تھی جو نہ عربی زبان جانتے تھے اور نہ ان کو اصل اسلامی

1۔ "اضواء علی الاستشراق" صفحہ 69-67

مصادر تک رسائی حاصل تھی۔ اسلام کو سمجھنے کے لئے ان کے سامنے وہی تحریریں تھیں جو ان کے اپنے ہم مذہب لوگوں نے اس دعوے کے ساتھ لکھی تھیں کہ ان کتابوں کو اصل مصادر کی مدد سے تیار کیا گیا ہے۔

ان دونوں قسم کے مستشرقین میں قدر مشترک صرف ایک چیز تھی۔ اور وہ چیز تھی، اسلام کے خلاف تعصب۔ یہ دونوں طبقے اسلام دشمنی میں ایک دوسرے سے بڑھ کر تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ایک طبقہ سب کچھ جانتے ہوئے اسلام کے شجرۂ طیبہ کو جڑوں سے اکھیڑ پھینکنے کیلئے بے تاب تھا اور دوسرے طبقے کی مخالفت کا بنیادی سبب یہ تھا کہ وہ اسلام کی حقیقت کو بالکل نہیں سمجھتا تھا۔ اور یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ جس چیز کے متعلق ضروری معلومات نہ رکھتا ہو، وہ اس سے خائف بھی رہتا ہے اور اس کی مخالفت بھی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بے شمار ایسے لوگ جن کی تربیت عیسائی پادریوں یا دیگر ادیان کے مذہبی راہنماؤں کے طور پر ہوئی تھی، جب انہوں نے اسلام کے رخ زیبا کو دیکھا تو ان کے لئے اس دین متین کے دامن میں پناہ لینے کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا۔

تبلیغی مشن

عیسائی مبلغین نے عیسائیت کی تبلیغ کی تربیت حاصل کی اور پھر دنیا کے کونے کونے میں پھیل گئے۔ ان لوگوں نے اپنے لئے جو لقب پسند کیا وہ مبشرین کا لقب تھا۔ انہوں نے انسانی ہمدردی، اخوت، رحم دلی، مساوات اور آزادی کے خوب صورت لباس زیب تن کر رکھے تھے لیکن ان کے سینوں میں بھی اسلام دشمنی کا وہی لاوا ابل رہا تھا جو یہود و نصاریٰ کی پہچان ہے۔ اہل مغرب اسلام کو کس نظر سے دیکھتے ہیں اس کی ایک جھلک قارئین کی خدمت میں ابتداء ہی میں پیش کر دینا ضروری ہے تاکہ کوئی کسی کو کسی خوبصورت بھیس میں دیکھ کر دھوکا نہ کھا جائے۔

برطانیہ کے ایک سابق وزیر اعظم "گلاڈسٹن" نے اسلام کے متعلق اپنی قوم کو آگاہ کیا اور کہا:

"جب تک مسلمانوں کے ہاتھوں میں یہ قرآن موجود ہے اس وقت تک یورپ مشرق پر اپنا تسلط قائم نہیں کر سکتا اور نہ ہی یورپ خود محفوظ ہے۔"(1)

1۔ "قوی الشر المتحالفہ"، صفحہ 15

"ھملٹن گب" نے ان الفاظ میں اپنے سینے میں چھپے ہوئے جذبات کا اظہار کیا:

"مسلمانوں کو مغربی تہذیب کی طرف مائل کرنے کی کوششوں کا مقصد اسلامی تہذیب کا خاتمہ ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کی ملی وحدت کی بنیاد یہی تہذیب ہے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ تعلیمی، ثقافتی اور ابلاغی ذرائع سے کام لے کر اس تہذیب میں بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں عمل میں لائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمانوں کو ان کا عمل اپنے دین سے بے بہرہ قوم ظاہر کرے گا لیکن خود ان کو اس کا احساس تک نہ ہوگا۔" (1)

"لورانس بروان" نے اپنے استشراقی جذبات کا اظہار اس طرح کیا:

"حقیقی خطرہ اسلامی نظام، اس کے پھیلنے اور لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے کی صلاحیت اور اس کی قوت حیات میں ہے۔ مغربی استعمار کے راستے میں یہی واحد دیوار ہے۔"

وہی مبشر مزید لکھتا ہے:

"اگر مسلمان ایک سلطنت کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے تو وہ ساری دنیا کے لئے لعنت بن جائیں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ نعمت بن جائیں۔ لیکن اگر وہ متفرق اور منتشر رہے تو وہ اسی طرح کمزور اور غیر موثر رہیں گے جیسے آج ہیں۔" (2)

قسیس "کالھون سیمون" نے اپنی تحریک کے خفیہ ارادوں کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"اسلامی وحدت سیاہ فام طبقوں کی آرزوؤں کو ایک نقطے پر جمع کرتی ہے اور اس طرح یورپی غلبے سے آزادی کے لئے انکی راہنمائی کرتی ہے۔ ان لوگوں کی آزادی کی تحریکوں کو کچلنے کے لئے مبشرین نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ کیونکہ مبشرین اہل یورپ کو بڑے دل کش رنگوں میں پیش کرتے ہیں اور ایسی کارروائیاں کرتے ہیں جن سے اسلامی تحریکیں اپنی قوت کے مرکز سے دور ہو جائیں۔" (3)

فرانسیسی مستشرق "ھانوتو" کہتا ہے۔

1۔ "قوی الشر المتحالفہ"، صفحہ 16

2۔ ایضاً، صفحہ 21

3۔ ایضاً، صفحہ 22

"آج ہمیں اسلام کا مسئلہ درپیش ہے۔ دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہیں جہاں آج اسلام موجود نہ ہو۔ یہی وہ واحد دین ہے جس میں لوگ فوج در فوج داخل ہوتے ہیں۔ اس دین کی طرف لوگ جس کثرت سے مائل ہوتے ہیں اس طرح کسی دوسرے دین کی طرف مائل نہیں ہوتے۔"(1)

مجلہ العالم الاسلامی الانجلیزیہ" کے جون 1930ء کے شمارے میں عالم اسلام کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا گیا:

"عالم مغرب پر ایک خوف کا طاری ہونا ضروری ہے۔ اس خوف کے کچھ اسباب ہیں۔ ان میں سے ایک سبب یہ ہے کہ اسلام جب سے مکہ میں ظاہر ہوا، اس وقت سے اس کے پیروکاروں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ بلکہ یہ دین مسلسل پھیل رہا ہے۔ پھر اسلام محض ایک مذہب ہی نہیں بلکہ جہاد اس کے ارکان میں سے ایک اہم رکن ہے۔ اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی قوم اسلام قبول کرنے کے بعد پھر عیسائیت کی طرف لوٹی ہو۔"(2)

"نپولین بوناپارٹ" نے جب اس تاریخی حقیقت پر غور کیا کہ اسلام کی حدود ایک صدی سے بھی کم مدت میں مغرب میں فرانس اور اٹلی اور مشرق میں خلیج بنگال، چین اور کوہ اورال تک پھیل گئی تھیں تو اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے:

"عربوں نے اسلام کی برکت سے نوے سال کے عرصے میں دنیا کے جتنے حصے پر اپنی عظمت کے پھریرے لہرائے، رومی پانچ سو سال کے عرصے میں بھی اتنے علاقوں کو زیر نگین نہ بنا سکے۔"(3)

برطانیہ کے ایک سابق وزیر خارجہ "لارڈ کرزن" نے کہا:

"مبشرین اسلام کی چٹان کی طرح مضبوط دیوار پر عبث کدالیں چلا رہے ہیں۔ یہ دیوار کبھی منہدم نہ ہوگی۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جو زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہے۔ اس کے پیروکار مہد سے لحد تک اس کی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔ اسلامی معاشرہ جن روابط کی بنا پر ترقی کرتا ہے وہ سماجی نہیں بلکہ دینی ہیں۔

1۔ "قوی الشر المتحالفۃ"، صفحہ 22
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً، صفحہ 23

یہ جامع نظام حیات جو اس دنیوی زندگی کے تمام معاملات کے لئے مفصل احکام مہیا کرتا ہے اور حیات اخروی کی نجات و سعادت کی خبر دیتا ہے، جب تک اپنے پیروکاروں کی زندگیوں پر حاوی رہے گا اس وقت تک مبشرین کی ان تھک کوششیں اور اس کام کے لئے خرچ کیا جانے والا سرمایہ، سب بے کار جائے گا۔"(1)

جرمن سیاح "پول اشمید" نے اپنی کتاب "الاسلام قوۃ الغد" میں تین چیزوں کو مسلمانوں کی شوکت و قوت کے عوامل قرار دیا ہے۔

1۔ دین اسلام، اس کے عقائد، اس کا نظام اخلاق اور مختلف نسلوں، رنگوں اور ثقافتوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں رشتہ اخوت استوار کرنے کی صلاحیت۔

2۔ ممالک اسلامیہ کے طبعی وسائل۔

3۔ مسلمانوں کی روز افزوں عددی قوت۔

مسلمانوں کی قوت کے یہ عوامل بیان کرنے کے بعد وہ کہتا ہے:

"اگر یہ تینوں قوتیں جمع ہو گئیں، مسلمان عقیدے کی بنا پر بھائی بھائی بن گئے اور انہوں نے اپنے طبعی وسائل کو صحیح صحیح استعمال کرنا شروع کر دیا، تو اسلام ایک ایسی مہیب قوت بن کر ابھرے گا جس سے یورپ کی تباہی اور تمام دنیا کا اقتدار مسلمانوں کے ہاتھوں میں چلے جانے کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔"

یورپ کو ان ممکنہ خطرات کی طرف متوجہ کرنے کے بعد وہ اہل یورپ کو دعوت دیتا ہے کہ وہ ایک مرتبہ پھر مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگ کے لئے متحد ہو جائیں لیکن یہ جنگ ایسی ہو جو زمانے کے حالات سے مناسبت رکھتی ہو۔(2)

برطانیہ کے سابق وزیر اعظم "گلاڈسٹن" نے برطانوی دار العوام میں قرآن حکیم ہاتھ میں پکڑ کر باآواز بلند کہا:

"اسلامی ممالک میں ہماری نو آبادیوں کے لئے دو چیزیں خطرہ ہیں۔ اور ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم ہر قیمت پر ان دونوں چیزوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیں۔ ان میں سے ایک یہ کتاب (یعنی قرآن حکیم) ہے۔"

پھر وہ تھوڑی دیر خاموش رہا۔ مشرق کی طرف متوجہ ہوا اور اپنے بائیں ہاتھ سے مشرق کی

1۔ "قوی الشر المتحالفۃ"، صفحہ 23

2۔ ایضاً، صفحہ 24

طرف اشارہ کر کے کہا:

"اور یہ کعبہ۔"(1)

قسیس "ولیم جیفورڈ پالگراف" نے اپنی اسلام دشمنی کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

"جب قرآن اور مکہ کا شہر نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے تو پھر ممکن ہے کہ ہم عربوں کو اس تہذیب میں آہستہ آہستہ داخل ہوتے دیکھ سکیں جس تہذیب سے ان کو محمد (ﷺ) اور ان کی کتاب کے علاوہ کوئی چیز نہیں روک سکتی۔"(2)

الجزائر پر سو سال فرانس کی حکمرانی کے بعد الجزائر کے فرانسیسی حاکم نے کہا:

"ہم الجزائر میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک اس ملک کے لوگ قرآن پڑھتے اور عربی بولتے رہیں گے۔ ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم قرآن اور عربی زبان کو ان کی زندگیوں سے نکال دیں۔"(4)

فرانسیسی مستشرق "حانوتو" حج کو مسلمانوں کی یکجہتی اور اتحاد کا سب سے بڑا مظہر قرار دیتے ہوئے کہتا ہے:

"ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک ہی چیز باہم مربوط رکھے ہوئے ہے۔ ان کے اعمال اور افکار اس کے گرد گھومتے ہیں۔ اس کی مثال اس حبل متین کی سی ہے جس کے ساتھ کچھ چیزیں مربوط ہوں۔ وہ اس کی حرکت سے حرکت کرتی ہوں اور اس کے رک جانے سے رک جاتی ہوں۔ مسلمان جب کعبہ کے قریب پہنچتے ہیں، وہ کعبہ جو البیت الحرام ہے، جب وہ زمزم کے قریب ہوتے ہیں جس سے مقدس پانی ابلتا ہے، جب وہ اس حجر اسود کے قریب ہوتے ہیں جس کے گرد چاندی کا خول چڑھا ہے، جب وہ رکن کے قریب جاتے ہیں جس کے بارے میں ان کا عقیدہ ہے کہ یہ دنیا کی ناف ہے، جب ان کی وہ آرزو بر آتی ہے جس نے انہیں دور دراز سے اپنے وطنوں کو چھوڑ کر خدا کے مقدس گھر میں حاضری پر مجبور کیا، تو ان کے دلوں میں دینی حمیت کا جذبہ شعلہ زن ہو جاتا ہے۔ وہ بڑے خشوع و خضوع سے صفیں بنائے نماز میں مشغول ہو جاتے ہیں۔"

1۔ "قوی الشر المتحالفۃ"، صفحہ 27

2۔ ایضاً، صفحہ 28

3۔ ایضاً

ان کے آگے امام کھڑا ہوتا ہے۔ وہ بسم اللہ کہہ کر عبادت شروع کرتا ہے تو ہر طرف سکون اور خاموشی چھا جاتی ہے۔ یہ سکون اور سکوت ان صفوں میں کھڑے ہوئے ہزاروں (1) نمازیوں پر اپنے پر تان دیتے ہیں۔ پھر وہ یک زبان ہو کر "اللہ اکبر" کہتے ہیں۔ پھر انتہائی خشوع سے "اللہ اکبر" کہتے ہوئے ان کی جبینیں سجدہ ریز ہو جاتی ہیں۔ ان کی آواز کا یہ خشوع اپنے اندر عبادت کا معنی لئے ہوتا ہے۔" (2)

مبشر "تکلی" اسلام کی تباہی کے لئے یہ تدبیر پیش کرتا ہے:

"ہمیں سیکولر بنیادوں پر مدارس کے قیام کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے۔ کیونکہ مسلمانوں کی کثیر تعداد نے جب اہل مغرب کی درسی کتابیں پڑھیں اور اجنبی زبانیں سیکھیں تو قرآن اور اسلام پر ان کا اعتقاد متزلزل ہو گیا۔" (3)

مشہور مستشرق اور مبشر "صموئیل زویمر" جو اپنی اسلام دشمنی کی وجہ سے مشہور ہے وہ اپنے ہم مذہب لوگوں کو نصیحت کرتا ہے:

"جب تک مسلمان عیسائی مدارس میں داخلہ لینے سے ہچکچاتے ہیں، اس وقت تک ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم ان کے لئے لادینی مدارس کھولیں اور ان مدارس میں ان کیلئے داخلہ آسان بنائیں۔ یہی مدارس طلبہ کے اندر اسلامی روح کو ختم کرنے میں ہمارے ممد و معاون ثابت ہوں گے۔"

"مورو بیرجر" اپنی کتاب "العالم العربی المعاصر" میں رقمطراز ہے:

"عربوں سے ہمارا خوف اور امت عربیہ سے ہماری دلچسپی کی وجہ یہ نہیں کہ عربوں کے پاس پٹرول کے وافر ذخائر ہیں بلکہ اس کی وجہ اسلام ہے۔ ہمارے لئے اسلام سے جنگ کرنا ضروری ہے تاکہ عربوں کی وحدت کے راستے میں بند باندھ سکیں جس وحدت میں عربوں کی قوت کا راز مضمر ہے۔ عربوں کی قوت ہمیشہ اسلام، اس کے غلبے اور انتشار کے ساتھ منسلک رہی ہے۔ ہم جب براعظم افریقہ میں اسلام کو تیزی سے پھیلتے ہوئے دیکھتے ہیں تو یہ نظارہ ہمیں خوف زدہ کر دیتا ہے۔" (4)

1۔ حج کے اجتماع کو ہزاروں میں بیان کرنا مستشرق کی غلطی ہے وہاں لاکھوں کا اجتماع ہوتا ہے۔
2۔ "قوی الشر المتحالفہ"، صفحہ 35
3۔ ایضاً، صفحہ 100
4۔ ایضاً، 123

"ڈاکٹر اطسون" جو قاہرہ میں امریکی یونیورسٹی کا سابق مدیر ہے وہ کہتا ہے:
"ہم اسلامی مدارس میں تدریس قرآن کے عمل کو بڑے غور سے دیکھتے ہیں۔ اور اس میں ہمیں بڑا خطرہ پوشیدہ نظر آتا ہے۔ کیونکہ قرآن اور اسلامی تاریخ دو عظیم خطرے ہیں جن سے عیسائیت کی تبشیری سیاست خوفزدہ ہے۔"(1)

"اسلام کے خلاف تبلیغی اور تبشیری کوششوں کو صرف ممالک اسلامیہ تک محدود نہیں رہنا چاہئے بلکہ ضروری ہے کہ یورپ میں مقیم مسلمانوں کے دلوں سے بھی اسلام کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے۔ صرف مغربی یورپ میں دس ملین مسلمان آباد ہیں جن کی اکثریت برطانیہ، فرانس اور جرمنی میں مقیم ہے۔ ان کے درمیان بھی تبشیری کام کرنا ضروری ہے۔"(2)

مصری کلیسا کے سربراہ "شنودہ" نے اپنے ایک خطبے میں کہا:
"ضروری ہے کہ ہم موجودہ تبشیری کوششوں میں اضافہ کریں۔ کیونکہ جو تبشیری لائحہ عمل وضع کیا گیا ہے، اس کی بنیاد ان مقاصد پر رکھی گئی ہے جن کو اگلے مرحلے میں حاصل کرنے پر اتفاق ہو گیا ہے۔ اور وہ مقاصد یہ ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت کے دلوں سے اسلام کو نکال دیا جائے۔ ضروری نہیں کہ وہ سب لوگ عیسائیت میں داخل ہوں۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کا عقیدہ متزلزل ہو جائے اور ان کی اکثریت اپنی کتاب اور محمد (ﷺ) کی صداقت کو شک کی نظر سے دیکھنے لگے۔

اس لئے قرآن میں شک پیدا کرنے، اس کا بطلان ثابت کرنے اور محمد (ﷺ) کو جھوٹا ثابت کرنے کے لئے ہمیں ہر طریقے پر عمل کرنا چاہئے۔ اگر ہم اگلے مرحلے میں ان تبشیری مقاصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو یہ قومیں ہمارے راستے سے ہٹ جائیں گی اور آئندہ اگر یہ ہمارے ساتھ نہ ہوئیں تو ہمارے خلاف بھی نہ ہوں گی۔"

اس کے بعد "شنودہ" نے اپنے کارکنوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہا:
"ضروری ہے کہ ہم یہ کام نرمی، عقلمندی اور ہوشیاری سے کریں تاکہ ہماری یہ

1۔ "قوی الشر المتحالفۃ"، صفحہ 123
2۔ ایضاً، صفحہ 129

کوششیں مسلمانوں کی بیداری کا سبب نہ بن جائیں۔ ہم سے پہلے جو غلطیاں ہوئیں وہ یہ تھیں کہ جب کبھی ہمارے مبشرین مسلمانوں کو حلقہ عیسائیت میں شامل کرنے میں کامیاب ہوئے تو اس کی خبر مسلمانوں تک پہنچ گئی۔ جس سے مسلمان بیدار ہو گئے۔ مسلمانوں کی بیداری ہمارے لئے تباہ کن ہے۔ اس طرح ہم جن راستوں پر کام کر رہے ہیں ان پر کام کرنا ممکن نہ رہے گا، ہماری محنت کا پھل موخر ہو جائے گا اور ہماری جدوجہد ضائع ہو جائے گی۔“(1)

مبشرین کے سب سے بڑے راہنما ”صموئیل زویمر“ کے خیالات ملاحظہ فرمائیے۔ اس نے کہا:

”ہم نے اسلام کو نقصان پہنچانے کے لئے کثیر وقت اور سرمایہ صرف کیا۔ بے شمار کتابیں تصنیف کیں لیکن ہمیں کچھ حاصل نہ ہوا۔ اسلام سے صرف انہی لوگوں نے رابطہ توڑ کر عیسائیت اختیار کی جن کی اپنے نئے دین سے محبت خواہشات کی بنیاد پر تھی۔“

اپنی کوششوں کی ناکامی کا اعتراف کرنے کے بعد اس نے کہا:

”عیسائی مبشر کو مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی کوششوں میں ناکامی پر مایوس اور ناامید نہیں ہونا چاہئے۔ تمہارے لئے یہی کافی ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں اسلامی عقیدے کو متزلزل کر دو۔ اگر تم ان کو اسلام کے متعلق متذبذب بنانے میں کامیاب ہو گئے تو یہی تمہاری کامیابی ہے خواہ وہ عیسائیت کے حلقے میں داخل نہ ہوں۔“(2)

ایک اور مقام پر یہی مستشرق کہتا ہے:

”میرا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں عیسائیت داخل کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم عقیدے کے اس محل کو منہدم کریں جو ان کے دلوں میں مضبوطی سے قائم ہے۔ اس طرح جب یہ لوگ مسلمان نہیں رہیں گے تو ہمارے بعد آنے والے عیسائی مبشرین کے لئے ان کے دلوں میں عیسائیت کا عقیدہ داخل کرنا آسان ہو جائے گا۔“(3)

1۔”قوی الشر المتحالفۃ“، صفحہ 133

2۔ایضاً، صفحہ 136

3۔ایضاً

"صموئیل زویمر" ایک مقام پر اپنی ناکامیوں کا اعتراف ان الفاظ میں کرتا ہے:
"میں تمہارے سامنے اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ مسلمانوں میں سے جو لوگ حلقہ عیسائیت میں داخل ہوئے، وہ حقیقی مسلمان نہ تھے۔ وہ یا تو ایسے کم سن بچے تھے جن کے گھر میں ایسا کوئی آدمی نہ تھا جو ان کو اسلام کی تعلیم دیتا یا وہ لوگ تھے جن کی نظروں میں کسی بھی دین کی کوئی وقعت نہیں۔ ان کا دین صرف روٹی کے چند لقمے ہیں۔ ایسے لوگ غربت سے مجبور ہو کر صرف اپنا پیٹ بھرنے کی خاطر دین عیسوی میں داخل ہوئے۔ اور یا عیسائیت میں وہ لوگ داخل ہوئے جن کے پیش نظر صرف چند شخصی مقاصد تھے۔ لیکن مسیحی ممالک نے تمہیں اسلامی ممالک میں جس فریضہ کی ادائیگی پر مقرر کیا ہے وہ یہ نہیں کہ تم مسلمانوں کو حلقہ عیسائیت میں داخل کرو کیونکہ ایسا کرنے میں تو مسلمانوں کی عزت و تکریم ہے۔ تمہاری ڈیوٹی یہ ہے کہ مسلمانوں کو دائرہ اسلام سے خارج کر دو۔ تاکہ یہ ایک ایسی مخلوق بن جائے جس کا خدا کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو۔ اپنے اس عمل کی وجہ سے تمہیں ممالک اسلامیہ میں استعماری فتح کے لئے ہر اول دستہ کی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔"(1)

ہم نے ذرا تفصیل سے ان عزائم اور ارادوں کو بیان کر دیا ہے جن کے ساتھ مبشرین کے تبلیغی مشن ممالک اسلامیہ میں داخل ہوئے۔ ان عزائم کو تفصیلاً بیان کرنا اس لئے ضروری تھا کہ مبشرین گو اسلام کے سخت دشمن ہیں لیکن انہوں نے مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لئے مختلف لبادے اوڑھ رکھے ہیں۔

مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ جب وہ اہل مغرب کو اپنے ممالک میں فلاحی اور تعلیمی کاوشیں کرتے ہوئے دیکھیں تو صرف ان کے ظاہر کو دیکھ کر دھوکے میں نہ آجائیں بلکہ ان کے اصل عزائم کو دیکھنے کی کوشش کریں جن کے تحت انہوں نے ان نیک کاموں کے لئے اسلامی ممالک کو منتخب کیا ہے۔

گزشتہ صفحات میں مبشرین کے جن عزائم اور مقاصد سے پردہ اٹھایا گیا ہے، ان مقاصد کو اپنے سینوں میں چھپائے، عیسائیت کے تربیت یافتہ مبشرین نے عالم اسلام کا رخ کیا۔ سب

1۔ "قوی الشر المتحالفۃ"، صفحہ 137

سے پہلے فرانس سے تبشیری مشنوں نے عالم اسلام کو اپنا تختہ مشق بنایا۔

سترھویں صدی عیسوی کے آغاز میں فرانس کے کیتھولک عیسائی مشن شام پہنچے۔ انہوں نے وہاں مدارس اور دوسرے تعلیمی ادارے قائم کئے۔ انہوں نے کئی کتابیں بھی چھاپیں۔ اس کے بعد امریکہ بھی میدان میں آگیا اور انہوں نے بھی اپنے تبلیغی مشن ممالک اسلامیہ میں بھیجنے شروع کر دیئے۔ کچھ عرصہ بعد جرمنی اور برطانیہ نے بھی فرانس اور امریکہ کی تقلید کی۔

ان تبلیغی مشنوں کا نشانہ پورا عالم اسلام تھا۔ مختلف ممالک سے جو مشن اسلامی ممالک میں وارد ہوئے، ان کے حالات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مشن صرف کلیسا کی کوششوں سے عالم اسلام میں وارد نہیں ہوئے تھے بلکہ ان مشنوں کو بھیجنے میں ان ممالک کی حکومتوں کا بھی بڑا دخل تھا۔

یہی وجہ ہے کہ فرانس کا پہلا مشن شام میں کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد مالی مجبوریوں کی وجہ سے واپس چلا گیا لیکن جب امریکہ کے تبشیری مشن شام میں پہنچے تو فرانس کو دوبارہ اپنا مشن شام بھیجنا پڑا کیونکہ وہ امریکہ کے لئے میدان خالی نہیں چھوڑ سکتے تھے۔

ممالک اسلامیہ میں جو عیسائی مشن مصروف عمل تھے، چونکہ ان کا تعلق مختلف ملکوں سے تھا، ان ممالک کے مفادات ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے اور ان مشنوں میں عیسائیوں کے مختلف فرقوں کی نمائندگی کرنے والی جماعتیں موجود تھیں اس لئے اسلامی ممالک میں وہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوششوں میں مصروف تھے۔

ڈاکٹر محمد ابراہیم الفیومی نے اپنی کتاب "الاستشراق رسالۃ الاستعمار" میں ان تبلیغی مشنوں کے حالات بڑی تفصیل سے لکھے ہیں۔ وہ اہل مغرب کے رویے پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اہل مغرب اپنے ممالک میں مذہب کے خلاف مصروف پیکار ہیں لیکن وہی لوگ عیسائی مبلغین کو ممالک اسلامیہ کے طول و عرض میں عیسائیت کی تبلیغ کے لئے بھیجتے ہیں۔"(1)

ظاہر ہے اس طریقے سے مغرب کے اہل سیاست دوہرا فائدہ حاصل کر سکتے تھے۔

1۔ "الاستشراق رسالۃ الاستعمار"

ایک طرف تو مبشرین کی توجہ ممالک اسلامیہ کی طرف مبذول ہو جانے کی وجہ سے مغرب میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کے باہمی جھگڑوں میں کمی آسکتی تھی، دوسرا یہ مبشرین اپنی کارروائیوں کی وجہ سے مشرق میں مغربی سیاست کی کامیابی کے لئے راستہ ہموار کرسکتے تھے۔

مغرب سے جو تبلیغی مشن ممالک اسلامیہ میں آئے انہوں نے اپنا کام انتہائی عیاری سے کیا۔ انہوں نے یہاں آکر بڑے بڑے جلسے منعقد نہیں کئے۔ انہوں نے مسلمانوں کو مناظروں کی دعوت نہیں دی۔ دین اسلام کو جڑوں سے اکھیڑ پھینکنے کا نعرہ بلند کر کے وہ میدان میں نہیں آئے بلکہ انہوں نے مسلمانوں کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ ان کے ہمدرد، خیر خواہ اور دوست ہیں۔

انہوں نے سکول کھولے تاکہ عیسائیت کا بیج ان نونہال بچوں کے دلوں میں بو سکیں جن کو آسانی سے اپنی طرف مائل کیا جا سکتا ہے۔ ان کی توجہ اعلیٰ تعلیم پر نہ تھی بلکہ ان کی توجہ کا مرکز پرائمری تعلیم تھی کیونکہ اسی سطح پر وہ بچے کی طرف سے کسی مزاحمت کے بغیر اس کے دل سے ایمان کی دولت نکال سکتے تھے۔

ان سکولوں میں انہوں نے تربیت یافتہ عورتوں کو تدریس کے کام پر مقرر کیا جو بچوں کی نفسیات کی ماہر ہوتی تھیں اور بچوں کو آسانی سے اپنے شیشے میں اتار سکتی تھیں۔

انہوں نے عیسائی تعلیمی ادارے قائم کئے۔ جہاں یہ محسوس کیا کہ مسلمان اپنے بچوں کو عیسائی تعلیمی اداروں میں بھیجنے سے ہچکچاتے ہیں وہاں سیکولر ادارے قائم کر کے اپنے مقاصد حاصل کئے۔ انہوں نے اپنی یونیورسٹیوں سے بھی یہ کام لیا۔ 1957ء میں لندن میں "المشکلۃ الشرقیہ" کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی جس میں ایک عبارت یہ تھی:

"اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کے عقیدہ کی شکل مسخ کرنے کی ساری کوششیں ناکام ہو چکی ہیں لیکن ان مقاصد کو مغربی یونیورسٹیوں کی مدد سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ضروری ہے کہ ان جامعات میں داخلے کے لئے مسلمانوں میں سے ایسے طلبہ کا انتخاب کیا جائے جو کمزور طبیعتوں اور منتشر شخصیتوں کے ممالک ہوں۔ انہیں علمی سرٹیفکیٹ اور ڈگریاں دی جائیں۔ اگر ضروری ہو تو ان کے ہاتھ کسی بھی قیمت پر ڈگریاں بیچی جائیں تاکہ وہ ایسے مبشر بن سکیں جن کے مبشر ہونے کا کسی کو علم نہ ہو اور ہم نے مشرق میں سیاسی اور

سماجی رویوں میں جن بنیادی تبدیلیوں کو اپنا نصب العین بنا رکھا ہے اس میں وہ ہماری مدد کریں۔ میرا نظریہ یہ ہے کہ مغربی یونیورسٹیوں کو مشرقیوں کے علمی ڈگریوں کے جنون سے خوب فائدہ اٹھانا چاہئے اور مغرب کے ان ڈگری یافتہ لوگوں کو اپنے مقاصد کے لئے مبشرین اور اساتذہ کے طور پر استعمال کرنا چاہئے۔" (1)

مبشرین نے اپنے راہنماؤں کے اس قسم کے مشوروں سے خوب فائدہ اٹھایا۔ ان کی ان کوششوں ہی کا نتیجہ ہے کہ آج اسلامی ممالک کے مدارس، جامعات، اخبارات و رسائل، پارلیمانی اداروں اور حکومتی حلقوں میں کثیر تعداد ان لوگوں کی ہے جن کے نام اسلامی ہیں، وہ مسلمانوں کی زبانیں بولتے ہیں لیکن ان کے ذہن وہی کچھ سوچتے ہیں جو اہل مغرب سوچتے ہیں۔ ان کی زبانوں سے بھی وہی باتیں نکلتی ہیں جو اہل مغرب کے مقاصد پورے کرتی ہیں۔

ان لوگوں نے تعلیمی اداروں ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انہوں نے ہسپتال قائم کئے۔ وہاں علاج کی بہتر سہولتوں کے بندوبست کئے۔ ان ہسپتالوں میں جو عملہ متعین کیا ان کو مریضوں کے ساتھ ایسا سلوک کرنے کی تربیت دی جس سے وہ مریضوں کے دل جیت سکیں۔

مغربی ممالک میں آج تک نرس کو نرس ہی کہا جاتا ہے لیکن ممالک اسلامیہ میں اس کو مسلمان مریضوں کی ہمدرد، خیر خواہ اور غمگسار ثابت کرنے کے لئے سسٹر (Sister) کا لقب دیا گیا۔

ایک مریض آدمی کا ان لوگوں کا ممنون ہونا قدرتی بات ہے جو حالت مرض میں اس کا علاج کرتے ہیں، اس سے اظہار ہمدردی کرتے ہیں اور اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ مبشرین نے اس طریقے سے بھی مسلمانوں کو اپنی اور اپنے دین کی طرف مائل کرنے کی زبردست کوششیں کیں۔

تعلیمی ادارے اور ہسپتال قائم کرنے کے علاوہ مبشرین نے مختلف زبانوں میں بائیبل کے ترجمے شائع کر کے تقسیم کئے۔ قدرتی آفات میں متاثرین کی مدد کرنے کے لئے منظم پروگرام بنائے اور ان پروگراموں پر کثیر سرمایہ صرف کیا۔ انہوں نے اسلامی ممالک میں بے شمار تبشیری جماعتیں منظم کیں اور کئی گرجے تعمیر کئے۔

1۔ "قوی الشر المتحالفہ"، صفحہ 101

مبشرین نے انڈونیشیا کو اپنی تبلیغی سرگرمیوں کے لئے خصوصی طور پر منتخب کیا۔ یہاں تبشیری کوششیں 1500ء سے شروع تھیں، جب پرتگالیوں نے ان جزائر میں قدم رکھا تھا۔ وہاں تبشیری کوششیں زور و شور سے جاری رہیں حتیٰ کہ مبشرین نے 1967ء میں "مالانج" کے شہر میں ایک کانفرنس منعقد کی جس میں فیصلہ کیا گیا کہ جزیرہ جاوہ کے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کا کام بیس سال میں مکمل کیا جائے۔ یاد رہے کہ اس وقت جزیرہ جاوہ میں پینسٹھ (65) ملین مسلمان آباد تھے۔ اسی کانفرنس میں پورے انڈونیشیا کے تیرہ کروڑ سے زیادہ مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لئے پچاس (50) سال کا ہدف مقرر کیا گیا۔(1)

عیسائی ممالک کی حکومتوں کی بے پناہ مالی امداد کی وجہ سے انڈونیشیا میں تبشیری طوفان جس انداز سے پھیلا اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ 1975ء میں "پروٹسٹنٹ کلیسا آف انڈونیشیا" کے اعداد و شمار کے مطابق اس ملک میں 9819 گرجے، 3897 پادری اور 8504 جز وقتی مبشر تھے۔ اسی سال انڈونیشیا میں "کیتھولک چرچ" کے اعداد و شمار کے مطابق 7250 گرجے، 2630 پادری اور 5393 فارغ الوقتی مبشر تھے۔ ان مبشرین کے تصرف میں کئی ہوائی اڈے اور متعدد فضائی کمپنیاں تھیں۔ ذرائع ابلاغ ان کے کنٹرول میں تھے۔ کئی روزنامے ان کے تصرف میں تھے۔ اور کئی اشاعتی کمپنیاں، پریس اور ہسپتال ان کے کام میں معاونت کر رہے تھے۔

صرف ایک تبشیری تنظیم "کلینو موبیل" 180 ہسپتالوں، 129 ڈسپنسریوں، 345 میڈیکل ہالوں اور 45 کشتی ڈسپنسریوں کو ادویہ فراہم کرنے کی ذمہ دار تھی۔(2)

انڈونیشیا میں تبشیری کام کو وسعت دینے کے لئے مندرجہ ذیل طریقوں کو روبہ عمل لانے پر اتفاق ہوا۔

(ا) ایسی زمینیں جو گرجے اور کتب خانے قائم کرنے کے لئے زیادہ موزوں ہوں، ان کو ہر قیمت پر خرید لیا جائے۔ مثلاً ایک گرجے کے سامنے ایک چھوٹا سا گھر اسلام کی تبلیغ کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اس کو تیس لاکھ روپے میں خرید کر ڈسپنسری میں بدل دیا گیا۔

(ب) عوامی دلچسپی کے ایسے مراکز قائم کئے جائیں جو نوجوانوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکیں۔

(ج) کسانوں کو اپنے بچے تبشیری مراکز میں داخل کرانے کے بدلے میں اتنے قرضے

1۔ "الاستشراق وجہ للاستعمار الفکری"، صفحہ 101

2۔ ایضاً، صفحہ 3-102

دیئے جائیں جتنے قرضوں کا وہ مطالبہ کریں۔

(د) بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں ایسے مراکز قائم کئے جائیں جہاں لوگوں کو جمع ہونے اور ایک دوسرے سے تعاون کرنے کے مواقع میسر آئیں۔

(ہ) غریب لوگوں میں ضروریات زندگی مثلاً کپڑے اور چاول وغیرہ تقسیم کیے جائیں۔(1)

ہم نے انڈونیشیا کی تبشیری کوششوں کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کیا ہے۔ تبشیر کا یہ انداز صرف انڈونیشیا تک محدود نہ تھا بلکہ تمام ممالک اسلامیہ میں مبشرین نے اسی انداز سے اسلام کو ختم کرنے کی کوششیں کیں۔ وہ علاقے جن میں رہنے والوں کی اکثریت غریب اور ناخواندہ تھی، ان پر انہوں نے خصوصی توجہ دی۔ افریقہ کے ممالک بھی ان کی خصوصی توجہات کے مرکز تھے۔

انسان کے عقیدے کا تعلق اس کے دل سے ہوتا ہے اس لئے کسی کو کسی عقیدے کی طرف مائل کرنے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ اسے اس کے حالات کے مطابق چند مادی سہولتوں کا لالچ دے کر اس عقیدے کی طرف مائل کیا جائے۔ اسلام نے دین میں جبر کو اسی لئے خلاف ضابطہ قرار دیا ہے کہ جبر کا اثر جسم پر ہوتا ہے اور ایمان کا تعلق دل سے ہے۔ جبر سے انسان زبان سے تو کلمہ پڑھ سکتا ہے لیکن کسی انسان کے دل کو جبراً مسلمان نہیں بنایا جاسکتا۔

عیسائیوں نے اسلام کی تبلیغ کو روکنے اور عیسائیت کو پھیلانے کی کوششوں میں اس ضابطے کو بالکل مد نظر نہیں رکھا۔ انہوں نے ہر جائز و ناجائز طریقے سے لوگوں کو دائرہ عیسائیت میں داخل کرنے کی کوشش کی۔ تعلیم، علاج، مالی تعاون اور دیگر سہولتوں کا لالچ دے کر بھی انہوں نے اپنے دین کا حلقہ وسیع کرنے کی کوشش کی اور وقت پڑنے پر انہوں نے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لئے جارحیت سے کام لینے سے بھی دریغ نہ کیا۔

انڈونیشیا کے جزیرے "فلوریس" میں ناکام اشتراکی انقلاب کے بعد اس جزیرے کے مبشرین نے وہاں کے تمام مسلمانوں کو اشتراکی قرار دے دیا۔ جس کے نتیجے میں بے شمار مسلمانوں کو سخت سزائیں دینے کے بعد قتل کر دیا گیا اور اس عذاب اور موت سے صرف وہی لوگ بچ سکے جنہوں نے دین عیسوی میں داخل ہونا قبول کر لیا۔(2)

"علامہ مصطفی فوزی غزال" نے مبشرین کے طریقہ ہائے واردات کی حقیقت سے

1۔ "الاستشراق وجہ للاستعمار الفکری"، صفحہ 103

2۔ ایضاً، صفحہ 104

مسلمانوں کو آگاہ کرنے کے لئے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام انہوں نے "الخیل والاسالیب فی الد عوۃ الی التبشیر" رکھا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے متعدد واقعات ایسے لکھے ہیں جن میں لوگوں کو دھوکے، لالچ اور فریب کے ذریعے عیسائی بنانے کی کوشش کی گئی۔ غریب لوگوں کو چند سکوں کا لالچ دے کر ان کے جگر گوشے ان سے جدا کئے گئے، انہیں عیسائی بنایا گیا اور کئی بچوں کو یورپ منتقل کر دیا گیا۔ عیسائی راہبات نے نوجوان لڑکیوں کو بہلا پھسلا کر اور سبز باغ دکھا کر عیسائیت کی طرف مائل کیا۔(1)

عیسائیوں نے اپنے دین کو پھیلانے کے لئے ان تھک کوششیں کیں لیکن ان کوششوں میں ان کو شدید ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ جس عیسائیت کو وہ پھیلانا چاہتے تھے، اس کی تعلیمات میں اتنی جان نہیں تھی کہ وہ کسی سلیم الفطرت اور عقل سلیم رکھنے والے انسان کو اپنی طرف مائل کر سکیں اور اس کی کو پورا کرنے کیلئے انہوں نے جو حربے استعمال کئے ان کا اثر دل تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ مبشرین کے زعماء نے جن میں صموئیل زویمر پیش پیش تھا، یہ محسوس کر لیا کہ ہم کسی قیمت پر مسلمانوں کو عیسائی نہیں بنا سکتے۔ انہوں نے اس حقیقت کو سمجھ لیا کہ جو مسلمان بظاہر عیسائیت قبول کر لیتے ہیں وہ بھی دل سے ایسا نہیں کرتے بلکہ مادی مفادات حاصل کرنے کی خاطر محض زبان سے عیسائی ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے پروگرام بنایا کہ مسلمانوں کو عیسائی بنانے کا خواب دیکھنا چھوڑ دو کیونکہ یہ کام ناممکن ہے۔ مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی کوششوں کی بجائے تم کوشش کرو کہ مسلمان، مسلمان نہ رہیں۔ گو ان کے نام مسلمانوں والے ہوں، مردم شماری میں ان کا شمار مسلمانوں میں ہوتا ہو، لیکن ان کے دل مسلمان نہ ہوں۔ نہ ان کی سوچ مسلمانوں والی ہو اور نہ ان کا عمل مسلمانوں کے عمل سے کوئی مشابہت رکھتا ہو۔ ان کو ایسی مخلوق بنا دو جن کا خدا سے کوئی تعلق نہ ہو۔

ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مبشرین مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی کوششوں میں جس بری طرح ناکام ہوئے ہیں، مسلمانوں کے دلوں سے اسلام کو نکالنے کی کوششوں میں وہ اتنے ہی کامیاب ہوئے ہیں۔ اپنی اسی کامیابی کی بنا پر انہوں نے ممالک اسلامیہ کو اپنے استعماری تسلط میں لیا۔ اسی کامیابی کی بنا پر وہ طویل مدت تک ممالک اسلامیہ کے سیاہ وسفید

1۔ مصطفیٰ فوزی غزال، "الخیل والاسالیب فی الد عوۃ الی التبشیر"، (مطابع المجموعۃ الاعلامیہ)

کے مالک بنے رہے اور ان کی انہی کامیابیوں کا نتیجہ ہے کہ آج بھی اسلامی ممالک کی داخلی اور خارجہ پالیسیاں انہی کے اشاروں پر مبنی ہیں۔

مبشرین کی کوششوں سے مسلمان اہل مغرب کے ذہنی غلام بن چکے ہیں۔ اہل مغرب کی کوششیں اب اسی بات پر مرتکز ہیں کہ مسلمان اسی طرح اپنے دین سے بے گانہ رہیں تاکہ ان کے متعلق اہل مغرب کی سیاسی چالیں بدستور کامیاب ہوتی رہیں۔

حکومتی اور تجارتی اداروں سے رابطہ

مستشرقین نے ممالک اسلامیہ میں مختلف ناموں کی تنظیموں کے تحت جتنی کارروائیاں کیں ان کے مقاصد ایک ہی تھے لیکن چونکہ انہوں نے مختلف بھیس بدلے ہوئے تھے اس لئے عموماً لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اہل مغرب کی مختلف تنظیمیں مختلف مقاصد کے تحت سرگرم عمل رہی ہیں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی علم کا پیاسا تھا جو علم کی پیاس بجھانے کے لئے مشرق کے کونے کونے میں پھر تا رہا۔ کوئی تاجر تھا جو اپنی تجارتی سرگرمیوں کو وسعت دینے کے لئے نئے امکانات کی تلاش میں تھا۔ کچھ لوگ وہ تھے جو اپنے مذہب کا جھنڈا اکناف عالم میں لہرانا چاہتے تھے اور اس جذبے کے تحت مشرق خصوصاً ممالک اسلامیہ میں سرگرم عمل تھے۔ اور کچھ لوگ وہ تھے جو ممالک اسلامیہ کو اپنے سیاسی تسلط میں لانے کے لئے تدبیریں سوچ رہے تھے۔ یہ سب لوگ اپنے اپنے میدان میں سرگرم عمل تھے اور ان کا باہم کوئی تعلق نہ تھا۔

لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ ان مختلف مقاصد کے حامل لوگ مشرق میں بالکل یک جان تھے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انفرادی طور پر ان میں سے کوئی تنظیم بھی اپنے مقاصد تنہا حاصل نہ کر سکتی تھی۔ سیاستدانوں کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنے قدم ان ممالک میں جمانے سے پہلے ایسا بھیس بدلیں جو مقامی لوگوں کے دلوں میں نہ کھٹکے۔ علمی کام کرنے والوں اور تبلیغی فریضہ سرانجام دینے والوں کے لئے ضروری تھا کہ انہیں ایسے لوگوں کا تعاون حاصل ہو جو ان کی مالی معاونت بھی کریں اور انہیں تحفظ بھی فراہم کریں۔ اجنبی علاقوں میں اپنی تجارت کو وسعت دینے والے بھی دوسروں سے بے نیاز نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لئے وہ سب یک جان ہو گئے۔

جو لوگ عیسائیت کا جھنڈا ساری دنیا پر لہرانا چاہتے تھے انہیں اس صورت حال سے بہت فائدہ پہنچا۔ مغربی حکومتوں نے بھی ان کے ساتھ دل کھول کر تعاون کیا اور سرمایہ داروں نے بھی۔ مبشرین نے مشرقی ممالک میں جو بے شمار سکول، ہسپتال، ڈسپنسریاں اور دوسرے خیراتی ادارے قائم کئے، وہ اس بات کی دلیل ہیں کہ ان کی پشت پناہی ان کی حکومتیں کر رہی تھیں۔

واسکوڈے گاما نے 1498ء میں اہل مغرب کے لئے ہندوستان کا راستہ دریافت کیا۔ اس کے بعد پرتگالیوں نے اپنی اس سلطنت کی بنیادیں رکھنا شروع کر دیں جس کی حدیں مالقہ سے ہندوستان اور سیلون تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان حکمرانوں کے بعد پرتگالی تاجر آئے جنہوں نے اپنے حکمرانوں کی پشت پناہی میں مشرقی تاجروں کا مقابلہ کیا۔ ان کے بعد مبشرین آئے اور انہوں نے اپنی حکومتوں کے زیر سایہ اپنی سرگرمیاں شروع کیں۔(1)

کلیسائے برطانیہ کی تبشیری کونسل نے 1910ء میں ہندوستان میں اپنے کام کی رفتار کا جائزہ لیتے ہوئے اعتراف کیا:

"دو ہزار تبشیری مراکز، ایک ہزار مدرسے اور سینکڑوں تبلیغی مہمیں سرگرم عمل ہیں۔ ان کے علاوہ ایک اعلیٰ تعلیم کا مدرسہ ہے جس میں مسلمان بھی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ تبشیری کوششوں کی ان کامیابیوں کا سبب وہ تعاون اور امداد ہے جو مبشرین کو مسٹر لورنس، سر منٹگمری اور کرنل مارٹن کی طرف سے حاصل ہوتی ہے، جن کے ہاتھوں میں پنجاب کی زمام اقتدار ہے۔ ان کے اس تعاون کے سبب تبشیر کا میدان وسیع ہو گیا ہے۔ کثرت سے سکول اور ہسپتال قائم کئے گئے ہیں۔ کتابیں شائع کی گئی ہیں۔ ٹیکنیکل ٹریننگ سکول قائم ہوئے ہیں۔ تبشیری کتابوں کے اردو اور سندھی زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں۔ بادشاہوں اور رئیسوں کی سرپرستی میں تبشیری کاموں کو ترقی دینے کے لئے نمائشوں کا بندوبست کیا جاتا ہے۔"(2)

مستشرقین کے مختلف شعبوں کی مالی معاونت جو پہلے مغربی حکومتوں نے اپنے ذمے لے رکھی تھی وہ بعد میں دینی، سیاسی اور اقتصادی تنظیموں نے شروع کر دی۔ ان تنظیموں

1۔ "الاستشراق رسالة الاستعمار"، صفحہ 113

2۔ "الاستشراق وجه للاستعمار الفكري"، صفحہ 92

نے مستشرقین کی دل کھول کر مالی مدد کی۔ اس کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ "ڈاکٹر میشل" نے "الاخوان المسلمون" کے عنوان پر ڈاکٹریٹ کے لئے مقالہ لکھا اور اس تحقیقی کام کے لئے سارے اخراجات "فورڈ کمپنی" نے برداشت کئے۔(1)

یہی نہیں بلکہ 1960ء کے زمانے میں امریکہ میں علوم شرقیہ کے کئی ایسے ادارے قائم تھے جن کے اخراجات "فورڈ کمپنی" برداشت کرتی تھی۔(2)

یہودی گو عیسائیوں کے دشمن ہیں لیکن ممالک اسلامیہ میں جن کوششوں میں عیسائی مبشرین مصروف تھے ان کے لئے یہودیوں نے بھی دل کھول کر ان سے تعاون کیا۔ انہوں نے نہ صرف ان کے لئے اپنی تجوریوں کے منہ کھولے بلکہ "گولڈ زیہر، بندلی جوزی اور یوری ایفانوف جیسے جہاندیدہ اور ہوشیار لوگوں کو ان کی صفوں میں شامل کر کے ان کے کام کو آسان بنایا۔(3)

ہر مسلمان کو چاہئے کہ وہ خصوصی طور پر اہل مغرب کے اس رویہ کو پیش نظر رکھے کہ دو چیزیں جن کو خود اہل مغرب نے فضول اور بے کار سمجھا انہیں ممالک اسلامیہ میں رائج کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔

سائنس کے میدان میں مسلمانوں نے جس تجرباتی اسلوب کی بنیاد رکھی تھی، اس کو اپنا کر اہل مغرب نے یونانیوں کے جامد فلسفہ سے خود تو جان چھڑالی لیکن اس جامد فلسفہ کو مسلمانوں میں پھیلانے کی بھرپور کوششیں کیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اسلامی تاریخ کو ہر قسم کی خوبیوں سے معرا ثابت کرنے کے لئے سائنس کی موجودہ ترقیوں کا سہرا یونانیوں کے سر باندھتے ہیں۔

دوسری طرف مذہب عیسوی جو سینٹ پال کے ذہن کی اختراع تھی اور جس نے صدیوں یورپ کو جہالت اور ظلم کی تاریکیوں میں مقید رکھا، اس مذہب سے انہوں نے خود تو جان چھڑالی۔ اسے قومی زندگی سے بے دخل کیا، اس کے اخلاقی اصولوں کو نظر انداز کیا، قانون سازی میں اس کے دخل کو محال سمجھا اور عملاً اسے گرجوں میں بند کر دیا لیکن انہوں نے مسلمانوں کو اس وبا کا شکار بنانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔

1۔ الاستشراق وجہ للاستعمار الفکری"، صفحہ 93
2۔ ایضاً، صفحہ 29
3۔ ایضاً، صفحہ 93

اس مقصد کے لئے پروٹسٹنٹ، کیتھولک سے مل گئے۔ یہودی عیسائیوں کے ہمنوا بن گئے۔ مذہبی علماء اور سائنس دان ایک جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔

ان کے اس رویے کی وجہ ظاہر ہے۔ اور وہ یہ کہ ان کا دشمن مشترک تھا۔ وہی دشمن ان سب کے مقاصد کی تکمیل کے راستوں میں رکاوٹ تھا اور اس رکاوٹ کو ہٹانے کے لئے انہوں نے اپنے سارے باہمی اختلافات اور جھگڑے نظر انداز کر دیئے۔

سچ فرمایا ہے ہمارے علیم و خبیر رب نے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (1)

"اے ایمان والو! نہ بناؤ یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست (مددگار) وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اور جس نے دوست بنایا انہیں تم میں سے تو وہ انہی میں سے ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا ظالم قوم کو۔"

امریکہ میں علوم شرقیہ کی تحصیل اور اسلام کے خلاف جہاد کے لئے جو کوششیں جاری تھیں ان کے لئے فورڈ، روکفلر، کرنیجی اور ان جیسی پچاس کمپنیاں سرمایہ فراہم کر رہی تھیں۔(2)

مشہور مستشرق "فلنسک" نے "المعجم المفھرس لالفاظ الحدیث" مرتب کرنے کا بیڑا اٹھایا تو اس منصوبے کے لئے مالی امداد مہیا کرنے والوں میں ہالینڈ، برطانیہ، فرانس، امریکہ، اٹلی، یوگوسلاویہ، سویڈن، ڈنمارک اور ناروے کے کئی سرکاری ادارے شامل تھے۔(3)

مسلمانوں کو اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ اتنے عیسائی ممالک، جن کی اسلام دشمنی تاریخ کی ایک ثابت شدہ حقیقت ہے، کیا وہ یہ سب کوششیں مسلمانوں کی مدد اور انہیں فائدہ پہنچانے کے لئے کر رہے تھے یا ان کی ان بظاہر ہمدردانہ کوششوں کے پیچھے کچھ اور مقاصد کار فرما تھے؟

اس بات میں شک نہیں کہ مغربی حکومتیں مبشرین کو ہر قسم کی مالی امداد مہیا کرتی

1۔ سورۃ المائدۃ: 51
2۔ "الاستشراق وجہ للاستعمار الفکری"، صفحہ 31
3۔ ایضاً، صفحہ 118

تھیں۔ حکومتوں کے علاوہ متعدد تجارتی کمپنیاں بھی اس کام میں شریک تھیں لیکن اس سخاوت کا سبب ان کی دین عیسوی سے محبت نہ تھی بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ مبشرین اپنے کام کے ساتھ ساتھ ان سیاستدانوں اور تاجروں کے لئے بھی مشرق میں راستہ ہموار کرتے تھے۔ مبشرین سکول، ہسپتال، فلاحی اور خیراتی ادارے قائم کر کے اور مختلف طریقوں سے ضرورت مند لوگوں کی مدد کر کے مشرقی لوگوں کے دلوں میں اہل مغرب کے لئے اچھے جذبات پیدا کرتے تھے جس کی وجہ سے اہل مغرب کو ان ممالک میں اپنی سیاسی اور تجارتی کارروائیوں کے لئے مناسب ماحول میسر آجاتا تھا۔ اس کے علاوہ مبشرین ممالک شرقیہ میں ایسے آدمی بھی تیار کرتے تھے جو اپنی ساری صلاحیتیں اپنے ممالک میں مغربی سیاستدانوں اور تاجروں کی خدمت کے لئے وقف کر دیتے تھے۔

تبشیری انجمنیں اور تبشیری کانفرنسیں

یوں تو مبشرین نے سکول، کالج، یونیورسٹی، کتب خانے یا ہسپتال کی شکل میں جو بھی ادارہ بنایا وہ ایک تبشیری انجمن تھی اور اس کا کام اپنی حدود میں تبشیری کاموں کو منظم کرنا تھا۔

اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ امریکیوں نے بیروت میں علم کی خدمت کے نام پر ایک یونیورسٹی قائم کر رکھی تھی جس کا نام "الجامعۃ الامریکیہ" تھا۔ اس یونیورسٹی میں مسلم طلبہ بھی زیر تعلیم تھے۔ 1909ء میں مسلم طلبہ نے اس وجہ سے کلاسوں کا بائیکاٹ کیا کہ ان کو روزانہ گرجے جا کر عیسائی طریقے کے مطابق عبادت کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ مسلم طلبہ کے اس بائیکاٹ کے جواب میں یونیورسٹی کی انتظامیہ نے کہا:

> "یہ ایک عیسائی ادارہ ہے۔ اس کو عیسائیوں نے عیسائیوں کے مال سے شروع کیا ہے۔ اس کے لئے زمین انہوں نے خریدی۔ عمارت انہوں نے تعمیر کی۔ انہوں نے اس کے ساتھ ہسپتال قائم کیا اور اس کے لئے سارا سامان مہیا کیا۔ اگر یہ لوگ معاونت نہ کریں تو یہ ادارہ قائم نہیں رہ سکتا۔
>
> عیسائیوں نے یہ ساری محنت اس لئے کی ہے کہ وہ ایسی تعلیم عام کریں جس کی بنیاد تورات پر ہو۔ عیسائیوں کی ان بے پناہ قربانیوں سے فائدہ سب طلبہ اٹھاتے ہیں۔ اس لئے ہمارے ادارے میں جو طالب علم داخلہ لیتا ہے اسے پہلے سے معلوم ہونا چاہئے کہ اس ادارے میں داخل ہونے کے بعد اس سے کن

چیزوں کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے۔"(1)

مبشرین کے جو ادارے عالم اسلام کے طول و عرض میں تبشیری خدمات انجام دے رہے تھے، ان کے کام کو منظم کرنے کے لئے مبشرین نے قومی اور بین الاقوامی سطح پر ایسی انجمنیں بھی بنائیں جن کا دائرہ کار بہت وسیع تھا۔ اس قسم کی انجمنیں یورپ بھر میں موجود تھیں۔ ان میں سے چند ایک کا ہم یہاں ذکر کرتے ہیں۔

لندن کی تبشیری کونسل

یہ کونسل 1795ء میں وجود میں آئی۔ بے شمار عیسائی مذہبی راہنما اس تنظیم کے ساتھ منسلک تھے۔ اس تنظیم کی نہج پر سکاٹ لینڈ، نیویارک، جرمنی، ہالینڈ، سویڈن اور ناروے میں بھی تنظیمیں قائم ہوئیں۔ یہ تنظیم تمام غیر عیسائی دنیا میں اپنے مشن بھیجتی تھی۔ ہندوستان میں اس تنظیم کے مشن نے اس کام پر اکتفا کیا کہ غریب اور لاوارث بچوں کو اپنی تحویل میں لے کر عیسائی طریقے کے مطابق ان کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کرتی تھی۔(2)

1855ء میں برطانیہ اور امریکہ کے مسیحی نوجوانوں کی تنظیم قائم ہوئی۔ انہوں نے نارتھفیلڈ میں عیسائی طلبہ کی ایک کانفرنس منعقد کی جس میں اسی (80) مدارس کے دو سو پچاس (250) مندوب شریک ہوئے۔ اس کانفرنس نے مسیحیت کی تبلیغ کے لئے ایک سو نوجوانوں کی کفالت کا بیڑا اٹھایا۔ اسی تنظیم کی کوششوں سے "اجنبی ممالک میں تبلیغ عیسائیت کے لئے رضاکار نوجوانوں کی جمعیت" کا قیام عمل میں آیا جنہوں نے انجیل کی اشاعت پر سب کاموں کی نسبت زیادہ زور دیا۔(3)

1895ء میں "عیسائی طلبہ کے اتحاد کی عالمی انجمن" قائم ہوئی۔ اس کے قیام کے بعد ایک لاکھ کے قریب طلبہ اور اساتذہ نے اس کی رکنیت حاصل کی۔ ان طلبہ اور اساتذہ کا تعلق چالیس علاقوں اور قوموں کے ساتھ تھا۔(4)

1902ء میں "نوجوانوں میں تبلیغ عیسائیت کی انجمن" قیام پذیر ہوئی۔ یہ تنظیم عورتوں، نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کو مبشرین کی باتیں سننے کی طرف مائل کرتی تھی۔(5)

1۔ "قوی الشر المتحالفہ"، صفحہ 98
2۔ "الاستشراق وجہ للاستعمار الفکری"، صفحہ 105
3۔ ایضاً
4۔ ایضاً
5۔ ایضاً

1907ء میں ایک اور انجمن معرض وجود میں آئی جس کا مقصد عمر رسیدہ لوگوں میں عیسائیت کی تبلیغ تھا۔(1)

1890ء میں "جرمن تبشیری کونسل" وجود میں آئی۔ اس تنظیم کے مشن ساری دنیا خصوصاً مشرق وسطیٰ میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان کا مقصد ترکی خلافت کو ختم کرنا تھا، تاکہ اسرائیل میں یہودی ریاست کا قیام عمل میں آسکے۔(2)

اس وقت دنیا میں پانچ ہزار سے زیادہ عیسائیوں کی تبلیغی تنظیمیں ہیں جن کو مغربی حکومتیں عالم اسلام کے خلاف سازشوں کے لئے بھیجتی ہیں۔ صرف انڈونیشیا میں ایسی پچیس (25) بڑی بڑی تنظیمیں ہیں جو مسلمانوں اور دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو عیسائی بنانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔(3)

مبشرین کی ان لاتعداد کوششوں کے باوجود اسلام کے شجرہ طیبہ پر خزاں کے آثار نمودار ہونے کی بجائے اس پر تازہ برگ وبار نظر آنے لگتے ہیں۔ اسلام کی اشاعت کو روکنے کے لئے مبشرین جتنی کوششیں کرتے ہیں وہ اتنا ہی پھیلتا ہے۔

مبشرین حیران ہیں کہ مسلمانوں کے پاس اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لئے نہ تو منظم ادارے ہیں، نہ ان کے ذرائع ابلاغ اسلام کی اشاعت کے لئے موثر کوشش کرتے ہیں، نہ ہی ایسے رسالوں اور اخبارات کی بھرمار ہے جو اسلام کی اشاعت کے لئے سرگرم عمل ہوں، لیکن اس کے باوجود اسلام انتہائی سرعت سے پھیل رہا ہے۔ ایک مشہور مستشرق "کونت دی کاستری" کہتا ہے:

"مسلمانوں میں ایسے مبلغ نہیں ہیں جن کو خاص طور پر اسلام کی تبلیغ اور اسلامی احکام کی تعلیم کے لئے تربیت دی گئی ہو جیسے کہ عیسائیت کے تربیت یافتہ مبلغ موجود ہیں۔ اگر مسلمانوں میں اس قسم کے مبلغ ہوتے تو ہمارے لئے اسلام کے سرعت کے ساتھ پھیلنے کے سبب کو سمجھنا آسان ہو جاتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بادشاہ "شارلمان" ہمیشہ جنگوں میں اپنے ساتھ پادریوں اور راہبوں کی جماعت رکھتا تھا، تاکہ جب وہ علاقوں کو فتح کرلے تو اس کے بعد یہ لوگ مفتوحین کے

1۔ "الاستشراق وجہ للاستعمار الفکری"، صفحہ 105
2۔ ایضاً، صفحہ 106
3۔ ایضاً، صفحہ 154

دلوں کو فتح کر سکیں۔ لیکن اسلام کو پھیلانے کے لئے ہمیں ایسے لوگوں کا کہیں نشان نہیں ملتا۔ مسلمانوں نے اپنے دین میں داخل کرنے کے لئے کسی کو بھی نہ تو زبان سے اور نہ ہی تلوار سے مجبور کیا۔"(1)

"مورو بیر جر" نے اپنی کتاب "العالم العربی المعاصر" میں اسلام کی اشاعت کے متعلق یہ الفاظ لکھے:

"ہم جب اسلام کو افریقہ میں نہایت آسانی کے ساتھ پھیلتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ہم خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔"(2)

مبشرین اس قسم کے خطرات سے نمٹنے کے لئے کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں جن میں وہ تفصیل سے اپنے کام کا جائزہ لیتے ہیں۔ مبشرین کی پہلی کانفرنس مصر کے شہر قاہرہ میں 1906ء میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کی صدارت مشہور مستشرق اور مبشر "صموئیل زویمر" نے کی۔ ان کی دوسری کانفرنس 1910ء میں برطانیہ کے شہر ایڈنبرا میں منعقد ہوئی۔ ان دونوں کانفرنسوں کی وجہ سے فرانس اور جرمنی کی تبشیری جماعتوں کے درمیان گہرے روابط قائم ہوئے۔ مبشرین کی تیسری کانفرنس ہندوستان کے شہر لکھنو میں منعقد ہوئی۔(3)

1961ء میں جرمنی کے شہر برلن میں ایک خفیہ تبشیری کانفرنس منعقد ہوئی جس میں اعلان کیا گیا کہ "فاتحین کی نسل" افریقہ میں تبشیری مہم کو تیز کرنے کے لئے کثیر تعداد میں راہبوں اور پادریوں کو تیار کرے گی۔ اسی قسم کی ایک کانفرنس روم میں منعقد ہوئی جس میں فیصلہ کیا گیا کہ عالم اسلام خصوصاً افریقہ پر تبشیری یلغار کی شدت میں اضافہ کیا جائے۔(4)

مبشرین کی نگرانی میں جو جامعات چل رہی تھیں وہ بھی اسی قسم کی کانفرنسیں منعقد کرتی تھیں۔ امریکی یونیورسٹی کے فارغ التحصیل طلبہ نے قاہرہ میں اسی قسم کی ایک کانفرنس منعقد کی اور "وطن عربی کے مسائل" کو اپنی کانفرنس کا بڑا موضوع قرار دیا۔(5)

ان کانفرنسوں کو گو بظاہر مبشرین کی کانفرنسیں کہا جاتا ہے لیکن ان میں مستشرقین اور مستعمرین بھی شریک ہوتے تھے۔ اسی طرح مستشرقین کی کانفرنسوں میں بھی مبشرین کا

1۔ "قوی الشر المتحالفۃ"، صفحہ 115

2۔ ایضاً، صفحہ 124

3۔ "الاستشراق وجہ للاستعمار الفکری"، صفحہ 96

4۔ "قوی الشر المتحالفۃ"، صفحہ 125

5۔ ایضاً، صفحہ 103

کردار بہت اہم ہوتا تھا۔ استعماری کانفرنسوں میں بھی مبشرین اور مستشرقین کثیر تعداد میں شرکت کرتے تھے۔

ان کانفرنسوں میں یہ لوگ جس قسم کے پروگرام بناتے تھے ان کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے 1906ء میں قاہرہ میں منعقد ہونے والی پہلی تبشیری کانفرنس کے ایجنڈے پر ذرا غور فرمائیے:

اس ایجنڈے کی اہم شقیں مندرجہ ذیل تھیں۔

1۔ دنیا میں مسلمانوں کی تعداد کا جائزہ

2۔ افریقہ، سلطنت عثمانیہ، ہندوستان، فارس، ملایا اور چین میں اسلام اور مسلمانوں کے حالات کا تفصیلی سروے

3۔ ایسی کتابوں کی تیاری اور اشاعت جن کو تعلیم یافتہ مسلمانوں اور مسلم عوام کے درمیان پھیلانا ضروری ہے۔

4۔ لوگوں کو عیسائی بنانے کی کوششیں

5۔ مرتد ہو جانے والوں کا جائزہ

6۔ عیسائیت قبول کرنے والے غرباء کی مدد

7۔ مسلم عورتوں کے معاملات

8۔ مبشرین کی تربیت اور باہمی رابطہ

9۔ مسلمانوں کے لئے نظام تعلیم (1)

تبشیری کانفرنس کے اس ایجنڈے کے مطالعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مبشرین کو اسلام اور مسلمانوں کی کتنی فکر تھی۔ اس ایجنڈے میں ایک شق بھی ایسی نہیں جس میں مسلمانوں کے علاوہ کسی دوسرے مذہب کے لوگوں کو عیسائیت کی تبلیغ کا ذکر ہو۔

1913ء میں لکھنؤ میں منعقد ہونے والی کانفرنس میں جو فیصلے ہوئے ان کو بھی ایک نظر دیکھ لیں۔

1۔ مسلمانوں کے انداز فکر کو مغربی رنگ میں رنگنے کی کوشش کی جائے۔ مغربی زبانوں کو عام کیا جائے تاکہ مسلمان مغربی ادب اور مغربی تہذیب سے واقف ہو کر ان کی طرف مائل ہوں۔ اور ان حالات میں تبشیری جماعتیں اسلامی فکر کو مٹانے کے لئے اپنا کام کریں۔

1۔ "قوی لنشر المخالفۃ"، صفحہ 124

یہ بات ذہن میں رہے کہ مسلمانوں کا دین عیسائیت میں داخل ہونا خارج از امکان ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان کو اسلامی خصوصیات اور اسلامی اقدار سے محروم کر دیا جائے۔ اس طرح ان کے اندر دینی روح ختم ہو جائے گی جس کی بحالی ممکن نہیں ہو گی۔ اس مقصد کے لئے تبشیری مدارس کی تعداد میں اضافہ کیا جائے اور مغربی تعلیم کو مغربی زبانوں اور انداز فکر کے ساتھ تمام مسلمانوں میں پھیلایا جائے۔ تاکہ ان کے مدارس اور اخبارات و رسائل مغربی انداز اختیار کر لیں۔

2۔ رضاکار مبشرین کی جماعتیں تیار کی جائیں کیونکہ رضاکار کی زبان اور دل پیشہ ور کی زبان اور دل سے مختلف ہوتے ہیں۔

3۔ مسلمانوں کو سیاسی طور پر تقسیم کیا جائے تاکہ وہ سیاسی طور پر کمزور ہوں اور ان کے درمیان مغربی تہذیب کو پہنچنے کا موقع مل سکے۔

4۔ ایشیا اور افریقہ اہم انسانی منڈیاں ہیں۔ ان میں کام کرتے ہوئے عیسائیوں کو چاہئے کہ وہ اپنے باہمی اختلافات کو ظاہر نہ ہونے دیں ورنہ مقامی لوگ عیسائیت سے بدظن ہو جائیں گے۔

5۔ "زویمر" نے کہا مسلمان اگرچہ توحید پرست ہونے کے مدعی ہیں لیکن وہ "الہ" کی جو تعریف کرتے ہیں وہ "الہ" کی عیسائی تعریف سے مختلف ہے۔

6۔ مبشرین کو چاہئے کہ وہ مختلف طریقوں سے مسلمانوں کو موسیقی کا رسیا بنائیں۔ وہ نرمی سے گفتگو کریں۔ مخاطب کی ذہنی سطح کا خیال رکھیں۔ عقائد پر بات کرنے سے پہلے عام سماجی موضوعات کو شروع کریں۔ انجیل کے حوالے سے بات کریں تو اس بات کا خیال رکھیں کہ یہ بات وہی ہو جس میں قرآن اور انجیل متفق ہوں تاکہ مسلمانوں کے دلوں میں عیسائیت کے لئے نرم گوشہ پیدا ہو۔

7۔ طبی مراکز کو ہر سطح پر عام کریں اور دینی مناظروں سے پرہیز کریں۔

8۔ ایسے مدارس قائم کریں جن میں عربی کی تدریس کے لئے آسان اور عمدہ طریقہ کار اپنایا جائے تاکہ جامعہ ازہر کے متعلق مسلمانوں کا اعتقاد متزلزل ہو جائے۔

9۔ سستے نرخوں پر کتابیں مہیا کرنے کا بندوبست کریں اور کتابوں کی فروخت پر ایسے لوگ متعین کریں جو مسلمانوں کی نفسیات کو سمجھ کر ان سے گفتگو کریں تاکہ مسلمانوں کا

اعتماد حاصل کر سکیں۔

10۔ عیسائیت کے اہم عقائد پر رسالے لکھ کر ان کو سستے نرخوں پر مہیا کریں۔

11۔ تبشیری کاموں میں عورتوں سے مدد لی جائے۔ وہ مریضوں کی دیکھ بھال اور تبشیری مدارس میں کام کریں۔ دیہاتوں میں اور لوگوں کے گھروں میں جا کر لوگوں سے بات چیت کریں۔ مدارس البنات قائم کئے جائیں جہاں روزانہ انجیل سنائی جائے۔ جو مسلمان لڑکیاں بائبل نہ سننا چاہیں انہیں اس کی آزادی ہو کیونکہ اس طرح ممکن ہے ان کے والدین ان کو انجیل سننے کی اجازت دے دیں۔ تبشیر کے لئے بھی پیشہ ور مبشرات کی بجائے رضاکار عورتیں تیار کی جائیں۔

12۔ مناظرے اور مجادلے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ان سے وہ محبت ختم ہو جاتی ہے جس سے دوسرے کا دل متاثر ہوتا ہے۔ مبشر کا ہتھیار محبت اور حسن سلوک ہے۔ کیونکہ اعتقاد کا تعلق دل سے ہے۔ مبشر کے لئے ضروری ہے کہ وہ حسن اخلاق، استقامت اور عقلی خصوصیات سے متصف ہو تاکہ مبشرین کا حسن اخلاق عیسائیت کو اسلام سے بہتر ثابت کر سکے۔

13۔ مدرسہ پہلا مبشر ہے۔ اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھا جائے۔

14۔ انجیل کو مسلمانوں کی مختلف زبانوں میں ترجمہ کر کے کثرت سے شائع کیا جائے۔

15۔ ساجی خدمات کے ذریعے لوگوں کے دلوں کو جیتنے کی کوشش کی جائے۔(1)

عیسائی جس طرح لوگوں کو اپنے دین میں داخل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس بیان کو ختم کرنے سے پہلے ہم فرانس کے مستعمرین کے ایک تبشیری حربے کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

سینی گال کے فرانسیسی مستعمرین لوگوں کو وسائل حیات سے محروم کرتے تھے۔ پھر غریب سینی گالیوں کو غذائی اشیاء مثلاً چاول، گھی اور آٹے کی شکل میں امداد پیش کرتے تھے۔ اس امداد کے لئے شرط یہ تھی کہ ہر خاندان جس کو اس قسم کی امداد کی حاجت ہے وہ اپنے ایک پندرہ سال سے کم عمر کے بچے کو کلیسا کے حوالے کر دے۔ تاکہ کلیسا اسے اپنے مدارس میں تعلیم دے۔

جو لوگ اپنا لخت جگر کلیسا کے حوالے کرتے ان سے یہ وعدہ کیا جاتا کہ ان کے بچے کو

1۔ "الاستشراق وجہ للاستعمار"، صفحہ 99-97

یونیورسٹی کی سطح تک تعلیم دی جائے گی اور پھر اسے سینی گال واپس آنے سے پہلے فرانسیسی شہریت عطا کی جائے گی۔ اسے وہ تمام امتیازات حاصل ہوں گے جو فرانسیسیوں کو حاصل ہیں۔

سینی گالیوں سے بچہ وصول کرتے وقت یہ معاہدہ لکھا جاتا تھا کہ اگر کسی خاندان نے بچے کی تعلیم کی تکمیل سے پہلے اپنے بچے کی واپسی کا مطالبہ کیا تو اس نے جتنی امداد حاصل کی ہو گی وہ اسے واپس لوٹانا پڑے گی۔(1)

علمی مقاصد

مستشرقین کی پوری تحریک علمی لبادے میں کام کرتی ہے۔ یونیورسٹیوں میں علوم شرقیہ کی تعلیم حاصل کرنا، دنیا کے طول وعرض میں مدارس قائم کرنا، مخطوطات جمع کرنا، مختلف کتابوں کی تحقیق کرنا، کتابوں کو شائع کرنا، عربی کتابوں کے مختلف زبانوں میں ترجمے کرنا، مختلف موضوعات پر کتابیں تالیف کرنا، یہ تمام کام علمی کاوشوں کے زمرے میں شامل ہوتے ہیں، لیکن گزشتہ صفحات میں مستشرقین اور مبشرین کے جو متعدد بیانات ذکر کئے گئے ہیں ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان تمام علمی کاوشوں کے پیچھے علم کی خدمت کا جذبہ کار فرما نہ تھا بلکہ علم کی خدمت کے لبادے میں دراصل اسلام اور مسلمانوں سے مقابلہ مقصود تھا۔

عام مستشرقین کی علمی کاوشوں کا مقصد تو یہی ہے لیکن یہ اصول تمام مستشرقین پر لاگو نہیں ہوتا۔ مستشرقین میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے صرف علم کے حصول اور علم کی خدمت کے جذبہ سے اپنی زندگیاں تحقیق کے خارزار میں گزار دیں۔

اسلام کے موضوع سے ہٹ کر دیگر موضوعات پر انہوں نے علم کی قابل قدر خدمت کی ہے۔ اسلامی موضوعات پر بھی ان کے قلم سے ایسی باتیں نکلی ہیں جن میں اسلام اور مسلمانوں کے متعلق منصفانہ رویہ اختیار کیا گیا ہے۔ گو ان کی تحریروں میں بہت سی باتیں غلط بھی ہیں لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک آدمی جو مسلمان نہ ہو اور اس کے پیش نظر کتابوں کا وہ ذخیرہ ہو جو اسلام کے متعلق زہریلے پروپیگنڈے سے پر ہے، اس آدمی سے اس قسم کی غلطیوں کا صادر ہو جانا بعید از قیاس نہیں ہے۔

نیک نیتی یا بدنیتی سے قطع نظر، مستشرقین بے شمار علمی مقاصد کے تحت بھی علوم

1۔ "الاستشراق وجہ للاستعمار"، صفحہ 158

شرقیہ کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

علم دولت بھی ہے۔ علم طاقت بھی ہے۔ علم نور بھی ہے۔ علم حسن بھی ہے اور علم انسان کا زیور بھی ہے۔ اہل مشرق خصوصاً مسلمان اس دولت کے مالک تھے۔ ان کے ممالک کے طول و عرض میں اس دولت کے خزانے بکھرے ہوئے تھے۔ یہ خزانے کتابوں کی شکل میں بھی تھے، مخطوطات کی شکل میں بھی تھے اور ایسی انسانی اقدار اور رویوں کی شکل میں بھی تھے جو قوموں کو باوقار زندگی کی ضمانت دیتے ہیں۔

یورپ ان تمام نعمتوں سے محروم تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ طویل کشمکش نے اہل یورپ کو مسلمانوں کی قوت، شوکت، عظمت اور وقار کا راز معلوم کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ جب ان کو معلوم ہو گیا کہ مسلمانوں کی سطوت و شوکت کا راز ان کے دین میں اور اس علم میں مضمر ہے جو ان کو اس دین کی بدولت عطا ہوا ہے تو ان کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ اس حیات بخش اور قوت بخش علم کی طرف متوجہ نہ ہوتے۔

چاہئے تو یہ تھا کہ مسلمانوں کی شوکت و قوت کا راز معلوم ہونے کے بعد اہل مغرب بھی اسی منبع قوت سے قوت حاصل کرتے جس سے مسلمانوں کو یہ عظمت ملی تھی اور وہ بھی اسلام کے حلقے میں داخل ہو کر انہی عظمتوں سے بہرہ مند ہوتے جو مسلمانوں کے حصے میں آئی تھیں، لیکن افسوس! کہ اہل مغرب نے یہ منطقی اور معقول رویہ اختیار نہیں کیا۔

انہوں نے مسلمانوں کے مادی علوم سے تو جی بھر کر استفادہ کیا لیکن اسلام کے روحانی علوم سے اپنے سینوں کو منور کرنے کی سعادت سے وہ محروم رہے۔ بلکہ حق تو یہ ہے دین اسلام اور اس کے روحانی علوم کے چشمہ صافی کو مکدر کرنا ان بدنصیبوں نے اپنی زندگی کا مقصد وحید بنا لیا۔

اہل مغرب نے مسلمانوں کے مادی علوم سے خوب استفادہ کیا۔ علم الافلاک، جغرافیہ، تاریخ، سائنس، طب، ریاضی، فلسفہ اور حکایات کی کثیر تعداد میں کتابوں کو انہوں نے عربی سے مغربی زبانوں میں منتقل کیا، ان کو شائع کیا اور ان کتابوں کو اپنی یونیورسٹیوں میں شامل نصاب کیا۔ چونکہ علوم و فنون کے یہ خزانے عربی زبان میں تھے اس لئے انہوں نے ان علوم سے کماحقہ فائدہ حاصل کرنے کے لئے یورپ میں عربی کی تدریس کے اداروں کے جال بچھا دیئے۔

انہوں نے پورے عالم اسلام سے قیمتی مخطوطے جمع کیے۔ ایسی کتابیں تالیف کیں جو اس اسلامی علمی ورثے سے استفادے کو آسان بنا دیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے کانفرنسیں منعقد کیں تاکہ ان کانفرنسوں میں اس بات پر بحث کی جاسکے کہ علم کے اس ذخیرے سے کس طرح زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

مستشرقین اپنی انہی ان گنت اور ان تھک کوششوں کی وجہ سے تعریف کے مستحق ہیں۔ انہوں نے اپنی استشراقی کوششوں سے علمی مقصد اس خوبی سے حاصل کیا کہ آج ساری دنیا کے انسان حصول علم کے لئے یورپ اور امریکہ کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

اگر مغرب میں یونیورسٹیاں اور وہ لاتعداد لائبریریاں نہ ہوتیں جن میں کروڑوں کی تعداد میں کتابیں موجود ہیں تو شاید آج اہل مغرب کو ممالک اسلامیہ میں وہ اعتماد حاصل نہ ہوتا جو آج ان کو حاصل ہے اور جس اعتماد کی وجہ سے اسلامی ممالک عملاً ان کے ذہنی غلام ہیں۔

مستشرقین کی ان علمی کاوشوں نے مغرب کے اہل کلیسا، رجال سیاست اور کاروباری اداروں کے لئے بھی راستے ہموار کئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر مستشرقین نے علم کے میدان میں اتنی محنت نہ کی ہوتی تو ممالک اسلامیہ میں مبشرین، استعماری طاقتوں اور مغربی تجارتی کمپنیوں کے لئے کامیابی کا امکان کم ہو جاتا۔

اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ مستشرقین کو جتنی کامیابی علمی مقاصد کے سلسلے میں ہوئی ہے اتنی کامیابی ان کو نہ تو تبشیر کے میدان میں حاصل ہوئی اور نہ ہی استعمار کے میدان میں۔ کیونکہ گو مبشرین مسلمانوں کو بڑی حد تک اپنے دین کی تعلیمات سے دور کرنے میں تو کامیاب ہوئے لیکن صدیوں کی کوششوں کے باوجود وہ ان کو عیسائی بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ استعماری طاقتیں بھی ممالک اسلامیہ پر اپنا تسلط قائم کرنے میں تو کامیاب ہوئیں لیکن وہ اس تسلط کو برقرار رکھنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ اس کے برعکس علم کے میدان میں انہوں نے جو کچھ حاصل کیا اس نے مغرب کا نقشہ بدل دیا اور یورپ اور امریکہ کو وہاں تک پہنچا دیا جہاں تک پہلے کوئی انسانی معاشرہ نہ پہنچا تھا۔

اقتصادی مقاصد

علمی اور دینی مقاصد کے علاوہ تجارتی مقاصد بھی مستشرقین کے پیش نظر تھے جن کی وجہ سے وہ مشرقی زبانوں اور مشرق کے دیگر حالات کے مطالعہ کی طرف متوجہ ہوئے۔

اہل مغرب خصوصاً اٹلی کے لوگوں کے مشرقی ممالک کے ساتھ قدیم تجارتی تعلقات تھے۔ اہل مشرق کے ساتھ اپنے تجارتی معاملات کو اچھے طریقے سے طے کرنے کے لئے انہوں نے عربی زبان کی تعلیم کو ضروری سمجھا۔ اس لئے انہوں نے عربی زبان سیکھنے پر خصوصی توجہ دینا شروع کر دی۔

ان کوششوں کا نتیجہ یہ تھا کہ 1265ء میں تونس اور اٹلی کے شہر "بیزا" کے تاجروں کے درمیان جو تجارتی معاہدہ ہوا اسے عربی زبان میں لکھا گیا۔ (1)

چوتھے صلیبی حملے کے بعد اٹلی والوں نے باقی صلیبی قوتوں کی نسبت مسلمانوں کے بارے میں اپنے رویے میں تبدیلی کر لی۔ انہوں نے ممالک اسلامیہ کے ساتھ بہتر تعلقات استوار کرنے کی کوشش کی۔ ان کوششوں سے بھی ان کو مشرقی زبانوں اور تہذیبوں کو سمجھنے میں مدد ملی۔

وینس کو مشرق و مغرب کے درمیان ہمزہ وصل کی حیثیت حاصل تھی۔ وہاں کے لوگ عربی زبان بھی بولتے تھے۔ جب 1435ء میں سلطان محمد ثانی نے قسطنطنیہ کو فتح کر لیا تو انہوں نے عربی کے ساتھ ترکی کو بھی اپنے ہاں رائج کر لیا۔

اہل مشرق کے ساتھ اٹلی کی تجارت کو دیکھ کر فرانس بھی مشرق کے ساتھ تجارت کی طرف مائل ہوا۔ انہوں نے مشرقی ممالک خصوصاً لبنان کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم کئے۔ فرانس لبنان سے ریشم اور دوسری چیزیں درآمد کرتا۔ "ریشلیو" جو لوئی سیز دھم کا وزیر تھا، اس نے بحری تجارت کی کمپنی قائم کی۔ ھنری چہارم نے اس کمپنی کو وسعت دی اور لوئی پانزدھم کے عہد میں فرانس کے بازاروں میں اور دیگر مقامات پر مشرقی مصنوعات کی بھرمار نظر آنے لگی۔

فرانسیسیوں نے 1665ء میں "شارنتیہ" کی قیادت میں مشرقی ممالک کے سروے کے لئے ایک مہم ترتیب دی۔ اس مہم کے ارکان کی اکثریت مختلف شعبوں کے علماء اور ماہرین پر مشتمل تھی۔ (2) ان لوگوں نے فرانسیسیوں کے لئے ممالک شرقیہ کے خزانوں کا سراغ لگایا اور مختلف طریقوں سے انہیں حاصل کرنے کی کوشش کی۔

بعد میں اس قسم کی کوششوں میں انگلینڈ بھی شامل ہو گیا۔ انگلینڈ کی ایسٹ انڈیا کمپنی

1۔ "الاستشراق وجہ للاستعمار الفکری"، صفحہ 76

2۔ ایضاً

نے برصغیر میں جو کردار ادا کیا تھا، اسی قسم کا کردار دیگر ممالک اسلامیہ میں کئی مغربی تجارتی کمپنیوں نے ادا کیا۔ یہی تجارتی کمپنیاں استعمار کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔

جرمنی اور امریکہ بھی اس میدان میں کود گئے۔ انہوں نے اس میدان میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کی۔ ممالک اسلامیہ کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے خام مال کے ذخیروں اور دوسری دولت کو مغرب میں منتقل کرنے کیلئے انہوں نے ریلوے لائنیں بچھائیں۔

نپولین نے مصر پر حملہ کیا تو اپنے ساتھ علماء کا ایک لشکر بھی لایا تا کہ وہ ممالک شرقیہ کی دولت کا کھوج لگائیں اور اس کو اہل مغرب کے لئے حاصل کرنے کی تدبیریں سوچیں۔ واسکوڈے گاما کے ہندوستان کے سفر کے بعد پرتگال کی تجارتی کمپنیاں مشرقی ممالک میں سرگرم عمل ہو گئیں۔

مشرق میں دولت کے ذخیرے دیکھ کر اہل مغرب کے منہ میں کس حد تک پانی بھر آیا تھا؟ اس کا اندازہ ایک مستشرق "روبراخ" کے ان جملوں سے کیجئے۔ مستشرق مذکور نے اپنی ایک کتاب میں اپنے جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

"میں اس وقت کو اپنی چشم تخیل کے ساتھ کن حسین آرزوؤں سے دیکھ رہا ہوں جب (ہم بابل کے حسین علاقوں میں قیام پذیر ہوں گے۔) ہر طرف درختوں کی خوب صورت قطاریں ہوں گی۔ سیاہ فام مقامی لوگ شمالی عراق کے خوب صورت علاقوں کو ہماری خاطر خالی کر کے جنوب کے دور دراز علاقوں میں چلے جائیں گے تاکہ ہم جرمنوں کے لئے کثرت سے گندم پیدا کریں۔"(1)

مستشرق مذکور کے اس اقتباس کے بعد اس بات میں کیا شک رہ جاتا ہے کہ اہل مغرب کی نظریں صرف ممالک شرقیہ کی دولت پر ہی نہیں بلکہ وہ ان علاقوں کے باشندوں کو بھی اپنا غلام دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایک انگریز ادیب "سدنی لو" نے 1912ء میں مشرق کے متعلق مغربی لوگوں کے اس رویہ پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا:

"مغرب کی عیسائی حکومتیں کئی سالوں سے امم شرقیہ کے ساتھ جو سلوک کر رہی ہیں اس سلوک کی وجہ سے یہ حکومتیں چوروں کے اس گروہ کے ساتھ کتنی

1۔"الاستشراق رسالة الفكر"، صفحہ 120

مشابہت رکھتی ہیں جو پرسکون آبادیوں میں داخل ہوتے ہیں، ان آبادیوں کے کمزور مکینوں کو قتل کرتے ہیں اور ان کا مال اسباب لوٹ کرلے جاتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ یہ حکومتیں ان قوموں کے حقوق پامال کر رہی ہیں جو آگے بڑھنے کی تگ ودو میں مصروف ہیں۔ اس ظلم کی وجہ کیا ہے جو ان کمزوروں کے خلاف روا رکھا جارہا ہے۔ کتوں جیسے اس لالچ کا جواز کیا ہے کہ ان قوموں کے پاس جو کچھ ہے وہ ان سے چھیننے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ یہ عیسائی قومیں اپنے اس عمل سے اس دعویٰ کی تائید کر رہی ہیں کہ طاقت ور کو حق پہنچتا ہے کہ وہ کمزوروں کے حقوق غصب کرے۔ یہ قومیں اس سوچ کے صحیح ہونے کا ثبوت مہیا کر رہی ہیں کہ مسلح قوت کے سامنے اخلاق و آداب اور اجتماعی قدروں کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ ہاں! یہ قومیں اہل مشرق کے ساتھ معاملہ کرنے میں ہر قسم کی خوبیوں سے اس طرح تہی دامن ہو گئی ہیں کہ زمانہ قدیم کے ظالم ترین لشکروں میں بھی اس کی مثال نہیں ملتی۔"(1)

مشرق کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنا عام اہل مغرب کا معمول تھا لیکن مستشرقین، جو تشنگان علم و حکمت ہونے کے مدعی تھے، ان میں بھی ایک طبقہ ایسا تھا جو صرف روزی کمانے کے لئے تحریک استشراق میں شامل ہوا تھا۔ علم و سائنس کے دیگر شعبے جن میں آگے بڑھنے کے لئے سخت محنت کی ضرورت تھی، یہ لوگ ان شعبوں میں دوسروں کا مقابلہ کرنے کی سکت اپنے اندر نہیں پاتے تھے اس لئے وہ استشراق کی تحریک میں شامل ہو جاتے تھے۔ اس میدان میں مقابلے کی وہ کیفیت نہ تھی جو دوسرے علمی میدانوں میں تھی اس لئے وہ اس میدان میں آسانی سے نام پیدا کر سکتے تھے۔ مستشرقین کی اکثر تحریریں جو اسلام کے بارے میں ہیں ان کے مطالعہ سے انسان آسانی کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ وہ لوگ نہ تو السنہ شرقیہ کو جانتے تھے اور نہ ہی دیگر مشرقی علوم سے ان کا کوئی واسطہ تھا۔ وہ اپنے پیشروؤں کی تحریروں کو پڑھ کر ان کے خیالات کو ہی اپنے انداز میں پیش کر دیتے تھے اور بہت بڑے ادیب اور مستشرق کہلاتے تھے۔ لیکن یہ بات سارے مستشرقین پر صادق نہیں آتی۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو علوم اسلامیہ اور مشرقی زبانوں کے ماہر تھے لیکن انہوں

1۔ "الاستشراق وجہ للاستعمار"، صفحہ 108

نے جان بوجھ کر اسلام کی صورت کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔

چونکہ ممالک شرقیہ اسلامیہ میں بہت سے مادی فوائد اہل مغرب کو اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے اس لئے ان فوائد کو حاصل کرنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ اہل مشرق کی زبانوں، جغرافیہ، زرعی وسائل، انسانی خصوصیات اور ان کے دیگر حالات سے آگاہی حاصل کریں تاکہ جب وہ اپنے مختلف مقاصد کی خاطر مشرق کا سفر کریں تو انہیں مشرقی لوگوں سے میل جول اور لین دین میں آسانی ہو۔

یہی وجہ تھی کہ مالی کمپنیاں، تجارتی ادارے اور حکومتیں ان علاقوں کے تفصیلی جائزے کے لئے باقاعدہ مہمیں روانہ کرتی تھیں۔ چونکہ انسانوں کے رویے اور اخلاق میں ان کا دین اہم کردار ادا کرتا ہے اس لئے وہ مشرقی ادیان خصوصاً دین اسلام کی طرف بھی خصوصی توجہ دیتے تھے۔ وہ اسلام کے موضوع پر کتابیں لکھتے اور اس دین سے متعلقہ کتابوں پر تحقیق کرتے تھے۔

سیاسی مقاصد

مستشرقین جن مختلف مقاصد کی خاطر اقوام مشرق کی طرف متوجہ ہوئے تھے، ان میں سیاسی مقصد سر فہرست تھا۔ اقوام مغرب کے مشرق میں سیاسی مقاصد کو صرف دو عنوانوں کے تحت بیان کیا جا سکتا ہے:

1۔ سارے عالم اسلام پر سیاسی غلبہ

2۔ مملکت اسرائیل کا قیام

پرانے زمانے میں تو دستور یہ تھا کہ جب کوئی قوم کسی دوسری قوم کے کسی علاقے پر قبضہ کرنا چاہتی تھی تو اس کا ایک ہی طریقہ تھا کہ طاقتور قوم کمزور قوم پر حملہ کر دیتی۔ دوسری قوم میں اگر ہمت ہوتی تو حملہ آور قوم کا مقابلہ کرتی ورنہ ہتھیار ڈال دیتی۔ حملہ آور قوم اگر جنگ جیت جاتی تو مطلوبہ علاقے پر قابض ہو جاتی اور اگر ہار جاتی تو اپنے ناکام ارادے لئے واپس لوٹ جاتی۔

انسان جوں جوں مہذب ہوتا جا رہا ہے وہ دوسری اقوام کے حقوق غصب کرنے کو تو خلاف تہذیب نہیں سمجھتا البتہ اس لوٹ مار کے لئے بظاہر طاقت کے استعمال کو ترجیح نہیں دیتا بلکہ جھوٹ، فریب اور سازش یعنی میکیاولی سیاست کے ذریعے اپنے مقاصد کو حاصل

کرنا چاہتا ہے۔ گو ضرورت پڑنے پر طاقت کا بھی اس انداز میں استعمال کرتا ہے جس کی تاریخ انسانی کے تاریک ترین ادوار میں بھی نظیر نہ ملتی ہو۔ اس کی واضح مثال خلیج کی جنگ میں مغرب اور امریکہ کے مہذب انسانوں کی سفاکی اور درندگی ہے۔

اہل مغرب نے مسلمانوں کے ممالک پر قبضہ کرنے کا خواب دیکھا لیکن اس مقصد کے حصول کیلئے انہوں نے اپنے صدیوں کے تلخ تجربات کی بنا پر تلوار کے استعمال کو خلاف مصلحت سمجھا۔ انہوں نے انسانوں کی ایسی جماعتیں تیار کیں جنہوں نے علم کی محبت اور خدمت انسانیت کے حسین جامے زیب تن کر رکھے تھے۔ ان کا کام یہ تھا کہ وہ ممالک اسلامیہ میں ایسے حالات پیدا کریں کہ جب عملی طور پر اہل مغرب ان ممالک پر اپنا سیاسی تسلط قائم کرنے کے لئے آگے بڑھیں تو ان ممالک کے شہریوں کی طرف سے کسی قسم کی مزاحمت کا امکان نہ ہو۔

جن لوگوں کو اس مقصد کیلئے میدان میں اتارا گیا ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک طبقہ وہ تھا جنہوں نے علم کے شیدائیوں کا بھیس بدلا۔ اس طبقے کو مستشرقین کا نام دیا گیا۔ دوسرا گروہ وہ تھا جنہوں نے اہل مشرق خصوصاً مسلمانوں کو مختلف تدبیروں کے ذریعے عیسائیت کی طرف مائل کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس گروہ کو مبشر کا خوبصورت لقب دیا گیا۔

ان لوگوں کو اس کام پر مامور کرنے والوں میں دنیائے عیسائیت کے تمام کلیسے بھی شامل تھے۔ ان میں یہودی بھی شامل تھے۔ فرانس، جرمنی، برطانیہ، روس، امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کی حکومتوں نے بھی اس کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس کام کیلئے یہ مختلف اور باہم متحارب عناصر کیوں کر جمع ہو گئے؟ اس لئے کہ امت مسلمہ جس نے صدیوں چار دانگ عالم میں اپنی عظمت کے پھریرے لہرائے تھے، وہ اب انہیں اس بیمار کی طرح نظر آنے لگی تھی جو بستر مرگ پر پڑا اپنی زندگی کی آخری سانسیں گن رہا ہو۔ اس مرد بیمار کے ورثے پر تمام مغربی طاقتوں کی نظریں جم گئیں۔

ایک موقعہ پر ان میں سے بعض عناصر نے کوشش کی کہ یہ سارا ترکہ اسے مل جائے لیکن جب انہوں نے ایک دوسرے کے تیور دیکھے تو فوراً سمجھ گئے کہ اگر انہوں نے اس ترکے کو تقسیم کرنے کے لئے اتحاد کا مظاہرہ نہ کیا ہے تو ممکن ہے کہ کسی کو بھی کچھ نہ ملے۔

انہیں یہ بھی خطرہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ملت اسلامیہ میں کوئی ایسا راہبر فرزانہ سامنے

آ جائے جو اس قریب الموت مریض کی رگوں میں زندگی کا تازہ خون دوڑا دے۔ اس صورت میں نہ صرف یہ کہ وہ اس ترکے سے محروم ہو جائیں گے بلکہ ان کے اپنے وجود کو بھی خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ اس لئے انہوں نے اسلامی ورثے پر قبضہ کرنے کے لئے بڑی ہوشیاری سے منصوبہ بندی کی۔

انہوں نے پہلے عالم اسلام کو تمام پہلوؤں سے صحیح صحیح سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کام کے لئے انہوں نے تعلیم و تدریس، اشاعت کتب، علمی مہموں اور کھدائیوں وغیرہ کی شکل میں جو کوششیں کیں، ان کا ذکر پہلے مختلف عنوانات کے تحت ہو چکا ہے، یہاں اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ رجال سیاست کے لئے یہ بنیادی اہمیت کا کام جن لوگوں نے کیا وہ مستشرقین کہلاتے ہیں۔

مسلمانوں کے حالات کے تفصیلی مطالعہ کے بعد انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کی قوت کا راز کیا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ قوموں کی قوت و شوکت کا راز ان کے باہمی اتفاق و اتحاد میں مضمر ہوتا ہے۔ اتحاد ختم ہو جائے تو قومیں قوت و شوکت سے محروم ہو جاتی ہیں۔

انہوں نے مسلمانوں کو کمزور کرنے کے لئے مختلف حربے استعمال کئے۔ انہیں معلوم تھا کہ ملت اسلامیہ کسی ایک نسلی یا جغرافیائی وحدت کا نام نہیں بلکہ اس ملت میں مختلف نسلوں، مختلف رنگوں اور مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ موجود ہیں۔ ان کی بنائے وحدت نہ نسل ہے اور نہ رنگ، نہ زبان ہے اور نہ علاقہ بلکہ ان کی وحدت کی بنیاد ان کا عقیدہ ہے۔

اہل مغرب سمجھ گئے کہ مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں پر ان کے عقیدے کی گرفت ختم ہو جائے یا کمزور پڑ جائے تو یہ قوم پارہ پارہ ہو سکتی ہے۔ انہوں نے اسلامی عقیدے پر حملے شروع کر دیئے۔ پیغمبر اسلام ﷺ جو ہر مسلمان کے عقیدے کا مرکز ہیں، اہل مغرب نے ان کی ذات بابرکات پر ایسی الزام تراشیاں کیں کہ شرافت ندامت کی وجہ سے منہ چھپانے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

ہر برائی جس کا تصور ممکن ہے، اسے کائنات کے اس پاکیزہ ترین وجود کی طرف منسوب کیا گیا۔ قرآن حکیم کو آپ کے ذہن کی اختراع کہا گیا۔ مسلمانوں کو اسلامی اقدار سے بے بہرہ کرنے کی باقاعدہ مہم چلائی گئی۔ ایسی تعلیم کو فروغ دیا گیا جو مسلمانوں کو مسلمان نہ رہنے

دے۔ مسلمانوں کو یہ نصیحت کی گئی کہ اسلام چودہ سو سال پہلے تو ممکن ہے مختلف امور حیات میں بہتر راہنمائی کر سکتا ہو لیکن وہ آج کی ترقی یافتہ زندگی کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتا، اس لئے دین کو مسجدوں یا ذاتی زندگیوں تک محدود رکھا جائے اور قومی زندگی کے اجتماعی مسائل کے لئے مغرب کے کامیاب تجربات سے فائدہ اٹھایا جائے۔

اہل مغرب نے مسلمانوں کو بتایا کہ ان کا دین مجرموں کو جو سزائیں دینے کا حکم دیتا ہے وہ سزائیں ظالمانہ ہیں، اس ترقی یافتہ اور مہذب دور میں اس قسم کی سزاؤں کی گنجائش نہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کی ملی زندگی سے جہاد کو خارج کرنے کی کوششیں کیں۔ مسلمانوں کو اپنے تشخص اور اپنی تہذیب سے بے گانہ کر کے مغربی تہذیب کی طرف دعوت دی گئی۔

یہ سارے کام مغرب کے اہل سیاست نے مستشرقین اور مبشرین سے کرائے۔ مقصد یہ تھا کہ جب مستشرقین کے پھیلائے ہوئے خیالات و نظریات امت مسلمہ پر اثر انداز ہوں گے تو اس کا نتیجہ دو صورتوں میں ظاہر ہو سکتا ہے۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ ملت مسلمہ مجموعی طور پر ان پرکشش نظریات کو قبول کر لے گی۔ اس صورت میں دین کا عظیم الشان محل منہدم ہو جائے گا، بنائے وحدت ختم ہونے سے ملت انتشار کا شکار ہو جائے گی اور اس طرح یہ قوم کسی قسم کی مزاحمت کے قابل نہیں رہے گی۔ دوسری صورت یہ ممکن تھی کہ ملت کا ایک طبقہ مغربی خیالات و نظریات کو تسلیم کرلے گا اور دوسرا طبقہ ان نظریات کو اسلامی اقدار پر حملہ تصور کر کے انکی مخالفت کرے گا اور اس صورت میں بھی ملت کا اتحاد پارہ پارہ ہو جائے گا۔

ان مقاصد کو حاصل کرنے کیلئے استعماری طاقتوں نے مستشرقین اور مبشرین پر پانی کی طرح روپیہ بہایا۔ ان تنظیموں نے اس دولت کے بل بوتے پر تعلیمی اداروں، ہسپتالوں، فلاحی اداروں، غریبوں اور محتاجوں کے لئے امدادی منصوبوں، اخبارات و رسائل، کتابوں اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے مسلمانوں کو اپنے رنگ میں رنگنے کی بھرپور کوشش کی۔

مستشرقین اور مبشرین کو اپنی کوششوں کو آگے بڑھانے کے لئے خود امت مسلمہ میں سے بھی کئی بے ضمیر لوگ مل گئے جنہوں نے ان اسلام دشمن کارروائیوں کو آگے بڑھانے کے لئے زبردست کام کیا۔

مستشرقین نے مسلمانوں کو فرقہ واریت کے جہنم میں پھینکنا چاہا تو اس مشن کی تکمیل

کے لئے انہیں مسلمانوں کی صفوں میں سے کارکن میسر آگئے۔ انہوں نے اسلام کے بارے میں یہ فتویٰ صادر کیا کہ اس کی تعلیمات زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتیں، تو اس فکر کی ترویج کے لئے کئی مسلمانوں نے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ جہاد جو قصر ملت کے محافظ کی حیثیت رکھتا ہے، مستشرقین نے اسے ملت مسلمہ کی زندگی سے خارج کرنے کا ارادہ کیا تو اس ارادے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کیلئے انہیں ایسے کارکن میسر آگئے جن کے نام مسلمانوں والے تھے۔

خلافت عثمانیہ بھی اہل مغرب کے استعماری عزائم کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ تھی۔ یہ خلافت اگرچہ اپنی گزشتہ سطوت و شوکت سے محروم ہو چکی تھی لیکن اس کی صورت میں ملت اسلامیہ کے پاس ایک مرکز تھا۔ اس مرکز کے گرد وہ کسی بھی وقت اکٹھے ہو سکتے تھے۔ اہل مغرب ممالک اسلامیہ پر مغربی اور صلیبی پرچم لہرانے کی خاطر اس خلافت کا خاتمہ ضروری سمجھتے تھے۔ اس کام کیلئے بھی انہیں مسلمانوں کی صفوں سے کارندے مل گئے جنہوں نے اپنے ذاتی اقتدار کے لالچ میں مسلمانوں کے اس آخری سہارے کو بھی ختم کر دیا۔

مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنے والوں نے ایک طرف دین سے ان کا تعلق منقطع کرنے کی تدبیریں کیں تو دوسری طرف انہیں یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ مسلمان بعد میں ہیں اور پہلے وہ عرب، ترک، ایرانی اور افغان وغیرہ ہیں۔ اس طرح نسلی، لسانی اور علاقائی تعصبات کو بھڑکا کر مسلمانوں کو منتشر کرنے کی کوشش کی گئی۔

ایک انتہائی ظالمانہ وار جو اہل مغرب نے مسلمانوں پر کیا وہ یہ تھا کہ انہوں نے اہل مغرب کے نسلی تفوق کا نظریہ گھڑا اور اس نظریے کی اس ہوشیاری سے تشہیر کی کہ مسلمان اس کو حقیقت سمجھنے لگے۔ اس نظریے کی رو سے دنیا کے انسانوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ ہیں جو پیدائشی اور فطری طور پر اعلیٰ ہیں۔ وہ علم و حکمت کے میدانوں میں ترقی کرنے اور دنیا پر حکمرانی کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہیں۔ اس قسم کے اعلیٰ لوگ آریائی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور اہل مغرب کا تعلق اس نسل سے ہے۔ جب کہ دوسری قسم کے لوگ پیدائشی طور پر تخلیقی صلاحیتوں سے محروم ہوتے ہیں یہ لوگ نہ تو ایک بہتر تہذیب کو جنم دے سکتے ہیں اور نہ ہی وہ اپنے سیاسی امور کو خود چلانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ سامی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور مشرقی اقوام خصوصاً مسلمان سامی نسل

سے ہیں۔ ان لوگوں کیلئے مناسب ہے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرنے کی بجائے مغرب کی نقالی کریں۔ اپنے سیاسی مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے انہیں اپنے ممالک میں طلب کریں۔ تہذیب کا درس ان سے لیں اور ان کے ہر مشورے پر عمل کریں۔

اس نظریے کی خوب تشہیر کی گئی۔ ممالک اسلامیہ کی پسماندگی کی بنیادی وجوہات دو قرار دی گئیں۔ ایک تو ان کی فطری نااہلی اور دوسری یہ کہ وہ ایک ایسے دین سے منسلک ہیں جس کی تعلیمات جدید تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتیں اس لئے اپنی اہمیت کھو چکی ہیں۔

اہل مغرب نے مسلمانوں کو تاثر دیا کہ وہ ان کے خیر خواہ ہیں۔ وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں ان کی راہنمائی کر سکتے ہیں۔ مسلمانوں کے مسائل کو وہ مسلمانوں کی نسبت بہتر سمجھتے ہیں اور انہیں حل کر سکتے ہیں۔

ان تدابیر کی بدولت جب مسلمانوں کا اعتماد اپنی ذات سے، اپنی قوم سے اور اپنے دین سے اٹھ گیا تو اہل مغرب کو عالم اسلام میں کھل کھیلنے کا موقعہ مل گیا۔ انہوں نے اقوام مشرق خصوصاً ممالک اسلامیہ کو اپنے استبدادی پنجے میں کس لیا اور طویل مدت تک ان ممالک کو جی بھر کر لوٹتے رہے۔

انہوں نے مشرق میں اپنے لئے جو اقتصادی، دینی اور سیاسی اہداف مقرر کئے تھے وہ انہیں حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔

گو آج سے کچھ عرصہ پہلے انہیں ان ممالک کی آزادی کو تسلیم کرنا پڑا ہے لیکن انہوں نے مسلمانوں کی جو برین واشنگ کی ہے اس کے اثرات ابھی جوں کے توں قائم ہیں۔

دیگر مشرقی اقوام جو مسلمان نہیں تھیں وہ آزادی کے بعد اپنے پاؤں پر کھڑی ہو رہی ہیں لیکن مسلمان ابھی تک اہل مغرب کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

اس کی وجہ صدیوں کی وہی محنت ہے جو مستشرقین نے مسلمانوں کو فکری، اخلاقی اور عملی طور پر کھوکھلا کرنے کے لئے کی ہے۔

مُستشرقین کے علمی رُعب کے اَسباب

مستشرقین کے علمی رعب کے اسباب

دورِ جدید کے مصنف کے لئے ضروری ہے کہ وہ جو بات لکھے اس کا ثبوت مہیا کرے۔ اپنی ہر بات کو دلائل سے ثابت کرنا اور تاریخی وقائع و حوادث بیان کرتے ہوئے اور افراد و اقوام کے نظریات اور اقوال پر روشنی ڈالتے ہوئے مستند مصادر کا حوالہ دینا ایک مولف اور مصنف کی اہم ذمہ داری ہے۔ جو مصنف اپنی تصنیف میں اس انداز کو اختیار کرتا ہے اسے قابل اعتماد محقق اور ایک مستند مصنف شمار کیا جاتا ہے اور جو قلم کار اس انداز کو اپنائے بغیر اپنے خیالات وجذبات کو بیان کر دیتا ہے اسکی تصنیف کو ایک تحقیقی تخلیق کی حیثیت حاصل نہیں ہوتی۔

یہ رجحان بڑا مفید ہے۔ اس سے ان لوگوں کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے جو ہر رطب ویابس کو بغیر کسی دلیل کے اپنی کتابوں میں جمع کر دیتے ہیں۔ اس طرح حق و باطل میں تمیز ممکن نہیں رہتی۔ دوسری طرف ان لوگوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے جو تحقیق کے صبر آزما سفر پر روانہ ہوتے ہیں اور اس راستے کی ہر کٹھن منزل کو پامردی سے عبور کرتے ہوئے منزل مقصود تک پہنچتے ہیں۔ ان کی کوششوں سے حق کا رخ روشن ماہ تاباں کی طرح تابندہ نظر آنے لگتا ہے اور باطل کے چہرے سے تمام پردے ہٹ جاتے ہیں۔

اسلام اس قسم کی تحقیق کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اسلام ظن پر نہیں بلکہ علم پر اعتماد کرنے کا حکم دیتا ہے اور علم کی منزل تک رسائی دلائل قطعیہ کے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔

بدقسمتی سے اس مثبت رجحان میں ایک منفی رویہ ایسا در آیا ہے جس نے اس کی ساری افادیتوں پر پانی پھیر کر رکھ دیا ہے۔ ہمارے ہاں عام رجحان یہ ہے کہ جو مصنف اپنی تصنیف میں کسی مغربی قلم کار (Writer) کا حوالہ دے دیتا ہے اور اس کی تحریر کے چند اقتباسات سے اپنی تصنیف کو مزین کر دیتا ہے اسے بڑا روشن خیال ادیب اور غیر جانبدار محقق خیال کیا جاتا ہے۔ اس نے جس آدمی کا حوالہ دیا ہے اس کے بارے میں یہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی کہ متعلقہ موضوع کے متعلق اس کی معلومات کی حیثیت کیا ہے اور آیا وہ اس

قابل ہے کہ اس کی بات کو اس موضوع پر اتھارٹی (Authority) شمار کیا جائے یا وہ اس قابل نہیں ہے۔

یہ رویہ عام قسم کے موضوعات تک محدود نہیں بلکہ خالص اسلامی موضوعات پر بھی، جن پر مسلمان مفسرین، محدثین، فقہاء، مجتہدین اور مورخین سے بڑی اتھارٹی کوئی نہیں ہو سکتی، اسی کتاب کو زیادہ وزنی سمجھا جاتا ہے جس کے مصنف نے کسی یورپی مصنف کے چند اقتباسات نقل کئے ہوں اور اس کے مقابلے میں اس کتاب کو دقیانوسی شمار کیا جاتا ہے جس کے مصنف نے اپنی تصنیف کو قرآن حکیم، احادیث طیبہ، اقوال مجتہدین اور مسلم علماء کی تحریروں کے ٹھوس اور ناقابل تردید دلائل سے مزین کیا ہو۔

اس صورت حال کو دیکھ کر اس حقیقت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ہم علمی طور پر اہل مغرب خصوصاً مستشرقین سے کتنے مرعوب ہیں۔

ہم نے گزشتہ ابواب میں مستشرقین کے تفصیلی حالات لکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ تحریک استشراق کو علمی لبادے میں کام کرتی ہے لیکن اس تحریک کی تاریخ کے تفصیلی مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک علمی تحریک نہیں بلکہ یہ ایک کثیر المقاصد تحریک ہے جس کے پروگرام میں علم کی خدمت کو بہ نسبت دوسرے کئی مقاصد کو کہیں زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ تحریک انہی مقاصد کے تحت وجود میں آئی اور انہی کی تکمیل کے لئے صدیوں سرگرم عمل رہی۔

ان تمام حقائق کے باوجود یہ تحریک صرف ایک علمی تحریک کے طور پر متعارف ہے اور مشرق و مغرب میں لوگ مستشرقین سے علمی طور پر مرعوب ہیں۔ اس باب میں ہم ان اسباب کا جائزہ لیں گے جن کی بدولت مستشرقین کا علمی رعب قائم ہے تاکہ قارئین مستشرقین کے علمی رعب میں آکر ان کی ہر بات کو صحیح سمجھنے کی غلطی نہ کریں بلکہ نقد و جرح کے اصولوں پر پرکھ کر کسی بات کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کریں۔

مستشرقین کے علمی رعب کے اسباب کو ہم یہاں اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

اہل یورپ کی نسلی برتری کا نظریہ

مستشرقین کے علمی رعب کا ایک بہت بڑا سبب یہ ہے کہ انہوں نے کئی صدیاں مسلسل کوشش کی ہے کہ اہل مشرق خصوصاً مسلمان ان کی ہر قسم کی برتری کو تسلیم کرلیں۔

ان کوششوں میں ایک بہت بڑی کوشش اہل مغرب کی نسلی برتری کا نظریہ ہے۔ اس نظریے کو سب سے پہلے ایک فرانسیسی فلسفی "رینان" نے پیش کیا۔(1) "لیون جوتیہ" اور لابی (Lapie) نے اس نظریے کو پروان چڑھایا اور پھر مستشرقین اور استعماری طاقتوں نے اس نظریے کی اتنی تشہیر کی کہ یہ فرضی اور بے بنیاد نظریہ ایک ثابت شدہ حقیقت نظر آنے لگا۔

اس نظریے کی رو سے آریائی اقوام پیدائشی طور پر عقل و فہم اور نظم وضبط کی صلاحیتوں کے لحاظ سے سامی اقوام سے اعلیٰ اور برتر ہیں۔ سامی اقوام جن میں مسلمان سرفہرست ہیں وہ پیدائشی طور پر آریائی نسل کے لوگوں کی نسبت کم تر ہیں۔ وہ نہ اپنے معاملات کو خود سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی اپنے مسائل کو خود حل کر سکتے ہیں۔ اہل مغرب نے مسلمانوں کے ساتھ اپنے علمی، سماجی اور نظریاتی اختلافات میں اس نظریے کا خوب استعمال کیا۔ جب مسلمانوں نے ان کے کسی نظریے یا اجتماعی قدر پر اعتراض کیا تو انہوں نے ایک سادہ سا جواب دے کر معاملہ ختم کر دیا کہ سامی نسل کے لوگ کم تر فہم وادراک کے مالک ہیں۔ یہ ان اعلیٰ اقدار کو سمجھنے سے قاصر ہیں جن کو آریائی نسل کی اعلیٰ عقل و فہم نے جنم دیا ہے۔

یہ نظریہ اپنی موت آپ مر جاتا لیکن ممالک شرقیہ پر اہل مغرب کے استعماری غلبے نے اس نظریے کو تقویت بخشی۔ مغربی اقوام کو جب تسلط حاصل ہوا تو انہوں نے مغلوب اقوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ مغربی تسلط سے پہلے مشرقی اقوام جس بدنظمی کا شکار تھیں اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ مشرقی لوگ اپنی فطری کم فہمی اور عدم صلاحیت کی بنا پر اس قابل ہی نہ تھے کہ وہ اپنے سیاسی اور انتظامی معاملات کو خود کنٹرول کر سکتے۔ اہل مغرب مشرقی اقوام کو اس بدنظمی سے نجات دلانے کے لئے ان کے ممالک میں وارد ہوئے ہیں۔ ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ مشرقی اقوام ان کی راہنمائی میں اس راستے پر گامزن ہوں جو انہیں ترقی کی منزل تک پہنچا سکے۔

استعمار کے طویل دور میں اہل مغرب نے نہ صرف دل کھول کر اس نظریے کا پرچار کیا بلکہ اسی بیساکھی کے سہارے انہوں نے اپنے اقتدار کو طول دیا۔ جب نو آبادیات میں آزادی کی تحریکیں اٹھنے لگیں تو انہوں نے تصادم کا راستہ اختیار کرنے سے اسی لئے احتراز کیا کہ تصادم کی صورت میں ان کے اس نظریے کو ٹھیس پہنچنے کا خطرہ تھا جس کی بنا پر مغلوب

1۔ "الاستشراق رسالۃ الاستعمار"، صفحہ 235

اقوام کے عوام انہیں اپنا ہمدرد اور خیر خواہ سمجھتے تھے۔

اہل مغرب نے نو آبادیات کو خود مختاری دینے کا اعلان تو کر دیا لیکن مغربی لوگوں کی نسلی برتری کا جو تصور انہوں نے مشرقی ذہنوں میں پیدا کر دیا تھا وہ بدستور قائم رہا۔ چونکہ مستشرقین کی کوششوں کا اصل ہدف اسلام اور مسلمان تھے اس لئے ملت اسلامیہ پر آج تک ان کی ان کوششوں کے اثرات موجود ہیں۔

آزادی کے بعد اگر اسلامی ممالک کی زمام اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں آتی جو مخلص اور ایمان دار ہوتے اور ملت کے سفینے کو ساحل مراد تک پہنچانا اپنا فرض منصبی سمجھتے تو اہل مغرب کی نسلی برتری کا تصور خود بخود ختم ہو جاتا۔ لیکن بدقسمتی سے مسلمانوں کی زمام اقتدار ان لوگوں کے ہاتھوں میں آئی جو نہ اپنے دین کیلئے مخلص تھے اور نہ ہی ملت کے لئے۔ انہوں نے سیاسی اور انتظامی امور کو چلانے میں انتہائی بدنظمی کا مظاہرہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں نے مغربی اقتدار کا زمانہ دیکھا تھا وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ آج کے مسلمان حکمرانوں کی نسبت انگریز اور مغربی حکمران کہیں بہتر تھے۔

اس صورت حال میں نسلی برتری کے نظریہ کو، جسے اہل مغرب نے مسلمانوں پر مسلط کرنے کی کوشش کی تھی، مزید تقویت حاصل ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ آج اسلامی ممالک میں مغربی تہذیب، مغربی زبانوں اور مغربی انداز فکر کو تہذیب کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اس کا سب سے زیادہ فائدہ ان لوگوں کو پہنچتا ہے جو مختلف طریقوں سے اپنے افکار و نظریات مسلمانوں پر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ مستشرقین کا چونکہ یہی میدان ہے اس لئے وہ اس صورت حال سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ بعض مستشرقین نے تحقیق کے میدان میں ان تھک محنت کی ہے اور اس محنت کے نتیجے میں ایسا علمی ذخیرہ وجود میں آیا ہے جس سے مستشرقین کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی جی بھر کر استفادہ کر رہے ہیں۔ مستشرقین کی ان کاوشوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھنا ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ تحریک استشراق میں بے شمار لوگ ایسے بھی موجود ہیں جو نہ اسلام کو اسکے اصل مصادر کے ذریعے سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور نہ ہی انہوں نے اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کرنے کی کبھی کوشش کی ہے۔ اس قسم کے مستشرقین کی معلومات کا سارا سرمایہ ان کے ہم مشرب

مستشرقین کی تحریروں سے مستفاد ہوتا ہے اور ان تحریروں میں وہ نظریات درج ہوتے ہیں جو مستشرقین میں صدیوں سے نسل در نسل منتقل ہوتے چلے آرہے ہیں۔ ایسے مستشرقین جو اسلامی علوم کی روح سے عدم واقفیت کے باوجود اسلامی موضوعات پر خامہ فرسائی کرتے ہیں ان کی تحریروں کو بھی محض اسی بنا پر سند کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ ایک مستشرق کے قلم سے نکلی ہیں اور کسی یورپی زبان میں لکھی گئی ہیں۔

حق تو یہ ہے کہ جو آدمی کسی موضوع کی بنیادی باتوں سے ناآشنا ہو اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس موضوع پر ماہرانہ تبصرہ کرنے بیٹھ جائے۔ لیکن مستشرقین یہ کام بھی کرتے ہیں اور اس کے باوجود قابل اعتماد محقق سمجھے جاتے ہیں۔ اس کی ایک واضح مثال تھامس کارلائل کے قرآن حکیم کے متعلق تاثرات ہیں۔ اس نے اپنے لیکچر "On Heroes and Hero Worship" میں اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے متعلق بہت سی منصفانہ باتیں لکھیں لیکن قرآن حکیم کو اس نے غیر مرتب خیالات کا ایک تھکا دینے والا مجموعہ قرار دے دیا۔(1)

تھامس کارلائل کی اس تحریر سے یہ تاثر بھی ملتا ہے کہ اس نے قرآن حکیم کے اصل متن کو نہیں دیکھا بلکہ اس نے قرآن حکیم کو جارج سیل کے ترجمے کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ مستشرق مذکور جارج سیل کے بارے میں تو کسی قسم کے منفی تاثرات کا اظہار نہیں کرتا کہ اس نے ترجمے کا حق ادا کرنے میں کوتاہی کی ہے البتہ وہ کتاب، جس کو دنیا کے اربوں انسان صدیوں سے نسخہ ہدایت تسلیم کرتے آرہے ہیں اور جس نسخہ ہدایت کی روشنی میں اس کے ماننے والوں نے دنیا پر تہذیب و ثقافت کے ایسے نقوش ثبت کیے ہیں جو تاریخ کے اوراق میں روز روشن کی طرح چمک رہے ہیں، تھامس کارلائل جیسے محتاط مستشرق نے اس کتاب کے بارے میں بغیر تحقیق کے ایسے منفی تاثرات بیان کرنے میں ذرا جھجک محسوس نہیں کی۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ اتنی غلط بات کہنے کے باوجود اس کی ثقاہت میں ذرا فرق نہیں آیا کیونکہ وہ ایک مستشرق ہے اور مستشرقین کے متعلق اہل مغرب نے ہمیں بتا رکھا ہے کہ وہ السنہ شرقیہ اور علوم شرقیہ کے ماہر ہوتے ہیں۔

ہم نے یہاں تھامس کارلائل کی مثال پیش کی ہے جس نے اپنی تحریروں میں اکثر مقامات پر اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں منصفانہ رویہ اپنایا ہے۔ اس مستشرق نے یقیناً تاریخ اسلام میں یہ بات پڑھی ہوگی کہ عرب جو فصاحت و بلاغت میں اپنی مثال

1۔ "آن ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ"، صفحہ 299

آپ تھے، انہوں نے دشمنی کے باوجود قرآن حکیم کی معجزانہ فصاحت و بلاغت کو چیلنج کرنے کی کبھی جرأت نہیں کی۔ اس نے یہ بھی پڑھا ہو گا کہ اسی قرآن حکیم کی چند آیات نے عمر بن خطاب کے دل کی دنیا بدل دی تھی اور وہ سینہ جو عداوت اسلام کی آماجگاہ تھا وہاں اس دین متین کی محبت کے گلشن کھل اٹھے تھے۔

جس کتاب کی فصاحت و بلاغت کے متعلق اہل زبان کی رائے یہ تھی اس کتاب کو محض ایک غلط ترجمے کے ذریعے پڑھ کر اس کی شان اعجاز بلکہ اس کی عام ادبی خوبیوں کو چیلنج کرنا کہاں کی تحقیق ہے؟ جب ایک منصف مستشرق کی حالت یہ ہے تو متعصب مستشرقین کی حالت کیا ہو گی؟

حقیقت یہ ہے کہ مستشرقین نے اپنی تحقیق سے مطلوبہ نتائج برآمد کرنے کے لئے تحقیق کے اصل راستے کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ انہوں نے تحقیق کا ایک نیا نہج اپنایا ہے۔ مادی موضوعات پر ان کی تحقیق مثبت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مادی میدان میں بہت ترقی کی ہے۔ لیکن روحانیت، اخلاقیات، انسانی تاریخ اور مذاہب عالم خصوصاً اسلام کے متعلق ان کی تحقیق کا انداز نرالا ہے۔

وہ روحانی حقائق کو مادی پیمانوں سے ماپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اخلاق کو مفادات کے پیمانے پر پرکھتے ہیں۔ عالم بالا کے متعلق صحف سماویہ کے بیانات کو اپنی عقل سقیم پر پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور تاریخ کے ہر بیان کو بیسویں صدی عیسوی کی یورپی تہذیب کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ان کے اس انداز تحقیق کی رو سے یہ بات ممکن نہیں کہ مسلمان کسی قسم کے مادی لالچ کے بغیر حضور ﷺ کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ اس لئے وہ ان مادی مفادات کا کھوج لگانا ضروری سمجھتے ہیں جن کی وجہ سے مسلمان اس نبی عربی ﷺ کے گرد جمع ہوئے تھے۔

اپنے اس انداز تحقیق کی برکت سے انہیں ساتویں صدی عیسوی کے اوائل کی مکی زندگی میں بیسویں صدی عیسوی کے سرمایہ دارانہ نظام کی جھلک نظر آ جاتی ہے۔ کفار مکہ کے مظالم سے تنگ آ کر حبشہ ہجرت کر جانے والے مسلمانوں کے دلوں میں ان مستشرقین کو خفیہ سیاسی مقاصد نظر آ جاتے ہیں۔ وہ خالق کائنات کو کائنات کا خالق و مدبر ماننے کے لئے تیار نہیں خواہ اسکے لئے انہیں انسانوں کو بندروں کی نسل سے ثابت کرنا پڑے۔

ان لوگوں نے حقائق کو مسخ کرنے کیلئے بڑی ہوشیاری سے ایسا راستہ اختیار کیا ہے جس کی رو سے سچ کو جھوٹ ثابت کیا جا سکے۔ اور اس راستے کو انہوں نے تحقیق کا نام دیا ہے۔ وہ ہر بات کو عقل کے پیمانے پر ماپنے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن عقل سلیم ان کی علمی حماقتوں پر مسکراتی ہے۔ کیا عقل سلیم اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ اگر زمین کے مختلف خطوں میں کھدائی سے کسی عظیم تاریخی ہستی کے آثار نہ ملیں تو اس ہستی کے وجود کا انکار کر دیا جائے۔ جیسا کہ اس قسم کے محققین نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شخصیات کا انکار کر کے کیا ہے۔ مستشرقین کی اس قسم کی بے بنیاد تحقیق کو بھی ہمارے ہاں بلا جھجک تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ ہمارے اس رویہ کی وجہ اسی نسلی برتری کے نظریے کے اثرات ہیں۔

ہمارا یہ رویہ انتہائی حیران کن ہے۔ کیونکہ ہم مسلمان ہیں اور ہمارا دین ہمیں حکم دیتا ہے کہ ہم کسی بات کو قبول کرنے سے پہلے اس کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ ہمارے اسلاف کرام نے احادیث طیبہ کی چھان پھٹک کے لئے جو ضابطے وضع کئے ہیں اور سچ کو جھوٹ سے علیحدہ کرنے کے لئے جس عرق ریزی کا مظاہرہ کیا ہے اس کی مثال تاریخ تحقیق کے کسی دور میں ملنا ممکن نہیں۔ ہمارا رب ہمیں حکم دیتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًاۢ بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ○(1)

"اے ایمان والو! اگر لے آئے تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی خبر تو اس کی خوب تحقیق کر لیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم ضرر پہنچاؤ کسی قوم کو بے علمی میں پھر تم اپنے کئے پر پچھتانے لگو۔"

اسلام مسلمانوں کو یہ حکم نہیں دیتا کہ وہ غیر مسلموں کی بات کو محض اس لئے مسترد کر دیں کہ وہ کسی کافر کی زبان سے نکلی ہے۔ بلکہ اسلام کا حکم تو یہ ہے کہ ہر بات کو قرآن و حدیث اور عقل سلیم کی روشنی میں پرکھو۔ اگر وہ ان معیاروں پر پوری اترتی ہے تو اسے تسلیم کر لو اور اگر وہ ان معیاروں پر پوری نہیں اترتی تو اسے مسترد کر دو۔

جب تک مسلمان مستشرقین کی ہر بات کو بلا چوں و چرا تسلیم کرنے کے رویے میں تبدیلی نہیں کرتے اس وقت تک مستشرقین انہیں اپنی پسند کے راستوں پر چلاتے رہیں گے۔ چونکہ مستشرقین کا مشن ہی یہی ہے کہ مسلمان نہ اپنے دین کے قریب ہوں، نہ باہم

1۔ سورۃ الحجرات: 6

متحد ہوں اور نہ ہی معاشی اور سیاسی طور پر ترقی کریں اس لئے ہم جب تک ان کے اشاروں پر ناچتے رہیں گے، اس وقت تک نہ ہم اپنے حیات بخش دین کے قریب ہو سکیں گے، نہ ہمیں اتحاد کی نعمت میسر ہوگی اور نہ ہی ہم اقوام عالم میں باعزت مقام حاصل کر سکیں گے۔

نسلی برتری کے اس نظریے نے صرف مسلمانوں ہی کو تباہ نہیں کیا بلکہ یہ ساری انسانیت کے لئے تباہ کن ہے۔ یہودیوں کو اپنی نسلی برتری کے اسی زعم نے کسی زمانے میں کسی دوسری قوم کے ساتھ امن و سلامتی کے ساتھ رہنے کی اجازت نہیں دی۔ انہیں اپنی اسی غلط فہمی بلکہ حماقت کی بارہا ذلت آمیز سزا بھی ملی لیکن ان کے رویے میں تبدیلی نہیں آئی۔ جرمن قوم نسلی برتری کے زعم میں مبتلا ہوئی تو انہوں نے ساری دنیا کو ہلاکت کی بھٹی میں جھونک دیا۔ عبائے علم و معرفت زیب تن کرنے والے مستشرقین نے یہ نظریہ پیش کر کے پوری دنیا پر ظلم کیا ہے۔ مستشرقین کے اس ظلم کی سنگینی کا اندازہ اہل یورپ کو اس وقت ہوگا جب اس کا ردعمل ظاہر ہوگا۔

یورپ کی مادی ترقی اور منظم زندگی

انسان فطرتاً اشیاء کی ظاہری چمک دمک سے بہت متاثر ہوتا ہے۔ جھوٹی آن بان اور ظاہری چمک دمک کی محبت میں وہ بہت آگے نکل جاتا ہے اور بعض اوقات یہ چمک دمک اس کو اپنی اصلیت سے بھی چشم پوشی کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

آج یورپ کی زندگی میں چمک دمک بھی ہے۔ زندگی کی بے پناہ سہولتیں بھی موجود ہیں۔ عوام کا معیار زندگی بلند ہے۔ اہل یورپ نے ہر قسم کی صنعتوں خصوصاً دفاعی صنعت میں اتنی ترقی کی ہے کہ ساری دنیا اس میدان میں ان پر انحصار کرنے پر مجبور نظر آتی ہے۔ ان کے مقابلے میں اقوام مشرق باستثنائے چند بہت پسماندہ ہیں۔ ممالک اسلامیہ خصوصی طور پر اس پسماندگی میں سر فہرست ہیں۔ زر سیال نے جن اسلامی ریاستوں کو دولت سے مالا مال کر دیا ہے وہ ریاستیں بھی صنعت اور ٹیکنالوجی کے میدان میں کلیۃً مغربی اقوام پر انحصار کرتی ہیں۔

ممالک اسلامیہ میں دفاعی سامان، سامان تعیش، ضروریات زندگی، صنعتی مشینری اور ٹیکنالوجی سب چیزیں مغرب سے درآمد ہوتی ہیں۔ یہ ممالک اپنے بے پناہ قدرتی ذخائر کے باوجود اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں۔

جب تمام مادی اشیاء مغرب ہی سے آتی ہیں تو ایک عام ذہن یہ سوچنے لگتا ہے کہ جن باصلاحیت لوگوں نے اتنی عظیم چیزیں ایجاد کی ہیں ان کی سوچ غلط نہیں ہو سکتی۔ عام لوگ سوچتے ہیں کہ اہل مغرب جب کسی بھی میدان میں تحقیق کرتے ہیں تو اس کے لئے وہی انداز تحقیق اختیار کرتے ہیں جس کی بدولت انہوں نے مادی میدان میں اتنی حیران کن ترقی کی ہے۔

بدقسمتی سے ممالک اسلامیہ میں قومی زندگی کسی نظم وضبط کے بغیر چل رہی ہے۔ پاکستان کی مثال لیجئے، جس کی پارلیمنٹ کے ممبر گھوڑوں اور لوٹوں کی طرح بکتے ہیں۔ پولیس کسی شریف آدمی کو سڑک پر چلنے نہیں دیتی۔ دکاندار گاہک کا چہرہ دیکھ کر چیزوں کے نرخ بتاتا ہے۔ سرکاری دفتر کا کلرک اپنے کسی جائز کام سے دفتر میں داخل ہونے والے ہر شخص کو اپنا شکار سمجھتا ہے۔ کمزور کی ہر حرکت جرم ہے اور طاقتور کی ہر بدمعاشی شرافت کی علامت۔ عدلیہ کو اپنے ادارے کے تقدس کا احساس نہیں۔ ڈاکو کھل کھیلتا ہے اور پولیس اس غریب کو اپنا تختہ مشق بناتی ہے جس کی زندگی بھر کی پونجی کسی ظالم نے ہڑپ کر لی ہو۔ اسلامی قدریں تو بڑی دور کی بات ہے یہاں عام انسانی قدروں کی بھی کوئی وقعت نہیں۔ حق بات کہنے والوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور دولت اور طاقت کے نشے میں دندنانے والوں کو معاشرے کے معزز ترین افراد سمجھا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں یورپ کی زندگی میں یہ تمام قباحتیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ وہاں پارلیمنٹ کا ممبر نہ بکتا ہے اور نہ ہی اپنی پارٹی اور اپنے ووٹروں سے غداری کرتا ہے۔ وہاں کی پولیس اپنے آپ کو عوام اور معاشرے کا خادم سمجھتی ہے۔ دکاندار ہر گاہک سے ایک ہی نرخ مانگتا ہے۔ ان کی زندگی مذہبی قیود سے آزاد ہے لیکن وہ عام انسانی قدروں کو اہمیت دیتے ہیں۔ مجرم ان کی نگاہ میں مجرم ہے اور اہل مغرب اسے معاشرے کا دشمن سمجھتے ہیں اور اسکے خلاف قانون کی طاقت کے استعمال کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ وہاں محنتی اور قابل آدمی کی قدر ہے۔ وہاں کسی کو عظمت آباؤ اجداد سے ورثے میں نہیں ملتی بلکہ ہر ایک کو اپنی ذاتی کوشش سے آگے بڑھنا پڑتا ہے۔

ایک مسلمان جس نے یورپ کی زندگی کے نظم وضبط کو قریب سے دیکھا ہو یا اسے اس زندگی کے متعلق معلومات حاصل ہوں، وہ جب یورپی زندگی سے اسلامی ممالک کی قومی زندگی کا موازنہ کرتا ہے تو اپنے ممالک کی اجتماعی زندگی میں اسے جنگل کا قانون نافذ نظر آتا

ہے۔ اس موازنے کے بعد وہ اہل مغرب کو اپنی قوم سے بہتر خیال کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ زندگی کی عام سہولتوں کے ساتھ ساتھ وہ مغرب کے اجتماعی نظام کی نقل کو بھی اپنے اجتماعی مسائل کا واحد حل قرار دیتا ہے۔

مسلمانوں کی اکثریت اس حقیقت سے ناآشنا ہے کہ ان کا اپنا دین اپنے دامن میں ایک ایسا اجتماعی نظام رکھتا ہے جس پر ہزار مغربی نظام قربان کئے جاسکتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ ان کے دین نے جو اجتماعی نظام پیش کیا ہے اس کی رو سے عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے بارعب خلیفہ سے اس کی قمیص کے کپڑے کا شان ورود پوچھنے کے لئے ایک بدو کو کسی پارٹی یا پریشر گروپ کی حمایت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ جس نظام کی رو سے خلیفہ کے دربار میں حاکم مصر کے بیٹے کو ایک عام قبطی سے زیادہ حیثیت حاصل نہیں ہوتی۔ جس نظام میں خلیفہ وقت پیوند لگے کپڑے پہنے اونٹ کی مہار پکڑے پیدل چلتا ہے اور اس کا غلام اونٹ پر سوار ہوتا ہے۔ جس نظام کی رو سے خلیفہ مسند خلافت پر متمکن ہونے کے بعد پہلا خطبہ یہ دیتا ہے کہ تم میں سے جو کمزور ہے، میرے لئے وہ اس وقت تک طاقت ور ہے جب تک میں اس کا حق اسے نہ دلوادوں۔ اور تم میں سے جو طاقت ور ہے وہ میرے لئے اس وقت تک کمزور ہے جب تک میں اس سے حق دار کا حق وصول نہ کرلوں۔ اور ساتھ ہی یہ اعلان کرتا ہے کہ اگر میں احکام خداوندی کے مطابق حکمرانی کروں تو میری اطاعت کرنا ورنہ مجھے پکڑ کر مسند خلافت سے علیحدہ کر دینا۔ ہمارا دین جو معاشرتی نظام دیتا ہے یہ نظام وہ ہے جس میں غلاموں کو "سیدنا" کا مقام عطا ہوتا ہے اور ایک غلام اس لشکر کی قیادت کرتا ہے جس میں بڑے بڑے عرب قبائل کے سردار بطور سپاہی شریک ہوتے ہیں۔

عام مسلمان اسلام کے نظام زندگی سے ناآشنا ہے۔ ممالک اسلامیہ میں جو نظام زندگی رائج ہے اسے نظام کہنا ہی اس لفظ کی توہین ہے۔ یورپ کا نظام زندگی اس نام نہاد نظام کی نسبت کہیں بہتر ہے۔ یورپ کے جو لوگ مسلمانوں کو اپنے دین سے متنفر کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں (یعنی مستشرقین) وہ بڑی عیاری سے اسی نظام کو حقیقی اسلامی نظام بنا کر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو آج کل ممالک اسلامیہ میں رائج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل کے مستشرقین اسلام کی اصل تعلیمات کا مطالعہ کرنے کی بجائے دور حاضر کے مسلم معاشروں کی معاشرتی اقدار کا تفصیل سے جائزہ لیتے ہیں۔ اور آج کل کے

مسلمان جو کچھ کرتے ہیں وہ اسے ہی حقیقی اسلام قرار دے دیتے ہیں۔
مستشرقین کے ان خیالات کو پذیرائی نصیب ہوتی ہے۔ یورپ کی مادی ترقی اور اجتماعی زندگی کے نظم وضبط کے مقابلے میں ممالک اسلامیہ کی پسماندگی اور بدنظمی ان کے اس پروپیگنڈے کو حقیقت بنادیتی ہے اور وہ جو کچھ کہتے ہیں اسے بلاچوں وچرا تسلیم کرلیا جاتا ہے۔
ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ارباب اقتدار میں کثیر تعداد ان لوگوں کی ہوتی ہے جنہوں نے یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی ہوتی ہے۔ انہوں نے یورپ کی اجتماعی زندگی کے نظم وضبط کو قریب سے دیکھا ہوتا ہے لیکن وہ اپنے ممالک کو یورپ کی ساری قباحتوں سے ملوث کرنا تو اپنا فرض سمجھتے ہیں مگر یورپ کی خوبیوں کو اپنے ممالک میں رائج کرنا وہ خلاف مصلحت سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے اسلامی ممالک میں جس بدنظمی اور لاقانونیت کا دور دورہ ہے وہ اس طبقے کے لئے بے شمار مراعات کی ضمانت دیتی ہے۔ اگر یہ بدنظمی کسی اچھے نظام میں بدل جائے تو یہ مراعات یافتہ طبقہ ختم ہو جائے۔ اس مراعات یافتہ طبقے کو یہ خطرہ لاحق ہے کہ اگر اسلامی ممالک میں کوئی اچھا نظام نافذ ہو گیا تو وی۔ آئی۔ پی کلچر کا وجود مٹ جائے گا اور جو لوگ آج اپنے آپ کو عام انسانوں کی نسبت ایک اعلیٰ مخلوق سمجھتے ہیں ان کو عام انسانوں کی سطح پر رہ کر زندگی گزارنا پڑے گی۔

مستشرقین کی علمی کاوشیں

مستشرقین کے علمی رعب کے اسباب میں سے ایک بہت بڑا سبب اس طبقے کی علمی کاوشیں ہیں۔ گو مستشرقین کی اکثریت کے پیش نظر سیاسی، اقتصادی اور تبشیری مقاصد تھے لیکن ان کا ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو حقیقت میں علم کا پیاسا تھا اور ان کی کوششیں شمع علم کو فروزاں رکھنے کی خاطر تھیں۔
اس طبقے کے علاوہ جو مستشرقین سیاسی مقاصد کے پیش نظر مصروف جدوجہد تھے انہوں نے بھی اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر علم کو ہی ذریعہ بنایا۔ اس طرح ان لوگوں کی کوششوں سے وہ علمی سرمایہ وجود میں آیا جس کی افادیت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ آج صورت حال یہ ہے کہ مشرق یا مغرب کا کوئی اہل قلم جب کسی موضوع پر لکھنے کا ارادہ کرتا ہے تو مطلوبہ مواد تک رسائی کے لئے اسے مستشرقین کی کاوشوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ایک مسلمان صاحب قلم جسے مستشرقین کی اسلام دشمن کارروائیوں کا بخوبی علم ہے وہ بھی جب

کسی اسلامی موضوع پر قلم اٹھانا چاہتا ہے تو اسے کسی مستشرق کے کام سے استفادہ کرنا پڑتا ہے۔ اگر اس مسلمان کی مادری زبان عربی یا فارسی وغیرہ نہ ہو بلکہ اس نے کسی مغربی ملک میں آنکھیں کھولی ہوں تو اس کیلئے اسلام کو سمجھنے کی خاطر مستشرقین کی تحریروں کا سہارا لینا ایک مجبوری بن جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کے اسلاف نے علم کے میدان میں بے پناہ کام کیا ہے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، جغرافیہ، طب، کیمیا، طبیعات اور دیگر علوم عقلیہ و نقلیہ کے موضوعات پر انہوں نے کتابوں کے انبار لگا دیے۔ ایک ایک مصنف کے قلم سے سینکڑوں کتابیں نکلیں اور ان کی روشنی سے مشرق و مغرب دونوں بقعہ نور بن گئے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ جب امت مسلمہ سیاسی زوال اور تنزل کا شکار ہوئی تو اس نے علم کی اس شمع کو بھی دور پھینک دیا جو اس نے اپنے ہاتھوں میں اٹھا رکھی تھی۔

جن اقوام کے ساتھ مسلمانوں کو اپنے دور زوال میں واسطہ پڑا وہ علم کی دشمن تھیں۔ انہوں نے لاکھوں کتابیں جلائیں اور مسلمانوں کی سینکڑوں سال کی محنت کو برباد کر دیا۔ جو کچھ بچ گیا وہ یا تو مطبوعہ کتابوں کی شکل میں تھا یا مخطوطات کی شکل میں۔ یہ ذخیرہ زیادہ تر عربی، فارسی یا ان زبانوں میں تھا جو مسلمانوں کے دور عروج میں مسلمانوں کے زیر تسلط علاقوں میں بولی جاتی تھیں۔ اسلام پھیل کر یورپ، ایشیا اور افریقہ کے دور دراز علاقوں تک جا پہنچا تھا۔ اب ملت اسلامیہ جن افراد پر مشتمل تھی ان میں بیشمار زبانیں بولنے والے لوگ موجود تھے۔ مسلمان اسلاف کا علمی سرمایہ ان سب کی میراث تھا۔ اس سرمائے کی حفاظت اور پوری ملت اسلامیہ کو اس سے مستفیض کرنے کی دو ہی صورتیں تھیں۔ یا تو عربی اور فارسی بولنے والے لوگ دنیا کی دوسری زبانیں سیکھتے اور اس علمی سرمایہ کو ان زبانوں میں منتقل کرتے۔ دوسری صورت یہ تھی کہ جن لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا وہ عربی کو، قرآن وحدیث کی زبان سمجھ کر، سیکھنا اپنا فرض سمجھتے اور پھر اس زبان میں موجود علم کے وسیع ذخیرے کو اپنی زبانوں میں منتقل کرتے۔

مسلمان جب تک اپنے دین کے ساتھ قلبی طور پر وابستہ رہے وہ اس دوسرے طریقے پر عمل کرتے رہے۔ سمرقند و بخارا نے ایسی ہستیاں اٹھیں جنہوں نے عربی زبان سیکھ کر علم دین کی وہ خدمت کی جس کے لئے ملت اسلامیہ ان کی ہمیشہ ممنون رہے گی۔ ہندوستان میں

ایسے باہمت لوگوں نے جنم لیا جنہوں نے عربی سیکھ کر نہ صرف عربی زبان میں کتابیں لکھیں بلکہ اپنی قومی اور مقامی زبانوں میں علوم اسلامیہ کو منتقل کرنے کے لئے زبردست کوششیں کیں۔ یہ کوششیں آج بھی مکمل طور پر ختم نہیں ہوئیں بلکہ جاری ہیں لیکن ان کی رفتار زمانے کی رفتار کی نسبت بہت سست ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے کام انفرادی سطح پر ہو رہے ہیں اور اس وسیع کام کے لئے جن بے پناہ وسائل کی ضرورت ہے وہ میسر نہ ہونے کی وجہ سے یہ کوششیں خاطر خواہ نتائج پیدا کرنے سے قاصر ہیں۔

دنیا کی مادی ترقی کے ساتھ ساتھ وقت کا تقاضا یہ تھا کہ اس بے پناہ علمی سرمائے کو محفوظ کیا جاتا، اس پر تحقیق کی جاتی، محققین اور طلبہ کے لئے اس علمی سرمائے تک رسائی کو آسان بنایا جاتا، اس سرمائے کو مختلف زبانوں میں منتقل کیا جاتا، کتابوں کی ایسی فہرستیں تیار کی جاتیں جن کی مدد سے ایک طالب علم اپنے مطلوبہ مواد تک آسانی سے پہنچ سکتا، اس علمی سرمائے کو طبع کیا جاتا اور ایک عام طالب علم کے لئے اس سے استفادے کو آسان بنایا جاتا۔

بدقسمتی سے مسلمانوں نے وقت کی پکار پر لبیک نہیں کہا۔ انہوں نے نہ تو اپنے علمی ورثے کی حفاظت کی طرف توجہ مبذول کی اور نہ ہی اس سے استفادے کو آسان بنانے کے لئے اپنی ذمہ داری پوری کی۔ آج بھی پاکستان جیسے ملک میں چھوٹے چھوٹے گاؤں اور قصبوں میں کئی نادر کتابیں اور قلمی نسخے بکھرے پڑے ہیں جو مسلمانوں کی نااہلی کے سبب دیمک کی خوراک بن رہے ہیں۔ جو کتابیں آج سے کئی صدیاں پہلے لکھی گئی ہیں ان سے دور حاضر کے تقاضوں کے مطابق استفادے کے لئے جس کام کی ضرورت ہے، مسلمانوں نے وہ کام نہیں کیا۔

دنیا کا یہ اصول ہے کہ یہاں خلا زیادہ دیر قائم نہیں رہتا۔ ایک انسان اپنا خالی پیٹ بھرنے کے لئے کسی ایسی چیز کا انتخاب کرتا ہے جو انسان کی غذا بننے کی صلاحیت رکھتی ہو لیکن اگر اسے کوئی صالح چیز میسر نہ آئے تو وہ ناچار پیٹ کے خالی تنور میں کوئی ایسی چیز ڈال دیتا ہے جسے وہ خود مضر سمجھتا ہے۔ اگر کسی اسامی کے لئے کوئی اہل آدمی موجود نہ ہو تو کسی نااہل آدمی کے ذریعہ ہی اس خالی اسامی کو پر کر لیا جاتا ہے۔ جس گھر کو اس کے مالک فراموش کر دیں وہاں کوئی اجنبی ڈیرے ڈال دیتا ہے۔ جس دولت کا کوئی وارث نہ ہو اس پر جس کا جی چاہے ہاتھ رکھ دیتا ہے۔ یہی کچھ مسلمانوں کے علمی ورثے کے ساتھ بھی ہوا۔ جب اس

ورثے کے حقیقی وارثوں نے اس کی طرف سے بے اعتنائی کا رویہ اپنایا، نہ اس کی حفاظت کی اور نہ ہی اس سے اپنی انفرادی اور قومی زندگی کو رعنائیاں عطا کرنے کی کوشش کی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ کوئی دوسرا بھی اس سرمائے کی طرف متوجہ نہ ہوتا۔

مسلمانوں کا تصادم دیگر اقوام کے ساتھ اسلام کے ابتدائی سالوں ہی سے شروع ہو چکا تھا۔ اس تصادم کے نتیجے میں دوسری قومیں مسلمانوں اور ان کے علمی ورثے کے متعلق بہت کچھ سمجھ چکی تھیں۔ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کی قوت کا راز ان کے علمی ورثے میں مضمر ہے۔ جب انہوں نے محسوس کیا کہ مسلمان اپنی اس قیمتی دولت کی طرف سے بے پرواہ ہو چکے ہیں تو انہوں نے آگے بڑھ کر اس دولت کو اپنے قبضے میں کرنے کا ارادہ کیا۔ انہوں نے اس مقصد کے لئے اپنی یونیورسٹیوں میں ایسے آدمی تیار کئے جو السنہ شرقیہ اور علوم شرقیہ پر کامل دسترس رکھتے تھے۔ یہی لوگ حصول تعلیم کے بعد مغربی یونیورسٹیوں کے السنہ شرقیہ اور علوم شرقیہ کے شعبوں میں تدریس کے فرائض سرانجام دیتے اور ممالک شرقیہ میں مغربی ممالک کی سفارت کے فرائض سرانجام دیتے۔ اہل مشرق اور خصوصاً اسلام کے متعلق مغربی لوگ جو تحقیقاتی منصوبے بناتے ان میں یہ لوگ پیش پیش ہوتے۔

مغرب کی یونیورسٹیوں میں مغربی طلبہ کے علاوہ بے شمار مسلمان طلبہ بھی داخلہ لیتے۔ ان یونیورسٹیوں میں ان مسلمان طلبہ کو وہ تعلیمی سہولتیں میسر آتیں جن کا وہ اپنے ممالک میں تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ ان یونیورسٹیوں کے ساتھ بڑی بڑی لائبریریاں تھیں جن کے ذریعے جذبہ جستجو سے سرشار طلبہ دل کھول کر داد تحقیق دے سکتے تھے۔ یہ سارا تعلیمی نظام مستشرقین کے کنٹرول میں تھا اس لئے جو لوگ ان تعلیمی اداروں میں مستشرقین کی زیر نگرانی تعلیم حاصل کرتے ان کے لئے ان سے متاثر نہ ہونا ممکن نہ تھا۔ ان یونیورسٹیوں کے طلبہ نہ صرف خود مستشرقین سے متاثر ہوئے بلکہ انہوں نے اپنے ممالک میں واپس آ کر ان مستشرقین کے گن گائے۔

مستشرقین کے یہ مسلمان شاگرد چونکہ مغربی یونیورسٹیوں کے سند یافتہ تھے اس لئے اسلامی ممالک میں وہ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ اپنی قوم کی نسل نو کی تربیت کا فریضہ ان لوگوں کو سونپا گیا اور ان کی کوششوں کی برکت سے ایک ایسا طبقہ وجود میں آ گیا جو ہر مستشرق کو استاذ الاساتذہ ہونے کا درجہ دیتا اور اس کی ہر بات کو بلاچون وچرا تسلیم کرنے کو

ہی تحقیق کی معراج سمجھتا۔

اسلامی ممالک میں ہر مغربی خیال کو اسی لئے پذیرائی حاصل ہو رہی ہے کہ ان ممالک کے ہر شعبہ زندگی میں وہ لوگ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں جوان مستشرقین کے شاگرد ہیں یا ان کے شاگردوں کے شاگرد ہیں۔ مستشرقین اپنے ان شاگردوں کے بھرپور تعاون سے اپنا ہر نظریہ مسلمانوں پر ٹھونستے ہیں اور مسلمان شکریے کے ساتھ اسے قبول کر کے اپنے قومی وجود کی بنیادیں کھوکھلی کرتے ہیں۔

مغربی یونیورسٹیوں کے اس کردار کے علاوہ مستشرقین نے اس علمی سرمائے کو ممالک شرقیہ کے کونے کونے سے اکٹھا کیا جو مسلمانوں کی ناقدری کی وجہ سے ردی کے بھاؤ بک رہا تھا یا تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں دیمک کی خوراک بن رہا تھا۔ مختلف علوم وفنون کے متعلق کتابیں اور مخطوطے اہل مغرب نے کوڑیوں کے بھاؤ مسلمانوں سے خریدے اور انہیں مغربی ممالک میں منتقل کیا۔

مشرقی ممالک کے ساتھ تجارت کے لئے مغربی تجارتی کمپنیوں کے جو جہاز مشرقی ممالک کا سفر کرتے، بعض یورپی حکومتیں ان کو یہ فرض سونپتیں کہ وہ اسلامی ممالک سے کچھ مخطوطے ضرور اپنے ساتھ لائیں۔(1)

مستشرقین، مغربی حکومتیں، ان کے سفارت کار، عیسائیت کے تبلیغی مشن اور یہودیوں کی مختلف تنظیمیں ممالک شرقیہ کے مخطوطات کو جمع کرنے اور انہیں مغربی ممالک میں منتقل کرنے کے کام میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے لگیں۔ انہوں نے مخطوطات کو مغربی ممالک میں منتقل کرنے کیلئے قانونی اور غیر قانونی ہر قسم کے ذرائع استعمال کیے۔ ان کی ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہے کہ آج لاکھوں کی تعداد میں اسلامی اور مشرقی مخطوطات یورپ کی لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔(2)

مستشرقین نے اسلامی مخطوطے جمع کرنے کے لئے جو محیر العقول کارنامے سرانجام دیئے ان کی ایک مثال ایک مستشرقہ "کراچکوفسکی" کی کوششوں میں ملتی ہے۔ اس مستشرقہ نے سولہویں صدی عیسوی میں قرآن حکیم کے نادر مخطوطات پر ایک مقالہ لکھا اور اس مقالے کو مستشرقین کی کانفرنس میں پیش کیا۔ "شیخ امین خولی" نے کانفرنس میں اس

1۔ "الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری"، صفحہ 73

2۔ ایضاً، صفحہ 74

مستشرقہ کے مذکورہ مقالہ کو سنا اور ان تاثرات کا اظہار کیا:

"مجھے یقین نہیں کہ مسلمانوں کے اکثر ائمہ ان نادر مخطوطات کے بارے میں جانتے ہوں۔ یہ مسئلہ ایسا ہے جس کی اہمیت کا احساس کرنے میں سستی کا مظاہرہ کرنا ممکن نہیں۔" (1)

ان لوگوں نے مخطوطات صرف جمع ہی نہیں کئے بلکہ ان کی ایسی فہرستیں تیار کیں جن میں ہر مخطوطے کا مکمل تعارف موجود تھا۔ مخطوطے کا موضوع، اس کے مصنف کا نام، زمانہ تصنیف، مصنف کی تاریخ ولادت و وفات، یہ سب معلومات محققین کے لئے راہنما کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لاکھوں کی تعداد میں جو مخطوطے مغرب میں موجود ہیں، گو ان کے مصنفین مسلمانوں کے آباؤ اجداد ہیں لیکن ان کی حفاظت اور ان سے استفادے کو ممکن بنانے کا سہرا مستشرقین کے سر بندھتا ہے۔

ایک مسلمان محقق جو اپنے موضوع کے لئے مواد اکٹھا کرنا چاہتا ہے وہ ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ ان مخطوطات تک رسائی حاصل کرے۔ خواہ اس مقصد کے لئے وہ خود یورپ کی کسی لائبریری میں جائے یا کسی ذریعے سے متعلقہ مخطوطے کی نقل حاصل کرے۔ ہر محقق کے لئے یہ مخطوطے چونکہ انتہائی مفید اور معاون ثابت ہوتے ہیں اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ اگر مستشرقین نے اتنی عرق ریزی نہ کی ہوتی تو اس کیلئے ان مخطوطات سے استفادہ ممکن نہ تھا، اس لئے اس شخص کے دل میں فطری طور پر مستشرقین کے لئے احترام کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور وہ ان لوگوں کی ہر بات کو مستند خیال کرنے لگتا ہے۔

مستشرقین نے صرف اسلامی مخطوطات پر ہی توجہ نہیں دی بلکہ اسلامی ورثے کی تحقیق اور نشر و اشاعت میں بھی انہوں نے زبردست کوشش کی۔ انہوں نے کتابوں کے مختلف نسخوں کا تقابلی مطالعہ کیا۔ نسخوں کے باہمی اختلافات کی نشاندہی کی اور جس نسخے کو زیادہ صحیح سمجھا اس کو ترجیح دی۔ انہوں نے کتابوں کے ساتھ ان کے مضامین اور اسماء کی فہرستوں کا اضافہ کیا۔ بعض کتابوں کی بڑی مفید تشریح کی۔ پھر ان کتابوں کو تحقیق کے بعد حواشی اور فہرستوں سمیت شائع کر کے محققین کی خدمت میں پیش کر دیا۔ انہوں نے جن کتابوں کو تحقیق و تفحص کے بعد شائع کیا ان کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے۔

1۔ "الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری"، صفحہ 74

سیرت ابن ہشام، سیوطی کی اتقان، واقدی کی المغازی، زمخشری کی کشاف، تاریخ الطبری، کتاب سیبویہ، ابن موید کی الاشتقاق، سمعانی کی الانساب، یاقوت کی معجم الادباء، ابن مسکویہ کی تجارب الامم، ابن عبد الحکم کی فتوح مصر والمغرب والاندلس، ابو نصر سراج کی اللمع، ابن المعتز کی البدیع، ابن طفیل کی حی بن یقظان، خوارزمی کی مختصر فی حساب الجبر والمقابلہ، شہرستانی کی الملل والنحل، حافظ نسفی کی عمدۃ عقیدۃ اھل السنۃ والجماعۃ، ازدی بصری کی فتوح الشام، واقدی کی فتوح الشام، مبرد کی الکامل، ابن درید کی الجمھرہ، سیرانی کی اخبار النحویین البصریین، ابن الھیثم کی کتاب المناظر، ابن حجر عسقلانی کی الاصابہ فی تمیز الصحابہ، ماوردی کی الاحکام السلطانیہ، غزالی کی فضائح الباطنیہ، تاریخ الیعقوبی، ابن الندیم کی الفہرست، حاجی خلیفہ کی کشف الظنون، جرجانی کی التعریفات، ذھبی کی طبقات الحفاظ، ابن خلکان کی وفیات الاعیان، نووی کی تہذیب الاسماء، صحیح البخاری، ابن جنی کی المقتضب، اشعری کی مقالات الاسلامیین، الصفدی کی الوافی بالوفیات، ابو عمرو عثمانی الدانی کی التیسیر فی القراءات السبع، غزالی کی الرد الجمیل علی مدعی الوھیۃ المسیح بصریح الانجیل، ابن ابی اصیبعہ کی عیون الانباء فی طبقات الاطباء، اصفہانی کی الاغانی، سیوطی کی الاوائل، طبقات ابن سعد، ابن قتیبہ کی عیون الاخبار، امام ابو حنیفہ کی الفقہ الاکبر اور ان کے علاوہ بے شمار کتابیں خصوصاً شعری دیوان۔(1)

ہم نے سطور بالا میں صرف مثال کے طور پر چند ایسی کتابوں کا ذکر کیا ہے جن کو مستشرقین نے تحقیق کے بعد شائع کیا ہے۔ اسلام کے کسی موضوع پر تحقیق کرنے والا محقق، خواہ وہ مستشرق ہو یا ایک پکا مسلمان، وہ ان کتابوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اسلامی ممالک کی لائبریریوں میں اول تو ان میں سے اکثر کتابوں کا ملنا ہی ایک مسئلہ ہے اور اگر مل بھی جائیں تو وہ ان مفید اضافوں اور فہرستوں کے بغیر ہوں گی جو مستشرقین کے مطبوعہ نسخوں میں موجود ہیں اور جو محقق کو اپنے مطلوبہ مواد تک پہنچنے اور اسے سمجھنے میں بہت مدد دیتی ہیں۔ اس کے برعکس یورپ میں جو کتاب شائع ہوئی ہے اس کو وہاں تلاش کرنا کوئی مسئلہ نہیں۔ اہل مغرب نے ایسی فہرستیں مرتب کی ہیں جن کی مدد سے ایک محقق کو پتہ چل سکتا ہے کہ کون سی کتاب کس لائبریری میں موجود ہے۔ لائبریریوں کا عملہ ان لوگوں کے

1۔ "الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری"، صفحہ 76

ساتھ پورا تعاون کرتا ہے جو ان کی لائبریریوں میں موجود کتابوں سے استفادہ کرنا چاہیں۔ اگر محقق کی مطلوبہ کوئی کتاب اس لائبریری میں موجود نہ ہو تو بھی لائبریری کا عملہ ملک کی کسی بھی لائبریری سے مطلوبہ کتاب منگوا کر محقق کو مہیا کرنے کے لئے پوری کوشش کرتا ہے۔

یہ ساری کارروائیاں قدم قدم پر ایک طالب علم اور محقق کی مدد کرتی ہیں۔ اس لئے اس کے دل میں ان لوگوں کے لئے تشکر کے جذبات کا پیدا ہونا قدرتی بات ہے جن کی کوششوں سے اس کو یہ بے بہا سہولتیں میسر ہوئی ہیں۔ یورپ کی لائبریریوں میں اسلامی کتابوں کے یہ انبار جو مستشرقین کی کوششوں سے اپنی موجودہ شکل میں موجود ہیں، وہ ہر محقق کے دل پر مستشرقین کے علمی رعب کو طاری کرنے کا ایک، بہت بڑا سبب ہیں۔

مستشرقین نے تحقیق و تفحص کے بعد اسلامی کتابوں کو ان کی اصل عربی زبان میں شائع کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ انہوں نے بے شمار کتابوں کو یورپی زبانوں میں منتقل کیا۔

ترجمے کا کام بہت پہلے شروع ہو چکا تھا اور قرون وسطیٰ میں اہل مغرب نے طب، فلسفہ، اور علم الافلاک وغیرہ کے موضوعات پر مسلمانوں کی کتابوں کو مغربی زبانوں میں منتقل کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ یہ کام ہر زمانے میں جاری رہا ہے اور مستشرقین نے عربی کے بے شمار شعری دیوانوں کو مغربی زبانوں میں منتقل کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے تاریخ ابی الفداء، تاریخ الطبری، مسعودی کی مروج الذهب، مقریزی کی تاریخ المماليک، سیوطی کی تاریخ الخلفاء، غزالی کی احیاء العلوم اور المنقذ من الضلال وغیرہ سینکڑوں کتابوں کو مغربی زبانوں میں منتقل کیا۔ (1)

قرآن حکیم کا پہلا ترجمہ لاطینی زبان میں بارہویں صدی عیسوی میں مکمل ہو گیا تھا۔ اس کے بعد مستشرقین نے مغربی زبانوں میں قرآن حکیم کے تراجم کے ڈھیر لگا دیے۔

قرآن حکیم کے چودہ (14) ترجمے جرمن زبان میں، دس ترجمے انگریزی زبان میں، نو ترجمے ہسپانوی زبان میں، سات ترجمے لاطینی زبان میں اور چھ ترجمے ڈچ زبان میں ہوئے۔ (2)

مستشرقین، جو اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں، مغربی ممالک میں جنم لینے والے لوگ جنہیں قدرت نے اسلام کی دولت سے مالا مال کیا ہے اور ممالک اسلامیہ کے لاکھوں طلبہ جو مغرب میں رہائش پذیر ہیں اور مغربی تعلیمی اداروں کے تعلیم

1۔ "الاستشراق والخلفية الفكرية للصراع الحضاري"، صفحہ 77

2۔ ایضاً، صفحہ 78

یافتہ ہیں، ان کے لئے مستشرقین کی یہی کتابیں اسلام کو سمجھنے کا سب سے بڑا وسیلہ ہیں۔
مسلمانوں نے اپنے علمی ورثے کو مغربی زبانوں میں منتقل کرنے کی جو کوششیں کی ہیں وہ انتہائی ناکافی ہیں اور مستشرقین کی کوششوں کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے ہمارے نوجوانوں ذہن نہ صرف مستشرقین کے علمی رعب سے مرعوب ہوتے ہیں بلکہ وہ اسی انداز میں سوچنے اور بولنے لگتے ہیں جو مستشرقین کا انداز فکر ہے۔

اسلامی علمی ورثے کے تراجم کے علاوہ مستشرقین نے بے شمار ایسی کتابیں خود تالیف کی ہیں جن کا تعلق مشرق اور خصوصاً اسلام سے ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کے اوائل سے لے کر بیسویں صدی عیسوی کے وسط تک کے ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں مستشرقین نے مشرقی موضوعات پر جو کتابیں تالیف کیں ان کی تعداد ساٹھ ہزار کے لگ بھگ ہے۔ (1)
مستشرقین کی تالیفات میں بے شمار کتابیں ایسی ہیں جو اسلام کے خلاف الزامات اور جھوٹے پروپیگنڈے سے پر ہیں۔ ان کا نہ تحقیق سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہی علمیت سے۔ لیکن ان کتابوں میں ایسی کتابوں کی بھی کمی نہیں جن سے دور حاضر کا کوئی محقق بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

مثال کے طور پر جرمن مستشرق "کارل بروکلمان" نے تاریخ الادب العربی کی تالیف کا بیڑا اٹھایا۔ وہ آدمی تن تنہا نصف صدی سے زیادہ عرصہ اس عظیم علمی منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے شب و روز جد و جہد میں مصروف رہا۔ اس نے اپنی اس کتاب میں عربی زبان کے ان تمام علمی شہ پاروں کا تعارف کرانے کی کوشش کی جو مطبوعات یا مخطوطات کی شکل میں اس کے علم میں آئے۔ مولف نے عربی کتابوں اور مخطوطوں کے مصنفین اور مولفین کے سوانح حیات بھی لکھے۔ ہزاروں صفحات پر مشتمل یہ کتاب ہر اس شخص کو اپنی طرف کھینچتی ہے جو کسی عربی یا اسلامی موضوع پر کچھ پڑھنا یا لکھنا چاہتا ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کے پیش نظر عربوں نے اس کو عربی زبان میں منتقل کرنا بھی ضروری سمجھا اور اس کے کئی اجزاء کے عربی تراجم بھی ہوئے۔ (2)

یہ ایک ایسا کام ہے جس پر نظر ثانی اور اضافوں کی ضرورت ہمیشہ محسوس ہوتی رہے گی۔ نئے مخطوطات بھی منظر عام پر آتے رہیں گے اور عربی کی نئی تالیفات و تصنیفات بھی شائع ہوتی رہیں گی۔ اگر اس کام میں بھی مسلمانوں نے کوتاہی کی تو کوئی دوسرا مستشرق

1۔ "الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری"، صفحہ 78
2۔ ایضاً، صفحہ 79

"بروکلمان" کے کام کو آگے بڑھانے کا بیڑا اٹھائے گا۔ جب علمی اور تحقیقی افادیت کا سارا کام مستشرقین کے ہاتھوں سے انجام پائے گا تو ان کے مقابلے میں کسی دوسرے کی بات کو کیوں اہمیت دی جائے گی؟

ایک عظیم منصوبہ جو تحریک استشراق کو ایک علمی تحریک کا رنگ دینے اور مشرق و مغرب پر ان کا علمی رعب قائم کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے وہ "دائرۃ المعارف الاسلامیہ" کی تالیف ہے۔ یہ منصوبہ مستشرقین کے بین الاقوامی علمی تعاون کے نتیجے میں منظر عام پر آیا۔ اس کا پہلا ایڈیشن 1913ء سے 1938ء تک کے عرصے میں انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں طبع ہوا۔ 1948ء میں پیرس میں منعقد ہونے والی مستشرقین کی اکیسویں کانفرنس میں اس انسائیکلوپیڈیا پر نظر ثانی کا فیصلہ کیا گیا تاکہ پہلے ایڈیشن کی طباعت کے بعد اس کے مندرجات پر جو اعتراضات کئے گئے یا جن خامیوں کی نشاندہی ہوئی ان کی اصلاح کی جائے اور وہ علمی مواد اس میں شامل کیا جائے جو پہلے شامل نہ ہو سکا تھا۔ نظر ثانی شدہ "دائرۃ المعارف الاسلامیہ" کی اشاعت کا کام 1954ء میں شروع ہوا اور ابھی اس پر کام جاری ہے۔(1)

اس میں شک نہیں کہ اس دائرۃ المعارف کے اکثر مقالہ نگار متعصب یہودی اور عیسائی ہیں۔ اس منصوبے کے لئے مالی تعاون مغربی حکومتیں کرتی ہیں۔ اس عظیم منصوبے سے ان کا اصل مقصد ان مستشرقین کو علمی مواد فراہم کرنا ہے جو ممالک اسلامیہ میں استشراقی، تبشیری اور استعماری کارروائیوں میں سرگرم عمل ہیں۔ اس انسائیکلوپیڈیا میں اسلام کے خلاف بہت کچھ ہے۔ لیکن ان تمام حقیقتوں کے باوجود اسلام یا علوم شرقیہ پر تحقیق کرنے والا کوئی شخص اس دائرۃ المعارف سے کیسے بے نیاز ہو سکتا ہے جو مشرق خصوصاً اسلام کی ہر مشہور شخصیت، ہر تحریک، تاریخ کے ہر موڑ بلکہ زندگی کے ہر شعبے کے متعلق بنیادی مواد فراہم کرتا ہے۔

مستشرقین بھی اس تالیف کا مطالعہ کریں گے، مشرق سے تعلق رکھنے والے بھی اور مسلمان بھی۔ وہ لوگ بہت کم ہوں گے جن کی نظر ان علمی خیانتوں یا غلطیوں تک پہنچ گی جو اس تالیف میں جا بجا بکھری پڑی ہیں۔ عملاً یہی کچھ ہو رہا ہے۔ ہمارے اصحاب قلم جو کسی اسلامی موضوع پر قلم اٹھانا چاہتے ہیں ان کے لئے یہ دائرۃ المعارف بنیادی مصدر کی حیثیت

1۔ "الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری"، صفحہ 82

رکھتاہے۔اس کے مقابلے میں کوئی دوسری تحریر ان کے لئے اتنی اہمیت نہیں رکھتی۔

جب اس دائرۃ المعارف کی اہمیت اتنی زیادہ ہے تو وہ جماعت جس نے اس عظیم علمی منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچایا ان کا علمی رعب ذہنوں پر کیسے طاری نہیں ہو گا۔

مسلمانوں نے اس کتاب کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے مختلف اسلامی ممالک کی زبانوں میں اس کے تراجم شروع کرائے ہیں اور مستشرقین کی غلطیوں کی نشاندہی اور اس کی تصحیح کے لئے بھی کام شروع کیا ہے لیکن مستشرقین کے اس منصوبے کے اثرات کو کم کرنے کے لئے جس قسم کے کام کی ضرورت ہے وہ اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔

"دائرۃ المعارف الاسلامیہ" کی تالیف کے علاوہ معاجم کی تیاری میں بھی مستشرقین نے بہت عرق ریزی کی ہے۔ ہم نے پہلے ایک جگہ ذکر کیا ہے کہ پہلی عربی لاطینی قاموس بارہویں صدی عیسوی میں مکمل ہوئی۔ اس کے بعد عربی اور یورپی زبانوں کی کئی قوامیس تیار ہوئیں۔ "اوجست فشر" (ت 1949) نے "معجم اللغۃ العربیۃ القدیمۃ" کی تیاری کے لئے کئی دیگر مستشرقین کی معیت میں چالیس سال صرف کئے۔ یہ معاجم ہر طالب علم کی ضرورت ہیں اور وہ اپنی زندگی کے کسی دور میں ان سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

"المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث" نے تو مستشرقین کی اہمیت کو اور زیادہ بڑھا دیا ہے۔ حدیث کا کوئی طالب علم خواہ وہ مستشرق ہو یا مسلمان اس معجم سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

مختصر یہ کہ مستشرقین کا علمی رعب اس لئے قائم ہے کہ انہوں نے کئی صدیاں کام کیا ہے اور مسلسل کام کر رہے ہیں۔ انہوں نے ایک ایک علمی منصوبے پر کئی کئی سال زبردست محنت کی ہے۔ انہوں نے تحقیق کے ہر صبر آزما مرحلے کو صبر واستقامت سے عبور کیا ہے۔

اسلام کے وہ دشمن تھے، ان سے اسلام کے متعلق بھلائی کی توقع فضول تھی لیکن جن مقاصد کے تحت انہوں نے کام شروع کیا، اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انہوں نے محنت اور مشقت کی حد کر دی۔ ہم ان کو ہزار برا بھلا کہیں، ان کی اہمیت اس وقت تک کم نہیں ہو سکتی جب تک مسلمان ان کی محنت سے کئی گنا زیادہ محنت نہیں کرتے اور ان کے علمی کارناموں سے زیادہ مستند اور مفید کارنامے انجام نہیں دیتے جن سے محققین اور طلبہ جی بھر کر استفادہ کر سکیں۔ اگر مسلمان موجودہ صورت حال میں تبدیلی چاہتے ہیں تو انہیں نوشتہ دیوار کو پڑھنا ہو گا اور وقت کی پکار کو سننا ہو گا ورنہ ان کا خشک واویلا کسی کام نہیں آئے گا۔

انصاف پسندی کا لبادہ

مستشرقین نے ایسے کام کئے ہیں جن کی بدولت اقوام مشرق خصوصاً مسلمان اپنے حقوق سے محروم ہوئے، ان کی آزادیاں سلب ہوئیں، ان کے دینی جذبات مجروح ہوئے اور ان کے قومی تشخصات کو سخت نقصان پہنچا۔ مستشرقین کی کوششوں کی بدولت اقوام مشرق کے مادی اور تہذیبی وسائل اقوام مغرب کے تسلط میں آئے۔ انہوں نے مشرق میں استعماری طاقتوں کے سیاسی تسلط کا راستہ ہموار کرنے کے لئے اپنی ساری صلاحیتیں صرف کیں۔ انہوں نے اپنے علم کو سیاسی اور اقتصادی مقاصد کے لئے استعمال کیا اور خصوصاً اسلام کے متعلق تحقیق کرتے ہوئے وہ نہ غیر جانبدار رہ سکے اور نہ ہی علمی دیانت کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔ انہوں نے اپنے پیش نظر مقاصد کو حاصل کرنے کیلئے تحقیق کے جو مناہج اختراع کئے وہ مناہج اس لئے نہیں گھڑے گئے تھے کہ ان کے ذریعے حقائق تک پہنچنا آسان ہو بلکہ یہ مناہج تاریخ کو مسخ کرنے اور حقائق کی شکل بگاڑنے کے لئے وضع کئے گئے۔

مستشرقین نے اقوام مشرق پر یہ ان گنت مظالم کئے لیکن اس کے باوجود مستشرقین کو ان اقوام میں بھی احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے جن کے تہذیبی وجود کو جڑوں سے اکھیڑ پھینکنے کے لئے انہوں نے اپنی زندگیاں صرف کر دیں۔(1)

اس صورت حال کی ایک، بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ مستشرقین نے دوست بن کر دشمنی کی ہے۔ کہیں وہ معلم بن کر گئے، کہیں طبیب بن کر، کہیں بے ضرر سیاح بن کر اور کہیں حقائق عالم کے جوئندہ بن کر۔ انہوں نے پسماندہ اقوام کی خود فراموشی اور خود فریبی سے فائدہ اٹھایا اور ان کا ہمدرد بن کر ان کو اس راستے پر لگا دیا جو راستہ تباہی کی طرف جاتا تھا۔

مستشرقین نے صدیوں اسلام کا تصور مسخ کرنے کی کوشش کی۔ اسلام کو بت پرستی کا مذہب قرار دیا۔ انہوں نے حضور ﷺ کی ذات پاک پر ایسے الزامات عائد کئے جو کوئی شریف آدمی کسی برے سے برے آدمی کے متعلق بھی زبان پر لانا گوارا نہیں کر سکتا۔ انہوں نے اپنے ان الزامات کی خوب تشہیر کی۔ ان کوششوں سے قرون وسطیٰ میں یورپ میں اسلام کے متعلق وہی تصور قائم ہو گیا جو مستشرقین کرنا چاہتے تھے۔

1۔ "الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری"، صفحہ 83

لیکن جب زمانے نے کروٹ لی۔ توہمات اور فرضی افسانوں کو عقل کے معیار پر پرکھنے اور ذہنی بیداری کا زمانہ شروع ہوا تو مستشرقین نے فوراً یہ خطرہ محسوس کرلیا کہ ان کے آباؤ اجداد صدیوں سے اسلام کے متعلق جو بے بنیاد زہر اگلتے رہے ہیں، اس کا بھانڈا بہت جلد پھوٹ جائے گا۔ جب دنیا پر یہ حقیقت منکشف ہوگی کہ مستشرقین اسلام کے متعلق جھوٹا پروپیگنڈہ کرتے رہے ہیں تو اس سے تحریک استشراق کے اعتماد اور علمی وقار کو سخت دھچکا لگے گا۔ ان متوقع خطرات کے پیش نظر مستشرقین نے فوراً پینترا بدل لیا۔ ان میں بے شمار لوگ ایسے منظر عام پر آئے جنہوں نے کھل کر اپنے پیشرؤوں کی تردید کی۔ انہوں نے اسلام کے خلاف اپنے اسلاف کے الزامات کو بے بنیاد قرار دیا۔ ان لوگوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی چند خوبیوں کا کھل کر اعتراف بھی کیا۔

مستشرقین کے رویے میں اس تبدیلی کا سبب یہ نہیں تھا کہ ان نئے مستشرقین کے دلوں میں اپنے پیشرؤوں کی نسبت اسلام دشمنی کا جذبہ ماند پڑ گیا تھا اور وہ اسلام کے بارے میں منصفانہ اور غیر جانبدارانہ تحقیقات کے قائل ہو گئے تھے بلکہ ان کے انداز میں اس تبدیلی کی وجہ یہ تھی کہ بدلتے ہوئے حالات میں مستشرقین کا قدیم انداز اسلام کی نسبت خود ان کی تحریک کے لئے زیادہ تباہ کن تھا۔

یہ بات قابل غور ہے کہ قرون وسطی میں مستشرقین نے اسلام پر جو کیچڑ اچھالا اس کے خلاف سب سے پہلے آواز بھی ان ہی لوگوں نے اٹھائی جو خود بھی مستشرق تھے۔ ان لوگوں نے ایک طرف اپنے پیشرؤوں کی اسلام دشمنی کی مذمت کی اور دوسری طرف خود بھی اسلام پر ایسے وار کئے جو ان کے پیشرؤوں کے حملوں کی نسبت بھی زیادہ تباہ کن تھے۔ ان کا انداز یہ تھا کہ وہ اسلام کی دس پندرہ خوبیوں کا ذکر کرتے اور ان خوبیوں کے درمیان اسلام کے شجرہ طیبہ کی جڑوں پر ایک ایسا وار کرتے جس کی وجہ سے مذکورہ خوبیوں کے اثرات بھی غائب ہو جاتے۔ اس طرح وہ اپنے اسلام دشمنی کے جذبے کی بھی تسکین کر لیتے اور ان کی انصاف پسندی پر بھی کوئی حرف نہ آتا۔ زمانہ بیداری کے بعد کے مستشرقین کا انداز یہی ہے۔ مسلمان ان کی تحریروں میں اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے متعلق چند اچھے کلمات پڑھ کر ان کی غیر جانبداری اور انصاف پسندی کے قائل ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد وہ علمی زہر کی جو گولیاں ان مسلمانوں کو بڑے تپاک سے پیش کرتے ہیں، سادہ لوح مسلمان

انہیں بھی شکریے کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں۔ مستشرقین کے اس انداز کو سمجھنے کے لئے منٹگمری واٹ کی تحریروں کا مطالعہ مفید ہو سکتا ہے، جس نے ایک طرف اپنے پیشرؤوں کی غلطیوں پر ان کی گرفت کی ہے اور دوسری طرف اس نے خود اسلام پر ایسے حملے کئے ہیں جو اس کے پیشرؤوں کے حملوں سے بھی زیادہ مہلک ہیں۔

متعصب اور منصف مستشرقین کا ایک ہی زمرے میں شمار

مستشرقین کی تاریخ بارہ تیرہ صدیوں پر مشتمل ہے۔ اس عرصے میں لاکھوں آدمی اس تحریک کے ساتھ منسلک ہوئے اور انہوں نے مختلف انداز سے کام کیا۔ اس تحریک میں وہ متعصب عیسائی راہب اور پادری بھی تھے جن کے سینے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف حسد و عداوت کی آگ میں جل رہے تھے۔ ان میں وہ یہودی بھی تھے جن کو مدینہ اور خیبر میں اپنے آباؤ اجداد کا انجام چین کا سانس نہ لینے دیتا تھا۔ اس تحریک میں وہ لوگ بھی شامل تھے جن کی نظریں مشرق کے سرسبز و شاداب خطوں پر اپنی حکمرانی کے جھنڈے لہرانے پر جمی ہوئی تھیں اور وہ بھی تھے جو ممالک اسلامیہ کے بے پناہ قدرتی وسائل کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو دنیا کے ہر انسان کے گلے میں صلیب لٹکتی ہوئی دیکھنا چاہتے تھے اور وہ بھی تھے جو دنیا کے ہر خطے پر صیہونی شوکت و سطوت کا علم لہراتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ ان میں وہ بھی تھے جو اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف قوت تخیل کے زور پر گمراہ کن افسانے تراش رہے تھے اور ان کی صفوں میں وہ لوگ بھی تھے جن کی زندگی کی شامیں اور شامیں اسلامی ادب سے اسلام کی کمزوریاں تلاش کرتے ہوئے گزرتی تھیں۔ ان میں وہ بھی تھے جن کا مقصد اسلام کے خلاف زہریلا پروپیگنڈہ کر کے اپنے حسد کی آگ کو ٹھنڈا کرنا تھا اور ان میں وہ بھی تھے جن کو اسلام قبول کرنے کی توفیق تو میسر نہ ہوئی البتہ وہ اسلام کی شاندار تاریخ اور اسلام کی حیات بخش تعلیمات کو سلام عظمت پیش کئے بغیر نہ رہ سکے تھے۔

اس صورت حال میں جن لوگوں نے ان مستشرقین کے رویے کو پیش نظر رکھا جن کی تحریروں میں حضور ﷺ کو (نعوذ باللہ) بت بنا کر پیش کیا گیا تھا، انہوں نے تمام مستشرقین کو اسلام کا دشمن سمجھتے ہوئے، ان سے کسی خیر کی توقع کو خارج از امکان سمجھا اور جن لوگوں نے ان مستشرقین کے رویے کو دیکھا جن کی ان تھک تحقیقی کاوشوں کے نقوش دنیا کی ہر

لائبریری میں نظر آتے ہیں یا جن کی تحریروں میں اسلام کے متعلق نسبتاً مثبت رویہ ملتا ہے، انہوں نے مستشرقین کو علم کی دنیا کا امام سمجھا اور ان کی ہر بات کو بلا حیل وحجت تسلیم کرنے کو تحقیق کی معراج قرار دیا۔

ان لوگوں کی تعداد بہت قلیل تھی جن کی نگاہ مستشرقین کی کوششوں کے منفی پہلوؤں تک پہنچی لیکن مستشرقین کی مثبت کوششیں ہر اس شخص کو نظر آگئیں جس نے تحقیق کے میدان میں قدم رکھا یا کسی مغربی یونیورسٹی یا کتب خانے تک پہنچا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ صدیوں سے علمی خیانتوں کے مرتکب ہو رہے تھے ان کے کرتوت تو پس منظر میں چلے گئے اور دوسرے مستشرقین کی مثبت کوششوں نے علمی خیانت کے مرتکب مستشرقین کو بھی منصف اور غیر جانبدار محقق بنا دیا۔

اگر یہ حقیقت مشرقی لوگوں خصوصاً مسلمانوں کے ذہن نشین ہوتی کہ مستشرقین میں کئی قسم کے لوگ ہیں، جن میں علم کے پیاسے محققین کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کو نہ علم کی ہوا لگی ہے اور نہ علمی دیانت کی، تو ان لوگوں کے دلوں پر کسی شخص کا علمی رعب محض اس لئے قائم نہ ہوتا کہ وہ ایک مستشرق ہے بلکہ وہ ہر مستشرق کا رویہ دیکھ کر اس کے متعلق فیصلہ کرتے کہ وہ قابل اعتماد ہے یا نہیں۔ لیکن یہ بات ان مستشرقین کے بھی حق میں نہ تھی جو مخصوص مقاصد کے تحت اپنے پیشرو مستشرقین کے رویے پر تنقید کر رہے تھے۔ ان کا مفاد بھی اسی میں تھا کہ تحریک استشراق ایک علمی تحریک کے طور پر متعارف ہو اور مستشرق کہلانے والے ہر شخص کو غیر جانبدار محقق سمجھا جائے۔ اس لئے انہوں نے اقوام مشرق پر مستشرقین کا علمی رعب قائم کرنے کی شعوری کوششیں بھی کیں۔ اس مقصد کے لئے مغربی یونیورسٹیوں اور دیگر تعلیمی اداروں نے انتہائی اہم کردار ادا کیا۔

اب بات مغربی یونیورسٹیوں تک محدود نہیں رہی بلکہ ممالک اسلامیہ کی یونیورسٹیوں میں بھی مستشرقین کے علمی رعب کو قائم کرنے کی کوششیں زور شور سے جاری ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب اسلامی ممالک میں ان لوگوں کی کمی نہیں جن کو مستشرقین کی شاگردی کا شرف حاصل ہے۔ ایسے لوگ اسلامی ممالک کی جامعات میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ اسلامی ممالک کا ایک بہت بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ان ممالک میں مقامی یونیورسٹیوں کی ڈگریوں پر غیر ملکی خصوصاً مغربی یونیورسٹیوں کی ڈگریوں کو فوقیت حاصل ہے۔ اس صورت حال سے

فائدہ ان لوگوں کو پہنچتا ہے جو مغربی یونیورسٹیوں میں پڑھتے ہیں اور مستشرقین کے شاگرد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ممالک میں ہر شعبہ زندگی میں وہی لوگ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں جو مستشرقین کے شاگرد ہیں۔ یہ لوگ مستشرقین کے علمی کارناموں کے گن گا کر ان کا علمی رعب اپنے ابنائے وطن کے ذہنوں پر قائم کرتے ہیں۔ یہ انہی خیالات وافکار کا پرچار کرتے ہیں جو مستشرقین مخصوص مقاصد کے تحت پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔

مستشرقین کے یہ شاگرد اپنی قوم کے نونہالوں کو یہ تو بتاتے ہیں کہ مستشرقین نے علم کے میدان میں فلاں فلاں کارنامے سرانجام دیئے ہیں لیکن وہ یہ نہیں بتاتے کہ کچھ مستشرقین وہ بھی ہیں جو اسلام کو بت پرستی اور پیغمبر اسلام ﷺ کو (نعوذ باللہ) بت پرستی کا معلم قرار دیتے ہیں۔ اس لئے مستشرقین کے علمی رعب کا ایک بہت بڑا سبب یہ ہے کہ اکثر لوگ تمام مستشرقین کو ایک جیسا سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ سب لوگ صدیوں علم کی خدمت میں مصروف رہے ہیں۔

مسلمانوں کی کم علمی اور ذہنی غلامی

مستشرقین نے اسلام کے خلاف صدیوں بھرپور جدوجہد کی ہے لیکن ان کو، ان کوششوں کی وجہ سے صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اسلام کے دشمن ہیں۔ جب وہ اسلام کے دشمن ہیں تو پھر ان سے اسلام دشمنی کے علاوہ کسی چیز کی توقع عبث ہے۔ آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ بزدل دشمن ہے جو سامنے آکر وار کرنے کی بجائے چھپ کر وار کرتا ہے۔ لیکن مستشرقین کی ان کوششوں کی کامیابی اور ان کے منفی عزائم کی تکمیل کی ساری ذمہ داری خود ملت مسلمہ پر عائد ہوتی ہے۔

مستشرقین اسلام کے دشمن تھے۔ انہوں نے اپنا کام کیا۔ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی ناموس کی حفاظت مسلمانوں کی ذمہ داری تھی۔ انہوں نے اپنے فرض منصبی کی ادائیگی میں تساہل پسندی کی انتہا کردی۔ مسلمانوں کی اس کوتاہی کا نہ اسلام کو کچھ نقصان پہنچ سکتا ہے اور نہ ہی مدنی تاجدار ﷺ کی رفعتوں میں کوئی کمی آسکتی ہے کیونکہ چاند کے چہرے پر تھوکنے سے چاند کی چاندنی میں کمی نہیں آتی بلکہ تھوکنے والے کا اپنا چہرہ ہی آلودہ ہوتا ہے۔

لیکن ملت مسلمہ کی اس کوتاہی نے خود اس کی عظمتوں کو خاک میں ملادیا ہے۔ انہوں نے اعلائے کلمۃ الحق کے فریضے کی ادائیگی میں کوتاہی کی، اس کے باوجود اسلام مشرق ومغرب

میں پھیل رہا ہے۔ البتہ اپنے اس تساہل اور کوتاہی کی وجہ سے مسلمان دنیا کے کونے کونے میں ذلیل وخوار ہو رہے ہیں۔

ملت کفر کے خلاف جہاد امت مسلمہ کا ملی فریضہ ہے۔ جب تک ملت اسلامیہ یہ فریضہ کما حقہ ادا کرتی رہی، اس وقت تک نہ ان کے خلاف ان کے دشمنوں کی کوئی سازش کامیاب ہو سکی اور نہ ہی کفر کے ٹڈی دل اس قوم کا کچھ بگاڑ سکے۔

دشمنان اسلام نے تلوار کے محاذ پر ملت مسلمہ سے پے در پے شکستیں کھانے کے بعد علم کے محاذ پر مسلمانوں سے پنجہ آزمائی کا فیصلہ کیا۔ لیکن جب تک غزالی اور رازی جیسے مردان حق ملت مسلمہ کے علمی محاذ کی حفاظت پر مامور تھے کسی کو اس محاذ پر ملت اسلامیہ کو للکارنے کی جرأت نہ ہوئی۔ لیکن بدقسمتی سے ملت مسلمہ پر ایک وقت وہ بھی آیا جب مسلمانوں نے فضول بحثوں میں الجھ کر اپنے علمی محاذ کو خالی چھوڑ دیا۔ دشمن نے جب اس محاذ کو خالی دیکھا تو انہوں نے ملت اسلامیہ کی نظریاتی سرحدوں پر یلغار کر دی۔

مستشرقین ملت اسلامیہ کے خلاف ملت کفر کے اس علمی اور نظریاتی حملے کا ہراول دستہ ہیں۔ صدیوں سے ان کے سامنے میدان خالی پڑا ہے۔ کوئی ان کو للکارنے والا نہیں۔ وہ علمی میدان میں مسلمانوں کو اپنی انگلی کے اشاروں پر نچا رہے ہیں۔ مسلمانوں نے مستشرقین کے مقابلے میں اپنے آپ کو علمی طور پر مسلح کرنے اور ان کے منظم علمی حملوں کی روک تھام کے لئے کسی منظم کارروائی کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی۔

مسلمانوں کی یہ کوتاہی مستشرقین کے لئے نعمت غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ خوش ہیں کہ ان کے مدمقابل کوئی نہیں۔ وہ بلا مقابلہ فاتح قرار پا رہے ہیں اور ان کی علمی عظمت کے جھنڈے اکناف عالم میں لہرا رہے ہیں۔ دوست اور دشمن سب ان کے علمی کارناموں کے مداح اور ان کی تحقیقی عظمتوں کے قائل ہیں۔

یہ صورت حال اس وقت تک بدستور قائم رہے گی جب تک مسلمان اپنے رویے میں تبدیلی نہیں کرتے۔ جب تک وہ مستشرقین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا حوصلہ اپنے اندر پیدا نہیں کرتے اور جب تک وہ دنیا کے سامنے مستشرقین کے علمی کارناموں سے بہتر علمی کارنامے پیش نہیں کرتے۔ کیونکہ قدرت کا اصول ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (1)

1۔ سورۃ الرعد: 11

"بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بدلتا کسی قوم کی (اچھی یا بری) حالت کو جب تک وہ لوگ اپنے آپ میں تبدیلی پیدا نہیں کرتے۔"

اسلام علم کا دین ہے، اسلام اور جہالت کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں۔ اسلام کی الہامی ہدایت کا پہلا کلمہ ہی "اقراء" کے حکم پر مشتمل ہے۔ اس دین کی حامل قوم جب جاہل بن جائے تو اس کی ذلت اور بدبختی سے اسلام بری الذمہ ہے۔ اگر مسلمان علم کی قدر کرتے، اگر ان کے ہاں اپنے اسلاف کے علمی کارناموں اور اس علمی ورثے کی قدر ہوتی جو ان کے اسلاف نے ملت کے لئے چھوڑا تھا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ مسلمان ممالک علم کے ان موتیوں سے محروم ہوتے اور یورپ اور امریکہ کی سرزمینیں ان کی ضو سے جگمگار ہی ہوتیں۔

مستشرقین نے مسلمانوں کے اسی علمی ورثے کی حفاظت اور خدمت کر کے دنیا پر اپنا علمی رعب قائم کیا ہے۔ اگر مسلمان اپنے علمی ورثے کی خود حفاظت کرتے اور اسے تحقیق و تفحص کے بعد خود اہل جہاں کے استفادے کے لئے پیش کرتے تو بلاشبہ وہ علمی ورثہ نہ صرف مسلمانوں کی علمی عظمتوں کی ضمانت دیتا بلکہ وہ ساری دنیا کے لئے رحمت، سلامتی اور آشتی کا پیغام ثابت ہوتا۔

مستشرقین نے تو اس علمی ورثے میں اپنے تعصب کا زہر گھول کر اس کی حقیقی افادیت کا ستیاناس کر دیا ہے۔ اس علمی ورثے کی حفاظت کا کام اگر مسلمان کرتے اور اسے اپنا دینی اور ملی فریضہ سمجھ کر کرتے تو آج دنیا مادے کی پرستش میں جہاں تک پہنچ چکی ہے وہاں تک قطعاً نہ پہنچتی۔ اس سنگین صورت حال سے نکلنے کی ایک ہی صورت ہے کہ مسلمان "اقراء" کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے اور مہد سے لحد تک علم حاصل کرنے کے حکم کی تعمیل میں میدان میں نکل آئیں۔ مستشرقین نے علم کے پیاسوں کیلئے جو بے پناہ علمی ذخیرہ تیار کیا ہے اس سے بہتر اور صاف و شفاف علمی سرمایہ ان کے سامنے پیش کریں۔ مستشرقین کی مثبت باتوں سے استفادہ کریں اور ان کے اچھے کاموں پر ان کو ضرور داد بھی دیں لیکن جہاں انہوں نے علمی خیانتوں کا مظاہرہ کیا ہے وہاں ان کی خیانتوں کا پردہ چاک کریں تاکہ لوگ نگہبان اور چور میں تمیز کر سکیں۔ جب تک مسلمان اپنے ذمے اس قرض کو ادا نہیں کرتے اس وقت تک مستشرقین کے اس علمی مقام میں کمی نہیں آئے گی جو انہیں ان کی صدیوں کی علمی جدوجہد اور تحقیقی کاوشوں سے حاصل ہوا ہے۔ اس وقت تک دوست اور دشمن سب ان کی

تعریف میں رطب اللسان رہیں گے اور ان کے علمی رعب میں مزید اضافہ ہوتا رہے گا۔
مستشرقین کے علمی رعب کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ ملت اسلامیہ طویل عرصہ اہل مغرب کی سیاسی غلام رہی ہے۔ سیاسی غلبے کے خاتمے کے بعد سے ملت اسلامیہ مسلسل اقوام مغرب کی معاشی غلامی میں گرفتار ہے۔ اس طویل سیاسی اور معاشی غلامی نے مسلمانوں کو اہل مغرب کا ذہنی غلام بنادیا ہے۔

سیاسی اور معاشی غلامی بذات خود مسلمانوں کو اہل مغرب کا ذہنی غلام بنانے کے لئے کافی تھیں لیکن اہل مغرب نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انہوں نے ارادۃً مسلمانوں کو اپنا ذہنی غلام بنانے اور ذہنی غلام رکھنے کے لئے زبردست منصوبہ بندی کی۔ انہیں علم تھا کہ کسی قوم کو طویل مدت تک سیاسی اور معاشی غلامی میں مبتلا رکھنا ممکن نہیں جب تک کہ اس قوم کے ذہن غلامی کو قبول نہ کرلیں۔ انہوں نے اسی مقصد کے لئے اپنی نسلی برتری کا نظریہ تراشا تھا اور اپنے تعلیمی اداروں، پریس اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے اس کی تشہیر کے لئے ہر ممکن کوشش کی تھی۔ ان کی یہ کوششیں بڑی حد تک کامیاب رہیں اور ملت اسلامیہ کے اکثر افراد مغرب کی نقالی کو ہی تہذیب کی معراج قرار دینے لگے۔ انہوں نے یہ کوشش بھی کی کہ ساری ملت ان کی اقتداء میں اہل مغرب کی نقالی کو ہی تہذیب کی معراج سمجھے اور دنیا میں ترقی کے لئے اس کو ضروری سمجھنے لگے۔

ملت اسلامیہ کا اہل مغرب کی ذہنی غلامی کو قبول کرلینا مستشرقین کے لئے ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ مسلمانوں کی اسی غلامی کی بدولت وہ ان کی مقدس ہستیوں پر کیچڑ بھی اچھال لیتے ہیں، اسلام کے شجرہ طیبہ کی جڑوں پر کلہاڑا بھی چلالیتے ہیں، اسلامی شعائر کی دل کھول کر توہین بھی کرلیتے ہیں لیکن اس کے باوجود نہ ان کی انصاف پسندی متاثر ہوتی ہے اور نہ ہی ان کا علمی وقار اور علمی دیانت مجروح ہوتی ہے۔

علامہ اقبال نے غالباً امت مسلمہ کو اسی تکلیف دہ صورت حال سے نکالنے کے لئے مسلمانوں کے جذبہ خودی کو بیدار کرنے کی کوشش کی تھی اور اس مقصد کے لئے انہوں نے اپنی ساری صلاحیتیں صرف کردی تھیں۔ لیکن جس خوابیدہ قوم کو جگانے والا ایک اقبال ہو اور اسے لوریاں دے کر سلانے والے لاکھوں ہوں اس کے بیدار ہونے کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں۔

صورت حال کی اس سنگینی کے باوجود نہ اقبال مایوس تھے اور نہ ہی کسی مسلمان کو مایوس ہونا چاہئے کیونکہ رحمت خداوندی سے مایوس ہو جانا کفار کی پہچان ہے۔ امت مسلمہ کی کشت ویراں بڑی زرخیز ہے۔ یہ ذرا سے نم کی منتظر ہے۔ قافلہ حجاز کی خاکستر میں کئی چنگاریاں بے تاب ہیں جنہیں کسی حسین کی ایک پھونک کا انتظار ہے۔

انشاء اللہ وہ وقت آئے گا جب ملت اسلامیہ قرآن کا دامن پکڑ کر ایک مرتبہ پھر ان عظمتوں کی امین بن جائے گی جو صدیوں اس کا طرۂ امتیاز رہی ہیں۔

جب حق کا پرچم بلند ہو گا تو باطل کا پرچم خود بخود سرنگوں ہو جائے گا۔ نہ مستشرقین کا مصنوعی علمی رعب، ملت مسلمہ کی حقیقی عظمتوں کے آفتاب کو گہنا سکے گا اور نہ راہبوں، پادریوں اور یہودی علماء کی پھونکیں چراغ اسلام کو بجھا سکیں گی۔

حق حق ہے۔ وہ ہمیشہ غالب رہتا ہے کبھی مغلوب نہیں ہوتا۔

اسلام پر مستشرقین کے حملوں کی جہتیں

اسلام پر مستشرقین کے حملوں کی جہتیں

گزشتہ ابواب کے مطالعہ سے قارئین کرام اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے ہوں گے کہ تحریک استشراق کی صدیوں پر مشتمل تاریخ، اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ دشمنی سے عبارت ہے۔ یہ تحریک اسی مقصد کے تحت وجود میں آئی اور اسی مقصد کی تکمیل کے لئے صدیوں مصروف جدوجہد رہی۔

گو مستشرقین نے اس موضوع سے ہٹ کر بھی کام کیا ہے لیکن ان کی اس قسم کی کوششیں ضمنی کام کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کا اصل مقصد ہر دور میں اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی مخالفت رہا ہے اور یہ مقصد کبھی ان کی آنکھوں سے او جھل نہیں ہوا۔

عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ حق کی حمایت بڑا مشکل کام ہے اور حق کی مخالفت آسان، کیونکہ حمایت حق کی خاطر عیش و آرام، عزت و جاہ اور مال و جان کا نذرانہ پیش کرنا پڑتا ہے۔ کبھی آگ کے آسمان سے باتیں کرتے ہوئے شعلوں میں کودنا پڑتا ہے اور کبھی ریگزار کرب وبلا میں سارا کنبہ کٹوانا پڑتا ہے۔ اس کے مقابلے میں حق کی مخالفت انسان کو ان آزمائشوں سے بچالیتی ہے اور کبھی کبھی اسے تخت شاہی پر بھی بٹھا دیتی ہے۔

دراصل یہ سوچ غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حق کی حمایت کا راستہ ہی آسان راستہ ہے۔ یہ سچ ہے کہ حمایت حق کا راستہ منتخب کرنے والوں کو طرح طرح کی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جو خوش نصیب حمایت حق پر کمربستہ ہو جاتا ہے اس کے سینے میں حق کی خاطر کٹ مرنے کا وہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے جس کی برکت سے وہ مسکراتے ہوئے نار نمرود میں کود جاتا ہے، زندگی بھر کے اثاثے اور گھر بار کو الوداعی سلام کرتا ہے، دولت ایمان کو سینے سے لگائے مدینہ کا مسافر بنتا ہے اور اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتا ہے۔ دشمن چمنستان زہرا کی مسکراتی کلیوں کو بے دردی سے مسلتے ہیں اور وہ اس نذرانے کی قبولیت پر خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔ وہ ان آزمائشوں سے خندہ بلب گزر کر اس منزل پر پہنچ جاتا ہے جہاں اس کا استقبال ان روح پرور

کلمات سے ہوتا ہے:

يَاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (1)

"اے نفس مطمئن! واپس چلو اپنے رب کی طرف۔ اس حال میں کہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔ پس شامل ہو جاؤ میرے (خاص) بندوں میں اور داخل ہو جاؤ میری جنت میں۔"

حمایت حق کا انعام یہ ہے جو قرآن حکیم کی اس آیہ کریمہ میں بیان ہوا ہے۔ جبکہ حق کی مخالفت اپنے دامن میں دنیا اور آخرت کی ذلتیں لئے ہوتی ہے۔ حق کی مخالفت کرنے والے کو قدم قدم پر اپنی فطرت سے جنگ کرنی پڑتی ہے۔ ضمیر میں اگر زندگی کی کوئی رمق باقی ہو تو وہ قدم قدم پر اسے کچوکے لگاتا ہے۔ اگر ضمیر مر گیا ہو تو حق کی مخالفت کرنے والا شخص دنیا میں حیوانوں کی سی زندگی گزار کر آخرت میں دوزخ کی آگ کا ایندھن بنتا ہے۔ قرآن حکیم نے اس حقیقت کو کتنے خوب صورت پیرائے میں بیان فرمایا ہے:

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى (2)

"پھر جس نے (راہ خدا میں اپنا) مال دیا اور (اس سے) ڈرتا رہا اور (جس نے) اچھی بات کی تصدیق کی تو ہم آسان کر دیں گے اس کے لئے آسان راہ اور جس نے بخل کیا اور بے پروا بنا رہا اور اچھی بات کو جھٹلایا تو ہم آسان کر دیں گے اس کے لئے مشکل راہ۔"

ابلیس کا کام کتنا کٹھن ہے کہ وہ اپنی موجودہ زندگی میں تو آدم اور نسل آدم سے حسد کی آگ میں جل رہا ہے اور یوم حساب کے بعد ہمیشہ کے لئے نار جہنم کا ایندھن بنے گا۔

نمرود، فرعون، ابو جہل، یزید اور ابلیس کے دوسرے چیلے اسی کٹھن راستے کے مسافر ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے لئے جو راستہ منتخب کیا ہے، وہ اس دنیا میں بھی بڑا صبر آزما ہے اور اس کا حیات اخروی کا مرحلہ اور بھی زیادہ صبر آزما ہوگا۔

1۔ سورۃ الفجر: 30-27

2۔ سورۃ اللیل: 10-5

مستشرقین نے بھی اپنے لئے اسی کٹھن راستے کا انتخاب کیا ہے۔ بلکہ ان کا کام اپنے پیشروؤں کی نسبت کہیں مشکل ہے۔ ان لوگوں نے آفتاب حق کو اپنی پھونکوں سے بے نور کرنے کا بیڑا اس وقت اٹھایا جب وہ نصف النہار پر پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر تھا۔ مستشرقین نے دین اسلام کی مخالفت کو اس وقت اپنا وظیفہ حیات بنایا جب یہ تمام تکمیلی مراحل سے گزر کر اپنے کمال تک پہنچ چکا تھا اور بارگاہ خداوندی سے یہ اعلان صادر ہو چکا تھا:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (1)

"آج میں نے مکمل کر دیا ہے تمہارے لئے تمہارا دین اور پوری کر دی ہے تم پر اپنی نعمت۔ اور میں نے پسند کر لیا ہے تمہارے لئے اسلام کو بطور دین۔"

ان بدنصیبوں کا کام اس لئے کٹھن ترین تھا کہ ان کے حصے میں خدا کے اس برگزیدہ بندے کی مخالفت آئی جو خدا کا محبوب تھا۔ جس کے بارے میں اس نے خود اعلان فرمادیا تھا۔

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى (2)

"اور یقیناً ہر آنے والی گھڑی آپ کے لئے پہلی سے (بدرجہا) بہتر ہے۔"

جس کام کا بیڑا مستشرقین نے اٹھایا تھا وہ ان سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ کفار مکہ نے، آفتاب اسلام کے طلوع ہوتے ہی، کائنات کو اس کی ضو سے محروم کرنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ انہوں نے اس مقصد کے لئے پوری جدوجہد کی تھی لیکن ان کی سعی نامسعود میں وہ ذہنی کرب کی جن منزلوں سے گزر رہے تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے:

حج کا موسم قریب آ رہا تھا۔ قریش کے جہاندیدہ سرداروں کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ موسم حج میں دور دراز سے لوگ حج کیلئے مکہ آئیں گے۔ ان لوگوں نے یہ بات سن رکھی ہے کہ مکہ میں ایک شخص ظاہر ہوا ہے جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اور بتوں کی پوجا چھوڑ کر خدائے واحد کی عبادت کی دعوت دیتا ہے۔ وہ لوگ اہل مکہ سے اس شخص کے متعلق پوچھیں گے۔ اگر اہل مکہ نے اس کے متعلق کوئی متفقہ موقف اختیار نہ کیا اور ہر ایک نے اس کے متعلق اپنی مختلف رائے کا اظہار کیا تو باہر سے آنے والے لوگ اہل مکہ سے بدظن ہو کر

1۔ سورۃ المائدہ: 3
2۔ سورۃ الضحیٰ: 4

اس کی طرف مائل ہوں گے۔ اس طرح خطرہ ہے کہ ان کی کثیر تعداد مسلمان ہو جائے گی۔

ولید بن مغیرہ جو معمر ہونے کے ساتھ ساتھ تجربہ کار اور دور اندیش بھی تھا، اس نے قریش مکہ کی ایک مجلس میں یہ مسئلہ پیش کیا۔ اس نے سب لوگوں کو دعوت دی کہ وہ محمد (ﷺ) کے بارے میں کسی ایک رائے پر متفق ہو جائیں۔ جو بھی ان سے ان کے متعلق پوچھے، اسے ایک ہی جواب دیں۔ ہر ایک نے اپنی اپنی رائے دی۔ کسی نے کہا: ہم کہیں گے وہ کاہن ہے۔ ولید نے جواب دیا قسم بخدا! وہ کاہن تو نہیں۔ ہم نے کاہنوں کو دیکھا ہے۔ محمد (ﷺ) کے کلام میں نہ کاہنوں جیسی گنگناہٹ ہے اور نہ سجع۔ کسی نے رائے دی: ہم کہیں گے وہ دیوانہ ہے۔ ولید نے کہا: تمہاری اس بات کو کون مانے گا؟ اس میں تو دیوانگی کی کوئی بھی نشانی نہیں۔ نہ تو اس کے اعضاء از خود دیوانوں کی طرح کپکپاتے ہیں اور نہ ہی اس کی زبان سے کوئی مہمل اور بے معنی بات نکلتی ہے۔

کسی نے تجویز پیش کی: ہم کہیں گے وہ شاعر ہے۔

ولید بولا: وہ شاعر کیسے ہو سکتا ہے؟ ہم خود اہل زبان ہیں۔ شعر کی تمام صنفوں سے بخوبی واقف ہیں۔ محمد (ﷺ) جو کلام سناتے ہیں وہ شعر کی جملہ صنفوں میں سے کسی میں بھی شمار نہیں ہو سکتا۔

محفل حیرت وسکوت میں ڈوب گئی۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد کہیں سے آواز آئی: ہم کہیں گے وہ جادوگر ہے۔

ولید نے کہا: ہم نے جادوگروں کو بھی دیکھا ہے۔ محمد (ﷺ) نہ تو جادوگروں کی طرح پھونکیں مارتے ہیں اور نہ ہی ان کی طرح دھاگوں میں گرہیں لگاتے ہیں۔

جب ولید نے حاضرین محفل کی تمام آرا کو مسترد کر دیا تو سب اسی کی طرف متوجہ ہوئے اور اس سے کہا کہ آپ ہی اپنے وسیع تجربے کے پیش نظر اس مسئلے کا کوئی قابل عمل حل تجویز کریں۔

ولید نے کہا: بخدا! جو کلام محمد (ﷺ) سناتے ہیں اس میں ایک عجیب قسم کی مٹھاس ہے۔ یہ ایسا سرسبز وشاداب تنا ہے، جس سے بے شمار شاخیں پھوٹی ہوئی ہیں۔ اس کی ٹہنیاں پکے پھلوں سے لدی ہوئی ہیں۔

بخدا! ان باتوں میں سے کوئی بات بھی ہم کہیں گے تو لوگ جھٹ کہیں گے کہ تم

جھوٹ بول رہے ہو۔ ہمارے پاس اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں کہ ان کے بارے میں ہم سے جب کوئی پوچھے تو ہم اس سے کہیں کہ وہ ساحر ہے۔ اس نے اپنے سحر کے اثر سے باپ سے بیٹے کو، بھائی سے بھائی کو، شوہر سے بیوی کو اور دوست سے دوست کو جدا کر دیا ہے اور سارے قبیلے میں پھوٹ ڈال دی ہے۔

قریش مکہ نے اسی رائے پر اتفاق کر لیا۔ ایام حج میں جب حجاج کے قافلے مختلف سمتوں سے آنے شروع ہوئے تو یہ لوگ مختلف راستوں پر بیٹھ گئے۔ جو شخص حضور ﷺ کے متعلق ان سے دریافت کرتا، اسے سب کفار مکہ طوطے کی طرح رٹا ہوا یہ جواب سنا دیتے کہ وہ جادوگر ہے۔ اس نے اپنے جادو کے اثر سے مکہ کا سماجی نظام برباد کر دیا ہے۔

یہ واقعہ کفار مکہ کے اس ذہنی کرب کو ظاہر کرتا ہے جس میں وہ دین حق، اسلام کی مخالفت کرنے کی وجہ سے مبتلا تھے۔ ایک ایسا شخص، جس نے ان کے شہر اور قبیلے میں آنکھ کھولی، جس نے اپنا لڑکپن اور جوانی اس عفت اور پاکبازی سے گزاری کہ کی اور عربی معاشرہ میں اس کی مثال ملنا محال تھی، جس کی صداقت اور امانت کا اقرار اہل شہر نے اس کو صادق اور امین کا لقب دے کر کیا، جس کی دور اندیشی نے قبائل قریش کی تلواروں کو ایک دوسرے کے خلاف بے نیام ہونے سے روک لیا، جس کی نسبی شرافت و نجابت مسلم تھی، وہ ایک ایسی بات کہتا ہے جو فطرت انسانی کے دل کی آواز ہے، جو عقل انسانی کو مسحور کرتی ہے، جس میں دل کی غذا بھی ہے اور روح کی بھی، جو جسم کے تقاضوں کو بھی پورا کرتی ہے اور ذہن انسانی کو بھی نئی جولانیاں عطا کرتی ہے، جو دنیوی زندگی کی کامیابی کی ضمانت بھی دیتی ہے اور اخروی زندگی کی ابدی نعمتوں کا مژدہ بھی سناتی ہے، جس بات سے قلب و روح دونوں متاثر ہوتے ہیں، ان بد نصیبوں نے اس حیات بخش پیغام کو اس صادق و امین کی زبان سے سنا اور محض چند مادی مفادات اور بے بنیاد مزعومات کی وجہ سے اسے مسترد کر دیا۔ انہوں نے نہ صرف اسے مسترد کیا بلکہ اس کی مخالفت کا تہیہ کر لیا۔

انہیں اس پیغام میں کوئی حقیقی برائی نظر نہیں آتی۔ یہ پیغام لانے والے پیغامبر کے کردار پر انہیں کوئی دھبہ نظر نہیں آتا۔ ان کا دل اور ضمیر گواہی دیتا ہے کہ یہ شخص جو کچھ کہتا ہے وہ نہ صرف یہ کہ سچ ہے بلکہ اس جیسا معجز کلام کسی انسان کا کلام ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کلام کے متعلق ان کے ضمیر اور دل کا فتویٰ یہ ہے لیکن اسکے باوجود انہوں نے اس پیغام کی

مخالفت کا فیصلہ کیا ہے۔

اس غلط ترین فیصلے کے بعد وہ سوچ کے سمندر میں ڈوب جاتے ہیں۔ سوچتے ہیں اب اس پیغام حق کی مخالفت کیسے کریں؟ لوگوں کے دلوں کو اس کی نورانی تاثیر سے کیسے محفوظ رکھیں؟ ولید بن مغیرہ کو یقین ہے کہ یہ شخص نہ کاہن ہے نہ دیوانہ، نہ شاعر ہے نہ جادوگر۔ دوسرے لوگوں کو اگر اس کے کاہن، دیوانہ، شاعر یا جادوگر ہونے کا کوئی شبہ تھا بھی تو وہ ولید بن مغیرہ کے مسکت جوابات سے دور ہو گیا ہوگا۔

لیکن یہ یقین ہونے کے باوجود کہ وہ جادوگر نہیں ہے، اسے جادوگر کہنے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ یہ کام کتنا کٹھن تھا؟ عربوں کے لئے جو اپنی حریت اور بے باکی کے لئے مشہور تھے، حق گوئی کو جو نشان عظمت سمجھتے تھے، ان کے لئے یہ منافقانہ رویہ اپنانا کتنا مشکل تھا؟ لیکن "فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرَى" کے خدائی اصول کے مطابق وہ اس کٹھن ترین راستے پر چلتے رہے۔ ان کو اسلام میں کوئی خامی نظر نہ آئی تھی لیکن وہ اپنے تخیل کے زور پر اسلام کی طرف بے بنیاد خامیوں کو منسوب کرتے رہے۔ ان کو اگر اسلامی تعلیمات میں کوئی حقیقی خامی نظر آتی تو وہ اس پر متفق ہو جاتے لیکن نہ انہیں کوئی خامی نظر آئی اور نہ وہ کسی ایک بات پر متفق ہو سکے۔ وہ اسلام کے متعلق نت نیا شوشہ چھوڑ کر اپنے دعووں کی خود ہی تکذیب کرتے رہے۔

مستشرقین کو بھی اسی طبقے کی بدبختی ورثے میں ملی ہے۔ انہوں نے حق کی اسی شمع کو گل کرنے کا تہیہ کیا ہے جسے کفار مکہ کی پھونکوں نے روشن تر کر دیا تھا۔ وہ بارہ سو سال سے اس پیغام حق میں کیڑے ڈالنے کی کوششوں میں مصروف ہیں لیکن آج تک وہ کسی ایک بات پر متفق نہیں ہو سکے۔ قرون وسطیٰ کے مستشرق اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے کردار کے اردگرد کذب وافتراء کا جو جال بنتے ہیں، بعد کے مستشرقین اس کا تارو پود الگ کر دیتے ہیں۔

جو شخص اس استشراقی ادب کا مطالعہ کرتا ہے جو مستشرقین کی بارہ سو سالہ مشترکہ مساعی کا حاصل ہے، وہ اس قابل نہیں ہوتا کہ یہ فیصلہ کرے کہ مستشرقین اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں کیا نظریہ رکھتے ہیں۔ ان میں قدر مشترک کے طور پر صرف دو باتیں نظر آئیں گی: ایک اسلام دشمنی اور دوسری یہ کہ اسلام الہامی دین نہیں اور قرآن خدا

کا کلام نہیں۔

جن مستشرقین نے اسلام دوستی اور انصاف پسندی کا لبادہ اوڑھنے کی کوشش کی ہے، انہوں نے بھی قرآن حکیم کے کلام خداوندی ہونے کا انکار کر کے اور حضور ﷺ پر خود قرآن گھڑ کے اسے خدا کی طرف منسوب کرنے کا الزام لگا کر، اپنے سینے میں چھپے ہوئے عداوت اسلام کے جذبے کا اظہار کر دیا ہے۔ ان دو باتوں کے علاوہ اسلام کے بارے میں مستشرقین کے خیالات باہم متضاد اور ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ حضور ﷺ نے بحیرٰی راہب اور کچھ دوسرے یہودی اور عیسائی علماء سے اہل کتاب کا علم سیکھا اور اسے قرآن کی شکل میں پیش کر دیا۔ کوئی کہتا ہے کہ حضور ﷺ نے اپنی بے پناہ صلاحیتوں کو کام میں لاتے ہوئے اپنے دور کے مسائل کا تجزیہ کیا اور اپنے تخلیقی تخیل (Creative imagination) سے کام لے کر قرآن وضع کیا اور آپ نے اپنی قائدانہ صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کر کے جزیرہ عرب کے مکینوں کو قرآن کے راستے پر گامزن کر دیا۔ کوئی حضور ﷺ کی طرف کذب، افتراء، فریب اور دوسری گھٹیا سے گھٹیا اخلاقی برائیوں کو منسوب کرتا ہے اور کوئی اس مقدس ہستی کو ان عیوب سے مبرا ثابت کرتا ہے۔ کوئی حضور ﷺ کو مرگی کا مریض قرار دیتا ہے اور کوئی مستشرق اپنے ساتھی مستشرقین کی اس علمی حماقت کا مذاق اڑاتا ہے۔ کوئی اسلام کو ایک دہشت پسند تحریک قرار دیتا ہے اور کوئی دوسرا اس کا انکار کرتا ہے۔ یہ کیفیت وہی ہے جو ولید بن مغیرہ اور اس کے ہم مجلس ساتھیوں کی تھی۔ اس محفل کا اتفاق بھی صرف ایک نکتے پر تھا اور وہ نکتہ اسلام دشمنی تھا۔

ایک مستشرقہ کیرن آرمسٹرانگ (Karen Armstrong) اسلام کے بارے میں اپنے پیش رووں کے رویہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہے:

> "Western Scholars denounced Islam as a blasphemous faith and its Prophet Muhammad as the great Pretender, who had founded a violent religion of the sword in order to conquer the world. "Mahomet, became a bogy to the people of Europe, used by mothers to frighten, disobedient children. In Mummers' Plays he was presented as the enemy of western civilization, who fought our own brave St. George. This inaccurate image of Islam became one of the re-

ceived ideas of Europe and it continues to affect our preceptions of the muslim world ....
It is mistake to imagine that Islam is an inherently violent or fanatical faith, as is sometimes suggested: Islam is a universal religion and there is nothing aggressively oriental or anti-western about it." (1)

"مغربی علماء اسلام پر ایک کافرانہ دین ہونے اور پیغمبر اسلام (ﷺ) پر جھوٹا مدعی (نبوت) ہونے کا الزام لگاتے ہیں، جس نے دنیا کو فتح کرنے کی خاطر تلوار کے ظالمانہ دین کی بنیاد رکھی۔ "ماہومٹ" اہل مغرب کے لئے ایک بھوت کی شکل اختیار کر گیا جس کا نام لے کر مائیں نافرمان بچوں کو ڈراتی تھیں۔ ڈراموں میں پیغمبر اسلام (ﷺ) کو مغربی تہذیب کے دشمن کی شکل میں پیش کیا گیا، جس نے ہمارے بہادر رہبر و سینٹ جارج کے خلاف جنگ کی تھی۔ اسلام کے متعلق یہ غلط تصور یورپ میں ایک تسلیم شدہ حقیقت بن گیا اور اب تک دنیائے اسلام کے بارے میں ہمارے خیالات اس غلط تصور سے متاثر ہوتے ہیں......
یہ سوچنا غلط ہے کہ اسلام تشدد پسند اور متعصب دین ہے جیسا کہ اکثر سمجھا جاتا ہے۔ اسلام ایک عالمگیر دین ہے۔ اس کے بارے میں ایک مغرب دشمن مشرقی مذہب ہونے کا خیال قطعاً غلط ہے۔"

منٹگمری واٹ (W.Montgomery Watt) اپنی کتاب "Muhammad Prophet and statesman" میں لکھتا ہے:

"In contrast to this are some European views of Muhammad. The worst was in medieval times when his name corrupted to 'Mahound, was regarded as a name of the devil .... Medieval christian ideas about Islam were little better than war-Propaganda. At their worst they were so palpably false that they damaged the christian cause."(2)

1۔ "محمد۔ اے ویسٹرن اٹیمپٹ ٹو انڈر سٹینڈ اسلام"، صفحہ 11
2۔ "محمد: پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین"، صفحہ 2

"اس کے برعکس محمد (ﷺ) کے متعلق کچھ یورپی نظریات ہیں۔ قرون وسطیٰ میں محمد (ﷺ) کے متعلق بدترین نظریات مشہور ہوئے۔ جب کہ آپ کے نام کو "ماہونڈ" کی شکل دے کر شیطان کا نام قرار دیا جاتا تھا......

قرون وسطیٰ میں اسلام کے متعلق عیسائی خیالات جنگی پراپیگنڈے سے زیادہ کچھ نہ تھے۔ ان خیالات کا جھوٹ کا پلندہ ہونا اتنا صریح اور واضح تھا کہ انہوں نے عیسائیت کے مفاد کو نقصان پہنچایا۔"

فلپ کے۔ ہٹی (Philip K. Hitti) کا اپنے پیشروؤں کے رویے پر تبصرہ ملاحظہ فرمائیں۔ وہ لکھتا ہے:

"قرون وسطیٰ کے عیسائیوں نے محمد (ﷺ) کو غلط سمجھا اور انہیں ایک حقیر کردار خیال کیا۔ ان کے اس رویے کے اسباب (جیسا کہ بعد میں بیان ہوں گے) نظریاتی سے زیادہ معاشی اور سیاسی تھے۔ نویں صدی عیسوی کے ایک یونانی وقائع نگار نے ایک جھوٹے نبی اور مکار کی حیثیت سے آپ کی جو تصویر کشی کی تھی، بعد میں اسے جنس پرستی، آوارگی، خونخواری اور قزاقی کے شوخ رنگوں سے مزین کیا گیا۔ پادریوں کے حلقوں میں محمد (ﷺ) دشمن مسیح کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ تصور پیش کیا گیا کہ آپ کا جسم زمین و آسمان کے درمیان کہیں معلق ہے۔ حتیٰ کہ 1503ء میں ایک اطالوی نو مسلم مدینہ گیا تو محمد (ﷺ) کی نعش کو مذکورہ جگہ پر نہ پا کر متعجب ہوا۔ "ڈانٹے" نے آپ کے جسم کو دو حصوں میں تقسیم کر کے اسے جہنم کے نویں درجے میں دکھایا جوان ملعون روحوں کا مستقر ہے جو مذہب میں فرقہ بندی پیدا کرتے ہیں۔ مغربی داستان گوؤں نے "ماؤمٹ" (جو محمد نام کی ان چالیس شکلوں میں سے ایک ہے جو آکسفورڈ انگلش ڈکشنری میں موجود ہیں) کو شیطان کے معنی میں استعمال کیا۔ یہ نام پتلی اور گڑیا کا ہم معنی بن گیا۔ شیکسپیئر نے اس نام کو "Romeo and Juliet" میں اسی مفہوم میں استعمال کیا۔ اس نام کی ایک اور شکل "ماہون" کو ڈراموں میں ایک ایسی چیز کے طور پر پیش کیا گیا جس کی عبادت کی جاتی ہے۔ کتنا بڑا ظلم ہے

کہ سب سے بڑے بت شکن اور تاریخ انسانی کے سب سے بڑے موحد کو معبود بنا کر پیش کیا گیا۔"(1)

تمام مستشرقین کا مقصد اسلام کو نقصان پہنچانا اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے دلوں میں اس کے خلاف نفرت پیدا کرنا ہے لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جو طریقہ کار وہ اپناتے ہیں اس میں باہم تضاد ہے۔ کیرن آرمسٹرانگ، منگمری واٹ اور فلپ۔کے۔ ہٹی نے اپنے پیشروؤں کے خیالات کی تردید اس لئے نہیں کی کہ وہ اسلام کو ایک مظلوم دین سمجھتے ہیں اور اس کے ساتھ انصاف کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ اپنے پیشروؤں کے ساتھ ان کے اختلاف کا سبب یہ ہے کہ اسلام کے خلاف ان کے پیشروؤں کے الزامات اتنے بے بنیاد، لغو اور فضول ہیں کہ ان سے اسلام کی بجائے ان کی اپنی تحریک کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ استشراق کی تحریک جو اپنی غیر جانبداری، بے لاگ تحقیق اور انصاف پسندی کے لئے مشہور ہے، اسلام پر اس کی طرف سے اس قسم کے بے بنیاد الزامات سے اس کا اپنا پردہ چاک ہونے کا اندیشہ ہے۔ دور اندیش مستشرقین نے اندازہ لگا لیا ہے کہ اگر تحریک استشراق کا جبہ پارسائی چاک ہو گیا تو اس کے چہرے پر تعصب، عناد، انصاف دشمنی اور غلو کی سیاہی دیکھ کر دنیا کو گھن آنے لگے گی اور مستشرقین کی جھوٹی عظمت کا محل زمین بوس ہو جائے گا۔

مستشرقین کے رویے میں تبدیلی مقصد کی تبدیلی نہیں بلکہ حکمت عملی کی تبدیلی ہوتی ہے۔ ان کا ہدف ہمیشہ ایک ہی رہتا ہے لیکن اسے نشانہ بنانے کے لئے وہ زاویے بدلتے رہتے ہیں۔ ہزاروں مستشرقین نے کئی صدیاں اسلام پر مشق ستم کی ہے۔ "ہر کہ آمد عمارت نو ساخت" کے مصداق انہوں نے اسلام دشمنی کے نت نئے اسلوب اپنائے ہیں۔ انہوں نے اسلام کو نشانہ بنانے کے لئے جو تیر پھینکے ہیں ان کے تفصیلی تذکرے کے لئے کسی دائرۃ المعارف کی ضرورت ہے۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا یہ فرض ہے کہ مستشرقین نے اسلام کے پاکیزہ دامن پر جو خیالی دھبے ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے، ہم ان دھبوں کی قلعی کھول کر اسلام کو اس کی اصلی اور پاکیزہ شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کریں تاکہ حق کی جستجو کرنے والے جادہ حق پر گامزن ہو کر اپنی دنیا اور آخرت کو سنوار سکیں۔

1۔ "اسلام: اے وے آف لائف"، صفحہ 23

مستشرقین نے اسلام کے خلاف بھانت بھانت کی بولیاں بولی ہیں۔ انہوں نے اسلام پر اکثر ایسے الزامات لگائے ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی وہ اس قابل ہیں کہ ان پر علمی بحث کی جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ جو مسلمان مستشرقین کے ظالمانہ اور عیارانہ حملوں سے اپنے دین متین کا دفاع کرنا چاہتے ہیں، ان کے راستے میں سب سے پہلا مسئلہ مستشرقین کے ان اعتراضات کا انتخاب ہوتا ہے جو وہ اسلام پر کرتے رہے ہیں اور جن پر علمی گفتگو کی گنجائش موجود ہے۔

ہم جب مستشرقین کی طرف سے اسلام پر کئے جانے والے اعتراضات کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ لوگ اسلام کے شجرہ طیبہ کی ہر اس جڑ کو کاٹ دینا چاہتے ہیں جس پر اس کے وجود اور بقاء کا دارومدار ہے۔ اسلام کے گہرے مطالعہ کے بعد وہ اس حقیقت سے آشنا ہو چکے ہیں کہ اسلام کی مثال اس شجرہ طیبہ کی سی ہے جس کا ذکر قرآن حکیم نے ان الفاظ میں کیا ہے:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۙ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۭ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (1)

"کیا آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ کیسی عمدہ مثال بیان کی ہے اللہ تعالیٰ نے کہ کلمہ طیبہ ایک پاکیزہ درخت کی مانند ہے جس کی جڑیں بڑی مضبوط ہیں اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ وہ دے رہا ہے اپنا پھل ہر وقت اپنے رب کے حکم سے۔ اور بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ مثالیں لوگوں کے لئے تاکہ وہ (انہیں) خوب ذہن نشین کر لیں۔"

مستشرقین کے سامنے اسلام کا شجرہ طیبہ تھا جس کی جڑیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کا تنا مضبوط اور شاخیں بار آور تھیں۔ اربوں انسان اس کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر اس کے شیریں پھلوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ انہوں نے اس شجرہ طیبہ کی اس نرالی شان کو دیکھا تو حسد کی آگ میں جلنے لگے۔ انہوں نے حسد کی آگ میں جلتے ہوئے، اس شجرہ طیبہ کو کاٹ دینے کا تہیہ کر لیا۔

1۔ سورۂ ابراہیم: 25

انہوں نے اس کی جڑوں پروار شروع کر دیئے۔ لیکن جب بھی انہوں نے اس کی جڑوں پر کوئی تازہ وار کیا انہیں محسوس ہوا کہ یہ پہلے سے بھی مضبوط تر ہو گیا ہے۔ وہ حیران تھے کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ وہ چیز کیا ہے جس کی وجہ سے ان کا ہر وار بے اثر ہو رہا ہے۔ اس شجرہ طیبہ کی مضبوطی کا راز کیا ہے۔

مستشرقین نے ان سرچشموں کا سراغ لگانا شروع کر دیا جن سے اس شجرہ طیبہ کو مسلسل غذا مہیا ہو رہی ہے۔ اس تلاش نے ان کو اس نتیجے پر پہنچایا کہ اسلام کے شجرہ طیبہ کو تین سرچشموں سے مسلسل غذا مل رہی ہے۔ وہ تین سرچشمے یہ ہیں: قرآن حکیم، احادیث نبویہ اور سیرت سرور عالم ﷺ۔ انہیں اس حقیقت کو سمجھنے میں مشکل پیش نہ آئی کہ جب تک قوت اور طاقت کے یہ سرچشمے موجود ہیں، اس وقت تک نہ اسلام کے تناور درخت کو زمین بوس کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی خنک چھاؤں اور لذیذ میووں سے بنی نوع انسان کو محروم کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اس حقیقت کو بھی پالیا کہ اسلام کا قصر رفیع قرآن حکیم، احادیث نبویہ اور سیرت مصطفوی کے مضبوط ستونوں پر استادہ ہے۔ جب تک یہ ستون قائم ہیں یہ قصر رفیع قائم رہے گا۔ انہوں نے ان ستونوں پر تیشہ زنی شروع کر دی۔ انہوں نے قصر اسلام کے ان ستونوں کو گرانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن انہیں ہمیشہ اپنی ناکامیوں پر کف افسوس ملنے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔

مستشرقین کے کام کے متعلق اس بنیادی نکتے کو سمجھ لینے کے بعد ہم ان کی اسلام دشمن کارروائیوں کو پانچ حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

1۔ قرآن حکیم کی مخالفت

2۔ احادیث نبویہ کی مخالفت

3۔ سیرت سرور عالم ﷺ کی مخالفت

4۔ شریعت اسلامیہ کی مخالفت

5۔ تاریخ اسلام کی مخالفت

مستشرقین نے مذکورہ بالا تمام میدانوں میں کتابوں کے ڈھیر لگا دیئے ہیں۔ انہوں نے تقسیم کار کے اصول پر عمل کیا۔ کسی نے قرآن حکیم کو اپنی مشق ستم کا نشانہ بنایا۔ کسی نے احادیث طیبہ پر طبع آزمائی کی۔ کسی نے مسلمانوں کو عشق مصطفیٰ کی انمول دولت سے محروم

کرنے کے لئے سیرت مصطفیٰ علیہ اطیب التحیۃ والثناء کے عفت مآب دامن کو آلودہ کرنے کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ کسی نے شریعت اسلامیہ کو صحرائی اور بدوی مزاج کے موافق قرار دے کر دور حاضر کے لئے ناقابل عمل قرار دینے کی سعی نامسعود کو اپنی زندگی کا وظیفہ بنایا اور کسی نے اسلام کی درخشندہ اور تابندہ تاریخ میں کیڑے ڈالنے کے لئے دنوں کا چین اور راتوں کی نیند قربان کر دی۔

صلیبی جنگوں کے دور میں مستشرقین نے اسلام پر جو کیچڑ اچھالا وہ ان کے تعصب، حسد، عناد اور خبث باطن کے اظہار کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس دور میں انہوں نے اسلام کو ہر خوبی سے معرا اور ہر خامی کا منبع ثابت کرنے کیلئے بھرپور کوشش کی۔

انہوں نے اسلام کو بت پرستی کا مذہب قرار دیا۔ حضور ﷺ کے پاکیزہ دامن کو ہر گندگی سے آلودہ کرنے کی کوشش کی اور مسلمانوں کو انسانوں کی بجائے درندہ بنا کر پیش کیا۔ مستشرقین کے اس پروپیگنڈے میں نہ انسانیت تھی اور نہ شرافت۔ اس میں نہ تو صداقت کا کوئی پہلو تھا اور نہ ہی اس کی بنیاد کسی علمی تحقیق پر تھی۔ مستشرقین کے اس دور کے اعتراضات اپنی لغویت کی وجہ سے اس قابل نہیں کہ ان پر بحث چھیڑ کر سلیم الفطرت انسانوں کے ذوق کو مجروح کیا جائے۔ ان اعتراضات کو در خور اعتناء سمجھنے کی ضرورت اس لئے بھی نہیں کہ متاخر مستشرقین نے خود اپنے پیشروؤں کی ان علمی بددیانتیوں اور اخلاقی دیوالیہ پن کا پردہ چاک کر دیا ہے۔ اس لئے ہمیں ان الزامات اور ان کے جوابات کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔

متاخر مستشرقین نے اپنی کوششوں کو علمی رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے اسلامی ادب کا بڑی گہری اور تنقیدی نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ اور جہاں بھی انہیں اسلام پر اعتراض کرنے کی معمولی سی گنجائش ملی ہے وہاں انہوں نے اپنے ذہنوں کی زرخیزی اور قلم کی جولانی کے خوب جوہر دکھائے ہیں۔ ان مستشرقین نے اکثر و بیشتر اپنے الزامات کو ثابت کرنے کے لئے مسلم مصنفین کی عبارتوں کو بطور ثبوت پیش کیا ہے لیکن انہوں نے مستند باتوں کو رد کرنے اور کمزور باتوں کو قبول کرنے میں جرح و تعدیل کے اصولوں کو جی بھر کر پامال کیا ہے۔

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ متاخر مستشرقین کا میدان تحقیق بھی اپنے پیشروؤں کی

طرح قرآن حکیم، احادیث طیبہ، سیرت طیبہ، شریعت اسلامیہ اور تاریخ اسلام ہی ہیں لیکن ان کا انداز اور طریقہ واردات مختلف ہے۔

دور حاضر میں انسان نے مادی علوم میں بڑی ترقی کی ہے لیکن ان علوم کا ایک بہت بڑا مسئلہ یہ ہے کہ یہ کائنات کے تمام حقائق کو مادی پیمانوں پر ماپنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب کوئی حقیقت ان پیمانوں پر پوری نہیں اترتی تو اس کا انکار کر دیتے ہیں۔ ان علوم پر اعتماد کرنے والے اس عظیم کائنات کے عظیم خالق کے وجود کو خلاف عقل کہہ کر اس کا انکار کر دیتے ہیں اور پھر اس کائنات کے حیران کن نظم و ضبط، اس کی روح پرور ہم آہنگی اور اس کے ذرے ذرے سے عیاں اعجاز آفرینیوں کے اسباب مادی دنیا میں تلاش کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ کبھی کائنات کی رعنائی اور عظمت کو اتفاقی حادثہ قرار دیتے ہیں اور کبھی اپنی لیبارٹریوں کی مدد سے کائنات کے مختلف مظاہر کی ارتقائی تاریخ گھڑنے بیٹھتے ہیں اور تحقیق کے نام پر اس قسم کے مضحکہ خیز نظریات پیش کرتے ہیں جو سلیم الفطرت انسانوں کے لئے روحانی کرب کا باعث بن جاتے ہیں۔

مستشرقین نے اسلام پر تحقیق کرتے ہوئے بھی یہی رویہ اپنایا ہے۔ حضور ﷺ نے اعلان فرمایا کہ قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو اللہ تعالیٰ کے امین فرشتے جبریل علیہ السلام کے ذریعے قلب مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثنا پر نازل ہوا۔ مستشرقین حضور ﷺ کے اس دعویٰ کو تسلیم نہیں کرتے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ مستشرقین کی ایک معقول تعداد حضور ﷺ کو جھوٹا کہنے کی جرأت بھی نہیں کرتی۔ وہ حضور ﷺ کے کردار کی تعریف بھی کرتے ہیں۔ آپ نے قرآن حکیم کی تعلیمات کی مدد سے تاریخ انسانی میں جو انقلاب برپا کیا، اس کی عظمت کا اقرار بھی کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود اس حیات بخش پیغام کے کلام الٰہی ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ اس انکار کے بعد ان کی کیفیت بڑی عجیب ہوتی ہے۔ یہ کلام جس نے نہ صرف جزیرہ عرب بلکہ پوری دنیا کا نقشہ بدل دیا تھا، اگر یہ خداوند کریم کا کلام نہیں تو پھر اس کا مصدر و منبع کیا ہے؟ پھر وہ اس سوال کا جواب تلاش کرنے اور اس لاثانی کلام کے مصدر و منبع کا کھوج لگانے کے لئے میدان خیال میں اپنی تحقیق و جستجو کے گھوڑے سرپٹ دوڑا دیتے ہیں۔ کبھی یہود و نصاریٰ کو حضور ﷺ کا استاد قرار دیتے ہیں۔ کبھی حضور ﷺ کی ذہانت، فطانت، معاملہ فہمی اور دوراندیشی کی عظمتوں کو سلام کر کے قرآن حکیم کو ان کا کرشمہ قرار

دیتے ہیں۔ کبھی جزیرہ عرب کے جغرافیے، تاریخ اور تہذیب کے ساتھ اس حیات بخش پیغام کا رشتہ جوڑتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں حضور ﷺ کی حیات طیبہ مختلف مراحل میں جن مسائل سے دوچار ہوتی رہی، ان مسائل کا حل تلاش کرنے اور اپنے پیروکاروں کے اعتماد کو بحال رکھنے کے لئے آپ حسب ضرورت قرآنی آیات خود بناتے رہے۔ کئی مستشرقین نے قرآن حکیم کی نزولی ترتیب خود متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ ولیم میور، ہبرٹ گرمے (Hubret Grimme) تھیوڈور نولڈک (Theodor Noldeke) اور رچرڈ بیل (Richard Bell) نے اپنے اپنے نقطہ نگاہ سے قرآن حکیم کی نزولی ترتیب پر کتابیں لکھی ہیں۔ (1) اس موضوع پر نولڈک اور رچرڈ بیل کا کام مستشرقین کے ہاں بڑا مستند شمار کیا جاتا ہے۔

قرآن حکیم کی اس خود ساختہ ترتیب نزولی کے بل بوتے پر وہ قرآن حکیم پر بڑے عجیب و غریب اعتراضات کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: قرآن حکیم کی ابتدائی سورتوں میں بتوں کی مخالفت کا کوئی ذکر نہیں۔ قرآن حکیم نے بت پرستی کی مخالفت، بہت بعد میں شروع کی۔ اسی ترتیب نزولی کے بھروسے پر وہ یہ تحقیق فرماتے ہیں کہ قرآن کی ابتدائی آیات میں حضرت جبریل امین علیہ السلام کا ذکر نہیں، ان کا ذکر صرف مدنی سورتوں میں ملتا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ مکی قرآن کو لے کر حضرت جبریل امین نہیں اترے بلکہ مکی قرآن کسی دوسرے فرشتے کے ذریعے نازل ہوا۔ کبھی وہ حضور ﷺ کو بت پرستوں کے ساتھ عقائد کے معاملے میں "کچھ دو اور کچھ لو" کے اصول پر عمل پیرا دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اسی خود ساختہ ترتیب نزولی کے زور پر وہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے سود کی حرمت کا اعلان صرف یہودیوں کی مخالفت کی وجہ سے کیا۔ جب تک آپ کو امید تھی کہ یہودی حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں گے، اس وقت تک آپ نے ان کے ساتھ نرم رویہ اختیار کئے رکھا اور جب آپ کو یقین ہو گیا کہ یہ لوگ اسلام قبول نہیں کریں گے تو آپ نے ان کی مخالفت شروع کر دی۔ اسی وجہ سے آپ نے بیت المقدس کی بجائے خانہ کعبہ کے قبلہ ہونے کا اعلان کیا کیونکہ بیت المقدس یہودیوں کا قبلہ تھا۔ حضور ﷺ نے یہودیوں پر دوسرا وار یہ کیا کہ آپ نے سود کو حرام قرار دے دیا تاکہ یہودیوں کے کاروبار کو نقصان پہنچے۔

مستشرقین نے قرآن حکیم کی جمع و تدوین پر بھی دل کھول کر اعتراضات کئے تاکہ اس

1۔ منٹگمری واٹ، "محمد ایٹ مکہ"، (ایڈنبرا یونیورسٹی پریس۔ 1988)، صفحہ 3

بات پر سے مسلمانوں کا ایمان متزلزل ہو کہ آج ہمارے ہاتھوں میں جو قرآن حکیم ہے یہ بعینہٖ وہی ہے جو حضور ﷺ پر نازل ہوا تھا۔ وہ قرآن کی مختلف قراءتوں کو قرآن حکیم کے مختلف "Version" قرار دیتے ہیں۔

"Version" کا لفظ عیسائی ادب میں جس معنی میں استعمال ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کے ہاں انجیل چار مختلف روایتوں سے موجود ہے: متی کی انجیل، لوقا کی انجیل، مرقس کی انجیل اور یوحنا کی انجیل۔ متی، لوقا، مرقس اور یوحنا نے چار مختلف انجیلیں لکھی ہیں۔ یہ چاروں انجیلیں مستقل کتابیں ہیں۔ ان میں باہم کئی اختلافات ہیں۔ یہ نہ تو ایک دوسری کا ترجمہ ہیں اور نہ ہی ان کے مندرجات میں مکمل یگانگت پائی جاتی ہے۔ ہر ایک مصنف نے اپنے نقطہ نظر سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تاریخ لکھی ہے۔ ایسی سینکڑوں انجیلیں لکھی گئیں لیکن کلیسانے اپنے عقائد کو سارے عالم عیسائیت پر ٹھونسنے کے لئے اکثر اناجیل تلف کر دیں اور مذکورہ بالا چار انجیلوں کو متند قرار دیا۔ ان انجیلوں پر بھی عیسائی علماء مختلف اوقات میں نظر ثانی کرتے رہے اور اس نظر ثانی کے نتیجے میں ان انجیلوں میں بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں بھی کرتے رہے۔ جب بھی کوئی انجیل نظر ثانی کے بعد شائع ہوئی اسے ایک نیا "Version" قرار دیا گیا۔ اس لحاظ سے اناجیل اربعہ میں سے ہر انجیل کے کئی کئی (Version) ان کے پاس موجود ہیں جس طرح ہر انجیل دوسری انجیل سے متعدد مقامات پر مختلف ہے، اسی طرح ہر انجیل کا ہر (Version) بھی دوسرے (Version) سے مختلف ہے۔

مستشرقین کے آباؤ اجداد نے انجیل میں تحریفات کر کے اسے جس مقام پر پہنچا دیا ہے، وہ قرآن حکیم کو بھی اسی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اناجیل کے ان باہمی تضادات نے عالم عیسائیت کی اکثریت کو مذہب عیسوی سے متنفر کر رکھا ہے۔ اگر قرآن میں بھی وہی کمزوری ثابت ہو جائے جس کی وجہ سے اناجیل کا اعتماد مجروح ہوا تو اسلام کا بھی وہی حشر ہو گا جو عیسائیت کا ہوا ہے۔ لیکن مستشرقین پوری کوششوں کے باوجود قرآن حکیم میں اس خامی کو ثابت نہیں کر سکتے کیونکہ اس کتاب مبین کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ دنیا کے کسی حصے میں چلے جائیں، وہاں جو قرآن حکیم پڑھا جا رہا ہو گا وہ بعینہٖ وہی ہو گا جو باقی ساری دنیا میں پڑھا جا رہا ہے۔ اس میں نہ ملک کی تمیز ہے، نہ علاقے کی اور نہ زمانے کی۔ اور مستشرقین اس حقیقت کا انکار بھی نہیں کر سکتے۔

مستشرقین نے قرآن حکیم کی مختلف قرأتوں کو صرف قرآن حکیم کے مختلف (Version) ہی قرار نہیں دیا بلکہ ان قراءتوں کی وجہ سے قرآن حکیم پر اور بھی کئی حملے کئے ہیں۔ اور اپنے مخصوص مقاصد کے تحت اس مسئلے کو خوب اچھالا ہے۔ ہم موزوں مقام پر مستشرقین کی ان الزام تراشیوں کا تفصیل سے جواب دیں گے۔ سر دست صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ مستشرقین کی طرف سے اسلام پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں ان کی نوعیت کیا ہے۔

قرآن حکیم کے علاوہ قصر اسلام کا دوسرا ستون احادیث طیبہ ہیں۔ مستشرقین نے قصر اسلام کے اس ستون پر بھی دل کھول کر تیشہ زنی کی ہے۔ انہوں نے بڑی کوششوں سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ احادیث گھڑنا مدتوں مسلمانوں کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ وہ مسلمانوں پر یہ بے بنیاد الزام لگاتے ہیں کہ مسلمان اپنے جس عقیدے یا خیال کو ثابت کرنا چاہتے تھے، اس کے لئے خود حدیثیں گھڑ لیتے تھے۔

احادیث طیبہ کی وقعت کو کم کرنا اسی صورت میں ممکن تھا جب احادیث کے راویوں کے دامن کو آلودہ کر کے لوگوں کو دکھایا جاتا۔ اس مکروہ مقصد کے لئے مستشرقین نے رواۃ حدیث اور فن حدیث کے ماہرین پر انتہائی گھٹیا الزامات لگائے تاکہ ان کی ثقاہت مجروح ہو اور اس کے نتیجے میں احادیث طیبہ کی حیثیت ختم ہو کے رہ جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ احادیث طیبہ پر سے مسلمانوں کا اعتماد اٹھ جائے اور ہر شخص کو اپنی مرضی سے قرآن حکیم کی تفسیر کی کھلی چھٹی مل جائے تاکہ وہ دین جو وحدت انسانی کا علمبردار ہے وہ بازیچہ اطفال بن جائے۔

مستشرقین احادیث طیبہ کو تو تاریخی دستاویز کے طور پر بھی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اسلام پر مستشرقین کا یہ وار بڑا کارگر ثابت ہوا ہے اور اب ملت اسلامیہ میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو قرآن حکیم کے علاوہ دینی ادب کے کسی مصدر پر اعتماد کرنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ ہر مسئلے کا حل براہ راست قرآن حکیم سے اخذ کرنے کے قائل ہیں۔ اس کام کے لئے انہیں نہ احادیث کی ضرورت ہے اور نہ ان علوم کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت ہے جو تفہیم دین کے لئے علمائے اسلام نے مدتوں کی عرق ریزی سے مدون کئے ہیں۔ انہیں عربی زبان جاننے کی بھی ضرورت نہیں۔ ان کے نزدیک کسی بھی زبان میں قرآن کا ترجمہ پڑھ کر علوم قرآن کا ماہر بنا جا سکتا ہے۔

حضور ﷺ کی سیرت طیبہ تو خصوصی طور پر مستشرقین کی مشق ستم کا نشانہ بنی ہے۔

بعثت نبوی خصوصاً ہجرت نبوی کے بعد دنیا کے حالات میں جس تیزی کے ساتھ محیر العقول تبدیلیاں رونما ہوئیں، مستشرقین نے ان کا بڑی وقت نظر سے مطالعہ کیا۔ انہوں نے عمر بن خطاب جیسے مضبوط اعصاب کے مالک شخص کو اپنا آبائی دین چھوڑ کر حضور ﷺ کی غلامی پر فخر کرتے دیکھا۔ انہوں نے بدر وحنین کے معرکوں میں بڑے بڑے لشکروں کے مقابلے میں مٹھی بھر غلامان مصطفیٰ کو کامیابی کے پرچم لہراتے دیکھا۔ انہوں نے دیکھا کہ شراب جن لوگوں کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی وہ محمد عربی ﷺ کے اشارہ ابرو پر شراب کے مٹکوں کو مدینے کی گلیوں میں توڑ رہے تھے۔ انہوں نے جانی دشمنوں کے دلوں میں جذبہ اخوت پیدا ہونے کے عدیم النظیر انسانی تجربے کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔ انہوں نے شمع محمدی کے پروانوں کی جاں نثاری کے واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ان خاک نشینوں اور نان جویں پر گزارہ کرنے والوں کی محیر العقول قوت کا راز عشق مصطفیٰ ﷺ کی اس چنگاری میں ہے جو ان کے سینوں میں دمک رہی ہے۔ دین اسلام کی طرف سے عائد ہونے والی پابندیوں پر بھی مسلمان اسی جذبہ عشق کی بدولت خندہ پیشانی سے عمل کرتے ہیں اور عشق کا یہی جذبہ انہیں پہاڑوں سے ٹکر لینے اور سمندروں میں کود جانے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔

انہوں نے عشق کے اس شعلے کو سرد کرنے کی کوشش کی جو مسلمانوں کے سینوں میں روشن تھا۔ لیکن جب شمع پوری آب و تاب سے جل رہی ہو تو کسی پروانے کے دل سے جل جانے کے جذبے کو نکال دینا ممکن نہیں ہوتا۔ انہوں نے شمع جمال محمدی کو گل کرنے کی تدبیریں کیں لیکن وہ شمع جس کی حفاظت خود خداوند کریم فرمارہا تھا وہ کسی بدخواہ کی پھونکوں سے کیسے بجھ سکتی تھی۔

وہ شمع جو نہ کفار مکہ کی پھونکوں سے بجھی تھی، نہ یثرب کے یہودیوں کی کوششیں اسے بے نور کر سکی تھیں اور نہ دیگر دشمنان اسلام کی صدیوں کی کوششیں اس شمع کو گل کر سکی تھیں، مستشرقین نے اس شمع کی روشنی کو دھندلا کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ خدا نے جس ہستی کو عالمین کے لئے راہنما بنا کر بھیجا تھا، انہوں نے اسے اپنے ڈراموں، تصویری کہانیوں اور ناولوں کا ایک ناپسندیدہ کردار بنا کر پیش کیا۔ جس ہستی کے بت شکن ہونے کی گواہی فرشتے دیتے ہیں، اسے انہوں نے بت پرست اور جھوٹا معبود بنا کر پیش کیا۔

جس انسان کامل کی عفت و عصمت پر پوری نسل انسانی کو ناز کرنا چاہیے، بدبخت مستشرقین اسے جنس پرست، بدکردار اور دولت، شہرت اور اقتدار کا حریص بنا کر پیش کرتے ہیں۔ جس رسول معظم نے کلام خداوندی میں تحریف کو گناہ عظیم اور کفر قرار دیا ہے، وہ اس پر قرآن خود گھڑ کر خدا کی طرف منسوب کرنے کا الزام لگاتے ہیں۔

مستشرقین کائنات کی اس پاکیزہ ترین ہستی پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ موقع محل کی مناسبت سے خود قرآن گھڑتی اور اس میں تحریف کرتی رہی۔ خدا کا جو محبوب بندہ اپنے سر پر رحمۃ للعالمینی کا تاج سجائے اس عالم آب و گل میں جلوہ گر ہوا تھا، مستشرقین اسے ظلم اور سفاکی کا داعی بنا کر پیش کرتے ہیں۔

مستشرقین کی ان تمام کوششوں کا مقصد اور مدعا صرف یہ ہے کہ لوگ اپنی روحانی پیاس بجھانے کی خاطر اس چشمہ صافی کی طرف متوجہ نہ ہوں۔ تاریکیوں اور ظلمتوں میں بھٹکتی ہوئی نسل آدم معرفت و روحانیت کے اس آفتاب کی نورانی کرنوں سے اپنے قلب و نگاہ کو منور نہ کرے۔ لیکن ہر قسم کے بدخواہوں کی تمام کوششوں کے باوجود رسالت محمدی کا آفتاب آج بھی پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہے۔ چمنستان محمدی سے آج بھی نکہت و نور سے معمورہ ہوائیں اٹھ رہی ہیں جو ایک عالم کے مشام جان کو معطر کر رہی ہیں۔

اے شمع جمال مصطفوی کو اپنی پھونکوں سے بجھانے کی کوشش کرنے والے! ذرا توقف کر۔ چند لمحات کے لئے اپنے دل کی گہرائیوں میں جھانک۔ اپنی بصیرت، اپنے ضمیر، اپنے دل اور اپنی روح سے فتویٰ طلب کر کہ ریگزار عرب میں روشن ہونے والی وہ شمع جسے گل کرنے کے لئے مکہ کے کفار نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا، جسے بے نور کرنے کے لئے قیصر و کسریٰ پورے طمطراق کے ساتھ میدان میں آئے، جس کی روشنی کو ختم کرنے کے لئے پورا یورپ صدیوں صلیبیں گلوں میں لٹکائے، تلواریں بے نیام کئے اور عظمت مسیحیت کے نعرے لگاتے ہوئے ممالک اسلامیہ پر حملہ آور ہوتا رہا اور جس کی روشنی کو دھندلا کرنے کے لئے مستشرقین بارہ سو سال سے اپنی ساری صلاحیتیں صرف کر رہے ہیں لیکن وہ شمع ہے کہ روشن تر ہو رہی ہے، اس پھول کی مہک میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور اس شجرہ طیبہ کی خنک چھاؤں میں پناہ لینے والوں کی تعداد میں مسلسل بڑھ رہی ہے۔ ذرا سوچ! کیا یہ سب کچھ اس بات کی دلیل نہیں کہ اس شمع اور اس کے نور کی حفاظت اور رکھوالی خود

خدائے بزرگ و برتر فرمارہاہے؟

یقیناً اس شمع کا رکھوالا وہی رب قدوس ہے۔ وہی ہے جو اتنی پھونکوں کے باوجود اسے بجھنے نہیں دیتا۔ وہی ہے جو اس کی تنویرات میں مسلسل اضافہ فرمارہاہے۔

• ذرا سوچ! کیا تاریخ انسانی میں ایسی کسی دوسری ہستی کی مثال موجود ہے، جس کے کردار کو مسخ کرنے کی اتنی کوششیں کی گئی ہوں لیکن اس کے باوجود وہ کروڑوں بلکہ اربوں انسانوں کی محبت وعقیدت کا مرکز رہی ہو؟

اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر اس دن سے ڈر جس دن شمع جمال حبیب ﷺ کو گل کرنے کی کوشش کرنے والوں کے لئے تاریکیوں اور ظلمتوں کے سوا کچھ بھی نہ ہوگا۔

مستشرقین نے جب دیکھا کہ شریعت اسلامیہ زندگی کے ہر میدان میں مسلمانوں کی راہنمائی کرتی ہے تو انہوں نے شریعت اسلامیہ کے چشمہ صافی کو بھی گدلا کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگانا شروع کر دیا۔ انہوں نے شریعت اسلامیہ کا منبع قرآن وحدیث کو نہیں بلکہ رومی قانون کو قرار دیا۔ امت مسلمہ کی جو مقدس ہستیاں زندگی بھر شریعت اسلامیہ کی خدمت میں مصروف رہیں، مستشرقین نے ان کے پاکیزہ دامن کو فرضی عیوب سے داغدار کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے جہاد کے اسلامی فریضے کو دہشت گردی قرار دیا۔ انہوں نے لوگوں کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ مسلمانوں کا دین قتل وغارت اور خون ریزی کا درس دیتا ہے۔ انہوں نے قرآن حکیم کی خود ساختہ ترتیب نزولی کی آڑ میں اسلام پر یہ وار کیا کہ ابتداء میں اسلام نے احترام آدمیت اور انسانی جان ومال کی حفاظت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ تعدد ازدواج اور عقوبات کے اسلامی قوانین پر انہوں نے دل کھول کر طبع آزمائی کی۔

مستشرقین نے جب دیکھا کہ ان کے اتنے واویلے کے باوجود مسلمان اپنے دین سے بے نیاز نہیں ہو رہے تو انہوں نے مسلمانوں کا خیر خواہ بن کر انہیں یہ باور کرانے کی بھرپور کوشش کی کہ عربوں کا اپنا ایک مخصوص مزاج تھا۔ اس عربی مزاج کے مطابق اسلامی شریعت واقعی قابل عمل اور مفید تھی۔ ساتویں صدی عیسوی کے جزیرہ عرب کو جن سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل کا سامنا تھا، شریعت اسلامیہ نے واقعی ان کا حل پیش کیا اور اس شریعت پر عمل کر کے عربوں نے اتنی ترقی کی کہ قیصر وکسریٰ کی حکومتیں ان کے لئے ریت کی دیوار ثابت ہوئیں لیکن اب زمانہ بہت آگے نکل چکا ہے۔ اب انسان کی ذہنی سطح

بہت بلند ہو چکی ہے۔ آج کے انسانی مسائل ساتویں صدی عیسوی کے جزیرہ عرب کے مسائل سے قطعاً مختلف ہیں۔ آج شریعت اسلامیہ سے چمٹے رہنے پر اصرار کرنا اپنی قوم کو پسماندگی کے گڑھے میں دھکا دینے کے مترادف ہے۔

مستشرقین مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ آج دنیا میں مسلمان سب سے زیادہ پسماندہ قوم ہیں۔ وہ مسلمانوں کو یہ بھی بتاتے ہیں کہ ان کی پسماندگی کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ شریعت اسلامیہ کے ساتھ چمٹے رہنے پر مصر ہیں، اور یہ شریعت زندگی کے تیزی سے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دینے سے قاصر ہے۔ مسلمانوں کے یہ بہی خواہ انہیں نصیحت کرتے ہیں کہ ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ یا تو کلی طور پر شریعت سے اپنا دامن چھڑا لیں اور اگر یہ نہیں کرتے تو کم از کم اس شریعت میں ایسی ترمیمیں کریں کہ وہ وقت کے تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔

بدقسمتی سے اکثر مسلمانوں نے مستشرقین کے ان مشوروں کو بڑی توجہ سے سنا ہے اور ان پر عمل پیرا ہونے کے لئے پوری کوشش کر رہے ہیں۔ ترکی میں شریعت سے دامن چھڑا کر ملک کو ترقی یافتہ بنانے کی ایک کوشش ہو چکی ہے اور دیگر اسلامی ممالک کا ایک اچھا خاصا طبقہ بھی انہی خطوط پر سوچ رہا ہے۔ لیکن مادہ پرستی کے اس دور میں شاید ملت اسلامیہ وہ واحد قوم ہے جس کی غالب اکثریت آج بھی اسلامی ممالک میں شریعت کے نفاذ کو ہی تمام مسائل کا حل سمجھتی ہے اور دنیا کے مختلف خطوں میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی تحریکیں بڑے زور شور سے اٹھ رہی ہیں۔

مستشرقین کی اکثریت عیسائی مذہب سے تعلق رکھتی ہے اور جمہوریت کو دنیا کا بہترین سیاسی نظام شمار کرتی ہے۔ عیسائی مستشرقین ذرا غور فرمائیں کہ جس دور میں عیسائیوں نے اپنے مذہب کو پارلیمانی اداروں، بازاروں، کارخانوں اور زندگی کے دیگر شعبوں سے نکال کر چرچ کی چار دیواری میں بند کر رکھا ہے اور اس مقدس قیدی کی آزادی کے لئے عالم عیسائیت کے کسی کونے سے کوئی آواز نہیں اٹھتی، اسی دور میں اکثر مسلم ممالک میں ایسی تحریکیں زور شور سے اٹھ رہی ہیں جو شریعت اسلامیہ کو قومی زندگی میں قوت حاکمہ کی حیثیت سے نافذ کرنے کے مطالبے کر رہی ہیں۔

جمہوریت کے مدعی یہ حضرات ذرا جمہوری اصولوں کے پیش نظر یہ فیصلہ کریں کہ کیا

وہ دین سچا ہے جس کے پیروکاروں کی غالب اکثریت اسے چرچ کی چار دیواری میں بند رکھنے کو ہی قرین مصلحت سمجھتی ہے یا وہ دین سچا ہے جس کے ماننے والے کروڑوں انسان، اسے ملت کی اجتماعی زندگی میں قوت حاکمہ کی حیثیت سے نافذ دیکھنا چاہتے ہیں؟

مستشرقین شریعت اسلامیہ پر یہ الزام بھی لگاتے ہیں کہ وہ جمہوریت کی دشمن ہے۔ مستشرقین کے اس الزام کے جواب میں مختصراً عرض ہے کہ اگر جمہوریت سے مراد اکثریت کی خواہشات کی غیر مشروط پیروی ہے تو اسلام واقعی اس کا مخالف ہے کیونکہ اگر کسی موقعہ پر اکثریت یہ قانون بنانا چاہے کہ نماز پڑھنا جرم ہے تو اسلام اس کی مخالفت کرے گا کیونکہ خدا کے بنائے ہوئے قانون کو انسانوں کی اکثریت بدلنے کی مجاز نہیں۔ لیکن اگر جمہوریت سے مراد اظہار رائے کی آزادی اور ملت کے سواد اعظم کی رائے کا احترام ہے تو پھر اسلام اس کا قطعاً مخالف نہیں بلکہ اظہار رائے کی جو آزادی شریعت اسلامیہ نے دی ہے اس کا خواب جمہوریت کے علمبرداروں نے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔

تاریخ اسلام بھی مستشرقین کا خصوصی موضوع ہے۔ انہوں نے اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرنے اور اسے اپنے مزعومات کے مطابق ڈھالنے کے لئے کئی نظریات وضع کئے ہیں۔ انہوں نے ایک عالمی مذہب کا مطالعہ کرنے کے لئے روحانیت کی دخل اندازی کو مسترد کر دیا ہے۔ انہوں نے ہر بات کو مادی اور عقلی پیمانوں پر ماپا اور اسلام کی جو بات ان محدود پیمانوں پر پوری نہ اتری اس کا انکار کر دیا۔ انہوں نے نزول قرآن کی تاریخ لکھی اور اس کام کے لئے انہوں نے کسی اسلامی مصدر پر بھروسہ نہ کیا بلکہ اپنے مخصوص اصولوں کو، جو انہوں نے محض اس کام کیلئے خود وضع کئے تھے، کام میں لا کر انہوں نے یہ عظیم منصوبہ پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ قرآن کی کوئی آیت اگر اپنے موجودہ مقام پر ان کی خود ساختہ ترتیب سے ٹکرائی تو اسے انہوں نے بعد کا اضافہ قرار دے دیا۔

قرآن حکیم کی نزولی تاریخ کے علاوہ انہوں نے ملت اسلامیہ کی ملی تاریخ پر بھی خصوصی توجہ دی۔ انہوں نے ساتویں صدی عیسوی کے جزیرہ عرب کی تاریخ، جغرافیہ اور سماج کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور اس پس منظر میں وہ اسباب تلاش کرنے کی کوشش کی جنہوں نے حضور ﷺ کو ایک نیا مذہب متعارف کرانے کی طرف متوجہ کیا اور جن اسباب کی وجہ سے بعد میں اسلام نے ترقی کی۔ انہوں نے جاہلی ادب اور زمانہ جاہلیت کے رسوم و

رواج سے وہ معلومات تلاش کرنے کی کوشش کی جن کی بنیاد پر عرب کے امی رسول نے قرآن حکیم جیسی عظیم علمی کتاب تخلیق کی۔ انہوں نے ان عیسائی اور یہودی عناصر کو تلاش کرنے کی کوشش کی جنہوں نے، ان کے خیال کے مطابق، حضور ﷺ کو عیسائی اور یہودی تعلیمات سے آگاہ کیا جس کے نتیجے میں حضور ﷺ نے بائبل کی تعلیمات پر مشتمل قرآن اپنی امت کے سامنے پیش کیا۔

انہیں کفار مکہ کی شکل میں وہ اجارہ دار نظر آئے جنہوں نے مکہ اور طائف کی تجارت پر اجارہ داری حاصل کر کے چھوٹے تاجروں اور غریب طبقوں کو احساس کمتری میں مبتلا کر دیا تھا جس کے رد عمل کے طور پر اسلام کے نام پر ایک نیا دین وجود میں آیا، جس نے بڑے تاجروں کے انداز حیات اور ان کے کاروباری مفادات پر تابڑ توڑ حملے کئے، مکہ کے غرباء اور اپنے خاندانی بزرگوں کے مظالم سے تنگ آئے ہوئے نوجوانوں نے اس دین کو اپنے دل کی آواز سمجھا اور وہ جوق در جوق اس دین میں شامل ہونے لگے۔

مستشرق مورخین کی جولانئ طبع کا اندازہ فرمائیے کہ انہیں مکہ سے ہجرت کر کے حبشہ کی طرف جانے والے مسلمانوں کی ہجرت کا سبب یہ نظر آیا کہ مسلمانوں کی مختصر سی کیونٹی دو طبقوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ ایک طبقے کے سربراہ حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما تھے اور دوسرے طبقے کے سربراہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ مستشرقین کے خیال میں اس انتشار کے منفی اثرات سے اپنی مختصر سی جماعت کو محفوظ رکھنے کے لئے حضور ﷺ نے حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے چند ساتھیوں کو حبشہ بھیج دیا ورنہ مکہ والوں نے ان مسلمانوں پر کوئی اتنے زیادہ مظالم نہیں ڈھائے تھے جن کی وجہ سے انہیں اپنے ملک کو الوداع کہنے کی ضرورت پیش آتی۔

مستشرقین کے فن تحقیق نے ایک نئی حقیقت یہ بھی دریافت کی کہ حضور ﷺ نے کفار مکہ کے خلاف اہل حبشہ سے فوجی مدد کی درخواست کرنے کے لئے اپنے نمائندے اس ملک میں بھیجے تھے۔

مستشرقین ہمیں بتاتے ہیں کہ ہجرت کے بعد قریش مکہ نے تو مسلمانوں سے تعرض نہ کیا البتہ محمد (ﷺ) نے قریش کو اشتعال دلانے کے لئے ان کے تجارتی قافلوں پر حملے کئے جس کی وجہ سے کفار مکہ کو مجبوراً مسلمانوں کے خلاف تلوار اٹھانا پڑی۔ وہ ہمیں یہ بھی بتاتے

ہیں کہ مسلمانوں نے بدر کے اسیروں کے ساتھ انتہائی برا سلوک کیا تھا۔

مستشرقین کو مسلمانوں کے ساتھ یہودیوں کی عہد شکنی، ان کی سازشیں اور شع اسلام کو گل کرنے کیلئے ان کے متعدد منصوبے صفحات تاریخ پر کہیں نظر نہیں آتے، انہیں صرف یہودیوں کے خلاف حضور ﷺ کی کارروائی نظر آتی ہے اور اسے وہ خوب مرچ مسالا لگا کر پیش کرتے ہیں۔ کعب بن اشرف یہودی اور اس جیسے نابکاروں کی اسلام کے خلاف سازشیں انہیں نظر نہیں آتیں لیکن ان کے خلاف مسلمانوں نے جو تادیبی کارروائی کی وہ ان مستشرقین کے قلم کی جولانیوں کے لئے مفید میدان ثابت ہوتی ہے۔

حضور ﷺ نے مختلف ممالک کے حکمرانوں کو جو خطوط لکھے تھے وہ انہیں تو تسلیم کرتے ہیں لیکن اس بات کو وان کی عقل رسا تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ حضور ﷺ نے ان خطوں کے ذریعے ان حکمرانوں کو اسلام کی دعوت دی تھی۔ مستشرقین کے اصول تحقیق کی رو سے یہ بات قطعاً ناممکن اور ناقابل تسلیم ہے کہ مدینہ کا ایک امی رسول جس کے پیروکاروں کی تعداد چند ہزار تک محدود تھی، وہ قیصر و کسریٰ جیسے جابر حکمرانوں کو اپنا آبائی دین چھوڑ کر ایک نئے دین کو اپنانے کی دعوت دے سکتا تھا۔

مستشرقین کو نہ تاریخ میں فتح بیت المقدس کے وقت عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں کا رحمدلانہ سلوک نظر آتا ہے اور نہ ہی وہ وحشت و بربریت ان کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر سکتی ہے جس کا سامنا مسلمانوں کو صلیبیوں کے ہاتھوں اس وقت کرنا پڑا تھا جب عیسائی بیت المقدس کو مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھیننے میں کامیاب ہوئے تھے۔

عیسائیوں کی بربریت کے بے شمار مظاہروں کے باوجود، مستشرقین عیسائیوں کو رحمدل اور نصرانیت کو رافت و محبت کا دین ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ دین جس کے علمبردار صلاح الدین ایوبی اور نور الدین زنگی جیسے بہادر اور رحمدل انسان ہیں، اس دین کو وحشت اور بربریت کا دین ثابت کرنے کے لئے اپنے قلم کی جولانیاں دکھاتے ہیں۔

مستشرقین نے تاریخ کو اپنی مرضی کا جامہ پہنانے کے لئے آریائی نسل کی نسلی برتری کا نظریہ گھڑا ہے۔ اور اس نظریے کے ذریعے انہوں نے مسلمانوں اور ان کے دین کو گھٹیا اور نچلے درجے کا ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے۔ ان کے نزدیک مادہ اور بیسویں صدی عیسوی کے یورپ کی مادہ پرستانہ سوچ واقعات تاریخ کو پرکھنے کا معیار ہیں۔ اگر تاریخ

کہتی ہے کہ مسلمانوں نے کسی مادی مفاد کے لالچ کے بغیر اسلام کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دی تھیں تو تاریخ کا یہ کہنا حقیقت کے خلاف ہے کیونکہ، ان کے خیال میں، یہ ممکن نہیں کہ انسان کسی مادی مفاد کے بغیر کسی تحریک کے ساتھ منسلک ہو۔ مستشرقین کو تاریخ اسلام میں جو ایسی چیزیں نظر آتی ہیں جو ان کی مادہ پرست عقل کے معیار پر پوری نہیں اترتیں، انہیں وہ یہ کہ کر مسترد کر دیتے ہیں کہ ان باتوں کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس قسم کے واقعات متاخر مسلمانوں نے اپنے اسلاف کو ہیرو بنا کر پیش کرنے کے لئے خود گھڑے ہیں۔

ہم نے گزشتہ صفحات میں مستشرقین کی طرف سے اسلام کے خلاف کئے جانے والے اعتراضات کی نوعیت کی ایک جھلک قارئین کی خدمت میں پیش کی ہے۔ ان کے اعتراضات میں کچھ اعتراضات ایسے بھی ہیں جن کو اسلام کے خلاف قلمی جارحیت کے سوا کوئی دوسرا نام دینا مناسب نہیں۔ کیونکہ نہ تو وہ اعتراضات علمی بنیادوں پر کئے گئے ہیں اور نہ ہی ان میں شرافت اور انسانیت کا کوئی پاس رکھا گیا ہے۔ مستشرقین کے اعتراضات میں سے کچھ اعتراضات وہ بھی ہیں جن کے لئے انہوں نے قرآن و حدیث سے مواد تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور جہاں کہیں انہیں کوئی ضعیف سے ضعیف روایت ملی ہے، اس کی بنیاد پر انہوں نے اعتراض کا قصر رفیع تعمیر کرنے کی کوشش کی ہے جس کی حیثیت ریت کے گھروندے سے زیادہ کچھ نہیں۔

یہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ مستشرقین کے کمزور سے کمزور اعتراض بھی انہیں پہاڑ نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی اصلیت کو فراموش کر دیا ہے۔ انہوں نے علم کی دنیا سے اپنا رابطہ منقطع کر لیا ہے۔ مسلمانوں کے علمی سرمائے سے آگاہی حاصل کرنے کی جتنی کوششیں مستشرقین کرتے ہیں ہماری علمی کوششیں ان کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔

مستشرقین جس علمی سرمائے میں اسلام پر اعتراض کرنے کی بنیادیں تلاش کرتے ہیں، اسی علمی سرمائے میں ان کے اعتراضات کے مسکت اور منہ توڑ جواب موجود ہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ مسلمان اپنی علمی دولت کی طرف متوجہ ہوں اور اس سے کام لے کر مستشرقین کے اعتراضات بلکہ الزامات کا منہ توڑ جواب دیں۔

ضیاء النبی سیرت کی کتاب ہے۔ اس مناسبت سے یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ اس کتاب میں مستشرقین کے صرف ان اعتراضات کے جوابات دیئے جائیں گے جن کا تعلق سیرت سے ہے۔ لیکن اگر ذرا باریک بینی سے صورت حال کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اسلام کے تمام شعبے باہم یوں مربوط ہیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا ممکن نہیں۔ جو اعتراض قرآن حکیم پر کیا جائے وہ بھی براہ راست سیرت پر اعتراض ہے اور جن اعتراضات کا تعلق احادیث نبویہ سے ہے وہ بھی سیرت پر ہی اعتراض شمار ہونگے۔ شریعت اسلامیہ پر جو اعتراض کیا جائے، سیرت نگار اسے بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔

اس لئے ہم انشاء اللہ العزیز مستشرقین کے ان تمام اعتراضات کا تعاقب کریں گے جن کا تعلق دین اسلام کے کسی بھی شعبے سے ہے۔ ہم ان الزامات بلکہ گالیوں سے تعرض نہیں کریں گے جنہوں نے خود مستشرقین کی اکثریت کو پریشان کر رکھا ہے۔ مستشرقین کے وہ اعتراضات جن میں انہوں نے علم کا نام استعمال کیا ہے ان میں سے ہم ان اعتراضات کا انتخاب کریں گے جو مستشرقین کے سب سے بڑے ہتھیار ہیں۔

ہم اس علمی بحث میں مستشرقین کی پیروی نہیں کریں گے۔ ان کا رویہ تو یہ ہے کہ اسلام اور مسلمان جن عقائد اور نظریات سے بری الذمہ ہیں، ان کو اسلام کے سر تھوپ کر وہ اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔ ہم ایسا نہیں کریں گے بلکہ ہم ان کی تردید میں اس اسلوب کو اختیار کریں گے جو ہمارے اسلاف کا طرہ امتیاز ہے۔

ہم کسی مسئلے پر بحث کرتے وقت مستشرقین کا موقف پیش کریں گے۔ ان کے دلائل بیان کریں گے۔ ان کا موقف اور اس کے دلائل ان کی اپنی کتابوں کے حوالے سے پیش کریں گے۔ اس کے بعد ہم اس مسئلے پر مسلمانوں کا موقف پیش کریں گے۔ اس کے دلائل قرآن وحدیث، اسلامی تاریخ اور خود مستشرقین کی کتابوں سے پیش کریں گے۔

ہم مستشرقین کی طرح خود جج نہیں بنیں گے۔ وہ اسلام کے خلاف خود ہی مقدمہ دائر کرتے ہیں۔ خود ہی وکالت کرتے ہیں اور خود ہی فیصلہ فرما کر یہ یقین کر لیتے ہیں کہ انہوں نے اسلام کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ ہم فریقین کا موقف دلائل کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش کریں گے اور فیصلہ ان پر چھوڑ دیں گے۔

مستشرقین نے اسلام کی جڑیں کاٹتے ہوئے ہمیشہ غیر جانبداری کا لبادہ اوڑھا ہے۔ ہم

اس قسم کا کوئی لبادہ نہیں اوڑھیں گے۔ ہم اس بحث میں شروع ہونے سے پہلے اعلان کرتے ہیں کہ ہم غیر جانبدار نہیں بلکہ ہم اسلام کے سپاہی ہیں۔ دشمنانِ اسلام کی سازشوں کے خلاف اس دین متین کا دفاع کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ہم قرآن حکیم کو خدا کا کلام مانتے ہیں اور اس کے ایک ایک لفظ کو حق یقین کرتے ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ اسلام دین فطرت ہے اور اس کا ہر حکم انسانی فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ ہم احادیث طیبہ کو دین اسلام کا ایک اہم جزو سمجھتے ہیں اور بشرط ثبوت ہر حدیث کو واجب العمل یقین کرتے ہیں۔

ان چیزوں پر ہمارا ایمان اندھی تقلید کی بنا پر نہیں بلکہ ہم نے انفس و آفاق کے کثیر اور ناقابل تردید دلائل کی بنا پر قرآن کو خدا کا کلام اور حضور ﷺ کو اس کا سچا رسول اور عظیم نبی یقین کیا ہے۔ ہمارے ہاں ایمان کے لئے زبانی اقرار کے ساتھ ساتھ قلبی تصدیق بھی ضروری ہے۔ زبانی اقرار تو محض تقلید سے ممکن ہے لیکن قلبی تصدیق اس وقت تک ممکن نہیں جب تک دل، ضمیر اور روح کسی چیز کی صداقت سے مطمئن نہ ہو جائیں۔

تاریخ ہمارے سامنے ہے کہ جب کوئی آیت کریمہ نازل ہوئی یا حضور ﷺ کی زبان پاک سے کوئی بات نکلی اور وہ بات صحابہ کرام کے دل کو مطمئن نہ کر سکی، تو اس ایمان کے باوجود کہ وہ بات جس زبان سے نکلی ہے وہ حق کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتی، صحابہ کرام نے حضور ﷺ سے وضاحت طلب کی۔ جس بات سے دل اور ضمیر مطمئن نہ ہوا اس کے متعلق بار بار سوال کیا اور حضور ﷺ نے ان کے سوالات کے جوابات اس حکیمانہ انداز میں دیئے کہ دل مطمئن ہوگئے۔

قرآن کسی پارلیمنٹ کا بنایا ہوا آئین نہیں کہ اس کے مندرجات کی سطح انسانی سوچ کی سطح سے بلند نہ ہو سکے۔ قرآن حکیم رب العالمین کا کلام ہے اور عالمین کا دائرہ اسی زمین تک محدود نہیں بلکہ "عالمین" کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ دور حاضر کا ترقی یافتہ انسان اس کی وسعتوں کے تصور سے بھی عاجز ہے۔ قرآن حکیم میں کائناتی حقائق بیان ہوئے ہیں۔ اور حضور ﷺ نے اپنی زبان فیض ترجمان سے ان بیانات کی تشریح کی ہے۔ اگر عالم غیب کی کسی حقیقت کو ہماری عقل پورے طور پر نہ سمجھ سکے تو ہم اس کو اپنی عقل کا قصور قرار دیتے ہیں اور قرآن و حدیث کے بیان کو خلاف عقل کہہ کر مسترد نہیں کرتے۔

قرآن حکیم نے بے شمار ایسے سائنسی مسائل بیان کئے ہیں جن تک سائنس آج پہنچی ہے۔ ظاہر ہے ساتویں صدی عیسوی کے امی عربوں کے لئے ان حقائق کی تہ تک پہنچنا ممکن

نہ تھا۔ لیکن انہوں نے اپنی عقل کے قصور کو قرآن حکیم کے انکار کا بہانہ نہیں بنایا اور "عقل قربان کن بہ پیش مصطفٰیؐ" کے اصول پر عمل کرتے ہوئے ان حقائق کو بے چون وچرا تسلیم کر لیا۔ اور آج سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ جو رویہ انہوں نے اپنایا تھا وہی صحیح تھا۔

مختصر یہ کہ عالم غیب کے حقائق کے متعلق ہم عقل نارسا کو نہیں بلکہ بیان رسول ﷺ کو معیار سمجھتے ہیں اور جو شخص عقل کو ہر حقیقت کو پرکھنے کے لئے بطور معیار استعمال کرنے پر مصر ہے، ہم اس سے گزارش کریں گے کہ وہ پہلے یہ ثابت کرے کہ عقل انسانی کائنات کے تمام حقائق کا ادراک کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

ہم مستشرقین سے یہ گزارش بھی کریں گے کہ وہ قرآن وحدیث اور شریعت اسلامیہ کو جس تنقیدی نظر سے دیکھتے ہیں اسی نظر سے ذرا اپنے مذہبی لٹریچر کو بھی دیکھیں اور اسلامی ادب کے کسی بیان کو پرکھنے کے لئے وہ جن اصولوں پر عمل کرتے ہیں ذرا وہی اصول اپنے دینی ادب پر بھی آزما کر دیکھیں۔ یہ بات ہمارے لئے قابل قبول نہیں کہ بائیبل نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے نکلی ہو، نہ اناجیل اربعہ کے مصنفین کے حالات کا کچھ علم ہو، نہ وہ متصل روایت سے ثابت ہو، اس کے باوجود وہ خدا کا کلام قرار پائے اور اس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہ ہو اور اس کے مقابلے میں قرآن حکیم کا ایک ایک لفظ حضور ﷺ کی زبان سے نکلا ہو، آپ سے کثیر تعداد میں صحابہ کرام نے اسے سنا اور لکھا ہو، اور پھر ہر دور میں تواتر کے ساتھ روایت ہوتے ہوئے ہم تک پہنچا ہو اور لاکھوں سینوں میں محفوظ ہو لیکن اس کے باوجود اس کے کلام خداوندی ہونے میں شک ہو۔

ہم چیلنج کرتے ہیں کہ مستشرقین قرآن وحدیث کو پرکھنے کے لئے جو لائحہ عمل اختیار کرتے ہیں، عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید کے متعلق بھی ذرا اسی لائحہ عمل کو اختیار کر کے دیکھیں، انہیں پتہ چل جائے گا کہ حق کیا ہے اور باطل کیا۔

ہم نے مذکورہ بالا وضاحتیں کرنے کی ضرورت اس لئے محسوس کی ہے کہ مختلف وجوہ کی بنا پر جن کا ذکر گزشتہ ابواب میں تفصیل سے ہو چکا ہے، مستشرقین کو دنیائے علم کا امام اور غیر جانبدار محقق سمجھا جاتا ہے۔ اس جبہ پارسائی کو زیب تن کر کے وہ جو کچھ کہتے ہیں اسے بلا جھجک تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں میں ایک معقول تعداد ان لوگوں کی ہے جو اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کا جذبہ تو اپنے سینوں میں رکھتے ہیں لیکن مستشرقین کی

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے سے کتراتے ہیں۔ وہ اختلافی مسائل پر بحث کرنے کے لئے ان ضابطوں کو فوراً تسلیم کر لیتے ہیں جو مستشرقین نے اپنے مخصوص عزائم کی خاطر وضع کئے ہیں۔ ایسے مسلمان اسلام کا دفاع کرنے بیٹھتے ہیں تو کسی ایک اسلامی نکتے کو ثابت کرنے کے لئے دس باتوں میں مستشرقین کے ہم نوا بن جاتے ہیں۔

مستشرقین نے اسلامی مصادر کو بے وقعت ثابت کرنے کے لئے جو واویلا مچایا ہے اس کی پیروی میں ہمارے کچھ محترم مصنفین نے اپنے اسلاف کے علمی سرمائے کو یوں لتاڑا ہے کہ ان کی تحریروں کے مطالعہ سے یہ شک پیدا ہونے لگتا ہے کہ شاید ہمارے اسلاف کا مشغلہ صرف جھوٹی حدیثیں گھڑنا اور انہیں حضور ﷺ کی طرف منسوب کرنا ہی تھا۔ ان لوگوں کی تحریروں سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ شاید ہمارے اسلاف کے ہاں بات کو پرکھنے کا کوئی اصول نہ تھا، وہ ہر رطب و یابس کو یونہی اپنی تحریروں میں جمع کر دیتے تھے۔ انسان سوچنے لگتا ہے کہ شاید یہ ہمارے اسلاف کی بے احتیاطی کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے پاس کتابوں کے ڈھیر موجود ہیں لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں کہ ان میں سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا۔ کون سی بات نقل صحیح سے ثابت ہے اور کون سی بات متاخرین نے اپنے مخصوص مفادات کے تحت خود گھڑی ہے، اور اگر مستشرقین کی مساعی نہ ہوتیں تو ہمارے لئے حق کو باطل سے ممتاز کرنا ممکن نہ تھا۔

ہمیں اس بات کی سمجھ نہیں آتی کہ مستشرقین کی طرف سے اسلام کے خلاف تابڑ توڑ حملوں کے جواب میں اس معذرت خواہانہ رویے سے کیا مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔

ہم حق پر ہیں اور ہمارے دین کی ایک ایک بات حق ہے۔ جب باطل پرست نہ ہمارے جذبات کا خیال کرتے ہیں نہ انسانیت اور شرافت کے تقاضوں کا خیال رکھنا ضروری سمجھتے ہیں تو ہم ان سے مرعوب کیوں ہوں؟ ہاں یہ سچ ہے کہ ہم ان کی طرح جھوٹ، فریب اور مکاری پر عمل نہیں کر سکتے اور نہ ہمیں اس کی ضرورت ہے۔

آفتاب نصف النہار پر چمک رہا ہو تو اسے ایک روشن وجود ثابت کرنے کے لئے نہ کسی حیلے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی کسی قسم کے جھوٹ کی۔ مستشرقین تو سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنا چاہتے ہیں اس لئے ان کے پاس منفی راستہ اختیار کئے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔ لیکن ہمیں اس قسم کی کوئی مجبوری درپیش نہیں۔ کیونکہ ہمارا کام حق کو حق ثابت

کرتا ہے۔ اور حق جھوٹ سے نہیں بلکہ سچ بولنے سے ثابت ہوتا ہے۔ ہم انشاء اللہ العزیز ثبت انداز میں اپنے موقف کو ثابت کرنے کی کوشش کریں گے۔

ہم سب سے پہلے قرآن حکیم پر مستشرقین کے مختلف اعتراضات کا جواب دیں گے۔ اس کے بعد احادیث طیبہ اور سیرت نبویہ پر مستشرقین کی طرف سے لگائے جانے والے الزامات کی حقیقت واضح کریں گے۔

یہاں ہم دین وملت کا درد رکھنے والے مسلمانوں کی خدمت میں یہ عرض ضرور کریں گے کہ مستشرقین کے طلسم کو توڑنے کے لئے ایک ضیاء النبی قطعاً کافی نہیں۔ ان لوگوں نے صدیوں اسلام کا چہرہ مسخ کرنے کے لئے بھرپور کوششیں کی ہیں۔ اسلام کے متعلق ان کی لکھی ہوئی کتابوں سے یورپ اور امریکہ کی لائبریریاں بھری پڑی ہیں۔ اب اسلامی ممالک میں بھی ان کی کتابوں کے ساتھ دلچسپی رکھنے والوں کی تعداد کافی ہے۔ ان کی کتابیں مختلف زبانوں میں ہیں۔ خصوصاً فرانسیسی، جرمن اور انگریزی میں ان کی کتابیں بہت زیادہ ہیں۔ ان کی کتابوں کے مختلف زبانوں میں ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔ مستشرقین اور ان کے شاگرد دنیا بھر کی یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں پر قابض ہیں۔ وسائل ابلاغ ان کے تصرف میں ہیں۔ اور وہ اپنی تمام صلاحیتوں اور وسائل کو اسلام کے چراغ کی روشنی کو مدھم کرنے یا اس چراغ کو بجھانے کے لئے صرف کر رہے ہیں۔

مستشرقین کی ان انتھک کوششوں کے اثرات کو زائل کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ مسلمان بھی ان کی کتابوں کے مقابلے میں اپنی تصنیفات کے ڈھیر لگا دیں۔ ایسی کتابیں جن کا انداز علمی اور تحقیقی ہو اور جو جدید ذہن کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہوں۔

یہ کتابیں کسی ایک زبان میں نہ ہوں بلکہ مختلف زبانوں میں ان کتابوں کے تراجم کرا کے ان کی خوب اشاعت کی جائے۔ خصوصاً جن زبانوں میں مستشرقین کی کتابیں کثرت سے ہیں ان زبانوں میں اسلام کے موقف کی خوب تشہیر کی جائے۔

ہمیں یقین ہے کہ جب حق آئے گا تو باطل مٹ جائے گا کیونکہ مٹ جانا باطل کا مقدر ہے۔

قرآنِ حکیم اور مستشرقین

قرآن حکیم اور مستشرقین

مستشرقین کی تحریک کا مقصد اسلام کی مخالفت کرنا اور دنیا میں اس دین متین کی اشاعت کو روکنا ہے۔ جن مقاصد کے تحت ان لوگوں نے یہ راستہ اختیار کیا ہے ان کو گزشتہ ابواب میں تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔

مستشرقین کے لئے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ اسلام کے شجرۂ طیبہ کی بیخ کنی کے لئے ضروری ہے کہ اسلام کی اصل اول قرآن حکیم پر وار کیا جائے۔ ان کو معلوم تھا کہ جب تک قرآن حکیم موجود رہے گا اور مسلمانوں کو یہ یقین رہے گا کہ اسی کتاب کی پیروی میں ان کی دنیا اور آخرت کی کامیابی کی ضمانت موجود ہے، اس وقت تک نہ اسلام کو نقصان پہنچایا جا سکتا ہے اور نہ ہی ملت اسلامیہ کو قوت و شوکت سے محروم کیا جا سکتا ہے۔

دراصل قرآن حکیم مستشرقین کو اپنے وجود کے لئے ایک بہت بڑا خطرہ نظر آتا تھا۔ قارئین کرام نے گزشتہ ابواب میں ملاحظہ فرمایا کہ کس طرح مستشرقین اور مستغربین قرآن حکیم کو اپنے لئے چیلنج سمجھتے تھے اور کس طرح برطانیہ کے ایک سابق وزیر اعظم نے دارالعوام میں ببانگ دہل اعلان کیا تھا کہ جب تک قرآن مسلمانوں کے پاس موجود ہے، اس وقت تک ہمارے استعماری عزائم کے پایہ تکمیل تک پہنچنے کا کوئی امکان نہیں۔

مستشرقین نے قرآن حکیم کو اپنے وجود اور اپنے مفادات کے لئے خطرہ سمجھتے ہوئے اس کا مقابلہ کرنے کا تہیہ کیا۔ قرآن حکیم کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے انہوں نے مختلف زاویوں سے اس کتاب مبین پر وار کئے۔ انہوں نے بیک زبان ہو کر اعلان کیا کہ قرآن خدا کا کلام نہیں بلکہ یہ حضرت محمد (ﷺ) کی اپنی تصنیف ہے۔ انہوں نے قرآن حکیم کی تدوین اور حفاظت پر اعتراض کر کے اس کے ایک مستند دستاویز ہونے کا بھی انکار کیا۔ انہوں نے قرآن حکیم کی فصاحت و بلاغت اور اس کی شان اعجاز پر بھی طبع آزمائی کی۔ انہوں نے اس کے مضامین، اس کی ترتیب اور اس کے اسلوب کو بھی اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔ قرآن حکیم کی تعلیمات بھی مستشرقین کے طعن و تشنیع کے تیروں سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ ان ابواب میں

ہم انشاء اللہ العزیز مستشرقین کی طرف سے قرآن حکیم پر کئے جانے والے مختلف اعتراضات کا جواب دیں گے۔ وَبِاللّٰہِ التَّوْفِیْقُ وَھُوَ الْمُسْتَعَانُ

قرآن حکیم کے کلام خداوندی ہونے پر اعتراض

مسلمانوں کا ایمان ہے کہ قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے امین فرشتے حضرت جبریل امین کے ذریعے حضرت محمد ﷺ کے قلب اطہر پر نازل فرمایا۔ اس مقدس کلام کے الفاظ و معانی سب الہامی ہیں۔ اس مقدس کلام میں انفس و آفاق میں پھیلی ہوئی ان گنت آیات بینات کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی توحید کو بھی ثابت کیا گیا ہے۔ اس کے ذریعے انسانوں کو ان کے مبدأ و معاد کی حقیقت سے بھی آگاہی بخشی گئی ہے۔ انہیں ان کی تخلیق کا مقصد بھی بتایا گیا ہے۔ عالم شہادت اور عالم غیب کی بے شمار حقیقتوں کو بھی بے نقاب کیا گیا ہے۔ ماضی کے واقعات جن میں بنی نوع انسان کے لئے عبرت کا بے پناہ سامان موجود ہے انہیں بھی اس کتاب مبین میں انتہائی حسین پیرائے میں بیان کیا گیا ہے اور حیات اخروی کی وہ حقیقتیں جو انسانی ہدایت کے لئے ضروری ہیں، ان کو بھی دل نشین انداز میں بیان کر کے انسان کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ دنیوی زندگی کی لذتوں ہی میں نہ کھو جائے بلکہ اخروی زندگی کی لازوال نعمتوں سے مالا مال ہونے کے لئے بھی اپنے سفینہ حیات کا رخ متعین کرے۔

مسلمانوں کا ایمان ہے کہ قرآن حکیم اس ہستی کا کلام ہے جو ساری کائنات کی خالق و مالک ہے۔ کائنات کی وسعتوں میں جو کچھ ہے وہ اس کے علم میں ہے۔ وہ زمانے اور مکان کی پابندی سے ماوراء ہے۔ وہ مستقبل کو بھی اسی طرح دیکھ رہا ہے جس طرح حال کو دیکھ رہا ہے۔ ماضی بھی اس کی نگاہوں میں اسی طرح واضح ہے جس طرح حال۔ تخلیق کائنات سے لے کر قیامت تک جو کچھ ہوا ہے یا ہوگا وہ سب اس کی نگاہ قدرت میں ہے۔ اس لئے اس کے کلام میں غلطی کا کوئی شائبہ نہیں ہو سکتا۔

وہ ہستی جو رحیم اور کریم ہے، اس نے یہ کلام ہدایت انسانی کے لئے نازل فرمایا ہے۔ قرآن نازل کرنے کا مقصد بنی نوع انسان کی فلاح ہے۔ رب قدوس انسان کا اور اس کی فطرت کا خالق ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ کون سی چیز انسان کے لئے مفید ہے اور کون سی چیز اس کے لئے مضر ہے۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کے نفع اور نقصان کو خود ان سے زیادہ جانتا ہے۔

اسی حقیقت کا بیان رب حکیم و علیم نے ان الفاظ میں فرمایا ہے:

وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝ (1)

"اور ہو سکتا ہے کہ تم ناپسند کرو کسی چیز کو حالانکہ وہ تمہارے لئے بہتر ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم پسند کرو کسی چیز کو حالانکہ وہ تمہارے حق میں بری ہو۔ اور (حقیقت حال) اللہ ہی جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔"

چونکہ اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کا انسان کے لئے مفید یا مضر ہونا پوشیدہ نہیں اس لئے جو کام انسان کے لئے مفید تھے ان کاموں کے کرنے کا اللہ تعالیٰ نے اس مقدس کلام میں حکم دیا ہے اور جو کام انسانوں کے لئے مضر تھے ان کاموں سے منع فرمادیا ہے۔

قرآن حکیم اور اس سے پہلے دوسرے آسمانی صحائف نازل کرنے کا سبب یہ تھا کہ عقل انسانی میں گو قدرت نے بے پناہ صلاحیتیں ودیعت کر دی ہیں لیکن ان تمام صلاحیتوں اور حیران کن قوتوں کے باوجود اس کا دائرہ کار محدود ہے اور وہ عالم انفس و آفاق میں پھیلے ہوئے ان گنت حقائق کے ادراک سے قاصر ہے۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر اپنا خلیفہ ہونے کا اعزاز بخشا ہے۔ اس گرانبار فریضہ سے عہدہ برآ ہونے کے لئے انسان کو علوم و معارف کے جس سرمائے کی ضرورت ہے وہ صرف عقل کے ذریعے حاصل ہونا ممکن نہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ہر زمانے میں اپنے خلیفہ ارضی کی راہنمائی کے لئے صحائف نازل فرمائے۔ اور آخر کار اپنے حبیب لبیب ﷺ پر وہ لازوال کلام نازل فرمایا، جو ان تمام حقائق و معارف کا مجموعہ بھی ہے جو سابقہ صحف میں بیان ہو چکے تھے اور اس میں علوم و معارف کا ایک ایسا سمندر بھی موجزن ہے جو صرف اسی کلام آخریں کا حصہ ہے۔

اس کلام مقدس میں جو حقائق بیان ہوئے ہیں یا اس کے ذریعے انسان کو جن احکام کا مکلف بنایا گیا ہے، وہ عقل سلیم کو جلا بخشتے ہیں اور فطرت انسانی کو ان میں اپنی بالیدگی کا سامان میسر آتا ہے۔ مسلمان انسانی عقل کی سلامت روی کو پرکھنے کے لئے اس کلام الٰہی کو بطور معیار استعمال کرتے ہیں اور اہل مغرب کی طرح کلام خداوندی کو عقل کی محدود کسوٹی پر

1۔ سورۃ البقرہ: 216

پرکھنے کو وہ نزول وحی کی حکمتوں کے خلاف سمجھتے ہیں۔
یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے ہمیشہ قرآن حکیم کے ایک ایک لفظ کو حق سمجھا ہے۔ حالانکہ قرآن حکیم میں بے شمار ایسے مسائل بیان ہوئے ہیں جو عقل انسانی کی حد ادراک سے ماوراء ہیں۔ قرآن میں بے شمار ایسی باتیں بیان ہوئی ہیں جن کا تعلق سائنس کی دنیا سے ہے۔ ایسی باتوں کو سائنسی ترقی کے موجودہ دور میں سمجھنا تو آسان ہے لیکن ساتویں صدی عیسوی کے عربوں کے لئے ان کی تہ تک پہنچنا ممکن نہ تھا۔ اس کے باوجود مسلمانوں نے قرآن حکیم کے ہر بیان کو حق یقین کیا اور جو بات عقل میں نہ آسکی اسے بھی بلاچون و چرا تسلیم کر لیا اور اسے نہ سمجھ سکنے کو اپنی عقل کا قصور قرار دیا۔
مسلمانوں نے اس کتاب مقدس کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا آئین قرار دیا۔ زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق اسی سے راہنمائی حاصل کی اور اسکے نتیجے میں وہ ساکنان عرب، جو آئین و دستور کی پابندیوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے، وہ قانون کی حکمرانی کے علمبردار بن گئے۔ مسلمانوں کو یقین تھا کہ ان کی کامیابی، ان کی عزت و شوکت اور ان کا ملی وقار قرآن حکیم سے وابستہ ہے۔ ان کی تاریخ بھی اس حقیقت کی عکاسی کرتی ہے کہ انہوں نے جب تک قرآنی تعلیمات کو اپنی اجتماعی زندگی کا منشور بنائے رکھا، دنیا ان کی عظمتوں اور رفعتوں کو سلام کرتی رہی۔ اور جب انہوں نے اپنی عقل کے بھروسے پر قرآنی تعلیمات کو غیر ضروری قرار دے کر نظرانداز کر دیا، وہ دنیا میں ذلیل و خوار ہو گئے۔

وہ معزز تھے زمانے میں مسلماں ہو کر
اور ہم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر

مستشرقین کی اکثریت یہودیت اور نصرانیت سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ وجود خداوندی کے بھی قائل ہیں۔ فلاح انسانیت کے لئے آسمانی راہنمائی کی اہمیت پر بھی یقین رکھتے ہیں اور اس بات پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ خدا کا کلام ہر شک و شبہ سے بالاتر ہوتا ہے۔
اگر وہ قرآن حکیم کو خدا کا کلام مان لیں تو دین اسلام کی مخالفت کا ان کا سارا منصوبہ خاک میں مل جاتا ہے۔ قرآن حکیم کو کلام خداوندی مان لینے کے بعد ان کے لئے حضور ﷺ کی رسالت کے انکار کی بھی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس صورت میں انہیں قرآن حکیم میں بیان کردہ حقائق پر بھی ایمان لانا پڑتا ہے بلکہ قرآن حکیم نے ان کی جن ملی کوتاہیوں کا

پردہ چاک کیا ہے، انہیں ان کا الزام بھی اپنے سر لینا پڑتا ہے۔ قرآن حکیم کو کلام خداوندی مان لینے کے بعد انہیں یہودیت اور نصرانیت کا طوق اپنے گلے سے اتار کر غلامی مصطفیٰ کا پٹہ اپنے گلے میں لٹکانا پڑتا ہے۔ انہیں خدا کی لاڈلی مخلوق ہونے کی خوش فہمی کو دور کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ قرآن حکیم کو کلام خداوندی مان لینے کے بعد اہل یورپ کی نسلی برتری کے نظریے کا تاج محل دھڑام سے زمین بوس ہو جاتا ہے۔ اور اس نظریے کے سہارے مغرب نے اپنی سیاسی چودھراہٹ کا جو ڈرامہ رچار کھا ہے اس کا ڈراپ سین ہو جاتا ہے۔

اس صورت حال میں مستشرقین کے لئے دو ہی راستے رہ جاتے ہیں: یا تو کلمہ توحید پڑھیں، قرآن کو اپنی زندگی کا منشور بنائیں اور ملت اسلامیہ کا فرد بن کر خدا کی زمین پر خدا کی حکمرانی قائم کرنے کی جدوجہد میں شامل ہو جائیں۔ اور یا پھر قرآن حکیم کے کلام خداوندی ہونے کا صاف انکار کر دیں خواہ اس انکار کے لئے ان کے پاس کوئی دلیل نہ ہو اور انہیں اپنے ضمیر کو کچل کر یہ فیصلہ کرنا پڑے۔ بد قسمتی سے مستشرقین نے یہی دوسرا راستہ اپنایا ہے۔ انہوں نے قرآن حکیم کے کلام خداوندی ہونے کا صاف انکار کر دیا ہے۔ بلکہ یہی وہ واحد نکتہ ہے جس پر ساری دنیائے استشراق متحد ہے۔

جس طرح نصف النہار پر پوری آب و تاب سے چمکتے ہوئے آفتاب کا انکار کرنا کوئی آسان کام نہیں اسی طرح قرآن حکیم، جس کی ضوء سے صدیوں ایک عالم جگمگا تا رہا، کا انکار بھی کوئی آسان کام نہ تھا۔ قرآن حکیم کے انکار کی دو ہی صورتیں تھیں۔ یا تو حامل قرآن حضرت محمد ﷺ کی صداقت کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا اور یا پھر قرآن حکیم کی تعلیمات اور اس کے بیانات کو دلائل کی روشنی میں غلط ثابت کیا جاتا۔

قرون وسطی کے مستشرقین نے پہلا راستہ اختیار کیا اور حضور ﷺ کی صداقت و امانت کے ان اوصاف کا جو آپ کے دشمنوں کے ہاں بھی مسلم تھے، ان کا انکار کیا اور آپ کو ہر خامی سے متصف اور ہر خوبی سے عاری ثابت کرنے کے لئے زبان اور قلم کی ساری صلاحیتیں وقف کر دیں۔ لیکن دن کو رات کہنے سے وہ رات نہیں بن جاتا بلکہ دن ہی رہتا ہے۔

مستشرقین نے حضور ﷺ کے کردار کو داغدار کرنے کے ذریعے قرآن حکیم کے کلام خداوندی ہونے کا انکار کیا لیکن دنیا دیکھ رہی تھی کہ کروڑوں انسان حضور ﷺ کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں لٹکانے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ انہوں نے قرآن حکیم کی

تعلیمات کی روشنی میں علمی، مادی اور روحانی میدانوں میں اتنی ترقی کی ہے کہ تاریخ انسانی میں اس کی مثال تلاش کرنا فضول ہے۔ وہ جس انسان کامل کے دامن کو کذب، افتراء، جھوٹ، فریب اور دغابازی کے دھبوں سے آلودہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے، اس کے بارے میں تاریخ یہ بتارہی تھی کہ ان اخلاقی برائیوں کا الزام تو اس پر ان دشمنوں نے بھی نہیں لگایا تھا جو اس کے خون کے پیاسے تھے اور اس کے دین کی شمع کے ساتھ ساتھ اس کی زندگی کے چراغ کو بھی گل کرنا چاہتے تھے۔

مستشرقین کی طرف سے حضور ﷺ پر جو الزامات لگائے گئے ان کے متعلق تاریخ کے ایک طالب علم کے ذہن میں یہ سوالات اٹھ سکتے تھے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک جھوٹا اور فریبی شخص اٹھے اور چند سالوں میں پورے جزیرہ عرب کی کایا پلٹ دے۔ دشمنوں کو دوست بنادے۔ خون کے پیاسوں کے درمیان اخوت کا مقدس رشتہ پیدا کردے۔ بچیوں کو زندہ درگور کرنے والوں کو احترام نسوانیت کا چیمپئن بنادے۔ بت پرستوں کو بت شکن بنا دے اور توہمات کے اندھیروں میں بھٹکتی ہوئی انسانیت کو علم کی وہ روشنی عطا کرے جس سے دلوں اور ذہنوں کی دنیا جگمگا اٹھے۔

محمد عربی ﷺ جن کو جھوٹا کہنے کی جرأت نہ نجاشی کے دربار میں قریش کے سفیروں نے کی تھی اور نہ قیصر روم کے دربار میں سردار مکہ ابوسفیان انہیں جھوٹا کہہ سکا تھا، انہیں جھوٹا کہنا مستشرقین کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا سکتا تھا، اس لئے بعد کے مستشرقین نے قرآن حکیم کے پیغام میں ایسی چیزیں تلاش کرنا شروع کردیں جن کے بل بوتے پر اس کے کلام خداوندی ہونے کا انکار کرکے اسے محمد ﷺ کی تصنیف کہا جاسکے۔

مستشرقین کو عالم اور بے لاگ محقق ہونے کا دعویٰ تھا۔ انہیں چاہئے تھا کہ قرآن حکیم کو انسانی کلام ثابت کرنے کے لئے ایسے مضبوط دلائل پیش کرتے جو ناقابل تردید ہوتے لیکن قرآن کی اس حیثیت کا انکار کرتے وقت انہوں نے اپنے علمی مقام کو فراموش کردیا اور قرآن حکیم کے کلام الٰہی ہونے کا انکار کرنے کے لئے انہوں نے بھی وہی اسلوب اپنایا جو نزول قرآن کے وقت مکہ کے اجڈ عربوں نے اپنایا تھا۔ کفار مکہ کا اسلوب انکار یہ تھا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ (1)

1۔ سورۃ الفرقان: 4

"اور کہنے لگے کفار کہ نہیں یہ (قرآن) مگر محض بہتان جو گھڑ لیا ہے اس نے اور مدد کی ہے اس کی اس معاملہ میں ایک دوسری قوم نے۔"

کبھی انہوں نے یہ واویلا مچایا:

وَقَالُوٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا (1)

اور کفار نے کہا: یہ تو افسانے ہیں پہلے لوگوں کے۔ اس شخص نے لکھوا لیا ہے انہیں اور پھر یہ پڑھ کر سنائے جاتے ہیں اسے ہر صبح وشام (تاکہ از بر ہو جائیں)"

کبھی وہ کہتے:

اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ (2)

"کہ انہیں تو یہ قرآن ایک انسان سکھاتا ہے۔"

اب ذرا مستشرقین کی چند تحریروں کو ملاحظہ فرمایئے اور اندازہ کیجئے کہ کس طرح وہ کفار مکہ کی باتوں کو اپنے عیارانہ اسلوب میں بیان کرتے ہیں۔

جارج سیل (George Sale) ایک مشہور مستشرق ہے۔ اس کا ترجمہ قرآن مستشرقین کے لئے ایک اہم علمی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ترجمہ قرآن کے مقدمے میں قرآن حکیم کو حضور ﷺ کی تصنیف ثابت کرنے کے لئے اپنے تخیل اور قلمکاری کی ساری صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے رقمطراز ہے:

"Muhammad seems not to have been ignorant of the enthusiastic operation of rhetoric on the minds of men ; for which reason he has not only employed his utmost skill in these his pretended revelations to preserve that dignity and sublimity of style , which might seem not unworthy of the majesty of that being, whom he gave out to be the author of them ; and to imitate the prophetic manner of the old testament ; but he has not neglected even the other arts of orato-

---

1۔ سورۃ الفرقان: 5

2۔ سورۃ النحل: 103

ry ,wherein he succeeded so well, and so strangely captivated the minds of the audience ,that several of his opponents thought it the effect of whichcraft and enchantment ,as he sometimes complains".(1)

"کلام میں لفاظی حاضرین کے ذہنوں پر جو زبردست اثر ڈالتی ہے، محمد (ﷺ) اس سے بے خبر نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے ان نام نہاد الہامات میں اسلوب بیان کے اس وقار اور رفعت کو قائم رکھنے کے لئے اپنی پوری صلاحیتیں استعمال کی ہیں، جو اس ذات کی شان کے شایان ہو جس کی طرف وہ ان کو منسوب کرتے ہیں۔ اور اس اسلوب کو اختیار کیا ہے جو عہد نامہ قدیم کے پیغمبرانہ اسلوب سے ہم آہنگ ہو سکے۔ بلکہ انہوں نے فن بلاغت کے دیگر اصولوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ اور اس میں وہ اس حد تک کامیاب ہوئے اور انہوں نے اپنے مخاطبین کے اذہان کو یوں گرویدہ کیا کہ ان کے کئی مخالفین نے اسے جادو اور سحر کا اثر قرار دیا۔"

یہی جارج سیل اپنی اسی کتاب میں ایک اور جگہ لکھتا ہے:

Several of which stories or some circumstances of them are taken from the old and new testament ,but many more from the apocryphal books and traditions of the jews and christians of those ages, set up in the koran as truths in opposition to the scriptures, which the jews and christians are charged with having altered, and I am apt to believe that few or none of the relations or circumstances in the koran were invented by Muhammad, as is generally supposed, it being easy to trace the greatest part of them much higher".(2)

"(قرآن حکیم میں بیان ہونے والی) کئی کہانیاں یا ان کے کچھ حالات عہد نامہ قدیم یا عہد نامہ جدید سے لئے گئے ہیں۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ

1۔ جارج سیل، "The Koran" (نیویارک۔ 1890)، صفحہ 48
2۔ "The Karon"، صفحہ 49

کہانیاں ان غیر مستند انجیلوں اور روایات سے لی گئی ہیں جو اس دور کے یہودیوں اور عیسائیوں میں مروج تھیں۔ ان کہانیوں کو بائبل کے بیانات کے برخلاف حقائق کی شکل میں قرآن میں پیش کیا گیا ہے۔ اور یہودیوں اور عیسائیوں پر الزام لگایا گیا ہے کہ انہوں نے صحف سماوی میں تحریف کر دی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ قرآن حکیم میں ایسے بیانات یا حالات یا تو کلیۃً مفقود ہیں یا بالکل کم ہیں جو محمد (ﷺ) نے ابتداءً پیش کئے ہوں، جیسا کہ عام خیال کیا جاتا ہے، کیونکہ ان بیانات کے اکثر حصے کو قرآن سے پہلے کے مصادر میں آسانی سے تلاش کیا جا سکتا ہے۔

جارج سیل قرآن حکیم کے متعلق اپنا آخری فیصلہ صادر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"That Muhammad was really the author and chief contriever of the Koran is beyond dispute; though it be highly probable that he had no small assistance in his design from others, as his countrymen failed not to object to him; however they differed so much in their conjectures as to the particular person who gave him such assistance; that they were not able, it seems, to prove the charge; Muhammad, it is to be presumed, having taken his measures too well to be discovered.

Dr. prideaux has given the most probable account of this matter, though chiefly from christian writers, who generally mix such ridiculous fables with what they deliver, that they deserve not much credit."(1)

"اس حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں کہ قرآن کے مصنف یا اس کتاب کو اختراع کرنے والے محمد (ﷺ) ہیں۔ اگرچہ اس بات کا غالب امکان موجود ہے کہ اس منصوبے میں ان کو دوسرے لوگوں سے جو مدد ملی وہ کم نہ تھی۔ جیسا کہ ان کے اہل وطن نے ان پر یہ اعتراض کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ البتہ ان کو اس قسم کی مدد مہیا کرنے والے مخصوص

1۔ جارج سیل، "The Koran" صفحہ 50

شخص کے تعین میں ان کے مفروضے باہم اتنے متضاد تھے کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ محمد (ﷺ) کے خلاف اس الزام کو ثابت نہ کر سکے۔ یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ محمد (ﷺ) نے اس معاملے کو خفیہ رکھنے کے لئے اتنے عمدہ اقدامات کئے کہ ان کی وجہ سے اس راز کا انکشاف ممکن نہ تھا۔ ڈاکٹر پریڈو نے اس مسئلے کی ایسی تفصیلات بیان کی ہیں جو زیادہ قرین قیاس ہیں لیکن یہ تفصیلات اکثر عیسائی مصنفین کی تحریروں سے لی گئی ہیں جو اپنے بیانات میں بعض بڑے مضحکہ خیز قصوں کو خلط ملط کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے وہ کسی اعتبار کے قابل نہیں رہتے۔

آرتھر جیفری (Arthur Jeffery) اپنی کتاب "(Islam, Muhammad and his religion) میں اپنے قارئین کو قرآن حکیم کا تعارف ان الفاظ میں کراتا ہے:

"The Quran is the scripture of Islam .It is called the Noble Quran ,the Glorious Quran ,the Mighty quran, but never the Holy Quran save by modern, Western-educated Muslims who are imitating the title Holy Bible .It contains the substance of Muhammad's deliverances during the twenty odd years of his public ministry .It is clear that he had been preparing a book for his community which would be for them what the old testament was for the Jews and the new testament for the Christians ,but he died before his book was ready ,and what we have in the Quran is what his followers were able to gather together after his death and issue as the corpus of his revelations" (1)

"قرآن اسلامی صحیفہ ہے۔ اسے قرآن عظیم اور قرآن مجید وغیرہ ناموں سے تو پکارا جاتا ہے لیکن اسے "Holy Quran" یعنی قرآن پاک نہیں کہا جاتا۔ کچھ جدید دور کے مغرب کے تعلیم یافتہ مسلمان "Holy

1۔ آرتھر جیفری، "اسلام، محمد اینڈ ہز ریلیجن"، (انڈیانا۔1979)، صفحہ 47

"Bible" کے لقب کی نقل کر کے قرآن کو بھی "Holy Quran" یعنی قرآن پاک کہتے ہیں۔ یہ کتاب محمد (ﷺ) کے بیس سالہ دور نبوت کے بیانات کے مجموعے پر مشتمل ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ محمد (ﷺ) ایک ایسی کتاب کی تیاری میں مصروف تھے جو مسلمانوں کے لئے وہی حیثیت رکھے جو یہودیوں کے لئے عہد نامہ قدیم اور عیسائیوں کے لئے عہد نامہ جدید کی ہے لیکن اس کتاب کی تکمیل سے پہلے وہ فوت ہو گئے۔ اور آج قرآن میں جو کچھ موجود ہے یہ وہ ہے جو ان کے بعد ان کے پیروکاروں نے جمع کیا اور اسے محمد (ﷺ) کے الہامات کے مجموعے کے طور پر شائع کر دیا۔"

ڈبلیو۔ منٹگمری واٹ (W. Montgomery Watt) کا انداز بالکل ہی نرالا ہے۔ وہ قرآن حکیم کو انسانی ذہن کی اختراع ثابت کرنے کے لئے بہت دور کی کوڑی لاتے ہیں۔ کبھی وہ قرآن حکیم کو نزول قرآن کے وقت جزیرہ عرب کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کا ردعمل قرار دیتے ہیں۔ کبھی وہ اس کتاب مبین کو حضور ﷺ کے تخلیقی تخیل کا کرشمہ قرار دیتے ہیں اور کبھی قرآن حکیم کے ڈانڈے عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید کے ساتھ ملانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ان تمام قلابازیوں میں یہ خیال رکھتے ہیں کہ ان کی کسی حرکت سے یہ محسوس نہ ہو کہ وہ اسلام کی مخالفت کر رہے ہیں۔

ان کے انداز فکر کی چند جھلکیاں ملاحظہ فرمائیے۔ وہ قرآن کو زمانے کے ماحول کا ردعمل ثابت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"It is axiomatic that the new religious movement of Islam must somehow or other have risen out of the conditions in Mecca in Muhammad's time. A new religion cannot come into being without a sufficient motive. In the experience of Muhammad and his early followers there must have been some need which was satisfied by the practices and doctrines of the embryonic religion. (1)

1۔ "محمد، پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین"، صفحہ 14

"یہ بات مسلم ہے کہ نئی مذہبی تحریک کسی نہ کسی طریقے سے محمد (ﷺ) کے زمانے کے مکہ کے حالات سے ابھری ہوگی۔ نیا دین کسی معقول محرک کے بغیر وجود میں نہیں آتا۔ محمد (ﷺ) اور ان کے ابتدائی پیروکاروں کے تجربے میں ضرور کوئی ایسی ضرورت ظاہر ہوئی ہو گی جس کو اس نا پختہ مذہب کے عقائد اور اعمال کے ذریعے پورا کیا گیا۔"

یہی صاحب ایک اور جگہ قرآن حکیم کو حضور ﷺ کی ذہنی کیفیت کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"He had a talent for administration that would have enabled him to handle the biggest operations then carried out in Mecca, but the great merchants excluded him from inner circle His own dissatisfaction made. him more aware of the unsatisfactory aspects of life in Mecca. In these, hidden years, he must have brooded over such matters. Eventually what had been maturing in the inner depths was borught to light." (1)

"محمد (ﷺ) میں اتنی صلاحیت تھی کہ وہ مکہ میں اس وقت کے کسی بڑے سے بڑے کاروباری عمل کا انتظام سنبھال سکتے تھے لیکن مکہ کے بڑے تاجروں نے ان کو کاروبار کے مرکزی حلقے سے خارج کر دیا تھا۔ ذاتی عدم اطمینان نے ان کو مکی زندگی میں بے چینی کے پہلوؤں سے آگاہ کر دیا۔ اپنی زندگی کے ان غیر معروف سالوں میں انہوں نے ان معاملات پر خوب غور کیا ہوگا۔ آخر کار جو جذبات ان کے باطن کی دنیا میں پرورش پا رہے تھے ان کو ظاہر کر دیا گیا۔"

منٹگمری واٹ ایک اور مقام پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ حضور ﷺ پورے خلوص اور دیانتداری سے یہ سمجھتے تھے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اس بارے میں ان کے خلوص پر شک نہیں کیا جا سکتا لیکن خلوص اور دیانتداری کے باوجود ان کا یہ خیال غلط تھا کہ قرآن کلام خداوندی ہے۔ مستشرق مذکور کے اپنے الفاظ ملاحظہ فرمائیے:

1۔ محمد: پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین، صفحہ 13

"For Muslim tradition the Quran is thus the word or speech of God ,and Muhammad himself must also have regarded it in this way .Moreover he must have been convinced that he was able to distinguish between his own thoughts and the message that came to him from outside himself -------- .To say that Muhammad was sincere does not imply that he was correct in his beliefs .A man may be sincere but mistaken ----- .What seems to man to come from outside himself ,may actually come from his unconscious". (1)

"مسلمانوں کی روایت کے مطابق قرآن اللہ کا کلام ہے۔ اور محمد (ﷺ) نے خود بھی یہی سمجھا ہوگا۔ مزید بر آں یہ بھی ممکن ہے کہ محمد (ﷺ) یہ اعتقاد رکھتے ہوں کہ وہ اپنے ذاتی خیالات اور اس وحی میں تمیز کر سکتے ہیں جو خارج سے ان پر نازل ہوتی ہے...... محمد (ﷺ) کو مخلص کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اپنے عقائد میں ٹھیک راستے پر تھے۔ ممکن ہے ایک آدمی مخلص ہو لیکن اس کے باوجود غلطی پر ہو ...... انسان جن خیالات کو خارج سے آتا ہوا محسوس کرتا ہے ممکن ہے وہ خیالات در اصل اس کے اپنے لاشعور سے ابھرے ہوں۔

اسلامی تعلیمات پر یہودی اور نصرانی تعلیمات کی چھاپ ظاہر کرنے کی کوشش میں منٹگمری واٹ رقمطراز ہے:

"The earliest Passages of the Quran show that it stands with the tradition of Judaeo-Christian monotheism with its conceptions of God the creator, of resurrection and judgement, and of revelation. In late passages the dependence on the Biblical tradition becomes even more marked, for they contain much material from the old and new testament". (2)

1۔ محمد: پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین، صفحہ 17

2۔ ایضاً، صفحہ 39

"قرآن کی ابتدائی آیات ظاہر کرتی ہیں کہ خدائے خالق، بعث بعد الموت اور یوم حساب کے نظریات کے لحاظ سے اسلام، یہودی اور عیسائی نظام توحید سے مطابقت رکھتا ہے۔ بعد کی آیات میں قرآن کا بائیبل کی روایات پر انحصار اور بھی واضح نظر آتا ہے کیونکہ ان آیات میں عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید کا مواد کثرت سے موجود ہے۔"

یہ بات بیان کرنے کے بعد مستشرق مذکور سوچتا ہے کہ مکہ کا ایک امی جس نے کبھی کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہ کیا تھا، اس نے کس طریقے سے بائیبل کی تعلیمات حاصل کر کے ان کی بنیاد پر قرآن حکیم جیسا علوم و معارف کا بحر ذخار تیار کر لیا۔ وہ خود ہی اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے:

"Here there are various possibilities. He might have met jews and christians and talked about religious matters with them, There were christian Arabs on the borders of Syria. Christian Arabs or Abyssinians from Yeman may have come to Mecca to trade or as slaves. Some of the nomadic tribes or clans were Christians, but may still have come to the annual trade fair at Mecca. There were also important Jewish groups settled at Medina and other places. Thus opportunities for conversation certainly existed. Indeed Muhammad is reported to have had some talks with Waraqah Khadijah's christian cousin and during his life time his enemies tried to point to some of his contacts as the source of his revelation". (1)

"اس کی کئی صورتیں ممکن ہیں۔ ممکن ہے محمد (ﷺ) یہودیوں اور عیسائیوں سے ملے ہوں اور ان کے ساتھ مذہبی معاملات پر گفتگو کی ہو۔ شام کی سرحد کے ساتھ کچھ عیسائی عرب آباد تھے۔ ممکن ہے عیسائی عرب یا یمن کے حبشی تجارت کی غرض سے یا غلام بن کر مکہ آئے ہوں۔ کچھ بدو قبائل یا ان کی کچھ شاخیں بھی عیسائی تھیں، لیکن

1۔ محمد: پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین، صفحہ 40

عیسائی ہونے کے باوجود ممکن ہے وہ مکہ کے سالانہ تجارتی میلوں میں شرکت کرتے ہوں۔ مدینہ اور کچھ دوسری جگہوں پر یہودیوں کے کچھ اہم قبائل آباد تھے۔ لہٰذا ایسے عناصر سے گفتگو کے امکانات یقیناً موجود تھے۔ محمد (ﷺ) کی حضرت خدیجہ کے عیسائی چچازاد ورقہ سے ملاقات کا بیان تاریخ کے صفحات پر موجود ہے۔ اور محمد (ﷺ) کی زندگی میں آپ کے دشمنوں نے کچھ ایسے عناصر کے ساتھ آپ کے رابطوں کی طرف اشارہ کیا تھا جن کو ان کے الہامات کا منبع قرار دیا جا سکتا ہے۔"

منٹگمری واٹ جب حضور ﷺ کے کسی ایسے انسان سے رابطے کو ثابت نہیں کر سکتا جس نے آپ کو بائیبل کی تعلیمات سے آگاہ کیا ہو تو بڑی عیاری سے یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا ہے کہ نزول قرآن کے وقت عیسائی اور یہودی نظریات مکہ اور جزیرہ عرب میں جڑ پکڑ چکے تھے۔ عیسائیت اور یہودیت کے متعلق محمد (ﷺ) کی معلومات اسی ماحول سے ماخوذ تھیں۔

اپنے اس مفروضے کو منٹگمری واٹ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"The conclusion of this matter is that Muhammad received his knowledge of Biblical conceptions in general (as distinct from the details of some of the stories) from the intellectual environment of Mecca and not from reading or from the communication of specific individuals. Islam thus in a sense belongs to the Judaeo-Christian tradition because it sprang up in a milieu that was permeated by biblical ideas. (1)

"اس بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ محمد (ﷺ) نے بائیبل کے نظریات کا علم (چند کہانیوں کی تفصیلات کو چھوڑ کر) مکہ کے ذہنی ماحول سے اخذ کیا تھا۔ یہ علم آپ نے کوئی کتاب پڑھ کر یا کسی مخصوص شخص کے ساتھ رابطے کے ذریعے حاصل نہیں کیا تھا۔ اس لئے ایک لحاظ سے اسلام کا تعلق یہودی اور عیسائی روایت کے ساتھ ہے کیونکہ یہ دین اس ماحول سے ابھرا جس میں بائیبل کے نظریات سمائے ہوئے تھے۔"

1۔ محمد: پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین، صفحہ 41

گزشتہ صفحات میں ہم نے ذرا تفصیل کے ساتھ مستشرقین کے اس انداز کو بیان کر دیا ہے جس انداز میں وہ قرآن حکیم کے کلام خداوندی ہونے کا انکار کرتے ہیں۔

مستشرقین کی ان تحریروں سے جو تاثر انسان کے ذہن میں ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ لوگ اس بات پر تو متفق ہیں کہ قرآن حکیم خدا کا کلام نہیں ہے، لیکن پھر یہ ہے کیا اور اس کا مصدر کیا ہے؟ اس سوال کے جوابات کے لئے انہوں نے ظن و تخمین کے جو گھوڑے دوڑائے ہیں ان کو دیکھ کر وہ ذہنیت سامنے آجاتی ہے جس کی نشاندہی قرآن حکیم نے کئی مقامات پر اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (1) اور اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ (2) کے کلمات سے کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ مستشرقین اپنی تحریروں میں جو دعویٰ کر رہے ہیں، اپنے اس دعویٰ کی تردید بھی وہ خود ہی کر رہے ہیں۔ جارج سیل قرآن حکیم کو حضور ﷺ کے ذہن کی اختراع قرار دیتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ محمد (ﷺ) نے بڑی مہارت سے اس کتاب کو ادب کے اس بلند مقام پر رکھا ہے کہ قرآن کے کلام خداوندی ہونے کے دعویٰ کا انکار کرنے والا یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کلام، خدا کے شایان شان نہیں اور یا یہ کہ اس میں عہد نامہ قدیم کا پیغمبرانہ اسلوب مفقود ہے۔ اور ساتھ ہی جارج سیل یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ اس کتاب کا ادبی مقام اتنا بلند ہے اور اس کی قوت تاثیر اتنی زبردست ہے کہ زمانہ نزول قرآن کے عرب، جو اپنی فصاحت و بلاغت پر ناز کیا کرتے تھے، وہ اس کتاب کے اسلوب بیان کو سحر یا جادو کا اثر کہنے پر مجبور ہو گئے۔

جارج سیل قرآن حکیم کے کلام خداوندی ہونے کے دعویٰ پر یہ اعتراض کرنا چاہتا ہے کہ قرآن جن لوگوں کے سامنے نازل ہوا تھا، انہوں نے بھی اس کے بشری الاصل ہونے کا شور مچایا تھا اور انہوں نے ایسے لوگوں کا ذکر کیا تھا جو محمد (ﷺ) کو معلومات مہیا کرتے تھے، لیکن ساتھ ہی جارج سیل یہ بھی کہتا ہے کہ محمد (ﷺ) کے مخالفین اپنے اس اعتراض کو ثابت کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ اور پھر جارج سیل حضور ﷺ کے مخالفین کی اس ناکامی کی وجہ اپنے تخیل کے زور سے یہ بتاتا ہے کہ محمد (ﷺ) نے معلومات مہیا کرنے والے لوگوں کے ساتھ اپنے رابطوں کو بڑی کامیابی کے ساتھ مخفی رکھا تھا اور آپ

1۔ وہ محض ظن (و تخمین) سے کام لے رہے ہیں۔

2۔ اور نہیں وہ مگر اٹکلیں دوڑا رہے ہیں۔

کے مخالفین آپ کی ان احتیاطی تدابیر کی وجہ سے اس بات کا سراغ لگانے میں ناکام رہے تھے کہ وہ لوگ کون ہیں جو آپ کو معلومات مہیا کرتے ہیں۔

جارج سیل مصادر قرآن کے متعلق ان تفصیلات کو قرین قیاس قرار دیتا ہے جو ڈاکٹر پریڈو نے بیان کی ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ ڈاکٹر پریڈو نے تمام تفصیلات عیسائی مصنفین سے اخذ کی ہیں اور عیسائی مصنفین اپنے بیانات میں بعض مضحکہ خیز کہانیوں کو خلط ملط کر دیتے ہیں۔

منٹگمری واٹ قرآن حکیم کا منبع و مصدر تلاش کرنے کی کوشش میں اپنے تخیل کے گھوڑے کو بے لگام چھوڑتا ہے۔ جو کسی ایک مقام پر چند لمحے رکتا ہے اور پھر کسی دوسری طرف چل نکلتا ہے۔ وہ کبھی مکہ کی طبقاتی کشمکش کو قرآن کا منبع قرار دیتا ہے اور کبھی حضور ﷺ کے تخلیقی تخیل کو۔ کبھی وہ قرآن حکیم کے ڈانڈے ان اہل کتاب کے ساتھ ملاتا ہے جو اطراف واکناف سے مختلف مقاصد کے تحت مکہ آتے تھے اور کبھی وہ مکہ کے ذہنی ماحول کو قرآن کا مصدر قرار دیتا ہے۔

قرآن حکیم کے کلام الٰہی ہونے کا انکار جن بنیادوں پر مکہ کے بت پرستوں نے کیا تھا، یورپ کے اہل کتاب کا رویہ اس سے مختلف نہیں۔ جس طرح مستشرقین قرآن حکیم کو انسانی کلام ثابت کرنے کے لئے بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں کفار مکہ بھی اسی قسم کی باتیں کرتے تھے۔ جس طرح مستشرقین کو بات کہتے ہوئے مطلقاً یہ احساس نہیں ہوتا کہ ان کی بات کتنی کھوکھلی اور بے وزن ہے، مشرکین مکہ کی کیفیت بھی بالکل اسی قسم کی تھی۔

جن لوگوں نے قرآن حکیم کو بشری الاصل قرار دینے کی کوشش کی اور قرآن حکیم کے کلام الٰہی ہونے پر اعتراض کیا، ان کے اس اعتراض اور اسکے جواب کو خالق کائنات نے کس عمدہ پیرائے میں بیان فرمایا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ۭ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّ هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ(1)

"اور ہم خوب جانتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ انہیں تو یہ قرآن ایک انسان سکھاتا ہے۔ حالانکہ اس شخص کی زبان جس کی طرف یہ تعلیم قرآن کی

1۔ سورۃ النحل: 103

نسبت کرتے ہیں عجمی ہے اور قرآن فصیح وبلیغ عربی میں ہے۔

مشرکین مکہ کی بوکھلاہٹ کا اندازہ کیجئے کہ قرآن حکیم ان کے سامنے پڑھا جارہا ہے۔ اس کلام پاک میں اتنی قوت ہے کہ مکہ کے بڑے بڑے زبان دان اس کی عظمت کا اعتراف کر چکے ہیں۔ کچھ اس کی تاثیر سے متاثر ہو کر اس کے حلقہ بگوش بن رہے ہیں۔ جو مخالف ہیں وہ بھی چھپ چھپ کر اس معجزانہ کلام کو سنتے ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ اگر یہ کلام ان کی عورتوں، بچوں یا باہر سے آنے والے لوگوں کے کانوں میں پڑ گیا تو وہ اس کی تاثیر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ اس لئے وہ کوشش کرتے ہیں کہ یہ آواز اس قسم کے لوگوں کے کانوں تک نہ پہنچنے پائے۔

جس کلام نے کفار مکہ کو یوں عاجز کر دیا ہے، اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ کلام محمد ﷺ کو کوئی انسان سکھاتا ہے۔

لیکن وہ سکھانے والا انسان ہے کون؟ کوئی کہتا ہے وہ بلعام لوہار ہے۔ کوئی کہتا ہے وہ بنی مغیرہ کا غلام یعیش ہے۔ کوئی عیش اور جبر کو حضور ﷺ کا معلم قرار دیتا ہے۔ (1)

لطف کی بات یہ ہے کہ جن لوگوں کی طرف وہ عربی ادب کے اس شاہکار کو منسوب کر رہے ہیں وہ سب عجمی ہیں۔ کسی کی مادری زبان عربی نہیں۔ وہ سب غلام ہیں اور ان میں سے اکثر حلقہ بگوش اسلام ہو چکے ہیں۔

قرآن حکیم قریش مکہ کو ان کے اعتراض کے کھوکھلے پن سے آگاہ کرتا ہے اور فرماتا ہے۔ ذرا عقل کے ناخن لو۔ کیا یہ ممکن ہے کہ جس عربی کلام کی عظمتوں کو تمہارے ولید بن مغیرہ اور لبید بن ربیعہ جیسے زبان دان، دشمنی کے باوجود، سلام کرتے ہیں، وہ کلام کسی عجمی کی تعلیم سے وجود میں آیا ہو؟ قرآن حکیم مردان حر کو زندگی گزارنے کے جوگر سکھاتا ہے، کیا وہ ان غلاموں کے ذہن کی اختراع ہے جن کو اپنے مالکوں کی خدمت سے فرصت نہیں ملتی؟

قرآن حکیم نے کفار مکہ کو جو جواب دیا تھا، وہ ہر دور کے منکرین قرآن کے سامنے بطور چیلنج پیش کیا جاسکتا ہے۔ قرآن حکیم ایک عالمگیر پیغام ہے اور اس کا خطاب صرف مکہ کے عربوں سے نہیں بلکہ ہر دور اور ہر علاقے کے انسان سے ہے۔ قرآن حکیم ہر دور کے

1۔ پیر محمد کرم شاہ، "ضیاء القرآن"، (ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور)، جلد 2، صفحہ 4-603

انسان سے اس کی ذہنی سطح اور اس کے معتقدات کے مطابق گفتگو کرتا ہے۔ کفار مکہ کے نزدیک سب سے بڑا کمال زبان دانی تھا۔ ان کے شاعر، ادیب، قصہ گو اور خطیب معاشرے کے بڑے باکمال افراد شمار ہوتے تھے۔ اس لئے ان سے خطاب کرتے وقت قرآن حکیم نے ان کی زندگی کے اس شعبے کو پیش نظر رکھا۔ قرآن ان سے کہہ رہا ہے کہ یہ کلام تمہارے سامنے ہے۔ تم اپنی زبان دانی کی بنیاد پر اس کی ادبی خوبیوں کو سمجھ سکتے ہو۔ ذرا سوچو! جن لوگوں کی مادری زبان ہی عربی نہیں وہ اس کتاب کی تصنیف کے لئے کیسے معاونت کرسکتے ہیں۔

زبان دانی پر اترانے والے عربوں کے سامنے قرآن حکیم نے اپنی ادبی خوبیوں کو بطور چیلنج پیش کیا۔ لیکن قرآن حکیم کے کمالات صرف اس کی ادبی خوبیوں تک محدود نہیں بلکہ یہ علوم و معارف کا ایک بحر بے پیدا کنار ہے۔ قانون دان کو اس میں حیران کن قانونی موشگافیاں نظر آتی ہیں۔ سیاستدان اس سے سیاست کے زریں اصول اخذ کرتا ہے۔ جرنیل کو اس سے اپنی جنگی حکمت عملی وضع کرنے میں مدد ملتی ہے۔ طبیب کو اس کے صفحات میں پھیلے ہوئے بے شمار طبی نسخے نظر آتے ہیں۔ صوفی کو اس میں راہ سلوک میں راہنمائی کا سامان میسر آتا ہے۔ اور سائنس دان کو قرآن حکیم میں انسانوں کو بلندیوں کی طرف مائل پرواز کرنے والی یہ دعوت نظر آتی ہے "کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں"۔

یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب مبین نہ تاریخ کی کتاب ہے، نہ جغرافیے کی، نہ طب کی، نہ قانون کی، نہ تصوف کی اور نہ سائنس کی، بلکہ یہ تمام علوم کی کتاب ہے جس میں ہر علم کے ایسے اصول بیان کر دیئے گئے ہیں جن سے بہتر اصول وضع کرنا کسی مخلوق کے بس کی بات نہیں ہے۔

مستشرقین کبھی بحیرا راہب کو، کبھی شام اور یمن سے مکہ میں تجارت کے لئے آنے والے عیسائیوں کو اور کبھی مکہ کے سرداروں کے ہاں بے کسی کی زندگی گزارنے والے عیسائی غلاموں کو حضور ﷺ کا معلم قرار دیتے ہیں۔ قرآن حکیم نے جو بات کفار مکہ سے کہی تھی، ہم وہی بات مستشرقین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ کیا وہ علوم جو قرآن حکیم میں بیان ہوئے ہیں، وہ بحیرا راہب کو حاصل تھے؟ کیا مکہ یا مدینہ میں مقیم یا باہر سے آنے والا کوئی اہل کتاب ان علوم سے بہرہ ور تھا جو قرآن حکیم کی برکت سے بنی نوع انسان کو حاصل ہوئے ہیں؟

اگر بحیرا ہی راہب یا دوسرا کوئی عیسائی یا یہودی اتنا بڑا عالم تھا تو اسے خفیہ طور پر حضور ﷺ کو علم کے ان بے مثال موتیوں سے بہرہ ور کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیوں نہ وہ خود ایک عظیم کتاب تصنیف کر کے، اور اس کی بنیاد پر ایک عالمی مذہب کی بنیاد رکھ کر اپنے نام کو زندہ جاوید بنانے کی طرف متوجہ ہوا؟

جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام کی تعلیمات یہودیت اور نصرانیت سے ماخوذ ہیں ان کی خدمت میں ہم گزارش کرتے ہیں کہ وہ ذرا یہ وضاحت فرمائیں کہ قرآن حکیم کی وہ تعلیمات جو بائبل کی تعلیمات سے متصادم ہیں، وہ حضور ﷺ کو کس نے سکھائی تھیں؟ جارج سیل صاحب فرمائیں گے کہ وہ تعلیمات آپ نے غیر مستند انجیلوں اور ان غلط روایات سے حاصل کی تھیں جو اس زمانے میں عیسائیوں اور یہودیوں میں مشہور تھیں۔ ہم گزارش کریں گے کہ ان غیر مستند انجیلوں کے مصنف کون تھے؟

انجیل برناس کو عیسائی، مسلمانوں کی تصنیف کہہ کر جان چھڑا لیتے ہیں، ذرا یہ تو بتائیں کہ وہ انجیلیں جن سے حضور ﷺ نے استفادہ کیا تھا، ان کے مصنف کون تھے؟ مسلمان تو ان انجیلوں کے مصنف ہو نہیں سکتے کیونکہ وہ انجیلیں اسلام سے پہلے کے دور میں تصنیف ہوئی تھیں۔

ہم جارج سیل صاحب اور ان کے ہم نوا اور ہم مسلک لوگوں سے یہ بھی استفسار کریں گے کہ حضور ﷺ کے زمانے کے عرب یہودیوں اور عیسائیوں میں جو غلط مذہبی روایات مروج تھیں ان کو رواج دینے کا ذمہ دار کون تھا؟ ظاہر ہے اسلام اس کا ذمہ دار ہو نہیں سکتا کیونکہ یہ سب کچھ طلوع اسلام سے پہلے ہو چکا تھا۔ عرب کے بت پرست بھی اس کے ذمہ دار نہیں ہو سکتے کہ وہ خود علم کے میدان میں یہود و نصاریٰ کو اپنے آپ سے بہتر سمجھتے تھے۔

اس تمام بحث سے یہی واحد نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے کہ وہ انجیلیں جنہیں جارج سیل غیر مستند کہہ رہے ہیں وہ بھی عیسائیوں کے ایک طبقے کے ہاں معتبر تھیں اور وہ عقائد جن کو مستشرق مذکور غلط عیسائی عقائد کا نام دے رہے ہیں وہ عیسائیوں کی کثیر تعداد کے عقائد تھے۔

جارج سیل نے بے خبری میں یہ بات کہہ کر نصرانیت کے قصر رفیع کی بنیادیں ہلا دی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد دنیائے عیسائیت کئی طبقوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ طویل عرصہ ان میں باہم چپقلش رہی۔ ہر طبقے کی اپنی انجیلیں تھیں جو

دوسری انجیلوں سے مختلف تھیں۔ آخر کار سینٹ پال کا طبقہ غالب آگیا۔ ان کے عقائد کو رواج حاصل ہوا اور ان کے مقابلے میں دوسرے فرقے دب گئے۔ جو انجیلیں سینٹ پال کے عقائد کے مطابق تھیں ان کو مستند قرار دے دیا گیا اور جو انجیلیں اس کے عقائد سے متصادم تھیں انہیں غیر مستند قرار دے کر تلف کرنے کے احکامات صادر کر دیئے گئے۔

اس حقیقت کو ایک فرانسیسی مستشرق ڈاکٹر مورس بکائلے (Dr. Maurice Bucaille) کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے۔ وہ لکھتے ہیں:

"As for as the decades following Jesus's mission are concerned, it must be understood that events did not at all happen in the way they have been said to have taken place and that peter's arrival in Rome in no way laid the foundations of the Church. On the contrary, from the time Jesus left earth to the second half of the second century, there was a struggle between two factions. One was what one might call Pauline Christianity and the other Judeo Christianity. it was only very slowly that the first supplanted the second, and Pauline Christianity triumphed over Judeo-Christianity." (1)

"جہاں تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ تبلیغ کے بعد کی چند دہائیوں کا تعلق ہے، یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ واقعات اس طرح پیش نہیں آئے جس طرح کہ مشہور ہیں۔ اور دوسری یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ پطرس کے روم میں پہنچنے سے کسی بھی صورت میں کلیسا کا آغاز نہیں ہوا۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دنیا کو الوداع کہنے سے لے کر دوسری صدی کے نصف آخر تک عیسائیت کے دو طبقوں میں چپقلش رہی۔ ایک طبقہ وہ تھا جسے آپ سینٹ پال کی عیسائیت کہہ سکتے ہیں اور دوسرا طبقہ یہودی عیسائیت کا طبقہ تھا۔ سینٹ پال کے فرقے نے کافی عرصہ بعد یہودی عیسائیت پر فتح حاصل کی اور اس کو میدان سے ہٹا دیا۔"

1۔ "دی بائبل، "دی قرآن اینڈ سائنس"، صفحہ 67

عیسائیت کے دو متحارب طبقوں کی چپقلش کی مزید تفصیل بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر موریس بکائلے لکھتا ہے:

"For those Judeo-Christians who remained "Loyal Jews "Paul was a traitor. Judeo -Christian documents call him an "enemy ,accuse him of "tactical double dealing"......"Until 70 A.D ,Judeo-Christianity represents the majority of the Church, and Paul remains an isolated case. The head of the community at that time was James, a relation of Jesus. With him were Peter (at the beginning) and John. James may be considered to represent the Judeo-Christian camp, which deliberately clung to judaism as opposed to pauline-christianity. Jesus's family has a very important place in Judeo-Christian Chruch of Jerusalem."(1)

"یہودی عیسائیت کا طبقہ جو مخلص یہودی تھے ،ان کی نظروں میں سینٹ پال ایک دھوکا باز تھا۔ یہودی عیسائیت کے طبقے کی دستاویزات ،اسے دشمن کے نام سے یاد کرتی ہیں اور اس پر چالبازی اور دوغلے پن کا الزام لگاتی ہیں...... 70ء تک یہودی عیسائیت کو کلیسا میں اکثریت حاصل تھی اور سینٹ پال ایک بے اثر شخص تھا۔ اس وقت قوم کا سربراہ جیمز تھا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رشتہ دار تھا۔ اس کے ساتھ پطرس (ابتدائی زمانے میں) اور یوحنا تھے۔ جیمز کو یہودی عیسائیت کا نمائندہ قرار دیا جاسکتا ہے جو سینٹ پال کی عیسائیت کے برعکس یہودیت کے ساتھ منسلک رہی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خاندان کو یوروشلم کی یہودی عیسائیت میں بڑا اہم مقام حاصل ہے۔"

مندرجہ بالا اقتباسات اس حقیقت کا انکشاف کرتے ہیں کہ وہ انجیلیں جو آج عیسائیوں کے ہاتھ میں موجود ہیں ان کے مستند ہونے پر دنیائے عیسائیت کبھی متفق نہیں رہی۔ اور جو انجیلیں ضائع اور تلف کر دی گئی ہیں وہ بھی کبھی ساری دنیائے عیسائیت کی نظروں میں متفقہ

1۔ "دی بائبل، دی قرآن اینڈ سائنس"، صفحہ 68

طور پر غیر مستند نہ تھیں بلکہ وہ انجیلیں تورات کی تعلیمات کے مطابق تھیں اور جن لوگوں کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ قریبی تعلق تھا ان کے عقائد انہی انجیلوں کے مطابق تھے۔ موجودہ عیسائی مذہب اور مروج انجیلیں سینٹ پال کے عقائد پر مشتمل ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ساری زندگی آپ کا اور آپ کے دین کا دشمن رہا اور آپ کے رفع آسمانی کے بعد آپ کے دین کا سب سے بڑا چیمپئن بن بیٹھا۔

قرآن حکیم کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ انبیائے سابقین پر نازل ہونے والے صحائف کی مخالفت اور تردید کرنے کیلئے نازل نہیں ہوا بلکہ ان کی تصدیق کرنے والا اور محافظ بن کر نازل ہوا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (1)

"اور (اے حبیب ﷺ) اتاری ہم نے آپ کی طرف یہ کتاب (قرآن) سچائی کے ساتھ۔ تصدیق کرنے والی ہے جو اس سے پہلے (آسمانی) کتاب ہے اور یہ (قرآن) محافظ ہے اس پر۔"

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی انبیائے سابقین کی تصدیق کرنے والے تھے۔ ان کے بارے میں بھی قرآن حکیم ہمیں اس حقیقت سے آگاہ فرماتا ہے:

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًا ۢ بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ ۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ (2)

"اور یاد کرو جب فرمایا عیسیٰ فرزند مریم نے: اے بنی اسرائیل! میں تمہاری طرف اللہ کا (بھیجا ہوا) رسول ہوں۔ میں تصدیق کرنے والا ہوں تورات کی جو مجھ سے پہلے آئی ہے اور مژدہ دینے والا ہوں ایک رسول کا جو تشریف لائے گا میرے بعد۔ اس کا نام (نامی) احمد ہوگا۔"

حضور ﷺ اپنے تمام پیشرو انبیائے کرام اور ان کی کتابوں کی تصدیق کرنے والے ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اپنے سے پہلے تشریف لانے والے انبیائے کرام اور

1۔ سورۃ المائدہ: 48
2۔ سورۃ الصف: 6

تورات کی تصدیق کرنے والے اور اپنے بعد آنے والے نبی حضرت احمد ﷺ کی آمد کی بشارت دینے والے ہیں۔

اگر یہود و نصاریٰ نے اپنی کتابوں میں تحریف نہ کردی ہوتی تو آج قرآن، تورات اور انجیل میں تضاد نظر نہ آتا بلکہ یہ سب ایک دوسری کی تصدیق کرتیں۔ وہ کتابیں جن کو کلیسا نے غیر مستند قرار دے کر تلف کرنے کا حکم صادر کیا تھا، اگر وہ محفوظ ہوتیں تو یقیناً ان کی اکثر تعلیمات اناجیل اربعہ کی نسبت قرآن حکیم کی تعلیمات کے زیادہ قریب ہوتیں۔

کلیسا کی مسترد کردہ انجیلوں میں سے ایک انجیل، انجیل برنباس آج بھی دنیا کی لائبریریوں میں موجود ہے۔ اس کتاب میں بار بار مدنی تاجدار ﷺ اور آپ کے کمالات کا تذکرہ ہوا ہے۔ اس انجیل کی تعلیمات مروج عیسائیت کی تعلیمات سے بالکل متصادم اور قرآن حکیم کی تعلیمات کے بالکل قریب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیائے عیسائیت اس کتاب کو یہ کہہ کر مسترد کر دیتی ہے کہ اس کتاب کو کسی مسلمان نے تصنیف کیا ہے۔

جن ہزاروں انجیلوں کو کلیسا نے تلف کرنے کا حکم دیا تھا، ان میں یقیناً ایسی تعلیمات ہوں گی جو مروج عیسائیت کی تعلیمات سے متصادم تھیں۔ اسی وجہ سے ان کو غیر مستند قرار دے کر تلف کرنے کا حکم دیا گیا۔

ڈاکٹر مورس بکائے کا یہ کہنا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رشتہ دار اور قریبی لوگ سینٹ پال کو فریبی، دشمن اور دوغلا سمجھتے تھے، اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے عقائد سینٹ پال کے عقائد سے متصادم تھے۔ یقیناً ان کے عقائد وہی ہوں گے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تعلیم کیے تھے۔ ان عقائد کی جھلک ہی ہمیں انجیل برنباس میں نظر آتی ہے۔

مندرجہ بالا حقائق کے پیش نظر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن حکیم نے مصدق اور مھیمن ہونے کی دونوں ذمہ داریاں خوبصورتی سے نبھائی ہیں۔ تورات اور انجیل کے جو بیانات اپنی اصلیت پر قائم تھے اور تحریف سے محفوظ تھے، قرآن حکیم نے ان کی تصدیق کی اور جن الہامی تعلیمات کو یہود و نصاریٰ نے بدل دیا تھا، قرآن حکیم نے ان کو از سر نو زندہ کیا۔ قرآن حکیم نے یہود و نصاریٰ کے تمام غلط عقائد کی تردید کر دی اور اس طرح اپنے مھیمن ہونے کے دعوئ کو ثابت کر دیا۔

یہودی اور عیسائی مشترکہ طور پر دعوئ کرتے ہیں کہ قرآن حکیم عہد نامہ قدیم اور عہد

نامہ جدید کی تعلیمات سے ماخوذ ہے۔ ہم ان سے سوال کرتے ہیں کہ قرآن حکیم نے نہ تو بائیبل کے تمام بیانات کی تصدیق کی ہے اور نہ ہی تردید۔ قرآن حکیم نے جہاں عہد نامہ جدید و قدیم کے بیانات کی تردید کی ہے وہاں اس تردید کے لئے بڑے پرزور اور مسکت دلائل پیش کئے ہیں۔

ہمارے مہربان ذرا ہمیں یہ بتائیں کہ مکہ کے امی رسول کو یہ قوت استدلال کہاں سے ملی تھی؟ اگر وہ خدا کا برگزیدہ رسول نہیں تھا تو نجران کے عیسائی عالموں کا وفد جو مدینہ آیا تھا وہ آپ کو مناظرے میں لاجواب کیوں نہ کر سکا تھا؟ اور مدینہ کے یہودی جو اپنی علمیت پر نازاں تھے وہ اسے مناظرانہ گفتگو میں زیر کیوں نہ کر سکے تھے۔

مستشرقین نے ایک اور تاثر یہ دینے کی کوشش کی ہے کہ قرآن حکیم کو حضور ﷺ نے اپنے ذہن کی زبردست تخلیقی قوت کے ذریعے تصنیف کیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ اس تصنیف کے لئے مواد آپ کو مکہ کے ذہنی ماحول سے حاصل ہوا۔

مستشرقین کے اس مفروضے پر گفتگو کرتے ہوئے ان کے مندرجہ ذیل نظریات کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے:

1:۔ اہل مغرب کی نسلی برتری کا مشہور مغربی اور استشراقی نظریہ

2:۔ یہ نظریہ کہ مشرقی اقوام عقلی صلاحیتوں کے لحاظ سے کمتر ہیں اور ان کا ذہن تخلیقی قوتوں کے معاملے میں مغربی ذہن کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

3:۔ یہ نظریہ کہ عربوں کی سوچ صحرائی تھی۔ قرآن ان کے حالات میں مفید تھا اور یہ ترقی یافتہ اقوام کی راہنمائی کے لئے مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔

ذرا غور فرمائیے کہ صدیوں اہل مغرب کا اس نظریے پر اتفاق رہا ہے کہ اقوام مشرق ذہنی طور پر کمتر ہیں اور اپنے نفع نقصان کو بہتر طور پر نہیں سمجھ سکتیں۔ ممالک شرقیہ پر اپنے استعماری غلبے کو قائم کرنے اور قائم رکھنے کے لئے انہوں نے اس نظریے کو کافی عرصہ بڑی کامیابی سے آزمایا۔ اور آج بھی اقوام مشرق کو اپنا ذہنی غلام رکھنے کی خاطر مغرب کے ذرائع ابلاغ بڑی عیاری سے اس نظریے کے مطابق ہی پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔

مغربی ذہن کی برتری کے نظریے کے باوجود حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ یہودیت اور نصرانیت کو اپنا دین تسلیم کرتے ہیں جب کہ یہ دونوں دین مشرقی ہیں اور ان کے پیغمبروں

اور ابتدائی مخاطبین کا تعلق مشرق سے تھا۔ یہ عجیب سی بات ہے کہ وہ ادیان جو کم تر ذہنی صلاحیتیں رکھنے والی مشرقی اقوام پر نازل ہوئے تھے وہ مدتوں سے اعلیٰ ذہنی صلاحیتیں رکھنے والی مغربی نسل کی راہنمائی کر رہے ہیں۔ اہل مغرب کے ان نظریات کی روشنی میں مستشرقین کا یہ مفروضہ اور بھی حیران کن لگتا ہے کہ حضور ﷺ نے مکہ کے ذہنی ماحول سے مواد اخذ کیا اور اپنے ذہن کی زبردست تخلیقی قوت سے کام لے کر قرآن تصنیف کر لیا۔

مستشرقین نے قرآن حکیم کے سینکڑوں ترجمے مغربی زبانوں میں کئے ہیں۔ ان کے ہزاروں علماء نے اپنی زندگیاں علوم و معارف کے اس بحر بیکراں میں غوطہ زنی کرتے ہوئے صرف کی ہیں اور ان میں سے کئی اس کی عظمتوں کو سلام کرنے پر مجبور بھی ہوئے ہیں۔ ان کے تاریخ دان یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس کتاب مبین کی تعلیمات نے عربوں کا مقدر سنوارا، اجڈ بدوؤں کو تہذیب و ثقافت کا علمبر دار بنایا، ان گنت بتوں کی پوجا کرنے والی قوم کو خدائے واحد کے سامنے سجدہ ریز کیا اور اوہام کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ذہنوں کو علم کے نور سے منور کیا۔

وہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس کتاب مبین کی تعلیمات کو خضر راہ بنانے والوں نے کئی عظیم قائم کیں اور صدیوں ان کی عظمت کے پھریرے مشرق و مغرب میں لہراتے رہے۔ انہوں نے یونان کے فلسفے کو تجربے کی کسوٹی پر پرکھا اور اسے نسل انسانی کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے استعمال کیا۔

وہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ وہ کتاب ہے جس کی تعلیمات نے مغرب کی نشاۃ ثانیہ میں اہم کردار ادا کیا، جس نے تخلیق کائنات کے متعلق وہ تفصیلات بیان کیں جن میں سے کسی کو بھی سائنس اپنے دور عروج میں بھی نہ جھٹلا سکی، جس نے ماضی کے واقعات پوری صحت کے ساتھ بیان کئے اور جس نے مستقبل کے بارے میں متعدد پیشگوئیاں کیں جن میں سے اکثر کو سو فیصد صحیح ثابت ہوتے ہوئے دوستوں اور دشمنوں سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

جس کتاب کی یہ ناقابل انکار اور ناقابل تردید خوبیاں سطور بالا میں بیان کی گئی ہیں، اس کتاب کے متعلق مستشرقین یہ تحقیق فرماتے ہیں کہ اس کی تصنیف کے لئے مواد مکہ کے ذہنی ماحول نے مہیا کیا۔ وہ اہل مکہ جن کی راہنمائی کے لئے کوئی آسمانی کتاب موجود نہ تھی، جن کی فکری زندگی کا تانا بانا توہمات سے تیار ہوا تھا، جو علوم و فنون سے قطعاً بے بہرہ تھے اور

جن کا سارا ادبی سرمایہ صرف ذہنوں میں محفوظ تھا۔

مکہ کے اس ماحول میں جنم لینے اور پروان چڑھنے والا ایک شخص جو مشرقی بھی ہے، عرب بھی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ امی بھی ہے، اس شخص کے بارے میں مستشرقین ہمیں آگاہ فرما رہے ہیں کہ یہ وہ شخص ہے جس نے اس کتاب کو تصنیف کیا جس کی خوبیوں کا ذکر سطور بالا میں ہوا ہے۔

ہمیں سمجھ نہیں آتی کہ ہم مستشرقین کی کس بات کو تسلیم کریں اور ان کی کس بات کا انکار کریں۔ اگر ان کے اہل یورپ کی نسلی برتری کے نظریے کو تسلیم کرتے ہیں تو اس بات کا انکار کرنا پڑتا ہے کہ ایک مشرقی شخص نے مشرق کے ذہنی ماحول سے مواد اخذ کر کے قرآن جیسی کتاب لکھ لی تھی۔ اور اگر ان کی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن ایک امی عرب کے تخلیقی تخیل کا نتیجہ ہے تو اہل یورپ کی نسلی برتری کے نظریے کا انکار کرنا پڑتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ حق کی مخالفت کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیتے ہیں ان کے قلموں اور ان کی زبانوں سے اسی قسم کی بے سروپا باتیں نکلتی ہیں۔ اس لئے ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ ہم مستشرقین کے ان تمام مزعومات کا انکار کر کے قرآن حکیم کو اس وحدہ لاشریک کا کلام تسلیم کریں جو علیم بھی ہے اور حکیم بھی، جس کی نگاہ قدرت سے نہ ماضی پوشیدہ ہے اور نہ مستقبل۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی تعمیل کریں:

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (1)

"کہہ دو ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر اور جو نازل کیا گیا ہماری طرف اور جو اتارا گیا ابراہیم و اسماعیل و اسحٰق و یعقوب اور ان کی اولاد کی طرف۔ اور جو عطا کیا گیا موسیٰ اور عیسیٰ کو اور جو عنایت کیا گیا دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے۔ ہم فرق نہیں کرتے ان میں سے کسی پر ایمان لانے میں اور ہم تو اللہ کے فرماں بردار ہیں۔"

1۔ سورۃ البقرہ:136

مستشرقین کی خدمت میں چند گزارشات

مستشرقین دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ تاریخی بیانات، خصوصاً تاریخ اسلام کے کئی اہم واقعات کا انکار وہ محض اس بنا پر کرتے ہیں کہ عقل ان کو تسلیم نہیں کرتی۔ سیرت اور احادیث طیبہ کی کتابوں میں جو باتیں حضور ﷺ کی معجزانہ شان کو بیان کرتی ہیں، ان کو وہ خلاف عقل کہہ کر مسترد کر دیتے ہیں۔ وہ اسلامی مصادر میں اس قسم کے مواد کی موجودگی کو ان مصادر کے غیر معتبر ہونے کی دلیل قرار دیتے ہیں۔

ہم مستشرقین سے یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہیں کہ وہ قرآن حکیم کے وحی الٰہی ہونے کا انکار کر کے، قرآن حکیم کی تصنیف کے متعلق جو مختلف مفروضے پیش کرتے ہیں، کیا ان میں سے کوئی ایک مفروضہ بھی عقل کے معیار پر پورا اترتا ہے؟

کیا مستشرقین کی عقل اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ تجارتی قافلے کی معیت میں بحیرئی راہب کے ساتھ ایک دعوت میں حضور ﷺ کی جو ملاقات ہوئی تھی، اس میں بحیرئی راہب نے حضور ﷺ کو اتنا بڑا عالم بنا دیا تھا کہ آپ اس علم کے زور پر قرآن حکیم جیسی کتاب لکھنے میں کامیاب ہو گئے تھے، حالانکہ اس ملاقات کی گفتگو زیادہ تر ان سوالات پر مشتمل تھی جو بحیرئی راہب حضور ﷺ سے پوچھتا رہا تھا؟ کیا مستشرقین کی عقل یہ بات تسلیم کرتی ہے کہ ایک ایسا شخص جس نے کبھی کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا، جو نہ لکھنا جانتا تھا اور نہ پڑھنا جانتا تھا، جس کے پاس نہ کوئی کتاب تھی اور نہ لائبریری، وہ شخص ایک ایسی کتاب لکھنے میں کامیاب ہو گیا تھا جس نے سیاسی، سماجی، معاشی، ذہنی اور روحانی میدانوں میں ایک بے نظیر انقلاب برپا کر دیا تھا؟

کیا تاریخ ادب میں اور بھی کوئی مثال ایسی ہے کہ کسی شخص نے مذکورہ حالات میں اتنی عظیم کتاب لکھی ہو؟

بالفرض اگر آج دنیا کے کسی پسماندہ علاقے کا کوئی ناخواندہ شخص مستشرقین کے پاس کوئی ایسی کتاب لائے جس میں سیاست، قانون، اخلاق، سائنس، معیشت اور معاشرت کے ایسے زریں اصول موجود ہوں، جن سے انسانیت پہلے نا آشنا ہو، اور آ کر کہے کہ اگرچہ وہ ناخواندہ ہے لیکن اسکے باوجود یہ کتاب اس نے خود لکھی ہے۔ تو کیا مستشرقین کی عقل رسا اس شخص کے اس دعویٰ کو تسلیم کر لے گی؟

کیا عقل انسانی اس بات کو تسلیم کر سکتی ہے کہ مکہ کے اطراف واکناف سے جو یہودی اور عیسائی تجارت کیلئے مکہ آتے تھے یا جو عیسائی سرداران مکہ کے ہاں غلامی کی زندگی گزار رہے تھے، انہوں نے حضور ﷺ کو تعلیم دی جس کے نتیجے میں آپ قرآن حکیم جیسی کتاب دنیا کے سامنے پیش کرنے میں کامیاب ہوگئے؟

اگر ان باتوں میں سے کسی بات کو بھی عقل تسلیم نہیں کرتی تو نبی امی ﷺ کی اس وضاحت کو تسلیم نہ کرنے کی وجہ کیا ہے کہ قرآن حکیم ان کی تصنیف نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا نازل کیا ہوا کلام ہے؟

مشرکین مکہ نے بھی قرآن حکیم کے کلام خداوندی ہونے کا انکار کیا تھا۔ ان کے انکار کی وجہ تو سمجھ میں آسکتی ہے کیونکہ ان کی عقل تو اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہی نہ تھی کہ آسمان اور زمین کے درمیان وحی کے ذریعے رابطہ ممکن ہے۔ وہ تو کسی بھی بشر کو، جو عام انسانوں کی طرح کھاتا پیتا اور زندگی بسر کرتا ہو، خدا کا رسول ماننے کے لئے تیار ہی نہ تھے۔ کیا مستشرقین بھی کفار مکہ کی طرح نزول وحی کے منکر ہیں؟

اگر وہ وحی کے نزول کو ناممکن سمجھتے ہیں تو ان صحائف کے متعلق ان کا کیا خیال ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئے تھے؟

اگر وہ عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید کو آسمانی صحائف مانتے ہیں تو جس ذریعے سے یہ کتابیں نازل ہوئی ہیں، اسی ذریعے سے قرآن حکیم کے نزول کا انکار وہ کس بنا پر کرتے ہیں؟ وہ جس چیز کو یہودیت اور عیسائیت کے لئے جائز مانتے ہیں، اسلام کے لئے اس کو محال کیوں قرار دیتے ہیں؟

اگر آپ لوگ آسمان سے وحی کے نزول کو ممکن سمجھتے ہیں تو پھر دوسری آسمانی کتابوں کی طرح قرآن حکیم کے منزل من اللہ ہونے کا بھی آپ کو اقرار کرنا پڑے گا۔ اور اگر آپ نزول وحی کے امکان ہی کے منکر ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ انبیائے بنی اسرائیل پر نازل ہونے والے صحائف کو تو منزل من اللہ تسلیم کریں اور قرآن حکیم کی اس حیثیت کا انکار کر دیں۔ حالانکہ قرآن حکیم میں عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید کی نسبت کہیں زیادہ حقائق بیان ہوئے ہیں۔ اور جوں جوں سائنس ترقی کرتی جا رہی ہے اس نے بائیبل کے کئی بیانات کو جھٹلایا ہے لیکن آج تک سائنس قرآن حکیم کے کسی ایک بیان کو بھی جھٹلا نہیں سکی۔

ڈاکٹر مورس بکائیلے نے اپنی کتاب "دی بائبل، دی قرآن اینڈ سائنس" میں اس حقیقت کو کئی ناقابل انکار دلائل کے ذریعے ثابت کیا ہے۔

مستشرقین کے پاس قرآن حکیم کے کلام خداوندی ہونے کا انکار کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ ان کے انکار کے پس منظر میں حسد، بغض اور اسلام دشمنی کے سوا کچھ نہیں۔ اس لئے ہم ان کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنے رویے میں تبدیلی کریں۔ ساتھ ہی ہم ان کی توجہ قرآن حکیم کی اس آیت کریمہ کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا(1)

"اے وہ لوگو جنہیں دی گئی کتاب! ایمان لاؤ اس کتاب پر جو نازل فرمائی ہم نے تاکہ تصدیق کرے اس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے (ایمان لاؤ) اس سے پہلے کہ ہم مسخ کر دیں چہرے پھر پھیر دیں انہیں پشتوں کی طرف یا لعنت کریں ان پر جس طرح ہم نے لعنت کی سبت والوں پر اور اللہ کا حکم پورا ہو کر رہتا ہے۔"

قرآن حکیم کی حیثیت کو مشکوک بنانے کے لئے استشراقی وسوسے

مستشرقین نے قرآن حکیم کے کلام خداوندی ہونے کا انکار کرنے کے لئے مختلف ناکام حیلے استعمال کئے۔ چونکہ باطل کی کوئی مستقل بنیاد نہیں ہوتی اس لئے وہ نت نئے رنگ بدلتا رہتا ہے۔

مستشرقین کے پاس کوئی نکتہ ایسا نہ تھا جس پر ڈٹ کر وہ اپنے موقف کو ثابت کرتے اس لئے وہ رنگ اور انداز بدل بدل کر قرآن حکیم پر حملہ آور ہوتے رہے۔ ان کا طریقہ واردات یہ ہے کہ جب وہ کسی اسلامی عقیدے کو باطل ثابت کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں تو خاموش ہو کر بیٹھ نہیں جاتے بلکہ ایسے ایسے شوشے چھوڑنے لگتے ہیں جن سے اس عقیدے پر مسلمانوں کا ایمان متزلزل ہو جائے۔

قرآن حکیم کے کلام خداوندی ہونے کے عقیدے کے بارے میں بھی انہوں نے یہی

1۔ سورۃ النساء: 47

رویہ اپنایا ہے اور انہوں نے قرآن حکیم کے بارے میں بھانت بھانت کی بولیاں بول کر مسلمانوں کے ایمان کو متزلزل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ذیل میں ہم مستشرقین کے قرآن حکیم کے متعلق اس قسم کے وسوسوں اور ان کی حقیقت سے قارئین کو آگاہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ وسوسہ کہ قرآن حکیم میں جدت کا فقدان ہے

مستشرقین نے قرآن حکیم کے متعلق یہ تاثر عام کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے کہ اس کی تعلیمات میں کوئی چیز نئی نہیں۔ جارج سیل کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ جس میں وہ کہتا ہے۔

"مجھے یقین ہے کہ قرآن حکیم میں کوئی چیز ایسی نہیں جو محمد (ﷺ) نے ابتداء متعارف کرائی ہو۔ بلکہ قرآن حکیم میں جو کچھ ہے اس کو قدیم مصادر میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔"(1)

مستشرقین میں یہ جملہ عام طور پر مشہور ہے:

"قرآن میں جو کچھ جدید ہے وہ صحیح نہیں اور جو صحیح ہے وہ جدید نہیں۔"

مستشرقین کہنا یہ چاہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے قرآن حکیم کی جو تعلیمات یہود و نصاریٰ سے اخذ کی ہیں وہ تو ٹھیک ہیں لیکن جو باتیں آپ نے اپنی طرف سے پیش کی ہیں، ان میں سے کوئی بھی صحیح نہیں۔

وہ اپنے اس نظریے کو ذہن میں رکھ کر قرآن حکیم کی تعلیمات کا منبع تلاش کرنے کے لئے ہی عہد نامہ جدید و قدیم کا مطالعہ کرتے ہیں۔ جب انہیں قرآن حکیم کی کوئی بات سابقہ صحف سماویہ کے مطابق نظر آتی ہے تو بڑی خوشی سے اعلان کرتے ہیں کہ محمد (ﷺ) نے یہ بات فلاں جگہ سے اخذ کی ہے، تاکہ قاری یہ محسوس کرے کہ قرآن حکیم خدا کا نازل کردہ کلام نہیں بلکہ حضور ﷺ نے دوسرے صحف سماویہ کی نقل کر کے اس کو تصنیف کیا ہے۔

مستشرقین صحف سماویہ کے علاوہ زمانہ جاہلیت کے عربوں کی روایات، مکی زندگی کے رسوم و رواج اور جاہلی عرب شاعری میں بھی ایسے مقامات تلاش کرتے ہیں جن کو قرآن حکیم کا منبع قرار دیا جا سکے۔

مستشرقین کی خدمت میں گزارش ہے کہ انہوں نے یہ اصول کہاں سے حاصل کیا ہے

1۔ "The Koran"، صفحہ 49

کہ سچ وہی ہوتا ہے جو نیا ہو یا دین وہی سچا ہوتا ہے جو اپنے سے پہلے انسانی معاشرے میں موجود تمام عقائد، نظریات، روایات اور معمولات کو یکسر ملیامیٹ کردے اور پھر ان کے کھنڈروں پر عمارت نو تعمیر کرے۔ کیا اصلاحی تحریکیں وہی سچی ہوتی ہیں جو معاشرہ کی ہر قدر کو، صحت و سقم کی تمیز کے بغیر، ملیامیٹ کر دیں اور پھر نظریات، اخلاق، اقدار اور روایات کا وہ مجموعہ پیش کریں جس کی پہلے کہیں نظیر نہ ملتی ہو؟

یہ بات تو سچ ہے کہ اسلام کی بہت سی باتیں ایسی ہیں جو نئی نہیں لیکن یہ بات صحیح نہیں کہ اسلام نے یہ باتیں کسی انسانی ذریعے سے حاصل کی ہیں۔

اسلام نے کب یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس نے جو حقائق پیش کئے ہیں وہ اس سے پہلے کسی نبی یا رسول نے پیش نہیں کئے ؟

اسلام کا تو دعویٰ ہی یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور ﷺ تک تمام انبیائے کرام ایک ہی پیغام کے علمبردار بن کر تشریف لاتے رہے۔ حق نا قابل تغیر ہوتا ہے، وہ زمانے کے بدلنے سے بدل نہیں جاتا۔ جو بات حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے میں حق تھی وہی بات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں بھی حق تھی۔ جو بات حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے زمانے میں حق تھی وہی بات حضرت محمد ﷺ کے زمانے میں بھی حق تھی۔

چونکہ تمام انبیائے کرام حق کے علمبردار تھے، اس لئے ان کی تعلیمات اور ان کے پیغامات میں موافقت ایک قدرتی بات تھی۔ ہمارے ہاتھوں میں آج جو صحف سماوی موجود ہیں ان میں ہمیں جو باہم تضاد نظر آتا ہے، وہ تضاد اس لئے نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ ایک دوسرے سے متضاد پیغام لے کر تشریف لائے تھے بلکہ یہ تضاد اس وجہ سے ہے کہ یہود و نصاریٰ نے اپنے صحائف کو صدیوں بازیچہ اطفال بنائے رکھا ہے۔ اگر آج ہمیں اصل تورات، زبور اور انجیل مل جائیں تو ان کی بنیادی تعلیمات اور قرآن حکیم کی بنیادی تعلیمات میں ذرا فرق نظر نہ آئے۔ تفصیلات کے معمولی اختلافات زمانے کے تقاضوں کے مطابق ضروری ہیں اور تفصیلات میں اختلاف حکمت کے عین مطابق ہے۔

قرآن حکیم تو بار بار اعلان فرماتا ہے کہ وہ پہلی آسمانی کتابوں کا مصدق اور مھیمن ہے۔

اگر اس کی تعلیمات ہر جگہ پہلی کتابوں کی تعلیمات سے مختلف ہوں تو نہ وہ پہلی کتابوں کا مصدق کہلا سکتا ہے اور نہ ہی مھیمن۔ اسلام میں تو ایمان بالرسالت اور ایمان بالکتب کا مطلب ہی یہ ہے کہ رسالت کے پورے ادارے اور الہامی کتابوں کے مکمل سلسلے پر ایمان لایا جائے۔ کوئی مسلمان صرف حضور ﷺ کی رسالت کا اقرار کر کے ایمان بالرسالت کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا بلکہ ایمان بالرسالت کے تحقق کے لئے اسے تمام انبیاء اور رسولوں پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ اسی طرح ایمان بالکتب کے لئے صرف قرآن پر ایمان کافی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ ہر مسلمان مجملاً یہ ایمان رکھے کہ سابق انبیاء و رسل پر جو کچھ نازل ہوا تھا وہ حق تھا۔

گویا اسلام کے اساسی عقائد ایمان بالرسل اور ایمان بالکتب کا تقاضا یہ ہے کہ تمام رسول ایک ہی دین کے علمبردار ہوں اور تمام کتب سماوی کا منبع ایک ہو۔

اگر مستشرقین کے وسوسے کے مطابق کسی کتاب کے منزل من اللہ ہونے کا معیار یہ ہو کہ اس کی تعلیمات کسی دوسری کتاب کی تعلیمات کے مشابہ نہ ہوں تو ایمان بالکتب ممکن ہی نہیں رہتا۔ اس صورت میں تو ایمان بالکتاب کی اصطلاح استعمال کرنی ہوگی کہ ہر نبی کے پیروکار صرف ایک ہی کتاب پر ایمان رکھیں۔ اس سے صرف مسلمان ہی متاثر نہ ہوں گے بلکہ خود عیسائی مستشرقین کے لئے بھی ایک مسئلہ بن جائے گا۔

ہم مستشرقین سے پوچھتے ہیں کہ اگر اناجیل کی کوئی بات تورات کے مطابق نظر آئے تو کیا وہ اس بنا پر انجیل کے کلام خداوندی ہونے کا انکار کر دیں گے اور اسے تورات سے نقل شدہ کتاب قرار دیں گے ؟

اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ انجیل میں اگر ایسی باتیں موجود ہوں جو سابقہ کتابوں میں بھی نظر آتی ہیں تو اس سے انجیل کے کلام خداوندی ہونے پر کوئی حرف نہ آئے اور اگر قرآن حکیم کی کوئی بات سابق صحف سماوی میں بھی نظر آ جائے تو اس کے کلام خداوندی ہونے کا انکار کر کے اس کو سابقہ کتابوں کی نقل قرار دیا جائے؟

ہمارا یہ ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء و رسل پر جو کتابیں نازل فرمائی تھیں وہ حق تھیں۔ ان سب کا پیغام ایک تھا۔ وہ سب ایک ہی آفتاب حق کی نورانی کرنیں تھیں۔ ان سب کی تعلیمات ایک جیسی تھیں۔ لیکن ان کتابوں میں سے کوئی کتاب بھی کسی دوسری

کتاب کی نقل نہ تھی۔ بلکہ ہر کتاب بذریعہ وحی اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک برگزیدہ بندے اور رسول پر نازل فرمائی تھی۔

مستشرقین اگر کوئی ایک اصول بنا کر اسے تمام الہامی کتابوں پر لاگو کریں تو انہیں قرآن حکیم پر اعتراض کرنے کا قطعاً کوئی موقعہ نہ ملے۔ عجیب بات یہ ہے کہ مستشرقین قرآن حکیم پر اعتراض کرنے کے لئے جو اصول وضع کرتے ہیں، ان اصولوں سے وہ ان کتابوں کو مستثنیٰ سمجھتے ہیں جو ان کے اپنے عقیدے کے مطابق منزل من اللہ ہیں۔

یہ دوغلی پالیسی نہ علم ہے اور نہ معروضیت۔ اس لئے ہم مستشرقین کے ان یک طرفہ فیصلوں کو تسلیم کرنے کے لئے قطعاً تیار نہیں۔

یہ وسوسہ کہ وقت کے ساتھ ساتھ قرآنی پیغام کی روح بدلتی رہی

ڈارون نے اہل مغرب کے سامنے ارتقاء کا جو نظریہ پیش کیا، اسے انہوں نے ہر میدان میں دل کھول کر استعمال کیا۔ کائنات بحر و بر اور عالم ارض و سماء میں قدرت خداوندی کی ان گنت نشانیاں دیکھنے کے باوجود انہوں نے وجود خداوندی کا انکار کیا اور اس انکار کی علمی دلیل کے طور پر انہوں نے ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو استعمال کیا۔

انہوں نے حضرت انسان جیسی اعلیٰ مخلوق کے لئے کسی خالق کے وجود کا انکار کیا اور پھر پانی میں ظہور حیات کے مرحلے سے لے کر کاروان حیات کے منزل انسانیت پر پہنچنے تک، مختلف کڑیاں گھڑتے اور ملاتے رہے اور اس چیستاں کے سہارے خدا کے وجود کو غیر ضروری قرار دے کر درمیان سے نکال دیا۔

مستشرقین کی اکثریت گو یہودی اور عیسائی ہے اور وجود خداوندی کی بھی قائل ہے اور خدا کو کائنات کا خالق بھی مانتی ہے لیکن اس کے باوجود قرآن حکیم کے متعلق ان کا رویہ حیران کن ہے۔

قرآن حکیم ان کے سامنے ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ میں اس کے کلام خداوندی ہونے کے بیّن دلائل موجود ہیں۔ اس میں ہمہ جہتی معلومات کا وہ سمندر موجزن ہے کہ اسے کسی علیم و خبیر ہستی کی طرف نسبت کئے بغیر چارہ نہیں۔ اس کتاب کو لانے والا پیغمبر اس کو رب کائنات کی طرف منسوب کرتا ہے لیکن یہ انتساب مستشرقین کے مفادات کے لئے خطرناک ہے۔ وہ ہر قیمت پر اس کتاب کے کلام خداوندی ہونے کا انکار کرنا چاہتے

ہیں۔ کیونکہ اگر اسے خدا کا کلام تسلیم کر لیا جائے تو ان کی تحریک کے قصر رفیع کی بنیادیں ہل جاتی ہیں۔ ان کے اسلاف کی صدیوں کی محنت رائیگاں جاتی ہے۔ اس لئے وہ قرآن کے کلام خداوندی ہونے کا انکار کرنے کو ضروری خیال کرتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ کیوں نہ قرآن حکیم کے کلام خداوندی ہونے کا انکار کرنے کے لئے ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو استعمال کیا جائے۔

اگر کتاب کائنات کے صفحے صفحے پر قدرت خداوندی کے ایسے نشانات ثبت ہونے کے باوجود، جنہیں ہر عالم اور جاہل، ذہین اور غبی دیکھ رہا ہے، سائنسدان نظریہ ارتقاء کے ذریعے خدا کے وجود کا انکار کر سکتے ہیں تو مستشرقین اس نظریے کے ذریعے قرآن کے کلام خداوندی ہونے کا انکار کیوں نہیں کر سکتے۔

مستشرقین نے یہ اندازہ لگالیا تھا کہ قرآن عربی زبان کی کتاب ہے۔ اس کے مطالعہ کے لئے تعلیم اور عربی زبان کا جاننا ضروری ہے۔ کروڑوں لوگ ایسے ہیں جو مسلمان ہونے کے باوجود قدرت خداوندی کے ان نشانات کو دیکھنے سے قاصر ہیں جو قرآن حکیم کے صفحات میں جا بجا بکھرے پڑے ہیں اور جو اعلانیہ اس کتاب کے کلام خداوندی ہونے کی گواہی دے رہے ہیں۔ اربوں غیر مسلم ایسے ہیں جنہوں نے شاید قرآن کا نام بھی نہ سنا ہو۔ ان غیر مسلموں کو اور قرآن کی تعلیمات سے بے بہرہ مسلمانوں کو یقین دلانے کے لئے کہ یہ کتاب کلام خداوندی نہیں، نظریہ ارتقاء کو بڑی کامیابی سے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

ممکن ہے یہ بات عام مسلمانوں کو بھی عجیب لگے کہ مستشرقین نے قرآن حکیم کے کلام خداوندی ہونے کے عقیدے کے خلاف نظریہ ارتقاء کو استعمال کیا ہے۔ مسلمانوں کے لئے یہ سوچنا قدرتی بات ہے کیونکہ مسلمانوں کو اپنے دین کو حق ثابت کرنے کے لئے جھوٹ، فریب، ریاکاری اور عیاری کے حربے استعمال کرنے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔

اپنے دنیوی معاملات میں وہ یہ سارے حربے استعمال کرتے ہوں گے لیکن اپنے دین کی کسی تعلیم کو ثابت کرنے کے لئے وہ یہ حرکت کبھی نہیں کرتے اور نہ انہیں اس کی ضرورت پیش آتی ہے کیونکہ ان کا دین حق ہے اور اس کو ثابت کرنے کے لئے کلمہ حق ہی کام آتا ہے۔ ان کا دین وہ ہے جس کو رب قدوس نے اتارا ہی غالب ہونے کے لئے ہے۔

ارشاد خداوندی ہے:

هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى

الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝(1)

"وہی تو ہے جس نے بھیجا ہے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ تا کہ وہ غالب کر دے اسے سب دینوں پر خواہ سخت ناپسند کریں اس کو مشرک۔"

مسلمانوں کا دین حق ہے۔ وہ غالب ہونے کے لئے نازل ہوا ہے اور مسلمانوں کو اس کے غلبے کی جدوجہد میں کسی منفی ہتھکنڈے کی ضرورت نہیں ہوتی، لیکن مستشرقین کا معاملہ مختلف ہے۔ وہ ایک ایسی بات کو ثابت کرنا چاہتے ہیں جس کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں۔ اس لئے ان کے لئے منفی ہتھکنڈے استعمال کئے بغیر کوئی چارہ کار ہی نہیں۔

مستشرقین نے نظریہ ارتقاء کو اسلام کے خلاف استعمال کرنے کے لئے سب سے پہلے اپنے ظن و تخمین کے زور سے قرآن حکیم کی ترتیب نزولی گھڑی۔ مسلمان قرآن حکیم کی نزولی تاریخ کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں: کی دور اور مدنی دور۔ جب کہ مستشرقین کی دور کو پھر تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اس خود ساختہ تقسیم کی رو سے وہ اس قسم کے مفروضے گھڑتے ہیں کہ آج اسلامی عقائد و عبادات کا جو مجموعہ ہمارے سامنے ہے یہ مرور زمانہ کے ساتھ ارتقائی مراحل طے کرتا ہوا اپنی موجودہ شکل میں جلوہ گر ہوا ہے۔ ورنہ قرآن حکیم کی ابتداء میں نازل ہونے والی سورتوں میں بت پرستی کی مخالفت نہیں کی گئی۔ ان کے خیال میں حضور ﷺ نے قرآن میں اللہ کا لفظ کم استعمال کیا، اس کی جگہ کبھی ضمیر استعمال کی، کبھی "ربک" کا لفظ استعمال کیا اور کبھی "رحمٰن" کا لفظ استعمال کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ "اللہ" کا لفظ کفار مکہ کے ہاں بھی استعمال ہوتا تھا اور آپ اپنے دین کے حوالے سے اس کو زیادہ استعمال نہیں کرنا چاہتے تھے۔

اسی نظریے کے مطابق وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مکی قرآن حضرت جبریل امین لے کر نازل نہیں ہوئے کیونکہ مکی قرآن میں ان کے نام کا کہیں ذکر نہیں۔ وہ تو صرف مدنی قرآن لے کر نازل ہوئے کیونکہ مدنی سورتوں میں ان کا نام مذکور ہے۔

ہم یہاں مستشرقین کی تحریروں سے چند اقتباسات نقل کرتے ہیں جن سے قارئین کرام یہ اندازہ کر سکیں گے کہ کس طرح مستشرقین نے قرآن حکیم کی نزولی تاریخ کو اسلام

1۔ سورۃ الصف: 9

کے خلاف استعمال کیا ہے اور کس طرح وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ قرآنی پیغام میں وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق ردوبدل ہوتا رہا اور حضور ﷺ کو جب کسی مشکل صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تو آپ نے اس مشکل سے نکلنے کے لئے پہلے نازل ہونے والی آیات کے برعکس ایک نئی آیت پیش کر دی۔

جارج سیل کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔ وہ کہتا ہے:

"اس کے علاوہ قرآن کی کئی آیات عارضی ہیں اور کسی مخصوص واقعہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ کیونکہ جب بھی کوئی ایسا واقعہ پیش آتا جو محمد (ﷺ) کو الجھا دیا پریشانی میں مبتلا کر دیتا اور اس سے نکلنے کی کوئی صورت ممکن نہ ہوتی تو محمد (ﷺ) ہمیشہ نئی وحی کا سہارا لیتے۔ جو اس قسم کی صورت حال سے نکلنے کا قابل اعتماد اور معصوم ذریعہ تھا اور انہوں نے دیکھا کہ اس طریقہ کار کی کامیابی ان کی توقعات کے مطابق ہے۔ یقیناً یہ محمد (ﷺ) کا قابل تعریف اور سیاسی اختراع تھا کہ آپ سارے قرآن کو بیک وقت صرف پہلے آسمان تک لائے لیکن زمین پر نہیں لائے، جیسے کہ کوئی ناتجربہ کار پیغمبر ضرور کرتا۔ کیونکہ اگر سارا قرآن بیک وقت نازل ہوتا تو بہت سارے اعتراضات پیدا ہوتے جن کا جواب محمد (ﷺ) کے لئے ناممکن نہیں تو کم از کم مشکل ضرور ہوتا۔ لیکن انہوں نے ظاہر یہ کیا کہ ان پر قرآن مختصر حصوں میں نازل ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کی ہدایت کے لئے مناسب سمجھتا ہے۔ اس طرح ان کے لئے تمام ہنگامی حالات سے نمٹنے اور مشکلات سے نکلنے کا بہترین ذریعہ موجود تھا۔" (1)

جارج سیل یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں۔ حضور ﷺ نے اپنے دعویٰ نبوت کو سچا ثابت کرنے کے لئے قرآن لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ طریقہ کار یہ تھا کہ جب کوئی مسئلہ در پیش آتا تو آپ اس کے مطابق کوئی آیت پیش کر دیتے۔ پھر جب کوئی نئی صورت حال پیش آتی تو اس سے نمٹنے کے لئے آپ کوئی نئی وحی پیش کر دیتے۔

مستشرق مذکور یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ قرآن کے بیک وقت نازل نہ ہونے کا مقصد یہ تھا کہ اس صورت میں قرآن کو ہنگامی حالات سے نکلنے کے لئے استعمال نہ کیا جا سکتا تھا۔

1۔ "The Koran"، صفحہ 50

حیرت ہے کہ جارج سیل اور اسکے ہم نوا ایک طرف تو یہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے قرآن حکیم کا علم یہود و نصاریٰ سے حاصل کیا تھا اور یہاں وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ جب صورت حال تقاضا کرتی تو آپ خود قرآن کی آیات بنالیتے اور کہتے کہ یہ آسمان سے وحی آئی ہے۔

جارج سیل صاحب ذرا بتائیں کہ جب اس قسم کی صورت حال پیش آتی تھی تو کیا حضور ﷺ اس کا حل پوچھنے کے لئے کسی ایسے آدمی کے پاس تشریف لے جاتے تھے جو سابقہ الہامی کتب کا عالم ہو۔؟ اگر ایسا ہوتا تو سب لوگوں کو اس کا علم ہوتا اور آپ پیش آمدہ مشکل سے نکلنے کے بجائے زیادہ پریشانی میں مبتلا ہو جاتے۔

کیا حضور ﷺ نے آئندہ تیئس سال کے عرصہ میں پیش آنے والی تمام مشکلات کے جوابات یہودیوں، عیسائیوں اور دوسرے لوگوں سے پوچھ کر اپنے پاس محفوظ کر رکھے تھے کہ جب بھی ایسی صورت حال پیش آئے، مختلف مصادر سے حاصل کیا ہوا وہ جواب لوگوں کے سامنے پیش کیا جا سکے؟ کیا حضور ﷺ نے مختلف مصادر سے حاصل ہونے والی ان معلومات کو کسی کتاب کی شکل میں اپنے پاس جمع کر رکھا تھا اور حسب ضرورت وہاں سے آیت نکال کر لوگوں کو سنا دیتے تھے۔؟

لیکن مستشرقین تو یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور سے پہلے قرآن کتابی شکل میں موجود ہی نہ تھا، اس لئے وہ حضور ﷺ کے پاس کتاب کی شکل میں قرآن حکیم کی موجودگی کا تصور کیسے کر سکتے ہیں۔

یوں لگتا ہے جیسے جارج سیل صاحب یہ ماننے کے لئے تو تیار نہیں کہ قرآن آسمان سے نازل ہوا، لیکن اپنے اعتراض میں قوت پیدا کرنے کے لئے وہ یہ تسلیم کرنے پر تیار نظر آتے ہیں کہ حضور ﷺ وقت پڑنے پر پہلے آسمان پر موجود قرآن حکیم سے مطلوبہ آیات لے لیا کرتے تھے۔ اگر جارج سیل صاحب کے اقتباس سے یہ تاثر لینا صحیح نہیں تو پھر یہ سوال اٹھ کھڑا ہوگا کہ اس قسم کی ہنگامی صورت حال میں جو آیات نازل ہوتی تھیں وہ آپ کو کون سکھاتا تھا۔ یہی وہ سوال ہے جس کے جواب کے لئے جارج سیل اور اس کے ہم مشرب مستشرقین نے کئی مفروضے گھڑے ہیں۔

سچ ہے "جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے"۔ جارج سیل نے ان آیات کی نشاندہی نہیں کی جن کو وہ عارضی اور وقتی ضرورتوں کا جواب قرار دیتے ہیں۔ اگر وہ اس قسم کی آیات کی

نشاندہی کرتے تو ہم ضرور ان کو دکھاتے کہ کس طرح وہ آیات، جن کو وہ عارضی سمجھتے ہیں، چودہ سو سال سے کروڑوں انسانوں کی راہنمائی کا فریضہ سرانجام دے رہی ہیں اور ہر دور میں ان کی اہمیت ایک نئی شان سے ظاہر ہوتی ہے۔

جارج سیل صاحب جو کچھ کہہ رہے ہیں اگر وہ سچ ہوتا تو حضور ﷺ کے گرد پیروکاروں کا جو ہجوم تھا وہ چھٹ جاتا۔ مستشرقین کو معلوم ہے کہ ان لوگوں میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جیسے دیدہ بینا رکھنے والے لوگ تھے جن کی بصیرت پورے علاقے میں مشہور تھی۔ ان میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے جری لوگ تھے، جن کے بارے میں مداہنت کا گمان کرنا تاریخ کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔ حضور ﷺ کی جو بات کئی صدیاں بعد جارج سیل پر ظاہر ہوگئی ہے وہ حضرت عثمان غنی اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما جیسے ذہین لوگوں کی نظروں سے کیسے پوشیدہ رہی؟

ساری گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ مستشرقین کے یہ سارے وسوسے جھوٹے ہیں اور قرآن حکیم کا یہ ارشاد سچا ہے:

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ۝ (1)

"بلکہ انہوں نے جھٹلایا اس چیز کو جسے وہ پوری طرح نہ جان سکے اور نہیں آیا ان کے پاس اس کا انجام۔ اسی طرح (بے علمی سے) جھٹلایا انہوں نے جو ان سے پہلے تھے۔ پھر دیکھ کیسا انجام ہوا ظالموں کا۔"

منٹگمری واٹ نے اپنے مخصوص انداز میں دوست بن کر اسلام پر حملہ کیا ہے۔ وہ آغاز وحی پر بحث کرتے ہوئے ان احادیث کی طرف اشارہ کرتا ہے جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضور ﷺ کو آغاز وحی کے وقت سچے خواب دکھائی دیتے تھے۔ پھر اس نے حضور ﷺ کے جبریل امین کو دیکھنے کا ذکر کیا۔ پھر اس نے سورہ نجم اور سورہ تکویر کی ان آیات کی طرف اشارہ کیا جن میں رویت کا ذکر ہے۔ پھر یہ مستشرق ان تمام آیات اور احادیث کے مفہوم کو جمع کر کے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ حضور ﷺ نے اللہ کو دیکھا۔ اور اس کی دلیل یہ دیتا ہے کہ فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى (2) میں عبد کا ذکر ہے اور یہ عبد جبریل کا نہیں بلکہ خدا کا ہی

1۔ سورہ یونس: 39
2۔ سورۃ النجم: 10

ہو سکتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ حضور ﷺ نے خدا کو دیکھا تھا جبریل کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ اکثر مسلمان مفسرین بھی اس قول کو پسند کرتے ہیں۔

بظاہر منٹگمری واٹ مسلمانوں کا بڑا ہمدرد بن رہا ہے اور ظاہر یہ کر رہا ہے کہ وہ حضور ﷺ کے لئے رویت باری ثابت کر رہا ہے لیکن حقیقت میں وہ ثابت یہ کر رہا ہے کہ نزول وحی کے سلسلے میں حضور ﷺ نے اپنی احادیث طیبہ میں جہاں جبرائیل کے دیکھنے کا ذکر کیا ہے وہاں در حقیقت آپ نے جبریل کو نہیں بلکہ خدا کو دیکھا تھا۔ ساتھ ہی وہ حضور ﷺ پر یہ بے بنیاد الزام بھی لگاتا ہے کہ آپ ابتدا میں یہی سمجھتے رہے کہ آپ خدا کو دیکھتے ہیں لیکن جب آپ کو معلوم ہوا کہ یہودی رویت باری کو ناممکن سمجھتے ہیں اور خود قرآن بھی کہتا ہے لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ (1) "نہیں گھیر سکتیں اسے نظریں" تو آپ نے اپنا موقف بدل لیا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ آپ نے خدا کو نہیں جبریل کو دیکھا تھا۔ منٹگمری واٹ کے اپنے الفاظ ملاحظہ فرمائیں وہ کہتا ہے:

"Muhammad at least for a time believed he had seen the supreme deity. and presumably still believed this when sura 53 was revealed. Later, especially when he learnt that Jews and Christians held that God cannot be seen. he came to think that the vision had been not of God but of an angel. In 6-113 it is asserted that sight reaches him (God) not. (2)

"محمد (ﷺ) کو کم از کم کچھ عرصہ یہ یقین رہا کہ انہوں نے اللہ کو دیکھا۔ اور شاید ان کا یہ اعتقاد اس وقت تک قائم تھا جب سورۃ نمبر 53 (نجم) نازل ہوئی۔ بعد میں، خصوصاً جب ان کو معلوم ہوا کہ یہودی اور عیسائی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا کو دیکھنا ممکن نہیں، تو انہوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ انہوں نے خدا کو نہیں بلکہ جبریل کو دیکھا تھا۔ سورۃ نمبر 6 کی آیت نمبر 113 میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ نظریں اسے گھیر نہیں سکتیں۔"

1۔ سورۃ الانعام: 103

2۔ "محمد ایٹ مکہ"، صفحہ 56

منٹگمری واٹ اس مفروضے کے ذریعے اسلام کے قصر رفیع کی بنیادیں ہلانا چاہتا ہے۔
مسلمانوں کا ایمان یہ ہے کہ وحی لانے والے فرشتے حضرت جبریل امین تھے اور جب وہ وحی لاتے تو حضور ﷺ ان کو دیکھتے۔ مستشرق مذکور یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ کمی دور میں وحی حضرت جبریل امین علیہ السلام کے ذریعے نہیں آتی تھی بلکہ حضور ﷺ براہ راست اللہ تعالیٰ سے وحی وصول کرتے تھے۔ اپنے اس مفروضے کو ثابت کرنے کے لئے وہ وحی کی مختلف صورتوں کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ کمی دور کی وحی فرشتے کے ذریعے نہیں تھی بلکہ وحی کے دوسرے ذرائع استعمال ہوتے تھے اور خصوصاً یہ کہ حضور اللہ تعالیٰ کو دیکھتے تھے اور وحی براہ راست اللہ تعالیٰ سے وصول کرتے تھے۔ مستشرق مذکور چاہتا ہے کہ اس کا یہ مفروضہ ثابت ہو جانے کے بعد مسلمانوں کا یہ دعویٰ باطل ہو جائے گا کہ سارا قرآن حکیم حضرت جبریل امین کے ذریعے حضور ﷺ کے قلب انور پر اترا تھا۔ اس دعویٰ کے بطلان کے ساتھ رویت خداوندی کو محال ثابت کر کے وحی کے سارے سلسلے کو ہی نا قابل اعتبار ثابت کیا جا سکتا ہے۔

قارئین کرام کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ہم نے اس باب کا نام مستشرقین کے وسوسے کیوں رکھا ہے، اس کا نام مستشرقین کے اعتراضات کیوں نہیں رکھا۔ اعتراض کے لئے علمی بنیاد کی ضرورت ہوتی ہے لیکن وسوسے کے لئے کسی علمی بنیاد کی ضرورت نہیں ہوتی۔

مستشرقین عموماً ہر واقعہ کو تاریخی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور قرآن حکیم کے مختلف بیانات کو تاریخ کی روشنی میں دیکھنے کیلئے انہوں نے خود قرآن حکیم کے نزول کی تاریخ اپنے تخیل کے زور پر مرتب کی ہے۔ لیکن منٹگمری واٹ نے یہاں حضور ﷺ کے رویائے صادقہ، نزول وحی کے وقت حضور ﷺ کے جبریل امین کو دیکھنے اور شب اسریٰ کی رویت کے واقعات کو ایک دوسرے میں گڈمڈ کر کے ان سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ حضور ﷺ نے کسی مافوق الفطرت ہستی کا مشاہدہ کیا۔ آپ کافی عرصہ یہ سمجھتے رہے کہ آپ نے خدا کو دیکھا ہے لیکن جب آپ کو یہود و نصاریٰ سے اس بات کا علم ہوا کہ خدا کو دیکھنا ممکن نہیں تو آپ نے اپنا پہلا موقف بدل لیا اور کہنا شروع کر دیا کہ میں نے جبریل کو دیکھا تھا۔

مستشرق مذکور کی طرف سے یہ اسلام کے خلاف کتنی خطرناک وسوسہ اندازی ہے۔

حضور ﷺ کے عام رویائے صادقہ میں یہ ضروری نہ تھا کہ آپ ہمیشہ کسی مافوق الفطرت ہستی کا مشاہدہ فرماتے۔ ان رویائے صادقہ کی کیفیت تو یہ تھی کہ آپ جو کچھ خواب میں دیکھتے وہ ہو بہو پیش آجاتا اور آپ اس حالت کو حالت بیداری میں اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیتے۔

جن احادیث طیبہ میں وحی لانے والے فرشتے جبریل کو دیکھنے کا ذکر ہے وہاں حضور ﷺ نے ہمیشہ اس بات کی وضاحت فرمائی ہے کہ آپ نے فرشتے کو دیکھا ہے۔ خدا کو دیکھنا کسی روایت میں موجود نہیں اور یہ منٹگمری واٹ نے محض اپنے تخیل کے زور پر ایک مفروضہ گھڑا ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں۔

جہاں تک سورہ نجم کی آیات میں رویت کا تعلق ہے اس میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا تھا یا حضرت جبرائیل علیہ السلام کو۔ یہ اختلاف بعد کے مفسرین میں پیدا نہیں ہوا بلکہ صحابہ کرام کے درمیان بھی اس مسئلے میں اختلاف تھا۔ اگر حضور ﷺ سورہ نجم نازل ہونے کے بعد تک یہ فرماتے رہے ہوتے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے، جیسے کہ منٹگمری واٹ کہہ رہا ہے، اور طویل عرصہ بعد یہ اعلان کرتے کہ نہیں میں نے جبرائیل کو دیکھا تھا، تو اس کے رد عمل کے طور پر مسلمانوں کا آپس میں اجتہادی اختلاف ظاہر نہ ہوتا بلکہ ان کے دلوں میں ایمان کا جو پودا لہلہا رہا تھا وہ جڑوں سے اکھڑ جاتا اور وہ بھی حضور ﷺ کے بارے میں وہی کچھ سوچنے لگتے جو منٹگمری واٹ سوچ رہا ہے۔

جو لوگ حضور ﷺ کے حلقہ عقیدت میں شامل تھے، انہوں نے یوں ہی اسلام قبول نہ کر لیا تھا۔ کوئی بچپن سے آپ کے شب و روز کا مشاہدہ کرتا چلا آرہا تھا۔ کسی نے اسلام کے شجرہ طیبہ کو جڑوں سے اکھیڑ پھینکنے کے لئے اپنی ساری صلاحیتیں صرف کی تھیں اور ناکام ہونے کے بعد اپنی ناکامیوں کا واحد سبب یہ سمجھا تھا کہ جس پودے کو وہ اکھیڑنا چاہتا ہے، اس کی حفاظت وہ ہستی کر رہی ہے جو اس سے زیادہ طاقتور ہے۔ انہوں نے دلیل اور تلوار دونوں ذرائع سے اسلام کو مٹانے کی کوششوں کے بعد ناکام ہو کر اس کی دہلیز پر جبیں فرسائی کی تھی۔

اندھی تقلید ان کے نزدیک کفر تھی۔ یہ سمجھنا ان کے لئے مشکل نہ تھا کہ حضور ﷺ جس ہستی کو کل تک خدا قرار دیتے رہے وہ ہستی یکایک جبریل کیسے بن گئی۔ اگر ان کے نوٹس میں ایسی کوئی بات آئی ہوتی تو حضور ﷺ کی صداقت پر ان کا ایمان متزلزل ہو جاتا۔ ان

کے نوٹس میں اس قسم کی کسی بات کا نہ آنا اس بات کی دلیل ہے کہ انہیں اپنے محبوب راہنما کی زبان پاک سے جو کچھ سننے کو ملتا تھا، اس سے ان کا ایمان متزلزل نہیں بلکہ مزید تازہ اور قوی ہو جاتا تھا۔ اور اپنے پیارے دین کی اشاعت اور اپنے محبوب راہنما کی ناموس کی حفاظت کے لئے کٹ مرنے کا جذبہ ان کے دلوں میں جوان ہو جاتا تھا۔ اس لئے منٹگمری واٹ جو کچھ کہہ رہاہے، وہ اس کے مریض دل کی آواز ہے۔ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی اس کی اس قسم کی وسوسہ اندازیوں سے اسلام کو کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

منٹگمری واٹ کا یہ کہنا کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کا ذکر مکی قرآن میں کہیں نہیں، یہ ایسا ہی ہے کہ جان میجر (1) (John Major) کسی تقریب میں شریک ہو۔ سٹیج سیکرٹری اعلان کرے کہ جناب وزیر اعظم تشریف لائے ہیں اور وہ تقریر کریں گے۔ وزیر اعظم تقریر کریں اور تقریب کے اختتام تک تقریب میں موجود رہیں۔ لیکن دوسرے دن برطانیہ کے اخبارات یہ سرخی لگائیں کہ "جان میجر" نے اتنی اہم تقریب میں شرکت نہیں کی اور دلیل یہ دیں کہ انہوں نے سٹیج سیکرٹری کی زبان سے جان میجر کا نام نہیں سنا۔

ہم اس بات کی داد دیتے ہیں کہ جناب "واٹ" نے سارے قرآن حکیم کو امعان نظر سے دیکھا اور اس حقیقت کو دریافت کیا کہ جبریل کا لفظ ان سورتوں میں نہیں جو مکہ میں نازل ہوئیں۔ لیکن کیا مستشرق مذکور نے یہ آیہ کریمہ نہیں دیکھی۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِیْمٍۙ ذِیْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِیْنٍۙ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِیْنٍؕ (2)

"یہ (قرآن) ایک معزز قاصد کا (لایا ہوا) قول ہے۔ جو قوت والا ہے۔ مالک عرش کے ہاں عزت والا ہے۔ (سب فرشتوں کا) سردار اور وہاں کا امین ہے۔"

اور کیا یہ آیت کریمہ مسٹر منٹگمری واٹ صاحب کی نظر سے نہیں گزری۔

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ (3)

"فرمائیے: نازل کیا ہے اسے روح القدس نے آپ کے رب کی طرف

1۔ 1996ء میں برطانیہ کا وزیر اعظم
2۔ سورۃ التکویر: 21-19
3۔ سورۃ النحل: 102

سے حق کے ساتھ۔"

یا کیا مسٹر منٹگمری واٹ نے قرآن حکیم کی اس آیت کریمہ پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی:

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ (1)

"اترا ہے اسے لے کر روح الامین (یعنی جبریل) آپ کے قلب (منیر) پر تاکہ بن جائیں آپ (لوگوں کو) ڈرانے والوں سے۔"

سورۃ تکویر، سورۃ النحل اور سورۃ الشعراء تینوں مکی سورتیں ہیں۔ ان سورتوں میں وحی لانے والے کو، الرسول الکریم، روح القدس اور روح الامین کہا گیا ہے۔ اور علمائے امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ تمام حضرت جبریل امین کے القاب ہیں (2)۔ اور امت مسلمہ کے علماء مفسرین قرآن حکیم کے مفاہیم و مطالب کو جناب "واٹ" کی نسبت زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔

منٹگمری واٹ سارے قرآن حکیم کے حضرت جبریل امین کے ذریعے نازل ہونے کے تصور کو متاخر مسلمانوں کی اختراع کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ قرآن میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں کہ سارا قرآن حکیم حضرت جبریل امین کے ذریعے نازل ہوا۔ مسٹر واٹ کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے۔

"After the third manner, with Gabriel as the messenger, was taken to be the normal or standard one, Muslim scholars tended to read this back into early passages where the manner was probably different. In the Meccan period, however, messengers other than Gabriel were spoken of. Sometimes there is mention of the spirit, by itself......... When this last was accepted as normal by later Muslims, the spirit was identified with Gabriel. though there is no direct evidence for this in the Quran." (3)

"بعد میں جب وحی کا تیسرا طریقہ، جس میں جبرائیل کو وحی لانے والا فرشتہ تسلیم کیا گیا ہے، قرآن کے نزول کا تسلیم شدہ طریقہ قرار پا گیا تو

1۔ سورۃ الشعراء: 4-193

2۔ دکتور عبدالعظیم ابراہیم محمد المطعنی "افتراءات المستشرقین علی الاسلام"، (مکتبہ قاہرہ۔ 1992)، صفحہ 12

3۔ "محمد ایٹ مکہ"، صفحہ 63

مسلمان علماء نے اس طریقے کو قرآن کے ابتدا میں نازل ہونے والے حصے پر بھی لاگو کرنے کی کوشش کی، جس کے نزول کا ذریعہ غالباً مختلف تھا۔ مکی سورتوں میں جبریل کے علاوہ دیگر فرشتوں کا ذکر ملتا ہے۔ کئی مقامات پر خود "روح" کو جبریل قرار دے دیا گیا حالانکہ قرآن میں اس کی کوئی براہ راست شہادت موجود نہیں۔

منٹگمری واٹ صاحب یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ مکی قرآن کے نزول کو جبریل امین کی طرف منسوب کرنا اور روح یا روح القدس کو جبریل قرار دینا متاخر مسلمانوں کی اختراع ہے، حالانکہ ابتدا میں یہ تصور نہ تھا اور نہ ہی قرآن میں اس کا کوئی ذکر ہے۔

منٹگمری واٹ نے جس طرح قرآن حکیم پر تبصرے کیے ہیں، اس سے اس بات میں شک نہیں رہتا کہ انہوں نے سارے قرآن حکیم کا امعان نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ ورنہ وہ یہ نہ کہہ سکتے کہ مکی قرآن میں جبریل امین کا کہیں ذکر نہیں اور وہ یہ دعویٰ نہ کر سکتے کہ قرآن میں کہیں اس بات کا ذکر نہیں کہ سارا قرآن جبریل امین کے ذریعے نازل ہوا۔

مستشرقین کا طریقہ واردات یہ ہے کہ جو بات ان کے مطلب کی ہو وہ رائی کے دانے کے برابر بھی ہو تو ان کی نظروں سے او جھل نہیں رہ سکتی۔ لیکن جو بات ان کے مطلب کی نہ ہو وہ پہاڑ کے حجم کی ہو تو بھی ان کی نظر التفات کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتی۔

اگر منٹگمری واٹ اپنی آنکھوں سے حسد کی عینک اتار دیتے تو ان کو قرآن حکیم میں یہ آیت نظر آجاتی:

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَإِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللّٰهِ (1)

"آپ فرمائیے: جو دشمن ہو جبریل کا (اسے معلوم ہونا چاہئے) کہ اس نے اتارا قرآن آپ کے دل پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے۔"

یہ آیۂ کریمہ سورہ بقرہ کی ہے جو مدنی ہے لیکن یہ آیت اعلان کر رہی ہے کہ سارا قرآن خواہ مکی ہو خواہ مدنی وہ جبریل امین لے کر نازل ہوئے۔

جب یہاں حضرت جبریل امین کا نام لے کر وضاحت کر دی گئی کہ سارا قرآن حکیم لے کر وہ نازل ہوئے تو یہ بات واضح ہو گئی کہ جن آیات میں نزول قرآن کی نسبت روح

1۔ سورۃ البقرۃ 97

القدس، الرسول الامین یا الرسول الکریم کی طرف کی گئی ہے وہاں یہ سب نام حضرت جبریل امین علیہ السلام کے القاب کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔

دراصل منٹگمری واٹ صاحب قرآن حکیم کو عقیدۂ تثلیث کی عینک لگا کر دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی تثلیث میں روح القدس (Holy Spirit) کو جس مفہوم میں استعمال کرنے کے عادی ہیں، وہ قرآن حکیم کے روح القدس اور الروح الامین کو بھی اسی مفہوم میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن جس طرح اسلام کی خالص توحید اور نصرانیت کی تثلیث زدہ توحید میں کوئی مناسبت نہیں ہے، اسی طرح اسلام کے روح القدس اور نصرانیت کے Holy Spirit میں بھی کوئی مناسبت نہیں۔

اگر مسٹر واٹ صاحب تثلیث اور حسد کی عینک اتار دیتے تو ان کو حق روز روشن کی طرح واضح نظر آجاتا۔ لیکن وہ حق کا رخ زیبا دیکھنے کے متمنی ہی نہیں۔ وہ تو اسلام کے خلاف اپنے سینے میں بھڑکنے والی حسد، بغض اور کینے کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے اس قسم کی باتیں لکھتے ہیں۔

قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚۖ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ [1]

"ظاہر ہو چکا ہے بغض ان کے مونہوں (یعنی زبانوں) سے اور جو چھپا رکھا ہے ان کے سینوں نے وہ اس سے بھی بڑا ہے۔"

مستشرقین نے نظریہ ارتقاء کو جس طرح قرآن حکیم کے خلاف استعمال کیا اس کی چند مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں۔ ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ مستشرقین یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ آج اسلام کے جو عقائد، اعمال بلکہ تاریخ ہمارے سامنے ہیں، یہ ابتدا سے نہیں ہیں بلکہ آج مسلمان جو عقیدے رکھتے ہیں وہ اسلام کے ارتقائی عمل سے گزرنے کے بعد کے عقائد ہیں جن میں زمانے کے بدلنے کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں آتی رہی ہیں۔

اسلام پر یہ مہلک وار کرنے کے لئے وہ "رچرڈ بیل" اور "نولڈکے" وغیرہ کی قرآن حکیم کی نزولی ترتیب پر بھروسہ کرتے ہیں حالانکہ وہ ترتیب ان لوگوں کے تخیل کی اختراع سے زیادہ کچھ نہیں جن کے سینوں میں اسلام کے خلاف عداوت اور حسد کی آگ بھڑک رہی ہے۔ جن لوگوں کے سینوں میں اسلام کا بغض اس حد تک پہنچ چکا ہے، ان سے اسلام

1۔ سورۃ آل عمران: 118

کے متعلق کوئی بات غیر جانبدارانہ یا معروضی انداز میں لکھنے کی توقع رکھنا خود فریبی ہے۔
شرک کی مخالفت اور توحید کا پرچار اسلامی تحریک کا پہلا نکتہ ہے۔ قرآن حکیم شرک کی مخالفت اور توحید کے اعلانات سے بھرا پڑا ہے۔ صفحے صفحے اور سطر سطر پر لوگوں کی توجہ انفس و آفاق میں پھیلی ہوئی قدرت خداوندی کی نشانیوں کی طرف مبذول کروا کے ان کو یہ بتایا گیا ہے کہ اگر کائنات ارضی و سماوی کی ہر شے کا خالق و مالک صرف اللہ ہے تو پھر اس کے سوا کوئی دوسرا خدا کیسے ہو سکتا ہے۔ لیکن مستشرقین کے تخیل کی جولانیوں کا مشاہدہ کیجئے کہ انہوں نے قرآن حکیم کی جو ترتیب نزولی خود گھڑ رکھی ہے، اس کے پیش نظر وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن کی ابتدا میں نازل ہونے والی آیات میں نہ تو خدا کے واحد ہونے کا تصور موجود ہے اور نہ ہی ان میں بت پرستی کی کہیں مخالفت کی گئی ہے۔ توحید کا اثبات اور شرک کی نفی تو ایسے تصورات ہیں جو اسلام نے اس وقت اپنائے جب وہ ارتقائی مراحل سے گزر کر کمال تک پہنچ چکا تھا۔

اپنے اس قسم کے تصورات کو لوگوں کے ذہنوں میں بٹھانے کے لئے مستشرق منٹگمری واٹ پہلے یہ شوشہ چھوڑتا ہے:

"محمد ﷺ کی زندگی کے آخری سالوں میں حالات اتنے بدل چکے تھے کہ لوگوں کو یہ یاد نہ تھا کہ اسلام کا آغاز کس طرح ہوا تھا۔ مسلمان قرآن کی جن آیتوں کو اولین آیات قرار دیتے ہیں ممکن ہے ان سے پہلے بھی کچھ آیات نازل ہوئی ہوں اور ہمارا اندازہ یہ ہے کہ قرآن کی کچھ آیات جو سب سے پہلے نازل ہوئیں، ان کو مٹا دیا گیا ہے۔" (1)

مستشرقین جو کچھ کہتے ہیں انہیں اس کیلئے کوئی مضبوط بنیاد تلاش کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی، ورنہ منٹگمری واٹ یہ بات نہ لکھ سکتا۔ مسلمان چودہ سو سال کے عرصہ میں جن چیزوں کو نہیں بھولے، ان کے بارے میں "واٹ" صاحب فرما رہے ہیں کہ انہیں مسلمان بیس سال کے عرصے میں بھول گئے تھے۔ مستشرق مذکور حضور ﷺ پر نازل ہونے والی وحی کی کیفیات کو فراموش کرنے کا الزام ان نفوس قدسیہ پر لگا رہا ہے جو حضور ﷺ کے وضو کے پانی اور آپ کے لعاب دہن کو زمین پر نہیں گرنے دیتے تھے۔ جو لوگ حضور ﷺ کے بالوں کو اپنے پاس بطور تبرک رکھنے کو اپنے لئے سعادت عظمیٰ سمجھتے تھے،

1۔ محمد: پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین، صفحہ 20

ان سے یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ کے دور نبوت کے ابتدائی ایام کو فراموش کر دیا تھا۔

مسٹر واٹ جانتے ہیں کہ وہ عرب ہزاروں اشعار پر مشتمل کئی کئی قصائد کو اپنے سینوں میں محفوظ رکھتے تھے اور انہیں اپنے حافظے پر اتنا اعتماد تھا جتنا شاید مسٹر واٹ کو اپنی تحریروں پر بھی نہ ہو۔

حضور ﷺ کی حیات طیبہ کے آخر میں مسلمان، اسلام کے آغاز کے متعلق جن حقائق کو بھول گئے تھے، وہ مسٹر واٹ اور اس کے ہمنواؤں کے سراغ رساں تخیل سے نہیں بچ سکے۔ مسٹر واٹ اسلام کے آغاز کے متعلق فراموش شدہ حقائق سے پردہ اٹھاتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ہمارا اسلام کے بارے میں پہلے سے قائم کردہ تصور یہ ہے کہ خدا کی قدرت اور رحمت و رافت کے تصور کو نزول قرآن کی ابتدا ہی سے اہم حیثیت حاصل رہی ہے لیکن یہ بات حقیقت کے خلاف ہے۔ ہمارا یہ تصور اسلام کے اس متاخر اور ترقی یافتہ اصول سے تشکیل پذیر ہوا ہے کہ اللہ ایک ہے اور بت کچھ بھی نہیں ہیں۔ دوسرے الفاظ میں محمد (ﷺ) کا ابتدائی پیغام بت پرستی کے خلاف نہیں تھا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ابتدائی اسلام کے مخاطب وہ لوگ تھے جن کے ہاں خدا کا مبہم سا تصور پہلے سے موجود تھا۔"(1)

منٹگمری واٹ اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اپنی کتاب "محمد ایٹ مکہ" میں لکھتے ہیں:

"مزید برآں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ قرآن کی پہلے نازل ہونے والی آیات میں اس بات پر بالکل زور نہیں دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے۔ ممکن ہے کہ محمد (ﷺ) کا عقیدہ بھی کسی حد تک وہی ہو جو ان کے ہم عصروں کا تھا کہ اللہ تعالیٰ بڑا خدا ہے جس کے سامنے دوسری چیزیں شفاعت کر سکتی ہیں۔ یہ تو ممکن نہیں ہے کہ محمد (ﷺ) اس قسم کی چیزوں کو جھوٹے خدا سمجھتے ہوں لیکن یہ ممکن ہے کہ وہ ان چیزوں کو فرشتے سمجھتے ہوں۔ ایک بڑی عجیب چیز جس کا یہاں ذکر مناسب ہوگا، وہ یہ ہے کہ قرآن کی ابتدائی آیات میں اللہ کا لفظ بہت کم

1۔ محمد: پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین، صفحہ 20

استعمال ہوا ہے۔ بلیشیر (Blachere) کی ترتیب کے مطابق پہلی تیس سورتوں میں اللہ کا لفظ تسمیہ کے علاوہ صرف دس سورتوں میں استعمال ہوا ہے۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ اللہ کا لفظ جن آیات میں استعمال ہوا ہے وہ متعلقہ سورتوں کی باقی آیات کی نسبت متاخر تھیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ لفظ اللہ والی آیات جامعین قرآن نے بعد میں سورتوں کے آخر میں ملا دی ہوں۔ اس کے برعکس "ربک، ربھم یا ربکم کے الفاظ بیس سورتوں میں استعمال ہوئے ہیں اور ہر سورت میں کئی کئی بار مستعمل ہیں۔ اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ محمد (ﷺ) کے دینی تجربے میں مرکزی حیثیت ان خوابوں کو حاصل تھی جن کا ذکر سورۃ نمبر53 (سورۃ النجم) میں ہے جن کے مطابق انہوں نے جس ذات کو دیکھا تھا وہ "رب" کی ذات تھی "اللہ" کی ذات نہیں تھی، جس کا تصور عام مکہ والوں کے ذہنوں میں تھا۔ مشرکین کا اللہ کو تسلیم کرنا موحدوں کے لئے مسائل پیدا کر سکتا تھا۔ البتہ آہستہ آہستہ محمد (ﷺ) کو یقین ہو گیا کہ "رب" جس کا انہوں نے مشاہدہ کیا ہے، وہ وہی اللہ ہے جس پر عیسائی یہودی اور دوسرے ایمان رکھتے ہیں اور جو خدائے یکتا ہے۔"(1)

منٹگمری واٹ "رب" اور "اللہ" کو دو علیحدہ علیحدہ ذاتیں قرار دینے کے وسوسے کو فلسفیانہ انداز میں آگے بڑھاتا ہے۔ وہ ان سورتوں کا ذکر کرتا ہے جن میں خدا کی توحید کا بیان ہے اور جو ان کے حساب سے ابتدائی سورتوں میں سے ہیں۔ وہ پہلے سورہ اخلاص لکھتا ہے اور پھر سورہ مزمل کی یہ آیات لکھتا ہے:

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ۝ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا ۝(2)

"اور ذکر کیا کرو اپنے رب کے نام کا اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو رہو۔ مالک ہے شرق و غرب کا۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس بنائے رکھئے اسی کو اپنا کارساز۔"

پھر منٹگمری واٹ اس آیت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

1۔ "محمد ایٹ مکہ"، صفحہ 87

2۔ سورۃ المزمل: 8-9

"یہ بڑی عجیب بات ہے کہ اس اصولی بات کے بیان کے اصل الفاظ میں لفظ "اللہ" کے استعمال سے گریز کار جحان نظر آتا ہے۔ "متاخر کلمہ شہادت" میں جو ترکیب استعمال ہوئی ہے (یعنی لا الہ الا اللہ) وہ پورے قرآن میں صرف دو مرتبہ استعمال ہوئی ہے جبکہ اس کے برعکس "لا الہ الا ھو" کی ترکیب قرآن میں تیس مرتبہ استعمال ہوئی ہے۔ گویہ بات مسلم ہے کہ یہ ترکیب جن مقامات پر استعمال ہوئی ان مقامات میں سے اکثر کی ابتدا میں "اللہ" کا لفظ بھی موجود ہے یعنی "اللہ لا الہ الا ھو" کی ترکیب استعمال ہوئی ہے۔

ایک اور حیران کن حقیقت جس کا "اللہ" کے لفظ کے استعمال سے گریز کے ساتھ گہرا تعلق نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک وقت ایسا بھی تھا جب "رحمٰن" کا لفظ "اللہ" کے لفظ کی جگہ لے رہا تھا۔ تسمیہ کے علاوہ "الرحمٰن" کا لفظ قرآن حکیم میں پچاس مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ لیکن ان میں سے چالیس مرتبہ یہ لفظ ان سورتوں میں استعمال ہوا ہے جو "بلیشر" کی ترتیب کے مطابق مکی دور کے دوسرے حصے سے تعلق رکھتی ہیں۔ کیا یہ رجحان ان مشکلات کا نتیجہ ہے جو خدا تعالیٰ کے لئے "اللہ" کا نام استعمال کرنے سے پیدا ہو رہی تھیں؟" (1)

منٹگمری واٹ صاحب مندرجہ بالا اقتباسات میں جو وسوسہ پیدا کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں ممکن ہے وہ کئی لوگوں کی سمجھ میں نہ آیا ہو کیونکہ وسوسہ ڈالنے والے کا مقصد کچھ سمجھانا نہیں ہوتا بلکہ اس کا مقصد ذہنوں اور دلوں میں قرار پذیر خیالات اور عقائد کو متزلزل کرنا ہوتا ہے۔

مستشرق مذکور مندرجہ بالا عبارتوں میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ خالق کائنات کا نام "اللہ"، عربوں میں طلوع اسلام سے پہلے متعارف تھا لیکن ان کے ہاں توحید کا تصور نہ تھا۔ عربوں کا عقیدہ یہ تھا کہ بے شمار خدا ہیں جن میں سے "اللہ" سب سے بڑا ہے۔ اسلام چونکہ توحید کا دین تھا اس لئے حضور ﷺ اپنے دین توحید میں خدائے واحد کے لئے وہ نام استعمال نہیں کرنا چاہتے تھے جو نام مشرکانہ ماحول میں متعارف تھا۔ اس لئے آپ نے "اللہ" کی جگہ کبھی "ربک"، کبھی "ربکم"، کبھی ربہ اور کبھی "ربھم" وغیرہ کے الفاظ استعمال

1۔ "محمد ایٹ مکہ"، صفحہ 93

گئے۔ اور ایک وقت ایسا بھی آیا جب "اللہ" کی جگہ "الرحمٰن" کالفظ استعمال ہونے لگا۔

اس ساری وسوسہ اندازی کا مقصد یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھیں کہ قرآن خدا کا کلام نہیں بلکہ یہ محمد ﷺ کے ذہن کا اختراع ہے۔ چونکہ انسانی ذہن ماحول سے متاثر ہوتا ہے اور کسی صورت میں بھی اپنے اردگرد پیش آنے والے حالات سے چشم پوشی نہیں کر سکتا، اس لئے محمد ﷺ جو انسان تھے ان کے کلام کا حالات اور ماحول سے متاثر ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ حضور ﷺ کا جس قوم سے واسطہ تھا ان میں توحید کا ایک غیر واضح سا تصور پہلے سے موجود تھا اس لئے آپ نے ابتداء میں نہ تو خدا کی توحید کو پر زور انداز میں بیان کرنے کی ضرورت محسوس کی اور نہ ہی بت پرستی کی مخالفت کو کوئی اہمیت دی۔

یہ مستشرقین ہی کا کمال ہے کہ انہوں نے ایک ایسی کتاب، جس کا مرکزی خیال ہی توحید کا اثبات اور شرک کی نفی ہے، اسے اپنے تخیل کے زور سے توحید سے بے نیاز اور بت پرستی کے قریب ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے قرآن حکیم کی ان بے شمار آیات کو نظر انداز کر دیا جو توحید کا اعلان اور بت پرستی کا قلع قمع کر رہی ہیں۔ حضور ﷺ کی سینکڑوں احادیث جو شرک و بت پرستی کے خلاف اور توحید کے حق میں ہیں، وہ بھی مستشرقین کی توجہ کو اپنی طرف مبذول نہیں کرا سکیں۔ تاریخ کے وہ صفحات جو یہ بتا رہے ہیں کہ حضور ﷺ کے خلاف سارا مکہ اس لئے اٹھ کھڑا ہوا تھا کہ آپ نے ان کے بتوں کے خلاف آواز اٹھائی تھی، وہ بھی مستشرقین کو نظر نہیں آتے۔ لیکن صدیوں بعد کے چند مستشرقین نے اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لئے نزول قرآن کی جو ترتیب لکھی ہے وہ انہیں صحف سماوی سے بھی زیادہ مستند نظر آتی ہے۔ اور اس جعلی ترتیب کے بھروسے پر وہ اسلام کے تمام زریں اصولوں کو بعد کے اضافے قرار دیتے ہیں اور ابتدائی قرآن کو توحید کے تصور سے خالی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

انہیں ابتدائی قرآن میں نہ بتوں کی مخالفت نظر آتی ہے۔ نہ انہیں وہاں کثرت سے اللہ تعالیٰ کے اسم ذات کا استعمال نظر آتا ہے۔ "رب" اور "رحمٰن" کے الفاظ کا استعمال انہیں کھٹکتا ہے اور انہیں ان الفاظ کے استعمال کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ حضور ﷺ بعض مشکلات کے پیش نظر لفظ "اللہ" کا عام استعمال خلاف مصلحت سمجھتے تھے اس لئے اس لفظ کی جگہ دوسرے الفاظ استعمال کرتے تھے۔

منٹگمری واٹ ایک مشہور مصنف ہے۔ یہ شخص یقیناً ادبی ذوق سے محروم نہیں ہو گا۔ لیکن براہو حسد اور تعصب کا کہ اس نے یورپ کے ایک مشہور ادیب اور فلکار کے قلم سے ایک ایسی بات نکلوادی ہے جو ہر اس شخص کے جذبات کو مجروح کرتی ہے جس کو ادب کے ذوق لطیف میں سے معمولی ساحصہ بھی ملا ہو۔

وہ "اللہ لا الہ الا ھو" کو بھی "اللہ لا الہ الا اللہ" کی شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ قرآنی جملوں میں ضمائر کے استعمال پر چیں بجبیں ہیں اور بضد ہیں کہ جملے میں ہر جگہ ضمیر کے بجائے اسم ظاہر استعمال ہو تا کہ اسم ظاہر کے استعمال سے گریز کا کوئی شائبہ نظر نہ آئے۔

منٹگمری واٹ کے اس طرز عمل کے جواب میں ہم اس کے سوا کیا کہہ سکتے ہیں۔

ع ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے

منٹگمری واٹ کو "رب" اور "الرحمٰن" کے الفاظ کا استعمال بھی مشتبہ نظر آرہا ہے۔ اور وہ ان الفاظ کے استعمال کو بھی لفظ "اللہ" کے استعمال سے بچنے کا وسیلہ قرار دے رہے ہیں۔

اگر مسٹر واٹ نے اپنی تحقیق کی بنیاد قرآن حکیم کو ہی بنایا ہوتا تو یقیناً انہیں قرآن حکیم میں یہ آیات کریمہ نظر آجاتیں۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (1)

"اللہ (وہ ہے کہ) کوئی عبادت کے لائق نہیں بغیر اس کے۔ اس کے لئے بڑے خوبصورت نام ہیں۔"

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (2)

"اور اللہ ہی کے لئے ہیں نام اچھے اچھے۔ سو پکارو اسے ان ناموں سے اور چھوڑ دو انہیں جو کج روی کرتے ہیں اس کے ناموں میں۔ انہیں سزا دی جائے گی جو کچھ وہ کیا کرتے تھے۔"

منٹگمری واٹ سے پہلے بھی ایک دشمن اسلام تھا جس کا نام ابو جہل تھا۔ اس نے بھی "اللہ" اور "الرحمٰن" کو علیحدہ علیحدہ ذاتیں قرار دیا تھا۔ اس نے حضور ﷺ کے "یا اللہ" اور

1۔ سورۂ طٰہٰ: 8

2۔ سورۃ الاعراف: 180

"یارحمٰن" کا ورد کرنے پر اعتراض کیا (1) تو اس کے اعتراض کا جواب رب قدوس نے خود ان الفاظ میں دیا:

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی (2)

"آپ فرمایئے: "یااللہ" کہہ کر پکار و یا، "یارحمٰن" کہہ کر پکارو۔ جس نام سے اسے پکارو اس کے سارے نام ہی اچھے ہیں۔"

منٹگمری واٹ صاحب کی خدمت میں گزارش ہے کہ یہ آیت سورۃ بنی اسرائیل کی ہے جو مکی ہے۔ ابو جہل نے بھی حضور ﷺ کو مکہ میں ہی "یااللہ" اور "یارحمٰن" کا ورد کرتے سنا ہوگا کیونکہ اسے مدینہ میں حضور ﷺ کو دیکھنا نصیب ہی نہیں ہوا۔

جب ایک مکی سورۃ میں اللہ تعالیٰ اعلان فرمارہا ہے کہ اس کے اسمائے حسنیٰ میں سے جس کے ساتھ بھی اسے پکارو وہی صحیح ہے تو مکی دور کی اس آیت کے بعد نہیں اللہ، رحمٰن، رب وغیرہ اسمائے حسنیٰ میں یہ فرق کیوں نظر آتا ہے؟ اگر منٹگمری واٹ کا مدعا تحقیق حق ہوتا تو یقیناً قرآن حکیم کی یہ وضاحت اس کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہوتی۔ لیکن منٹگمری واٹ اور دیگر مستشرقین کا مقصد تو کچھ اور ہے جو اب پوشیدہ نہیں رہا۔

منٹگمری واٹ صاحب نے "نولڈک" وغیرہ کی قرآن حکیم کی ترتیب نزولی کو اسلام کے خلاف اپنی تحریروں میں خوب استعمال کیا ہے۔ اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آج مسلمانوں کے ہاں ان کی جو تاریخ مشہور ہے وہ بھی ایک زمانے کے بعد موجودہ شکل میں صورت پذیر ہوئی ہے۔ ان کے عقائد کی طرح ان کی عبادات بھی متاخر ادوار کی پیداوار ہیں۔ اگر منٹگمری واٹ صاحب کی یہ باتیں مان لی جائیں تو اسلامی دعوت کے ابتدائی زمانہ میں کوئی بھی چیز ایسی نظر نہیں آئے گی جس کا تعلق اسلام کی بنیادی باتوں سے ہو۔

مستشرقین کی اس قسم کی تمام تحریروں کے اقتباسات یہاں نقل کرنا ممکن نہیں۔ ہم ان کی کچھ تحریروں کی طرف محض اشارہ کریں گے اور ان کی کچھ تحریروں کے مختصر اقتباسات قارئین کرام کی خدمت میں پیش کریں گے تاکہ مسلمانوں کو پتہ چل سکے کہ ان

1۔ "ضیاء القرآن"، جلد 2، صفحہ 691

2۔ سورۃ بنی اسرائیل: 110

کے دین کے دشمن کس انداز میں ان کے دین کی جڑیں کاٹنے میں مصروف ہیں۔
منٹگمری واٹ قرآن اور "الکتاب" کو بھی دو علیحدہ علیحدہ چیزیں قرار دیتا ہے اور اپنے مستشرق بھائی رچرڈ بیل کے حوالے سے لکھتا ہے کہ محمد (ﷺ) نے اپنی دعوت کے ابتدائی سالوں میں، گو بالکل آغاز نبوت سے نہ سہی، اپنے الہامات کو قرآن کی شکل میں ترتیب دینے کے متعلق سوچا تھا لیکن مدینہ میں دو سال کے قیام کے بعد انہوں نے ایک کتاب مرتب کرنے کے متعلق سوچا جسے وہ اپنی قوم کے سامنے پیش کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ منٹگمری واٹ کی چند سطریں ملاحظہ فرمایئے۔ لکھتا ہے:

"One thing that is clear, however, is that in his closing years at Medina Muhammad had moved far beyond thinking that his function was to be, only a warner, and now regarded it as including the production of 'the Book 'which was to be the scripture of his community". (1)

"البتہ ایک بات واضح ہے کہ مدینہ میں اپنے آخری سالوں میں محمد (ﷺ) اپنے آپ کو صرف "نذیر" سمجھنے سے بہت آگے نکل گئے تھے اور اب وہ ایک "الکتاب" کی تیاری بھی اپنا فرض سمجھتے تھے جو ان کی امت کا صحیفہ قرار پاسکے۔"

اپنی اس بات کو ثابت کرنے کے لئے منٹگمری واٹ یہ تصور پیش کرتے ہیں کہ اپنی دعوت کی ابتدا میں صرف پانچ تصورات حضور ﷺ کے پیش نظر تھے۔

1۔ خدا کی قدرت اور رحمت کا تصور
2۔ یوم قیامت کی جوابدہی کا تصور
3۔ خدا کے شکر اور اس کی عبادت کا تصور
4۔ راہ خدا میں خرچ کرنے کا تصور
5۔ یہ تصور کہ لوگوں کو آخرت کے عذاب سے ڈرانا آپ کا فرض اور ذمہ داری ہے۔

یہ لکھنے کے بعد منٹگمری واٹ لکھتے ہیں:

"The other aspects of his vocation do not come into the earliest passages". (2)

1۔ "محمد ایٹ مکہ"، صفحہ 80
2۔ ایضاً، صفحہ 82

"آپ کے منصب کے دیگر پہلوؤں کا ذکر قرآن کی ابتدائی سورتوں
میں نہیں ملتا۔"

مستشرق مذکور اسی نظریئے کو ذرا اور آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ابتدائی قرآن خدائی عبادت اور خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے کی ترغیب کے علاوہ مہذب انسانی رویہ کے باقی اصولوں کو بالکل نظرانداز کر دیتا ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمایئے کہ مستشرقین دوپہر کے وقت نصف النہار پر پوری آب و تاب کے ساتھ چمکتے ہوئے آفتاب کی روشنی کا کس ڈھٹائی سے انکار کرتے ہیں۔ منٹگمری واٹ کی کتاب "محمد۔ پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین" کا یہ جملہ ملاحظہ فرمایئے:

"There is nothing about respect for life, Property, parents and marriage or the avoiding of false witness".(1)

"(قرآن کی ابتدائی سورتوں میں) جان و مال کے احترام، والدین کے ادب، شادی اور جھوٹی گواہی دینے سے بچنے کے متعلق کچھ بھی نہیں ہے۔"

اقامت صلوٰۃ پر قرآن حکیم نے جتنا زور دیا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں لیکن ذرا ملاحظہ فرمایئے کہ مستشرق مذکور کس طرح نماز کو بھی حضور ﷺ کے بعد کی اختراع قرار دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

"اپنی دعوت کے ابتدائی مراحل میں محمد (ﷺ) کو اس بات کا احساس تھا کہ ان کی طرف قرآن کی شکل میں جو پیغام نازل ہو رہا ہے، وہ یہودیت اور عیسائیت کی تعلیمات کے مشابہ ہے۔ غالباً وہ اپنے دعوی نبوت کا مفہوم یہ لیتے تھے کہ ان کا پیغام پہلے پیغمبروں کے پیغام سے ملتا جلتا ہے۔ انہوں نے غالباً ہجرت مدینہ کے بعد اپنی مذہبی رسوم کو متعارف کرانا شروع کیا۔ مثلاً مسلمانوں کا باہم لڑائی سے اجتناب اور مہاجرین کے ساتھ فیاضی اور مہمان نوازی کا سلوک۔ اس وقت عام مسلمانوں سے مذہبی فریضے کے طور پر جس بات کا مطالبہ کیا جاتا تھا وہ بات صرف یہ تھی کہ مسلمان جمعہ کے دن جمعہ کی نماز میں حاضر ہوں۔ وہ لوگ جو مذہب کے معاملے میں زیادہ پُرجوش تھے شاید وہ صبح، شام اور دن کی نماز بھی پڑھتے ہوں لیکن اس بات کا کوئی عمدہ ثبوت موجود نہیں کہ زمانہ مابعد کے اسلام کی نماز پنجگانہ، محمد (ﷺ) کی زندگی میں مقرر ہو چکی تھی۔ البتہ صلوٰۃ اللیل جو مکہ میں

1۔ "محمد، پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین"، صفحہ 33

کئی مسلمانوں میں مقبول تھی، ہجرت کے بعد جب مسلمان دنیوی معاملات میں زیادہ مصروف ہوگئے، تو اسے وحی کے ذریعے ختم کردیا گیا۔" (1)

ملاحظہ فرمایئے! کہ مستشرقین نماز، احترام جان ومال، والدین کے ادب، شادی بیاہ کے قوانین اور جھوٹی گواہی سے اجتناب کے اسلامی ضابطوں کو تحریک اسلامی میں عمل ارتقاء کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

انسان حیرت زدہ ہو جاتا ہے کہ اگر یہ ساری چیزیں بعد کی پیداوار ہیں تو صدیق وفاروق، عبدالرحمٰن بن عوف اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم جیسے دیدہ ور کیا دیکھ کر حلقہ اسلام میں داخل ہوئے تھے؟ اور بلال ویاسر نے اسلام کی کس خوبی کی بنا پر ناقابل بیان مصیبتیں جھیلی تھیں؟

مستشرقین کی تحقیق کا انداز ہی نرالا ہے۔ وہ اسلام کی تاریخ، تفسیر اور حدیث کے سارے علمی سرمائے کو ناقابل اعتماد قرار دے دیتے ہیں اور قرآن حکیم کو تاریخ کی کتاب قرار دے کر اس کی مدد سے تحریک اسلامی کی ارتقائی تاریخ مرتب کرتے ہیں۔ اناجیل اربعہ میں چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات زندگی مذکور ہیں اس لئے وہ قرآن حکیم میں بھی وہی رنگ دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ اناجیل اربعہ میں تو تاریخ کے سوا کچھ بھی نہیں جب کہ قرآن حکیم علوم ومعارف کا ایک بحر بے کراں ہے۔ اس میں ہر علم کے بنیادی اصول مل جاتے ہیں لیکن یہ کتاب کسی ایک علم کی تفصیلات کو اپنا موضوع نہیں بناتی۔ یہ عبرت و موعظت کی کتاب ہے اور جملہ علوم میں سے جو کچھ عبرت کے لئے ضروری اور مفید ہو سکتا ہے، یہ کتاب اسی کے بیان پر اکتفاء کرتی ہے۔

مستشرقین کا مندرجہ بالا انداز تحقیق نہ علمی ہے اور نہ ہی نیک نیتی پر مبنی ہے۔ جسے اسلام کے خلاف اعتراض کرنا ہے وہ اسلام کے ان عقائد اور تعلیمات پر اعتراض کرے جن کو ملت مسلمہ نے چودہ سو سال سے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے اور جن عقائد وتعلیمات کی تفصیلات ان کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہیں جو مسلمانوں کی چودہ سو سالہ محنت کا ثمر ہیں۔

مستشرقین اتنے انجان بھی نہیں۔ وہ آئین اور قانون کی کتابوں میں فرق کو سمجھتے ہیں۔ آئین میں قومی زندگی میں پیش آنے والے ہر مسئلے کے لئے قانون موجود نہیں ہوتا بلکہ آئین میں قانون سازی کے صرف بنیادی اصول موجود ہوتے ہیں۔ ان اصولوں کے تحت پارلیمنٹ تفصیلی قوانین وضع کرتی ہے۔ عدالت ان قوانین کی تشریح کرتی ہے اور عدالت کی تشریح بذات خود قانون کی شکل اختیار کر جاتی ہے۔

1۔ محمد: پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین، صفحہ 100

قرآن حکیم امت مسلمہ کے لئے کتاب دعوت ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے لئے ایک دستور بھی ہے۔ ابتدائی ضابطے یہ کتاب مہیا کرتی ہے اور ان کی تفصیلات احادیث طیبہ اور علمائے امت کی اجتہادی مساعی سے مرتب ہوتی ہیں۔ نماز قائم کرنے کا حکم قرآن دیتا ہے اور اس حکم کی تفصیل خدا کا محبوب رسول اپنے قول اور عمل سے بتاتا ہے۔ امت مسلمہ میں چودہ سو سال سے تواتر کے ساتھ نماز کے حکم کا نقل ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمان جس طرح آج نماز ادا کر رہے ہیں صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما بھی اسی طرح نمازیں ادا کیا کرتے تھے۔ احترام جان و مال اور والدین کے ادب پر جو زور اسلام نے دیا ہے وہ کسی دوسرے مذہب نے نہیں دیا۔ جھوٹی گواہی سے اجتناب پر جتنا زور اسلام نے دیا ہے، عیسائی حضرات پہلے ثابت کریں کہ ان کے مذہب نے اس پر اسلام کی نسبت زیادہ زور دیا ہے اور اس کے بعد اسلام پر اعتراض کریں کہ اس نے اس معاشرتی قدر کی پروا نہیں کی۔

کسی نظام کو اس کی اجتماعی حیثیت میں دیکھ کر ہی اس کے مفید یا بے کار ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ اسلام ایک دین ہے جس نے انسانی زندگی میں دور رس اور ہمہ گیر تبدیلیاں کیں۔ اسلام جن حالات میں ظاہر ہوا وہ مستشرقین کے سامنے ہیں۔ ساری دنیا بالعموم اور عرب قوم بالخصوص ہر قسم کی فکری اور عملی گمراہیوں کی دلدل میں سر سے پاؤں تک ڈوبی ہوئی تھی۔ ان حالات میں صورت حال کی اصلاح کے لئے تدریجی تبدیلی ہی حکمت کا تقاضا تھا۔ اگر اسلام کے تمام اوامر و نواہی، جن کا تعلق انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں سے تھا، ان کو بیک جنبش قلم نافذ کر دیا جاتا تو اس کے نتائج یقیناً مثبت بر آمد نہ ہوتے۔

اسلام نے بگڑے ہوئے انسانوں کی پہلے انفرادی اصلاح کی اور پھر انہیں ایک منظم قوم کی شکل میں ساری انسانیت کی راہنمائی کے کام پر لگا دیا۔ اگر اسلام انسانوں کی انفرادی اصلاح سے پہلے انہیں امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور خدا کی زمین پر اس کی حکومت کا جھنڈا لہرانے کے کام پر لگا دیتا تو اس کا نتیجہ وہی ہوتا جو آج کل کی اصلاحی تحریکوں کا ہوتا ہے، ایسی تحریکیں جن میں فکری اور عملی بے راہروی میں مبتلا لوگ دوسروں کو صراط مستقیم کی طرف بلانے کا بیڑا اٹھا لیتے ہیں۔

اسلام کے احکام واقعی تدریجی طور پر نازل ہوئے۔ جن باتوں کا تعلق اعتقادات اور اصلاح ذات کے ساتھ تھا، ان کو پہلے نازل کیا گیا۔ اور جن کا تعلق تشکیل جماعت اور جماعت کی ملی ذمہ داریوں سے تھا وہ احکام اس وقت نازل ہوئے جب مسلمانوں کے دل اور ضمیر شیشے کی طرح صاف ہو چکے تھے، جب ان میں اطاعت رسول کا جذبہ اتنا پختہ ہو چکا تھا

کہ شراب جیسی مرغوب شے کو پاؤں کی ٹھوکر لگانے کے لئے انہیں اپنے محبوب نبی کے صرف ایک اشارۂ ابرو کی ضرورت تھی۔

اگر ان لوگوں کے نفوس کی اصلاح سے پہلے یہ حکم صادر کیا جاتا تو اس کا نتیجہ وہی نکلتا جو آج کے ترقی یافتہ دور میں ان کوششوں کا ہوتا ہے جو شراب نوشی کی لعنت کو روکنے کے لئے یورپ اور امریکہ کی حکومتیں کرتی ہیں۔ قرآن حکیم کے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہونے میں بھی یہی حکمت تھی اور اسلامی اوامر و نواہی میں تدریج کا اصول بھی اسی لئے اپنایا گیا تھا۔ لیکن اس تدریج کی وجہ سے اسلام کو اپنے ابتدائی ایام میں عقیدہ توحید، شرک کی نفی، نماز اور بنیادی اخلاقی اقدار کی تعلیمات سے محروم ثابت کرنے کی کوشش کرنا جہالت اور ظلم کی انتہا ہے۔

مستشرقین نے سارے اسلامی ادب کو ٹھکرا کر اپنے نظریہ ارتقاء کی روشنی میں مسلمانوں کی دینی تاریخ بھی مرتب کی ہے اور ہم پر یہ انکشاف کیا ہے کہ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں مسلمانوں کو پتہ نہ تھا کہ ابراہیم کون ہیں۔ نہ انہیں یہ علم تھا کہ حضرت ابراہیم کا عربوں کے ساتھ کوئی تعلق تھا۔ نہ ان کو یہ علم تھا کہ خانہ کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ مل کر کی تھی۔ یہ سارے حقائق مسلمانوں کو اس وقت معلوم ہوئے جب مسلمانوں کا یہود و نصاریٰ کے ساتھ رابطہ ہوا۔

اگر مستشرقین کی یہ بات سچ ہے تو پھر سوال پیدا ہو گا کہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیھما السلام کے متعلق اسلامی اور یہودی روایات میں جو اختلافات ہیں ان کا سبب کیا ہے؟ کیا مستشرقین اس سوال کا یہ جواب دینے کے لئے تیار ہیں کہ مدینہ کے گرد و نواح میں ایسے یہودی عالم موجود تھے جو ابراہیم و اسماعیل علیھما السلام کے متعلق وہی عقائد رکھتے تھے جو اب مسلمانوں کے ہاں مروج ہیں۔ اور مسلمانوں نے یہ عقائد انہی سے اخذ کئے تھے؟

اگر مستشرقین اس سوال کا یہ جواب دیں تو اس سے نتیجہ یہ نکلے گا کہ قرآن حکیم نے انبیائے کرام کے جو حالات بیان کئے ہیں وہ یہود و نصاریٰ کے علمائے حق کی تعلیمات کے عین مطابق ہیں۔ اور موجودہ بائیبل میں جو بیانات قرآنی بیانات سے مختلف ہیں وہ قسیسین و رہبان کی تحریفی کوششوں کا نتیجہ ہیں اور ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

مستشرقین یقین رکھیں کہ وہ اسلام کو مٹانے کے لئے جتنی کوششیں کریں گے وہ اتنا ہی نکھر کر سامنے آئے گا۔ اس میں مسلمانوں کا کوئی کمال نہیں یہ اسلام کا اپنا کمال ہے۔ کیونکہ اسلام حق ہے اور جب حق جلوہ نما ہوتا ہے تو باطل خود بخود مٹ جاتا ہے۔

قرآنی آیات کے ناسخ اور منسوخ ہونے پر اعتراض

قرآنی آیات کے ناسخ اور منسوخ ہونے پر اعتراض

مستشرقین کا قرآن حکیم پر ایک بہت بڑا اور مشہور اعتراض یہ ہے کہ قرآن حکیم میں کئی آیات ایسی ہیں جو باہم متضاد ہیں، لیکن مسلمان یہ کہہ کر اس اعتراض سے جان چھڑا لیتے ہیں کہ قرآن حکیم میں تضاد نام کی کسی شے کا وجود نہیں۔ بظاہر جن آیات میں تضاد نظر آتا ہے وہ باہم متضاد نہیں بلکہ ان کا آپس میں تعلق ناسخ اور منسوخ کا ہے۔

مستشرقین کہتے ہیں کہ مسلمان اس بہانے سے قرآن حکیم پر وارد ہونے والے ایک بہت بڑے اعتراض سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ یہاں تک بھی اپنے اس مفروضے کو طول دینے سے باز نہیں آتے کہ قرآن حکیم کے تضادات کو رفع کرنے کا یہ طریقہ کار خود حضور ﷺ نے وضع کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں آیات کو منسوخ کرنے یا ایک آیت کو دوسری آیت سے بدلنے کا ذکر ہے۔

اپنے اس دعویٰ کی ثبوت کے لئے وہ قرآن حکیم کی یہ آیت کریمہ پیش کرتے ہیں:

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا[1]

"جو آیت ہم منسوخ کر دیتے ہیں یا فراموش کرا دیتے ہیں تو لاتے ہیں (دوسری) بہتر اس سے یا (کم از کم) اس جیسی۔"

جارج سیل اپنے ترجمہ قرآن کے مقدمے میں لکھتا ہے:

"قرآن میں کچھ آیات ایسی ہیں جو باہم متضاد ہیں۔ مسلمان علماء نسخ کے اصول کے ذریعے ان پر وارد ہونے والے اعتراضات کا تدارک کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں کچھ احکام صادر کئے، جن کو بعد میں معقول وجوہات کی بنا پر منسوخ کر دیا گیا۔"[1]

1۔ سورۃ البقرہ:106

مستشرقین یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ نسخ کا لفظ نظر ثانی کے مترادف ہے۔ اور حضرت محمد (ﷺ) قرآن حکیم میں ترمیم واضافہ کرتے تھے اور قرآن کی ترتیب کو نئی شکل دیتے تھے۔ منٹگمری واٹ کا اس سلسلے میں ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

"Muhammad's belief that the revelation came to him from God would not prevent him rearranging the material and otherwise emending it by omission or addition. There are references in the Quran to God making him forget some passages, and a close study of the text makes it almost certain that words and phrases were added. Such addition, of course, would not be of Muhammad's composition. Presumably he had some way of listening. for revelations where he thought they were needed, and would only emend the text if he received an emending revelation. Islamic orthodoxy has always recognized that some passages of the Quran containing rules for the Muslims were abrogated by later passages, so that the original rules ceased to be binding. The story of the "Satanic verses ...... "is an instance of the emendation of what had been publicly proclaimed as a revelation." (2)

"محمد (ﷺ) کا یہ عقیدہ کہ انکے پاس وحی خدا کی طرف سے آتی ہے، ان کو مواد کو ترتیب نو دینے اور بالفاظ دیگر حذف واضافے کے ذریعے اس میں ترمیم کرنے سے باز نہیں رکھتا تھا۔ قرآن میں کچھ حوالے ایسے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ خدا محمد (ﷺ) کو کچھ آیات بھلوا دیتا تھا۔ متن کے بغور مطالعہ سے یہ بات تقریباً یقینی ہو جاتی ہے کہ قرآن کے کچھ الفاظ اور آیات کا بعد میں اضافہ کیا گیا۔ البتہ اس قسم کے اضافوں کو

1۔ "The Koran"، صفحہ 52

2۔ "محمد، پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین"، صفحہ 18-17

محمد (ﷺ) کی تالیف نہیں کہا جائے گا۔ یہ بات فرض کی جاسکتی ہے کہ محمد (ﷺ) کے پاس کوئی ایسا ذریعہ موجود تھا کہ جب ان کو قرآن کے کسی حصے میں ترمیم کی ضرورت محسوس ہوتی تھی تو وہ وحی کے الفاظ سن لیتے تھے۔ لیکن وہ وحی کے بغیر ترمیم نہیں کرتے تھے۔ روایت پسند مسلمانوں نے اس بات کو ہمیشہ تسلیم کیا ہے کہ قرآن کی کچھ آیات جن میں مسلمانوں کے لئے کچھ قوانین بیان ہوئے تھے، وہ بعد کی آیات کے ذریعے منسوخ ہو گئیں۔ شیطانی آیات کی کہانی اس سلسلے میں ترمیم کی ایک مثال ہے جس کے اعلانیہ وحی ہونے کا دعویٰ کیا گیا تھا۔"

منگمری واٹ کے اس اقتباس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ حضور ﷺ قرآن حکیم کے الفاظ اور آیات کو اپنی مرضی سے مرتب کرتے تھے، قرآن میں ترمیم و اضافہ کرتے تھے بالفاظ دیگر آپ قرآن پر نظر ثانی کرتے تھے۔ لیکن آپ لوگوں کو یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے تھے کہ آپ یہ ترمیمات اپنی طرف سے نہیں کرتے بلکہ جب آپ کسی مقام پر ترمیم کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو کسی نہ کسی ذریعہ سے آپ منبع وحی سے رابطہ قائم کر لیتے ہیں۔ اور پھر وحی کے ذریعے قرآن میں ترمیم کر دیتے ہیں۔

منگمری واٹ کے نزدیک ان تمام دعووں کی دلیل یہ ہے کہ قرآن اس بات کو بیان کرتا ہے کہ اس کی کچھ آیات دوسری آیات کے ذریعے منسوخ ہو گئی ہیں۔ ساتھ ہی منگمری واٹ اپنے دعوے کی دلیل یہ بھی دیتا ہے کہ روایت پسند مسلمان ہمیشہ اس حقیقت کو تسلیم کرتے آئے ہیں کہ قرآن حکیم کی بعض آیات دوسری آیات کے ذریعے منسوخ ہوئی ہیں۔ ناسخ و منسوخ کے مسئلے کو سمجھانے کے لئے وہ مثال یہ پیش کرتا ہے کہ "شیطانی آیات" پہلے بطور وحی نازل ہوئیں اور پھر منسوخ ہو گئیں۔

منگمری واٹ جو کچھ کہہ رہے ہیں اگر حقیقت یہی ہو تو پھر قرآن کو کلام خداوندی ماننے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ اگر اس نظریے کو تسلیم کر لیا جائے کہ حضور ﷺ قرآن حکیم میں از خود ترمیم کرتے تھے تو پھر قرآن کے منزل من اللہ ہونے کے عقیدے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ جو قرآن میں ترمیم کر سکتا ہے وہ قرآن کو تصنیف بھی کر سکتا ہے۔ مستشرقین الفاظ کے ہیر پھیر کے ذریعے اسی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

منٹگمری واٹ نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اس پر قرآن خود بھی شاہد ہے اور مسلمان بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں، حالانکہ منٹگمری واٹ کا یہ دعویٰ غلط ہے۔

قرآن حکیم نہ تو حضور ﷺ کو قرآن کا مصنف قرار دیتا ہے اور نہ ہی اس کی ترتیب اور اس میں نسخ کو حضور ﷺ کی طرف منسوب کرتا ہے۔ قرآن حکیم تو اللہ تعالیٰ کو ہی اس کتاب مبین کا نازل کرنے والا قرار دیتا ہے اور نسخ کی نسبت بھی اسی ذات والا صفات کی طرف کرتا ہے۔ اور روایت پسند مسلمان اسی بات کو تسلیم کرتے ہیں جس کا قرآن حکیم نے دعویٰ کیا ہے۔ نسخ کو حضور ﷺ کی طرف سے نظر ثانی قرار دینا نہ قرآن کا بیان ہے اور نہ ہی مسلمانوں نے کبھی اس بات کو تسلیم کیا ہے۔ منٹگمری واٹ صاحب اپنے مزعومات کو قرآن حکیم اور مسلمانوں کے سر تھوپ کر اپنی روایتی علمی بددیانتی کا ثبوت دے رہے ہیں۔

قرآن حکیم میں ایسی آیات موجود ہیں جن میں نسخ اور تبدیلی کا ذکر ہے۔ سورۃ بقرہ کی آیت نمبر 106 کا حوالہ سطور بالا میں گزر چکا ہے جس میں نسخ آیات کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ آیات اور احادیث میں بھی نسخ کا ذکر ہے۔ مسلمان چودہ سو سال کے عرصہ میں قرآن و حدیث کی تشریح اور ان سے استنباط احکام کیلئے نسخ کے اصول کو استعمال کرتے آئے ہیں۔ یہ اسلامیات کی ایک مستقل اصطلاح ہے جس کی اپنی مخصوص تعریف ہے اور اس کی کچھ شرائط ہیں۔

نسخ کوئی قانونی چھری نہیں، جو جس عقیدے کو چاہے باطل کر دے، جس تاریخی بیان کو چاہے بدل دے، جس قانون کو چاہے کالعدم قرار دے دے اور جس اخلاقی ضابطے کو چاہے ملیامیٹ کر دے۔ نہ اس کے لئے زمانے کی پابندی ہو، نہ مسئلے کی نوعیت اس قانون پر اثر انداز ہوتی ہو، بلکہ جس بات کو جب خلاف مصلحت سمجھا کالعدم قرار دے دیا۔

نسخ کے متعلق اس قسم کا کوئی تصور صحیح نہیں۔ یہ ایک شرعی اصطلاح ہے جو اپنے دائرے اور پابندیوں کے اندر نافذ العمل ہوتی ہے۔

سرسید احمد خان صاحب اور ان کے تتبع میں کچھ مسلم مصنفین نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ قرآن حکیم میں جہاں نسخ کا ذکر ہے اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن حکیم سابقہ شریعتوں کو منسوخ کرتا ہے، قرآن کی آیات کے ذریعے دوسری آیات کے منسوخ ہونے کا کوئی ذکر نہیں۔ ان مصنفین کے اس موقف کی حمایت نہ تو متعلقہ قرآنی آیات کے الفاظ

کرتے ہیں اور نہ ہی ملت اسلامیہ کی علمی تاریخ اس کی تصدیق کرتی ہے۔ نسخ کا قانون مسلمانوں کے ہاں مسلم ہے۔ اس کا انکار کر کے ہم قرآن حکیم کی کوئی خدمت نہیں کر سکتے اور نہ ہمیں اس کا انکار کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ضروری نہیں کہ جس بات میں مستشرقین کو نقص نظر آتا ہو وہ لازماً ناقص ہی ہو۔ ان کو تو اسلام کی کسی بات میں بھی کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ ان کی قلبی کیفیت کے بارے میں ہمارے رب کریم نے ہمیں آگاہ فرما رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِىْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَالَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (1)

"اور ہر گز خوش نہیں ہوں گے آپ سے یہودی اور نہ عیسائی، یہاں تک کہ آپ پیروی کرنے لگیں ان کے دین کی۔ آپ (انہیں) کہہ دیجئے کہ اللہ کا بتایا ہوا راستہ ہی سیدھا راستہ ہے اور اگر (بفرض محال) آپ پیروی کریں ان کی خواہشوں کی اس علم کے بعد بھی جو آپ کے پاس آ چکا ہے (تو پھر) نہیں ہوگا آپ کے لئے اللہ (کی گرفت سے) بچانے والا کوئی یار اور نہ کوئی مددگار۔"

ہم ذیل میں نسخ کا وہ مفہوم قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں جو حضور ﷺ نے اپنی امت کو سمجھایا اور جو چودہ سو سال سے ملت اسلامیہ میں مروج ہے۔ اس مفہوم کے اعتبار سے نسخ حکمت خداوندی کے عین مطابق ہے اور جس دین نے جہالت و کفر کی اتھاہ تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی انسانیت کو صراط مستقیم پر لگانا تھا، اس دین کے لئے اس اصول کو اپنانا ہی تقاضائے حکمت تھا۔

نسخ کا مفہوم

نسخ کا لغوی معنی زائل کرنا یا نقل کرنا ہے جیسے کہتے ہیں:

نَسَخَتِ الرِّيْحُ اٰثَارَ الْقَدَمِ اَیْ اَزَالَتْهُ

"کہ ہوا نے قدموں کے آثار مٹا دیئے یعنی ان کا ازالہ کر دیا۔"

1۔ سورۃ البقرہ: 120

اسی طرح جب ایک کتاب کے مندرجات کو دوسری کتاب میں نقل کیا جائے تو کہا جاتا ہے: نَسَخْتُ الْكِتَابَ اور اصطلاح شرع میں نسخ کی مختصر تعریف یہ ہے:

رَفْعُ الشَّارِعِ حُكْمًا شَرْعِيًّا بِدَلِيْلٍ شَرْعِيٍّ (1)

"یعنی شارع کا ایک حکم شرعی کو کسی دلیل شرعی سے ساقط کر دینا۔"

نسخ کا تعلق ایک طرف شارع سے ہے اور دوسری طرف امت کے مکلفین سے۔ مکلفین کی نسبت سے تو نسخ کا مفہوم یہی بنے گا کہ پہلے جو حکم موجود تھا وہ ساقط ہو گیا ہے اور اس کی جگہ نیا حکم نافذ کر دیا گیا ہے۔ لیکن شارع کی نسبت سے اس میں رفع کے معنی موجود ہی نہیں بلکہ اس نسبت سے اس کا مفہوم یہ ہے کہ شارع نے سابق حکم کے نفاذ کی مدت کے ختم ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔

وَفِيْ حَقِّ الشَّارِعِ بَيَانٌ مَحْضٌ لِانْتِهَاءِ الْحُكْمِ الْأَوَّلِ لَيْسَ فِيْهِ مَعْنَى الرَّفْعِ (2)

اس بات کو ہم ایک آسان مثال کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً ایک سکول کی انتظامیہ نظام الاوقات طے کرنے کیلئے ایک میٹنگ بلاتی ہے اور اس میں فیصلہ کرتی ہے کہ یکم مئی سے اکتیس اکتوبر تک سکول صبح سات بجے کھلا کرے گا اور یکم نومبر سے تیس اپریل تک سکول کھلنے کا وقت صبح نو بجے ہو گا۔ مئی کے آغاز میں انتظامیہ طلبہ میں اعلان کرتی ہے کہ آئندہ سکول سات بجے کھلا کرے گا۔ سکول حسب اعلان سات بجے کھلتا رہتا ہے اور اکتوبر کے آخری دنوں میں انتظامیہ اعلان کرتی ہے کہ یکم نومبر سے سکول کھلنے کا وقت تبدیل ہو جائے گا اور اب سکول نو بجے کھلا کرے گا۔

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس اعلان سے طلبہ تو یہی سمجھیں گے کہ سکول کھلنے کے وقت سے متعلق انتظامیہ نے اپنے پہلے حکم کو ختم کر کے اس کی جگہ نیا حکم جاری کر دیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انتظامیہ نے نہ کوئی حکم ختم کیا ہے اور نہ کوئی نیا فیصلہ کیا ہے۔ بلکہ پہلے سے جو فیصلہ ہو چکا تھا اس کے مطابق پہلے حکم کی مدت کے خاتمے کا اعلان کر کے دوسرے حکم کی مدت شروع ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔ ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں اس قسم کے تجربات

1۔ پیر محمد کرم شاہ، "سنت خیر الانام" (ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور، 1977)، صفحہ 206

2۔ ایضاً، صفحہ 207، بحوالہ کتاب التحقیق

کو روزانہ آزماتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی نگاہ قدرت سے نہ حال پوشیدہ ہے اور نہ مستقبل۔ یہ بات اس کے لامحدود علم میں ہے کہ کون سے حکم کی افادیت کس وقت تک قائم رہے گی اور کب اس کی جگہ دوسرا حکم زیادہ مفید ثابت ہوگا۔ نسخ کے ذریعے ایک حکم کے خاتمے اور دوسرے حکم کے نفاذ کا جو اعلان ہوتا ہے اس کا فیصلہ تو پہلے ہو چکا ہوتا ہے لیکن چونکہ بندوں کو پہلے اس کا علم نہیں ہوتا، اس لئے جب ناسخ آیت نازل ہوتی ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ پہلے حکم کو ساقط کر کے اس کی جگہ نیا حکم نافذ کر دیا گیا ہے حالانکہ شارع کے علم کے مطابق یہ تبدیلی صرف پہلے حکم کی مدت کے خاتمے اور دوسرے حکم کی مدت کے آغاز کا اعلان ہوتی ہے۔

یہاں بعض لوگ یہ وسوسہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ قرآن کی بعض آیات دوسری آیات کو منسوخ کر دیتی ہیں تو اس سے لازم آئے گا کہ پہلا حکم نازل کرتے وقت (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کو یہ علم نہ تھا کہ یہ حکم مفید ہے۔ اور جب تجربے کے ذریعے اس کے غیر مفید ہونے کا علم ہوا تو دوسرا حکم نافذ کر دیا گیا۔

یہ محض وسوسہ ہے، اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ ضروری نہیں کہ ہر مفید حکم ہر زمانے کے لئے مفید ہو۔ بلکہ حالات کے بدلنے سے حکم کی افادیت بدلتی رہتی ہے۔ بچہ چھوٹا ہوتا ہے تو والدین پیار و محبت کے ساتھ ساتھ سختی کے ذریعے اس کو غلط راستے پر چلنے سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس عمر میں حسب ضرورت سختی ہی بچے کے حق میں مفید اور بہتر ہوتی ہے۔ لیکن جب بچہ سن بلوغ کو پہنچ جاتا ہے اور اس کے احساسات جوان ہونے لگتے ہیں تو سختی اس کے لئے سنوارنے کی بجائے بگاڑنے کا باعث بن جاتی ہے۔ لہٰذا والدین بچے کے ساتھ سختی کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ اس لئے بچے کی تربیت کے لئے سختی کا طریق کار گو مفید ہے لیکن موقت ہے۔

طبیب اپنے مریض کا علاج مرحلہ وار کرتا ہے۔ پہلے مرحلے پر وہ جو علاج تجویز کرتا ہے وہ اس مرحلے کے لئے مفید ہوتا ہے۔ لیکن اسی علاج کو مستقل کر دینا نہ طبابت ہے اور نہ عقلمندی۔ طبیب ہر مرحلے کے بعد علاج کو تبدیل کرے گا اور یہی حکمت ہے۔

اب اگر کوئی فلسفی مزاج مریض، طبیب کی طرف سے نسخے میں تبدیلی پر یہ اعتراض جڑ دے کہ جناب ڈاکٹر صاحب! پہلے آپ نے یہ علاج تجویز کیوں نہ کیا تھا۔ کیا اس وقت آپ

کو اس بات کا علم نہ تھا جو اب آپ کے نوٹس میں آئی ہے، تو ایسا مریض کسی طبیب کے علاج سے صحت یاب کیسے ہو گا؟

یہ مثالیں ہم نے محض مسئلے کی وضاحت کے لئے پیش کی ہیں و گرنہ والدین اپنے بچے کی تربیت کے لئے اور طبیب اپنے مریض کے علاج کیلئے ہر مرحلہ پر وہ طریقہ اور نسخہ اختیار کرتے ہیں جو اس مرحلے کے لئے مفید ہو۔ انہیں اس بات کا تو علم ہوتا ہے کہ یہ طریقہ اور نسخہ وقتی ہے اور وقت آنے پر اس کو بدلنا پڑے گا۔ لیکن اس مرحلے کے خاتمے کے وقت کا تعین وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنے تجربے کی بنا پر کرتے ہیں، وہ پہلے سے صحیح وقت کا تعین نہیں کر سکتے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ قدرت سے کوئی چیز اوجھل نہیں ہے۔ وہ مستقبل میں پیش آنے والی تبدیلیوں کو دیکھ رہا ہے۔ اور اس کے لئے پہلے سے وقت کا تعین مشکل نہیں۔

اس بحث سے یہ حقیقت منکشف ہو گئی ہو گی کہ نسخ کا مطلب یہ نہیں کہ شارع نے پہلے غلط حکم دے دیا اور جب اس کی غلطی کا پتہ چلا تو اس کو دوسرے حکم سے بدل دیا۔ بلکہ نسخ کا مطلب یہ ہے کہ ایک حکم جب تک مفید تھا قادر و حکیم رب نے معین مدت تک اس کو نافذ العمل رکھا اور جب اس کی مدت ختم ہو گئی تو اس کی جگہ نئے حکم کے نفاذ کا اعلان کر دیا جو وقت کے تقاضوں کے مطابق زیادہ مفید تھا۔

مستشرقین بعض ایسے مسائل کے لئے نسخ کا لفظ استعمال کرتے ہیں جن کا نسخ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے اپنے خوابوں میں کسی مافوق الفطرت ہستی کو دیکھا۔ کچھ عرصہ تو لوگوں کو یہ بتاتے رہے کہ آپ نے خدا کو دیکھا ہے۔ لیکن جب آپ کو معلوم ہوا کہ یہود و نصاریٰ خدا کو دیکھنے کو ناممکن قرار دیتے ہیں اور قرآن بھی لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ کہہ کر رویت خداوندی کے امکان کو مسترد کرتا ہے تو آپ نے اپنا موقف بدل لیا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ آپ نے خوابوں میں جبریل امین کو دیکھا ہے۔ اور اس تضاد کا جواز آپ نے یہ پیش کیا کہ آپ کا پہلا موقف دوسرے موقف سے منسوخ ہو گیا ہے۔

اسی طرح مستشرقین جہاں ناسخ منسوخ کی بحث کرتے ہیں وہاں مثال کے طور پر "شیطانی آیات" کو پیش کرتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے کچھ آیات تلاوت کیں جن میں بتوں کی تعریف کی گئی تھی لیکن بعد میں ان آیات کو منسوخ قرار دے

دیا گیا۔ (ہم شیطانی آیات کے استشراقی وسوسے کا رد انشاء اللہ العزیز ایک مستقل باب میں پیش کریں گے) سر دست صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ مستشرقین نسخ کے اصول کو کس معنی میں استعمال کرتے ہیں۔

خواب میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا دعویٰ کرنا اور پھر کچھ عرصہ بعد یہ کہنا کہ میں نے خدا کو نہیں بلکہ جبریل امین کو دیکھا تھا، نسخ نہیں بلکہ یہاں دوسرا بیان پہلے بیان کی تکذیب کر رہا ہے۔ اسی طرح بتوں کی تعریف کر کے پھر ان کی مخالفت کرنا بھی نسخ نہیں بلکہ ایک غلط عقیدہ پیش کر کے پھر اس سے رجوع کرنے کے مترادف ہے۔

نسخ کا اصول نہ نظری معاملات اور عقائد میں لاگو ہوتا ہے اور نہ ہی خبر میں۔ نسخ کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام پہلے ایک عقیدے کا پرچار کرے، پھر اس کی جگہ دوسرا عقیدہ پیش کردے اور کہے کہ پہلا عقیدہ منسوخ ہوگیا ہے۔ اور نہ ہی نسخ کا یہ مطلب ہے کہ قرآن پہلے ایک حقیقت یا خبر کو بیان کرے اور پھر اس کو منسوخ قرار دے دے۔ نسخ کا قاعدہ تو صرف عملی احکام میں لاگو ہوتا ہے اور وہاں بھی چند شرائط کے ساتھ۔

ڈاکٹر محمد مصطفیٰ شلبی اپنی کتاب "اصول الفقہ الاسلامی" میں رقمطراز ہیں:

وَالنَّسْخُ لَا يَكُوْنُ فِيْ جَمِيْعِ الْاَحْكَامِ بَلْ فِى الْاَحْكَامِ الشَّرْعِيَّةِ التَّكْلِيْفِيَّةِ الْجُزْئِيَّةِ الَّتِىْ تَحْتَمِلُ الْوُجُوْدَ وَالْعَدَمَ- اَىْ تَحْتَمِلُ كَوْنَهَا مَشْرُوْعَةً اَوْ غَيْرَ مَشْرُوْعَةٍ فِيْ نَفْسِهَا فِيْ زَمَنِ النُّبُوَّةِ بِمَعْنٰى اَنَّ مَصْلَحَتَهَا تَتَغَيَّرُ فَتَكُوْنُ فِيْ وَقْتٍ نَافِعَةً وَّ فِيْ اٰخَرَ ضَارَّةً (1)

"نسخ کا قاعدہ تمام احکام میں لاگو نہیں ہوتا بلکہ اس کا اطلاق شریعت کے احکام تکلیفیہ جزئیہ میں ہوتا ہے، جن میں وجود اور عدم دونوں کا احتمال ہو۔ یعنی حضور ﷺ کے زمانہ میں ان کے نافذ العمل ہونے اور نہ ہونے کے دونوں احتمال موجود ہوں۔ کیونکہ وہ اس قسم کے احکام ہیں جن کی مصلحت بدلتی رہتی ہے۔ وہ کسی وقت مفید ہوتے ہیں اور کسی وقت مضر۔"

1۔ ڈاکٹر محمد مصطفیٰ شلبی "اصول الفقہ الاسلامی"، (بیروت۔1983)، جلد 1، صفحہ 553

محل نسخ کی اس وضاحت کے پیش نظر مندرجہ ذیل احکام نسخ کے دائرے سے خارج ہو جائیں گے۔(1)

1۔ شریعت کے احکام کلیہ اور اصول عامہ جیسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وغیرہ

2۔ ایسے احکام جن کے مشروع نہ ہونے کا احتمال ہی نہیں۔ جیسے وہ اصلی احکام جن کا تعلق عقائد سے ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ پر ایمان، فرشتوں، کتابوں، رسولوں اور یوم آخرت پر ایمان اور ایسے احکام جو نیکی اور فضیلت کی بنیاد ہیں، جیسے عدل، صداقت، امانت، والدین سے حسن سلوک، ایفائے عہد اور اسی قسم کے دیگر فضائل

3۔ ایسے احکام جن کی مشروعیت کا سرے سے احتمال ہی نہیں۔ جیسے کفر اور اصلی رزائل مثلاً ظلم، جھوٹ، خیانت، والدین کی نافرمانی اور دھوکہ بازی وغیرہ کیونکہ یہ ایسی چیزیں ہیں جن کی قباحت کبھی بدل نہیں سکتی۔

4۔ ایسے احکام جن کے ساتھ کوئی ایسی چیز ملحق ہو جو نسخ کے منافی ہو۔ مثلاً اس حکم کے ساتھ یہ وضاحت بھی ہو کہ یہ حکم تاابد ہے۔ اس کی مثال حضور ﷺ کی ازواج مطہرات سے نکاح کی حرمت کا مسئلہ ہے۔ قرآن حکیم نے واضح الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا(2)

"اور تمہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ تم اذیت پہنچاؤ اللہ کے رسول کو اور تمہیں اس کی بھی اجازت نہیں کہ نکاح کرو ان کی ازواج سے ان کے بعد کبھی۔"

اس آیۂ کریمہ میں "اَبَدًا" کے لفظ کے ساتھ یہ صراحت کر دی گئی ہے کہ زوجات رسول سے نکاح ابدی طور پر حرام ہے۔ اس حکم کو ابدی قرار دینا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ حکم ہمیشہ کیلئے عمدہ اور مفید ہے۔ کیونکہ اگر اس میں نسخ کا امکان ہو تو وہ اس حکم کے ابدی طور پر مفید ہونے کے خلاف ہوگا۔ دوسرے اس قسم کے احکام وہ ہیں جن کے ابدی ہونے کی وضاحت نص میں تو موجود نہیں لیکن قرائن اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ احکام ابدی ہیں۔ مثلاً ایسے احکام جن کا حضور ﷺ کی حیات طیبہ میں منسوخ ہونا کسی طریقے

1۔ ڈاکٹر محمد مصطفیٰ شلبی، "اصول الفقہ الاسلامی"، (بیروت۔ 1983)، جلد 1، صفحہ 553

2۔ سورۃ الاحزاب: 53

سے بھی ثابت نہیں، ایسے احکام بھی ابدی ہیں اور نسخ کو قبول نہیں کرتے کیونکہ نسخ کے لئے قول رسول ضروری ہے اور حضور ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں کیونکہ آپ خاتم الانبیاء والمرسلین ہیں۔

اسی طرح وہ احکام بھی نسخ کو قبول نہیں کرتے جن کا وقت متعین کر دیا گیا ہو۔ کیونکہ ایسا حکم اپنا وقت گزرنے کے ساتھ خود ہی ساقط العمل ہو جاتا ہے، اس کو ختم کرنے کے لئے کسی دوسرے حکم کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

نسخ کی شرائط

نسخ کے قاعدہ کے موثر ہونے کے لئے چند شرطیں ہیں۔ ان میں سے بعض شرطیں وہ ہیں جن پر علمائے امت کا اتفاق ہے اور بعض شرطیں وہ ہیں جن میں علمائے ملت کا اختلاف ہے۔ ہم یہاں صرف وہ شرطیں بیان کریں گے جن پر علمائے امت متفق ہیں۔ اگر وہ شرطیں نہ پائی جائیں تو نسخ کا قاعدہ بالاجماع لاگو نہیں ہوتا۔ وہ شرطیں مندرجہ ذیل ہیں۔ (1)

1۔ منسوخ ہونے والا حکم شریعت کا ایسا جزئی اور عملی حکم ہو جو قرآن وسنت سے ثابت ہو اور اس حکم کے ساتھ نہ تو ابدیت کی شرط ہو اور نہ ہی اس کی مدت متعین ہو۔ اور ساتھ ہی منسوخ کے لئے ضروری ہے کہ وہ نزول میں ناسخ سے مقدم ہو۔

2۔ ناسخ قرآن کی آیت یا حضور ﷺ کی قولی یا فعلی سنت ہو جو منسوخ سے متاخر ہو۔

نسخ کی صورتیں

نسخ کی کئی صورتیں ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔ (2)

1۔ کبھی ایک حکم منسوخ ہوتا ہے اور اس کے بدلے میں کوئی دوسرا حکم نازل نہیں ہوتا۔ جیسے پہلے حضور ﷺ کے ساتھ گفتگو کرنے سے پہلے صدقہ دینے کا حکم تھا۔ بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا اور اس کے بدلے میں کوئی دوسرا حکم نازل نہیں ہوا۔

2۔ کبھی ایک حکم کو منسوخ کر کے دوسرا ایسا حکم نافذ کیا جاتا ہے جو تاکید اور شدت کے حساب سے منسوخ حکم کے برابر ہوتا ہے، جیسے بیت المقدس کی بجائے خانہ کعبہ کو قبلہ

1۔ "اصول الفقہ الاسلامی"، جلد 1، صفحہ 554

2۔ ایضاً، صفحہ 57-256

بتانے کا حکم۔

3۔ کبھی ایک سخت حکم کو منسوخ کر کے اس کی جگہ ایک آسان حکم نافذ کر دیا جاتا ہے۔ جیسے پہلے مسلمانوں کو حکم تھا کہ ایک مسلمان دس مشرکوں کے مقابلے میں صبر کا مظاہرہ کرے لیکن بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا اور اسکے بدلے میں اس سے آسان حکم نازل ہو گیا کہ ایک مسلمان صرف دو مشرکوں کے مقابلے میں صبر کا مظاہرہ کرے۔

4۔ کبھی آسان حکم کو منسوخ کر کے اس کی جگہ سخت حکم کو نافذ کر دیا جاتا ہے جیسے پہلے حکم تھا کہ کفار کی اذیتوں پر صبر کیا جائے (وَدَعْ أَذَاهُمْ)(1) بعد میں اس حکم کو منسوخ کر کے کفار کے ساتھ جہاد اور قتال کا حکم دے دیا گیا۔ اسی طرح پہلے صرف یوم عاشورہ کا روزہ فرض تھا پھر اس کی فرضیت کو منسوخ کر کے ماہ رمضان کے روزے فرض کر دیئے گئے۔

5۔ کبھی قاعدہ نسخ کے ذریعے ممانعت کے حکم کو اباحت میں تبدیل کر دیا جاتا ہے جیسے پہلے رمضان کے مہینے میں نماز عشاء یا سونے کے بعد مباشرت حرام تھی پھر اس حکم کو اس آیۃ کریمہ کے ذریعہ منسوخ کر دیا گیا:

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَآئِكُمْ (2)

"حلال کر دیا گیا تمہارے لئے رمضان کی راتوں میں اپنی عورتوں کے پاس جانا۔"

6۔ کبھی نسخ صراحۃ ہوتا ہے اور کبھی ضمناً۔ پہلی صورت میں ناسخ حکم میں صراحت کر دی جاتی ہے کہ یہ حکم پہلے حکم کو منسوخ کر رہا ہے۔ جیسے کہ پہلے قرآن حکیم نے حکم دیا:

يَآأَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ ۚ إِنْ يَكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُونَ صٰبِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ ۚ وَإِنْ يَكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَغْلِبُوٓا أَلْفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ ○(3)

"اے نبی! برانگیختہ کیجئے مومنوں کو جہاد پر۔ اگر ہوں تم میں سے بیس آدمی صبر کرنے والے تو وہ غالب آئیں گے دو سو پر اور اگر ہوئے تم میں سے سو آدمی (صبر کرنے والے) تو غالب آئیں گے ہزار کافروں

1۔ سورۃ الاحزاب: 48
2۔ سورۃ البقرۃ: 187
3۔ سورۃ الانفال: 65

پر کیونکہ یہ کافروہ لوگ ہیں جو کچھ نہیں سمجھتے۔"
بعد میں اس آیت کریمہ کے حکم کو دوسری آیۃ کریمہ کے ذریعہ منسوخ کر دیا گیا۔ ارشاد خداوندی ہوا:

اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ۚ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (1)

"(اے مسلمانو!) اب تخفیف کر دی ہے اللہ تعالیٰ نے تم پر اور وہ جانتا ہے کہ تم میں کمزوری ہے۔ تو اگر ہوئے تم میں سے سو آدمی صبر کرنے والے تو وہ غالب آئیں گے دو سو پر اور اگر ہوئے تم میں سے ایک ہزار (صابر) تو وہ غالب آئیں گے دو ہزار پر اللہ کے حکم سے۔ اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

یہاں دوسری آیت میں، جو ناسخ ہے، اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ کے الفاظ صراحت کر رہے ہیں کہ پہلا حکم منسوخ ہو گیا ہے۔

دوسری صورت میں شارع نسخ کی صراحت تو نہیں کرتا لیکن ضمناً نسخ کا پتہ چل جاتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ متاخر نص کا حکم مقدم نص کے حکم کے مخالف ہو۔ دونوں میں نہ تو تطبیق ممکن ہو اور نہ ہی ایک کو دوسری پر ترجیح دی جاسکتی ہو۔ اس صورت میں پتہ چل جائے گا کہ دوسری نص پہلی نص کی ناسخ ہے۔

ادلہ شرعیہ جو ایک دوسری کو منسوخ کرتی ہیں

اس مسئلے کی وضاحت کے لئے "سنت خیر الانام علیہ الصلوۃ والسلام" کا ایک اقتباس قارئین کرام کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے:
"قوانین شریعت کا قصر رفیع چار بنیادوں پر قائم ہے۔"
1۔ کتاب اللہ۔ 2۔ سنت رسول اللہ۔ 3۔ اجماع۔ 4۔ قیاس۔
یہی چار دلیلیں ہیں جن سے شریعت کا کوئی حکم ثابت ہوتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان میں سے کون ناسخ ہو سکتی ہے اور کون منسوخ۔

1۔ سورۃ الانفال: 66

امت کا اس پر اتفاق ہے کہ اجماع اور قیاس ان احکام کو نسخ نہیں کر سکتے جو نصوص قرآنیہ اور احادیث متواترہ مشہورہ سے ثابت ہیں۔ اور اس آیت کریمہ کے نازل ہونے کے بعد نسخ احکام باقی نہیں۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (1)

"آج میں نے تمہارا دین تمہارے لئے مکمل کر دیا اور پوری کر دی تم پر اپنی نعمت اور میں نے پسند کر لیا ہے تمہارے لئے اسلام کو بطور دین۔"

باقی رہیں دو چیزیں: کتاب اور سنت۔ تو یہاں چار احتمال ہیں۔ کتاب کا نسخ کتاب سے، سنت کا نسخ سنت سے، سنت کا نسخ کتاب سے اور کتاب کا نسخ سنت سے۔

پہلے دو بالاتفاق جائز ہیں۔ اور دوسرے دو میں شافعیوں اور حنفیوں کا اختلاف ہے۔ پہلے دو کی ایک ایک مثال عرض کرتا ہوں۔

کتاب سے کتاب کے نسخ کی مثال

اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (2)

"(میدان کارزار میں) اگر تم میں سے بیس صبر کرنے والے ہوئے تو دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر سو ہوئے تو ہزار کافروں پر غالب آئیں گے۔"

اس میں مجاہدین کو حکم دیا گیا کہ اگر تمہارے مقابل دس گنا تک کفار ہوں تو پھر بھی ان سے مقابلہ کرنا فرض ہے۔ لیکن بعد میں یہ حکم اس آیت سے منسوخ کر دیا گیا:

اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ۚ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ۔ (3)

"اب اللہ تعالیٰ نے تم پر آسانی کر دی ہے اور تمہاری کمزوری کو جان لیا ہے۔ اگر تم میں سے ایک سو صابر ہوئے تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے

1۔ سورۃ المائدۃ: 3

2۔ سورۃ الانفال: 65

3۔ ایضاً: 66

اور اگر ایک ہزار ہوئے تو دو ہزار پر غالب آئیں گے۔"

پہلے دشمن کی تعداد دس گنا ہوتی تو بھی اس کا مقابلہ کرنا فرض تھا اب آسانی فرمادی کہ دشمن اگر دوگنا ہو تو تم پر اس کا مقابلہ کرنا فرض ہے۔

نسخ سنت بالسنۃ کی مثال

حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ اَلَافَزُوْرُوْهَا۔

"پہلے میں تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا کرتا تھا لیکن اب تمہیں اجازت ہے، بیشک زیارت قبور کے لئے جایا کرو۔"

حضور ﷺ کا پہلا حکم جو زیارت قبور سے منع کرنے کے متعلق تھا اب اس دوسرے حکم سے منسوخ ہوگیا۔

اب رہیں پچھلی دو شقیں یعنی "نسخ السنۃ بالکتاب" اور "نسخ الکتاب بالسنۃ" امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دونوں جائز نہیں۔

سنت کا نسخ کتاب سے

احناف نسخ السنۃ بالکتاب کو جائز سمجھتے ہیں اور دلیل کے طور پر تحویل قبلہ کی آیت پیش کرتے ہیں۔ حضور ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ میں رونق افروز ہوئے تو آپ پہلے چھ ماہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا جو پہلے (سنت سے) ثابت تھا اس آیہ سے منسوخ ہوگیا:

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (1)

"اے محبوب! اب نماز میں منہ مسجد حرام کی طرف پھیرلو۔"

سنت ناسخ قرآن نہیں

رہی چوتھی شق یعنی نسخ الکتاب بالسنۃ تو یہ ذرا تفصیل طلب ہے۔ ان حضرات نے بھی اعتراض کیا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ جو حکم اللہ تعالیٰ دے اس کا رسول اسے ساقط العمل قرار دے دے حالانکہ رسول کا فرض تو یہ ہے کہ اس کے حکم کی اطاعت کرے اور

1۔ سورۃ البقرہ: 144

دوسروں سے کرائے۔ آپ کا یہ خیال بالکل صحیح ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ۚ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ○ (1)

"اور جس وقت ہماری روشن آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو (روز قیامت) ہماری ملاقات کا یقین نہیں رکھتے، کہتے ہیں (یا رسول اللہ) اس کے بغیر کوئی اور قرآن لائیے۔ (جو ہماری ہوا و ہوس کے مطابق ہو) یا اسے (ہماری خواہش کے مطابق) تبدیل کر دیجئے۔ آپ فرمائیے مجھے تو اپنی طرف سے قرآن کے بدلنے کا کوئی حق نہیں۔ میں تو وہی مانتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے۔ مجھے تو خوف ہے بڑے دن کے عذاب کا اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں۔"

اس لئے یہ ناممکن ہے کہ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کو باطل قرار دیں۔ شوافع اور احناف سب اس پر متفق ہیں کہ جو حکم نص قرآنی سے ثابت ہو، حدیث اس کی ناسخ نہیں ہو سکتی۔ احناف کے ایک مسلمہ قاضی ابوزید نے تصریح کی ہے:

لَمْ يُوْجَدْ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ مَا نُسِخَ بِالسُّنَّةِ

"قرآن کا کوئی حکم ایسا نہیں جو سنت سے منسوخ ہوا ہو۔"

اور یہ جو احناف اور شوافع کا اختلاف ہے کہ احناف کے نزدیک سنت ناسخ کتاب ہے اور شوافع کے نزدیک نہیں اس کی وجہ ایک علمی نکتہ ہے۔ وہ یہ کہ

زِيَادَةُ التَّخْصِيْصِ عَلَى النَّصِّ نَسْخٌ اَمْ لَا

"یعنی کتاب اللہ کے ایک عام حکم کو خاص کر دینا کیا یہ نسخ ہے یا نہیں۔"

شافعیوں کے نزدیک یہ نسخ نہیں اور حنفیوں کے نزدیک یہ بھی نسخ ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک عام اپنے تمام افراد پر قطعی الدلالہ ہے اور تخصیص سے حکم بعض افراد سے ساقط ہو جاتا ہے اور بعض پر باقی رہتا ہے۔ اس لئے اس تخصیص سے ان افراد پر جن سے حکم ساقط ہو گویا پہلا حکم منسوخ ہو گیا۔ اس اختلاف سے شوافع خبر واحد سے کتاب اللہ کی تخصیص کر

1۔ سورۂ یونس: 15

لیتے ہیں لیکن احناف کے نزدیک کیونکہ یہ نسخ ہے اس لئے خبر واحد سے زیادتی منع ہے بلکہ اس کے لئے خبر مشہور یا متواتر درکار ہے۔

احناف یہ ہرگز نہیں کہتے کہ سنت اس معنی میں ناسخ کتاب ہے کہ ایسا حکم جو نص کتاب سے ثابت ہے اسے بھی ساقط العمل کر دے۔ بلکہ یہاں تو احتیاط کا یہ عالم ہے کہ کسی عام حکم کی تخصیص کو، جسے شوافع بھی جائز سمجھتے ہیں، نسخ شمار کیا اور پھر اس کے لئے بھی خبر واحد کو کافی نہیں سمجھا گیا بلکہ اس کے لئے خبر مشہور یا متواتر ضروری سمجھی گئی۔ "بہ بیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا"(1)

نسخ کا اصول شریعت محمدیہ سے خاص نہیں

مستشرقین نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ نسخ کا قانون مسلمانوں کی اختراع ہے اور پیغمبر اسلام ﷺ نے قرآن کے تضادات کو جواز مہیا کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا تھا۔ لیکن یہ مستشرقین کی روایتی علمی بددیانتی ہے۔ وہ ایک ایسی چیز کے ذریعے اسلام کو مورد الزام ٹھہرانے کی کوشش کر رہے ہیں جو خود ان کے ہاں بھی مروج ہے۔

نسخ کا جو مفہوم ہم نے سطور بالا میں بیان کیا ہے، اس مفہوم کے لحاظ سے نسخ کا قانون شریعتوں کی تاریخ میں ہمیشہ رائج رہا ہے۔ وہ چیزیں جن میں نسخ کا احتمال نہیں ہے، وہ نہ تو متاخر شریعتوں کے ذریعے منسوخ ہوئیں اور نہ ہی ایک شریعت کے متاخر احکام نے سابقہ احکام کو منسوخ کیا۔ عقیدہ توحید، عقیدہ رسالت، کتابوں، فرشتوں، یوم قیامت اور جزا و سزا پر ایمان، فضائل کو اپنانے کا حکم اور رذائل سے بچنے کی تاکید، یہ سب احکام تمام انبیائے کرام کی شریعتوں کے مرکزی نقطے تھے اور ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوئی۔ لیکن جن مسائل میں نسخ کا احتمال تھا ان میں سے کئی احکام متاخر شریعتوں کے ذریعے منسوخ ہوئے۔

یہاں ایک بات خصوصی طور پر قابل توجہ ہے۔ آج ہمارے پاس جو الہامی صحیفے ہیں، ان میں باہم کئی نوعیتوں کے اختلافات ہیں۔ ان تمام اختلافات کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بعد کی شریعتوں نے پہلی شریعتوں کو منسوخ کر دیا ہے۔ مثلاً عہد نامہ قدیم و جدید میں بے شمار مسائل ایسے ہیں جن کا تعلق عقائد سے ہے۔ اور وہ عقائد اسلامی عقائد کے خلاف ہیں۔ تثلیث، کفارہ، الوہیت مسیح، ابنیت مسیح، خدا کا بنو اسرائیل سے خصوصی تعلق اور اسی

1- "سنت خیر الانام"، صفحہ 10-207

قسم کے دوسرے عقائد اسلامی عقائد سے متصادم ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ پہلے انبیائے کرام کی شریعتوں میں یہی عقائد حق تھے، جن کو شریعت اسلامیہ نے منسوخ کر دیا ہے۔

ہمارا ایمان ہے کہ انبیائے سابقین کے عقائد بالکل وہی تھے جو اسلام کے عقائد ہیں۔ لیکن یہود و نصاریٰ نے کتابوں میں تحریف کے ذریعے ان کو بدل دیا ہے۔ یہ اختلاف یہود و نصاریٰ کی تحریف کے سبب سے ہے، اس وجہ سے نہیں کہ اسلام نے سابقہ انبیاء کے عقائد کو منسوخ کر دیا ہے۔ اسی طرح بائیبل میں متعدد مقامات پر انبیائے سابقین کی طرف ایسی چیزیں منسوب کی گئی ہیں جن سے وہ نفوس قدسیہ بری الذمہ تھے۔ انبیائے کرام کی عصمتوں پر یہ حملے بھی یہود و نصاریٰ کے مریض ذہنوں کی ایجاد ہیں۔ نہ ان کا تعلق الہامی پیغام سے ہے اور نہ ہی قرآن حکیم نے ان کو منسوخ کیا ہے بلکہ قرآن کو تو اللہ تعالیٰ نے سابقہ کتابوں پر "مھیمن" بنا کر نازل فرمایا ہے اور اس نے اپنے "مھیمن" ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے یہود و نصاریٰ کی تحریفات کا پردہ چاک کر دیا ہے اور انبیائے کرام کے دامن کو ہر قسم کی آلائشوں سے پاک ثابت کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

دین کے بنیادی مسائل جن کا تعلق عقائد، فضائل کو اپنانے اور رذائل سے بچنے کے ساتھ تھا وہ ہر نبی کی شریعت کے بنیادی مسائل تھے۔ وہ نہ نسخ کو قبول کرتے ہیں اور نہ ہی وہ منسوخ ہوئے ہیں۔ البتہ انسانوں نے اپنی کارروائیوں سے ان کو بگاڑنے کی کوشش کی لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ایک نیا نبی مبعوث فرما کر ان اساسی تعلیمات کو حیات نو عطا فرمادی۔ یہ سلسلہ چلتا رہا اور آخر اس ہستی پر آ کر اختتام پذیر ہو گیا جس کے سر پر قدرت نے "خاتم النبیین" کا زریں تاج سجایا تھا۔ اس ہستی کو جو پیغام آخریں عطا ہوا تھا اس پر یہ مہر لگادی گئی:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (1)

"بے شک ہم ہی نے اتارا ہے اس ذکر (قرآن مجید) کو اور یقیناً ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔"

یہ پیغام حق جو نبی آخر الزمان ﷺ پر نازل ہوا ہے، کسی کو اس میں تحریف یا تبدیلی کرنے کی جرأت نہیں کیونکہ جس چیز کی حفاظت رب قدوس کر رہا ہو اسے کون نقصان پہنچا سکتا ہے۔

1۔ سورۃ الحجر: 9

لیکن شریعتوں کے ایسے احکام جن میں نسخ کا احتمال تھا وہ منسوخ ہوتے رہے ہیں۔ پہلی شریعتوں میں بھی ناسخ و منسوخ کا سلسلہ چلتا رہا اور شریعت محمدیہ نے بھی سابقہ شریعتوں کے کئی احکام کو منسوخ کیا۔ لیکن پروردگار عالم نے

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (1)

کا حکم نازل فرما کر نسخ کے دروازے کو بھی بند کر دیا۔ ہم کتنے خوش قسمت ہیں کہ ہمارے ہاتھوں میں ہدایت کا جو صحیفہ ہے اس میں نہ تو تحریف کا اندیشہ ہے اور نہ ہی نسخ کا امکان۔ امت مسلمہ اس فضل خداوندی پر جتنا شکر کرے کم ہے۔

سابقہ شریعتوں میں نسخ کی مثالیں

مستشرقین نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ نسخ کا قانون اسلام کے ساتھ خاص ہے حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ سابقہ شریعتوں میں بھی نسخ کا اصول رائج رہا ہے۔ شریعتیں اپنے سے پہلے والی شریعتوں کو بھی منسوخ کرتی رہی ہیں اور ایک ہی نبی کی شریعت کے احکام بھی اسی شریعت کے سابقہ احکام کو منسوخ کرتے رہے ہیں۔ عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید میں دونوں قسم کے نسخ کی مثالیں موجود ہیں۔ ہم یہاں نسخ کی دونوں قسموں کی چند مثالیں قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

شریعتوں کے اپنے سے سابقہ شریعتوں کے احکام کو منسوخ کرنے کی مثالیں

(1) شریعت موسویہ میں بہنوں سے نکاح مطلقاً حرام ہے خواہ وہ بہن صرف ماں کی طرف سے ہو یا باپ کی طرف سے یا ماں باپ دونوں کی طرف سے۔ یہ حکم عہد نامہ قدیم میں کئی مقامات پر مذکور ہے۔ کتاب الاحبار باب بیس آیت نمبر 17 میں ہے:

"جو شخص اپنی بہن کو بیوی بنائے خواہ وہ اس کے باپ کی بیٹی ہو یا اس کی ماں کی بیٹی ہو اور اس کی شرم گاہ کو دیکھے اور وہ عورت اس کی شرم گاہ کو دیکھے تو یہ شرم

1۔ سورۃ المائدہ: 3، ترجمہ: آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے اور پوری کر دی ہے تم پر اپنی نعمت اور میں نے پسند کر لیا ہے تمہارے لئے اسلام کو بطور دین

کی بات ہے۔ ان کو ان کے ابنائے قوم کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہئے۔ اس شخص نے اپنی بہن کے پردے کو کھولا ہے، اسے اپنے کئے کی سزا بھگتنی چاہئے۔"

کتاب استشناء کے باب نمبر 27 کی آیت نمبر 22 کے الفاظ یہ ہیں۔

"وہ شخص لعنتی ہے جو اپنی بہن سے ہم بستری کرتا ہے خواہ وہ اس کے باپ کی بیٹی ہو اور خواہ اس کی ماں کی بیٹی ہو۔"

بہن سے نکاح، جس کی حرمت کو شریعت موسویہ میں اس زور شور سے بیان کیا جا رہا ہے، بائیبل کے اپنے بیان کے مطابق پہلی شریعتوں میں یہ جائز تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے میں بھائی بہنوں سے نکاح کرتے تھے۔ بائیبل کے بیان کے مطابق حضرت سارہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ ہیں وہ باپ کی طرف سے آپ کی بہن بھی ہیں۔ بائیبل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے حضرت سارہ کے متعلق یہ الفاظ کہلوا رہی ہے:

"And, besides, she is my sister, the daughter of my father, only not the daughter of my mother and she became my wife." (1)

"علاوہ ازیں وہ میری بہن ہے۔ وہ صرف میرے باپ کی بیٹی ہے اور میری ماں کی بیٹی نہیں اور وہ میری بیوی بن گئی ہے۔"

بائیبل ایک طرف بہن سے نکاح کو حرام قرار دے رہی ہے اور اس جرم کو باعث عار اور مجرم کو گردن زدنی قرار دے رہی ہے اور ساتھ ہی یہ بتا رہی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بہن سے شادی کی تھی۔ بائیبل کے ان بیانات سے صرف یہی نتیجہ نکالنا ممکن ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعتوں میں بہن سے نکاح جائز تھا۔ شریعت موسویہ نے اس حکم کو منسوخ کر دیا اور بہن سے نکاح کو حرام قرار دے دیا۔

اگر یہاں ناسخ اور منسوخ کے تصور کو تسلیم نہ کیا جائے تو تمام اولاد آدم اور حضرت ابراہیم علیہ السلام تک جملہ انبیائے کرام اس فتویٰ کی زد سے نہیں بچ سکتے جو شریعت موسویہ نے بہن سے شادی کرنے والوں پر لاگو کیا ہے۔

1۔ کتاب پیدائش، باب 20، آیہ 12

نوٹ:۔ بائیبل کے بعض ترجموں میں باپ کی بیٹی کے الفاظ میں تبدیلی کر کے "باپ کی طرف سے رشتہ دار" کے الفاظ لکھے گئے ہیں لیکن یہ اس اعتراض سے بچنے کیلئے یہود و نصاریٰ کی تحریفی کوششوں کے سوا کچھ نہیں۔(1)

(2) بائیبل کے بیان کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام کی شریعت میں تمام سبزیوں اور تمام جانوروں کا کھانا حلال تھا۔ کتاب پیدائش باب 9 آیت نمبر 3 میں حضرت نوح علیہ السلام سے کہا جارہا ہے۔ "سبزیوں کی طرح تمام حرکت کرنے والے جانور جو زندہ ہیں وہ تمہاری خوراک بن سکتے ہیں۔ میں یہ سب تمہیں عطا فرماتا ہوں۔"

لیکن شریعت موسویہ میں اکثر جانوروں کو حرام قرار دے دیا گیا۔ کتاب الاحبار کے باب نمبر 11 میں ان جانوروں کی تفصیل بیان کی گئی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کے لئے حرام ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کی شریعت میں سب جانور حلال تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں کئی جانوروں کی حرمت کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ نسخ نہیں تو اور کیا ہے؟

(3) کتاب پیدائش کے باب انتیس میں وضاحت ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے ماموں کی دو بیٹیوں "لیا" اور "راخیل" کو ایک ساتھ اپنے نکاح میں رکھا۔ لیکن شریعت موسویہ میں دو بہنوں کو ایک ساتھ نکاح میں رکھنا حرام ہے، جس کو کتاب الاحبار کے باب 18 کی آیت نمبر 18 میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

"اپنی بیوی کی بہن سے شادی نہ کرو اور نہ اس کے ستر کو منکشف کرو۔ یعنی اپنی بیوی کی زندگی میں اس کی بہن کو اسکے ساتھ اپنی بیوی نہ بناؤ۔"

مندرجہ بالا دونوں بیان بائیبل کے ہیں۔ اگر ان کی توجیہہ یہ نہ کی جائے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی شریعت میں دو بہنوں کے ساتھ بیک وقت نکاح جائز تھا اور شریعت موسویہ نے اس حکم کو منسوخ کر دیا، تو حضرت یعقوب علیہ السلام پر شریعت کی مخالفت کا الزام عائد ہوتا ہے۔

(4) کتاب الخروج باب 6 آیت 20 میں ہے کہ عمران نے اپنے باپ کی بہن (یوخاند) سے نکاح کیا جس کے بطن سے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیھما السلام تولد ہوئے۔

1۔ علامہ شیخ رحمت اللہ بن خلیل الرحمن کیرانوالی، "اظہار الحق"، (المکتبۃ العصریہ، بیروت)، جلد 1، صفحہ 515

لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں پھوپھی سے نکاح حرام تھا۔ کتاب الاحبار کے باب 18 کی آیت نمبر 12 میں مذکور ہے:

"اپنے باپ کی بہن کا ستر منکشف نہ کرو کیونکہ وہ تمہارے باپ کی خونی رشتہ دار ہے۔"

اس سے پتہ چلا کہ پھوپھی سے نکاح شریعت موسویہ سے پہلے جائز تھا جس کو شریعت موسویہ نے منسوخ کر دیا۔

(5) ارمیاہ نبی کی کتاب کے باب اکتیس کی آیت نمبر 31 اور 32 میں ہے:

"دیکھو! دن آنے والے ہیں۔ یہ قول خدا ہے۔ میں بنو اسرائیل اور بنو یہوداہ سے ایک نیا عہد باندھوں گا۔ یہ عہد اس عہد جیسا نہیں ہوگا جو میں نے ان کے آباؤ اجداد کے ساتھ اس وقت کیا تھا جب میں نے انہیں مصر سے نکالنے کے لئے ان کا ہاتھ پکڑا تھا۔"

پرانے عہد کی جگہ نئے عہد کا معنی اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ پرانا عہد یا پرانی شریعت منسوخ ہو گئی اور اس کی جگہ نیا عہد یعنی نئی شریعت نافذ ہو گئی۔

(5) شریعت موسویہ میں مرد کو کسی بھی سبب سے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا اختیار تھا۔ اور اس مطلقہ عورت کے ساتھ پہلے خاوند کے گھر سے نکلنے کے بعد کوئی بھی مرد نکاح کر سکتا تھا۔ جیسا کہ کتاب استثناء کے باب چوبیس کی پہلی اور دوسری آیات میں وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے۔ لیکن شریعت عیسوی میں بدکاری کی علت کے بغیر کسی وجہ سے طلاق دینے کی مرد کو اجازت نہیں اور نہ ہی مطلقہ عورت کے ساتھ کسی دوسرے مرد کو شادی کرنے کی اجازت ہے۔ متی کی انجیل کے پانچویں باب کی آیات نمبر 31 اور 32 کے الفاظ وضاحت کر رہے ہیں کہ یہ پہلا حکم اب منسوخ ہو گیا ہے۔

(6) شریعت موسویہ میں کئی جانور حرام تھے لیکن شریعت عیسوی میں وہ حرمت منسوخ ہو گئی۔ سینٹ پال نے رومیوں کے نام جو خط لکھا اس کے چودھویں باب کی آیت نمبر 14، اور طیطوس کے نام اس کے خط کے پہلے باب کی آیت نمبر 15 میں سینٹ پال کا یہ فارمولا موجود ہے کہ پاک لوگوں کے لئے ہر چیز پاک ہے اور ناپاک لوگوں کے لئے ہر چیز نجس ہے۔

(7) شریعت موسویہ میں عیدوں اور یوم سبت کی پابندی پر بہت زور دیا گیا ہے۔ سبت

کے دن کام کرنے کو بہت بڑا جرم قرار دیا گیا ہے۔ عہد نامہ قدیم جو عیسائی بائبل کا ایک حصہ ہے، اس میں متعدد مقامات پر سبت کی پابندی پر زور دیا گیا ہے۔ بائبل میں ایسی مثالیں بھی ہیں جب یہودیوں نے سبت کی پابندی نہ کرنے والوں کو سنگسار کیا۔(1) لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق بائبل بتاتی ہے کہ آپ نے سبت کے احکام پر عمل نہیں کیا۔ یہودیوں کی ان کے ساتھ مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آپ سبت کے احکام کی پابندی نہیں کرتے تھے۔ یوحنا کی انجیل کے پانچویں باب کی آیت نمبر 16 کے الفاظ یہ ہیں:

"اس وجہ سے یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اذیتیں دینے لگے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ یہ کام سبت والے دن کرتے تھے۔"

اسی انجیل کے نویں باب کی سولھویں آیت کہتی ہے:

"سو کچھ فریسیوں نے کہنا شروع کر دیا "یہ آدمی خدا کی طرف سے فرستادہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ سبت کے احکام کی پابندی نہیں کرتا۔ دوسروں نے کہا: "یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک گناہ گار آدمی کے ہاتھ پر ایسی نشانیاں ظاہر ہوں (جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر ظاہر ہو رہی ہیں)، لہٰذا ان میں تفریق ہو گئی۔"

سبت کی پابندی شریعت موسویہ کا ایک متفقہ مسئلہ تھا، اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت نے اس حکم کو منسوخ نہ کیا ہوتا تو یہ ممکن ہی نہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس شرعی حکم کی مخالفت کرتے۔ آپ کا سبت کے احکام کی پابندی نہ کرنا اور اس وجہ سے یہودیوں کی طرف سے اذیتوں کا نشانہ بننا اس بات کی دلیل ہے کہ شریعت عیسوی میں یہ حکم منسوخ ہو گیا تھا۔

(8) کتاب پیدائش کے باب نمبر 17 کی آیت نمبر 14 میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت میں ختنے کا حکم ابدی تھا۔ یہ حکم حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام کی نسلوں میں مروج رہا۔ شریعت موسوی میں بھی ختنے کا حکم تھا۔ لوقا کی انجیل کے دوسرے باب کی آیت نمبر 21 کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بھی ختنہ ہوا۔ یہ حکم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع آسمانی تک جاری رہا۔

گو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں اس حکم کو منسوخ نہیں کیا گیا لیکن حضرت

1۔ "کتاب العدد"، باب 15، آیہ 35

عیسٰی علیہ السلام کے بعد آپ کی شریعت کو جن مقدسین نے بازیچہ اطفال بنائے رکھا، انہوں نے اس ابدی حکم کو منسوخ کر دیا۔(1) مسلمانوں کی نظروں میں گویہ نسخ کی مثال نہیں کیونکہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے رفع آسمانی کے بعد ان کی شریعت کا کسی سابقہ حکم کو منسوخ کرنا خارج از امکان ہے لیکن عیسائی جو ان مقدسین کی وضع کردہ شریعت پر کاربند ہیں وہ اس کو نسخ کے علاوہ کیا قرار دیں گے؟

(9) ذبیحہ کے احکام شریعت موسویہ میں بے شمار تھے جو عیسائی شریعت میں منسوخ ہو گئے ہیں۔(2)

(10) حضرت ہارون علیہ السلام کی نسل کے متعلق کہانت اور عبادت کے وقت لباس کے بے شمار احکام جو شریعت موسویہ کا حصہ تھے وہ عیسوی شریعت میں منسوخ ہو گئے ہیں۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بعد سینٹ پال اور دوسرے مقدسین نے شریعت تورات کے اکثر احکام کو کالعدم قرار دے دیا۔ عبرانیوں کے نام پولس کے خط کے ساتویں باب کی آیت نمبر 18 میں یہ الفاظ موجود ہیں:

"Certainly, then, there occurs a setting aside of the preceding commandments on account of it's weakness and ineffectiveness.

"یقیناً سابقہ احکام کو ان کی کمزوری اور ان کے بے اثر ہونے کی وجہ سے منسوخ کر دیا جاتا ہے۔"

عبرانیوں کے نام خط کے آٹھویں باب میں بنو اسرائیل کے ساتھ خدا کے قدیم عہد کے بدلے میں ایک جدید عہد کا ذکر ہے۔ اس باب کی آیت نمبر 7 میں ہے:

"اگر پہلا عہد بے عیب نہ ہوتا تو نئے عہد کی کوئی گنجائش نہ ہوتی۔"

اسی باب کی آیت نمبر 13 کے الفاظ یہ ہیں۔

"In his saying "a new]covenant "[he has made the former one obsolete .Now that which is made obsolete and growing old is near to vanishing away".

"نئے عہد کا لفظ استعمال کر کے اس نے پرانے عہد کو منسوخ کر دیا ہے۔"

1۔ "کتاب اعمال"، باب 15، آیہ 4

2۔ "اظہار الحق"، جلد 1، صفحہ 524

اب جس کو منسوخ قرار دے دیا گیا ہے اور جو پرانا ہو رہا ہے وہ مٹ جانے کے قریب ہے۔"

مندرجہ بالا اقتباسات بائبل کے ہیں جن میں ایسے الفاظ استعمال ہو رہے ہیں جو نسخ کے ہم معنی ہیں۔

عبرانیوں کے نام خط کے ساتویں باب کی آیت نمبر 12 میں سینٹ پال نے ایک ایسا اصول وضع کر دیا ہے جس کے بعد عیسائیوں کے لئے نسخ کے انکار کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ سینٹ پال کہتا ہے:

"For since the priesthood is being changed, there comes to be of necessity a change also of the law".

"جب امامت تبدیل ہو رہی ہے تو ضروری ہو جاتا ہے کہ شریعت بھی تبدیل ہو۔"

مندرجہ بالا مثالوں سے یہ حقائق روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتے ہیں کہ:

(ا) دوسری شریعتوں کے بعض احکام کو منسوخ کرنا شریعت اسلامیہ کا خاصہ نہیں بلکہ سابقہ شریعتوں میں بھی یہ اصول مروج رہا ہے۔

(ب) تورات کے تمام عملی احکام خواہ وہ ابدی تھے یا غیر ابدی، وہ عیسوی شریعت میں منسوخ ہو گئے۔

(ج) تورات اور اس کے احکام کے متعلق نسخ کا لفظ عیسائی کتابوں میں بھی موجود ہے۔

(د) عیسائی قدیس سینٹ پال نے وضاحت کی ہے کہ امامت کی تبدیلی سے قانون کا تبدیل ہونا ضروری ہے۔

(ہ) سینٹ پال کا دعویٰ ہے کہ قدیم شے فنا کے قریب ہوتی ہے۔

مندرجہ بالا حقائق کے ہوتے ہوئے یہودی اور عیسائی اسلام پر یہ الزام کیسے لگا سکتے ہیں کہ مسلمانوں نے قرآن حکیم کے تضادات کو جواز مہیا کرنے کیلئے نسخ کا اصول وضع کیا ہے۔

ہم نے گزشتہ صفحات میں عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید سے نسخ کی جو مثالیں پیش کی ہیں ان میں کئی باتیں ایسی ہیں جن سے اسلام بری الذمہ ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کے نزدیک کسی منسوخ شریعت یا سابقہ الہامی کتاب کے متعلق ایسے الفاظ استعمال کرنا جرم ہے جن سے ان کی شان میں کمی کا شائبہ پیدا ہوتا ہو۔ لیکن بائبل میں سابقہ شریعتوں کے متعلق ایسے

الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جو نامناسب ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہم نے اس بحث میں انہی صحائف کو پیش نظر رکھا ہے جو اس وقت یہود و نصاریٰ کے ہاں مروج ہیں۔ چونکہ مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ان کتابوں میں بے شمار تحریفیں ہو چکی ہیں، اس لئے ضروری نہیں کہ بائیبل کے جس مسئلے کو ناسخ یا منسوخ ظاہر کیا گیا ہے، اسلام بھی اسے ناسخ یا منسوخ ہی سمجھتا ہو۔ کیونکہ ممکن ہے ناسخ اور منسوخ دونوں یا ان میں سے ایک یہود و نصاریٰ کی تحریفی کوششوں کا نتیجہ ہو۔

مسلمانوں کے ہاں نسخ کی اصطلاح مخصوص شرائط کے ساتھ استعمال ہوتی ہے۔ ان کے ہاں ایسا حکم جسے ابدی قرار دیا گیا ہو، وہ منسوخ نہیں ہوتا۔ لیکن گزشتہ مثالوں میں عہد نامہ جدید نے ان احکام کو بھی منسوخ کر دیا ہے جن کو تورات میں ابدی قرار دیا گیا تھا۔ اسی طرح سینٹ پال وغیرہ نے تورات کے ایسے احکام پر بھی خط تنسیخ کھینچنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی جو نسخ کو قبول ہی نہیں کرتے۔

چاہئے تو یہ تھا کہ نسخ کا جو بے قید اصول ان کے اپنے صحیفوں میں نظر آتا ہے، یہودی اور عیسائی اس کو شک کی نظر سے دیکھتے اور اس منطقی نتیجے پر پہنچتے کہ ان کے مذہبی راہنما تورات کو کلام خداوندی یقین کرنے کے بعد اس کے ساتھ جو سلوک روا رکھتے رہے ہیں وہ صحیح نہ تھا۔ اور وہ اس وجہ سے اپنے اکابر کو مورد الزام ٹھہراتے اور نسخ کے قانون کو حدود و شرائط کا پابند کرنے پر اسلام کی تعریف کرتے، لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔

اسلام نے نسخ کے قانون کو شریعت کے عملی احکام تک محدود رکھا ہے۔ اور وہ بھی ایسے عملی احکام جن کے ابدی ہونے کی صراحت نہ ہو۔ اسلام کا یہ قانون نسخ جو محدود اور مشروط ہے وہ تو مستشرقین کو کھٹکتا ہے لیکن نسخ کی جو بے رحم چھری عہد نامہ قدیم و جدید میں چلتی نظر آتی ہے، اس کی طرف ان کی توجہ مبذول نہیں ہوتی۔

اگر عہد نامہ جدید و قدیم میں نسخ کا اصول موجود ہونے کے باوجود ان کے کلام خداوندی ہونے پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا اور نہ ان کی الہامی حیثیت مشکوک ہوتی ہے، تو نسخ کے اسی اصول کی وجہ سے حضور ﷺ کو قرآن کا مصنف کہنا اور اسے کلام خداوندی تسلیم نہ کرنا کہاں کی علمیت اور کہاں کا انصاف ہے؟

اگر عیسوی شریعت موسوی شریعت کے بے شمار احکام کو منسوخ کر سکتی ہے اور موسوی شریعت سابقہ شریعتوں کے کئی احکام کو منسوخ کر سکتی ہے تو پھر اسلامی شریعت عیسوی

شریعت کے احکام کو کیوں منسوخ نہیں کر سکتی؟
نسخ کا قانون اگر ضروری اور مفید ہے تو وہ ہر جگہ مفید ہو گا اور اگر وہ غلط ہے تو ہر جگہ غلط ہو گا۔ یہ بات ہم تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ شریعت اسلامیہ سابقہ شریعت کو منسوخ کر دے تو مورد الزام ٹھہرے اور عیسوی شریعت سابقہ شریعتوں کو ناقص اور ناکارہ کہہ کر منسوخ قرار دے دے تو بھی اس کے تقدس میں کوئی فرق نہ آئے۔

ایک ہی شریعت کے احکام کے ناسخ اور منسوخ ہونے کی مثالیں

بائبل میں جس طرح سابق شریعتوں کے احکام کو منسوخ کرنے کی بے شمار مثالیں موجود ہیں اسی طرح ایسی بھی بے شمار مثالیں موجود ہیں جن میں ایک ہی شریعت کے احکام اسی شریعت کے دوسرے احکام کو منسوخ کر رہے ہیں۔ ہم یہاں اس قسم کی چند مثالیں قارئین کرام کے فائدے کے لئے پیش کرتے ہیں۔

(1) کتاب پیدائش کے بائیسویں باب میں اس بات کی تفصیل موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ اپنے بیٹے اسحاق علیہ السلام کو قربان کریں لیکن جب انہوں نے حکم کی تعمیل کا ارادہ کر لیا تو انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ملا کہ اپنے بیٹے کو قربان نہ کرو۔
یہاں پہلا حکم اگر دوسرے حکم سے منسوخ نہیں تو پھر اور کیا ہے؟

(2) صموئیل اول کے دوسرے باب میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا تھا کہ امامت کا منصب بڑے پادری کے خاندان میں ہمیشہ رہے گا۔ لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ نے اس فیصلہ کو بدل دیا۔ مذکورہ باب کی آیت نمبر 30 کے الفاظ یہ ہیں۔

"خدائے اسرائیل کا فرمان یہ ہے: میں نے تمہارے اور تمہارے اسلاف کے گھرانے سے کہا تھا کہ تم ہمیشہ میرے آگے آگے چلا کرو گے لیکن اب خدا کا فرمان یہ ہے کہ جہاں تک میرا تعلق ہے، یہ بات ناقابل تصور ہے کیونکہ جو میری تسبیح کرتے ہیں میں ان کا احترام کرتا ہوں اور جو میری توہین کرتے ہیں ان کی میرے نزدیک کوئی حیثیت نہیں۔"

اسی باب کی آیت نمبر 35 میں ہے:
"میں یقیناً اپنے لئے ایک وفادار پادری پیدا کروں گا جو وہی کرے گا جو میرے دل

اور روح کے مطابق ہو گا۔"

کتاب صموئیل اول کی ان آیات سے واضح ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے بڑے پادری کے خاندان کو منصب امامت تا ابد عطا فرمانے کا وعدہ کیا تھا لیکن بعد میں اس فیصلے کو بدل دیا اور ان کی جگہ منصب امامت دوسروں کو تفویض کر دیا۔

بائیبل کے مفسرین کہتے ہیں کہ یہ منصب اللہ تعالیٰ نے حضرت ہارون علیہ السلام کے بڑے بیٹے "عازار" کو ہمیشہ کے لئے عطا فرمایا تھا لیکن بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا۔(1)

عیسائی تو خدا کے ابدی وعدے پر بھی نسخ کا اصول لاگو کر رہے ہیں لیکن مسلمان اس قسم کی باتوں کو نسخ کے دائرہ کار سے باہر سمجھتے ہیں۔ وعدہ کر کے اسے پورا نہ کیا جائے تو یہ نسخ نہیں وعدہ خلافی کہلاتا ہے۔ مسلمان اللہ تعالیٰ کی ذات کو اس قسم کی صفات سے مبرا یقین کرتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ کا مزاج مختلف ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ پر وعدہ خلافی کا الزام بھی لگا لیتے ہیں اور ندامت جیسی کمزوریوں کو بھی اس کی پاک ذات کی طرف منسوب کر لیتے ہیں۔ بائیبل اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ اس قسم کی تمام باتوں کا وحی آسمانی ہونے سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ سب یہودیوں اور عیسائیوں کی تحریفات ہیں اور اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے۔

سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يَقُولُونَ عُلُوًّا كَبِيرًا

(3) کتاب الاحبار کے سترھویں باب میں حکم ہے کہ بنو اسرائیل کا جو شخص کوئی جانور ذبح کرے وہ اپنی قربانی کو خدا کے حضور پیش کرنے کے لئے خیمہ عبادت کے دروازے پر لائے اور جو شخص ایسا نہ کرے وہ گردن زدنی ہے لیکن کتاب استثناء کے بارھویں باب میں وضاحت کر دی گئی ہے کہ جب جی چاہے اور جہاں جی چاہے جو جانور چاہو ذبح کر و اور کھاؤ۔

ان آیات کی تفسیر میں بائیبل کا ایک مفسر ہورن لکھتا ہے۔(2)

"ان دونوں مقامات میں بظاہر تناقض نظر آتا ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ شریعت موسویہ میں بنی اسرائیل کے حالات کے مطابق کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔ اور شریعت موسوی ایسی نہیں تھی کہ اس میں بوقت ضرورت تبدیلی نہ کی جاسکے۔"

1۔ "اظہار الحق"، جلد 1، صفحہ 532

2۔ ایضاً، صفحہ 535

اس کے بعد مفسر مذکور لکھتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی ہجرت کے چالیسویں سال فلسطین میں داخل ہونے سے پہلے اس حکم کو منسوخ کر دیا اور اسرائیلیوں کو حکم دیا کہ فلسطین میں داخل ہونے کے بعد وہ جہاں چاہیں جانور ذبح کریں۔

مفسر مذکور نے یہاں نسخ کو بھی تسلیم کیا ہے اور اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ شریعت موسویہ میں کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔ لیکن حیرت ہے کہ اسی نسخ کو یہود و نصاریٰ اسلام پر بہت بڑا اعتراض بنا کر پیش کرتے ہیں۔

(4) کتاب گنتی کے چوتھے باب کی مختلف آیات میں خیمہ عبادت کے خادمین کی عمریں تیس سال اور پچاس سال کے درمیان مقرر کی گئی ہیں، جب کہ اسی کتاب کے آٹھویں باب کی آیات چوبیس اور پچیس میں خدام کی عمروں کی حد 25 سال سے 50 سال تک مقرر کی گئی ہے۔ ظاہر ہے ان میں سے ایک حکم ناسخ ہے اور دوسرا منسوخ۔

(5) کتاب الاحبار کے چوتھے باب میں جماعت کی غلطی کا فدیہ صرف ایک بیل قرار دیا گیا ہے لیکن کتاب گنتی کے پندرھویں باب میں جماعت کی غلطی کا کفارہ ایک بیل کے علاوہ غلہ، مشروبات اور بکری کے ایک بچے کی قربانی کو قرار دیا گیا ہے۔ گویا دوسرے حکم نے پہلے حکم کو منسوخ کر دیا۔

(6) متی کی انجیل کے دسویں باب کی آیات نمبر 5 اور 6 کے الفاظ یہ ہیں:

"These twelve Jesus sent forth, giving them these orders, Do not go off into the road of the nations, and do not enter into a sámaritan city, but instead go continually to the lost sheep of the house of Israel."

"حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان بارہ (حواریوں) کو ان احکام کے ساتھ روانہ فرمایا قوموں کے راستے پر مت جانا، سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا۔ بلکہ تسلسل کے ساتھ اسرائیلی گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔"

اسی کتاب کے پندرھویں باب کی آیت نمبر 25 میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی یہ وضاحت مذکور ہے:

"I was not sent forth to any but to the lost sheep of the house of Israel".

"میں اسرائیلی گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے علاوہ کسی کی طرف نہیں بھیجا گیا۔"

مندرجہ بالا آیات سے بغیر کسی شک وشبہ کے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا پر واضح فرما رہے ہیں کہ آپ کا حلقہ تبلیغ بنو اسرائیل تک محدود ہے۔ اور آپ کا پیغام اسی قوم کے لئے خاص ہے۔ لیکن مرقس کی انجیل کے سولھویں باب کی آیت نمبر 15 کے الفاظ یہ ہیں۔

"And he said to them ,Go into all the world and preach the good news to all creation".

"اور آپ نے ان (حواریوں) سے فرمایا: ساری دنیا میں جاؤ اور تمام دنیا کو انجیل کی تبلیغ کرو۔"

وہی پیغام جو انجیل متی کے مطابق ایک قوم تک محدود تھا، اسی پیغام کو انجیل مرقس میں عالمی قرار دیا جا رہا ہے۔ عیسائی حضرات کے لئے اب دو ہی صورتیں ہیں کہ یا تو دونوں انجیلوں میں تضاد کو تسلیم کریں اور یا پھر یہ کہیں کہ مرقس کی انجیل کے ذریعے متی کی انجیل کا حکم منسوخ ہو گیا ہے۔

(7) انجیل متی کے تیئیسویں باب کی پہلی آیت میں ہے:

"حضرت عیسیٰ علیہ السلام لوگوں کے ہجوم اور اپنے حواریوں سے یوں گویا ہوئے: کاتبوں اور فریسیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جگہ لے لی ہے۔ لہٰذا وہ جو باتیں تم سے کہتے ہیں ان کا خیال رکھو اور ان پر عمل کرو۔"

ظاہر ہے کاتب اور فریسی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نیابت میں احکام تورات کی پابندی کا ہی حکم دیتے تھے اسی لئے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام لوگوں کو انکا کہا ماننے کا حکم دے رہے ہیں۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکار کہلانے والوں نے تورات کے احکام کو اپنی شریعت سے خارج کر دیا ہے۔ اسے وہ نسخ نہیں کہیں گے تو اور کیا کہیں گے۔

(8) یوحنا کی انجیل کے تیسرے باب کی آیت نمبر 17 اور بارھویں باب کی آیت نمبر 47 کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرما رہے ہیں کہ وہ لوگوں کو ہلاکت اور معصیت میں مبتلا کرنے دنیا میں تشریف نہیں لائے بلکہ وہ نجات دہندہ بن کر تشریف لائے ہیں۔ لیکن "تسالونیون" کے نام دوسرے خط کے دوسرے باب کی آیت نمبر 8 میں ہے کہ "گناہ گار کا راز

فاش کیا جائے گا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی پھونک کے ذریعے اسے ختم کر دیں گے۔"
مذکورہ بالا دونوں بیانوں میں یا تو تضاد ہے، یا پہلا حکم دوسرے حکم سے منسوخ ہے۔ عیسائی حضرات ہی بہتر جانتے ہیں کہ وہ ان دونوں امکانات میں سے کس کو تسلیم کرتے ہیں۔
ہم نے گزشتہ صفحات میں شریعتوں کے سابقہ شریعتوں کے احکام کو منسوخ کرنے اور ایک ہی شریعت کے متاخر احکام کے اپنے سے سابقہ احکام کو منسوخ کرنے کی متعدد مثالیں پیش کی ہیں۔ دونوں اقسام کی ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو گئی کہ نسخ کا قانون ہر شریعت میں رائج رہا ہے۔ اور عہد نامہ قدیم اور جدید میں تو ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جو نسخ سے بھی کچھ زیادہ ہیں۔
اللہ تعالیٰ حکیم ہے۔ اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ زمانے کے بدلنے کے ساتھ ساتھ انسانی ضرورتیں اور زندگی کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں۔ کسی حالت میں کوئی حکم مفید ہوتا ہے اور کسی دوسری حالت میں وہی حکم مضر ثابت ہو سکتا ہے۔ ایک حکم ایک زمانے میں قابل عمل ہوتا ہے اور کسی دوسرے زمانے میں وہی حکم قابل عمل نہیں رہتا۔ کسی زمانے کے لوگ کسی حکم کے تقاضوں کو سمجھنے اور انہیں پورا کرنے کے قابل ہوتے ہیں اور کسی دوسرے زمانے کے لوگ اس حکم کے تقاضوں کو نہ سمجھ سکتے ہیں اور نہ اس حکم کی تعمیل کر سکتے ہیں۔
لہٰذا دانائی کا تقاضا یہی تھا کہ ہر زمانے کے حالات کے مطابق احکام نازل کیے جاتے۔ اور یقیناً اللہ تعالیٰ نے احکام اور شریعتیں اسی اصول کے مطابق نازل فرمائیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مندرجہ ذیل قول کے بعد نسخ کو محال سمجھنے کی گنجائش بالکل ختم ہو جاتی ہے۔
انجیل یوحنا کے سولھویں باب کی آیات نمبر 12 اور نمبر 13 کے الفاظ یہ ہیں:

"I have many things yet to say to you, but you are not able to bear them at present. However, when that one arrives, the spirit of the truth, he will guide you into all the truth for he will not speak of his own impulse, but what things he hears he will speak, and he will declare to you the things coming".

"میرے پاس تمہیں بتانے والی بہت سی باتیں ہیں لیکن فی الحال تم انہیں برداشت نہیں کر سکتے۔ البتہ جب وہ آئے گا جو سچائی کی روح ہے تو وہ

ساری سچائیوں کی طرف تمہاری راہنمائی کرے گا۔ کیونکہ وہ اپنی خواہش سے نہیں بولے گا بلکہ جو سنے گا وہی کہے گا۔ اور وہ تمہارے سامنے ان امور کا اعلان کرے گا جو مستقبل میں رونپذیر ہونے والے ہیں۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی امت سے کہہ رہے ہیں کہ تم سے کرنے والی باتیں تو بہت ہیں لیکن ابھی تم ان کو سننے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ لیکن مستقبل میں ایک عظیم ہستی تشریف لائے گی جو تمہیں تمام سچائیوں سے آگاہ کرے گی۔

یہ بات اب راز نہیں رہی کہ انسان کی ذہنی سطح ارتقاء کے مراحل سے گزر کر کمال تک پہنچی ہے۔ ہر مرحلے کی ذہنی سطح کے لئے جو احکام موزوں تھے وہ نازل کئے جاتے رہے اور جب مرحلہ بدل گیا، انسان کی ذہنی سطح نے ارتقاء کا ایک اور مرحلہ طے کر لیا تو پہلے احکام کو منسوخ کر کے نئے احکام نازل فرمادیئے گئے۔ اگر یہ اسلوب نہ ہوتا تو احکام انسان کے ذہنی ارتقاء کا ساتھ نہ دے سکتے اور خود بخود ختم ہو جاتے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام انبیائے بنو اسرائیل میں سے سب سے آخر میں تشریف لائے۔ جب ان کے زمانے کے لوگ بھی ساری سچائیوں کو برداشت کرنے کے قابل نہ تھے تو وہ لوگ تمام سچائیوں کے متحمل کیسے ہو سکتے تھے جو ان سے بھی پہلے گزر چکے تھے۔

اس لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کی ذہنی سطح کے مختلف ارتقائی مراحل میں مختلف شریعتیں نازل فرمائیں لیکن انسان جب ذہنی طور پر مرتبہ کمال کو پہنچ گیا تو اللہ تعالیٰ نے وہ امت پیدا فرمائی جو "خیر الامم" ہے اس امت کو وہ نبی عطا فرمایا جو "سید المرسلین" ہے اور اس کے ذریعے وہ دین نازل ہوا جس پر کمال کی مہر لگ چکی ہے۔ اب قیامت تک اسی دین کی پیروی دنیوی اور اخروی کامیابی کی ضامن ہے۔ اسی لئے پروردگار عالم نے اس کی حفاظت کو اپنے ذمے لے رکھا ہے۔

ابو جہل سے لے کر سلمان رشدی تک، مکہ کے کفار سے لے کر یورپ کے مستشرقین تک سب دشمن اس کو نقصان پہنچانے کے لئے صدیوں سے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں لیکن اس دین متین کا جھنڈا نت نئی بلندیوں پر لہراتا نظر آتا ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اسلام کی صداقت کی نشانی ہے۔ کاش دشمنان اسلام اس سے عبرت حاصل کریں۔

آیات کے بھلا دیئے جانے پر اعتراض

آیات کے بھلا دیئے جانے پر اعتراض

مستشرقین چونکہ قرآن حکیم کو اللہ تعالیٰ کا کلام تسلیم نہیں کرتے اس لئے اس کو حضور ﷺ کی تصنیف ثابت کرنے کے لئے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں۔ انہوں نے جس طرح نسخ کے اصول کو قرآن کے تضادات سے بچنے کا حربہ قرار دیا ہے اسی طرح انہوں نے یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ قرآن میں ایسے اشارے موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضور ﷺ کو کچھ آیات بھلوادی جاتی تھیں۔ آیات کے بھلوادیئے جانے کو وہ حضور ﷺ کی طرف سے قرآن حکیم کی نظر ثانی کے مترادف قرار دیتے ہیں۔

منٹگمری واٹ کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے:

"It is next to be noted, however, that in one or two passages the Quran envisages the possibility that Muhammad may forget certain verses and this, of course, is tantamount to revision by omission or deletion, even though the forgetting is caused by God. Incidently, this implies that the revelations were not written down." (1)

"البتہ اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہئے کہ ایک دو آیتوں میں قرآن بیان کرتا ہے کہ ممکن ہے حضور ﷺ چند آیات کو بھول گئے ہوں۔ یہ بھلا دیئے جانے کا عمل حذف کے ذریعے نظر ثانی کے مترادف ہے، اگرچہ بھلوانا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس بات سے ضمناً یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ قرآن حکیم لکھا ہوا نہیں تھا۔"

قرآن حکیم میں اس بات کی وضاحت کہیں بھی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو کچھ آیات فراموش کرادی تھیں۔ مستشرقین جن آیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں ان میں

1۔ "محمد ایٹ مکہ"، صفحہ 69

سے ایک تو وہی ہے جس میں نسخ اور بھلوا دیے جانے کا ذکر ہے:

مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰیَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَانَاتِ بِخَیۡرٍ مِّنۡهَآ اَوۡ مِثۡلِهَا (1)

"جو آیت ہم منسوخ کر دیتے ہیں یا فراموش کرا دیتے ہیں تو لاتے ہیں (دوسری) بہتر اس سے یا (کم از کم) اس جیسی۔"

اور دوسری سورۃ الاعلیٰ کی یہ آیت ہے۔

سَنُقۡرِئُكَ فَلَا تَنۡسٰۤی اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ (2)

"ہم خود پڑھائیں گے آپ کو۔ پس آپ اسے نہ بھولیں گے، بجز اس کے جو اللہ چاہے۔"

ان میں سے پہلی آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ اپنی سنت بیان فرمارہا ہے کہ ہم اپنے بندوں کو اپنی قدرت کی بے شمار نشانیاں بھی دکھاتے رہتے ہیں اور ان کی ہدایت و راہنمائی کے لئے آیات بھی نازل فرماتے رہتے ہیں۔ ہم ان میں سے جن آیات کو قائم رکھنا چاہتے ہیں انہیں قائم رکھتے ہیں اور جن کو فراموش کرانا چاہتے ہیں انہیں فراموش کرا دیتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے جو کسی زمانے سے مخصوص نہیں ہے۔ یہاں انساء (بھلوا دینا) نسخ کی ہی ایک قسم ہے۔ نسخ کا تعلق حکم سے ہے۔ کبھی حکم منسوخ ہو جاتا ہے اور آیت کی تلاوت باقی رہتی ہے۔ لیکن انساء کے ذریعے نسخ کی اس قسم کو بیان کیا جارہا ہے جس میں حکم کے ساتھ ساتھ تلاوت بھی منسوخ ہو جاتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے ذہنوں سے بھی ان آیات کو محو فرمادیتا ہے۔

مستشرقین اس سے یہ استدلال بھی کرتے ہیں کہ بھلا دیا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن لکھا ہوا موجود نہیں تھا۔ لیکن وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ جو ہستی لوح قلب سے کسی چیز کو محو کر سکتی ہے اس کے لئے صفحہ قرطاس سے کسی چیز کو مٹا دینا بھی ناممکن نہیں۔ اس آیت کریمہ میں گویا نسخ اور انساء کے الفاظ استعمال کر کے نسخ کی تمام ممکنہ صورتوں کو بیان کر دیا گیا ہے۔

دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کا بیان فرمارہے ہیں کہ اے حبیب! ﷺ آپ کو قرآن حکیم یاد رکھنے کے لئے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم آپ کو پڑھائیں گے

1۔ سورۃ البقرۃ: 106

2۔ سورۃ الاعلیٰ: 7-6

اور اس طرح پڑھائیں گے کہ آپ کچھ نہیں بھولیں گے۔ ہاں! اگر اللہ تعالیٰ اپنی حکمت سے کسی چیز کو فراموش کرانا چاہے تو وہ علیحدہ بات ہے۔

اگر دقت نظر سے دیکھا جائے تو یہ آیات اس بات کی دلیل فراہم کر رہی ہیں کہ قرآن حکیم حضور ﷺ کی تصنیف نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ مستشرقین کہتے ہیں کہ قرآن میں متضاد احکام موجود تھے، ان کا جواز فراہم کرنے کے لئے حضور ﷺ نے نسخ کا قانون متعارف کرایا۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر قرآن حضور ﷺ کی اپنی تصنیف ہوتا تو آپ کو یہ بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ اللہ چاہے تو کچھ آیات فراموش بھی کرا سکتا ہے۔

مستشرقین جن مقاصد کو نسخ اور انساء کو متعارف کرانے کا سبب قرار دیتے ہیں، وہ تو نسخ سے بھی پورے ہو سکتے تھے۔ نسیان جو ایک عیب شمار ہوتا ہے، حضور ﷺ کو اس کے اعلان کی کیا ضرورت تھی؟

حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم کی حفاظت کو اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی ذمہ داری ہی قرار نہیں دیا، بلکہ اسے اپنے ذمہ قدرت پر لے لیا ہے۔ حضور ﷺ پر جب قرآن حکیم کی آیات نازل ہوتیں تو آپ ان کو یاد کرنے کی غرض سے جلدی جلدی پڑھنے کی کوشش فرماتے۔ وحی کے الفاظ کو توجہ سے سننا، ان کا مفہوم ذہن نشین کرنا اور پھر ان الفاظ کو یاد رکھنے کی غرض سے انہیں دہرانا، بہ یک وقت سہ گونہ کوشش مشقت طلب تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں آپ کو تسلی دے کر اس مشقت سے آزاد فرمایا:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۞ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۞ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۞ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۞(1)

"اے حبیب! آپ حرکت نہ دیں اپنی زبان کو اسکے ساتھ تاکہ آپ جلدی یاد کر لیں اس کو۔ ہمارے ذمہ ہے اس کو (سینہ مبارک میں) جمع کرنا اور اس کو پڑھانا۔ پس جب ہم اسے پڑھیں تو آپ اتباع کریں اسی پڑھنے کا۔ پھر ہمارے ذمہ ہے اس کو کھول کر بیان کر دینا۔"

ان آیات کریمہ میں قرآن حکیم کی لفظی اور معنوی حفاظت کے جتنے شعبے تھے انہیں پروردگار عالم نے اپنے ذمہ قدرت پر لینے کا اعلان فرما دیا ہے۔ حضور ﷺ کو تو بتقاضائے

1۔ سورۃ القیامۃ: 19-16

بشریت یہ فکر تھی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو امانت آپ کے قلب اطہر کو ودیعت ہو رہی ہے، کہیں اس کی حفاظت میں کوتاہی نہ ہو جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس فکر سے آزاد فرمادیا اور فرمایا ہم علوم و معارف کا جو سمندر آپ کے قلب انور پر نازل فرما رہے ہیں، نہ اس کو یاد رکھنے کے لئے آپ کو کسی تردد کی ضرورت ہے، نہ اس کے مفاہیم کو سمجھنے کے لئے آپ کو پریشان ہونا چاہئے، بلکہ یہ سب کام ہم خود کریں گے۔

آپ پر جو کچھ نازل ہوگا، ہم اس کے تمام اسرار و رموز بھی آپ کے قلب انور پر منکشف فرمائیں گے اور اس کی حفاظت بھی خود کریں گے۔

اسی ضمن میں آپ ان آیات پر غور کریں جن میں آیات کے فراموش کرادینے کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرما رہے ہیں کہ ہم خود قرآن حکیم کے الفاظ و مفاہیم کی حفاظت فرمائیں گے۔ ہاں! اگر ہماری حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ کسی بات کو آپ کے قلب انور سے محو کردیں تو ہم یہ بھی کریں گے۔ آپ کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

بعض مسلمان مصنفین بھلا دیئے جانے کو ایک نقص سمجھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ حضور ﷺ عملاً کچھ نہیں بھولے تھے۔ گو قرآن حکیم کی کوئی آیت بھی انساء کے عملاً واقع ہونے کو بیان نہیں کرتی لیکن احادیث طیبہ سے پتہ چلتا ہے کہ انساء واقع بھی ہوا ہے۔ ان میں کچھ وہ احادیث بھی ہیں جن کو علمائے حدیث نے صحیح اور مستند قرار دیا ہے۔

جب احادیث طیبہ ان آیات کی تشریح میں وضاحت کر رہی ہیں کہ انساء عملاً واقع ہوا ہے تو ہمیں یہود و نصاریٰ اور مستشرقین کے وسوسوں سے بچنے کے لئے ان احادیث کو غیر مستند قرار دینے کے تکلف کی ضرورت نہیں۔ جس طرح انسان کے یاد کرنے اور خدا کے یاد کرانے میں فرق ہے اسی طرح انسان کے بھول جانے اور خدا کے بھلوا دینے میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہے۔ انسانوں کا یاد کرنا تو یہ ہے کہ چند سو صفحات کی کتاب بھی انسان کو نہ یاد ہوتی ہے اور نہ یاد رہتی ہے۔ بائیبل کو ماننے والوں کی تعداد دنیا میں مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہے لیکن ان میں بائیبل کا ایک بھی حافظ نظر نہیں آتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان صحائف کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے ذمہ قدرت پر نہیں لی۔ اور انسان کے یاد کرنے کی صلاحیتوں سے یہ کام بالاتر ہے۔

اور خدا کا یاد کرانا یہ ہے کہ حضور ﷺ کو بغیر کسی مشقت کے قرآن حکیم یاد ہوا اور یاد

رہا اور آپ کی امت کے لاکھوں خوش نصیبوں کو قرآن یاد ہوتا بھی ہے اور یاد رہتا بھی ہے۔
ہم نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو کسی دوسرے مضمون کو سمجھنے میں تو بالکل غبی نظر آتے ہیں لیکن قرآن ان کے سینے میں بھی یوں محفوظ ہوتا ہے جیسے کسی ذہین ترین انسان کے سینے میں محفوظ ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سابقہ صحف سماویہ کے برعکس قرآن حکیم کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ قدرت پر لے رکھی ہے۔ اور وہ خود قرآن کو انسان کے سینے میں محفوظ فرماتا ہے۔

انسان کے بھول جانے اور خدا کے بھلوا دینے کا معاملہ بھی یہی ہے۔ کیونکہ انسان جب بھولتا ہے تو یہ بات اس کے اختیار میں نہیں ہوتی کہ وہ ان باتوں کو تو فراموش کر دے جن کی افادیت کا زمانہ گزر چکا ہے اور جنکی افادیت باقی ہے ان کو فراموش نہ کرے۔ انسان جب بھولے گا تو یہ امتیاز قائم نہ رکھ سکے گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے بھلوانے کا معاملہ اور ہے۔ وہ اس بات پر قادر ہے کہ اپنے بندوں کے اذہان و قلوب پر جن آیات کو ثابت رکھنا چاہے، ان کو ثابت رکھے اور جن کو محو کر دینا اس کی مرضی کے مطابق ہوا نہیں محو کر دے۔ انسان کا بھول جانا تو واقعی انسانی کمزوریوں کی فہرست میں شمار ہوتا ہے لیکن خدا کا بھلوا دینا انسان کا فعل ہی نہیں اس لئے یہ اس کا نقص بھی شمار نہیں ہوگا۔

بعض لوگوں نے ان آیات کا کھوج لگانے کی کوشش بھی کی ہے جن کو فراموش کرادیا گیا لیکن یہ غیر ضروری تکلف ہے۔ جن آیات کو فراموش کرادینا قدرت کو مطلوب تھا، ان کی حفاظت نہ حضور ﷺ کے پیش نظر تھی اور نہ انہیں آئندہ نسلوں تک پہنچانا صحابہ کرام کی ذمہ داری تھی۔ اس لئے جن چیزوں کی حفاظت مقصود ہی نہ تھی نہ وہ محفوظ رہ سکتی تھیں نہ ان کا کھوج لگانے کی ہمیں ضرورت ہے اور نہ ہی یہ کام ممکن ہے۔

مستشرقین نے تو ان آیات کو بھی وحی کے فراموش کرانے کے معنی میں استعمال کیا ہے جن میں حضور ﷺ کے کوئی کام یا چیز بھول جانے کا ذکر ہے۔ منٹگمری واٹ کہتا ہے۔(1)

"غالباً ایک اور آیت بھی وحی بھول جانے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ گو ممکن ہے کہ اس آیت میں وحی کے علاوہ ان دوسری حقیقتوں کو بھول جانے کی طرف اشارہ ہو جو وحی کے ساتھ منسلک ہوں۔"

1۔ "محمد ایٹ مکہ"، صفحہ 70

منٹگمری واٹ نے جس آیہ کریمہ کی طرف اشارہ کر کے یہ بات کہی ہے وہ آیت کریمہ یہ ہے۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ إِذَا نَسِيْتَ وَقُلْ عَسَىٰ أَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِأَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا (1)

"اور یاد کر اپنے رب کو جب تو بھول جائے (یہ بھی) کہو کہ مجھے امید ہے کہ دکھادے گا مجھے میرا رب اس سے بھی قریب تر ہدایت کی راہ۔"

اس آیت کریمہ میں وحی کو فراموش کرانے کا ذکر نہیں اسی لئے یہاں نسیان کی نسبت حضور علیہ السلام کی طرف ہے۔ آیات میں اگر کبھی انساء واقع ہو تو وہ اذن خداوندی سے ہوتا ہے اس میں حضور علیہ السلام کی بشریت کا دخل نہیں ہوتا۔ یہاں خدا کی طرف سے بھلوانے کا نہیں بلکہ حضور علیہ السلام کے بھول جانے کا ذکر ہے۔

ہمیں حضور علیہ السلام کی بشریت سے انکار نہیں۔ تقاضائے بشریت کے مطابق اگر آپ کچھ بھول جائیں تو یہ نہ تو ناممکن ہے اور نہ ہی اس سے حضور علیہ السلام کی شان میں کوئی کمی آتی ہے۔ قرآن حکیم آپ اس لئے نہیں بھولتے کیونکہ اس کی حفاظت اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے اور دیگر امور میں اگر حضور علیہ السلام کو نسیان لاحق ہو جائے تو یہ بشری تقاضا ہے اور ناممکن نہیں۔ مذکورہ بالا آیت میں اسی قسم کے نسیان کا ذکر ہے۔ اس آیت کا وحی کو بھلا دینے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

1۔ سورۃ الکہف: 24

قرآنِ حکیم کی
مختلف قراتوں پر اعتراض

قرآن حکیم کی مختلف قراءتوں پر اعتراض

مستشرقین کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے صحائف میں جو قابل اعتراض چیزیں دیکھتے ہیں یا قرآن حکیم ان پر جو اعتراض کرتا ہے، وہ ان اعتراضات کو قرآن حکیم کی طرف لوٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید کی کتابیں تضادات سے پر ہیں۔ ان کے مختلف فرقوں کے نزدیک بائیبل کی کتابوں کی تعداد میں بھی اختلاف ہے۔ تاریخی بیانات اور اعداد و شمار کے اختلافات جا بجا نظر آتے ہیں۔

"مسٹر ہارن" نے عہد نامہ جدید و قدیم میں اس قسم کے اختلافات کے اسباب یہ بتائے ہیں۔(1)

1۔ نقل کرنے والوں کی غلطیاں

2۔ جس دستاویز سے نقل کی جا رہی ہے اس میں غلطیوں کا موجود ہونا۔

3۔ کاتبوں کا کسی سند اور ثبوت کے بغیر متن کی عبارت میں اصلاح کی کوشش کرنا۔

4۔ مختلف مذہبی فریقوں کا اپنے موقف اور مدعا کو ثابت کرنے کے لئے قصداً تحریف کرنا۔

"مسٹر ھارن" نے جو کچھ لکھا ہے اس کا عملی ثبوت ہمیں بائیبل کے مختلف "Versions" کے مطالعے سے جا بجا ملتا ہے۔ اناجیل اربعہ کے مصنفوں نے ایک ہی واقعہ لکھنے میں اختلاف کیا ہے۔ ہر انجیل کے مختلف "Versions" ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ایک زبان کی انجیل کچھ کہتی ہے اور اس کا دوسری زبان میں ترجمہ کچھ اور کہتا ہے۔ عیسائیوں کے پاس کوئی ایسا طریقہ بھی نہیں ہے جس کی مدد سے وہ غلط کو صحیح سے تمیز کر سکیں۔

مستشرقین قرآن حکیم میں بھی اسی صورت حال کو ثابت کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے مختلف حربے استعمال کرتے ہیں۔ ان مختلف حربوں میں سے ایک حربہ قرآن حکیم کی قراءات مختلفہ کو غلط رنگ میں پیش کرنے کا ہے۔ وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جس طرح بائیبل کے مختلف "Versions" ہیں اسی طرح یہ قراءتیں بھی قرآن حکیم کے

1۔ سر سید احمد خاں، "سیرت محمدی"، (مقبول اکیڈمی لاہور۔1988)، صفحہ 384

مختلف "ورژن" ہیں۔ جارج سیل کہتا ہے:

"Having mentioned the different editions of the Koran, it may not be amiss here to acquaint the reader, that there are seven principal editions, If I may so call them, or ancient copies of the book; two of which were published and used at Medina, a third at Mecca, a fourth at Cufa, a fifth at basra, a sixth at Syria and a seventh called the common or vulgar edition."(1)

"قرآن کے ایڈیشنوں کا ذکر کرنے کے بعد قارئین کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا مناسب نہ ہوگا کہ قرآن کے ابتدائی ایڈیشن سات ہیں: اگر ان کو ایڈیشن کہنا مناسب ہو، یا ہم ان کو اس کتاب کی سات نقلیں کہہ سکتے ہیں۔ جن میں سے دو مدینہ میں شائع ہوئیں اور وہیں استعمال ہوتی تھیں۔ تیسری مکہ میں، چوتھی کوفہ میں، پانچویں بصرہ میں، چھٹی شام میں اور ساتویں نقل کو عام ایڈیشن کہہ سکتے ہیں۔"

جارج سیل نے قرآن حکیم کی یہ تاریخ کہاں سے اخذ کی ہے، اس کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اس نے جن شہروں کے ساتھ قرآن کے ایڈیشنوں کو منسوب کرنے کی کوشش کی ہے، دور رسالت میں تو ان میں سے اکثر اسلامی قلمرو میں شامل ہی نہیں ہوئے تھے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت تک لوگ مختلف لہجوں میں قرآن حکیم کی تلاوت کرتے تھے لیکن آپ نے لغت قریش کے مطابق قرآن حکیم کے مختلف نسخے تیار کروا کے مختلف شہروں کو روانہ کئے جو اسلامی قلمرو کا حصہ تھے۔

غالباً جارج سیل صاحب نے قرآن حکیم کی سات قراءتوں اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے مختلف شہروں میں قرآن حکیم کی نقلیں بھیجنے کے مختلف مضامین کو اکٹھا کر کے اپنے تخیل کے زور پر یہ افسانہ گھڑا ہے۔ وہ تو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ جس طرح رومن کیتھولک عیسائیوں کی بائیبل اور ہے اور پروٹسٹنٹ عیسائیوں کی اور، اسی طرح مدینہ کے مسلمانوں کا قرآن اور تھا، مکہ کے مسلمانوں کا اور۔ کوفہ، بصرہ اور شام والوں کا کچھ اور۔ اور ایک قرآن ایسا بھی تھا جو عام تھا کسی کی تخصیص نہ تھی۔

1۔ "The Koran"، صفحہ 45

اگر بفرض محال دور صحابہ میں ملت اسلامیہ میں اتنے مختلف قرآن مروج ہوتے تو آج توان کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہوتی۔ لیکن ہم آج جارج سیل صاحب کے پسماندگان کو یہ چیلنج کرتے ہیں کہ وہ ساری دنیا کا چکر لگائیں۔ دنیا کے تمام براعظموں کا سروے کریں۔ دنیا میں انہیں قرآن حکیم کے کروڑوں نسخے ملیں گے، وہ ان نسخوں میں باہم اختلاف ثابت کریں۔

وہ جہاں بھی جائیں گے وہاں انہیں انشاء اللہ العزیز ایک ہی قرآن نظر آئے گا۔ جو قرآن عربوں کے پاس ملے گا، افریقہ کے حبشیوں کے پاس بھی وہی قرآن ہوگا۔ عالم اسلام میں جنم لینے والے مسلمانوں کے پاس جو قرآن ہوگا، یورپ اور امریکہ کے نو مسلموں کے پاس بھی وہی قرآن ہوگا۔

جارج سیل کے پسماندگان نے غالباً اس قسم کا سروے کیا ہے اسی لئے انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

> "This recension of uthman thus became the only standard text for the whole muslim world upto the present day". (1)
>
> "حضرت عثمان غنی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کی نظر ثانی سے جو نسخہ تیار ہوا وہ ساری ملت اسلامیہ کے لئے معیاری صحیفہ قرار پایا اور آج تک اس کی یہ حیثیت مسلم ہے۔"

اگر آج چودہ سو سال گزرنے کے بعد قرآن ایک ہی ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ دور صحابہ میں اس کے سات مختلف اصلی ایڈیشن موجود ہوں۔

• مستشرقین نے قرآن حکیم میں اختلاف کے مفروضے کا محل تعمیر کرنے کے لئے قرآن حکیم کی سات قراءتوں کو بنیاد بنایا ہے۔ وہ قرآن حکیم کی "سات قراءتوں" کے الفاظ پر توزور دیتے ہیں لیکن یہ ظاہر کرنے سے احتراز کرتے ہیں کہ قراءتوں کے اختلاف کی نوعیت کیا تھی۔

ہم اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ قرآن حکیم کی مختلف قراءتیں حضور ﷺ کے زمانے میں بھی موجود تھیں اور وہ آج بھی کسی حد تک موجود ہیں لیکن ان کی نوعیت وہ نہیں جو مستشرقین ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم یہاں اختلاف قراءات کی چند مثالیں

1۔ "انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا"، جلد 13، صفحہ 480

قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں تاکہ پتہ چل جائے کہ اختلاف قراءت کی نوعیت کیا ہے۔

(1) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًاۢ بِجَهَالَةٍ (1)

"اے ایمان والو! اگر لے آئے تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی خبر تو اس کی خوب تحقیق کر لیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم ضرر پہنچاؤ کسی قوم کو بے علمی میں۔"

اس آیت کے لفظ فَتَبَيَّنُوْٓا کو حضرت حفص کے علاوہ دوسرے حضرات نے فَتَثَبَّتُوْا پڑھا ہے۔(2) فَتَبَيَّنُوْٓا کا معنی تحقیق کرنا اور معاملے کی چھان بین کرنا ہے اور فَتَثَبَّتُوْا کا معنی بھی اس کے بالکل قریب ہے۔ المنجد میں "تثبت" کا معنی لکھا ہے:

تَثَبَّتَ فِي الْأَمْرِ وَالرَّأْيِ تَأَنّٰى فِيْهِ شَاوَرَ فِيْهِ وَفَحَصَ عَنْهُ

"یعنی کسی معاملے میں جلد بازی نہ کرنا، اس رائے کے متعلق مشورہ کرنا اور اس کی خوب تحقیق کرنا۔"

قارئین کرام سمجھ سکتے ہیں کہ یہاں اختلاف قراءت سے مفہوم میں قطعاً کوئی تبدیلی نہیں آئی بلکہ اختلاف قراءت سے مفہوم میں وسعت آ گئی کہ جب مسلمان کوئی مشکوک خبر سنیں تو اس کے مطابق عمل کرنے میں جلد بازی سے کام نہ لیں بلکہ باہم مشورہ کریں، معاملہ کی خوب تحقیق کریں اور جب معاملہ بالکل واضح ہو جائے تو پھر کارروائی کریں۔

اختلاف قراءت میں یہ بھی ایک حکمت ہے کہ اس سے آیات کے معانی میں وسعت پیدا ہوتی ہے جس سے امت مستفید ہوتی ہے اور اس سے زندگی کے بے شمار مسائل کو حل کرنے میں مدد ملتی ہے۔

(2) وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ (3)

"اور یہ کہتے ہیں کہ بنا لیا ہے اللہ نے (اپنا) ایک بیٹا۔ پاک ہے وہ (اس تہمت سے)۔"

ابن عامر نے اس کو بغیر واؤ کے قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ پڑھا ہے لیکن

1۔ سورۃ الحجرات: 6

2۔ "الافتراءات المستشر قین علی الاسلام"، صفحہ 24

3۔ سورۃ البقرۃ: 116

جمہور قراء نے اس کو واؤ کے ساتھ پڑھا ہے۔ جو حضرات بغیر واؤ کے پڑھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہاں سے نیا جملہ شروع ہو رہا ہے اور جو اس کو واؤ کے ساتھ پڑھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس کا اپنے ماقبل پر عطف ہے۔(1) دونوں صورتوں میں معنی ایک ہی رہتا ہے کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔

(3) سورۃ البقرہ کی آیہ نمبر 185 میں ہے: وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ "اور (چاہتا ہے کہ) تم گنتی پوری کر لیا کرو۔

اس لفظ کو جمہور قراء نے "میم" کی شد کے بغیر جزم کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ ابو بکر اور یعقوب نے اس لفظ کو "میم" کی شد کے ساتھ پڑھا ہے۔(2)

دونوں جگہ مادہ ایک ہے صرف ابواب کا اختلاف ہے اور اس مادہ کے باب افعال اور باب تفعیل کا معنی علمائے لغت کے نزدیک ایک ہی ہے۔

قارئین کرام نے قراءتوں کے اختلاف کی نوعیت کو ملاحظہ فرمایا۔ یہاں معانی میں تضاد کی کوئی گنجائش نہیں۔ قراءت کے اس اختلاف کا اس تناقض سے دور کا بھی واسطہ نہیں جو عہد نامہ جدید اور عہد نامہ قدیم میں ہے اور جس کو یہود و نصاریٰ کے علماء وقتاً فوقتاً دور کرنے کی کوشش بھی کرتے رہتے ہیں۔

"افتراءات المستشر قین علی الاسلام" کے مولف نے تورات کے تناقض کی ایک مثال کتاب التواریخ دوم کے باب اکیس اور بائیس سے دی ہے۔ باب اکیس بتاتا ہے کہ "یورام" فوت ہوا تو اس کی عمر چالیس سال تھی۔ لیکن باب بائیس بتاتا ہے کہ "یورام" کی موت پر اس کا بیٹا "اخزیا" تخت نشین ہوا۔ اور تخت نشینی کے وقت اس کی عمر بیالیس سال تھی۔ گویا بیٹا باپ سے دو سال بڑا تھا۔(3)

ہمیں یقین ہے کہ "افتراءات المستشر قین" کے فاضل مصنف کے پاس بائیبل کا جو نسخہ تھا اس کے الفاظ یہی ہونگے لیکن "نیو ورلڈ بائیبل ٹرانسلیشن کمیٹی" نے 1971ء کی نظر ثانی کے مطابق نیویارک سے 1981ء میں بائیبل کا جو ایڈیشن شائع کیا ہے اس کی کتاب التواریخ ثانی کے بائیسویں باب میں "اخزیاہ" کی تخت نشینی کے وقت اس کی عمر بائیس سال

1۔ "افتراءات المستشر قین علی الاسلام"، صفحہ 24
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً، صفحہ 25 (حاشیہ)

بتائی گئی ہے؟

بیالیس کا ترجمہ کر کے بائیس بنا دینا یہود و نصاریٰ اور مستشرقین کے لئے معمولی بات ہے۔ ان کے اس ترجمے یا اصلاح سے بیٹے کے باپ سے بڑا ہونے والی الجھن تو دور ہو جاتی ہے لیکن یہ الجھن باقی رہتی ہے کہ جس نسخے میں تخت نشینی کے وقت "اخزیاہ" کی عمر بیالیس سال بتائی گئی ہے وہ ٹھیک ہے یا جس میں اس کی عمر بائیس سال بتائی گئی ہے وہ ٹھیک ہے؟

آپ نے بائیبل کے اختلافات اور قرآن حکیم کی قراءتوں کے اختلاف کی نوعیت کو ملاحظہ فرمایا۔ ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ بائیبل کے مختلف ایڈیشنوں میں جس قسم کے اختلاف ہیں، اگر اختلاف قراءت کا مطلب وہی ہے تو خدا کے فضل و کرم سے قرآن حکیم اس قسم کے اختلاف قراءت سے مطلقاً پاک ہے۔ قرآن حکیم میں قراءت کا جو معمولی سا اختلاف ہے اس کو بھی عام مسلمانوں کی صوابدید پر نہیں چھوڑا گیا بلکہ وہ قراءت بھی حضور ﷺ سے مروی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

اَقْرَأَنِی جِبْرِیْلُ عَلٰی حَرْفٍ فَرَاجَعْتُہٗ فَلَمْ اَزَلْ اَسْتَزِیْدُہٗ وَیَزِیْدُنِیْ حَتّٰی اِنْتَھٰی اِلٰی سَبْعَۃِ اَحْرُفٍ (1)

"حضرت جبریل نے مجھے قرآن حکیم پڑھ کر سنایا۔ میں نے دوبارہ پڑھنے کے لئے کہا۔ انہوں نے دوبارہ پڑھا۔ میں قراءتوں میں اضافے کے لئے کہتا رہا اور وہ اضافہ کرتے گئے۔ حتیٰ کہ معاملہ سات قراءتوں تک پہنچ گیا۔"

یہاں بھی حضور ﷺ کی اپنی امت کے لئے رحمت و شفقت اپنا رنگ دکھا رہی ہے۔ آپ کی تمنا ہے کہ آپ کی امت کو ایک سے زیادہ قراءتوں میں قرآن پڑھنے کی اجازت ہو تاکہ امت مشقت سے بچ سکے۔ ایک اور حدیث پاک حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ سَمِعْتُ ھِشَامَ بْنَ حَزَامٍ یَقْرَءُ سُوْرَۃَ الْفُرْقَانِ عَلٰی غَیْرِمَا اَقْرَءُھَا وَکَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَقْرَءَنِیْھَا فَکِدْتُ اَنْ اَعْجَلَ عَلَیْہِ ثُمَّ

1۔ امام محمد بن اسماعیل بخاری "صحیح البخاری" (ایچ ایم سعید کراچی۔ 1936)، جلد 2، باب انزال القرآن علی سبعۃ احرف، ص

اَمْهَلْتُه حَتّٰی اِنْصَرَفَ ثُمَّ لَبَّبْتُه بِرِدَآئِهٖ فَجِئْتُ بِهٖ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّیْ سَمِعْتُ هٰذَا يَقْرَءُ سُوْرَةَ الْفُرْقَان عَلٰی غَيْرِ مَا اَقْرَءْتَنِيْهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِقْرَءْ فَقَرَءَ الْقِرَاَةَ الَّتِیْ سَمِعْتُهٗ يَقْرَءُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هٰكَذَا اُنْزِلَتْ ثُمَّ قَالَ لِیْ اِقْرَءْ فَقَرَاْتُ فَقَالَ هٰكَذَا اُنْزِلَتْ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ اُنْزِلَ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ فَاقْرَءُوْا مَاتَيَسَّرَ مِنْهُ (1)

"حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں: میں نے ہشام بن حزام کو سورۃ الفرقان پڑھتے ہوئے سنا۔ وہ اس سے مختلف پڑھ رہے تھے جیسے میں پڑھتا تھا۔ اور مجھے تو حضور ﷺ نے خود سورۃ الفرقان پڑھائی تھی۔ قریب تھا کہ میں ان کو سزا دیتا لیکن میں نے ان کو مہلت دی۔ جب وہ واپس آئے تو میں نے ان کو چادر سے پکڑا اور حضور ﷺ کی خدمت میں لے آیا۔ میں نے حضور ﷺ سے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! یہ سورۃ الفرقان اس سے مختلف پڑھ رہے تھے جس طرح آپ نے مجھے پڑھائی تھی۔ حضور ﷺ نے ان سے فرمایا: پڑھو۔ انہوں نے اسی طریقے سے پڑھا جیسے میں نے انہیں پڑھتے سنا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: یہ سورت یونہی نازل ہوئی ہے۔ پھر آپ نے مجھے حکم دیا تم پڑھو۔ میں نے پڑھا تو حضور ﷺ نے فرمایا: یہ سورۃ یونہی نازل ہوئی ہے۔ یہ قرآن سات قراءتوں پر نازل ہوا ہے۔ تمہیں جو آسان محسوس ہوا سے پڑھ لیا کرو۔"

تمام عربوں کی زبان ایک تھی لیکن ان کے لہجوں میں اختلاف تھا۔ کسی عرب کے لئے چونکہ دوسرے عربوں کے لہجے کے مطابق قرآن پڑھنا مشکل تھا، اس لئے ابتدا میں ہر ایک کو اپنے اپنے لہجے میں پڑھنے کی اجازت تھی۔ زکریا ہاشم زکریا اپنی کتاب "المستشرقون والاسلام" میں لکھتے ہیں۔

1۔ امام ابو الحسین مسلم بن حجاج، "الصحیح لمسلم"، (قدیمی کتب خانہ کراچی۔ 1956)، جلد 1، باب انزل القرآن علی سبعۃ احرف، صفحہ 272

وَلَقَدْ كَانَ لِلْقُرْاٰنِ لَهْجَاتٌ عَرَبِيَّةٌ نُسِخَتْ كُلُّهَا بَعْدَ تَمَامِ نُزُوْلِ الْقُرْاٰنِ وَكَانَتِ الْعَرْضَةُ الْاَخِيْرَةُ عَلٰى جِبْرِيْلَ بِلُغَةٍ وَّاحِدَةٍ وَاللُّغَةُ الْوَاحِدَةُ تَحْتَمِلُ قِرَاءَاتِ الْقُرْاٰنِ الْمُتَوَاتِرَةَ كُلَّهَا (1)

"ابتداء میں قرآن حکیم مختلف عربی لہجوں میں پڑھنے کی اجازت تھی۔ لیکن جب نزول قرآن کا سلسلہ مکمل ہو گیا تو ایک کے علاوہ باقی تمام لہجے منسوخ ہو گئے۔ اور حضور ﷺ کے ساتھ حضرت جبریل امین نے قرآن حکیم کا جو آخری دور کیا تھا وہ ایک ہی لہجے کے مطابق تھا۔ اور ایک لہجہ کے اندر بھی تمام متواتر قراءتوں کا احتمال موجود تھا۔"

یہی مصنف ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں قرآن حکیم کا جو نسخہ تیار ہوا تھا، اس کو نقطوں اور اعراب کے بغیر لکھنے کی حکمت یہ تھی کہ تمام منزل قراءتوں کا احتمال باقی رہے۔

وَقَدْ كُتِبَ بِرَسْمٍ لَمْ يُنقَطْ وَلَمْ يُشْكَلْ حَتّٰى لَا يَكُوْنَ مَحْصُوْرًا فِيْ قِرَاءَةٍ وَّاحِدَةٍ (2)

اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ قراءات میں اختلاف کی نوعیت کتنی معمولی تھی کہ اگر عبارت پر نقطے نہ ہوں تو تمام قراءتوں کے مطابق پڑھنا ممکن ہوتا ہے۔ ہم نے اختلاف قراءات کی جو مثالیں سطور بالا میں ذکر کی ہیں ان میں سے ایک اختلاف قراءات فَتَبَيَّنُوْا اور فَتَثَبَّتُوْا کا ہے۔ اگر اس لفظ سے نقطے اور اعراب مٹا دیئے جائیں تو یہ "مىسىوا" کی شکل میں لکھا جائے گا اور اس کو دونوں طریقوں کے مطابق پڑھنا ممکن ہوگا۔

اسی طرح کا اختلاف لِتُكْمِلُوْا اور لِتُكَمِّلُوْا کا ہے۔ اس لفظ کے بھی اگر نقطے اور اعراب مٹا دیئے جائیں تو اس کو بھی دونوں طریقوں سے پڑھنا ممکن ہے۔

جس طرح آبگینہ معمولی سی ٹھوکر کو بھی برداشت نہیں کر سکتا، اسی طرح قرآن حکیم کا تقدس بھی اتنے معمولی سے اختلاف کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے اس کو عوام کی صوابدید پر نہیں چھوڑا گیا بلکہ تمام قراءتیں اللہ تعالیٰ نے خود نازل فرمائیں، حضور ﷺ

1۔ "المستشرقون والاسلام"، صفحہ 6-115

2۔ ایضاً، صفحہ 115

ئے انہیں صحابہ کرام کو پڑھ کر سنایا اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیھم اجمعین نے انہیں روایت کیا۔

مختلف لہجے ابتدا میں لوگوں کی سہولت کے لئے جائز قرار دیئے گئے، قرآن حکیم کا نزول مکمل ہونے کے بعد اس جواز کو منسوخ کر دیا گیا۔

جب تک اسلامی قلمرو کی حدود عرب تک محدود تھیں اس وقت تک تو مختلف لہجوں میں قرآن حکیم کی تلاوت سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ عرب لوگ جانتے تھے کہ لہجوں کے اس اختلاف سے معانی میں کسی قسم کا اختلاف پیدا نہیں ہوتا۔ حضرت جبریل امین کے ساتھ حضور ﷺ کے قرآن حکیم کے آخری "دور" سے قرآن حکیم کو لغت واحدہ پر جمع کر دیا گیا تھا لیکن حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بعض لوگوں کو منسوخ لہجوں کے مطابق قرآن حکیم پڑھتے پایا گیا۔ اس سے غیر عرب نو مسلموں میں انتشار کے آثار بھی نظر آئے۔ اس پر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ماہرین قرآن صحابہ کی ایک جماعت کو حکم دیا کہ وہ قرآن حکیم کو صرف لغت قریش کے مطابق جمع کریں۔ اس جماعت نے لغت قریش کے مطابق جو نسخہ تیار کیا اس کی نقلیں مختلف صوبوں میں بھیجی گئیں اور لغت قریش کے علاوہ دیگر لہجوں کے مطابق جو نسخے تھے ان کو تلف کرنے کا حکم دیا۔

"زکریا ہاشم زکریا" اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

وَقَدْ لُوْحِظَ اَنَّهُ فِیْ بَعْضِ الْاَمْصَارِ وُجِدَمَنْ یَّقْرَءُ بِاللُّغَاتِ الْمَنْسُوْخَةِ اَوْ بِالْاُخْرٰی اَللَّهْجَةِ الْمَنْسُوْخَةِ وَهِیَ بِالْاِجْمَاعِ غَیْرُ الْقِرَاءَاتِ فَاخْتَلَفَ النَّاسُ فَاتَّجَهَ عُثْمَانُ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اِلٰی جَمْعِ الْقُرْاٰنِ مَرَّةً اُخْرٰی (1)

"بعض علاقوں میں ایسے لوگ پائے گئے جو منسوخ لغات یا، زیادہ صحیح الفاظ میں، منسوخ لہجوں میں قرآن پڑھتے تھے۔ اور اس بات پر اجماع ہے کہ لہجے قراءتوں سے مختلف چیزیں ہیں۔ (مختلف لہجوں میں پڑھنے کی وجہ سے) لوگوں میں اختلاف پیدا ہوا اس لئے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ پھر قرآن جمع کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔"

1۔ "المستشرقون والاسلام"، صفحہ 116

وہ اختلافات جو ملت کے لئے انتشار کا سبب بن سکتے تھے ان کو عہد رسالت میں ہی ختم کر دیا گیا۔ لیکن قراءتیں جو ملت اسلامیہ کے لئے رحمت خداوندی کا مظہر تھیں اور جنہیں حضور ﷺ نے اپنی امت کے لئے اپنے رب سے مانگ کر لیا تھا وہ اب بھی موجود ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا فضل دیکھئے کہ مختلف قراءتوں کے موجود ہونے کے باوجود قرآن حکیم کے نسخوں میں مشرق و مغرب میں ایک ہی قراءت پر ساری قوم جمع ہے۔ لیکن دوسری قراءتیں بھی تفسیر اور احادیث کی کتابوں میں تواتر سے نقل ہوتی آ رہی ہیں اور ان سے علمائے کرام مسائل کا استنباط بھی کرتے ہیں۔

عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید کے اختلافات سے قرآن حکیم کے اختلاف قراءات کی کوئی نسبت نہیں۔ بائبل کے اختلاف نے ملت عیسوی کو کئی حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اور قرآن حکیم کی مختلف قراءتوں نے ہر قسم کے حالات میں مسلمانوں کے لئے فکر کی نئی راہیں کھولی ہیں۔ ملت کے ائمہ نے اختلاف قراءات سے مختلف احکام اخذ کئے ہیں۔ بعض قراءتیں دوسری قراءتوں کا بیان اور تفصیل ثابت ہوئی ہیں۔

یہ بھی قرآن حکیم کے کلام خداوندی ہونے کی دلیل ہے کہ سات قراءتوں میں سے جو بھی قراءت کی جائے قرآن حکیم کی شان اعجاز اسی طرح قائم رہتی ہے۔

جو لوگ عربی زبان وادب سے واقفیت رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ عربی تحریروں میں حروف پر اعراب نہیں لگائے جاتے۔ اس لئے کئی الفاظ کو مختلف طریقوں سے پڑھنے کا احتمال باقی رہتا ہے۔ قرآن حکیم بھی ابتداً میں اعراب بلکہ نقطوں کے بغیر لکھا جاتا تھا۔ اگر قرآن صرف ایک ہی قراءت پر نازل ہوتا تو اس قسم کے مقامات پر جہاں لفظ کو مختلف طریقوں سے پڑھنے کا احتمال ہوتا، منزل طریقے کے علاوہ کسی اور طریقے سے پڑھنے میں قرآن میں تحریف اور تبدیلی لازم آتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کی امت کو اس مشقت سے محفوظ فرمالیا۔ اس لئے وہ ان سات منزل قراءتوں کے دائرے میں رہتے ہوئے جو بھی پڑھتے اس سے قرآن میں تحریف لازم نہ آتی۔

اس سہولت کے باوجود ساری دنیا کے مسلمان ایک ہی قراءت کے مطابق قرآن کے نسخے تیار کر رہے ہیں اور اسی کے مطابق تلاوت کر رہے ہیں۔ یقیناً یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے جس نے اپنے کلام کی حفاظت اپنے ذمہ قدرت پر لے رکھی ہے۔

مستشرقین نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش بھی کی ہے کہ مسلمان قرآن حکیم کی روایت بالمعنی کو جائز سمجھتے تھے۔(1) اپنے اس مفروضے کو بھی انہوں نے قراءات سبعہ سے منسلک کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسلمان قرآن حکیم کے معانی کو اپنے اپنے الفاظ میں بیان کرتے تھے اس طرح مختلف قراءتیں وجود میں آئیں۔ وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں کہ روایت بالمعنی کی آزادی کے ماحول میں قرآن حکیم کی تدوین کا کام مکمل ہوا۔ ان کا مدعا یہ ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ جب روایت بالمعنی مسلمانوں کے ہاں مسلم ہے تو قرآن کے الفاظ میں تبدیلی ناگزیر ہو جاتی ہے۔

لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ دنیا میں کوئی بھی مسلمان جماعت ایسی نہیں جو قرآن کی روایت بالمعنی کو جائز سمجھتی ہو۔ تمام مسلمانوں کا ایمان ہے کہ قرآن حکیم کے الفاظ اور معانی دونوں منزل من اللہ ہیں۔ اور دونوں تواتر کے ساتھ مروی ہو کر ہم تک پہنچے ہیں۔

اختلاف قراءات کی حقیقت کو ہم نے سطور بالا میں تفصیل سے بیان کر دیا۔ قراءات کے اختلاف کا روایت بالمعنی سے کوئی تعلق نہیں۔ روایت بالمعنی کے جائز ہونے کا مطلب تو یہ ہے کہ قرآن حکیم کے الفاظ کو عام انسانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ روایت بالمعنی کی صورت میں تو قرآن کی کیفیت وہی ہو جاتی جو اناجیل کی ہے کہ ایک ہی واقعہ کو "متی" نے کسی طریق سے بیان کیا ہے اور "مرقس" نے اس سے الٹا راستہ اختیار کیا ہے۔ لیکن بفضلہ تعالیٰ قرآن حکیم اس صورت حال سے پاک ہے۔ اگر قرآن کی روایت بالمعنی کی اجازت دی جاتی تو الفاظ انسانی ہوتے اور ان کی نظیر پیش کرنا انسانوں کے لئے ناممکن نہ ہوتا۔ قرآن کی نظیر پیش کرنے سے عربوں کا چودہ سو سال قاصر رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن کے معانی، الفاظ اور عبارات سب الہامی ہیں۔ اور کسی انسان کے لئے ممکن نہیں کہ وہ اس کی نظیر پیش کر سکے۔ مستشرقین کا یہ اعتراض بھی ان کے عام وسوسوں کی طرح ایک وسوسے سے زیادہ کچھ نہیں۔

1۔ "الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری"، صفحہ 109

قرآنِ حکیم کی
شانِ اعجاز

قرآن حکیم کی شان اعجاز

اللہ تعالیٰ نے جتنے انبیاء و رسل بھیجے وہ سب انسانیت کے ہمدرد اور خیر خواہ بن کر اس دنیا میں تشریف لائے۔ ان کے پیغامات انسانیت کی دینوی اور اخروی کامیابی کی ضمانت تھے۔ لیکن ان کی دعوت چونکہ ان مزعومات اور روایات کے خلاف ہوتی تھی جو ان کی قوموں کے رگ وپے میں سرایت کر چکی تھیں، اور خصوصاً ان کی قوموں کا مراعات یافتہ طبقہ ان کے پیغام عدل کو اپنے مفادات کے خلاف ایک بہت بڑا چیلنج سمجھتا تھا، اس لئے ان کی قوموں کی اکثریت اپنی آبائی روایات سے چمٹے رہنے کو ترجیح دیتی۔ وہ اپنے اس محسن پر مظالم کے پہاڑ توڑتی اور وہ پیغام جو اپنے دامن میں ان کے لئے ابدی نعمتیں سمیٹے ہوئے ان کے پاس آیا تھا، اسے مسترد کر دیتی۔

ہر نبی اور رسول کو اپنی امت دعوت کی طرف سے اس سلوک کا سامنا کرنا پڑا۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۔(1)

"اور اسی طرح بنا دیئے ہم نے ہر نبی کے لئے دشمن (یعنی) سرکش انسان اور جن جو چپکے سے سکھاتے تھے ایک دوسرے کو خوش نما باتیں (لوگوں کو) دھوکہ دینے کے لئے۔"

اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے۔ کائنات کے ذرے ذرے میں اس کی رحمت کے کرشمے جلوہ فگن ہیں۔ اس کی رحمت کو یہ بات گوارا نہ تھی کہ اولاد آدم اپنی جہالت، تنگ نظری، روایت پسندی، مرعوبیت یا مفاد پرستی جیسے اخلاقی امراض کی وجہ سے آسمانی سرچشمہ ہدایت سے سیراب ہونے سے محروم رہے۔ اس لئے پروردگار عالم نے ہر نبی کی رسالت کو ثابت کرنے کے لئے اپنی قدرت کی ایسی نشانیاں ظاہر فرمائیں کہ نبی کی رسالت اور دعوت میں

1۔ سورۃ الانعام: 112

شک کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی۔ اور سوائے ہٹ دھرمی کے اس نبی کی رسالت کو تسلیم نہ کرنے کا کوئی بہانہ باقی نہ رہا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مجمع عام کے سامنے آگ میں ڈالا گیا لیکن دنیا نے دیکھا کہ وہ آگ جس کی فطرت ہی جلانا ہے، اس نے خدا کے خلیل کا ایک بال بھی جلانے کی جرأت نہ کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعونیوں کو متعدد نشانیاں دکھائیں لیکن انہوں نے اتنی نشانیاں دیکھ کر بھی کفر پر ڈٹے رہنے کو ترجیح دی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ساحر کہا گیا۔ ملک کے طول و عرض سے ان کے مقابلے کے لئے جادوگروں کو جمع کیا گیا۔ خدا کی قدرت کی حیران کن نشانیاں دیکھ کر فن جادوگری کے ماہرین تو خدا کے کلیم کے دامن سے وابستہ ہو گئے لیکن جن لوگوں کو اپنی جھوٹی خدائی، اپنا اقتدار اور اپنے مفادات خطرے میں نظر آئے، وہ ہدایت سے محروم رہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خدا کے حکم سے مردوں کو زندہ کیا اور بیماروں کو شفایاب کیا لیکن قوم کی اکثریت ان کی دشمنی پر ڈٹی رہی۔

ہر نبی کو اللہ تعالیٰ نے جو نشانیاں عطا فرمائی تھیں، ان کو دیکھ لینے کے بعد، نبی کی دعوت کو ٹھکرانے کی کوئی معقول وجہ باقی نہ رہ جاتی تھی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو جو نشانیاں عطا فرمائیں، ان کا تعلق اسی میدان سے تھا جس میں اس قوم کو کمال حاصل تھا۔ جس کے تمام پہلوؤں سے وہ قوم خوب آگاہ تھی اور یہ فیصلہ کرنا ان کیلئے مشکل نہ تھا کہ جو نشانی ان کے سامنے ظاہر ہو رہی ہے، یہ انسانی عقل کی کرشمہ سازی ہے یا اس کا تعلق کسی مافوق الفطرت ہستی سے ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں فن جادوگری اپنے عروج پر تھا اسی لئے فرعون کو یقین تھا کہ اس کے ملک کے ساحر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جادو کو توڑ کر اس کے تخت کے لئے اس عظیم خطرے کو ٹال دیں گے۔ ساحروں کو بھی اپنی کامیابی کا یقین تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایک جادوگر اکیلا پورے ملک کے سرکردہ جادوگروں کا مقابلہ کیسے کرے گا۔ لیکن جب انہوں نے اپنے فن جادوگری کی دھجیاں اپنی آنکھوں کے سامنے بکھرتی دیکھیں تو انہیں یقین ہو گیا کہ ان کے فن کی یہ توہین کسی انسان کے ہاتھوں ممکن نہ تھی۔ اسی یقین کی وجہ سے انہوں نے حق کا نعرہ مستانہ بلند کیا اور فرعون کی دھمکیوں کو پرکاہ کی وقعت نہ دیتے ہوئے کہا:

فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ (1)

"(ہمارے بارے میں) جو فیصلہ تو کرنا چاہتا ہے کر دے (ہمیں ذرا پروا نہیں)۔"

مصر کے خداوندان ساحری عصائے کلیمی کی ایک ہی ضرب سے حق الیقین کی اس اعلیٰ منزل تک جا پہنچے لیکن جن کو اپنے مفادات شمع حق کی روشنی سے زیادہ عزیز تھے وہ باطل کے ساتھ چمٹے رہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں خوابوں کی تعبیر کا علم نشان عظمت تھا، اس لئے انہیں پروردگار عالم نے خوابوں کی تعبیر کا وہ علم عطا فرمایا جس کے سامنے سب معبروں کو جھکنا پڑا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں فن طبابت کے چرچے تھے، یہی وجہ ہے کہ اپنے اس پیارے نبی کو قدرت نے وہ نشانیاں عطا فرمائیں کہ ماہرین طب کو اس بات میں ذرا شک نہ رہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو کچھ ظاہر کر رہے ہیں، یہ انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔

تمام انبیائے کرام اپنی مخصوص قوموں کی طرف مبعوث ہوئے تھے اس لئے ان کو جو معجزات عطا فرمائے گئے ان کا تعلق ان میدانوں سے تھا جن میں ان کی قوموں کو کمال حاصل تھا۔ دیگر انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے برعکس حضور ﷺ قیامت تک آنے والی ساری قوموں کے لئے بشیر و نذیر بن کر تشریف لائے۔ اپنی نبوت و رسالت کے ثبوت کے لئے حضور ﷺ کو ایسی نشانی کی ضرورت تھی جو ہر زمانے کے انسانوں کو یقین دلا سکے کہ جو کام آپ کے دست اقدس پر ظاہر ہو رہا ہے وہ کسی انسان کا کام نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ایک ایسی نشانی عطا فرمائی جو قیامت تک اپنی عظمت کے جھنڈے کو عرش کی بلندیوں پر لہراتی رہے گی۔ حضور ﷺ کو عطا ہونے والی یہ عظیم نشانی قرآن حکیم ہے۔

مستشرقین عموماً یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے دیگر انبیائے کرام کی طرح کوئی معجزہ نہیں دکھایا۔ وہ اپنے اس دعوئی کے ثبوت کے طور پر وہ آیات پیش کرتے ہیں جن میں کفار کی طرف سے معجزات کے مطالبے پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ نشانیاں دکھانا میرا کام نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے۔ میرا کام تو تمہیں حق کی طرف دعوت دینا ہے۔

1۔ سورۂ طٰہٰ: 72

جو لوگ ہزاروں نشانیاں دیکھنے کے باوجود اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہیں آرہے تھے انہیں یہی جواب ملنا چاہئے تھا۔ وہ اپنے دلوں کے اطمینان کے لئے مطالبہ نہیں کرتے تھے بلکہ وہ تو صرف حجت بازی کے طور پر یہ مطالبے کرتے تھے۔ اس لئے وہ اسی جواب کے مستحق تھے جو انہیں دیا گیا۔ ان حجت بازوں کو جو جواب دیا گیا وہ بالکل واضح ہے کہ معجزے دکھانا رسول کا کام نہیں، یہ کام صرف اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے۔ وہ جب چاہتا ہے کسی نبی یا رسول کے دست اقدس پر معجزہ ظاہر فرمادیتا ہے۔ اس جواب سے یہ نتیجہ نکالنا کہ حضور ﷺ نے معجزے نہیں دکھائے تاریخی حقیقتوں کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔

حضور ﷺ کے حسی معجزات کسی دوسرے نبی کے معجزات سے کم نہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین حضور ﷺ کی ذات سے نت نئے معجزات کے ظہور کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور یقیناً ان کا ایمان، جو چٹان سے زیادہ مضبوط تھا، اس کو ان معجزات سے قوت عطا ہوتی تھی۔

حضور ﷺ نے چاند کو دو ٹکڑے کیا۔ سورج آپ کے اشارے پر پلٹا۔ بے شیر بکری نے آپ کے دست مبارک کی برکت سے دودھ دیا۔ درخت چل کر قدموں میں حاضر ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا آشوب چشم لعاب دہن رسول سے دور ہوا۔ انگلیوں سے پانی کے چشمے پھوٹے۔ چند آدمیوں کا کھانا سینکڑوں آدمیوں نے کھایا۔ یہ فہرست بڑی طویل ہے۔ حضور ﷺ کی ذات اقدس سے بے شمار معجزات کا ظہور ہوا لیکن آپ نے اپنی صداقت کی دلیل کے طور پر ہمیشہ قرآن حکیم کو پیش فرمایا۔

ساتویں صدی عیسوی میں مکہ کے کفار کے سامنے قرآن حکیم کو اپنی صداقت کی دلیل کے طور پر پیش کرنا، حضور ﷺ کے پیغام کے عالمگیر ہونے کی دلیل ہے۔ حضور ﷺ کی رسالت بھی ہمیشہ کے لئے ہے اور قرآن حکیم کا پیغام بھی ہمیشہ کے لئے ہے۔ حسی معجزات ابو جہل اور ابولہب کو تو خاموش کرا سکتے تھے، جو ان کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کرتے، لیکن بیسویں صدی عیسوی میں منٹگمری واٹ کا منہ بند کرنے کے لئے حسی معجزات کام نہیں آسکتے تھے۔

جو لوگ اسلام کی پوری تاریخ کو جھوٹ کا پلندہ، احادیث طیبہ کو محدثین کی کاوش فکر کا نتیجہ اور شریعت اسلامیہ کو رومی قانون کا چربہ کہہ سکتے ہیں، ان کے لئے اس بات کا انکار کرنے میں کون سی مشکل ہے کہ حضور ﷺ کی انگلی کے اشارے سے چاند دو ٹکڑے ہوا یا آپ نے اشارہ کیا تو سورج پلٹ آیا۔ اسی لئے جب کفار نے آپ کی نبوت و رسالت کا انکار

کیا اور قرآن حکیم کو انسانی دماغ کی اختراع قرار دینے کی کوشش کی تو ارشاد خداوندی ہوا:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (1)

"اور اگر تمہیں شک ہو اس میں جو ہم نے نازل کیا اپنے (برگزیدہ) بندے پر تو لے آؤ ایک سورت اس جیسی اور بلا لو اپنے حمایتیوں کو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔"

عصائے کلیمی، فن ساحری پر اترانے والی قوم کے لئے چیلنج تھا۔ دم عیسٰی، اپنے فن طبابت پر ناز کرنے والی قوم کے لئے چیلنج تھا، لیکن قرآن حکیم انسانی علوم وفنون کے تمام شعبوں کے ماہرین کے لئے چیلنج ہے۔ جن کو اپنی زبان دانی اور فصاحت پر ناز تھا، قرآن حکیم کی فصاحت وبلاغت انہیں اپنی مثل پیش کرنے کا چیلنج کر رہی ہے۔ جو اپنی کہانت اور مستقبل بینی پر نازاں تھے، قرآن حکیم کے مستقبل کے متعلق بیانات ان سے سوال کر رہے ہیں کہ کیا تاریخ کسی ایسے کاہن کو جانتی ہے جس کی مستقبل کے متعلق پیشگوئیاں اسی طرح صحیح ثابت ہوئی ہوں جس طرح قرآن حکیم کی پیشگوئیاں حرف بحرف پوری ہوئی ہیں۔ جو لوگ فلسفہ یونان پر نازاں تھے، قرآن حکیم ان کے سامنے فلسفہ یونان کے غلط نظریات کا پردہ چاک کر کے اپنی عظمت کا ثبوت مہیا کر رہا ہے۔ بیسویں صدی عیسوی کی ترقی یافتہ دور میں جن لوگوں کو اپنی سائنسدانی پر ناز ہے، قرآن ان کی کم مائیگی پر مسکراتے ہوئے فرما رہا ہے کہ تم نے جن حقیقتوں کا انکشاف آج کیا ہے، ہم نے تو اپنے خادموں کو ان حقائق سے چودہ سو سال پہلے آگاہ کر دیا تھا۔ ہم نے شکم مادر میں بچے کی پرورش کے مراحل کو چودہ سو سال پہلے بیان کیا تھا۔ تم ابھی تک آج پہنچے ہو اور ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ (1) کی بلندیوں کی طرف تو ابھی تمہارا طائر ہمت پر کشائی نہیں ہوا۔

قرآن حکیم کا یہ چیلنج جس طرح لبید بن ربیعہ اور ولید بن مغیرہ جیسے فصیح اللسان عربوں کے لئے تھا، اسی طرح وہ بیسویں صدی عیسوی کے یورپی اور امریکی سائنسدانوں کے لئے بھی ہے۔ اگر قرآن حکیم کا اعجاز صرف اس کی فصاحت وبلاغت تک محدود ہوتا تو جارج سیل اور تھامس کارلائل جیسے، غلط ترجموں کی مدد سے قرآن پڑھنے والے مستشرقین

1۔ سورۃ البقرۃ: 23

2۔ سورۃ المومنون: 14، ترجمہ: "پھر (روح پھونک کر) ہم نے اسے دوسری مخلوق بنا دیا۔"

کے سامنے اسے بطور چیلنج پیش کرنا بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف ہوتا۔ لیکن یہ پیغام ایک عالمگیر پیغام ہے۔ اس کے اعجاز کی کئی شانیں ہیں۔ کسی انسان کا تعلق زندگی کے کسی بھی شعبہ سے ہو قرآن حکیم اس کو اسی شعبہ زندگی کے متعلق ایسے حقائق سے آگاہ کرتا ہے جو انسانی عقل و خرد کی رسائی سے ماوراء ہیں۔ ایک ملاح قرآن حکیم میں، شب دیجور میں سمندر کے مسافر کی حالت کی تصویر کشی کو دیکھتا ہے تو اس معجزانہ بیان پر تڑپ اٹھتا ہے اور ایک سائنسدان چودہ سو سال پہلے کے ایک امی عرب کی زبان سے ان حقائق کی تفاصیل سن کر تصویر حیرت بن جاتا ہے، جن تک سائنس آج پہنچی ہے۔ ہم قرآن حکیم کے بے شمار وجوہ اعجاز میں سے صرف تین کا یہاں تذکرہ کریں گے۔

1۔ قرآن حکیم کا فصیح و بلیغ اسلوب اور اس کی تاثیر۔

2۔ مستقبل کے متعلق قرآن حکیم کی پیشگوئیاں۔

3۔ سائنس کے میدان میں قرآن حکیم کے معجزانہ بیانات۔

قرآن حکیم کا معجزانہ اسلوب اور اس کی تاثیر

قرآن حکیم کے پہلے مخاطب عرب تھے جن کو اپنی فصیح البیانی اور قادر الکلامی پر ناز تھا۔ کائنات کے متعلق قرآن حکیم کے وہ بیانات جن تک سائنس کئی صدیاں بعد پہنچی، وہ عربوں کی سمجھ سے بالاتر تھے۔ لیکن عربوں کے قرآن حکیم کی ان علمی اعجاز آفرینیوں کی تہ تک نہ پہنچ سکنے کے باوجود، قرآن حکیم نے ان کے دلوں کو حیرت انگیز طریقے سے اپنی طرف کھینچا۔

قرآن حکیم نے انہیں چیلنج کیا کہ اگر تم اس کے وحی الٰہی ہونے کا انکار کرتے ہو اور اسے انسانی ذہن کی اختراع قرار دیتے ہو تو اس جیسی کتاب بنا کر پیش کرو۔ اگر یہ نہیں کر سکتے تو دس سورتیں ہی اس جیسی بنا لاؤ۔ اگر یہ بھی مشکل ہے تو قرآن حکیم کی ایک سورۃ جیسی سورۃ ہی بنا کر پیش کر دو لیکن اس چیلنج کے سامنے ان کی گردنیں جھک گئیں۔ انہیں یقین تھا کہ اس کلام جیسا کلام بنانا ان کے بس کی بات نہیں۔

قرآن حکیم کی جس خوبی سے وہ متاثر تھے، وہ اس کا دلوں کو موہ لینے والا اسلوب، اس کی لغوی اور ادبی خوبیاں، اس کی فصاحت و بلاغت اور اس کی حیرت انگیز تاثیر تھی۔ قرآن حکیم مومنوں کے ساتھ ساتھ کافروں کے دلوں میں بھی اپنی تاثیر کے حیرت انگیز کرشمے دکھا رہا تھا۔ عربوں میں سے جو سب سے زیادہ قادر الکلام شمار ہوتے تھے، وہ دوسروں کی

نسبت زیادہ اس کی عظمت کے سامنے جھک رہے تھے۔

جارج سیل اپنے قارئین کو یہ بتاتا ہے کہ مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ قرآن کی مثال پیش کرنا انسانوں کے لئے ممکن نہیں۔ اور حضور ﷺ نے اسی قرآن حکیم کو اپنے دعویٰ رسالت کے ثبوت کے طور پر پیش کیا تھا اور ہزاروں عرب، جن کو اپنی قادر الکلامی پر ناز تھا، ان کو چیلنج کیا تھا کہ وہ اس کی ایک سورۃ جیسی سورۃ بنا کر دکھا دیں۔

اپنے قارئین کو یہ باتیں بتانے کے بعد جارج سیل لکھتا ہے:

> "I will mention but one instance of several to show that this book was really admired for the beauty of its composure by those who must be allowed to have been competent judges. A poem of Labid Ebn Rabia one of the greatest wits in Arabia in Muhammad's time, being fixed up on the gate of the temple of Mecca, an honour allowed to none but the most esteemed performances, none of the other poets durst offer anything of their own in competition with it. But the second chapter of Koran being fixed up by it soon after, Labid himself (then an idolater) on reading the first verses only, was struck with admiration, and immediately professed the religion taught thereby, declaring that such words could proceed from an inspired person only." (1)

"یہاں میں بے شمار مثالوں میں سے صرف ایک مثال یہ ظاہر کرنے کے لئے پیش کروں گا کہ اس کتاب کے اسلوب کی تعریف وہ لوگ بھی کیا کرتے تھے جن کو اس کتاب کے متعلق فیصلہ کرنے کے لئے اہل اور موزوں جج قرار دیا جاسکتا ہے۔ لبید بن ربیعہ جو محمد ﷺ کے زمانے کے عظیم عرب شعراء میں سے ایک تھا، اس کی ایک نظم خانہ کعبہ کے دروازے پر آویزاں کی گئی۔ یہ ایک ایسا اعزاز تھا جو صرف ان ادب پاروں کو حاصل ہوتا تھا جن کے مقابلے کی دوسرے شعراء میں ہمت نہ

1- "The Koran"، صفحہ 8-47

ہوتی تھی۔ لیکن جلد ہی لبید کی نظم کے ساتھ قرآن حکیم کی دوسری سورۃ آویزاں کر دی گئی۔ لبید اس سورۃ کی ابتدائی آیات پڑھ کر ہی اس کے لئے سراپا تعریف بن گیا۔ اس نے فوراً وہ دین قبول کر لیا جس کی تعلیم وہ سورۃ دے رہی تھی اور ساتھ ہی اعلان کیا کہ یہ کلام صرف ایسے شخص کی زبان سے نکل سکتا ہے جس پر خدا کی طرف سے وحی آتی ہو۔"

ولید بن مغیرہ قرآن اور صاحب قرآن کا دشمن تھا۔ اس کی قادر الکلامی کی دھوم پورے مکہ میں تھی۔ ابو جہل چاہتا تھا کہ اس کی زبان سے قرآن حکیم کے خلاف کچھ کلمات نکلوائے۔ ولید بن مغیرہ اسلام کا دشمن تو تھا لیکن قرآن حکیم کی عظمت نے اسے سرنگوں کر رکھا تھا۔ ابو جہل کے اصرار پر اس نے کہا: تم جانتے ہو کہ میں تمام اصناف سخن کا تم سے زیادہ شناسا ہوں لیکن خدا کی قسم محمد کا کلام ان اصناف سخن میں سے کسی کے ساتھ بھی تعلق نہیں رکھتا۔ اس موقعہ پر ولید بن مغیرہ نے یہ تاریخی جملے کہے:

وَاللّٰہِ اِنَّ لِقَوْلِہٖ لَحَلَاوَۃً وَّاِنَّ عَلَیْہِ لَطَلَاوَۃً وَّاِنَّہٗ لَمُثْمِرٌ اَعْلَاہُ مُشْرِقٌ اَسْفَلُہٗ وَاِنَّہٗ لَیَعْلُوْ وَمَا یُعْلٰی وَاِنَّہٗ لَیَحْطِمُ مَا تَحْتَہٗ (1)

"خدا کی قسم اس کلام میں ایک عجیب قسم کی مٹھاس ہے۔ حسن و جمال اس پر سایہ کناں ہے۔ اس کا اوپر والا حصہ ضیا بار اور اس کا نچلے والا حصہ تجلی ریز ہے۔ یہ غالب آتا ہے مغلوب نہیں ہو سکتا۔ جو اس کے نیچے آتا ہے، یہ اسے پیس کے رکھ دیتا ہے۔"

ہم قرآن حکیم کی عظمت کا انکار کرنے والوں کو چیلنج کرتے ہیں کہ قرآن حکیم کے متعلق ولید بن مغیرہ جیسا مخالف جو تبصرہ کر رہا ہے، اپنی کتابوں کے متعلق کسی مخالف کی زبان سے ایسے تبصرے کی کوئی مثال پیش کریں۔

عتبہ بن ربیعہ کو سرداران قریش نے حضور ﷺ سے گفتگو کے لئے منتخب کیا۔ اس کے انتخاب کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے دور کے مروجہ علوم و فنون: سحر، کہانت اور شاعری وغیرہ میں یگانہ روزگار تھا۔ وہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا۔ لالچ اور تحریص کے ذریعے حضور ﷺ کو اپنی دعوت سے دستبردار ہونے کی ترغیب دی۔ حضور ﷺ اس کی باتیں

1۔ السید محمد رشید رضا، "الوحی المحمدی"، (دار المنار مصر۔ 1947)، صفحہ 108

سنتے رہے۔ جب وہ اپنی گفتگو ختم کر چکا تو حضور ﷺ نے قرآنی آیات کی تلاوت شروع کی۔ جب آپ اس آیہ کریمہ پر پہنچے:

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ(1)

"پس اگر وہ (پھر بھی) روگردانی کریں تو آپ فرمائیے کہ میں نے ڈرایا ہے تمہیں اس کڑک سے جو عاد و ثمود کی کڑک کی مانند (ہلاکت خیز) ہو گی۔"

یہ آیات سن کر عتبہ کانپ اٹھا۔ کھڑے ہو کر حضور ﷺ کے دہن مبارک پر ہاتھ رکھ کر رحم کی التجا کی۔(2)

(منکرین قرآن، عتبہ بن ربیعہ کی اس حالت کا جائزہ لیں۔ وہ کون سی چیز تھی جس نے عتبہ کو لرزہ براندام کر دیا تھا؟ وہ قرآن حکیم کی تاثیر اور صاحب قرآن کی عظمت کے احساس کے علاوہ کیا تھا؟) عتبہ جب اپنی قوم کے پاس واپس پہنچا تو اس نے ان سے جا کر کہا: تم جانتے ہو محمد کو کہتے ہیں وہ ہمیشہ سچ کہتا ہے۔ ان کا کلام سن کر مجھ پر یہ خوف طاری ہو گیا تھا کہ کہیں تم پر عذاب نازل نہ ہو جائے۔

ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اس نے اپنی قوم سے کہا: محمد نے میرے سامنے وہ کلام پیش کیا ہے جس کی مثل میرے کانوں نے کبھی نہیں سنی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ میں ان کے جواب میں کیا کہوں۔(3)

ولید بن مغیرہ اور عتبہ بن ربیعہ جیسے لوگ تو دشمنی کے باوجود اعلانیہ قرآن کی عظمت کا اقرار کیے بغیر نہ رہ سکے۔ لیکن جو لوگ اٹھتے بیٹھتے قرآن اور قرآن لانے والے پیغمبر ﷺ کے خلاف پروپیگنڈے میں مصروف تھے اور جن کی زندگی کا مقصد اس شمع حق کو بجھانے کے سوا کچھ نہ تھا، وہ بھی چھپ چھپ کر قرآن سنتے اور اس کی عظمتوں کے سامنے سر تسلیم خم کرتے تھے۔ وہ جب آپس میں ملتے تو قرآن نہ سننے کی قسمیں کھاتے لیکن جب رات کا سناٹا چھاتا تو قرآن حکیم کی ناقابل بیان مٹھاس، جس سے ان کے کان آشنا ہو چکے تھے، وہ انہیں کسی کروٹ چین نہ لینے دیتی۔ وہ بے اختیار اٹھتے، کاشانہ حبیب خدا کا رخ کرتے، چھپ چھپ کر خدا کے حبیب کی زبان سے خدا کا کلام سنتے اور اس پر ایمان لائے بغیر اس کی

1۔ سورۃ حم السجدہ 13

2۔ "الوحی المحمدی"، صفحہ 138

3۔ ایضاً، صفحہ 139

ناقابلِ بیاں تاثیر سے محظوظ ہوتے۔

یہ رویہ غیر معروف قسم کے کافروں کا نہ تھا بلکہ ابو جہل، ابوسفیان اور اخنس بن شریق جیسے لوگ، جو اسلام کی عداوت میں پیش پیش تھے، ان کی راتیں چھپ چھپ کر قرآن سننے میں گزرتی تھیں۔(1)

کفارِ مکہ اپنی زبردست اسلام دشمنی کے باوجود اس بات کو خفیہ نہ رکھ سکے کہ وہ قرآن حکیم کی معجزانہ تاثیر کو تسلیم کرتے ہیں۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو کفارِ مکہ نے مسجد حرام میں نماز پڑھنے سے روکا۔ انہوں نے اس کے سبب کو خفیہ نہیں رکھا بلکہ انہوں نے علی الاعلان کہا کہ وہ ابو بکر کو مسجد حرام میں نماز پڑھنے سے اس لئے روک رہے ہیں کہ ان کی تلاوتِ قرآن کی تاثیر سے ان کو اپنی عورتوں اور بچوں کے گمراہ ہونے کا خطرہ ہے۔

انہوں نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مسجد حرام میں تلاوتِ کلام پاک سے روکا تو آپ نے اپنے گھر میں مسجد بنالی اور وہاں نماز اور تلاوتِ قرآن حکیم کے ذریعے اپنے قلب و روح کو تسکین مہیا کرنے کا سامان کر لیا۔ قرآن حکیم کی تلاوت جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے سینے میں لطیف جذبات کے گلشن آباد کر رہی تھی، اس کی بھینی بھینی خوشبو نے مکہ بھر کی فضاؤں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ قریش کی عورتیں اور بچے جو قرآن حکیم کی سامعہ نواز تلاوت سے قلب و روح کو مسرور کرنے کیلئے کبھی مسجد حرام کا رخ کیا کرتے تھے، ان کی توجہات کا مرکز اب کاشانہ صدیق بن گیا۔ قریش نے آپ کو اپنے گھر میں بھی تلاوتِ قرآن حکیم سے روکا اور سب پھر وہی پیش کیا جو پہلے پیش کر چکے تھے۔

اگر مچھلی پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ قرآن حکیم کی تلاوت کے بغیر کیسے رہ سکتے تھے۔ آپ نے اپنا گھر بار، کاروبار اور اہل و عیال سب کچھ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا لیکن تلاوتِ قرآن حکیم کی نعمت سے دستبردار ہونا گوارا نہ کیا۔ آپ نے ہجرت کر کے حبشہ چلے جانے کا فیصلہ کیا۔ گھر سے روانہ ہوئے۔ راستے میں ابن دغنہ سے ملاقات ہوئی جو اپنی قوم کا سردار تھا۔ جب اسے آپ کے ارادۂ ہجرت کا پتہ چلا تو اسے یہ بات ناگوار گزری کہ ابو بکر جیسے عظیم انسان کو اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور کیا جائے۔ اس نے آپ کو اپنی پناہ میں لے لیا اور مکہ واپس لے آیا۔ مکہ والوں نے ابن دغنہ کی پناہ کو تسلیم کر

1۔ "الوحی المحمدی"، صفحہ 136

لیا لیکن اس سے کہا کہ تم ابو بکر سے کہو کہ وہ اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر اپنے رب کی عبادت کرے۔ وہ اپنے گھر میں جو چاہے کرے لیکن اعلانیہ یہ کام نہ کرے کیونکہ اس کی تلاوت قرآن کی تاثیر سے ہمیں اپنی عورتوں اور بچوں کے گمراہ ہونے کا خطرہ ہے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے چند روز تو اپنے گھر میں آہستہ آہستہ تلاوت کی لیکن ترتیل قرآن کے جس سرور سے آپ کے قلب و روح آشنا ہو چکے تھے، اس سے کنارہ کش رہنا آپ کے لئے ممکن نہ تھا۔ آپ نے پھر اپنے گھر کی مسجد میں باآواز بلند تلاوت شروع کر دی۔ قریش نے ابن دغنہ سے آپ کے باآواز بلند قرآن پڑھنے کی شکایت کی۔ ابن دغنہ کے استفسار پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس کی پناہ اسے لوٹا دی اور اپنے رب قدیر کی پناہ میں رہ کر قرآن حکیم کی تلاوت کا وظیفہ جاری رکھا۔(1)

نہ جانے مکہ میں کتنے خوش نصیب ایسے ہوں گے جنہوں نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی قرآن خوانی سے متاثر ہو کر اسلام کے دامن میں پناہ لی ہو گی۔

آج تو علم نفسیات بڑی ترقی کر چکا ہے۔ علمائے نفسیات اگر اس علم کی روشنی میں کفار مکہ کے مندرجہ بالا رویہ کا مطالعہ کریں تو انہیں پتہ چلے گا کہ کفار مکہ قرآن حکیم کی عظمت اور اس کی تاثیر کے سامنے ہتھیار ڈال چکے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ اگر یہ کتاب پڑھی جاتی رہی تو اپنے بچوں اور عورتوں کو اس کی تاثیر سے محفوظ رکھنے کا ان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں۔ انہیں اس بات میں بھی کوئی شک نہ تھا کہ یہ کتاب کسی انسان کا کلام نہیں۔ یہ بات بھی ان سے پوشیدہ نہ تھی کہ محمد ﷺ، جن کا بچپن، لڑکپن اور جوانی ان کی آنکھوں کے سامنے گزری تھی، کل تک نہ شاعری کے میدان میں ان کا کوئی نام تھا اور نہ ہی مکہ کے فصحاء و بلغاء میں ان کا شمار ہوتا تھا، آج اچانک وہ ایسا کلام تیار کرنے میں کیسے کامیاب ہو گئے جس کے سامنے لبید بن ربیعہ، ولید بن مغیرہ اور عتبہ بن ربیعہ جیسے لوگ جھکے جا رہے تھے؟ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ اس کلام کی مخالفت کرنے میں وہ غلط راستے پر چل رہے ہیں۔ یقیناً احساس جرم کی ٹیسیں ان کے ضمیر سے اٹھ رہی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے اس غیر معقول رویہ کو وہ زیادہ دیر قائم نہ رکھ سکے۔ بیس سال سے کم عرصہ میں ان میں سے جو زندہ بچے تھے انہوں نے اس شمع کی روشنی سے اپنے سینے منور کر لئے جس کو بجھانے کے

1۔ "الوحی المحمدی"، صفحہ 38-137

لئے کبھی انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا۔

بیس سال کا عرصہ قوموں کی زندگی میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اتنے قلیل عرصہ میں ان کی اسلام دشمنی کا عروج پر پہنچنا اور پھر مخالفت کے اس غبارے سے ہوا کا نکل جانا، اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن حکیم نے انہیں اپنے پہلے ہی وار میں شکار کر لیا تھا۔ کچھ مصلحتیں تھیں جو انہیں قرآن کے آستان پر جبیں فرسائی سے روک رہی تھیں۔ وہ مصلحتیں بھی زیادہ دیر قائم نہ رہ سکیں اور جن خوش نصیبوں کو زندگی نے مہلت دی وہ اس منزل پر پہنچ گئے جس کی طرف نہ جانے کی انہوں نے بار بار قسمیں کھائی تھیں۔

جو لوگ عربی زبان و ادب کے ماہر نقاد بھی تھے اور ساتھ ہی قرآن حکیم کے سخت مخالف بھی، ان کی طرف سے قرآن حکیم کی عظمت کے اس قولی اور عملی اعتراف کے بعد اس بات میں شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ ان کی نظروں میں قرآن حکیم کسی انسان کی تصنیف نہیں بلکہ کسی مافوق الفطرت ہستی کا کلام تھا۔

حضور ﷺ کا ان سے مطالبہ ہی یہ تھا کہ تم میری بات نہیں مانتے تو تمہاری مرضی، تم مجھے یہ پیغام دوسروں تک پہنچانے دو۔ لیکن وہ حضور ﷺ کا یہ مطالبہ ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ انہیں خطرہ تھا کہ محمد ﷺ کی حیات بخش دعوت کو سن کر لوگ ان کی طرف پروانہ وار دوڑیں گے۔ لیکن یہ خطرہ کیوں تھا؟ محمد عربی ﷺ کے پاس کیا تھا جس کی وجہ سے لوگ کشاں کشاں آپ کی طرف جاتے؟

آپ کے پاس یہی قرآن حکیم تھا اور اپنی آبگینے کی طرح پاک اور شفاف سیرت ہی تھی جو لوگوں کو اپنی طرف مائل کر رہی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے صلح حدیبیہ کو غالباً اسی لئے فتح مبین قرار دیا ہے کہ اس کے بعد قرآن حکیم کی آواز کو مختلف قبائل تک پہنچانے کے راستے میں جو رکاوٹیں حائل تھیں، وہ دور ہو گئیں۔ جب جزیرہ عرب کے طول و عرض میں قرآن حکیم کی آواز پہنچی تو لوگ گروہ در گروہ حلقہ اسلام میں داخل ہونے لگے۔

قریش مکہ سے زیادہ کسی کو قرآن حکیم کی تاثیر کا اندازہ نہ تھا۔ انہیں یہ بھی علم تھا کہ جن مصلحتوں کی وجہ سے وہ قرآن حکیم کا انکار کر رہے ہیں، وہ مصلحتیں عام لوگوں کے پیش نظر نہ ہوں گی، اس لئے یہ کلام جہاں پہنچے گا وہاں ہر طرف سے نعرۂ توحید کی صدائیں بلند

ہونے لگیں گی۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے قرآن حکیم کی آواز کو مکہ کے اندر ہی دبا دینے کی کوشش کی۔ لیکن جب یہ آواز مکہ سے باہر نکل گئی تو اس کی تاثیر سے اپنے ہم مذہب لوگوں کو بچانے کے لئے کوئی تدبیر قریش مکہ کے کام نہ آسکی۔ اور انجام کار انہوں نے بھی اسی کے دامن میں پناہ لے کر اپنی دنیا اور آخرت سنوار نے کا تہیہ کر لیا۔

السید محمد رشید رضا نے اپنی کتاب "الوحی المحمدی" میں نام لئے بغیر ایک فرانسیسی فلسفی کا قول لکھا ہے وہ فلسفی کہتا ہے:

"عیسائی کہتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ نے اپنی نبوت کے ثبوت کے لئے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی طرح کوئی معجزہ پیش نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ محمد ﷺ خشوع وخضوع کے ساتھ قرآن حکیم کی تلاوت کرتے تھے اور ان کی قرأت لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لئے وہ کام کرتی تھی جو جملہ انبیائے کرام کے تمام معجزات نے نہیں کیا۔" (1)

کفار مکہ کے سینوں میں اسلام دشمنی کی آگ شعلہ زن تھی اس لئے انہوں نے اپنی زبان سے تو ایسی باتیں کہیں جن سے قرآن حکیم کی عظمت جھلکتی تھی لیکن چونکہ انہوں نے قرآن حکیم کی تنویرات سے اپنی زندگیوں کو منور کرنے کا فیصلہ نہیں کیا تھا اس لئے ان کے قول وفعل سے قرآن حکیم کی حقیقی عظمتوں کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ قرآن حکیم کی تاثیر کی قوت کا صحیح اندازہ کرنا ہو تو اس انفرادی، اجتماعی، سماجی، معاشی، اخلاقی، سیاسی اور روحانی انقلاب پر ایک نظر ڈالی جائے جو قرآن حکیم نے مسلمانوں کی زندگیوں میں برپا کیا تھا۔

کیا بت پرستوں کا بت شکن بن جانا، توہمات کے اندھیروں میں بھٹکنے والوں کا ایمان و ایقان کی دولت سے بہرہ ور ہو جانا اور اپنی اولاد کے قاتلوں کا رحمت ورافت کا علمبردار بن جانا کوئی معمولی بات تھی؟ کیا ایک دوسرے کے خون کے پیاسوں کے دلوں میں محبت و اخوت کے گلشن کھلا دینا کسی انسان کے بس میں تھا؟ کیا شراب کے پجاریوں کی کسی قوم کو کسی نے اپنے ہاتھوں سے شراب کے مٹکے توڑتے ہوئے دیکھا ہے؟

اگر یہ سب کچھ ہوا اور ساری دنیا کے سامنے ہوا تو اس کی توجیہہ، اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہ بے مثال انقلاب قرآن حکیم کی لازوال تاثیر کی برکت سے رونما ہوا۔

1۔ "الوحی المحمدی"، صفحہ 138

اسلام سے پہلے جزیرۂ عرب میں یہودیت اور عیسائیت نے بھی اپنے پاؤں پھیلائے تھے۔ عرب کی فضاؤں میں ان کے صحیفوں کی تلاوت کی صدائیں بھی بلند ہوتی تھیں۔ لیکن ان صحیفوں کی تلاوت نے نہ تو کفار مکہ کے دلوں میں یہ خوف پیدا کیا تھا کہ ان کی تاثیر سے ان کی عورتیں اور بچے دین آباء سے منہ موڑ جائیں گے اور نہ انہیں ان آوازوں کو دبانے کے لئے جدوجہد کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ وہ کتابیں نہ تو اپنے مخالفین کے لئے کسی چیلنج کا باعث بن سکیں اور نہ وہ اپنے ماننے والوں کے دلوں میں کوئی انقلاب برپا کر سکیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں تو تورات یقیناً اپنی اصلی حالت میں تھی لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کی قسوت قلب کو تو اس مقدس آسمانی صحیفے نے بھی ختم نہ کیا اور نہ ہی ان کے دلوں سے مصری بت پرستی کے آثار ختم ہوئے۔ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دست اقدس پر مصر میں، مصر سے خروج کے وقت اور صحرائے سینا میں بے شمار معجزات کا مشاہدہ کیا۔ انہوں نے کلام خداوندی کی آیات بھی سنیں لیکن اس کے باوجود وہ قدم قدم پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے حجت بازیاں کرتے رہے۔ کبھی آپ سے مطالبہ کیا کہ آپ ان کے لئے بت پرستوں کے بتوں کی طرح کا کوئی بت بنائیں۔ کبھی آپ سے رنگ برنگے کھانوں کے مطالبے کئے۔ جب آپ نے جہاد کا حکم دیا تو کہا: "موسیٰ! تم اور تمہارا خدا جاؤ اور لڑو ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔" جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کچھ وقت کے لئے غیر حاضر ہوئے تو انہوں نے خدا کو چھوڑ کر بچھڑے کو پوجنا شروع کر دیا۔

جو لوگ تورات کو کلام خداوندی مانتے ہیں اور قرآن کو حضور ﷺ کی تصنیف کہتے ہیں، وہ جواب دیں کہ تورات اور قرآن کی تاثیر میں یہ فرق کیوں تھا؟

ایک قوم تورات نے تیار کی اور دوسری قوم قرآن حکیم نے تیار کی۔ تورات نے اپنی تیار کردہ قوم کے متعلق یہ فیصلہ دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے فرماتے ہیں:

"For I —I well know your rebelliousness and your stiff neck. If while I am yet alive with you today, you have proved rebellious in behaviour toward Jehovah, Then how much more so after my death." (1)

"میں تمہاری اکڑی ہوئی گردن اور تمہاری باغیانہ فطرت سے خوب آگاہ ہوں۔

آج جب میں زندہ تمہارے درمیان موجود ہوں، تم باغی ثابت ہوئے ہو تو میرے انتقال کے بعد تمہاری بغاوت کا کیا عالم ہوگا۔"

اس کے برعکس جوامت قرآن حکیم نے تیار کی، اس کے متعلق قرآن حکیم کا اعلان یہ ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا (2)

"(جان عالم) محمد اللہ کے رسول ہیں اور وہ (سعادت مند) جو آپ کے ساتھی ہیں، کفار کے مقابلہ میں بہادر اور طاقت ور ہیں۔ آپس میں بڑے رحم دل ہیں۔ تو دیکھتا ہے انہیں کبھی رکوع کرتے ہوئے اور کبھی سجدہ کرتے ہوئے۔ طلب گار ہیں اللہ کے فضل اور اس کی رضا کے۔"

جزیرہ عرب کے لوگوں کی قلبی قساوت کو رحمت و رافت میں بدل دینا صرف اسی کلام سے ممکن تھا جو پروردگار عالم نے هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ بنا کر نازل فرمایا تھا۔ قرآن حکیم نے جزیرہ عرب کے مکینوں، مکہ کے مشرکوں اور ہدایت قرآنی کے دامن میں پناہ لینے والی دیگر قوموں کے دلوں پر جو حیران کن اثرات مرتب کیے تھے، تاریخ انسانی ان کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ایک امی عرب کی زبان سے ایسے معجزانہ کلام کا نکلنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کلام کا مصنف کوئی انسان نہیں بلکہ وہ ہستی ہے جو مقلب القلوب ہے اور جدھر چاہتا ہے بنی نوع انسان کے دلوں کو پھیر دیتا ہے۔

آج کل جو آدمی کچھ کتابیں پڑھ کر چند سطریں لکھ لے، اسے مفکر، مدبر، محقق اور دانشور جیسے بھاری بھرکم القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے مستشرقین سب ہی دانشور ہوتے ہیں۔ ان کو جس میدان میں معمولی سی شدبد ہو، اس میدان کا بھی ان کو ماہر شمار کیا جاتا ہے۔ خصوصاً علوم اسلامیہ میں وہ سب ہی ماہر ہوتے ہیں۔ جو لوگ غلط ترجموں کی مدد سے قرآن حکیم کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ بھی اپنے آپ کو قرآن حکیم کا مستند نقاد سمجھتے ہیں۔ وہ لوگ جس اسلوب میں خود کتابیں لکھتے ہیں اسی کو معیار قرار دیتے ہیں اور پھر اس خود ساختہ معیار پر قرآن حکیم کے اسلوب کو پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ان کے نزدیک ہر فن کی کتاب صرف اسی فن پر بحث کرتی ہے۔ ہر کتاب کا ہر باب کسی

1۔ "کتاب استثناء"، باب 31، آیت 27

2۔ سورۃ الفتح: 29

ایک موضوع پر مشتمل ہوتا ہے۔ وہ ایک موضوع پر لکھتے ہوئے صرف اسی موضوع پر بحث کرتے ہیں اور جو باتیں موضوع سے متعلق نہ ہوں، ان کو ذکر کرنا معیوب سمجھتے ہیں۔

وہ اپنے انہی اصولوں کو قرآن حکیم پر لاگو کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ قرآن حکیم کسی واقعہ کا ذکر کرتے کرتے بات کو روز قیامت کی سختیوں کی طرف موڑ دیتا ہے۔ قریش مکہ کے تجارتی سفروں کا تذکرہ کرتا ہے تو درمیان میں نماز کو داخل کر دیتا ہے۔ طلاق اور نکاح کے مسائل بیان کرتے ہوئے تقویٰ کی ترغیب دینے لگتا ہے۔ ان لوگوں کی نظر میں قرآن حکیم کا یہ اسلوب قابل اعتراض ہے۔

ہم صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اگر قرآن حکیم کا اسلوب وہ ہوتا جس کی وہ سفارش کر رہے ہیں تو یقیناً اس کی تاثیر وہ نہ ہوتی جس کی چند جھلکیاں ہم نے گزشتہ صفحات میں پیش کی ہیں۔ آج کا اسلوب نگارش یہ ہے کہ قانون کی کتاب میں صرف قانونی مسائل ہوتے ہیں جن کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ قانونی مسائل میں عدالتوں اور قانون دانوں کی راہنمائی کریں۔ تاریخ دان کا مقصد صرف کسی واقعہ کو اپنے قارئین تک پہنچانا ہوتا ہے۔ ماہر معاشیات اپنی کتاب کے ذریعے صرف معاشی مسائل کی تشریح کرنا چاہتا ہے۔ ان کتابوں کو صرف وہی شخص دلچسپی کے ساتھ پڑھ سکتا ہے جس کا تعلق متعلقہ میدان سے ہوتا ہے اور اس شخص کے لئے بھی ایک سے زیادہ بار ان کتابوں کو پڑھنا ممکن نہیں ہوتا۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے انسان کی معلومات میں اضافہ تو ہوتا ہے لیکن ایسا اتفاق بہت کم ہوتا ہے کہ ایسی کسی کتاب نے کسی انسان کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا ہو۔

اس کے برعکس قرآن حکیم کسی ایک علم کی کتاب نہیں۔ اس نے کائنات کے ہر موضوع کو اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے۔ یہ صرف معلومات مہیا کرنے والی کتاب نہیں بلکہ یہ کتاب ہدایت ہے۔ یہ اس حکیم کا کلام ہے جس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ قرآن حکیم بتوں کے سامنے جھکی ہوئی انسانیت کو خدائے واحد کے سامنے جھکانا چاہتا ہے۔ وہ اخلاقی بیماریوں کا قلع قمع کر کے حسن اخلاق کے گلشن کھلانا چاہتا ہے۔ وہ اوہام و اباطیل کے اندھیروں میں بھٹکنے والی انسانیت کو نور عرفان سے بہرہ ور کرنا چاہتا ہے۔ وہ انتشار و افتراق کی بھٹی میں سلگتی ہوئی نسل آدم کو وحدت و اخوت کی لڑی میں پرونا چاہتا ہے۔ وہ عقل کو جلا اور ضمیر کو حریت کی نعمت عطا کرنا چاہتا ہے۔ وہ امیر و غریب، شاہ و گدا، آقا و مولیٰ اور گورے اور کالے کے امتیازات کو مٹا کر نسل آدم میں مساوات قائم کرنا چاہتا ہے۔ وہ

عورتوں کی زبوں حالی اور غلاموں کی بے بسی کو ختم کر کے انہیں دوسرے انسانوں کے برابر مقام عطا کرنا چاہتا ہے۔

قرآن حکیم کے سامنے مقاصد کی ایک لمبی فہرست ہے۔ ان میں سے کچھ تو وہ ہیں جو صرف ایک بار کے اشارے سے پورے ہو جاتے ہیں۔ کچھ وہ ہیں جن کے لئے ہر بات کو چند بار دہرانے سے کام چل جاتا ہے۔ اور کچھ مقاصد وہ ہیں جن کے حصول کے لئے بات کو بار بار دہرانے کی ضرورت پڑتی ہے۔

قرآن حکیم نے کسی بات کو اتنی ہی بار دہرایا ہے جتنی بار اس کو دہرانے کی ضرورت تھی۔ کیا مکہ کے بت پرستوں کو صرف ایک بار یہ بتا دینا کافی ہو سکتا تھا کہ بت پرستی بری چیز ہے؟ کیا دلوں کی تختی کو دور کرنے کے لئے اس کے خلاف صرف ایک فتویٰ کافی تھا؟

قرآن حکیم تربیت کی کتاب ہے اور اس نے امت مسلمہ کی وہ تربیت کی ہے کہ دنیا اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ قرآن حکیم کا کمال یہ ہے کہ اس کی کوئی سورۃ لو، اس سورۃ کا عنوان کچھ بھی ہو، قرآن حکیم ان مقاصد کو کبھی فراموش نہیں کرتا جن کے حصول کے لئے وہ نازل ہوا تھا۔ قرآن حکیم قریش کے تجارتی قافلوں کا ذکر کرتا ہے تو ساتھ ہی کفار مکہ کو خدا کی نعمتیں یاد دلا کر انہیں اس کی شکر گزاری کی ترغیب دیتا ہے۔ انبیائے کرام کے واقعات کو قرآن حکیم متعدد بار بیان کرتا ہے اور ہر بار ان کے ذریعے اپنے نزول کے کسی مقصد کو پورا کرتا ہے۔ جیل کے ساتھی یوسف صدیق علیہ السلام سے اپنے خوابوں کی تعبیر پوچھتے ہیں تو آپ خوابوں کی تعبیر بتانے کا وعدہ کر کے ان کے سامنے توحید کے موضوع پر وہ خطبہ ارشاد فرماتے ہیں جو اپنی مثال آپ ہے۔

قرآن روح کی غذا ہے۔ مسلمان نماز کے اندر یا نماز کے علاوہ کسی اور حالت میں قرآن حکیم کی کوئی سی بھی سورۃ یا آیت پڑھے، اس نے اس کی روح کو غذا ملتی ہے۔

قرآن حکیم کے سامنے جو مقاصد تھے ان کے حصول کے لئے یقیناً وہی اسلوب مفید تھا جو قرآن حکیم میں اپنایا گیا ہے۔ اگر قرآن حکیم کا اسلوب وہ ہوتا جو آج کے نقاد دیکھنا چاہتے ہیں تو یقیناً وہ بھی آج کے دانشوروں کی کتابوں کی طرح کتب خانوں کی زینت تو ہوتا اور نقاد اس کی ادبی خوبیوں کو بھی سراہتے لیکن وہ عالمگیر انقلاب جو قرآن حکیم کے خدائی اسلوب کے طفیل رونما ہوا، وہ رونما نہ ہوتا۔

معوذتین کی قرآنیت کا مسئلہ

معوذتین کی قرآنیت کا مسئلہ

مستشرقین کی تحقیق کا اسلوب یہ ہے کہ جو بات ان کے مزعومات کے خلاف ہو، اس کو نقل متواتر کا درجہ حاصل ہو تو بھی اسے مسترد کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے لیکن جو چیز ان کے مزعومات کے موافق ہو، اس کی سند کتنی ہی ضعیف ہو، اسے ایک ناقابل انکار حقیقت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ قرآن حکیم کی زبان اور اسلوب انسانی اسلوب سے ممتاز ہیں اور کسی انسان کے لئے ممکن نہیں کہ وہ قرآن حکیم کی مثل ایک یا چند سورتیں بنا کر پیش کر سکے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کے صحابہ کرام بھی قرآن حکیم کی زبان کو عربی ادب کی عام زبان سے ممتاز نہیں سمجھتے تھے۔ اپنے اس دعویٰ کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سورہ فاتحہ اور معوذتین کو قرآن کا حصہ نہیں سمجھتے تھے۔

مستشرقین کو قرآن حکیم کے خلاف یہ اعتراض کرنے کا موقعہ اس طرح مل گیا کہ تفسیر اور حدیث کی بعض کتابوں میں یہ بات موجود ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ معوذتین کو قرآن کا حصہ نہیں سمجھتے تھے، وہ ان سورتوں کو قرآن حکیم سے کھرچ دیتے تھے، لوگوں سے کہتے تھے کہ غیر قرآن کو قرآن میں شامل نہ کرو۔ روایات میں یہ بات بھی موجود ہے کہ آپ نماز میں ان کی تلاوت نہیں کرتے تھے۔

علامہ سیوطی نے "الدر المنثور" میں صراحۃ لکھا ہے:

اَخْرَجَ اَحْمَدُ وَالْبَزَّارُ وَالطَّبْرَانِيُّ وَابْنُ مَرْدَوَيْهِ مِنْ طُرُقٍ صَحِيْحَةٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّهُ كَانَ يَحُكُّ الْمُعَوِّذَتَيْنِ مِنَ الْمُصْحَفِ وَيَقُوْلُ لَا تَخْلِطُوا الْقُرْاٰنَ بِمَا لَيْسَ مِنْهُ اِنَّهُمَا لَيْسَتَا مِنْ كِتَابِ اللهِ اِنَّمَا اَمَرَ النَّبِيُّ ﷺ اَنْ يَتَعَوَّذَ

بِهِمَا وَكَانَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ لَا يَقْرَءُ بِهِمَا[1]

"احمد، بزاز، طبرانی اور ابن مردویہ نے صحیح طریقوں سے حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ معوذتین کو مصحف مبارک سے محو کر دیا کرتے تھے اور فرماتے تھے قرآن کو ان چیزوں سے خلط ملط نہ کرو جو قرآن کا حصہ نہیں ہیں۔ یہ قرآن کا حصہ نہیں، حضور ﷺ نے تو محض یہ حکم دیا ہے کہ ان کے ذریعے پناہ مانگی جائے۔ اور حضرت عبد اللہ ابن مسعود ان سورتوں کی قرأت نماز میں نہیں کرتے تھے۔"

جہاں تک معوذتین کی قرآنیت کا مسئلہ ہے، اس پر تو اس قسم کی روایات اثر انداز نہیں ہوتیں کیونکہ اس قول میں صحابہ کرام میں سے کسی نے حضرت عبداللہ بن مسعود کی تائید نہیں کی۔ تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ان سورتوں کو قرآن حکیم کا حصہ سمجھتے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں قرآن حکیم کا جو نسخہ تیار ہوا تھا اس میں یہ سورتیں شامل تھیں۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور میں خاص لغت قریش کے مطابق قرآن حکیم کا جو نسخہ تیار ہوا تھا، یہ سورتیں اس نسخے میں بھی موجود تھیں۔ چودہ سو سال سے امت مسلمہ اسی نسخۂ عثمانی کے مطابق قرآن حکیم کی تلاوت کر رہی ہے اور یہی قرآن نقل متواتر کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے اور آج دنیا میں کوئی بھی قرآن حکیم کا نسخہ ایسا نہیں ہے جس میں یہ دو سورتیں موجود نہ ہوں۔ اس لئے خبر متواتر کے مقابلے میں خبر واحد کا اعتبار نہیں ہو گا۔

اس حقیقت کے باوجود قرآن حکیم کا معاملہ بڑا نازک ہے۔ کوئی روایت، خواہ وہ روایت و درایت کے اصولوں کے لحاظ سے کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہو، اگر اس میں کچھ ایسے الفاظ موجود ہوں جن سے قرآن حکیم کے متعلق کسی بھی حیثیت سے شک کا معمولی سا شائبہ پیدا ہونے کی گنجائش ہو تو اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے صحابیٔ رسول، جن کا شمار عالم صحابہ

1۔ امام جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر السیوطی، "الدر المنثور فی التفسیر بالماثور" جلد 6، صفحہ 416

کرام میں ہوتا ہے، ان کی طرف اس بات کا منسوب ہونا کہ انہوں نے قرآن حکیم کی کچھ سورتوں کے متعلق کہا کہ یہ قرآن کا حصہ نہیں، ایسی بات ہے جس کو نظرانداز کرنا ممکن نہیں ہے۔ ان کی طرف اس قسم کی بات کے منسوب ہونے سے کئی مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا قرآن پر اجماع نہیں تھا بلکہ بعض صحابہ کرام کو قرآن حکیم کے بعض حصوں کی قرآنیت پر اختلاف تھا۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ جن سورتوں کو حضور ﷺ نے بارہا نماز میں تلاوت فرمایا، وہ ان کے قرآن کا حصہ ہونے کا انکار کر رہے ہیں۔ دوسرے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ وہ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اتنے بڑے اقدام پر خاموش رہے اور انہوں نے حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔

مستشرقین کے لئے اس قسم کی روایتیں بہت بڑے ہتھیار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انہیں اپنے موقف کی حمایت کرنے والی کوئی موضوع روایت بھی مل جائے تو اسے خبر متواتر پر ترجیح دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے ملت نے اس مسئلے کو بڑی اہمیت دی ہے اور مفسرین کرام نے ان روایات کی وجہ سے پیدا ہونے والی صورت حال پر تفصیل سے بحثیں کی ہیں۔

بعض علمائے کرام نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان سورتوں کے قرآن ہونے کا انکار تو نہیں کرتے تھے، وہ صرف ان کو مصحف میں لکھنے کے خلاف تھے۔ وہ حضرات کہتے ہیں کہ چونکہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ان سورتوں کو کثرت سے تلاوت کیا کرتے تھے، اس لئے ان سورتوں کو یاد رکھنے کے لئے وہ ان کی کتابت کو ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کے مصحف مبارک میں سورۃ فاتحہ بھی لکھی ہوئی نہ تھی۔[1]

کچھ حضرات کہتے ہیں کہ یہ سورتیں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے نزدیک قرآن کا حصہ تو تھیں لیکن آپ کے نزدیک یہ ثابت نہ تھا کہ حضور ﷺ نے ان کو مصحف میں لکھنے کا حکم بھی دیا ہے۔

اس قسم کی تاویلیں خواہ کتنی نیک نیتی سے کی گئی ہوں، ان سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ کیونکہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے موقف کے متعلق جو روایات موجود ہیں، ان میں صرف لکھنے کا انکار نہیں بلکہ ان میں وضاحت ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ یہ کہہ کر ان سورتوں کی قرآنیت کا انکار کرتے تھے کہ غیر قرآن کو قرآن میں خلط ملط نہ کرو۔ بلکہ ان روایتوں میں یہ بھی مذکور ہے کہ آپ نے صراحۃً فرمایا کہ یہ سورتیں قرآن کا حصہ نہیں۔ حضرت ابن مسعود کی طرف سے اس وضاحت کے بعد اس قسم کی تاویلوں کی گنجائش نہیں رہتی۔

بعض علمائے امت اس قسم کی روایات کو اصول درایت پر پورا نہ اترنے کی وجہ سے باطل قرار دیتے ہیں۔ امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں:

نُقِلَ فِیْ بَعْضِ الْکُتُبِ الْقَدِیْمَۃِ اَنَّ ابْنَ مَسْعُوْدٍ کَانَ یُنْکِرُ کَوْنَ سُوْرَۃِ الْفَاتِحَۃِ وَالْمُعَوِّذَتَیْنِ مِنَ الْقُرْاٰنِ وَھُوَ اَمْرٌ فِیْ غَایَۃِ الصُّعُوْبَۃِ لِاَنَّا اِنْ قُلْنَا: اِنَّ النَّقْلَ الْمُتَوَاتِرَ کَانَ حَاصِلاً فِیْ عَصْرِ الصَّحَابَۃِ یَکُوْنُ ذَالِکَ مِنَ الْقُرْاٰنِ فَاِنْکَارُہٗ یُوْجِبُ الْکُفْرَ وَاِنْ قُلْنَا: لَمْ یَکُنْ حَاصِلاً فِیْ ذَالِکَ الزَّمَانِ فَیَلْزَمُ اَنَّ الْقُرْاٰنَ لَیْسَ بِمُتَوَاتِرٍ فِی الْاَصْلِ (1)

"بعض قدیم کتابوں میں منقول ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سورۃ فاتحہ اور معوذتین کے قرآن کا جزو ہونے کا انکار کرتے تھے۔ اس روایت کو تسلیم کرنا انتہائی مشکل ہے۔ کیونکہ اگر ہم کہیں کہ دور صحابہ میں قرآن حکیم کی روایت درجہ تواتر پر پوری اترتی تھی تو اس صورت میں یہ سورتیں قرآن حکیم کا جزو قرار پائیں گی اور ان کا انکار موجب کفر ہوگا۔ اور اگر ہم یہ کہیں کہ دور صحابہ میں قرآن حکیم کی روایت نقل متواتر نہ تھی تو یہ لازم آئے گا کہ در اصل قرآن متواتر ہی نہیں۔"

اس استدلال کی بنا پر امام فخر الدین رازی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس مذہب

1۔ "الاستشراق والخلفیۃ الفکریہ للصراع الحضاری"، صفحہ 112

کے منقول ہونے کو نقل باطل قرار دیتے ہیں۔ قاضی ابو بکر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اِنَّهٗ لَمْ يَصِحَّ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ هٰذِهِ السُّوَرَ لَيْسَتْ مِنَ الْقُرْاٰنِ (1)

"حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت صحیحہ سے یہ بات ثابت نہیں کہ آپ ان سورتوں کو قرآن کا جزو نہیں سمجھتے تھے۔"

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ "شرح المہذب" میں فرماتے ہیں:

اَجْمَعَ الْمُسْلِمُوْنَ عَلٰى اَنَّ الْمُعَوِّذَتَيْنِ وَالْفَاتِحَةَ مِنَ الْقُرْاٰنِ وَاَنَّ مَنْ جَحَدَ مِنْهَا شَيْئًا كُفْرٌ وَمَا نُقِلَ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ بَاطِلٌ لَيْسَ بِصَحِيْحٍ (2)

"مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ معوذتین اور سورۃ فاتحہ قرآن کا جزو ہیں اور جو ان میں سے کسی کی قرآنیت کا انکار کرے وہ کافر ہے۔ اس سلسلے میں جو باتیں حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں، وہ باطل ہیں، صحیح نہیں ہیں۔"

باقلانی نے اپنی کتاب اعجاز القرآن میں لکھا ہے:

اِنَّهٗ لَوْصَحَّ اَنَّ ابْنَ مَسْعُوْدٍ كَانَ قَدْ اَنْكَرَ السُّوْرَتَيْنِ عَلٰى مَا ادَّعَوْا لَكَانَتِ الصَّحَابَةُ تُنَاظِرُهٗ عَلٰى ذَالِكَ وَكَانَ يَظْهَرُ وَيَنْتَشِرُ فَقَدْ تَنَاظَرُوْا فِيْٓ اَقَلَّ مِنْ هٰذَا وَهٰذَا اَمْرٌ يُوْجِبُ التَّكْفِيْرَ وَالتَّضْلِيْلَ فَكَيْفَ يَجُوْزُ اَنْ يَّقَعَ التَّخْفِيْفُ فِيْهِ وَقَدْ عَلِمْنَا اِجْمَاعَهُمْ عَلٰى مَا جَمَعُوْهُ فِي الْمُصْحَفِ فَكَيْفَ يُقْدَحُ بِمِثْلِ هٰذِهِ الْحِكَايَاتِ الشَّاذَّةِ فِي الْاِجْمَاعِ الْمُقَرَّرِ وَالْاِتِّفَاقِ الْمَعْرُوْفِ (3)

"اگر یہ دعویٰ سچا ہوتا کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان دو سورتوں کا انکار کیا تھا تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس بات پر

1۔ الاستشراق والخلفیۃ الفکریہ للصراع الحضاری"، صفحہ 113

2۔ ایضاً

3۔ ایضاً، صفحہ 14-113

ان سے مناظرہ کرتے۔ اور یہ مسئلہ خوب شہرت حاصل کرتا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تو اس سے کم اہم معاملات میں بھی باہم مناظرہ کرتے تھے۔ یہ مسئلہ جو اتنا اہم تھا کہ اس کے متعلق غلط موقف انسان کو کفر و ضلالت کی منزل تک پہنچا سکتا تھا، اس کے متعلق صحابہ کرام کا نرم رویہ اختیار کرنا کیسے ممکن تھا۔ ہمیں معلوم ہے کہ صحابہ کرام نے جو کچھ مصحف میں جمع کیا تھا اس پر ان کا اجماع تھا۔ جہاں اجماع ثابت ہو چکا ہے اور جس مسئلے پر امت کا اتفاق مشہور ہے، اس کے متعلق اس قسم کی شاذ روایتوں کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے۔"

اگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عمومی مزاج اور قرآن و حدیث کے معاملے میں ان کی انتہائی احتیاط کو پیش نظر رکھا جائے تو اس بات میں شک نہیں رہتا کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف اس مذہب کا انتساب باطل ہے۔ اول تو حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس امر کا مخفی رہنا ہی بعید از قیاس ہے کیونکہ صحیح روایات میں وضاحت ہے کہ حضور ﷺ نے بارہا نماز میں ان سورتوں کی تلاوت فرمائی۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا شمار ان خوش نصیب صحابہ کرام میں ہوتا ہے جنہوں نے سب کچھ چھوڑ کر حبیب خدا ﷺ کی بارگاہ میں حاضری کو ہی اپنا وظیفہ حیات بنا رکھا تھا۔ ان کا شمار اصحاب صفہ میں ہوتا تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ حضور ﷺ پر قرآن حکیم کی کچھ سورتیں نازل ہوں، آپ ان کو ایسی سورتیں بھی قرار دیں جس قسم کی سورتیں پہلے نازل نہیں ہوئیں، آپ صحابہ کرام کو ان سورتوں کے دامن میں چھپی ہوئی ان گنت برکتوں سے بھی آگاہ کریں اور آپ ان سورتوں کو نماز میں تلاوت بھی کریں، اس صورت حال کا تمام صحابہ کرام کو علم ہو اور حضرت عبداللہ ابن مسعود جیسا حاضر باش صحابی ان تمام باتوں سے بے خبر رہے؟

آپ کسی الگ تھلگ مقام پر تو رہتے نہ تھے کہ جو بات تمام صحابہ کرام کے علم میں تھی، آپ اس سے بے خبر رہتے اور نہ یہ ممکن تھا کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ایک موقف اختیار کرتے اور اس موقف میں وہ تنہا ہوتے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین

میں ایک کثیر جماعت حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نسبت تلمذ رکھتی تھی۔ اگر حضرت ابن مسعود نے اس مسئلہ پر جمہور صحابہ کرام سے اختلاف کیا ہوتا تو ان کے تلامذہ کی ایک کثیر جماعت ان کی ہمنوا ہوتی۔

ہم ذیل میں چند احادیث طیبات نقل کرتے ہیں جن کے مطالعہ کے بعد اس بات میں شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ان سورتوں کے قرآن حکیم کا جزو ہونے میں کسی قسم کا شک وشبہ نہ تھا۔

(۱) لَمْ يُتَابِعْ اِبْنَ مَسْعُوْدٍ اَحَدٌ مِّنَ الصَّحَابَةِ وَقَدْ صَحَّ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ قَرَءَ بِهِمَا فِي الصَّلٰوةِ وَاُثْبِتَتَا فِي الْمُصْحَفِ (1)

"صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے کسی نے بھی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی پیروی نہیں کی۔ حضور ﷺ سے صحیح روایت میں ثابت ہے کہ آپ نے نمازوں میں ان سورتوں کی تلاوت کی۔ اور ان کو مصحف مبارک میں درج کیا گیا۔"

(۲) وَاَخْرَجَ اَحْمَدُ وَالْبُخَارِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ الضَّرِيْسِ وَابْنُ الْاَنْبَارِيِّ وَابْنُ حَبَّانَ وَابْنُ مَرْدَوَيْهِ عَنْ زِرِّ بْنِ حُبَيْشٍ قَالَ اَتَيْتُ الْمَدِيْنَةَ فَلَقِيْتُ اُبَيَّ ابْنَ كَعْبٍ فَقُلْتُ يَا اَبَا الْمُنْذِرِ اِنِّيْ رَاَيْتُ ابْنَ مَسْعُوْدٍ لَا يَكْتُبُ الْمُعَوِّذَتَيْنِ فِيْ مُصْحَفِهِ فَقَالَ اَمَا وَالَّذِيْ بَعَثَ مُحَمَّدًا بِالْحَقِّ قَدْ سَاَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْهُمَا وَمَا سَاَلَنِيْ عَنْهُمَا اَحَدٌ مُنْذُ سَاَلْتُهُ غَيْرُكَ قَالَ قِيْلَ لِيْ قُلْ فَقُلْتُ فَقُوْلُوْا فَنَحْنُ نَقُوْلُ كَمَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (2)

"احمد، بخاری، نسائی، ابن الضریس، ابن الانباری، ابن حبان اور ابن مردویہ نے حضرت زر بن حبیش سے روایت کیا ہے وہ فرماتے ہیں:

1۔ محمد بن علی بن محمد الشوکانی "فتح القدیر"، (دارالمعرفہ بیروت۔ س ن)، جلد 5، صفحہ 518

2۔ "الدر المنثور"، جلد 6، صفحہ 416

میں مدینہ طیبہ حاضر ہوا۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملا اور ان سے عرض کیا: اے ابو منذر! میں نے مشاہدہ کیا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ معوذتین کو اپنے مصحف میں درج نہیں کرتے، تو آپ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس نے محمد عربی ﷺ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا، میں نے حضور ﷺ سے ان کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ جب سے میں نے یہ بات حضور ﷺ سے پوچھی ہے، تمہارے بغیر کسی نے مجھ سے اس کے متعلق سوال نہیں کیا۔ حضور ﷺ نے میرے سوال کے جواب میں فرمایا: مجھے بارگاہ خداوندی سے یہ کہنے کا حکم ملا ہے سو میں کہتا ہوں، لہٰذا تم بھی کہو۔ اس لئے ہم بھی وہی کہتے ہیں جو حضور ﷺ نے کہا تھا۔"

اس حدیث پاک میں دو چیزیں قابل توجہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضرت زر بن حبیش، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف معوذتین کو صرف مصحف میں نہ لکھنے کی بات منسوب کر رہے ہیں۔ آپ کی طرف دیگر جو باتیں منسوب ہیں کہ آپ صراحۃً فرماتے تھے کہ یہ قرآن کا حصہ نہیں، غیر قرآن کو قرآن میں خلط ملط نہ کرو اور یہ کہ آپ نماز میں ان کو نہیں پڑھا کرتے تھے، ان تمام باتوں کا اس حدیث پاک میں ذکر نہیں۔ دوسری بات یہ غور طلب ہے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرما رہے ہیں کہ جب سے میں نے یہ مسئلہ حضور ﷺ سے پوچھا ہے، تمہارے بغیر کسی نے مجھ سے اس کے متعلق سوال نہیں کیا۔

یہ چیزیں اس حقیقت کی طرف واضح اشارہ کر رہی ہیں کہ دور صحابہ میں اس قسم کی کسی بات کو شہرت حاصل نہ تھی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ قرآن حکیم کی کچھ سورتوں کے قرآن کا حصہ ہونے یا نہ ہونے کا مسئلہ در پیش ہو اور اس سلسلے میں حضرت ابی بن کعب جیسے فاضل صحابی سے کوئی اس مسئلے کی وضاحت طلب نہ کرے؟

لطف کی بات یہ ہے کہ اس مفہوم کی حدیث خود حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔

(۳) اَخْرَجَ الطَّبْرَانِي عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ عَنْ هَاتَيْنِ السُّوْرَتَيْنِ فَقَالَ قِيْلَ لِيْ فَقُلْتُ

فَقُوْلُوْا كَمَا قُلْتُ (1)

"طبرانی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضور ﷺ سے ان سورتوں کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: مجھے بارگاہ خداوندی سے یہ کہنے کا حکم ملا ہے سو میں کہتا ہوں لہٰذا تم بھی کہو۔"

یہاں حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ خود ان کو سورتوں کا نام دے رہے ہیں اور حضور ﷺ کی زبانی ان کے کلام خداوندی ہونے کی وضاحت بھی کر رہے ہیں۔ اس حقیقت کے بعد اس بات کی گنجائش ہی نہیں رہتی کہ آپ ان سورتوں کے کلام خداوندی ہونے میں کسی قسم کا شبہ تھا یا آپ ان کو قرآن حکیم میں شامل کرنے کی مخالفت کرتے تھے۔

(٤) اَخْرَجَ ابْنُ مَرْدَوَيْهِ عَنْ مُعَاذِ ابْنِ جَبَلٍ قَالَ كُنْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ سَفَرٍ فَصَلَّى الْغَدَاةَ فَقَرَءَ فِيْهَا بِالْمُعَوِّذَتَيْنِ ثُمَّ قَالَ يَا مُعَاذُ هَلْ سَمِعْتَ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ مَاقَرَءَ النَّاسُ بِمِثْلِهِنَّ (2)

"ابن مردویہ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے فرماتے ہیں: میں سفر میں حضور ﷺ کے ہمراہ تھا۔ آپ نے فجر کی نماز ادا فرمائی اور نماز میں آپ نے معوذتین کی تلاوت فرمائی۔ پھر فرمایا: معاذ! کیا تم نے سنا؟ میں نے عرض کی ہاں یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا: لوگوں نے ان کی مثل کوئی چیز نہیں پڑھی۔"

(٥) اَخْرَجَ ابْنُ مَرْدَوَيْهِ عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ اَحَبِّ السُّوَرِ اِلَیَّ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ وَقُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (3)

"ابن مردویہ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی، وہ فرماتی ہیں۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: میرے لئے محبوب ترین سورتیں قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ہیں۔

1۔ "الدر المنثور"، جلد 6، صفحہ 416
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً

(٦) اَخرَجَ الْحَاكِمُ عَنْ عُقْبَةَ ابْنِ عَامِرٍ قَالَ كُنْتُ اَقُوْدُ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاحِلَتَه فِي السَّفَرِ فَقَالَ يَا عُقْبَةُ اَلَا اُعَلِّمُكَ خَيْرَ سُوْرَتَيْنِ قُرِئَتَا قُلْتُ بَلٰى قَالَ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ وَقُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ فَلَمَّا نَزَلَ صَلّٰى بِهِمَا صَلٰوةَ الْغَدَاةِ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كَيْفَ تَرٰى يَا عُقْبَةُ (1)

"حاکم نے حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت کی فرماتے ہیں: ایک سفر میں میں حضور ﷺ کی سواری کی مہار پکڑے جارہا تھا کہ آپ نے فرمایا: عقبہ! کیا میں تمہیں دوایسی سورتیں نہ سکھاؤں جو پڑھی جانے والی تمام سورتوں سے افضل ہیں؟ میں نے عرض کیا: ضرور یا رسول اللہ۔ آپ نے فرمایا: قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ پھر جب آپ اپنی سواری سے اترے تو آپ نے فجر کی نماز پڑھی اور نماز میں یہ دونوں سورتیں تلاوت فرمائیں۔ پھر مجھ سے فرمایا: عقبہ! کیا خیال ہے؟"

ان تمام روایات کا مزاج یہ بتاتا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ان سورتوں کے قرآن حکیم کا حصہ ہونے میں کسی قسم کا اشتباہ نہ تھا۔ وہ ان کو حضور ﷺ کی تعلیم کے مطابق بڑی عظمت والی سورتیں سمجھتے تھے اور انہیں نمازوں میں پڑھا کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے صحابی اگر ان سورتوں کی قرآنیت کا انکار کرتے تو صحابہ کرام میں اس مسئلہ پر مذکورہ یگانگت ممکن ہی نہ تھی۔ اس لئے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف جو باتیں منسوب کی جاتی ہیں انہیں عقلاً تسلیم کرنا بھی مشکل ہے۔

مستشرقین تو عقل کو معیار بنا کر مسلمانوں کے سارے علمی ورثے کا انکار کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ وہ ان روایات کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عمومی مزاج کے معیار پر پرکھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟

1۔"الدرالمنثور"، جلد6، صفحہ 417

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو مختلف قراءت سے قرآن پڑھنے والے صحابی کو چادر سے پکڑ کر بارگاہ نبوت میں پیش کر دیتے تھے اور عرض کرتے تھے: یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! جو کچھ آپ نے مجھے پڑھایا ہے یہ اس سے مختلف پڑھ رہے تھے، جن کے سامنے اگر کوئی ایسی روایت پیش کی جاتی جو آپ نے نہ سنی ہوتی تو آپ گواہ طلب کرتے اور گواہ نہ ہونے کی صورت میں روایت کرنے والے کو سزا دینے کے قائل تھے، ان کی موجودگی میں یہ کیسے ممکن ہے کہ قرآن حکیم کی چند سورتوں کا انکار ہو رہا ہو اور آپ ٹس سے مس نہ ہوں؟

اس تمام بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ ان سورتوں کی قرآنیت کے انکار اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس انکار پر خاموش رہنے کے الزام سے بری ہیں اور جن روایات میں ان نفوس قدسیہ کی طرف یہ باتیں منسوب کی گئی ہیں وہ باطل ہیں۔

خود حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایسی احادیث مروی ہیں جن میں معوذتین کو سورتیں یا آیات کہا گیا ہے۔ اس سلسلے میں طبرانی کی ایک حدیث کا حوالہ پہلے گزر چکا ہے۔ ایک اور حدیث ملاحظہ فرمائیے:

أَخْرَجَ الطَّبْرَانِيُّ فِي الْأَوْسَطِ بِسَنَدٍ حَسَنٍ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَقَدْ أُنْزِلَ عَلَيَّ آيَاتٌ لَمْ يُنْزَلْ عَلَيَّ مِثْلُهُنَّ الْمُعَوَّذَتَيْنِ (1)

"طبرانی نے اوسط میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے سند حسن کے ساتھ روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: مجھ پر ایسی آیات نازل ہوئی ہیں جن کی مثل آیات مجھ پر (پہلے) نازل نہیں ہوئیں۔ اور وہ آیات معوذتین ہیں۔"

جب حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ خود حضور ﷺ سے ایسی احادیث روایت کر رہے ہیں تو پھر اس شبہ کی گنجائش کیا ہے کہ وہ ان سورتوں کو قرآن کا حصہ نہیں سمجھتے تھے۔

اگر اصول درایت سے قطع نظر صرف اس بنا پر ان روایات کو تسلیم کر لیا جائے کہ کچھ

1۔ "الدر المنثور"، جلد 6، صفحہ 416

علماء نے ان کی سند کو صحیح قرار دیا ہے تو بھی زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے ابتداء میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان سورتوں کو سمجھا ہو لیکن اس کے وحی متلو یا وحی غیر متلو ہونے میں انہیں اشتباہ ہوا ہو کیونکہ یہ بات قطعاً ناممکن ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ جیسا اسالیب کلام کا ماہر کلام الٰہی اور انسانی کلام میں تمیز نہ کر سکا ہو۔

لبید بن ربیعہ، ولید بن مغیرہ اور عتبہ بن ربیعہ جیسے لوگ تو حالت کفر میں بھی کلام خداوندی کو انسانی کلام سے ممتاز کر سکتے ہوں اور تربیت گاہ مصطفوی کا یہ ہونہار سپوت اس اہلیت سے عاری ہو۔ "ایں خیال است و محال است و جنوں۔"

لیکن یہ اشتباہ بھی مستقل نہ تھا بلکہ جب آپ کو اس سلسلے میں حضور ﷺ کی وضاحتوں کا علم ہوا اور آپ کو پتہ چلا کہ صحابہ کرام ان سورتوں کے کلام خداوندی ہونے پر متفق ہیں تو آپ کا اشتباہ ختم ہو گیا اور آپ نے ان سورتوں کو اپنے مصحف میں درج بھی کیا اور ان کو وہی حیثیت دی جو قرآن حکیم کی باقی سورتوں کو دیتے تھے۔ کئی اسلاف امت کی آراء اس موقف کی تائید کرتی ہیں۔

علامہ عبدالحق حقانی فرماتے ہیں:

"عبداللہ ابن مسعود کا ایک اختلاف مشہور ہے۔ وہ یہ کہ ان کے نزدیک یہ دونوں اخیر کی سورتیں کلام الٰہی اور حضور ﷺ پر منزل تو ہیں مگر قرآن مجید کا جزو نہیں بلکہ قرآن مجید "قل ھو اللہ" پر تمام ہو گیا اور یہ دونوں سورتیں بطور تعویذ و حفاظت کے نازل ہوئیں۔ اور اسی لئے وہ ان کو اپنے قرآن میں نہیں لکھتے تھے۔ یہ نہیں کہ وہ ان کو منزل من اللہ اور کلام الٰہی نہیں جانتے تھے۔ اور جس نے ان کی نسبت یہ خیال کیا ہے یہ اس کی سخت غلط فہمی ہے۔ مگر جمہور صحابہ ان کے مخالف ہیں۔ سب نے عبداللہ بن مسعود کے قول کو غلط ٹھہرا دیا تھا۔"(1)

علامہ خازن اپنی "تفسیر خازن" میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث نقل کرتے ہیں:

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلَمْ تَرَ اٰیَاتٍ اُنْزِلَتْ

1۔ علامہ ابو محمد عبدالحق حقانی، "تفسیر فتح المنان المشہور بہ تفسیر حقانی"، (دہلی برقی پریس دہلی۔ س ن) جلد 6، صفحہ 287

هٰذِهِ اللَّيْلَةَ لَمْ يُرَ مِثْلُهُنَّ قَطُّ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ وَقُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ

"حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا تم نے ان آیات کو نہیں دیکھا جو آج رات نازل ہوئی ہیں۔ ان جیسی آیات کبھی مشاہدے میں نہیں آئیں۔ اور وہ آیات قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ہیں۔ یہ حدیث نقل کرنے کے بعد علامہ خازن لکھتے ہیں:

فِيْهِ بَيَانُ فَضْلِ هَاتَيْنِ السُّوْرَتَيْنِ وَفِيْهِ دَلِيْلٌ وَاضِحٌ عَلٰى كَوْنِهِمَا مِنَ الْقُرْاٰنِ وَفِيْهِ رَدٌّ عَلٰى مَنْ نَسَبَ اِلَى ابْنِ مَسْعُوْدٍ خِلَافَ هٰذَا وَفِيْهِ بَيَانُ اَنَّ لَفْظَةَ قُلْ مِنَ الْقُرْاٰنِ اَيْضًا وَاَنَّهُ مِنْ اَوَّلِ السُّوْرَتَيْنِ بَعْدَ الْبَسْمَلَةِ وَقَدِ اجْتَمَعَتِ الْاُمَّةُ عَلٰى هٰذَا كُلِّهِ بَعْدَ خِلَافٍ ذُكِرَ فِيْهِ (1)

"اس حدیث میں ان دونوں سورتوں کی عظیم فضیلت کا بیان ہے اور اس میں اس بات کی واضح دلیل بھی موجود ہے کہ یہ دونوں سورتیں قرآن کا حصہ ہیں۔ اس میں ان لوگوں کا رد بھی ہے جو ابن مسعود کی طرف اس کے خلاف موقف منسوب کرتے ہیں۔ اس میں یہ بیان بھی ہے کہ "قل" کا لفظ بھی قرآن کا حصہ ہے اور یہ کہ دونوں سورتوں میں "قل" کا لفظ "بسم اللہ" کے بعد سب سے پہلے ہے۔ جس اختلاف کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کے بعد تمام امت کا مذکورہ بالا تمام باتوں پر اجماع ہو گیا۔"

علامہ سید قطب اپنی تفسیر "فی ظلال القرآن" میں رقمطراز ہیں:

وَكَانَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ لَا يُثْبِتُهُمَا فِيْ مُصْحَفِهٖ ثُمَّ ثَابَ اِلٰى رَأْيِ الْجَمَاعَةِ وَقَدْ اَثْبَتَهُمَا فِي الْمُصْحَفِ (2)

"حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ ابتدا میں معوذتین کو اپنے مصحف میں نہیں لکھتے تھے۔ لیکن بعد میں آپ نے امت کی اجتماعی

1۔ علاؤ الدین علی بن محمد بن ابراہیم البغدادی المشہور بالخازن "تفسیر الخازن"، (المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ بمصر۔ س ن)، جلد 7، صفحہ 67-266
2۔ سید قطب، "فی ظلال القرآن"، (دار احیاء التراث العربی بیروت۔ 1971، طبع ہفتم)، جلد 8، صفحہ 708

رائے کی طرف رجوع کیا اور ان دونوں سورتوں کو اپنے مصحف میں بھی درج فرمایا۔"

ان حقائق کے بعد مستشرقین کے اس وسوسے میں کوئی جان باقی نہیں رہتی کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کا معوذتین کی قرآنیت کا انکار اس بات کی دلیل ہے کہ صحابہ کرام قرآن حکیم کے اسلوب کو عام عربی اسلوب سے ممتاز نہیں سمجھتے تھے۔

قرآن حکیم کی پیشین گوئیاں

مستقبل میں کس قسم کے حالات پیش آئیں گے اور آنے والا کل کیسا ہوگا؟ یہ اس قسم کے سوالات ہیں جن کا صحیح جواب انسانی عقل کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ ہر زمانے میں ایسے لوگ موجود رہے ہیں جو یہ دعویٰ کرتے رہے ہیں کہ وہ مستقبل کے متعلق بتا سکتے ہیں۔ نزول قرآن کے زمانے میں کاہنوں کو بھی اسی بنا پر بڑی شہرت حاصل تھی اور وہ معاشرے میں اپنی مستقبل بینی کی وجہ سے اعلیٰ مقام پر فائز تھے لیکن ان کی پیشین گوئیاں چند انکل پچوؤں کے سوا کچھ نہ تھیں۔ آج بھی کبھی کبھی اخبارات میں ماضی کے کچھ لوگوں کی کچھ پیشین گوئیاں چھپتی رہتی ہیں جن کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے کہ جس آدمی نے یہ پیشین گوئیاں کی ہیں اس کی کئی پیشین گوئیاں پہلے پوری ہو چکی ہیں اور آئندہ بھی اس کی کئی پیشین گوئیوں کے پورا ہونے کا یقین ہے۔ لیکن اس قسم کے دعوے اکثر اس وقت کئے جاتے ہیں جب (بقول ان کے) پیشین گوئی پوری ہوتی ہے۔ اس سے پہلے کسی کو نہ اس پیشین گوئی کا علم ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے پورا ہونے کے متعلق کوئی انتظار۔

تاریخ عالم شاہد ہے کہ مستقبل کے متعلق صرف ان لوگوں کی پیشین گوئیاں حرف بحرف پوری ہوئی ہیں، جن کے علوم کسبی نہیں بلکہ وھبی تھے۔ وہ اپنی عقل کے زور سر پر مستقبل کو نہیں دیکھتے تھے بلکہ وحی والہام کے ذریعہ وہ ہستی انہیں مستقبل کے حقائق سے آگاہ فرماتی تھی جس کے علوم زمان ومکان کی قید سے ماوراء ہیں۔ انبیائے کرام نے ہر زمانے میں پیشین گوئیاں کی ہیں اور ان کی پیشین گوئیاں حرف بحرف پوری ہوئی ہیں۔ آج بھی عہد نامہ قدیم وعہد نامہ جدید میں کئی پیشین گوئیاں موجود ہیں جو حضور ﷺ کے متعلق ہیں۔ وہ حرف بحرف پوری ہو چکی ہیں لیکن تعصب اور حسد کی وجہ سے یہود ونصاریٰ نے حق کے روز روشن کی طرح واضح ہونے کے باوجود اسے قبول نہیں کیا۔

تورات وانجیل میں حضور ﷺ کے متعلق جو پیشین گوئیاں تھیں، وہ کتنی واضح تھیں؟ اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ بحیرئی راہب نے حضور ﷺ کو درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے دیکھا تو فوراً پہچان لیا۔ ورقہ بن نوفل حضور ﷺ سے مختصر سی گفتگو کے بعد اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ یہ گلشن اسماعیل کا وہی گل سرسبد ہے جس کی خاطر محفل کائنات سجی ہے۔ طائف کے باغ میں زخموں سے چور خدا کا حبیب جب چند لمحے ستانے کے لئے بیٹھا تو عیسائی غلام عداس فوراً پہچان گیا کہ یہ کوئی معمولی ہستی نہیں بلکہ کائنات کا سردار ہے۔

کتب سماوی کی پیشین گوئیوں نے اہل کتاب کو حضور ﷺ کے متعلق جو علم یقین عطا فرمایا تھا، اس کی تصویر کشی قرآن حکیم نے ان الفاظ میں کی ہے:

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَ اِنَّ فَرِیْقًا مِّنْهُمْ لَیَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ (1)

"جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ پہچانتے ہیں انہیں جیسے وہ پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو۔ اور بے شک ایک گروہ ان میں سے چھپاتا ہے حق کو جان بوجھ کر۔"

مستقبل کے متعلق خبر دینا چونکہ انسانی عقل کے دائرے سے باہر ہے، اس لئے اگر کوئی کتاب مستقبل کے متعلق بے شمار پیشین گوئیاں کرے اور ان میں سے اکثر پیشین گوئیاں انہی لوگوں کے سامنے پوری ہو جائیں جن کے سامنے وہ پیشین گوئیاں کی گئی تھیں، تو اس سے اس نتیجے پر پہنچنا مشکل نہیں کہ وہ کتاب کسی انسانی ذہن کی اختراع نہیں ہو سکتی۔

قرآن حکیم نے بھی مستقبل کے متعلق لاتعداد پیشین گوئیاں کیں اور ان میں سے اکثر انہی لوگوں کے سامنے پوری بھی ہوئیں جن کے سامنے یہ پیشین گوئیاں کی گئی تھیں۔ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ کئی پیشین گوئیاں پوری ہو رہی ہیں اور جوں جوں انسانی ذہن ارتقاء کی نئی منزلیں طے کرتا جائے گا، اسے پتہ چلتا جائے گا کہ وہ آج جو کچھ دیکھ رہا ہے قرآن حکیم نے صدیوں پہلے اس کا پتہ دے دیا تھا۔ لیکن قرآن حکیم نے جب اس حقیقت سے پردہ اٹھایا تھا اس وقت کا انسان اس حقیقت پر ایمان تو لا سکتا تھا لیکن اس کی کنہ تک پہنچنے کے قابل نہ تھا۔ ہم ذیل میں قرآن حکیم کی صرف چند ایسی پیشین گوئیاں بیان کرتے ہیں

1۔ سورۃ البقرہ: 146

جن کو حرف بحرف پورا ہوتے ہوئے ایک زمانہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہے۔

قرآن حکیم کی نظیر کوئی نہیں بنا سکے گا

قرآن حکیم نے کافروں سے کہا کہ اگر تمہیں قرآن حکیم کے کلام الٰہی ہونے میں شک ہے تو اس کی مثل ایک سورۃ بنا کر دکھاؤ اور اس کام کے لئے اللہ تعالیٰ کے سوا اگر تمہارا کوئی حمایتی ہے تو اس کو بھی بلالو۔ اس کے بعد قرآن حکیم اعلانیہ یہ پیشین گوئی کرتا ہے:

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝(1)

"پھر اگر ایسا نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں، جو تیار کی گئی ہے کافروں کے لئے۔"

اس آیۂ کریمہ میں وَلَنْ تَفْعَلُوْا کے الفاظ غور طلب ہیں۔ تاکید کے ساتھ اعلان کیا جا رہا ہے کہ قرآن حکیم کی مثل ایک سورۃ لانے کا چیلنج کوئی بھی قبول نہیں کر سکے گا۔ یہ قرآن قیامت تک ساری نسل انسانی کے لئے پیغام ہدایت ہے۔ اسی طرح جو بھی اس کا منکر ہے اس کے لئے یہ چیلنج موجود ہے۔ یہ چیلنج جس طرح امراء القیس، ولید بن مغیرہ اور عتبہ بن ربیعہ کے لئے تھا، اسی طرح یہ چیلنج شیکسپیئر، ہومر، نطشے اور گوئٹے کے لئے بھی ہے اور اس چیلنج کے ساتھ ساتھ یہ واضح اعلان بھی موجود ہے کہ خواہ کوئی بھی ہو وہ کبھی یہ کام نہیں کر سکے گا۔

ایک اور مقام پر قرآن حکیم نے اس پیشین گوئی کی مزید وضاحت فرما دی اور اعلان کر دیا:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (2)

"(بطور چیلنج) کہہ دو کہ اگر اکٹھے ہو جائیں سارے انسان اور سارے جن اس بات پر کہ لے آئیں اس قرآن کی مثل تو ہرگز نہیں لا سکیں گے اس کی مثل اگرچہ وہ ہو جائیں ایک دوسرے کے مددگار۔"

یہ چیلنج چودہ سو سال سے اسی طرح موجود ہے۔ عرب کے وہ فصحاء جن کے قصائد کو

1۔ سورۃ البقرۃ 24

2۔ سورۃ بنی اسرائیل: 88

ہرن کی جھلیوں پر آب زر سے لکھوا کر خانہ کعبہ کی دیوار پر آویزاں کیا جاتا تھا اور ان کے بارے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ ان کا ہم پلہ کوئی شاعر یا ادیب موجود نہیں، انہوں نے اس چیلنج کے جواب میں چپ کیوں سادھ لی؟ مدینہ کے یہودی جن کو اپنے علم پر ناز تھا، وہ اس چیلنج کا جواب دینے کے لئے میدان میں کیوں نہ اترے؟

چودہ سو سال میں دنیائے عرب میں بڑے بڑے صاحب طرز ادیب گزرے ہیں، جن کی ادبی تخلیقات کا شہرہ عرب کی سرحدیں عبور کر کے یورپ اور امریکہ تک جا پہنچا ہے، انہوں نے ساتویں صدی عیسوی کے ایک امی عرب کی زبان سے نکلی ہوئی اس کتاب کے مقابلے میں کوئی کتاب پیش کرنے کی کوشش کیوں نہ کی؟

مستشرقین ایک ہزار سال سے اسلام کے خلاف اپنی ساری صلاحیتیں استعمال کر رہے ہیں۔ ان میں کئی ایسے بھی ہیں جو عربی ادب میں عربوں کے بھی استاد ہیں۔ انہیں یہ جرأت کیوں نہ ہوئی کہ وہ قرآن حکیم کے اس چیلنج کو قبول کرنے کے لئے میدان میں اتریں؟

ان لوگوں نے اسلام دشمنی کو جس طرح اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے، اس کے پیش نظر یہ بات تو ممکن نہیں کہ انہوں نے کبھی اس چیلنج کا جواب دینے کے متعلق سوچا ہی نہ ہو۔ انہوں نے ضرور اس چیلنج کے متعلق سوچا ہوگا لیکن وہ قرآن حکیم کی ادبی رفعتوں کے سامنے بے بس ہو گئے ہوں گے اور انہوں نے اس معاملہ میں خاموشی کو ہی غنیمت سمجھا ہو گا۔ صاحب روح المعانی نے ایسے چند واقعات لکھے ہیں جب کچھ مدعیان فصاحت و بلاغت نے قرآن حکیم کی مثل کتاب لکھنے کا ارادہ کیا لیکن پھر قرآن حکیم کی کسی ایک ہی آیت نے ان کی فصاحت و بلاغت کے غبارے سے ہوا نکال دی اور انہوں نے اعلان کیا کہ یہ مخلوق کا کلام نہیں ہے۔ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں:

ایک دفعہ عرب کے فصحاء و بلغاء نے قرآن کی مثل پیش کرنے کا عزم کر لیا۔ چالیس روز تک کباب و شراب سے اپنی فصاحت و بلاغت کی قوتوں کو تیز بلکہ برافروختہ کرتے رہے۔ اچانک ان کے کان میں یہ آیت پڑی:

وَقِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (1)

1۔ سورۃ ہود: 44

"اور حکم دیا گیا اے زمین! نگل لے اپنے پانی کو، اور اے آسمان! تھم جا اور اتر گیا پانی اور حکم الٰہی نافذ ہو گیا اور ٹھہر گئی کشتی جودی پہاڑ پر اور کہا گیا ہلاکت و بربادی ہو ظالم قوم کے لئے۔"

اس آیت کو سنتے ہی انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور کہنے لگے۔

هٰذَا الْكَلَامَ لَا يُشْبِهُ كَلَامَ الْمَخْلُوقِيْنَ

"کہ مخلوق کا کلام ایسا نہیں ہوا کرتا۔"

ابن مقفع کا نام دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اس نے بڑی دماغ سوزی، دیدہ ریزی اور جگر کاوی سے ایک سورۃ بنائی تاکہ اسے قرآن کے مقابلے میں پیش کرے۔ ایک روز اس کا گزر ایک مکتب کے پاس سے ہوا جہاں بچے قرآن حفظ کر رہے تھے۔ کوئی بچہ سورۃ ھود کی مذکورہ بالا آیت پڑھ رہا تھا۔ ابن مقفع اسے سن کر دم بخود ہو گیا۔ الٹے پاؤں واپس گھر پہنچا، اپنی تحریر کو دھو ڈالا اور کہا کہ اس کلام کا مقابلہ ممکن نہیں۔ (1)

قرآن حکیم کی حفاظت کی پیشین گوئی

قرآن حکیم نے اپنی حفاظت کے سلسلے میں دو پیشین گوئیاں کی ہیں۔ ایک تو یہ کہ جس طرح قرآن حکیم نازل ہوا ہے یہ اسی طرح محفوظ رہے گا اس میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ ہو گی۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (2)

"بے شک ہم ہی نے اتارا ہے اس ذکر (قرآن مجید) کو اور یقیناً ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔"

دوسری یہ کہ ہدایت و معرفت کے اس گنج گرانمایہ پر باطل کسی انداز میں بھی اثر انداز نہیں ہو سکے گا۔

لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ (3)

"اس کے نزدیک نہیں آ سکتا باطل نہ اس کے سامنے سے اور نہ پیچھے

1۔ "ضیاء القرآن"، جلد 2، صفحہ 364، بحوالہ روح المعانی
2۔ سورۃ الحجر: 9
3۔ سورۃ حم السجدہ: 42

سے۔ یہ اتری ہوئی ہے بڑی حکمت والے، سب خوبیاں سراہے کی طرف سے۔"

آپ ذرا غور فرمائیں کہ یہ دونوں پیشین گوئیاں کس طرح پوری ہوئیں۔ آپ دنیا کے تمام مذہبی صحیفوں کا جائزہ لیں، ان میں کوئی بھی ایسا نہیں ملے گا جس کے متعلق خود اس کے ماننے والے بالاتفاق یہ ایمان رکھتے ہوں کہ ان کی کتاب اپنی اصلی حالت میں ہے۔ تورات و انجیل منزل من اللہ کتابیں تھیں لیکن وہ انسانی کارروائیوں کی وجہ سے بارہا ایسے حالات سے گزریں کہ ان کا اصلیت پر قائم رہنا ممکن ہی نہ رہا۔ یہودی قوم پر، ان کے کرتوتوں کی وجہ سے، ان کے دشمن بارہا بجلی بن کر ٹوٹے اور ان کے شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ یہودیوں کے دشمنوں نے مذہبی کتابوں کو بھی نہیں چھوڑا اور ان کا نشان بھی صفحہ ہستی سے مٹانے کی کوشش کی لیکن قوم بنی اسرائیل کسی نہ کسی وسیلے سے پھر تورات کے نسخے تیار کرتی رہی۔ جو کتاب بار ہا ایسے مراحل سے گزری ہو، اس کا اپنی اصلی حالت پر قائم رہنا کیسے ممکن ہے؟ یہی وجہ ہے کہ آج عہد نامہ قدیم میں بے شمار ایسی باتیں ہیں جن کا بارگاہ الوہیت کی طرف انتساب قطعاً ممکن نہیں۔ حد یہ ہے کہ عہد نامہ قدیم کے پیروکار اس کی کتابوں کی تعداد پر بھی متفق نہیں۔

انجیل اللہ تعالیٰ کا کلام تھا اور وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی لیکن آج عیسائیوں کے ہاتھوں میں جو "Gospels" ہیں، ان کے بارے میں ساری دنیائے عیسائیت اس بات پر متفق ہے کہ ان کتابوں کو انہی لوگوں نے تحریر کیا ہے جن کے ناموں سے یہ منسوب ہیں۔ عیسائیوں کا کسی کتاب کے بارے میں یہ دعویٰ ہی نہیں کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اتری تھی۔

اس لئے وہ کتاب جو منزل من اللہ تھی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اتری تھی اس کا کوئی پتہ نہیں۔ عیسائیوں کے ہاتھوں میں جو کتابیں ہیں یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع آسمانی سے طویل عرصہ بعد لکھی گئیں۔ بے شمار لوگوں نے انجیلیں لکھیں۔ کلیسا کا دعویٰ ہے کہ انجیلیں لکھنے والے الہام (Inspiration) کی مدد سے کتابیں لکھتے تھے۔ سینٹ پال کے ہم خیال عیسائیوں نے جن انجیلوں کو اپنی مرضی کے خلاف سمجھا ان کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ بے شمار انجیلیں تلف کرائی گئیں۔ جو انجیلیں آج عیسائیوں کے پاس ہیں ان کے متعلق بھی

عیسائیوں کی اکثریت کا خیال ہے کہ وہ غلطیوں سے پر ہیں۔ (Jehovah's Witnesses) کے ایک رسالے پر بھی نظر پڑی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ بائبل میں پچاس ہزار غلطیاں ہیں۔ بائبل کی اسی کیفیت کی وجہ سے آج عیسائیوں کی اکثریت مذہب سے بیزار ہے اور گرجے فروخت کر کے لادینیت کی دلدل میں پھنستی جارہی ہے۔

اس کے برعکس قرآن حکیم کی شان یہ ہے کہ دشمن بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ اس کا ایک ایک لفظ حضرت محمد ﷺ سے تواتر کے ساتھ منقول ہے۔ مشہور مستشرق روڈی پیرٹ (Rudi Paret) ان لوگوں کی تردید میں کہتا ہے جو قرآن حکیم کی صحت کے متعلق شکوک پیدا کرنے کے لئے اپنی زندگیاں وقف کئے ہوئے ہیں:

"ہمارے پاس کوئی ایسا سبب نہیں جو ہمیں یہ اعتقاد رکھنے پر مجبور کرے کہ قرآن حکیم میں کوئی آیت ایسی بھی ہے جو محمد (ﷺ) سے مروی نہیں۔" (1)

اللہ تعالیٰ نے اس کتاب حکیم کی حفاظت کے لئے ایسے انتظامات فرمائے کہ اس میں تحریف کا شائبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ کتاب تورات کی طرح لکھی لکھائی حضور ﷺ کو عطا نہیں ہوئی بلکہ اس کے نزول کا طریقہ یہ تھا کہ حضرت جبریل امین نے حضور ﷺ کو کوئی آیت پڑھ کر سنائی اور آپ کو وہ آیت یاد ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم یاد کرنے کو حضور ﷺ کے حافظے پر نہیں چھوڑا بلکہ فرمایا:

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ (2)

"ہمارے ذمہ ہے اس کو (سینہ مبارک میں) جمع کرنا اور اس کو پڑھانا۔"

اللہ تعالیٰ نے بیان قرآن کو بھی اپنے ذمہ قدرت پر لے لیا اور فرمایا:

ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (3)

"پھر ہمارے ذمہ ہے اس کو کھول کر بیان کر دینا۔"

قرآن حکیم تیئیس سال کے عرصہ میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا تھا۔ آیات و سور کی ترتیب کا مسئلہ بھی پروردگار عالم نے اپنے ذمہ قدرت پر لے لیا تاکہ اس الہامی صحیفے کی ترتیب بھی انسانی دخل سے محفوظ رہے۔

1۔ "الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری"، صفحہ 112

2۔ سورۃ القیامۃ: 17

3۔ سورۃ القیامۃ: 19

اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو یہ معجزانہ شان عطا فرمائی کہ اس کا یاد کرنا آسان ہے۔ ہر زمانے میں لاکھوں کی تعداد میں ایسے خوش نصیب رہے ہیں جن کے سینوں میں قرآن حکیم کا ایک ایک لفظ محفوظ تھا۔

اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا دوسرا بندوبست یہ فرمایا کہ اپنے حبیب اور اس کی امت کو اس کی کتابت کی طرف مائل کر دیا۔ حضور ﷺ نے کاتبین وحی کی ایک جماعت تیار کر رکھی تھی۔ جب کوئی آیت نازل ہوتی تو اسے فوراً سپرد قلم کر دیا جاتا۔ کئی صحابہ نے اپنے اپنے صحائف تیار کئے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں قرآن حکیم کو ایک مصحف میں جمع کرنے کا اہتمام فرمایا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے لغت قریش کے مطابق قرآن حکیم کی نقول تیار کروا کے اپنی قلمرو کے مختلف حصوں میں ارسال فرمائیں۔ اور آج دنیا کا کوئی کونا ایسا نہیں جہاں قرآن حکیم کے نسخے موجود نہ ہوں۔

قرآن حکیم اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔ وہ جس زبان میں نازل ہوا، وہ دنیا کے کثیر ممالک میں ایک زندہ زبان کے طور پر مروج ہے۔ نہ اس میں لفظی تحریف ممکن ہے اور نہ اس میں معنوی تحریف کی گنجائش ہے۔ کوئی شخص قرآن حکیم کی لفظی تحریف کی کوشش کرتا ہے تو اس کی شرارت کو پکڑنے کے لئے کسی مفتی اعظم کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ دس سال کا ایک بچہ، جس کا سینہ قرآن حکیم کی تجلیات سے جگمگا رہا ہوتا ہے، وہ قرآن حکیم میں تحریف کی نشاندہی کر دیتا ہے۔

انڈونیشیا میں دشمنان اسلام نے محرف قرآن شائع کرنے کی کوشش کی لیکن مسلمانوں نے ان کی اس سازش کو فوراً بے نقاب کر دیا۔ کچھ ممالک سے قرآن حکیم میں ترمیم کرنے کا شوشہ اٹھ رہا ہے لیکن انشاء اللہ العزیز ایسی کوششیں بھی اپنی موت آپ مر جائیں گی۔

قرآن حکیم میں معنوی تحریف کرنے والوں نے بھی ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے۔ خصوصاً مستشرقین نے قرآن حکیم کے سینکڑوں تراجم کئے ہیں اور ان میں قرآن حکیم کی معنوی تحریف کی ہر ممکن کوشش کی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت قرآن کا نرالا انداز دیکھئے کہ خود متاخر مستشرقین اپنے پیشروؤں کی غلطیوں اور علمی خیانتوں کا پردہ چاک کر رہے ہیں۔ جو مستشرق بعد میں قرآن حکیم کا ترجمہ کرتا ہے وہ پہلے مستشرقین کے تراجم قرآن کے متعلق یہ تاثر دیتا ہے کہ وہ ترجمے غلط ہیں بلکہ ان میں سے بعض کو قرآن حکیم کا

ترجمہ قرار دینا ہی صحیح نہیں۔

قرآن حکیم میں معنوی تحریف ممکن ہی نہیں ہے۔ اس کتاب مبین کے اصل الفاظ محفوظ ہیں۔ جس زبان میں یہ کتاب نازل ہوئی وہ زبان بھی زندہ ہے۔ اس کتاب کا خدائی بیان حضور ﷺ کی احادیث طیبہ کی شکل میں موجود ہے۔ مدنی تاجدار ﷺ کے غلاموں نے آپ کی احادیث طیبہ کی حفاظت کے لئے وہ عرق ریزی کی ہے جس کی مثال تلاش کرنے کی کوشش کرنا فضول ہے۔

ذرا غور فرمائیے! قرآن حکیم ایک امی عرب ﷺ پر نازل ہوا۔ عرب بھی اس کے دامن سے وابستہ ہوئے اور عجمیوں نے بھی اس کے سائے میں پناہ لی۔ فلسفیوں نے بھی اس کے بحر معانی میں غوطہ زنی کی اور ایک ان پڑھ عجمی نے بھی اس کی تلاوت سے اپنے قلب و روح کو معطر کیا۔ وہ قومیں جن کی زبانیں عربی الفاظ کو ادا کرنے میں ثقل محسوس کرتی تھیں، انہوں نے بھی اس کی تلاوت کو اپنا وظیفہ حیات بنایا۔ اپنوں نے بھی اسے پڑھا اور دشمنوں نے بھی اس کا مطالعہ کیا۔ شاید دنیا میں کوئی دوسری کتاب ایسی نہیں ہے جس کے مخالفین اسے اس کثرت سے پڑھتے ہوں جتنا قرآن پڑھا جاتا ہے۔ لیکن ان مختلف عناصر کی صدیوں کی تلاوت قرآن حکیم کے باوجود اس کے کسی لفظ تو کیا کسی زیر یا زبر کی تبدیلی کی بھی نشاندہی نہیں کی جا سکتی۔ کیا حفاظت قرآن کی خدائی پیشین گوئی کی صداقت کا اس سے بڑا ثبوت ممکن ہے؟

تمام ادیان پر اسلام کے غلبے کی پیشین گوئی

جب قرآن حکیم نازل ہو رہا تھا، اس وقت دنیا پر دو مذاہب کے پیروکاروں کا تسلط تھا۔ ایران اور روم کو اپنے زمانے کی دو "سپر پاورز" کی حیثیت حاصل تھی۔ رومی مذہب عیسوی کے پیروکار تھے اور ایرانی مجوسیت کے۔ جزیرہ عرب پر ان گنت بتوں کی خدائی کے پھریرے لہرا رہے تھے۔ یثرب اور خیبر وغیرہ میں یہودیوں کا شہرہ تھا۔ مسلمانوں کو کفار مکہ نے اپنے گھروں اور اپنے وطن سے بے دخل کر دیا تھا اور انہوں نے سب کچھ چھوڑ کر اور اپنے دین کو بچا کر پہلے حبشہ کی طرف اور پھر مدینہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ خدا کے وہ بندے جو صرف دین کی دولت اپنے سینوں میں چھپائے دنیا کی ہر چیز کو ٹھکرا رہے تھے، ان کو ان کے رب نے یہ مژدہ جانفزا سنایا کہ تم جس دولت کو لئے پھر رہے ہو اسے معمولی مت

سمجھو۔ یہ نہ سمجھو کہ اپنی طاقت پر اترانے والے اس شمع کو گل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جس نے تمہاری زندگیوں کو تنویرات سے بھر دیا ہے کیونکہ اس کی حفاظت وہ کر رہا ہے جو سب سے زیادہ طاقت ور ہے۔ ارشاد خداوندی ہوا:

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (1)

"یہ لوگ چاہتے ہیں کہ بجھادیں اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے اور انکار فرماتا ہے اللہ مگر یہ کہ کمال تک پہنچا دے اپنے نور کو اگرچہ ناپسند کریں اس کو کافر۔"

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کے غلاموں کو خوش خبری دے رہا ہے کہ تم نے جس دولت کے لئے دنیا کی ہر نعمت کو ٹھکرا دیا ہے اور اس کی حفاظت کے لئے وطن سے بے وطن ہوئے ہو، یاد رکھو یہ ایک آفتاب ہے جس کی کرنیں پورے جہان کو بقعہ نور بنائیں گی اور جو لوگ اس شمع ہدایت کو پھونکوں سے بجھانا چاہتے ہیں وہ اپنی حسرت کی آگ میں جل کر بھسم ہو جائیں گے اور ان کی ہزار مخالفت کے باوجود یہ ہلال عید بدر کامل بن کر رہے گا۔ ساتھ ہی زبان قدرت نے یہ اعلان فرمادیا:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (2)

"وہی (قادر مطلق) ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو (کتاب) ہدایت اور دین حق دے کر تا کہ غالب کر دے اسے تمام دینوں پر اگرچہ ناگوار گزرے (یہ غلبہ) مشرکوں کو۔"

یہ آیت قرآن حکیم کی تین سورتوں میں موجود ہے۔ سورۃ توبہ، سورۃ فتح اور سورۃ الصف۔ یہ تینوں سورتیں مدنی ہیں۔ حضور ﷺ کی حیات طیبہ کا مدنی دور ہی وہ زمانہ ہے جب تمام ادیان کے پیروکار اسلام کو مغلوب کرنے کیلئے میدان میں آچکے تھے۔ مکہ مکرمہ میں تو آپ کے مدمقابل صرف بت پرست تھے۔ مدینہ طیبہ کے زمانہ میں اسلام کی ٹکر یہودیت سے بھی تھی، نجران کے عیسائیوں نے بھی مناظرے اور مجادلے کے ذریعے

1۔ سورۃ توبہ: 32

2۔ سورۃ توبہ: 33

اسلام پر عیسائیت کے غلبے کی ناکام کوششیں کی تھیں اور شام کی سرحدوں پر روم کے عیسائی بھی اسلام کو مٹانے کے منصوبے بنانے لگے تھے۔ جن لوگوں نے جزیرہ عرب کو عیسائیت کے رنگ میں رنگنے کے لئے کئی صدیاں زبردست جدوجہد کی تھی، اسلام ان کو ایک خطرہ دکھائی دیتا تھا، اس لئے وہ بھی اسلام کے خلاف کمر بستہ ہو رہے تھے۔

مذکورہ بالا حالات میں پروردگار عالم نے ایک ایسی پیشین گوئی فرمائی جس کے پورا ہونے کے بظاہر کوئی آثار اور امکانات نظر نہ آتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: یہ دین اپنے کمال کو بھی پہنچے گا اور کفار و مشرکین کی ناپسندیدگی کے باوجود تمام ادیان پر غالب بھی آئے گا۔

تاریخ سے پوچھ لیجئے کہ قرآن حکیم کی یہ پیشین گوئی کس شان سے پوری ہوئی۔ ابوسفیان جو جنگ احد میں 'اُعْلُ ھُبَلُ' کا نعرہ بلند کر رہا تھا، وہ جزیرہ عرب کے طول و عرض میں نعرہ توحید کی صدائیں لگاتا نظر آتا ہے۔ خالد بن ولید، جس کی جنگی مہارت اور شجاعت نے جنگ احد میں مسلمانوں کی فتح کو شکست میں بدل دیا تھا، وہ رومی اور ایرانی لشکروں کے مقابلے میں اسلامی فتح کے پھریرے لہراتے نظر آتا ہے۔ ابوجہل، جس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ شمع حق کو بجھانے کی کوششوں میں گزرا تھا، اس کا لخت جگر لشکر اسلام کا سپاہی بن کر باطل کی صفوں کو توڑتا نظر آتا ہے۔ عرب کی سرزمین جو ایک بت کدے کی شکل اختیار کر چکی تھی اس سے بتوں کا صفایا ہو جاتا ہے۔

یہودیت کو دیکھئے۔ اس کے پیروکار اپنے آپ کو حزب مختار سمجھتے ہیں۔ انہیں اپنی علمیت پر ناز ہے۔ وہ اپنے دین کے مقابلے میں کسی دین کو کوئی اہمیت نہیں دیتے لیکن ان کا ایک بہت بڑا عالم، عبد اللہ بن سلام، اسلام کی ایک جھلک دیکھ کر یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ یہودیت اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور پھر پورے اطمینان قلب کیساتھ یہودیت کا پٹہ اپنے گلے سے اتار کر اسلام قبول کر لیتا ہے۔ یہودیوں کے اکثر اکابر اپنی تنہائیوں میں اسلام کی عظمت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن تعصب انہیں اسلام کی دہلیز پر جھکنے کی اجازت نہیں دیتا۔

وہ دلیل سے اسلام کا مقابلہ کرتے ہیں لیکن شکست کھاتے ہیں۔ مکر وفریب کے حربے آزماتے ہیں لیکن ناکام ہوتے ہیں۔ باطل کی ساری قوتوں کو مجتمع کر کے مدینہ طیبہ کا محاصرہ کرتے ہیں لیکن جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ (1) کے تیر سے چھلنی ہو جاتے ہیں۔ ان کی

1۔ حق آیا اور باطل مٹ گیا

مخالفت کے باوجود مدینہ کی سرزمین پر اسلام کی عظمتوں کے پھریرے لہراتے نظر آتے ہیں اور خیبر کی سرزمین سے "اَللّٰہُ اَکْبَرُ" کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔

عیسائیت شوکت شاہی کے سہارے پنپ رہی ہے لیکن اسلام کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتی۔ اسلام عیسائیت سے اس کے قابل ترین پیروکار بھی چھین لیتا ہے اور اس کے سرسبز و شاداب علاقوں پر بھی قبضہ کر لیتا ہے۔ اسلام جزیرہ عرب سے اٹھتا ہے، بیت المقدس پر اسلامی عظمت کے جھنڈے لہراتا ہے، ارض اندلس سے نعرہ تکبیر کی صدائیں بلند کرتا ہے اور فرانس کے دروازے پر دستک دیتا ہے۔ مبشرین، مستشرقین اور مستعمرین مل کر اس کا راستہ روکنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ مسلسل بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ برطانیہ میں گرجے مسجدوں میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ جنوبی افریقہ کا مسلمان عالم "احمد دیدات" یورپ اور امریکہ میں پوری دنیائے عیسائیت اور یہودیت کو چیلنج کرتا پھر رہا ہے کہ آؤ میں تمہاری بائبل سے تمہارے سامنے یہ ثابت کروں کہ اسلام دین حق ہے اور جن ادیان کو تم نے اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے وہ ادیان باطلہ ہیں، لیکن کسی عیسائی یا یہودی عالم میں اتنی جرأت نہیں کہ وہ اسلام کے اس شیر کے سامنے چند منٹ ٹھہر سکے۔

اسلام یہودیوں اور عیسائیوں سے ان کے مذہبی عالم، سیاسی راہنما، سائنسدان اور قومی ہیرو چھین رہا ہے۔ اسلام نے ان کے ساتھ چودہ صدیوں کے طویل عرصہ میں مسلسل یہی سلوک کیا ہے۔ انہوں نے بارہا مسلمانوں کو سیاسی اور معاشی میدانوں میں شکستیں دی ہیں لیکن اسلام کو وہ کبھی مغلوب نہیں کر سکے۔ وہ خود حیران ہیں کہ مسلمانوں کی سطوت و شوکت کا آفتاب غروب ہو چکا ہے لیکن اس کے باوجود عیسائیوں کے "کیٹ سٹیونسن" "یوسف اسلام"، ان کے "کلے" "محمد علی" اور ان کے "مائیک ٹائسن" "ملک عبدالعزیز" بن رہے ہیں۔

جن علاقوں پر کبھی مجوسیت کی عظمت کے پھریرے لہرایا کرتے تھے، وہاں آج اسلامی پرچم پوری آب و تاب سے لہرا رہے ہیں۔

تمام ادیان پر اسلام کے غلبے کی یہ پیشین گوئی جس شان سے پوری ہوئی ہے کیا وہ اس بات کی دلیل نہیں کہ یہ پیشین گوئی کسی انسان کی نہیں ہو سکتی بلکہ یہ پیشین گوئی کرنے والی وہ ذات ہے جس کے علوم ماضی، حال اور مستقبل سب کو محیط ہیں؟

مسلمانوں کی عسکری کامرانیوں کی پیشین گوئی

اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ظہور کی پیشین گوئی فرمائی تو اسے مطلق رکھا کہ حالات کچھ بھی ہوں، مسلمانوں کے سیاسی حالات کیسے بھی ہوں، وہ عسکری اور معاشی طور پر جس حالت میں بھی ہوں، اسلام کا شجرہ طیبہ سدا بہار رہے گا کیونکہ اسلام اپنی ابدی اور نورانی تعلیمات کی وجہ سے نشو ونما پاتا ہے، اس کا غلبہ کسی انسانی گروہ کے سیاسی غلبے کا مرہون منت نہیں۔ اس کے برعکس پروردگار عالم نے جب مسلمانوں کے عسکری غلبے کی پیشین گوئی فرمائی تو اسے مشروط کر کھا فرمایا:

وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ (1)

"اور بے شک ہمارا لشکر ہی غالب ہوا کرتا ہے۔"

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (2)

"اور نہ (تو) ہمت ہارو اور نہ غم کرو اور تمہیں سربلند ہو گے اگر تم سچے مومن ہو۔"

جب مکہ کی ساری قوتیں اسلام کے خلاف متحد ہو رہی تھیں، جب مکہ کے سردار شجر اسلام کی بیخ کنی کو اپنی زندگیوں کا مقصد اولین قرار دے رہے تھے، جب نعرۂ توحید بلند کرنے کی پاداش میں بلال کو انگاروں پر لٹایا جا رہا تھا، جب مسلمان اپنے دین کی حفاظت کے لئے اپنے وطن سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو رہے تھے، اس زمانے میں اللہ تعالیٰ نے یہ پیشین گوئی فرمائی کہ جو لشکر ہمارا ہے وہی غالب آئے گا۔

یہ آیۂ کریمہ سورہ "والصفت" کی ہے جو مکی ہے۔ مکی زندگی میں نہ تو مسلمانوں کو ابھی اذن جہاد ملا تھا اور نہ ہی فدا کاروں کی اس جماعت نے ابھی "جند اللہ" (3) کی شکل اختیار کی تھی۔ ابھی تو وہ دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہی نعرہ مستانہ بلند کر رہے تھے۔

؎ تو اے ستمگر! ہنر آزمائیں۔ تو تیر آزما ہم جگر آزمائیں

1۔ سورۃ الصفت: 173

2۔ سورۃ آل عمران: 139

3۔ خدائی لشکر

گویا "جند اللہ" کو اس کی عملی تشکیل سے پہلے ہی غلبے کا مژدہ سنادیا گیا تھا۔ لیکن شرط یہ تھی کہ وہ ان تمام تقاضوں کو پورا کرے جن کا پورا کرنا "جند اللہ" کہلوانے کے لئے ضروری ہے۔

مدنی زندگی میں جب "جند اللہ" تشکیل پاگئی، جب اس خدائی لشکر کو بارگاہ خداوندی سے اذن جہاد مل گیا، شیطانی طاقتیں رحمانی طاقتوں سے ٹکرانے کے لئے پر تولنے لگیں، مدینہ کے چند سو مہاجرین وانصار کو ہر سمت مخالفت کی تند و تیز آندھیاں چلتی نظر آنے لگیں، جب جزیرہ عرب کے طول وعرض کے جنگجو اسلام کے مٹھی بھر مجاہدوں کو للکارنے لگے تو پروردگار عالم نے انہیں یہ مژدہ جانفزا سنایا:

"ہمت مت ہارو، غم مت کرو، اگر تم نے مومن ہونے کا حق ادا کیا تو غلبہ تمہارا ہی ہوگا۔"

ذرا چشم تصور سے چودہ سو سال پیشتر کے عرب کے حالات کا جائزہ لیجئے اور بتایئے کہ جب عرب سورماؤں کا لشکر مٹھی بھر مسلمانوں کے مقابلے میں بدر کے میدان میں صف آرا ہوا تھا تو کیا کسی انسانی پیمانے سے مسلمانوں کی کامیابی کو ممکن قرار دیا جاسکتا تھا؟ جب عرب کے تمام قبائل نے مل کر مدینہ طیبہ کا محاصرہ کرلیا تھا، مدینہ میں مقیم یہودی قبیلہ "بنو قریظہ" "مار آستین" کی طرح مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لئے موقعہ کی تاک میں تھا، کیا ان حالات میں فنون حرب سے واقفیت رکھنے والا کوئی شخص مدینہ طیبہ کے تباہی سے بچ جانے کو ممکن قرار دے سکتا تھا؟ جب خدائی لشکر قیصر روم سے دو دو ہاتھ کرنے کے ارادے سے سفر تبوک پر روانہ ہوا تھا، تو کیا کوئی یہ کہہ سکتا تھا کہ یہ مختصر سی فوج قیصر روم کے غضب سے بچ کر مدینہ واپس آسکے گی؟

دنیوی پیمانوں پر بھروسہ کرنے والا کوئی شخص یقیناً یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا لیکن خدائی لشکر کے ہر سپاہی کو ان تمام میدانوں میں اپنی کامیابی کا یقین تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ان کے رب نے ان سے وعدہ فرمار کھا تھا کہ وہ "جند اللہ" ہیں اور "جند اللہ" کبھی مغلوب نہیں ہوتی۔ انہوں نے اپنے ایمان کی حفاظت کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا، اس لئے انہیں یقین تھا کہ اس ایمان کی قوت سے وہی غالب آئیں گے۔

تاریخ سے پوچھ لیجئے وہ تمہیں بتائے گی کہ مسلمان جب تک "جند اللہ" کے معیار پر پورے اترتے رہے، جب تک ان کے پیش نظر صرف اعلائے کلمۃ الحق کا مقصد رہا، جب

تک وہ رب کی خاطر جینے اور رب کی خاطر مرنے کے جذبے سے سرشار رہے، وہ جس میدان میں بھی گئے کامیابیوں نے ان کے قدم چومے۔ وہ اپنے سے کئی گنا زیادہ طاقت ور دشمن سے ایک بار نہیں، بار بار ٹکرائے اور ہمیشہ کامیاب ہوئے۔ عرب، ایران، عراق، شام، فلسطین، مصر اور افریقہ کی سرزمینیں اس خدائی پیشین گوئی کے حرف بحرف پورا ہونے کی گواہی دے رہی ہیں۔

جب مسلمانوں نے ایمان کو کم اہمیت دینا شروع کر دی، جب ان کے پیش نظر اعلائے کلمۃ الحق کا مقصد نہ رہا تو وہ بار ہا غیر مسلموں کے ہاتھوں پٹے بھی لیکن یہ ان کا اپنا قصور تھا۔ وہ بھی اگر ایمان کی شرط کو پورا کرتے اور اپنے "جند اللہ" ہونے کا ثبوت مہیا کرتے تو نصرت خداوندی ان کی بھی دستگیری کرتی۔

تاریخ جانتی ہے کہ جب عماد الدین زنگی، نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی نے خالص اسی جذبے سے تلوار اٹھائی جس جذبے سے خیر القرون کے مسلمان اٹھاتے تھے، تو کس طرح صلیبیوں کے ٹڈی دل ان کے مقابلے میں ریت کی دیوار ثابت ہوئے۔ خدائی وعدہ آج بھی برقرار ہے۔ جو بھی نصرت خداوندی کی مذکورہ شرائط کو پورا کرے گا، فتح و کامرانی اس کے قدم ضرور چومے گی۔

مسلمانوں کے سیاسی غلبے کی پیشین گوئی

جن لوگوں نے اپنے دین کی خاطر اپنے وطن کو چھوڑ دیا تھا اور مکہ سے اڑھائی سو میل دور بھی کفار مکہ انہیں چین کا سانس لینے کی اجازت دینے کے لئے تیار نہ تھے، جن کو ہر وقت دشمنوں کے حملے کا کھٹکا لگا رہتا تھا، ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرما رہا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِكُوْنَ بِیْ شَیْـًٔا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (1)

"وعدہ فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے تم میں سے

1۔ سورۃ النور: 55

اور نیک عمل کئے کہ وہ ضرور خلیفہ بنائے گا انہیں زمین میں جس طرح اس نے خلیفہ بنایا ان کو جو ان سے پہلے تھے اور مستحکم کردے گا ان کے لئے ان کے دین کو جسے اس نے پسند فرمایا ہے ان کے لئے۔ وہ ضرور بدل دے گا انہیں ان کی حالت خوف کو امن سے۔ وہ میری عبادت کرتے ہیں، کسی کو میرا شریک نہیں بناتے۔ اور جس نے ناشکری کی اس کے بعد تو وہی لوگ نافرمان ہیں۔

اس آیت میں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے مندرجہ ذیل وعدے فرمارہا ہے:

1۔ انہیں زمین پر خلافت عطا فرمائے گا۔

2۔ ان کے محبوب دین کو استحکام عطا فرمائے گا۔

3۔ ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا۔

4۔ میرے یہ بندے نظام توحید کو مضبوطی سے قائم رکھیں گے اور شرک ان کے قریب نہیں پھٹک سکے گا۔

یہ آیت کریمہ ان وعدوں کے پورا ہونے کا وقت بھی بتا رہی ہے کہ ان کے ایفاء میں زیادہ مدت نہیں لگے گی بلکہ تم، جن کے سامنے یہ آیت وعدہ نازل ہو رہی ہے، ان سب نعمتوں سے بہرہ ور ہو گے۔ ''منکم'' کا لفظ بتا رہا ہے کہ جو لوگ ان وعدوں کے پہلے مخاطب ہیں، یہ سب وعدے ان کی زندگی میں پورے ہوں گے۔

ہر وعدے کو دیکھو کہ وہ کس شان سے پورا ہوا۔ پہلا وعدہ استخلاف فی الارض کا ہے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جو اپنے گھر بار کو چھوڑ کر اپنے حبیب ﷺ کی حفاظت کے لئے تین دن غار ثور میں گزارنے پر مجبور کر دیئے گئے تھے، وہ مسند خلافت پر متمکن ہوتے ہیں۔ ارتداد اور انکار زکوٰۃ کے فتنوں کو فرو کرتے ہیں۔ ان کے عہد ہمایوں میں حضرت خالد بن ولید، افواج کسریٰ سے ٹکراتے ہیں اور ابو عبیدہ قیصر کے لشکروں کے خلاف نبرد آزما ہو کر اسلام کی تاریخی فتوحات کا دیباچہ رقم کرتے ہیں۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ مسند خلافت پر متمکن ہوتے ہیں تو قیصر کو قسطنطنیہ تک دھکیل دیتے ہیں۔ مصر خلافت اسلامیہ کا حصہ بنتا ہے اور آتش کدہ فارس ہمیشہ کے لئے سرد ہو

جاتا ہے۔ حضرت عثمان غنی اور حضرت علی رضی اللہ عنھما کے زمانوں میں اسلامی خلافت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ کیا صحابہ کرام کے لئے استخلاف فی الارض کے وعدے کے ایفاء اور اس پیشین گوئی کی تکمیل کی اس سے بہتر کوئی صورت ممکن ہے۔

دوسرا وعدہ دین اسلام کے غلبے اور ظہور کا ہے۔ اس کی جھلک قارئین کرام پہلے اس موضوع کی پیشین گوئی کی بحث میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

تیسرا وعدہ امن وامان کا ہے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ فاتحین علاقے تو فتح کر لیتے ہیں لیکن مفتوحہ علاقوں میں نہ تو نظم ونسق قائم کر سکتے ہیں اور نہ امن کی صورت حال کو کنٹرول کر سکتے ہیں۔

سکندر مقدونی نے کتنے علاقے فتح کئے تھے لیکن کیا وہ کسی مفتوح علاقے کو کوئی نظام دینے میں کامیاب ہوا تھا؟ تاتاریوں نے کتنے علاقوں کی اینٹ سے اینٹ بجائی تھی لیکن وہ اپنے مفتوحہ علاقوں کو نہ تو نظم ونسق کی دولت دے سکے تھے اور نہ ہی امن وامان کی۔ اس کے برعکس مسلمانوں نے صرف علاقے ہی فتح نہیں کئے بلکہ علاقوں کے ساتھ ساتھ مفتوحین کے دلوں کو بھی فتح کر لیا۔ جن علاقوں میں وہ فاتح بن کر داخل ہوئے تھے، ان علاقوں کے لوگوں نے جب ان کے حسن کردار اور حسن سلوک کا مشاہدہ کیا تو وہ مسلمانوں کو اپنا محسن سمجھنے لگے۔ وہ مسلمانوں کو اپنا محسن اس لئے سمجھتے تھے کہ عدل اور امن کی جو نعمت انہیں مسلمانوں کے صدقے میسر آئی تھی، اس کا انہوں نے کبھی خواب تک نہ دیکھا تھا۔

مسلمانوں نے جن علاقوں کو چودہ سو سال پہلے فتح کیا تھا وہاں آج تک اسلامی پرچم لہرا رہے ہیں۔ کیا قیام امن کے وعدے کے ایفاء کی اس سے بہتر صورت ممکن ہے کہ مفتوحہ اقوام نے فاتحین کا دین قبول کر لیا اور فاتحین اور مفتوحین رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ (1) کی زندہ مثال بنے شانہ بشانہ اعلائے کلمۃ الحق کے لئے سرگرم ہو گئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو متعدد معجزات اور نشانیاں دکھانے کے بعد کچھ مدت کے لئے کوہ سینا پر گئے تھے لیکن آپ کی قوم نے آپ کی غیر حاضری میں خدائے واحد کو چھوڑ کر مصنوعی بچھڑے کی پوجا شروع کر دی تھا لیکن قرآن حکیم پیشین گوئی فرما رہا ہے کہ میرے حبیب ﷺ کے امتی بنو اسرائیل کی نقل نہیں کریں گے۔ ان کی جبینیں صرف میرے آستانے پر جھکیں گی اور شرک کی لعنت جس سے انہوں نے اسلام کی برکت سے

1۔ آپس میں بڑے رحم دل ہیں۔

چھٹکارا حاصل کیا ہے، وہ اس سے ہمیشہ محفوظ رہیں گے۔ عالم اسلام کے ہر کونے سے اٹھنے والی نعرۂ توحید کی صدائیں اس پیشین گوئی کے حرف بحرف پورے ہونے کا ثبوت مہیا کر رہی ہیں۔

کعبے کو صنم خانے سے پاسبان ملنے کی پیشین گوئی

یہ اسلام کا اعجاز بھی ہے، اس کی صداقت کی دلیل بھی اور اس کے پیغام کے عام ہونے کا ثبوت بھی کہ اس دین متین کی خدمت کسی خاص نسل، کسی خاص علاقے یا کسی خاص زمانے کے لوگوں کے ساتھ مخصوص نہیں رہی بلکہ اس نے ہر نسل اور ہر خطے کے لوگوں سے اپنی خدمت لی ہے۔ جب کسی قوم نے خدمت اسلام کا منصب عطا ہونے کے باوجود اپنے فرائض میں کوتاہی کا رویہ اپنایا، تو قدرت نے یہ اعزاز ان سے واپس لے کر کسی دوسری قوم کے سپرد کر دیا۔ عربوں نے بھی اس دین متین کی خدمت کی۔ ایرانیوں، شامیوں اور ترکوں نے بھی دین اسلام کا جھنڈا دنیا کے مختلف خطوں میں لہرانے کی خاطر اہم کردار ادا کیا۔ تاتاری بلائے بے درمان بن کر اٹھے، مختلف اسلامی ملکوں کو تاراج کیا اور عروس البلاد بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجائی لیکن اس حقیقت کو کون نہیں جانتا کہ پھر ان تاتاریوں کو بھی اسی شجرۂ طیبہ کے سائے میں پناہ ملی اور انہوں نے اس کی حفاظت کے لئے اپنا تن من دھن قربان کر دیا۔

کبھی کچھ قومیں اجتماعی شکل میں اس دین متین کی خدمت میں مصروف عمل ہو گئیں اور کبھی قدرت نے مختلف قوموں سے وہ نفوس قدسیہ چن لئے جن کو اس نے خدمت دین کے لئے پسند فرمایا تھا۔ آج یورپ اور امریکہ کے اسلام دشمن ماحول میں بھی انہی قوموں کے بے شمار سپوت خدمت دین اسلام کو اپنا فریضہ حیات سمجھتے ہیں۔ ایسا کیوں نہ ہوتا؟ قدرت نے چودہ صدیاں پہلے اس کی پیشین گوئی کر دی تھی اور فرما دیا تھا:

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (1)

"اور اگر تم روگردانی کرو گے (تو اس سعادت سے محروم کر دیئے جاؤ گے) اور تمہارے عوض وہ دوسری قوم لے آئے گا پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔"

1۔ سورہ محمد: 38

آج دنیائے اسلام اپنے دین سے منہ موڑ کر مغرب پرستی کے مرض میں مبتلا ہو رہی ہے اور ادھر یورپ اور امریکہ میں اسلام تیزی سے پھیل رہا ہے۔ مسلمان اگر خدمت دین کے اعزاز سے محروم نہیں ہونا چاہتے تو حالات کے تیور دیکھیں ورنہ خدائی پیشین گوئی ہمیشہ کی طرح ایک مرتبہ پھر پوری ہوگی اور اعلائے کلمۃ الحق کا اعزاز اہل مشرق سے لے کر اہل مغرب کے حوالے کر دیا جائے گا۔ کیونکہ یہ دین آفاقی ہے جس کا رب رَبُّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ (1) ہے اور وہ کسی بھی قوم کو اس اعزاز کے لئے منتخب فرما سکتا ہے۔

مستہزئین کے متعلق پیشین گوئی

جب حضور ﷺ نے مکہ مکرمہ میں دین حق کی تبلیغ شروع کی تو وہ لوگ جو دین آباء پر نازاں تھے، انہوں نے حضور ﷺ کو دعوت حق سے باز رکھنے کے لئے مختلف حربے آزمائے۔ ان میں سے ایک حربہ یہ تھا کہ وہ حضور ﷺ کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ یہ کام وہ صرف انفرادی طور پر ہی نہیں کرتے تھے بلکہ ان میں ایک مخصوص ٹولہ ایسا تھا جن کا کام ہی یہ تھا کہ وہ حضور ﷺ کی ہنسی اڑائیں، آوازے کسیں، نقلیں اتاریں اور حضور ﷺ کے وعظ کے درمیان دخل اندازی کریں۔ ان حالات میں سلسلہ تبلیغ کو جاری رکھنا انتہائی کٹھن کام تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو اپنا کام جاری رکھنے اور مشرکین کی دلآزاریوں کو خاطر میں نہ لانے کا حکم دیا اور یہ پیشین گوئی فرما کر حضور ﷺ کو تسلی دی:

اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (2)

"ہم کافی ہیں آپ کو مذاق اڑانے والوں کے شر سے بچانے کے لئے جو بناتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور خدا۔ سو یہ (حقیقت حال کو) ابھی جان لیں گے۔"

یہ پیشین گوئی کس شان سے پوری ہوئی، تاریخ سے پوچھو۔ وہ لوگ جو حبیب خدا ﷺ کا استہزاء کرنے والوں کے سرخیل تھے ان میں سے کوئی ذلت کی موت مرا اور کسی کو میدان بدر اور دوسرے معرکوں میں مسلمانوں نے واصل جہنم کیا۔ ابی بن خلف اسی غلام (بلال)

1۔ مشرق و مغرب کا رب

2۔ سورۃ الحجر: 96-95

کے ہاتھوں ھاویہ کا ایندھن بنا جنہیں وہ اپنی مشق ستم کا نشانہ بنایا کرتا تھا۔ عاص بن وائل گدھے وائل گدھے سے سر کے بل گڑھے میں گرا، اسے زہریلے عقرب نے کاٹا اور وہ سڑ کر مر گیا۔ ابولہب عدسہ وطاعون کی بیماریوں کے ہاتھوں واصل جہنم ہوا۔ اس کے پیارے بیٹوں نے اس بدبخت کی لاش کو دور کھڑے ہو کر سنگسار کیا اور اس کے جسم کو پتھروں کے نیچے چھپا دیا۔ اور ابو جھل کو دو ننھے مجاہدوں نے کاٹ کر رکھ دیا۔(1)

یہ پیشین گوئی اس وقت ہوئی تھی جب مسلمانوں کو خانہ خدا میں سجدوں کی اجازت بھی نہ تھی۔ جب ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اپنے گھر میں بھی باآواز بلند قرآن کی تلاوت کرنے سے روکا جا رہا تھا۔ کیا ایسے حالات میں ایسی پیشین گوئی کرنا اور پھر اس کا چند سالوں میں عملی شکل میں سامنے آجانا، خدائے قادر وقیوم کے سوا کسی اور کا کام ہو سکتا ہے؟

لوگوں کے شر سے حضور ﷺ کی حفاظت کی پیشین گوئی

حضور ﷺ کو بارگاہ خداوندی سے حکم ملا تھا کہ بتوں کے پجاریوں کے سامنے ان کے بتوں کی بے بسی کا اعلان کریں، دین آباء پر اترانے والوں کے سامنے ان کے آباؤ اجداد کی گمراہی کا ڈھنڈورا پیٹیں، دولت، قوت اور نسلی برتری پر تفاخر کرنے والوں کو انسانی مساوات کا درس دیں، ظالموں کے اٹھے ہوئے ہاتھوں کو پکڑ لیں، حیوانی خواہشات کے چنگل میں پھنسی ہوئی انسانیت کو اخلاقی قدروں کا درس دیں اور خدا کی زمین پر مخلوق کی بجائے خدا کی حکومت کا علم بلند کریں۔

حضور ﷺ نے ارشاد خداوندی کی تعمیل میں اپنا کام شروع کیا تو مخالفتوں کے طوفان امڈ کر آگئے۔ حضور ﷺ کا مذاق اڑایا گیا، آپ کے غلاموں کو ناقابل بیان تشدد کا نشانہ بنایا گیا، آپ کی شمع حیات کو گل کرنے کے منصوبے بنے لیکن حضور ﷺ ہر حال میں ثابت قدم رہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ آپ کے رب نے آپ سے حفاظت کا وعدہ فرما رکھا تھا اور آپ کو اپنے رب کے وعدے پر یقین کامل تھا۔ آپ کے رب نے آپ کو حکم دیا تھا:

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ(2)

"اے رسول! پہنچا دیجئے جو اتارا گیا ہے آپ کی طرف آپ کے

1۔ قاضی محمد سلیمان منصور پوری، "رحمۃ للعالمین"، (شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔ س ن)، جلد 3، صفحہ 300

2۔ سورۃ المائدۃ: 67

پروردگار کی جانب سے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو نہیں پہنچایا آپ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام۔"

اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ بھی فرمایا تھا:

وَ اللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ (1)

"اور اللہ تعالیٰ بچائے گا آپ کو لوگوں (کے شر) سے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا کافروں کی قوم کو۔"

حقیقت یہ ہے کہ حضور ﷺ نے اس حکم خداوندی کی تعمیل میں نیاز مندی کی جو مثالیں قائم کیں وہ بھی بے مثال ہیں اور رب قدوس نے اپنے وعدے کے مطابق جس طرح اپنے بندے کی حفاظت فرمائی، وہ بھی صرف اسی کے شایانِ شان ہے۔

حضور ﷺ نے صفا کی چوٹی سے اہل مکہ کو دعوت حق دے کر اپنے فرائض منصبی کی بجا آوری کا آغاز کیا۔ آپ نے کفار مکہ کو انفرادی طور بھی دین کی طرف بلایا اور اجتماعی طور بھی۔ آپ نے ارشاد خداوندی کی تعمیل میں طائف کا سفر اختیار کیا اور پتھروں سے اپنا جسم لہولہان کرایا۔ آپ نے میلوں اور منڈیوں میں جاکر دور دراز سے آنے والے قبائل کو دعوت توحید دی۔ مکہ کی سرزمین دعوت توحید کے لئے تنگ نظر آئی تو آپ نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی۔ آپ مدینہ طیبہ میں بھی چین سے نہیں بیٹھے بلکہ اردگرد کے قبائل کو دین کی دعوت دینے کا سلسلہ جاری رکھا۔ صلح حدیبیہ کے بعد جب جنگوں سے کچھ مہلت ملی تو قیصر و کسریٰ اور دوسرے چھوٹے بڑے حکمرانوں کو دعوت نامے ارسال کئے اور انہیں دین حق کی طرف بلایا۔ رب قدوس نے قدم قدم پر آپ کی حفاظت فرمائی۔ شب ہجرت کاشانہ اقدس کا محاصرہ کرنے والوں کی تلواریں آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ آپ کی تلاش میں آنے والے غار ثور کے دہانے تک پہنچ کر بھی آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ دشمن تلوار بے نیام کئے آپ کے سر پر آیا لیکن آپ کو اپنی شمشیر کا نشانہ بنانے کی بجائے آپ کے تیر نگاہ کا نشانہ بن گیا۔ بدر و حنین اور احد و احزاب میں عظمت کے خدائی وعدے نے آپ کی دستگیری فرمائی۔

عقلیت پسندی کا دعویٰ کرنے والے بتائیں کہ اگر عصمت خداوندی شامل حال نہ ہوتی تو حضور ﷺ کو جن حالات سے واسطہ پڑا تھا، کیا ان حالات میں آپ کا محفوظ رہنا ممکن تھا؟

1۔ سورۃ المائدہ 67

کفار کے متعلق پیشین گوئی کہ وہ اسلام کی شمع کو گل کرنے کیلئے زر کثیر خرچ کریں گے لیکن ناکام رہیں گے

کفار مکہ اسلام کو ختم کرنے کیلئے جہاں اپنی ساری سطوت و شوکت استعمال کر رہے تھے، وہاں اس مقصد کے حصول کے لئے پانی کی طرح دولت بھی خرچ کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس طرز عمل کے مسلسل جاری رہنے کی پیشین گوئی کی اور فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ (1)

"بے شک کافر خرچ کرتے ہیں اپنے مال تاکہ روکیں (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے۔ اور یہ آئندہ بھی (اسی طرح) خرچ کریں گے۔ پھر ہو جائے گا یہ خرچ کرنا انکے لئے باعث حسرت وافسوس پھر وہ مغلوب کر دیئے جائیں گے۔"

اس آیت کریمہ کے ذریعے تین پیشین گوئیاں کی گئیں۔

1۔ کافر اسلام کو مٹانے کے لئے اپنا مال خرچ کریں گے۔

2۔ ان کی یہ جدوجہد اور مال کثیر خرچ کرنا، ان کے لئے باعث حسرت ہو گا۔

3۔ اپنے اس مقصد میں وہ ناکام رہیں گے۔

اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کی صحیح جھلک دیکھنے کے لئے اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے۔ کیونکہ یہ پیشین گوئی صرف کسی ایک واقعے کے ذریعے پوری نہیں ہوئی بلکہ چودہ سو سال سے مسلسل پوری ہو رہی ہے اور آج کے دور میں یہ پیشین گوئی بڑی عجیب شان سے پوری ہو رہی ہے۔

یہ پیشین گوئی اس وقت بھی پوری ہوئی تھی جب بدر و احد اور احزاب و حنین میں دشمنان اسلام نے زر کثیر صرف کر کے اسلام کی شمع کو بجھانے کی کوششیں کیں لیکن ان کوششوں کے نتیجے میں انہیں سوائے حسرت و ذلت کے کچھ نہ ملا۔ اسلام روز افزوں ترقی کرتا رہا اور وہ حسرت و یاس کے ساتھ اپنی ناکامیوں پر کف افسوس ملتے رہے۔

اس پیشین گوئی کو اس وقت بھی چشم فلک پیر نے پورا ہوتے دیکھا جب قیصر و کسریٰ نے

1۔ سورۃ الانفال: 36

زر کثیر صرف کر کے لشکر ہائے جرار تیار کیے لیکن مسلمانوں کے مقابلے میں نہ ان کی ٹڈی دل فوجیں ٹھہر سکیں اور نہ ہی اموال کثیرہ کا صرف کرنا ان کے کام آسکا۔

اس پیشین گوئی نے اس وقت بھی اپنی شان دکھائی جب یورپ بھر سے لاکھوں کی تعداد میں صلیبی، شجر اسلام کی بیخ کنی کے لئے، ارض اسلام پر ٹوٹے لیکن اپنی حسرتوں کے سمندر میں غرق ہوگئے۔

ذرا اندازہ لگائیں کہ ایک ایک لشکر کی تیاری پر کتنا روپیہ صرف ہوا ہوگا۔ یہ صلیبی حملہ ایک نہیں تھا بلکہ کئی صدیاں یہ حملے جاری رہے۔ ان حملوں میں یہود و نصاریٰ کے لاکھوں جنگجو لقمہ اجل بنے۔ ان کی تجوریاں کھلیں اور اسلام کی مخالفت میں خالی ہوگئیں لیکن اسلام کا آفتاب اب بھی اسی آب و تاب سے چمک رہا ہے۔

قافلہ انسانیت کو اسلام کی راہ سے روکنے کے لئے مال خرچ کرنے والی پیشین گوئی کو جس انداز میں مستشرقین اور ان کی ہمنوا تحریکوں نے پورا کیا ہے اس کی مثال شاید ماضی کی تاریخ میں نہ مل سکے۔ اسلام کی کمزوریاں تلاش کرنے اور مناظرے کے میدان میں اس کا مقابلہ کرنے کیلئے انہوں نے عربی علوم کے ادارے قائم کئے۔ تمام اسلامی علوم کی کتابوں کو چھان مارا۔ ان کتابوں کے ترجمے کئے۔ اسلامی ممالک میں سکول کھولے۔ ہسپتال قائم کئے۔ خیراتی ادارے بنائے۔ انہوں نے یہ تمام کام اسلام کا مقابلہ کرنے کیلئے کئے لیکن ان تمام میدانوں میں طویل جدو جہد کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اتنی کوششوں اور اتنے اموال خرچ کرنے کے باوجود وہ کسی ایک بھی سچے مسلمان کو اپنے دین سے برگشتہ نہ کر سکے۔

کیا حسرت اور مغلوبیت کی اس سے بڑی مثال کا ملنا ممکن ہے؟ کیا اس قسم کی پیشین گوئی صرف وہی ہستی نہیں کر سکتی جو "عالم الغیب والشہادۃ" (1) ہے۔

جنگ بدر کے متعلق پیشین گوئی

جنگ بدر کے موقعہ پر مسلمان مدینہ طیبہ سے نکلے۔ ان کے سامنے ایک طرف اہل مکہ کا تجارتی قافلہ تھا جس کے محافظوں کی تعداد تیس چالیس سے زیادہ نہ تھی۔ دوسری طرف اہل مکہ کا لشکر جرار تھا جو مسلمانوں سے تعداد میں کئی گنا زیادہ تھا اور سامان حرب کے معاملے میں مسلمانوں کو اس سے کوئی نسبت ہی نہ تھی۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے

1۔ ہر پوشیدہ اور ظاہر چیز کو جاننے والا۔

وعدہ فرمایا:

وَاِذْ یَعِدُکُمُ اللّٰہُ اِحْدَی الطَّآئِفَتَیْنِ اَنَّھَا لَکُمْ (1)

"اور یاد کرو جب وعدہ فرمایا تم سے اللہ نے ایک کا ان دو گروہوں سے کہ وہ تمہارے لئے ہے۔"

وعدہ اور پیشین گوئی یہ تھی کہ قافلے یا لشکر دونوں میں سے ایک کے خلاف تمہیں فتح نصیب ہوگی۔ قدرتی طور پر مسلمانوں کی آرزو یہ ہوگی کہ قافلہ ان کے ہاتھ آئے۔ اگرچہ وہ سمندروں میں کودنے اور پہاڑوں سے ٹکرانے کے لئے بھی صرف رسول خدا ﷺ کے اشارۂ ابرو کے منتظر تھے لیکن آسان راستہ اختیار کرنا انسان کی فطرت ہے۔ اگر قافلہ مسلمانوں کے ہاتھ آجاتا تو بھی وعدہ تو پورا ہو جاتا لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ قدرت اس وعدہ کو اس انداز میں پورا کرنا چاہتی تھی کہ سارے عربوں کی آنکھیں کھل جائیں۔ قریش مکہ کی شوکت و سطوت کا محل زمین بوس ہو اور مسلمانوں کو کمزور سمجھنے والوں کو پتہ چلے کہ یہ کمزور نہیں بلکہ ان کے سینوں میں شیروں کے دل ہیں، ان کی شمشیریں خارا شگاف ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ زندگی پر شہادت کی موت کو ترجیح دیتے ہیں۔

اس وعدے کے بعد اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کفار مکہ کے لشکر کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اب مسلمانوں کو اس بات میں ذرا شک نہ رہا کہ ان کے ساتھ کس طائفے کے مقابلے میں فتح کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس وعدے پر یقین کامل ہی تھا کہ وہ موت و حیات سے بے نیاز ہو کر لڑے اور تاریخ عالم کے صفحات پر ایک ایسے معرکے کی یادیں ثبت کیں جس کی مثال تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ وعدہ کیسے پورا فرمایا؟ کفار مکہ جن کو اپنی تعداد اور سامان حرب پر ناز تھا اور جن کے مقابلے میں مسلمان کچھ بھی نہ تھے، وہ اپنے ستر سورماؤں کی لاشیں میدان جنگ میں چھوڑ کر بھاگے اور ان کے اعزہ و اقارب میں سے ستر کو مسلمان جنگی قیدی بنا کر مدینہ طیبہ لے گئے۔ یقیناً ایسی پیشین گوئیاں صرف رب قدوس ہی کر سکتا ہے جس کے لئے مولے کو شہباز سے لڑا دینا معمولی بات ہے۔

1۔ سورۃ الانفال: 7

مہاجرین کے عروج کی پیشین گوئی

مہاجرین اپنا سب کچھ چھوڑ کر اور صرف دولت ایمان کو بچا کر مدینہ طیبہ پہنچے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ فرمایا:

وَمَنْ يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً (1)

"اور جو شخص ہجرت کرے گا اللہ کی راہ میں، پائے گا زمین میں پناہ کے لئے بہت جگہ اور کشادہ روزی۔"

جو شخص اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہو، وہ اس مادی خوش حالی کا جائزہ لے جس سے مہاجرین بہرہ ور ہوئے۔ وہ ان علاقوں کی وسعت کا جائزہ لے جن پر صدیق و فاروق اور عثمان وحیدر رضی اللہ عنہم کا حکم چلتا تھا۔ وہ عراق، شام، ایران، مصر اور افریقہ میں خالد بن ولید، ابو عبیدہ بن جراح، عمرو بن عاص اور سعد بن وقاص رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسے مہاجرین کی کامرانیوں کی داستان کا مطالعہ کرے۔ یقیناً بے خانماں ہو جانے والوں سے وہی ہستی اس قسم کا وعدہ کر سکتی ہے جس کے لئے اس کو پورا کرنا ناممکن نہیں ہے۔

ایرانیوں پر رومیوں کے غلبے کی پیشین گوئی

نزول قرآن کے زمانے میں دنیا میں دو عظیم شخصیتیں موجود تھیں۔ سلطنت روم اور سلطنت ایران۔ ایرانی آتش پرست تھے اور رومی مذہب عیسوی کے پیروکار۔ یہ دونوں طاقتیں طویل عرصہ باہم برسر پیکار رہیں۔ ان کی باہمی آویزش کی تاریخ میں ایک دور ایسا آیا جب رومی حکومت کمزور ہو گئی اور ایرانی حکومت نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

ایرانی فوجوں نے انطاکیہ پر قبضہ کر لیا۔ 613ء میں دمشق میں داخل ہوئیں۔ 614ء میں بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ ہیلینا اور قسطنطین کے شاہی قلعے مسمار کر دیئے۔ کلیسوں کی ساری دولت لوٹ لی گئی۔ اصل صلیب جس پر عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مصلوب کیا گیا تھا، ایران بھیج دی گئی اور نوے ہزار

1۔ سورۃ النساء: 100

عیسائیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر دیا گیا........رومیوں کی قوت دن بدن دم توڑ رہی تھی۔ ایرانی فوج اور ان کے شہنشاہ کی طاقت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ایرانی فوجیں جدھر کا رخ کرتیں، کامیابی ان کے قدم چومتی۔ شام، فلسطین، اردن اور لبنان پر خسرو ایران کا پرچم لہرانے لگا۔ افریقہ میں مصر سے لیبیا تک کا علاقہ فتح کر لیا گیا۔ دوسرے محاذ پر ایرانی فوجیں خود قسطنطنیہ کے دروازے پر دستک دینے لگیں اور 616ء میں شہر کے سامنے ایک بلند پہاڑی پر ایرانی فوجوں نے اپنا کیمپ قائم کر لیا۔(1)

ایرانی شہروں پر شہر فتح کر رہے تھے اور ان کا بادشاہ طاقت کے نشے میں اتنا سرمست تھا کہ وہ اپنے آپ کو شہنشاہ ہی نہیں، خدا بھی سمجھنے لگا تھا۔ اسی زمانے میں مکہ میں حق و باطل کا معرکہ گرم تھا۔ کفار مکہ جب رومیوں کے خلاف ایرانیوں کی کامیابیوں کی داستانیں سنتے تو پھولے نہ سماتے اور مسلمانوں سے کہتے کہ تمہارے ہم مسلک اہل کتاب اپنے ملک میں ہمارے مشرک بھائیوں کے ہاتھوں پٹ رہے ہیں۔ مکہ میں ہماری تمہاری جنگ کا انجام بھی یہی ہوگا۔ یہاں بھی بت پرستوں کے ہاتھوں مسلمانوں کو شکست ہوگی۔

یہ صورت حال مسلمانوں کے لئے پریشان کن تھی۔ رحمٰن و رحیم پروردگار نے ان حالات میں اپنے مقدس کلام میں ایک ایسی پیشین گوئی فرمائی جس نے تاریخ کے مبصر کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ کافروں کو اس پیشین گوئی کے پورا نہ ہو سکنے کا یقین تھا۔ مسلمانوں کو اس کے پورا ہونے میں ذرہ برابر شک نہ تھا۔ یہ پیشین گوئی کیا تھی؟ اس دعوت کی صداقت کے لئے ایک ٹیسٹ تھی جس کو لے کر خدا کا حبیب اس کرہ ارضی پر جلوہ گر ہوا تھا۔ اگر یہ پیشین گوئی پوری ہوتی ہے تو قرآن حکیم یقیناً خدا کا کلام ہے کیونکہ ظاہری حالات میں اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کے امکانات ایک فی صد بھی نہ تھے اور اگر یہ پیشین گوئی پوری نہیں ہوتی تو قرآن کو کلام خداوندی کہنے کا جواز ختم ہو جاتا ہے۔

قرآن حکیم نے ان الفاظ میں پیشین گوئی فرمائی۔

الٓمّٓ ۚ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۙ فِیْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۗ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ۚ وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ بِنَصْرِ اللّٰهِ ۚ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ

1۔ "ضیاء القرآن"، جلد 3، صفحہ 55-554

الرَّحِیْمُo وَعْدَاللّٰہِ لَا یُخْلِفُ اللّٰہُ وَعْدَہٗ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (1)

"الف۔ لام۔ میم۔ ہرا دیئے گئے رومی پاس کی زمین میں اور وہ ہار جانے کے بعد ضرور غالب آئیں گے چند برس کے اندر۔ اللہ ہی کا حکم ہے پہلے بھی اور بعد بھی اور اس روز خوش ہوں گے اہل ایمان اللہ تعالیٰ کی مدد سے۔ وہ مدد فرماتا ہے جس کی چاہتا ہے اور وہی سب پر غالب ہے، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔ یہ وعدہ اللہ نے کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔"

یہ آیت کریمہ متعدد پیشین گوئیاں کر رہی ہے۔

1۔ رومی ذلت آمیز شکستوں کے بعد دوبارہ غالب آئیں گے۔

2۔ رومیوں کی شکستوں کو فتح میں بدلنے کے لئے تین سے نو سال تک کا عرصہ لگے گا۔

3۔ جب رومی ایرانیوں کے خلاف فتح کے علم بلند کریں گے تو اسی وقت مسلمانوں کو بھی نصرت خداوندی سے خوشیاں نصیب ہوں گی۔

4۔ یہ پیشین گوئیاں اللہ تعالیٰ کے وعدے ہیں جو اپنے وعدوں کی کبھی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

جن حالات میں یہ پیشین گوئیاں کی گئی تھیں ان حالات میں ان کے پورا ہونے کے امکانات ایک فی صد بھی نہ تھے۔ مشہور مغربی مورخ گبن لکھتا ہے۔

"At the time this prediction is said to have been delivered, no prophecy could be more distant from it's accomplishment, since the first twelve years of Heraclius announced the approaching dissolution of the empire". (2)

"جس زمانے میں یہ پیشین گوئی کیے جانے کا دعویٰ کیا جاتا ہے اس زمانے میں اس جیسی پیشین گوئی کے پورا ہونے کا کوئی امکان نہ تھا کیونکہ ہرقل کی حکمرانی کے پہلے بارہ سال رومی سلطنت کا خاتمہ قریب

1۔ سورۂ روم: 5-1

2۔ ایڈورڈ گبن، "دی ڈیکلائین اینڈ فال آف دی رومن ایمپائر" (ایوری مین لائبریری لندن۔ 1962)، جلد 4، صفحہ 514

ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔"

جب یہ پیشین گوئی کی گئی تو ایک واقعہ ایسا پیش آیا جو مومنانہ طرز فکر اور کافرانہ سوچ کا فرق واضح کرتا ہے۔ کافر ایرانیوں کی فتح پر ڈینگیں مارتے رہتے تھے۔ جب یہ آیات نازل ہوئیں تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے پورے یقین اور وثوق کے ساتھ کافروں سے جا کر کہا کہ خوشیاں منانا بند کر دو، رسول خدا ﷺ نے باذن خداوندی اعلان فرمادیا ہے کہ رومی عنقریب ایرانیوں پر غالب آئیں گے۔ ابی بن خلف کو اس بات کا کیسے یقین آتا۔ وہ کہنے لگا: تم جھوٹ بولتے ہو۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جھوٹ تم بول رہے ہو، میں اس بات پر تم سے شرط بدنے کے لئے تیار ہوں۔ شرط یہ طے ہوئی کہ اگر تین سال کے اندر اندر رومی ایرانیوں پر غالب آگئے تو ابی بن خلف حضرت صدیق کو دس اونٹ دے گا اور اگر ایسا نہ ہوا تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ابی بن خلف کو دس اونٹ دیں گے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے سارا ماجرا بارگاہ رسالت میں عرض کر دیا۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: قرآن حکیم نے "بضع" کا لفظ استعمال کیا ہے جو تین سے لے کر نو تک کے عدد پر بولا جاتا ہے۔ تم ابی بن خلف کے پاس واپس جاؤ اور شرط کی مدت میں توسیع کا مطالبہ کرو اور اونٹوں کی تعداد دس سے بڑھا کر سو کر دو۔ ابی بن خلف کے نزدیک اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کا کوئی امکان نہ تھا اس لئے اس نے ان ترمیمات کو بخوشی تسلیم کر لیا۔(1)

تاریخ کے صفحات گواہ ہیں کہ اس پیشین گوئی کا ایک ایک لفظ پورا ہوا۔ ہرقل جو، کسی بھی قیمت پر، خسرو کے ساتھ صلح کرنے کیلئے بے تاب تھا، جب اسے یقین ہو گیا کہ خسرو کے ہاتھوں سے اس کے بچنے کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہو گی تو اس نے اس صورت حال کو بدلنے کے لئے جان کی بازی لگانے کا عزم مصمم کر لیا۔ اس نے قوم کو ایرانیوں کے مقابلے کے لئے تیار کیا اور ایک لشکر جرار تیار کر کے ایران پر حملہ کر دیا۔ وہ مسلسل آگے بڑھتا رہا اور ایران کے مختلف شہروں کو فتح کرتے ہوئے آخر کار ایران کے پایہ تخت مدائن پر بھی قبضہ کر لیا۔ جب ہرقل ایران کی اینٹ سے اینٹ بجا رہا تھا، اس وقت خسرو ابھی قسطنطنیہ کا محاصرہ کئے بیٹھا تھا۔ ہرقل نے آتش پرستوں کے سب سے بڑے آتش کدے کو بجھا دیا۔ ان کی عبادت گاہوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ زرتشت کے مقام پیدائش آرمیا کو تباہ کر دیا۔ اس

1۔ "ضیاء القرآن"، جلد 3، صفحہ 560

طرح اس نے اپنے مقامات مقدسہ کی بے حرمتی کا انتقام لے لیا۔(1)

اس طرح اللہ تعالیٰ نے مغلوب رومیوں کے غالب آنے کی جو پیشین گوئی کی تھی، اسے پورا ہوتے ہوئے نہ صرف مکہ کے بت پرستوں نے دیکھا بلکہ روم کے عیسائیوں اور ایران کے آتش پرستوں کی تاریخیں بھی اس خدائی پیشین گوئی کے حرف بحرف پورا ہونے کے ناقابل تردید ثبوت فراہم کر رہی ہیں۔

اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کے لئے قرآن حکیم نے زیادہ سے زیادہ نو سال کی مدت مقرر کی تھی۔ یہ پیشین گوئی نو سال کا عرصہ مکمل ہونے سے پہلے پوری ہوئی۔ جسے یقین نہ آئے وہ متعلقہ اقوام کی تاریخوں سے اس بات کی تصدیق کر لے۔

قرآن حکیم نے اس بے مثال پیشین گوئی کے ساتھ ہی ایک اور ایسی پیشین گوئی بھی کی تھی جو تاریخ کا رخ موڑنے والی تھی۔ قرآن حکیم نے فرمایا تھا کہ جب رومیوں کو غلبہ نصیب ہو گا تو مسلمانوں کو بھی نصرت خداوندی سے ایک خوشی نصیب ہو گی۔ یہ خوشی اس طرح دوچند ہو گی کہ ایک طرف انہیں اہل کتاب کی آتش پرستوں پر فتح کی خبر مسرور کرے گی اور دوسری طرف خود انہیں اللہ تعالیٰ کی مدد سے اپنے دشمنوں کے خلاف فتح کی مسرت حاصل ہو گی۔

یہ خوش خبری بھی حرف بحرف پوری ہوئی۔ جس سال ہرقل کی فوجوں نے ایرانی افواج سے اپنی ذلت آمیز شکستوں کا انتقام لیا، اسی سال بدر کے میدان میں حق و باطل کا وہ تاریخی معرکہ برپا ہوا جس نے باطل کی کمر ہمیشہ کے لئے توڑ کر رکھ دی۔

مسلمانوں کی ہر فتح نصرت خداوندی کی مرہون منت ہوتی ہے لیکن مذکورہ بالا فتح کا نصرت خداوندی کے ساتھ ایک خصوصی تعلق تھا۔ کیونکہ مسلمانوں کی خوشی کو اللہ تعالیٰ نے "بنصر اللہ" (2) کے الفاظ سے وابستہ کر دیا تھا۔ اور یہ پیشین گوئی اس شان سے پوری ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کے غلاموں کی مدد کے لئے فرشتوں کے باقاعدہ لشکر بھیجے۔

جن حالات میں یہ پیشین گوئیاں کی گئیں وہ حالات ایسے تھے جن میں اس قسم کی پیشین گوئیوں کے پورا ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔ لیکن یہ پیشین گوئیاں پوری ہوئیں اور دوستوں

1۔ "ضیاء القرآن"، جلد 3، صفحہ 556

2۔ خدا کی مدد سے

اور دشمنوں سب نے ان کو پورا ہوتے دیکھا۔ ابی بن خلف تو پہلے فوت ہو گیا تھا لیکن اس کے وارثوں نے تسلیم کیا تھا کہ ان کا بزرگ شرط ہار چکا ہے اس لئے انہوں نے حسب وعدہ سو اونٹ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے حوالے کئے جو آپ نے حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق صدقہ کر دیئے۔

جس آدمی کے ضمیر کو تعصب کی آگ نے بھسم کر کے رکھ نہ دیا ہو اس کے لئے اس پیشین گوئی کو پورا ہوتے دیکھ لینے کے بعد قرآن حکیم کو کسی مخلوق کا کلام کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

مستشرقین جو کبھی بحیرئ راہب کو، کبھی مکہ کے عیسائی غلاموں کو، کبھی مکہ کے ذہنی ماحول کو اور کبھی حضور ﷺ کے تخلیقی تخیل کو قرآن حکیم کا مصدر قرار دیتے ہیں، ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ وہ بتائیں کہ جب رومیوں کے شہروں کے شہر ایرانیوں کے ہاتھوں نیست و نابود ہو رہے تھے اور رومی باہمی انتشار کے سبب کمزور سے کمزور تر ہو رہے تھے، اس وقت حضور ﷺ کے پاس یہ جاننے کا ذریعہ کیا تھا کہ چند سالوں میں جنگ کا نقشہ بدل جائے گا اور رومی جو آج ذلت آمیز شکستیں کھا رہے ہیں وہ کل غالب آجائیں گے اور ساتھ ہی یہ کہ آپ کے غلام جن کے لئے اہل مکہ نے جینا دوبھر کر دیا تھا وہ بھی اپنے دشمنوں پر غالب آجائیں گے؟

چار قوموں کے مستقبل کی تاریخ جو غیر متوقع انقلابات کے نتیجے میں جنم لینے والی تھی، اس کے متعلق صحیح صحیح معلومات حضور ﷺ کو کس انسانی وسیلے سے حاصل ہوئی تھیں؟

یقیناً ایسی معلومات انسانی ادراک کے دائرہ سے باہر ہیں، اس لئے مستشرقین کو ماننا پڑے گا کہ یہ پیشین گوئیاں حضور ﷺ نے کسی انسان کی مدد سے نہیں کیں بلکہ یہ پیشین گوئیاں رب قدوس نے خود فرمائی تھیں جو مستقبل کو بھی اسی طرح سے دیکھ رہا ہے جیسے حال کو دیکھتا ہے۔

تسخیر خلا کی پیشین گوئی

ایک فرانسیسی مستشرق اور سائنس دان مورس بکائلے (Maurice Bucaille) نے قرآن حکیم کی دو آیتیں دیکھیں تو وہ سمجھ گیا کہ ان آیات میں تسخیر خلا کے متعلق متعدد پیشین گوئیاں موجود ہیں۔ ہم قارئین کرام کی خدمت میں مستشرق مذکور کی کتاب کے

ایک اقتباس کا ترجمہ پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے:

"تسخیر خلا کے ضمن میں ہمیں قرآن حکیم کی تین آیات پر خصوصی توجہ دینی چاہئے۔ ایک آیت بغیر کسی ابہام کے بتارہی ہے کہ تسخیر خلا کے میدان میں انسان کیا کیا کامیابیاں حاصل کرے گا۔ دوسری دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ کفار مکہ کو بتارہا ہے کہ اگر وہ اپنے آپ کو آسمانوں کی سطح تک بلند کر سکیں تو انہیں کس قسم کی حیران کن صورت حال سے واسطہ پڑے گا۔ اللہ تعالیٰ کفار مکہ کے سامنے یہ بھی واضح کر رہا ہے کہ وہ نہ آسمانوں کی بلندیوں تک جاسکیں گے اور نہ ہی اس حیران کن صورت حال کا مشاہدہ ان کے مقدر میں ہے۔

پہلی آیت سورۃ رحمٰن کی آیت نمبر 33 ہے:

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ (1)

"اے گروہ انس و جن! اگر تم زمین و آسمان کے کروں سے پار ہو سکتے ہو تو ان سے پار ہو جاؤ۔ تم ان سے پار نہیں ہو سکو گے سوائے طاقت کے۔"

اس ترجمے کی قدرے وضاحت ضروری ہے۔

(ا) انگریزی زبان میں (if) کا لفظ شرط کو بیان کرنے کے لئے بولا جاتا ہے خواہ اس شرط کا حصول ممکن ہو یا ممکن نہ ہو۔ عربی ایک ایسی زبان ہے جو شرط کو مختلف درجوں میں تقسیم کر سکتی ہے جس سے مسئلہ زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ عربی میں شرط کے لئے تین حروف استعمال ہوتے ہیں۔ "اذا"، "ان" اور "لو"۔ "اذا" کا لفظ امکان کو بیان کرتا ہے۔ "ان" کا لفظ ممکن الحصول مفروضے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور "لو" کا لفظ ایسے مفروضے کے لئے استعمال ہوتا ہے جو ممکن الحصول نہ ہو۔ مذکورہ بالا آیت میں "ان" کا لفظ استعمال ہوا ہے جو ممکن الحصول مفروضے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا قرآن حکیم بتارہا ہے کہ اس آیت میں جس شرط کا ذکر ہو رہا ہے اس کا پورا ہونا قطعاً ممکن ہے۔ اس آیت کا یہ لفظی امتیاز ان تمام صوفیانہ تشریحات کو ختم کر دیتا ہے جو غلط طور پر اس آیت کی کی گئی ہیں۔

(ب) اللہ تعالیٰ اس آیت میں انسانوں اور جنوں سے مخاطب ہے، کسی مثالی وجود سے نہیں۔

1۔ سورۃ الرحمٰن: 33

(ج) پار جانا لفظ "نَفَذ" کا ترجمہ ہے۔ کزمیرسکی (Kazimirski) کی ڈکشنری کے مطابق اس لفظ کا مطلب ہے کسی جسم کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نکل جانا۔ جس طرح تیر جسم کے ایک سرے سے داخل ہو کر دوسرے سرے تک نکل جاتا ہے۔ گویا مطلب یہ ہوا کہ یہاں زمین و آسمان کے کروں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نکل جانے کا ذکر ہو رہا ہے۔

(د) جو انسان یہ کارنامہ انجام دیں گے انہیں طاقت (سلطان) اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہو گی۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ آج ہم جس چیز کو (شاید غلطی سے) تسخیر خلا کہتے ہیں اس آیت میں اس کے امکان کا ذکر ہو رہا ہے یعنی ایک روز انسان یہ کامیابی حاصل کرے گا۔ انسان کو یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ قرآن حکیم صرف آسمانوں سے باہر ہونے کا ذکر ہی نہیں کر رہا بلکہ زمینوں سے بھی پار ہونے کا ذکر کر رہا ہے۔ جس سے مراد زمین کی گہرائیوں کا کھوج لگانا ہے۔

دوسری دو آیتیں سورۃ الحجر کی آیت نمبر 14 اور 15 ہیں۔ اللہ تعالیٰ مکہ کے کفار کا ذکر فرما رہا ہے جیسا کہ مذکورہ سورۃ میں ان آیات کے سیاق وسباق سے ظاہر ہے:

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ۙ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ (1)

"اگر ہم ان کے لئے آسمانوں کے دروازے کھول دیں اور وہ مسلسل اوپر کی طرف اٹھتے رہیں تو وہ کہیں گے: ہماری آنکھوں کی بینائی یوں غیر واضح ہے جیسے نشے کی حالت میں ہوتی ہے۔ نہیں بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے۔"

مذکورہ بالا آیات میں اس حیرت کا ذکر ہو رہا ہے جو انسان کو کوئی ایسی چیز دیکھ کر ہوتی ہے جو اس کے تصور سے بھی بالاتر ہو۔ یہاں جملہ شرطیہ میں "لو" کا حرف استعمال ہوا ہے جو یہ بتا رہا ہے کہ جن لوگوں کا یہاں ذکر ہو رہا ہے، جہاں تک ان کا تعلق ہے، یہ شرط پوری نہیں ہو گی۔

1۔ سورۃ الحجر: 15-14

تسخیر خلا کا ذکر کرتے ہوئے ہمارے سامنے متن قرآن کی دو عبارتیں ہیں۔ ایک عبارت اس چیز کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو ایک روز انسان کے خداداد علم کی وجہ سے حقیقت کا روپ اختیار کرے گی۔ دوسری عبارت ایک ایسے واقعے کی طرف اشارہ کر رہی ہے جس کا مشاہدہ کفارمکہ نہیں کر سکیں گے۔ کیونکہ ان کے متعلق قرآن نے شرط کا جو حرف استعمال کیا ہے اس کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ جس شرط پر آئے وہ پوری نہیں ہوتی۔ البتہ اس واقعہ کا مشاہدہ کفارمکہ کے علاوہ دوسرے لوگ کریں گے جیسا کہ مذکورہ بالا پہلی آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ قرآنی عبارت اس انسانی ردعمل کو بیان کر رہی ہے جو غیر متوقع مناظر کے مشاہدے سے پیدا ہوتا ہے۔ جس سے کہ خلانوردوں کو واسطہ پڑے گا۔ یعنی بصری مدرکات کا ابہام، حالت نشہ اور جادو کے زیر اثر ہونے کا احساس۔ یہ بعینہ وہ تجربہ ہے جس سے خلاباز اس وقت سے مسلسل گزرتے رہے ہیں، جب سے 1961ء میں پہلا انسانی خلائی جہاز دنیا کے گرد چکر لگانے کی مہم پر نکلا تھا۔ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ انسان جب زمین کی فضا سے اوپر چلا جاتا ہے تو اسے آسمان اس طرح نیلگوں نظر نہیں آتا جس طرح کہ ہم اسے زمین سے دیکھتے ہیں۔ اس نیلگوں رنگ کا احساس سورج کی شعاعوں کے فضا میں جذب ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔ جو انسان زمین کی فضا سے بلند ہوتا ہے وہ ایک سیاہ آسمان کو دیکھتا ہے اور زمین کے گرد اسے ایک نیلگوں ہالہ سا محسوس ہوتا ہے۔ یہ احساس بھی سورج کی شعاعوں کے زمین کی فضا میں انجذاب سے جنم لیتا ہے۔ چاند کی کوئی فضا نہیں اس لئے وہ سیاہ آسمان کے پس منظر میں اپنی اصلی حالت پر نظر آتا ہے۔ یہ کلیتہً ایک نیا منظر ہے جو اپنے آپ کو اس انسان کے سامنے پیش کرتا ہے جو خلا میں موجود ہو۔ اس منظر کی تصویریں دور جدید کے انسانوں میں شہرت حاصل کر چکی ہیں۔

یہ ایک ایسی صورت حال ہے جس سے انسان کا متاثرنہ ہونا مشکل ہے۔ کیونکہ جب ہم متن قرآن کا موازنہ جدید سائنسی معلومات سے کرتے ہیں تو وہاں ہمیں ایسے بیانات نظر آتے ہیں جنہیں کسی ایسے انسان کے افکار کی طرف منسوب کرنا قطعاً ناممکن ہے جس کا زمانہ آج سے تقریباً چودہ صدیاں پیشتر کا ہے۔" (1)

مورس بکائلے کو قرآن حکیم میں جو پیشین گوئیاں نظر آئی ہیں مستشرقین بتائیں کہ

1۔ "دی بائیبل، دی قرآن اینڈ سائنس"، صفحہ 6-174

ساتویں صدی عیسوی کا ایک امی عرب الہام و وحی کے بغیر ایسی پیشین گوئیاں کیسے کر سکتا تھا۔

تسخیر ماہتاب کی پیشین گوئی

قرآن حکیم کی سورۃ الانشقاق میں ہے:

وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ

"قسم ہے چاند کی جب وہ پورا ہو جائے۔ یقیناً تم طبق در طبق اوپر جاؤ گے۔ پس انہیں کیا ہے پھر بھی ایمان نہیں لاتے۔"

مفسرین کرام نے مختلف زاویوں سے ان آیات کی تفسیر کی ہے لیکن ایک معاصر عالم(1) نے اس آیت کی ایک نئے زاویے سے تفسیر کرتے ہوئے یہ رائے قائم کی ہے کہ ان آیات میں واضح الفاظ میں مندرجہ ذیل پیشین گوئیاں موجود ہیں۔

1۔ انسان ایک طبق سے دوسرے طبق تک سفر کریں گے۔
2۔ ان کا یہ سفر زمین سے چاند تک ہو گا۔
3۔ سفر کرنے والے کسی چیز پر سوار ہو کر جائیں گے۔
4۔ جو لوگ یہ سفر کریں گے ان کی تعداد کم از کم تین ہو گی۔
5۔ یہ سفر اختیار کرنے والے غیر مسلم ہوں گے۔

وہ فرماتے ہیں: "ان آیات کریمہ میں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس سورۃ میں، ان آیات سے قبل، قیامت سے پہلے رونما ہونے والے واقعات کا ذکر ہے۔ اجرام فلکی، نظام کائنات اور خصوصاً نظام شمسی کا بیان ہے۔ اسی طرح اس میں کائنات کے اندر رونما پذیر ہونے والے مختلف تغیرات کا بھی بیان ہے۔ پھر مختلف قسمیں کھائی گئی ہیں اور آخر میں چاند کی قسم کھا کر کہا گیا ہے کہ تم ایک طبق سے دوسرے طبق تک پہنچو گے یعنی طبق در طبق پرواز کرو گے۔

چونکہ قرآن حکیم کی آیات کا ایک دوسری سے بڑا حکیمانہ ربط ہوتا ہے اس لئے طبق در طبق سفر کرنے کے ذکر سے پہلے چاند کی قسم میں ایک لطیف اشارہ ہے کہ اس سفر کا تعلق چاند سے ہو گا۔ گویا ایک طبق سے مراد زمین اور دوسرے طبق سے مراد چاند ہے۔ یہاں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر یہی کہنا مقصود ہوتا کہ انسان کا سفر چاند کی طرف ہو گا تو واضح

1۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری

طور پر چاند کا ذکر کر دیا جاتا۔ درحقیقت اس میں بھی ایک لطیف اشارہ ہے۔ اگر چاند کا ذکر کر دیا جاتا تو انسان کی سیر کائنات چاند تک محدود ہو جاتی لیکن انسان کے طائر ہمت کی پرواز چونکہ صرف چاند تک محدود نہیں بلکہ وہ تو کائنات کی وسعتوں کو ماپنے کی ہمت رکھتا ہے اور نہ جانے انسان کن کن اجرام فلکی پر آشیاں بند ہو گا اس لئے "طبق سے طبق تک" کے الفاظ استعمال کئے اور ابتداءمیں چاند کا ذکر کر دیا تاکہ پتہ چل جائے کہ انسان کائنات کی وسعتوں کو ماپنے نکلے گا تو اس کے اس سفر کا آغاز چاند سے ہو گا۔ اس سفر کے لئے "لترکبن" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کا مطلب ہے کسی چیز پر سوار ہونا۔ سواری کو مرکب کہتے ہیں اور گھوڑے پر سوار ہونے کے لئے جس چیز پر پاؤں رکھا جاتا ہے اس کو رکاب کہتے ہیں "گویا" "لترکبن" کا لفظ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ اوپر جانا کسی سواری کے ذریعے ہو گا۔

اَلرُّکُوْبُ فِی الْاَصْلِ کَوْنُ الْاِنْسَانِ عَلٰی ظَھْرِ حَیَوَانٍ وَّ قَدْ یُسْتَعْمَلُ فِی السَّفِیْنَۃِ

"رکوب اصل میں انسان کے کسی حیوان پر سوار ہونے کو کہتے ہیں لیکن اس کا استعمال جہاز کی سواری پر بھی ہوتا ہے۔"

جب تک سائنس اور ٹیکنالوجی نے ترقی نہیں کی تھی اور انسان کے زمین سے پرواز کر کے کسی دوسرے سیارے تک جانے کا تصور نہ تھا اس وقت "رکوب" کو اس کے اصل معنی میں استعمال کرنا مشکل تھا اس لئے مفسرین کرام اس کے مجازی معنی مراد لیتے رہے لیکن اب جب سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے انسان کی فضا اور خلا میں پرواز کو ممکن بنا دیا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ انسان مختلف سیاروں پر پہنچنے کی کوششوں میں مصروف ہے تو اب اس لفظ کو اس کے حقیقی مفہوم میں استعمال کرنا بلاشبہ جائز ہو گا۔

لَتَرْکَبُنَّ کے ساتھ لام تاکید اور نون ثقیلہ کا استعمال اس کے مفہوم میں دوہری تاکید پیدا کر رہا ہے کہ طبق در طبق کا یہ سفر ضرور واقع ہو گا۔ لَتَرْکَبُنَّ جمع کا صیغہ ہے اور جمع کا صیغہ عربی زبان میں کم از کم تین کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس سے یہ واضح اشارہ مل جاتا ہے کہ یہ سفر کرنے والے تعداد میں کم از کم تین ہوں گے۔ اور فَمَا لَھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ(1) کے الفاظ اس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ یہ سفر کرنے والے غیر مسلم ہوں گے۔

1۔ پس انہیں کیا ہے پھر بھی ایمان نہیں لاتے

آج سے کچھ عرصہ پہلے تسخیر ماہتاب کا حیران کن کارنامہ سرانجام دیا گیا تو یہ ساری پیشین گوئیاں حرف بحرف پوری ہوگئیں۔ انسان نے زمین سے چاند تک سفر کیا۔ اس کا سفر ایک سواری (خلائی جہاز) کے ذریعے تھا۔ سفر کرنے والوں کی تعداد تین تھی اور وہ تینوں غیر مسلم تھے۔"(1)

ان آیات کی یہ تفسیر انسان کے خلائی سفر کے بعد تو بالکل عام فہم معلوم ہوتی ہے لیکن جب تک انسان نے ابھی یہ کارنامہ سرانجام نہ دیا تھا، اس وقت ان آیات کی یہ تفسیر کرنا انسان کے لئے ممکن نہ تھا۔ ممکن ہے قرآن حکیم میں بے شمار آیات ایسی ہوں جو مستقبل کے واقعات کی طرف واضح اشارے کر رہی ہوں لیکن ہم چونکہ ان واقعات سے نابلد ہیں اس لئے ان آیات کے اشاروں کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ جوں جوں انسان ترقی کرتا جائے گا اس قسم کے راز منکشف ہوتے جائیں گے اور یہ حقیقت واضح تر ہوتی جائے گی کہ قرآن حکیم کسی انسان کا کلام نہیں بلکہ یہ خالق کائنات کا کلام ہے۔

ہم نے یہاں صرف نمونے کے طور پر چند پیشین گوئیوں کا ذکر کیا ہے ورنہ قرآن حکیم میں اس قسم کی بے شمار پیشین گوئیاں ہیں جن کو پورا ہوتے ہوئے انسانوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ صرف قرآن پاک ہی نہیں احادیث طیبہ میں بھی بے شمار ایسی پیشین گوئیاں ہیں جو حرف بحرف پوری ہوئیں۔

ہجرت کے سفر کے دوران سراقہ حضور ﷺ کو گرفتار کرنے کی غرض سے نکلا تھا اور پھر قدرت خداوندی کی نشانیاں دیکھ کر حضور ﷺ سے معافی کا خواستگار ہوا تھا۔ اس حالت میں، جب حضور ﷺ اپنے پیارے وطن سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیئے گئے تھے اور مکہ والے ہر طرف آپ کو تلاش کرتے پھر رہے تھے، آپ نے سراقہ کی معافی کی درخواست قبول کرنے کے بعد یہ پیشین گوئی فرمائی۔ آپ نے ارشاد فرمایا: سراقہ! وہ وقت کتنا عجیب ہو گا جب کسریٰ کے کنگن تمہارے ہاتھوں میں ہوں گے۔ جب یہ پیشین گوئی کی گئی تھی اس وقت عقل سے فتویٰ لینے والا کوئی شخص یہ بات تسلیم نہیں کر سکتا تھا کہ یہ پیشین گوئی پوری بھی ہوگی لیکن دنیا نے اس پیشین گوئی کو پورا ہوتے ہوئے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

قرآن حکیم وحی متلو ہے اور حدیث پاک وحی غیر متلو۔ قرآن و حدیث میں جتنی پیشین

1۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری، "ایمان بالکتب"، (منہاج القرآن لاہور،)، صفحہ 75-69، (ملخص)

گوئیاں کی گئیں وہ سب پیشین گوئیاں کرنے والا وہ رب قدوس ہے جس کے علوم کی وسعتوں کا کوئی انسان تصور بھی نہیں کر سکتا۔ نہ قرآنی پیشین گوئیوں کو حضور ﷺ کے تخیل کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی احادیث طیبہ کی پیشین گوئیوں کو آپ کی کاوش فکر کا نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ قرآن وحدیث کی جو پیشین گوئیاں روز روشن کی طرح سچی ثابت ہوئیں وہ قرآن حکیم کے کتاب اللہ اور حضور ﷺ کے رسول اللہ ہونے کا ناقابل تردید ثبوت ہیں۔

مستشرقین اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تو ان پیشین گوئیوں کی توجیہہ کریں جو قرآن حکیم کے صفحات میں موجود ہیں اور جن کے سچ ثابت ہونے کا ثبوت اقوام عالم کی تاریخیں فراہم کر رہی ہیں۔

سائنسی موضوعات پر قرآن حکیم کے معجزانہ بیانات

انسان نے سائنس کے میدان میں بتدریج ترقی کی ہے۔ آج کائنات کے متعلق انسان جن معلومات سے بہرہ ور ہے، قدیم زمانے کے انسان کے لئے ان کا تصور بھی ممکن نہ تھا۔ سائنس نے کائنات کے متعلق مختلف موضوعات پر بحث کی ہے۔ اس نے کائنات کی تخلیق، زمین و آسمان کے وجود میں آنے، کرہ ارضی پر زندگی کے ظہور وارتقاء اور حضرت انسان کے زمین پر ظاہر ہونے کے متعلق مختلف نظریے پیش کئے ہیں۔ سائنس دان مسلسل اپنے متقدمین کے پیش کردہ نظریات کی توثیق یا تردید کرتے رہے ہیں۔

ٹیکنالوجی کی ترقی نے انسان کو اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے کہ آج سائنس کے بے شمار نظریات ثابت شدہ حقائق کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ عملی طور پر سائنس نے کائنات کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی ان گنت قوتوں کا کھوج لگایا ہے اور ان قوتوں کو مسخر کر کے سائنس نے انسانی زندگی میں حیران کن انقلاب برپا کر دیا ہے۔ آج انسان ہوائی جہازوں پر سفر کر رہا ہے۔ خلائی جہاز کائنات کے ان گوشوں کا کھوج لگانے کی کوششوں میں مصروف ہیں جو ابھی انسانوں کی آنکھوں سے اوجھل ہیں۔ فاصلے سمٹ گئے ہیں۔ ہزاروں میل کے فاصلے پر جو کچھ ہو رہا ہے، ہم اسے دیکھ بھی رہے ہیں اور وہاں سے اٹھنے والی آوازوں کو سن بھی رہے ہیں۔ کمپیوٹر کی ایجاد نے انسانی زندگی کو ایک بالکل نئے رخ پر لگا دیا ہے۔

آج کا انسان تو سائنسی ترقی کے ان مراحل کے متعلق بھی سوچ سکتا ہے جہاں تک ابھی

سائنس نہیں پہنچی۔ لیکن انسانی تاریخ کا وہ دور جب نہ کوئی سائنس کا نام جانتا تھا اور نہ ٹیکنالوجی کا۔ جب نہ تحقیق کائنات کی حقیقت کو معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ تھا اور نہ کائنات کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی طاقتوں کے متعلق حصول علم کا کوئی ذریعہ موجود تھا، اس وقت اگر کسی انسان سے یہ کہا جاتا کہ انسان ایک دن فضا میں اڑے گا اور ہزاروں میل کا سفر چند گھنٹوں میں طے کرے گا، تو کوئی اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوتا۔

آج کے کسی غیر جانبدار انسان کے سامنے اگر یہ سوال رکھا جائے کہ سائنس نے بیسویں صدی عیسوی میں جو انکشافات کئے ہیں وہی انکشافات ساتویں صدی عیسوی میں بھی ہو چکے ہیں اور ساتھ ہی ساتویں صدی عیسوی میں یہ انکشافات کرنے والے نے یہ دعویٰ بھی کیا تھا کہ ان انکشافات میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں، تو یقیناً وہ غیر جانبدار شخص یہ کہے گا کہ ساتویں صدی عیسوی کا کوئی انسان قطعاً اس قابل نہ تھا کہ وہ اس قسم کے انکشافات کر سکتا۔

ہم اس ضمن میں اپنا مقدمہ انسانی ضمیر، انسانی عقل بلکہ خود انسانیت کی عدالت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

چودہ سو سال پہلے مکہ کے شہر میں ایک انسان ظاہر ہوا۔ وہ یتیم بھی تھا، اس کے پاس دولت و ثروت کے انبار بھی نہ تھے لیکن خاندانی شرافت اور ذاتی وجاہت میں کوئی اس کا مدمقابل نہ تھا۔ اس کی صداقت وامانت کے مظاہرے دیکھ کر اس کی ہم قوم اسے صادق و امین کا لقب دیتے تھے اور اہم قومی امور میں اس کو حکم بنانے پر فخر محسوس کرتے تھے۔ وہ ہر ایک کی آنکھ کا تارا تھا۔ ہر کوئی اس کی عزت کرتا تھا۔ اس کی ذاتی خوبیاں اوج کمال پر تھیں لیکن اس نے کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہ کیا تھا۔ وہ نہ لکھنا جانتا تھا اور نہ پڑھنا جانتا تھا۔ ایک روز اس نے اعلان کر دیا کہ اسے رب قدوس نے اپنا نبی بنایا ہے اور اس کے پاس فرشتہ آتا ہے جو خدا کی طرف سے ایک کلام لاتا ہے۔ اس کلام میں ان عقائد و نظریات کی تردید کی گئی تھی جو اس کی قوم میں مروج تھے۔

قوم نے اس کو اس نئے دین کی تبلیغ سے روکنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ انہوں نے اس سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے دعوے کے ثبوت کے لئے کچھ نشانیاں دکھائے۔ اس نے اپنی قوم کو بے شمار نشانیاں دکھائیں لیکن کہا کہ میرا سب سے بڑا معجزہ اور میرے دعویٰ کی

صداقت کی سب سے بڑی نشانی وہ کتاب ہے جو میں تمہیں پڑھ کر سناتا ہوں۔ ساتھ ہی اس نے اپنی قوم کو چیلنج کیا کہ اگر تم میرے دعویٰ میں شک کرتے ہو تو اس کتاب کی ایک سورۃ جیسی سورۃ بنا کر دکھا دو۔

اس کی قوم کو اپنی زبان دانی، اپنی فصاحت وبلاغت اور اپنی قادر الکلامی پر ناز تھا لیکن وہ اس چیلنج کو قبول نہ کر سکے۔ اس کے سب سے بڑے دشمن اس کے کلام کو چھپ چھپ کر سنتے۔ ان میں سے اکثر نے اس کلام کی عظمتوں کو دیکھ کر تسلیم کیا کہ یہ انسانی کلام نہیں۔ کئی اس کلام کی ایک یا چند آیتیں سن کر اس دین میں شامل ہو گئے جس کی طرف یہ کلام دعوت دیتا تھا۔ جو لوگ ابتداء میں ہٹ دھرمی پر ڈٹے رہے وہ بھی اس کی دعوت کے آخری سالوں میں اس کی صداقت کی قوت کے سامنے نہ ٹھہر سکے اور انہوں نے بھی آخر کار اس دین کے جھنڈے کو اکناف عالم میں لہرانے کا عزم مصمم کر لیا۔

اس کے پیروکاروں نے علاقے فتح کئے، سلطنتیں قائم کیں، دنیا کو علوم و معارف سے بھر دیا اور آج دنیا میں اس کے پیروکاروں کی تعداد ایک ارب کے لگ بھگ ہے۔ اس کی لائی ہوئی کتاب آج بھی اپنی اصلی شکل میں موجود ہے اور آج بھی وہ چیلنج کر رہی ہے کہ جو شخص اس کے کلام کے خداوندی ہونے کو تسلیم نہیں کرتا وہ اس کی ایک سورۃ جیسی سورۃ بنانے کے چیلنج کو قبول کرے۔ ساتویں صدی عیسوی کے لوگوں کیلئے اس کا چیلنج ادبی میدان میں تھا اور بیسویں صدی عیسوی کے لوگوں کے لئے اس کا چیلنج علم اور سائنس کی زبان میں ہے۔

سائنس نے بیسویں صدی عیسوی میں جو انکشافات کئے ہیں، ساتویں صدی عیسوی میں منظر عام پر آنے والی یہ کتاب ان انکشافات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ تخلیق کائنات کے متعلق سائنس نے جو کچھ معلوم کیا ہے اور جس کے صحیح ہونے کا اسے یقین ہے، وہ اس کتاب میں موجود ہے۔ یہ کتاب بتا رہی ہے کہ کائنات کے موجودہ شکل اختیار کرنے سے پہلے دخانی مادہ موجود تھا، زمین و آسمان جڑے ہوئے تھے، ان کو الگ الگ کیا گیا اور ہر زندہ شے کی تخلیق پانی سے ہوئی۔ اس کتاب نے کئی جہانوں کا تصور دیا، ایک سے زیادہ زمینوں اور آسمانوں کا تصور دیا اور اس نے شکم مادر میں بچے کی تیاری کے مراحل کی تفصیل بیان کی۔ یہ اور اس قسم کی بے شمار چیزیں وہ ہیں جن کا علم سائنس کو یا تو موجودہ صدی میں ہوا ہے اور یا سائنس ابھی اس حقیقت کو پانے کے لئے مصروف جدوجہد ہے۔

ہمارا موقف یہ ہے کہ یہ کلام اس امی عرب کا نہ تھا بلکہ اس کے علیم و خبیر رب کا تھا جس کے علوم سے کائنات کا کوئی ذرہ مخفی نہیں۔ لیکن وہ لوگ جو ہم سے زیادہ سائنس کو جانتے ہیں اور جن کو اپنے عالم ہونے پر ناز ہے وہ کہتے ہیں کہ وہ کتاب اس شخص نے خود لکھی تھی اور اس کے لئے کچھ معاصرین نے اس کے ساتھ تعاون کیا تھا یا اس نے سابقہ سماوی صحف کی نقل کی تھی۔

ہم انسانی عقل اور انسانی ضمیر سے یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا علوم کائنات کے اس دائرۃ المعارف کو ساتویں صدی عیسوی کے ایک امی عرب کی تصنیف کہنا زیادہ قرین قیاس ہے یا اسے خدائے وحدہ لاشریک کا کلام کہنا صحیح ہے جس نے ہر زمانے میں بنی نوع انسان کو ایسے علوم سے بہرہ ور کیا ہے جو انسانی عقل کے احاطہ ادراک سے ماوراء تھے۔

حق میں یہ قوت ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان لوگوں سے بھی تسلیم کروالیتا ہے جنہیں اس کے دامن میں پناہ لینے کی توفیق نہیں ہوتی۔ ولید بن مغیرہ اور عتبہ بن ربیعہ جیسے لوگ اس خدائی نور کے دشمن ضرور تھے لیکن وہ بھی اس نور کو ظلمت نہ کہہ سکے۔ مستشرقین نے بھی اسلام کے متعلق اپنی قوموں کی ایسی برین واشنگ کی ہے کہ ذہنی بیداری کے اس دور میں بھی، یورپ ان دیومالائی کہانیوں سے پیچھا چھڑانے کے لئے تیار نہیں جو قرون وسطی میں تعصب و عناد کی بنا پر اسلام کے متعلق گھڑی گئیں۔ لیکن تعصب کی اس تاریک رات میں بھی کہیں کہیں انصاف کے چراغ ٹمٹماتے نظر آتے ہیں۔

ہم نے سطور بالا میں انسانی ضمیر سے جو سوالات پوچھے ہیں، ان کے جوابات ہمیں ایک فرانسیسی مستشرق کی تحریروں میں ملے ہیں۔ فرانسیسی مستشرق مورس بکائلے (Maurice Bucaille) نے قرآن حکیم کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اس نے بائبل اور قرآن دونوں کے بیانات کو جدید سائنسی علوم کی روشنی میں پرکھا ہے اور وہ جس نتیجے پر پہنچا ہے اسے اس نے اپنی کتاب (The Bible, The Quran and science) میں بیان کیا ہے۔ یہاں ہم پہلے اس کے چند تاثرات نقل کرتے ہیں اور بعد میں قرآن حکیم کی ان آیات کریمہ کی ایک جھلک قارئین کرام کی خدمت میں پیش کریں گے جنہوں نے "مورس بکائلے" کے قلم کو ان تاثرات کے اظہار پر مجبور کیا ہے۔ مستشرق مذکور لکھتا ہے:

"These scientific considerations, which are very specific to the Quran, greatly surprised me at first.

Up until then, I had not thought it possible for one to find so many statements in a text compiled more than thirteen centuries ago referring to extremely diverse subjects and all of them totally in keeping with modern scientific knowledge". (1)

"یہ سائنسی خیالات جن کا قرآن (حکیم) کے ساتھ بڑا خصوصی تعلق ہے، انہوں نے ابتدا میں مجھے حیرت میں مبتلا کر دیا۔ اس وقت تک میں نے یہ سوچا تک بھی نہ تھا کہ ایک کتاب جو تیرہ صدیوں سے زیادہ عرصہ پہلے تالیف ہوئی، اس میں بے شمار ایسے بیانات کا موجود ہونا ممکن ہے جو سب کے سب جدید سائنسی معلومات سے کلیۃً ہم آہنگ ہوں۔"

مستشرق مذکور چند سطریں بعد لکھتا ہے:

"What initially strikes the reader confronted for the first time with a text of this kind is the sheer abundance of subjects discussed: the creation, astronomy, the explanation of certain matters concerning the earth, and the animal and vegetabe kingdoms and human reproduction". (2)

"جس قاری کو اس قسم کے متن سے پہلی بار واسطہ پڑتا ہے، اس کے لئے جو چیز سب سے زیادہ حیران کن ہوتی ہے، وہ ان موضوعات کی کثرت ہے جو اس کتاب میں زیر بحث لائے گئے ہیں:

تخلیق کائنات، فلکیات اور ایسے معاملات کی تشریح جن کا تعلق زمین، نباتات، حیوانات اور انسانی افزائش نسل سے ہے۔"

"Whereas monumental errors are to be found in the Bible, I could not find a single error in the Quran. I had to stop and ask myself: f a man was author of the Quran, how could he have written facts in the seventh century A.D. that today are shown to be in keeping with modern scientific knowledge? There

---

1۔ "دی بائبل، دی قرآن اینڈ سائنس"، صفحہ 128

2۔ ایضاً، صفحہ 129

was absolutely no doubt about it: the text of the Quran we have today is most definitely a text of the period ....., What human explanation can there be to this observation? In my opinion there is no explanation :there is no special reason why an inhabitant of the Arabian Peninsula should at a time when king Dagobert was reigning in France (629-639 A.D) have had scientific knowledge on certain subjects that was ten centuries ahead of our own." (1)

"بائبل میں بے شمار غلطیاں موجود ہیں لیکن میں قرآن حکیم میں کسی ایک غلطی کی نشاندہی نہ کر سکا۔ میں مجبور ہو کر رک گیا اور اپنے آپ سے سوال کیا۔ اگر کوئی انسان ہی قرآن کا مصنف تھا تو وہ ساتویں صدی میں ایسی چیزیں کیسے لکھ سکتا تھا جن کے متعلق آج یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ جدید سائنسی معلومات سے کلیۃً ہم آہنگ ہیں۔ اس بارے میں قطعاً کوئی شک نہیں کہ آج قرآن (حکیم) کا جو متن ہمارے سامنے ہے یہ بعینہ وہی ہے جو ساتویں صدی میں تھا۔ اس مشاہدے کی انسانی توجیہہ کیا ہو سکتی ہے؟ میری رائے میں اس کی کوئی انسانی توجیہہ ممکن نہیں۔ اس بات کی کوئی خاص وجہ نظر نہیں آتی کہ جس زمانے میں فرانس پر "ڈیگوبرٹ" بادشاہ حکومت کر رہا تھا (629-639) اس زمانے میں جزیرہ عرب کے ایک شخص کے پاس مختلف موضوعات پر اتنی سائنسی معلومات ہوں جو خود ہمارے دور سے بھی دس صدیاں آگے کی ہیں۔"

وہ مستشرقین جو قرآن حکیم میں موجود سائنسی بیانات کی توجیہہ یہ کرتے ہیں کہ عرب سائنس کے میدان میں اپنے ہم عصروں سے بہت آگے تھے، محمد ﷺ نے یہ سائنسی معلومات ان سے حاصل کی ہوں گی، ان مستشرقین کی اس مضحکہ خیز تحقیق کا جواب دیتے ہوئے "مورس بکائلے" لکھتا ہے۔

"Only ignorance of such religious and secular data can lead to the following bizzare suggestion I have

1۔ "دی بائبل، دی قرآن اینڈ سائنس"، صفحہ 129

heard several times: If surprising statements of a scientific nature exist in the Quran, they may be accounted for by the fact that arab scientists were far ahead of their time and Muhammad was influenced by their work. Anyone who knows any thing about Islamic history is aware that the period of the Middle Ages which saw cultural and scientific upsurge in the Arab world came after Muhammad and would not therefore indulge in such whims. Suggestions of this kind are particularly off the mark in that the majority of scientific facts which are either suggested or very clearly recorded in the Quran have only been confirmed in modern times."(1)

"صرف دینی اور سیکولر معلومات سے ناواقفیت ہی انسان کو ایسے نرالے خیالات کے اظہار کی اجازت دے سکتی جو بارہا میں نے سنے ہیں کہ: "اگر سائنسی نوعیت کے حیران کن بیانات قرآن حکیم میں موجود ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب سائنس دان اپنے دور کے دیگر سائنس دانوں سے بہت آگے تھے، محمد (ﷺ) ان سائنسدانوں سے متاثر ہوں گے۔ "جس شخص کو اسلامی تاریخ کی ابجد سے بھی واقفیت ہے وہ جانتا ہے کہ قرون وسطیٰ کا زمانہ جس میں دنیائے عرب نے سائنسی اور سماجی میدانوں میں حیرت انگیز ترقی کی، وہ زمانہ محمد (ﷺ) سے بعد کا ہے۔ اس لئے اس دور کو اس قسم کے مفروضے گھڑنے کے لئے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ اس قسم کے خیالات خصوصی طور پر اس لئے بھی بے بنیاد ہیں کہ قرآن حکیم نے جن سائنسی حقائق کی طرف اشارے کئے ہیں یا ان کو واضح طور پر بیان کر دیا ہے، سائنس نے ان میں سے اکثر کی تصدیق دور حاضر میں کی ہے۔"

مستشرق مذکور کہتا ہے کہ قرآن حکیم میں ایسے سائنسی انکشافات بھی ہیں جن تک ابھی سائنس نہیں پہنچ سکی لیکن وہ ان تک پہنچنے کے لئے مصروف تگ ودو ہے۔ وہ کہتا ہے:

1۔ "دی بائبل، دی قرآن اینڈ سائنس"، صفحہ 129

"In this context, I think I may have found references in the Quran to the presence of Planets in the universe that are similar to the earth. It must be added that many scientists think this is a perfectly feasible fact, although modern data cannot provide any hint of certainty".(1)

"اس ضمن میں میرا خیال ہے کہ مجھے قرآن (حکیم) میں ایسے بیانات نظر آئے ہیں جو اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ کائنات میں کچھ ایسے سیارے موجود ہیں جو بالکل زمین کے مشابہ ہیں۔ یہاں اس بات کا اضافہ کرنا ضروری ہے کہ اکثر سائنس دان اس کو ایک مکمل طور پر ممکن حقیقت تسلیم کرتے ہیں اگرچہ موجودہ سائنسی معلومات نے ابھی تک اس بات کے یقینی ہونے کا کوئی اشارہ نہیں دیا۔"

حضرت محمد ﷺ کو مصنف قرآن کہنے والوں سے مخاطب ہو کر "مورس بکائیے" کہتا ہے:

"The above observation makes the hypothesis advanced by those who see Muhammad as the author of the Quran quite untenable. How could a man, from being illiterate become the most important author, in terms of literary merit, in the whole of Arabic Literature? How could he then pronounce truths of scientific nature that no other human being could possibly have developed at the time, and all this without once making the slightest error in his pronouncements on the subject ? (2)

"یہ مشاہدہ ان لوگوں کے دعوے کو قطعی طور پر ناقابل مدافعت بنا دیتا ہے جو محمد (ﷺ) کو قرآن کا مصنف قرار دیتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک شخص ناخواندگی کی حالت سے ابھرتا اور اہم ترین مصنف بن جاتا اور اس کی تصنیف اپنی ادبی خوبیوں کی وجہ سے تمام ادب عربی پر چھا جاتی اور یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ شخص سائنسی نوعیت کی ایسی سچائیوں کا

1۔"دی بائبل، دی قرآن اینڈ سائنس"، صفحہ 130

2۔ایضاً، صفحہ 132

اعلان کرتا جن تک اس دور کے کسی دوسرے انسان کی رسائی نہ تھی اور ان اعلانات میں اس سے ذرہ برابر غلطی سرزد نہ ہوتی؟"

آخر میں اپنا فیصلہ سناتے ہوئے "مورس بکائلے" لکھتا ہے:

"They will lead to the conclusion that it is inconceivable for a human being living in the seventh century A.D. to have expressed assertions in the Quran on highly varied subjects that do not belong to his period and for them to be in keeping with what was to be revealed only centuries later. For me, there can be no human explanation to the Quran".(1)

"ان خیالات سے یہ نتیجہ برآمد ہو گا کہ یہ بات بالکل ناقابل تصور ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں رہنے والا ایک انسان قرآن میں مختلف موضوعات پر ایسی چیزیں بیان کرتا جن کا تعلق اس کے زمانے سے نہ تھا اور اس کے بیانات ان حقائق سے بالکل ہم آہنگ ہوتے جن کا انکشاف کئی صدیاں بعد ہوا۔ میرے نزدیک قرآن (حکیم) کے انسانی کلام ہونے کی کوئی توجیہ ممکن نہیں۔"

مستشرق مذکور تخلیق کائنات کے متعلق بائبل اور قرآن کے بیانات کا سائنسی معلومات کے حوالے سے جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ یہود ونصاریٰ کی طرف سے حضور ﷺ پر لگایا جانے والا یہ الزام قطعاً بے بنیاد ہے، کہ آپ نے بائیبل سے معلومات اخذ کر کے قرآن میں شامل کر دیں، کیونکہ تخلیق کائنات کے متعلق بائیبل کے بیانات جدید سائنس سے متصادم ہیں جب کہ قرآن حکیم کا کوئی ایک بیان بھی ایسا نہیں جو جدید سائنسی معلومات سے متصادم ہو۔ وہ لکھتا ہے:

"As for as the creation is concerned, this accusation is totally unfounded. How could a man living fourteen hundred years ago have made corrections to the existing description to such an extent that he eliminated scientifically inaccurate material and, on his own initiative, made statements that science has

---

1۔ "دی بائیبل، دی قرآن اینڈ سائنس"، صفحہ 132

only in the present day been able to verify. This hypothesis is completely untenable. The description of the creation given in the Quran is quite different from the one in the Bible." (1)

"جہاں تک تخلیق کائنات کا تعلق ہے، یہ نظریہ قطعاً بے بنیاد ہے۔ چودہ صدیاں پہلے کے ایک انسان کے لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ پہلے سے موجود صحیفے کی اصلاح کرتا اور وہ بھی اس حد تک کہ وہ سارا مواد نکال دیتا جو سائنسی طور پر غلط تھا اور اپنی طرف سے ایسے بیانات کا اضافہ کرتا جن تک سائنس دور حاضر میں پہنچی ہے۔ یہ مفروضہ بہت کمزور ہے۔ قرآن (حکیم) میں تخلیق کا بیان بائبل کے بیان سے قطعاً مختلف ہے۔"

نظم کائنات کے متعلق قرآن حکیم اور بائبل کے بیانات کا سائنسی معلومات سے موازنہ کرنے کے بعد مستشرق مذکور لکھتا ہے:

"The organization of the world is treated in neither the Gospels nor the Old Testament (except for a few notions whose general inaccuracy we have already seen.) The Quran however deals with this subject in depth. What it describes is important, but so is what it does not contain. It does not in fact provide an account of the theories prevalent at the time of the revelation that deal with the organization of the celestial world, theories that science was later to show were inaccurate". (2)

"نظم کائنات کا ذکر نہ تو انجیلوں میں ہے اور نہ ہی عہد نامہ قدیم میں (سوائے چند خیالات کے جن کا غلط ہونا ہم پہلے بیان کر چکے ہیں) البتہ قرآن اس موضوع پر تفصیل سے بحث کرتا ہے۔ قرآن نظم کائنات کے متعلق ان نظریات سے بالکل خالی ہے جو نزول قرآن کے وقت مروج تھے اور جن کو سائنس مستقبل میں باطل ثابت کرنے والی تھی۔"

1۔ "دی بائبل، دی قرآن اینڈ سائنس"، صفحہ 154

2۔ ایضاً، صفحہ 157

قرآن حکیم نے زمین کے متعلق جو حقائق بیان کئے ہیں ان کے متعلق مستشرق مذکور کہتا ہے کہ اس موضوع پر بھی قرآن حکیم ان نظریات وخیالات سے قطعاً پاک ہے جو نزول قرآن کے وقت مشہور تھے۔ یہاں وہ قرآن حکیم کی ایک عظیم خصوصیت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

"On the one hand, these verses express simple ideas readily understood by those people to whom, for geographical reasons, the Quran was first directed: the inhabitants of Mecca and Medina, the Bedouins of the Arabian peninsula. On the other hand, they contain reflections of general nature from which a more cultivated public of any time and place may learn something instructive, once it starts to think about them: this is a mark of the Quran's universality". (1)

"ان آیات میں ایک طرف تو وہ عام فہم نظریات ہیں جن کو مکہ اور مدینہ کے باسی اور جزیرہ عرب کے بدو بھی سمجھتے تھے جن کو، جغرافیائی وجوہات کی بنا پر، قرآن کا پہلا مخاطب بنایا گیا۔ دوسری طرف ان آیات میں ایسی چیزیں بھی موجود ہیں جن میں کسی بھی زمانے یا کسی بھی علاقے کے مہذب ترین معاشروں کے لئے بھی مفید ہدایات موجود ہیں بشرطیکہ وہ ان میں غور کرنے کی زحمت گوارا کریں۔ یہ قرآن حکیم کے پیغام کے عالمگیر ہونے کی دلیل ہے۔"

ہر جاندار کے پانی سے پیدا کئے جانے کے قرآنی بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے مستشرق مذکور لکھتا ہے:

"Whether it deals therefore with the origins of life in general, or the element that gives birth to plants in the soil, or the seed of animals, all the statements contained in the Quran on the origin of life are strictly in accordance with modern scientific data. None of

---

1۔ "دی بائیبل، دی قرآن اینڈ سائنس"، صفحہ 177

the myths on the origins of life that abounded at the time the Quran appeared are mentioned in the text".(1)

"اس آیت کا اشارہ عام زندگی کے آغاز کی طرف ہو یا اس عنصر کی طرف جو مٹی میں پودے کی پیدائش کا سبب بنتا ہے یا اس کا اشارہ حیوانی نطفے کی طرف ہو، قرآن حکیم میں آغاز حیات کے متعلق جتنے بیانات ہیں وہ جدید سائنسی معلومات سے کلیۃً ہم آہنگ ہیں۔ قرآن کے ظہور میں آنے کے زمانے میں آغاز حیات کے متعلق جتنے افسانے مشہور تھے، ان میں سے کسی کا بھی قرآن میں ذکر نہیں۔"

مادہ جانوروں کے پیٹ میں دودھ کی تیاری کا عمل، جس کا انکشاف سائنس نے دور جدید میں کیا ہے، اس کا ذکر قرآن حکیم میں دیکھ کر مستشرق مذکور ان تاثرات کا اظہار کرتا ہے:

"I consider that existence in the Quran of the verse referring to these concepts can have no human explanation on account of the period in which they were formulated". (2)

"میرے خیال میں قرآن میں ایسی آیت کا موجود ہونا جو ان نظریات کو بیان کرتی ہو، اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی کوئی انسانی توجیہ ممکن نہیں۔ کیونکہ جس زمانے میں یہ نظریات پیش کیے گئے اس زمانے میں کسی انسان کے لئے یہ کام ممکن نہ تھا۔"

رحم مادر میں بچے کی تیاری کے مراحل کو قرآن حکیم کی متعدد آیات میں دیکھ کر مستشرق مذکور لکھتا ہے:

"The Quranic description of certain stages in the development of the embryo corresponds exactly to what we today know about it, and the Quran does not contain a single statement that is open to criticism from modern science". (3)

"جنین کے ارتقائی مراحل کا قرآنی بیان ان معلومات کے بالکل مطابق

1۔ "دی بائبل، دی قرآن اینڈ سائنس"، صفحہ 199

2۔ ایضاً، صفحہ 210

3۔ ایضاً، 218

ہے جو اس موضوع پر آج ہمیں حاصل ہیں۔ اور قرآن میں ایک بھی بیان ایسا نہیں جس پر علم جدید کو تنقید کرنے کا موقعہ مل سکے۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آباؤ اجداد کے متعلق بائیبل کے بیان کو غلطیوں سے پر اور قرآن کے ان غلطیوں سے پاک ہونے پر تبصرہ کرتے ہوئے "مورس بکائیلے" لکھتا ہے:

"Once again, this fact must be noted if one is to be objective, and yet again its great importance appears very clearly in the face of the unfounded statements which are made claiming that Muhammad, the author of the Quran, largely copied the Bible. One wonders in that case who or what reason compelled him to avoid copying the passages the Bible contains on Jesus's ancestry, and to insert at this point in the Quran the corrections that put his text above any criticism from modern knowledge. The Gospels and Old Testament texts are quite opposite; from this point of view they are totally unacceptable".(1)

"جو آدمی غیر جانبدار رہنا چاہتا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس حقیقت کا دوبارہ جائزہ لے۔ اور یہ بات اس لئے اور بھی زیادہ ضروری ہو جاتی ہے کہ اس قسم کے بے بنیاد دعوے کئے جاتے ہیں کہ محمد (ﷺ) جو (بقول ان کے) قرآن کے مصنف ہیں، انہوں نے زیادہ تر بائیبل کی نقل کی ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو انسان حیران ہوتا ہے کہ وہ کون شخص تھا یا وہ کون سے اسباب تھے جنہوں نے محمد (ﷺ) کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ بائیبل کی ان عبارتوں کو نقل نہ کریں جن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آباؤ اجداد کا تذکرہ ہے اور ان کی جگہ ایسی اصلاحیں شامل کتاب کریں جو ان کی کتاب کو جدید سائنس کی طرف سے ہر قسم کے اعتراضات سے بالاتر بنا دیتی ہیں۔ انجیلوں اور عہد نامہ قدیم کے متون اس کے بالکل برعکس ہیں۔ اس موضوع پر ان

1۔ "دی بائیبل، دی قرآن اینڈ سائنس"، صفحہ 228

کے بیانات قطعاً ناقابل قبول ہیں۔"

طوفان نوح کا بیان بائبل میں بھی ہے اور قرآن حکیم نے بھی اس واقعے کو متعدد مقامات پر بیان فرمایا ہے۔ "مورس بکائلے" کی تحقیق کا نچوڑ یہ ہے کہ بائبل میں طوفان نوح کے متعلق جو بیانات ہیں، ان میں سے متعدد ایسے ہیں جو جدید معلومات کی روشنی میں قطعاً غلط ہیں جبکہ طوفان نوح کے قرآنی بیان میں ایک بھی چیز ایسی نہیں جسے جدید سائنس چیلنج کر سکے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

"One might ask if it is possible that, between the time of the Biblical narration and the one contained in the Quran, man could have acquired knowledge that shed light on this event. The answer is no, because from the time of the Old Testament to the Quran, the only document man possessed on this ancient story was the Bible itself. If human factors are unable to account for the changes in the narrations which affected their meaning with regard to modern knowledge, another explanation has to be accepted, i.e. a Revelation which came after the one contained in the Bible." (1)

"آدمی یہ سوال کر سکتا ہے کہ کیا بائبل کے زمانے اور قرآن کے زمانے کے درمیانی عرصہ میں انسان کی رسائی ایسی معلومات تک ہو گئی تھی جو اس واقعے پر روشنی ڈال سکتی تھیں۔ اس کا جواب نفی میں ہے کیونکہ عہد نامہ قدیم کے زمانے سے قرآن کے زمانے تک وہ واحد دستاویز جس میں اس قدیم کہانی کا ذکر ہے وہ بذات خود بائبل ہے۔ اس واقعے کے قرآنی بیان میں بائبل کے بیان کی نسبت جو ایسی تبدیلیاں ہیں جنہوں نے جدید سائنس کے نقطہ نگاہ سے ان بیانات کے مفہوم کو متاثر کیا ہے، اگر ان تبدیلیوں کی کوئی انسانی توجیہ ممکن نہیں تو اس کی دوسری توجیہ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ قرآن ایک الہامی کتاب ہے جو بائبل کے

1۔ "دی بائبل، دی قرآن اینڈ سائنس"، صفحہ 235

بعد نازل ہوئی۔"

"موریس بکائیلے" نے مندرجہ ذیل الفاظ میں قرآن حکیم کو خراج تحسین پیش کرنے کے ساتھ اپنی کتاب کو ختم کیا ہے:

"In view of the state of knowledge in Muhammad's day, it is inconceivable that many of the statements in the Quran which are connected with science could have been the work of a man. It is, moreover, perfectly legitimate, not only to regard the Quran as the expression of a revelation, but also to award it a very special place on account of the guarantee of authenticity it Provides and the presence in it of scientific statements which, when studied today, appear as a challenge to human explanation. (1)

"محمد (ﷺ) کے زمانے کی انسانی معلومات کے پیش نظر یہ تصور کرنا بھی ناممکن ہے کہ قرآن کے اکثر بیانات، جن کا تعلق سائنس سے ہے، وہ کسی انسان کا کام ہو سکتے ہیں۔ مزید برآں یہ بات بالکل جائز ہے کہ قرآن کو نہ صرف وحی تسلیم کیا جائے بلکہ اس کو ایک خاص مقام دیا جائے کیونکہ ایک طرف تو یہ اپنے مستند ہونے کی ضمانت فراہم کرتا ہے اور دوسری طرف اس میں ایسے سائنسی بیانات ہیں جن کا اگر آج مطالعہ کیا جائے تو بھی اس کے انسانی کلام ہونے کی کوئی توجیہ ممکن نہیں ہے۔

گزشتہ صفحات میں ہم نے قرآن حکیم کے متعلق "موریس بکائیلے" کے ان تاثرات کو نقل کیا ہے جن کا اظہار اس نے قرآن حکیم کی ان آیات کریمہ سے متاثر ہو کر کیا ہے جن میں سائنسی موضوعات کو بیان کیا گیا ہے۔ مستشرق مذکور نے اپنی کتاب میں قرآن حکیم کی وہ آیات بھی لکھی ہیں جن میں ایسے سائنسی حقائق بیان کئے گئے ہیں جو سائنسدانوں پر کئی صدیاں بعد منکشف ہوئے ہیں۔ ہم ذیل میں ان میں سے چند آیات خود موریس بکائیلے کے ترجمے کے ساتھ قارئین کرام کے فائدے کے لئے نقل کرتے ہیں۔

(۱) اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا

1۔ "دی بائیبل، دی قرآن اینڈ سائنس،" صفحہ 269

فَفَتَقْنٰهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ

"کیا کفار نہیں دیکھتے کہ زمین و آسمان باہم ملے ہوئے تھے پھر ہم نے ان کو الگ الگ کیا اور ہم نے ہر زندہ شے پانی سے بنائی۔ کیا وہ پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔" (1)

(۲) ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ

"مزید برآں اللہ تعالیٰ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جب کہ یہ دھواں تھا اور اس سے اور زمین سے فرمایا۔ (2)

(۳) اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا

"کیا تم نے دیکھا کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے سات آسمان پیدا کیے ایک کے اوپر دوسرا اور اس نے چاند کو روشنی اور سورج کو چراغ بنایا۔" (3)

(٤) اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ

"اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے زمین، آسمانوں اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، ان کو چھ ادوار میں پیدا کیا۔" (4)

(٥) وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا

"ہم نے تمہارے اوپر سات مضبوط (آسمان) بنائے ہیں اور ایک بھڑکتا ہوا سورج رکھا ہے۔" (5)

(٦) وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ النَّجْمُ الثَّاقِبُ

"آسمان اور رات کو آنے والے کی قسم۔ تمہیں کون بتائے گا کہ رات کو آنے والا کیا ہے۔ وہ ستارہ جس کی روشنی چھیدنے والی ہے۔" (6)

1۔ "دی بائبل، دی قرآن اینڈ سائنس"، صفحہ 145
2۔ ایضاً، صفحہ 145
3۔ ایضاً، صفحہ 147
4۔ ایضاً، صفحہ 148
5۔ ایضاً، صفحہ 162
6۔ ایضاً، صفحہ 163

(۷) اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡيَا بِزِيۡنَةِ ۨالۡكَوَاكِبِ

"ہم نے سب سے نچلے آسمان کو زینت یعنی سیاروں سے آراستہ کیا ہے۔"(1)

(۸) لَا الشَّمۡسُ يَنۡۢبَغِىۡ لَهَاۤ اَنۡ تُدۡرِكَ الۡقَمَرَ وَلَا الَّيۡلُ سَابِقُ النَّهَارِ ‌ؕ وَكُلٌّ فِىۡ فَلَكٍ يَّسۡبَحُوۡنَ

"نہ سورج چاند کو پیچھے سے پکڑ سکتا ہے اور نہ رات دن سے آگے نکل سکتی ہے۔ سب ایک مدار میں اپنی ذاتی حرکت سے محوِ سفر ہیں۔"(2)

(۹) وَالشَّمۡسُ تَجۡرِىۡ لِمُسۡتَقَرٍّ لَّهَا ‌ؕ ذٰلِكَ تَقۡدِيۡرُ الۡعَزِيۡزِ الۡعَلِيۡمِ

"سورج اپنے راستے پر چلا جارہا ہے ایک مخصوص مقام کی طرف۔ یہ فرمان ہے اللہ کا جو عزیز اور علیم ہے۔"(3)

(۱۰) يُكَوِّرُ الَّيۡلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيۡلِ

"وہ لپیٹتا ہے رات کو دن پر اور لپیٹتا ہے دن کو رات پر۔"(4)

(۱۱) وَالسَّمَآءَ بَنَيۡنٰهَا بِاَيۡٮدٍ وَّاِنَّا لَمُوۡسِعُوۡنَ

"اور آسمان کو ہم نے قدرت سے بنایا ہے اور یقیناً ہم اس کو وسعت دے رہے ہیں۔"(5)

(۱۲) يٰمَعۡشَرَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ اِنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ اَنۡ تَنۡفُذُوۡا مِنۡ اَقۡطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ فَانْفُذُوۡا ‌ؕ لَا تَنۡفُذُوۡنَ اِلَّا بِسُلۡطٰنٍ

"اے گروہ انس و جن! اگر تم آسمان اور زمین کے خطوں سے پار ہو سکتے ہو تو ان سے پار ہو جاؤ تم بغیر طاقت کے ان سے پار نہیں ہو سکتے۔"(6)

(۱۳) وَاَرۡسَلۡنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنۡزَلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً

1۔ "دی بائیبل، دی قرآن اینڈ سائنس"، صفحہ 164
2۔ ایضاً، صفحہ 166
3۔ ایضاً، صفحہ 172
4۔ ایضاً، صفحہ 170
5۔ ایضاً، صفحہ 173
6۔ ایضاً، صفحہ 174

فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ وَمَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ

"ہم نے ہوائیں بھیجیں جو بار دار کرتی ہیں۔ ہم آسمان سے پانی نازل کرتے ہیں۔ ہم تمہیں پانی مہیا کرتے ہیں اور تم پانی کے ذخیروں کے محافظ نہیں ہو سکتے۔"(1)

(١٤) وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا

"اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے دو سمندروں کو آزاد چھوڑ دیا ہے۔ ایک عمدہ اور میٹھا ہے اور دوسرا نمکین اور کڑوا۔ اس نے ان دونوں کے درمیان ایک رکاوٹ کھڑی کر دی ہے۔ یہ ایک ایسی حد ہے جس کو عبور کرنا ممنوع ہے۔"(2)

(١٥) وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى

"(اللہ تعالیٰ وہ ہے) جس نے آسمان سے پانی اتارا اور اس کے ذریعے ہم نے نباتات کے کئی جوڑے نکالے۔ ہر جوڑا دوسرے جوڑے سے مختلف ہے۔"(3)

(١٦) وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ

"اللہ تعالیٰ نے ہر جانور کو پانی سے پیدا فرمایا ہے۔"(4)

(١٧) وَ فِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّ نَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ

"زمین پر (مختلف) ٹکڑے ہیں جو قریب قریب ہیں۔ انگوروں کے

1۔ "دی بائیبل، دی قرآن اینڈ سائنس"، صفحہ 182

2۔ ایضاً، صفحہ 189

3۔ ایضاً، صفحہ 198

4۔ ایضاً، صفحہ 199

باغات، کھیتیاں، کھجوروں کے درخت، کچھ ایک دوسرے کے ہم مثل اور کچھ مختلف۔ ان کو ایک ہی پانی سے سیراب کیا جاتا ہے۔ ہم ان میں سے بعض کو کھانے میں دوسروں کی نسبت زیادہ لذیذ بنا دیتے ہیں۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں عقل مند لوگوں کے لئے۔"(1)

(۱۸) وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ

"اور اللہ تعالیٰ نے زمین پر تمام پھلوں کے دو دو کے جوڑے بنا دیئے۔"(2)

(۱۹) اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى

"اللہ تعالیٰ پھاڑتا ہے دانے اور گٹھلی کو۔"(3)

(۲۰) سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ

"ہر عیب سے پاک ہے وہ ذات جس نے ہر قسم کے جوڑوں کے اجزائے ترکیبی پیدا کئے۔ وہ جنہیں زمین اگاتی ہے اور وہ خود (یعنی انسان) اور جن کو وہ نہیں جانتے۔"(4)

(۲۱) وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ مَا فَرَّطْنَا فِی الْكِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ

"زمین پر نہ کوئی جانور ہے اور نہ کوئی پرندہ جو پروں پر اڑتا ہے مگر اس کا تعلق تمہاری طرح کے کسی معاشرے سے ہے۔ ہم نے کتاب میں کسی چیز کو نظر انداز نہیں کیا۔ اور وہ اپنے رب کے حضور جمع کئے جائیں گے۔"(5)

(۲۲) وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا

1۔ "دی بائیبل، دی قرآن اینڈ سائنس"۔ صفحہ 201
2۔ ایضاً، 202
3۔ ایضاً، 203
4۔ ایضاً
5۔ ایضاً، صفحہ 205

وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا يَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ

"تمہارے رب نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈال دی: بناؤ اپنی رہائش گاہ پہاڑوں میں، درختوں کے اندر اور ان چھپروں میں جو لوگ بناتے ہیں۔ کھا ہر قسم کے پھلوں سے اور چلتی رہ اپنے رب کے راستوں پر عاجزی کے ساتھ۔ ان کے جسموں سے مختلف رنگوں کا ایک مشروب نکلتا ہے۔ جس میں لوگوں کے لئے شفا ہے۔" (1)

(۲۳) مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ

"وہ لوگ جو خدا کے سوا دوسروں کو اپنا مددگار بناتے ہیں وہ مکڑے کی طرح ہیں جو اپنے لئے گھر بناتا ہے۔ اور یقیناً تمام گھروں سے کمزور گھر مکڑے کا ہوتا ہے کاش وہ جانتے۔" (2)

(۲۴) وَاِنَّ لَكُمْ فِى الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ

"بے شک تمہارے لئے مویشیوں میں عبرت ہے۔ ہم تمہیں پینے کے لئے دیتے ہیں جو ان کے جسموں میں ہے جو آنتوں کے مواد اور خون کے اتصال سے پیدا ہوتا ہے۔ خالص دودھ جو پینے والوں کے لئے بڑا خوش ذائقہ ہے۔" (3)

(۲۵) وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا

"اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں کئی (مختلف) مرحلوں میں پیدا کیا ہے۔" (4)

1۔ "دی بائبل، دی قرآن اینڈ سائنس"، صفحہ 206

2۔ ایضاً، صفحہ 207

3۔ ایضاً، صفحہ 209، یہ ترجمہ مسٹر مورس بکائلے کا ہے جس میں انہوں نے عام تراجم سے اختلاف کیا ہے۔

4۔ ایضاً، صفحہ 213

(۲۶) خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ
"اللہ تعالیٰ نے انسان کو تولیدی مادہ کی معمولی سی مقدار سے پیدا فرمایا۔"(1)

(۲۷) اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ
"ہم نے انسان کو مخلوط مائع کی معمولی سی مقدار سے پیدا کیا۔"(2)

(۲۸) ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ
"پھر ہم نے (انسان کو) تولیدی مادے کی معمولی مقدار کی شکل میں ایک بالکل محفوظ مقام پر رکھا۔"(3)

(۲۹) اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ
"پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ جس نے پیدا کیا انسان کو اس چیز سے جو چمٹ جاتی ہے۔"(4)

(۳۰) اَلَمْ یَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِیٍّ یُّمْنٰى ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى
"کیا انسان تولیدی مادہ کی ایک معمولی مقدار نہ تھا جسے ٹپکایا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ ایک ایسی چیز تھا جو چمٹ جاتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے درست اعضاء کے ساتھ پیدا فرمایا۔"(5)

(۳۱) فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا
"ہم نے چمٹ جانے والی چیز کو چبائے ہوئے گوشت کی بوٹی بنایا اور ہم نے چبائے ہوئے گوشت کی بوٹی کو ہڈیاں بنایا اور ہم نے ان ہڈیوں کو گوشت پہنادیا۔"(6)

1۔"دی بائبل، دی قرآن اینڈ سائنس"، صفحہ 213
2۔ ایضاً، صفحہ 215
3۔ ایضاً، صفحہ 214
4۔ ایضاً، صفحہ 217
5۔ ایضاً
6۔ ایضاً، صفحہ 218

(۳۲) يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ

"اللہ تعالیٰ پیدا فرماتا ہے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں ایک حالت کے بعد دوسری حالت میں تاریکی کے تین پردوں کے اندر۔" (1)

موریس بکائیلے نے اپنی کتاب میں بہت سی آیات قرآنی نقل کی ہیں جن میں اس کے بقول ایسے سائنسی حقائق بیان ہوئے ہیں جن کو بیان کرنا ساتویں صدی عیسوی کے کسی انسان کے لئے ممکن نہ تھا۔ ہم نے مستشرق مذکور کی نقل کردہ متعدد آیات میں سے صرف چند آیتیں یہاں ذکر کی ہیں۔

موریس بکائیلے نے اپنی کتاب میں تفصیل سے یہ بھی لکھا ہے کہ کس طرح ان آیات کریمہ میں بیان کردہ حقائق جدید سائنسی انکشافات سے مطابقت رکھتے ہیں۔ جو لوگ تفصیلات جاننا چاہیں وہ موریس بکائیلے کی کتاب "The Bible, The Quran and Science" کا ضرور مطالعہ کریں۔ ہم نے یہاں صرف اختصار سے صرف موریس بکائیلے کے تاثرات بیان کئے ہیں اور ساتھ ہی چند ایسی آیات درج کی ہیں جنہوں نے ایک غیر مسلم کو قرآن حکیم کے متعلق ایسے تاثرات کے اظہار پر مجبور کیا ہے کہ قرآن حکیم کے کلام خداوندی ہونے کا اعلان کر رہے ہیں۔ موریس بکائیلے کی تحقیق کا نچوڑ یہ ہے کہ

1۔ قرآن اور بائیبل دونوں میں تخلیق کائنات کے متعلق بیانات موجود ہیں۔ بائیبل کے متعدد بیانات جدید علوم کی روشنی میں غلط قرار پاتے ہیں لیکن قرآن اس قسم کے بیانات سے مطلقاً پاک ہے جن کو جدید سائنس جھٹلانے کا دعویٰ کر سکے۔

2۔ طوفان نوح کی تفصیلات بائیبل میں بھی بیان ہوئی ہیں اور قرآن نے بھی متعدد مقامات پر اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ بائیبل کے متعدد بیانات کو سائنس تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں لیکن قرآن حکیم اس قسم کے بیانات سے قطعاً پاک ہے جن کو سائنسی طور پر ناممکن قرار دیا جاسکے۔

3۔ قرآن حکیم نے متعدد سائنسی موضوعات کو بیان کیا ہے لیکن قرآن میں کسی ایسے نظریے کا مطلقاً ذکر نہیں جو نزول قرآن کے زمانے میں مروج ہو لیکن بعد میں سائنس نے اس کو غلط قرار دے دیا ہو۔ اس کے برعکس قرآن حکیم نے ایسے انکشافات کئے ہیں جو نزول

1۔ "دی بائیبل، دی قرآن اینڈ سائنس"، صفحہ 218

قرآن کے زمانے کے لئے تو اجنبی تھے لیکن بیسویں صدی عیسوی کے ترقی یافتہ دور کے نظریات سے ہم آہنگ ہیں۔

4۔ قرآن حکیم میں ایسے انکشافات بھی ہیں جن تک سائنس ابھی نہیں پہنچی لیکن سائنس دان ان کو ممکن قرار دیتے ہیں اور ان کے پاس کوئی دلیل ایسی نہیں جس کی بنا پر وہ قرآن حکیم کے ان بیانات کو غلط قرار دے سکیں۔

5۔ قرآن حکیم نے متعدد سائنسی موضوعات پر بحث کی ہے لیکن قرآن کے کسی ایک بیان کو سائنس کی روشنی میں جھٹلایا نہیں جاسکتا۔

جس طرح مکہ، مدینہ اور جزیرہ عرب کے فصحاء و بلغاء قرآن حکیم کی ایک سورۃ کی مثل بنانے سے قاصر رہے تھے، اسی طرح دور جدید کے ماہرین علوم جدیدہ بھی اس کی مثل بنانے سے قاصر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی انسان کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ ایک کتاب لکھے، اس میں اپنے زمانے میں مروج غلط خیالات و نظریات کا ذکر تک نہ کرے اور اپنی تصنیف کو ان معلومات سے مزین کرے جن کا انکشاف بنی نوع انسان پر کئی صدیاں بعد ہونے والا ہو، وہ کتاب مسلسل کئی صدیاں اپنوں اور بیگانوں کی تنقیدی تحقیق کا نشانہ بنی ہو اور کسی منصف مزاج شخص کو اس کے کسی ایک بیان کو غلط قرار دینے کی جرأت نہ ہوئی ہو۔ سچ ہے:

تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ مِنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (1)

"اس کتاب کا نزول، اس میں ذرہ شک نہیں، سب جہانوں کے پروردگار کی طرف سے ہے۔"

جن لوگوں کے سینوں میں تعصب اور حسد کی آگ شعلہ زن ہے، ان کے لئے تو کوئی بھی دلیل کافی نہیں لیکن وہ لوگ جن کے نزدیک انصاف کی کوئی قیمت ہے، وہ گزشتہ صفحات میں بیان کردہ حقائق سے آگاہ ہونے کے بعد، نہ قرآن کو بائیبل کی نقل قرار دے سکتے ہیں، نہ اسے کسی انسان کی تصنیف قرار دے سکتے ہیں جس نے دوسرے انسانوں کی مدد سے اسے تحریر کیا ہو، نہ وہ اسے عرب کے ذہنی ماحول کی پیداوار قرار دے سکتے ہیں اور نہ ہی وہ اسے کسی انسان کے تخلیقی تخیل کا نتیجہ قرار دے سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ان حقائق سے آگاہ ہونے کے بعد کسی منصف مزاج شخص کے لئے اس کتاب مبین کے کلام خداوندی ہونے کا انکار ممکن ہی نہیں ہے۔

1۔ سورۃ السجدۃ: 2

جمع و تدوینِ قرآنِ حکیم

جمع وتدوین قرآن حکیم

یہود و نصاریٰ کے پاس اس وقت جو صحیفے موجود ہیں، ان کے متعلق ان مذاہب کے پیروکار اس دعوئی کو ثابت نہیں کر سکتے کہ یہ بعینہٖ وہ صحیفے ہیں جو ان انبیائے کرام پر نازل ہوئے تھے جن کے ناموں سے یہ منسوب ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ان کی سند متصل نہیں بلکہ سرے سے ان کی کوئی سند ہے ہی نہیں۔

عہد نامہ قدیم کے صحیفے متعدد بار دشمنوں کے ہاتھوں نیست و نابود ہوئے اور متاخرین نے ان کو جن مصادر کی مدد سے دوبارہ تیار کیا ان کا کسی کو علم نہیں۔

انجیلیں جو اس وقت عیسائیوں کے ہاں مستند اور معتبر سمجھی جاتی ہیں، وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع آسمانی کے طویل عرصہ بعد مرتب ہوئیں اور مرتبین نے بغیر کسی سند کے اس دعوئی کے ساتھ ان کو مرتب کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملہم (Inspired) ہیں۔ ان حالات میں مروجہ انجیلوں میں سے کسی کو بھی وہ انجیل نہیں کہا جا سکتا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی اور جس کو کلام خداوندی تسلیم کرنا مسلمانوں کے ایمان کا حصہ ہے۔

قرآن حکیم نے یہود و نصاریٰ کو جہاں دیگر کئی جرائم کا مجرم ٹھہرایا ہے، وہاں اس نے ان کو بار بار اس بات کا بھی مجرم ٹھہرایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو صحیفے ان کی راہنمائی کے لئے انبیائے کرام کے ذریعے انہیں عطا فرمائے تھے، انہوں نے ان صحیفوں میں طرح طرح کی تبدیلیاں کر دی ہیں۔ اور اب ان کے ہاتھوں میں جو صحیفے موجود ہیں یہ بعینہٖ وہ صحیفے نہیں جو ان کے انبیائے کرام پر نازل ہوئے تھے بلکہ ان میں انسانی ہاتھوں نے بے شمار ایسی تبدیلیاں کر دی ہیں جن سے ان کے پیغام اور ان کی تعلیمات کی روح ہی ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ یہودیوں نے اپنی کتابوں کے ساتھ جو سلوک کیا اس کو بیان کرتے ہوئے قرآن حکیم ارشاد فرماتا ہے:

يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ (1)

1۔ سورۃ المائدۃ: 13

"وہ بدل دیتے ہیں (اللہ کے) کلام کو اپنی اصلی جگہوں سے اور انہوں نے بھلادیا بڑا حصہ جس کے ساتھ انہیں نصیحت کی گئی تھی۔ اور آپ ہمیشہ آگاہ ہوتے رہیں گے ان کی خیانت سے بجز چند آدمیوں کے ان سے۔"

عیسائیوں کے اسی قسم کے کرتوتوں کو بیان کرتے ہوئے قرآن حکیم ارشاد فرماتا ہے۔

وَمِنَ الَّذِينَ قَالُوْا اِنَّا نَصٰرٰى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ (1)

"اور ان لوگوں سے جنھوں نے کہا ہم نصرانی ہیں، ہم نے لیا تھا پختہ وعدہ ان سے بھی، سو انہوں نے بھی بھلادیا بڑا حصہ جس کے ساتھ انہیں نصیحت کی گئی تھی۔"

جو لوگ اپنی تحریروں کو کلام خداوندی کہنے کی جسارت کرتے ہیں، ان کے جرم کی شناعت کو بیان کرتے ہوئے قرآن حکیم ارشاد فرماتا ہے:

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ (2)

"پس ہلاکت ہو ان کیلئے جو لکھتے ہیں کتاب خود اپنے ہاتھوں سے پھر کہتے ہیں یہ (نوشتہ) اللہ کی طرف سے ہے تاکہ حاصل کرلیں اس کے عوض تھوڑے سے دام۔ سو ہلاکت ہو ان کے لئے بوجہ اس کے جو لکھا ان کے ہاتھوں نے اور ہلاکت ہو ان کے لئے بوجہ اس مال کے جو وہ (اس طرح) کماتے ہیں۔"

یہود و نصاریٰ کے پاس قرآن حکیم کی طرف سے لگائے جانے والے ان الزامات کا کوئی جواب نہیں۔ گو ان کے مذہبی راہنما اور کٹر مذہبی لوگ تو اب بھی ان صحیفوں کو غیر محرف کلام الٰہی کہنے پر بضد ہیں لیکن ان مذاہب کے پیروکاروں کی اکثریت اپنے الہامی صحیفوں کو انسانی دخل اندازیوں سے محفوظ نہیں سمجھتی۔ اس صورت میں ان کے لئے اپنے مذہبی صحیفوں کے اعتقاد کو بحال رکھنا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

1۔ سورۃ المائدہ 14

2۔ سورۃ البقرہ 79

مستشرقین جن کی اسلام کے متعلق کاوشوں کے پیچھے ہمیشہ مذہبی تعصب کارفرما رہا ہے، انہوں نے اس صورت حال سے نمٹنے کی تدبیر یہ نکالی ہے کہ قرآن حکیم نے ان پر اپنے مذہبی صحائف میں تحریف کا جو الزام عائد کیا ہے، وہ اسے قرآن حکیم کی طرف لوٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پہلے تو وہ قرآن حکیم کو کلام خداوندی ماننے کے لئے تیار ہی نہیں بلکہ وہ اسے حضور ﷺ کی تصنیف قرار دیتے ہیں، پھر ذرا آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرآن جو آج مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے یہ بعینہٖ وہ قرآن نہیں جو حضور ﷺ کے زمانے میں تھا بلکہ مرور زمانہ سے اس میں بہت سی تبدیلیاں آگئی ہیں۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دور میں قرآن حکیم کو ایک مصحف میں جمع کرنے اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور میں لغت قریش کے مطابق قرآن حکیم کے نسخے تیار کروا کر مختلف علاقوں میں بھیجنے کی جو کوششیں ہوئیں، ان کو دلیل بنا کر وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن حکیم حضور ﷺ کے زمانے میں تحریر نہیں ہوا بلکہ اس کو بعد میں آپ کے جانشینوں نے تحریر کیا۔ وہ قرآن حکیم کی آیات اور سورتوں کی ترتیب کو بھی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ بعض مستشرقین یہ تاثر دینے کی کوشش بھی کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے ہاں قرآن حکیم کی روایت بالمعنی جائز تھی اور ہر شخص کو آزادی تھی کہ وہ قرآنی مفاہیم کو اپنے الفاظ میں بیان کرے۔ وہ کہتے ہیں کہ روایت بالمعنی کی اسی آزادی کے ماحول میں قرآن حکیم کی تالیف عمل میں آئی اس لئے، ان کے نزدیک، یہ ممکن نہیں کہ آج جو قرآن مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے، یہ وہی قرآن ہو جو حضور ﷺ کی زبان پاک سے نکلا تھا۔ اپنے ان مزعومات کے لئے وہ ان احادیث طیبہ کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ قرآن حکیم کا نزول سات حروف پر ہوا ہے۔

قرآن حکیم کے کلام خداوندی ہونے اور قرآن حکیم کی سات قراءتوں کی حقیقت پر گزشتہ صفحات میں تفصیل سے بحث ہو چکی ہے۔ یہاں ہم مستشرقین کے اس وسوسے کا پول کھولیں گے، کہ جو قرآن حکیم حضور ﷺ نے اپنی امت کے سامنے پیش کیا تھا وہ محفوظ نہیں رہا بلکہ انسانی ہاتھوں نے اس میں ترامیم اور اضافے کر دیئے ہیں۔

یہاں اس حقیقت کو بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ مستشرقین میں ایک معقول تعداد ان لوگوں کی ہے جو قرآن حکیم پر لگائے جانے والے اس الزام کو تسلیم نہیں کرتے اور ان

کے نزدیک جو قرآن حکیم آج مسلمانوں کے ہاتھوں میں موجود ہے یہ وہی ہے جو حضرت محمد مصطفی ﷺ نے اپنی امت کے سامنے پیش کیا تھا لیکن مستشرقین میں ان لوگوں کی بھی کمی نہیں جو قرآن حکیم کو غیر محفوظ سمجھتے ہیں۔

یہود و نصاریٰ کا عمومی مزاج یہ ہے کہ وہ اسلام کے متعلق مستشرقین کی اس رائے کو مستند اور معتبر سمجھتے ہیں جو اسلام کے خلاف ہو۔ کسی مستشرق کے قلم سے نکلی ہوئی اسلام کے متعلق کوئی مثبت بات انہیں معیار سے گری ہوئی اور گھٹیا محسوس ہوتی ہے۔ اس لئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ قرآن حکیم کی حفاظت کے متعلق مستشرقین نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے دلوں میں جو وسوسے پیدا کرنے کی مذموم کوششیں کی ہیں ان کی حقیقت واضح کریں۔ "بلاشیر" قرآن حکیم کی حفاظت کو مشکوک بنانے کے لئے کہتا ہے:

"وحی کی تدوین کا خیال محمد (ﷺ) کو مدینہ طیبہ میں مقیم ہونے کے بعد پیدا ہوا۔ نیز قرآن کی تدوین جزوی تھی اور اس کا انحصار انفرادی کوششوں پر تھا جس کی وجہ سے اختلافات کا رونما ہونا قدرتی بات تھی۔"(1)

مستشرقین کا مقصد ہی چونکہ تشکیک پیدا کرنا ہوتا ہے، اس لئے وہ ایسے ایسے شوشے چھوڑنے سے بھی باز نہیں آتے جن کی کوئی علمی بنیاد نہیں ہوتی۔ منٹگمری واٹ نے بیل (Bell) کے حوالے سے لکھا ہے کہ "قرآن" اور "الکتاب" دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ اپنے منصب نبوت کے ابتدائی ایام میں حضور ﷺ کا خیال یہ تھا کہ آپ پر جو وحی نازل ہو رہی ہے اس کا مجموعہ قرآن کی شکل میں ظاہر ہو گا لیکن مدینہ میں قیام کے کچھ عرصہ بعد آپ کو "الکتاب" مرتب کرنے کا خیال آیا جس کو اپنی امت کے سامنے پیش کرنا آپ کی ذمہ داری تھی۔ منٹگمری واٹ کے اپنے الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

"Bell held that from an early point in his prophetic career, though not from the beginning, Muhammad thought of the separate revelations he was receiveing as constituting a single Quran. After he had been a year or two in Medina, however, he thought of them as constituting, the Book, which it was his task to produce". (2)

1۔ "الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری"، صفحہ 110۔ بحوالہ "القرآن"، از بلاشیر
2۔ "محمد ایٹ مکہ"، صفحہ 80

اس کے ساتھ ہی منٹگمری واٹ اپنے قارئین کے سامنے یہ وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہے کہ جب قرآن کا لفظ بولا جائے تو ضروری نہیں کہ اس سے مراد وہ پورا صحیفہ ہو جو اس وقت ہمارے ہاتھوں میں ہے بلکہ قرآن کی کسی ایک آیت کو بھی قرآن کہا جاسکتا ہے۔

یہ دو مستشرق جو فلسفہ بگھارنے کی کوشش کر رہے ہیں اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ لوگوں کو یہ تاثر دیں کہ منصب نبوت کے ابتدائی سالوں میں حضور ﷺ کو (نعوذ باللہ) یہ احساس نہ تھا کہ آپ پر جو وحی نازل ہو رہی ہے، یہ آپ کی امت کے لئے کتاب ہدایت ہے اور اس کے ایک ایک لفظ کو محفوظ رکھنا اور اسے اپنی امت تک منتقل کرنا آپ کی ذمہ داری ہے بلکہ آپ اگر کچھ محفوظ کرنے کا اہتمام فرما بھی رہے تھے تو وہ قرآن کی حفاظت کا اہتمام تھا۔ اور قرآن کی حفاظت کا فریضہ تو چند آیات کی حفاظت سے بھی پورا ہو سکتا تھا کیونکہ قرآن کی ہر آیت کو قرآن کہا جاسکتا ہے۔ وہ یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وحی کو کتاب ہدایت کی شکل میں محفوظ رکھنے کا خیال ہجرت کے کئی سال بعد پیدا ہوا۔

منٹگمری واٹ اور "بیل" کی یہ تحقیق جس کی بنیاد نہ قرآنی الفاظ مہیا کرتے ہیں اور نہ ہی مسلمانوں کے دیگر علمی ورثہ میں اس نرالی تحقیق کی طرف کوئی اشارہ ملتا ہے، اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس بات کی کوئی ضمانت نہیں رہتی کہ حضور ﷺ پر جو وحی نازل ہوئی تھی وہ بتمامہ بغیر کسی تغیر و تبدل کے محفوظ رہی۔ کیونکہ چودہ پندرہ سال تک جس بات کو محفوظ رکھنے کا خیال ہی نہ ہو اس کے متعلق یہ یقین کے ساتھ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ وہ کلیۃً محفوظ ہے۔

ارتھر جیفری (Arthur Jeffery) تدوین قرآن کے متعلق غلط تاثر دیتے ہوئے لکھتا ہے:

"It is clear that he had been preparing a book for his community which would be for them what the old testament was for the Jews and the New Testament for the Christians, but he died before his book was ready, and what we have in the Quran is what his followers were able to gather together after his death and issue as the corpus of his "revelations." (1)

"یہ بات واضح ہے کہ آپ اپنی امت کے لئے ایک کتاب تیار کر رہے تھے جس کی آپ کی امت کے نزدیک وہی حیثیت ہوگی جو یہودیوں کے

1۔ "اسلام، محمد اینڈ ہز ریلیجن"، صفحہ 47

نزدیک عہد نامہ قدیم کی اور عیسائیوں کے نزدیک عہد نامہ جدید کی ہے۔ لیکن کتاب کی تکمیل سے پہلے آپ کا انتقال ہو گیا اور آج قرآن میں جو کچھ ہے یہ وہ ہے جس کو آپ کے پیروکار آپ کے انتقال کے بعد جمع کرنے میں کامیاب ہوئے اور انہیں آپ کے الہامات کے مجموعے کے طور پر شائع کر دیا۔"

ایچ۔ اے۔ آر۔ گب (H.A.R.Gibb) نے بھی یہی تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ تالیف قرآن کا کام حضور ﷺ کے زمانے میں مکمل نہیں ہوا۔ وہ لکھتا ہے:

"It seems possible that the work of compilation was begun in his lifetime, but it was completed only some years after his death". (1)

"یہ بات ممکن معلوم ہوتی ہے کہ تالیف قرآن کا کام آپ کی زندگی میں شروع ہو گیا تھا لیکن اس کی تکمیل آپ کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد ہوئی۔"

عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید کی حفاظت کیلئے یہود و نصاریٰ نے جو کردار ادا کیا اس کو سامنے رکھا جائے تو مستشرقین کے مذکورہ بالا بیانات بھی اس بات کا اعتراف ہیں کہ قرآن حکیم کی حفاظت ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ کیونکہ اگرچہ یہ مستشرقین حضور ﷺ کے عہد مبارک میں قرآن حکیم کی جمع و تدوین مکمل ہونے کا انکار کر رہے ہیں لیکن ساتھ ہی وہ یہ اقرار کر رہے ہیں کہ قرآن حکیم کو ان لوگوں نے جمع کیا جن کے شب و روز حضور ﷺ کی معیت میں گزرے تھے اور وہ حضور ﷺ کے اقوال و افعال کے چشم دید گواہ تھے جبکہ یہود و نصاریٰ کے اپنے صحیفے اس اعزاز سے بھی محروم ہیں۔

مستشرقین کے یہ بیانات کو ایک طرح سے قرآن حکیم کی حفاظت کے لئے کی جانے والی کوششوں کا اعتراف ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بیانات ان تابندہ مساعی کی تابندگی کو دھندلا کر کے پیش کرنے کی کوشش بھی ہیں جو حضور ﷺ اور آپ کی امت نے قرآن حکیم کو محفوظ کرنے کے لئے سرانجام دیں۔

مسلمانوں کا دعویٰ یہ ہے کہ حضور ﷺ پر جو قرآن حکیم نازل ہوا، وہ حرف بحرف

1۔ ایچ۔ اے۔ آر۔ گب "اسلام" مشمولہ، "دی انسائیکلوپیڈیا آف لِونگ فیتھ"، ایڈیٹڈ بائی۔ آر۔ سی۔ زائز (ہاچنسن گروپ ساؤتھ افریقہ) صفحہ 168

محفوظ ہے۔ اس میں نہ تو کوئی ایک لفظ کم یا زیادہ ہوا ہے اور نہ ہی اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل رونما ہوا ہے۔ اور آج قرآن حکیم اسی طرح پڑھا جا رہا ہے جس طرح حضور ﷺ کے زمانے میں پڑھا جاتا تھا۔ مسلمانوں کے اس دعوٰی کو وہی شخص تسلیم کر سکتا ہے جس کی نظر ان ان تھک مساعی پر ہو جو قرآن حکیم کی تدوین و حفاظت کے لئے حضور ﷺ نے خود اور آپ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے انجام دیں۔

جو شخص تدوین قرآن کی تاریخ کو مستشرقین کی کتابوں سے سمجھنے کی کوشش کرے گا، اس کے لئے مسلمانوں کے اس دعوے کو حرف بحرف سچا تسلیم کرنا ممکن ہی نہیں۔ مستشرقین کا تو مقصد ہی حق کے رخ زیبا کو شکوک و شبہات کے پردوں میں چھپانا ہوتا ہے اور اس مقصد کو اپنی تحریروں کے ذریعے حاصل کرنے کے فن میں وہ خوب مہارت رکھتے ہیں۔

ذیل میں ہم تدوین قرآن کی وہ تاریخ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں جس پر امت مسلمہ متفق ہے اور جس سے آگاہ ہونا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے تا کہ وہ مستشرقین اور دیگر اسلام دشمن قوتوں کی وسوسہ اندازیوں سے اپنے ایمان کو محفوظ رکھ سکے۔ تدوین قرآن کی تاریخ پر ایک نظر ڈالنے سے پہلے چند حقیقتوں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

(ا) زمانہ نزول قرآن میں جزیرہ عرب میں خواندگی کی شرح وہ نہ تھی جس کا مشاہدہ ہم دور حاضر میں کر رہے ہیں۔ عربوں کی اکثریت نوشت و خواند کے فن سے نا آشنا تھی لیکن ان میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ گوان کی تعداد بہت زیادہ نہ تھی۔

(ب) آج دنیا بھر میں کاغذ کی بھر مار ہے اور صنعت طباعت عروج پر ہے۔ نزول قرآن کے وقت کیفیت یہ نہ تھی۔ عرب ابھی فن طباعت سے نا آشنا تھے اور کاغذ کی جگہ چمڑے کی جھلیوں، ہڈیوں اور پتھروں کو استعمال کرنے پر مجبور تھے۔

(ج) عربوں کے مشہور شعراء سینکڑوں اشعار پر مشتمل قصیدے کہتے تھے۔ ان قصیدوں کو وہ لوگ اپنا قومی سرمایہ سمجھتے تھے اس لئے ان کی حفاظت کو بھی اپنا قومی فریضہ سمجھتے تھے۔ لیکن ان قصیدوں کی یہ حفاظت قلم و قرطاس کے ذریعے نہیں کی جاتی تھی بلکہ عرب ان کو اپنے سینوں میں محفوظ کر لیتے تھے۔

(د) قرآن حکیم یکبارگی نازل نہیں ہوا بلکہ یہ تھوڑا تھوڑا کر کے تیئیس سال کے عرصہ میں

نازل ہوا۔

گویا حضور ﷺ کے زمانے میں کسی کلام کو محفوظ کرنے کے دو ہی ذریعے تھے۔ ایک تو یہ کہ اسے زیادہ سے زیادہ انسانوں کے سینوں میں محفوظ کر دیا جائے اور دوسرا یہ کہ لکھنے کے لئے پتھر، کھجور کے درختوں کے پتے، ہڈیاں یا چمڑے کے ٹکڑے وغیرہ، جو بھی چیزیں میسر آئیں، اس کلام کو ان چیزوں پر لکھ لیا جائے اور لکھنے کے لئے ان لوگوں کی خدمات حاصل کی جائیں جو لکھنے کے فن کے ماہر ہوں۔

حضور ﷺ نے قرآن حکیم کی حفاظت کے لئے یہ دونوں طریقے بھرپور انداز میں استعمال کئے۔ ابتدا میں حضور ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ جب جبریل امین ایک یا چند آیتیں لے کر حضور ﷺ کے پاس تشریف لاتے تو حضور ﷺ حضرت جبریل امین کی قراءت کے ساتھ ساتھ جلدی سے قرآن حکیم کو پڑھنے کی کوشش کرتے تاکہ آپ پر جو وحی نازل ہو رہی ہے وہ حفظ ہو جائے اور اس میں سے کوئی چیز ضائع نہ ہو۔

حضور ﷺ کے اس عمل سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ابتدا ہی سے قرآن حکیم کو محفوظ کرنے کے بارے میں کتنے سنجیدہ تھے۔ حضور ﷺ کا یہ عمل، جس پر قرآن حکیم شاہد ہے، مستشرقین کے اس مفروضے کی تردید کرتا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ تدوین قرآن اور حفاظت قرآن کا خیال پیغمبر خدا ﷺ کو ہجرت کے بعد آیا تھا۔ آپ ﷺ قرآن حکیم کی حفاظت کو اپنا فرض اولین سمجھتے تھے اسی لئے اس کو حفظ کرنے کی غرض سے جبریل امین کی قراءت کے ساتھ ساتھ اس کو دہراتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اپنے حبیب ﷺ کو اس مشقت سے آزاد فرما دیا اور فرمایا:

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۡ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا (1)

"اور نہ عجلت کیجئے قرآن کے پڑھنے میں اس سے پہلے کہ پوری ہو جائے آپ کی طرف وحی اور دعا مانگا کیجئے: میرے رب! (اور) زیادہ کر میرے علم کو۔"

یہاں اللہ تعالیٰ حفاظت قرآن کا ایک ایسا وسیلہ حضور ﷺ کو سکھا رہا ہے، جس کی

1۔ سورۃ طٰہٰ: 114

حیرت انگیز تاثیر کو وہ لوگ سمجھنے سے قاصر ہیں جو مادے کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے: حبیب! حفظ قرآن کے لئے تمہیں آیات قرآنی کو جلدی جلدی دہرانے کی ضرورت نہیں بلکہ تم اپنے رب کے حضور دست بستہ عرض کرو کہ پروردگار! میرے علم میں اضافہ فرما۔ تمہاری یہ دعایقیناً تمہارے لئے آیات قرآنی کو جلدی جلدی دہرانے کی نسبت زیادہ کارگر ثابت ہوگی۔

مسلمانوں کا ایمان ہے کہ لاکھوں سینوں میں قرآن حکیم کے محفوظ ہونے میں جہاں ان خوش نصیب لوگوں کی ان تھک محنت کا دخل ہے جو حفظ قرآن کے لئے اپنے دنوں کا سکون اور راتوں کی نیند قربان کردیتے ہیں، وہاں یقیناً اس دولت کو ان کے سینوں میں محفوظ کرنے کے لئے ان کی اپنی، ان کے اساتذہ، ان کے والدین اور پاکان امت کی دعائیں بھی ایک اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

یہ حکم دینے کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے حبیب ﷺ کو یہ تسلی بھی دیتے ہیں کہ آپ کو حفاظت قرآن کے سلسلے میں متفکر ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ کی طرف جو وحی آرہی ہے، اس میں سے کسی چیز کے ضائع ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں کیونکہ آپ کے قلب انور میں اس وحی کو محفوظ کرنے، اسے پڑھانے اور اس کے مفاہیم کو کھول کر بیان کرنے کا کام اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ قدرت پرلے رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے پیغمبر آخر الزمان ﷺ کو جبریل امین سے وحی قبول کرنے کا طریقہ بھی سمجھا دیا اور فرمایا کہ جبریل کے قراءت سے فارغ ہونے تک آپ انتظار کیا کریں:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖؕ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗۚ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗۚ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗؕ (1)

"(اے حبیب!) آپ حرکت نہ دیں اپنی زبان کو اس کے ساتھ تاکہ آپ جلدی یاد کرلیں اس کو۔ ہمارے ذمہ ہے اس کو (سینہ مبارک میں) جمع کرنا اور اس کو پڑھانا۔ پس جب ہم اسے پڑھیں تو آپ اتباع کریں اسی پڑھنے کا۔ پھر ہمارے ذمہ ہے اس کو کھول کر بیان کردینا۔"

اس ہدایت ربانی کے بعد حضور ﷺ اسی کے مطابق وحی کو حضرت جبریل امین سے

1۔ سورۃ القیامۃ: 19-16

قبول فرماتے تھے۔"

ڈاکٹر محمد مصطفیٰ شلبی اپنی کتاب "اصول الفقہ الاسلامی" میں لکھتے ہیں:

فَكَانَ الرَّسُوْلُ بَعْدَ ذَالِكَ يَنْتَظِرُ اِنْتِهَاءَ جِبْرِيْلَ مِنْ قِرَاءَتِهِ فَيَقْرَءُ كَمَا قَرَءَ وَبَعْدَ انْصِرَافِ جِبْرِيْلَ يَقْرَءُهُ لِمَنْ حَضَرَ مِنْ اَصْحَابِهِ وَيُقْرِئُهُمْ لِيَتَثَبَّتَ مِنْ حُسْنِ تَرْتِيْلِهِمْ ثُمَّ يَدْعُوْ بَعْضَ كُتَّابِ الْوَحْيِ لِيَكْتُبُوْا مَا نَزَلَ وَهٰكَذَا كُلَّمَا نَزَلَ شَيْئٌ مِّنَ الْقُرْاٰنِ حَفِظُوْهُ وَكَتَبُوْهُ فِيْمَا تَيَسَّرَ لَهُمْ مِّمَّا يُكْتَبُ فِيْهِ مِنْ عُسْبِ النَّخْلِ وَاللِّخَافِ وَعَظْمِ الْاَكْتَافِ وَقِطَعِ الْاَدِيْمِ ثُمَّ يُوْضَعُ فِيْ بَيْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ حَتّٰى تَمَّ نُزُوْلُ الْقُرْاٰنِ (1)

"اس کے بعد حضور ﷺ حضرت جبریل امین کے قراءت ختم کرنے کا انتظار فرماتے۔ پھر آپ اسی طرح خود پڑھتے جس طرح حضرت جبریل امین نے پڑھا ہوتا۔ حضرت جبریل امین کے واپس چلے جانے کے بعد آپ نازل شدہ آیات ان صحابہ کرام کو پڑھ کر سناتے جو آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوتے اور آپ صحابہ کرام کو پڑھاتے تاکہ وہ اس کلام خداوندی کو حسن ترتیل کے ساتھ پڑھ سکیں۔ پھر آپ کچھ کاتبین وحی کو طلب فرماتے تاکہ وہ نازل شدہ آیات کو لکھ لیں۔ اسی طرح جب بھی قرآن حکیم کی کچھ آیات نازل ہوتیں تو صحابہ کرام انہیں یاد کرتے اور انہیں لکھنے کے کام آنے والی جو بھی چیز، مثلاً کھجور کے درخت کے پتے، پتھر کی سلیں، کندھوں کی ہڈیاں اور چمڑے کے ٹکڑے، میسر آتی اس پر انہیں لکھ لیتے۔ پھر یہ مکتوب حضور ﷺ کے کاشانہ اقدس میں رکھ دیا جاتا۔ یہ کام اسی طرح جاری رہا حتیٰ کہ نزول قرآن کا سلسلہ مکمل ہو گیا۔"

آیات اور سورتوں کے توقیفی ہونے کے متعلق مصنف مذکور لکھتے ہیں۔

"وَكَانَ جِبْرِيْلُ كُلَّمَا نَزَلَ بِشَيْئٍ اَرْشَدَ الرَّسُوْلَ اِلٰى مَكَانِهٖ لِيَقْرَءَ الْقُرْاٰنَ مُرَتَّبًا كَمَا اَرَادَهُ اللّٰهُ وَكَمَا هُوَ مُدَوَّنٌ فِي

1۔ "اصول الفقہ الاسلامی"، جلد 1، صفحہ 93

اللَّوْحِ الْمَحْفُوْظِ لَا كَتَرْتِيْبِهٖ حَسْبَ النُّزُوْلِ وَلِهٰذَا كَانَ الرَّسُوْلُ كُلَّمَا نَزَلَتْ عَلَيْهِ الْاٰيَةُ اَوِ الْاٰيٰتُ يَقُوْلُ ضَعُوْهَا فِي السُّوْرَةِ الَّتِيْ يُذْكَرُ فِيْهَا كَذَابَيْنَ اٰيَةِ كَذَا وَاٰيَةِ كَذَا" (1)

"حضرت جبریل امین جب کبھی کچھ وحی لے کر نازل ہوتے تو حضور ﷺ کو یہ بھی بتاتے کہ ان آیات کی جگہ کون سی ہے تا کہ حضور ﷺ قرآن حکیم کی تلاوت اس ترتیب سے کریں جو ارادہ خداوندی کے مطابق ہے اور جس ترتیب سے قرآن حکیم لوح محفوظ میں مدون ہے نہ کہ قرآن حکیم کی ترتیب نزولی کے مطابق۔ اسی لئے حضور ﷺ پر جب کوئی آیت یا آیات نازل ہوتیں تو آپ کاتبین وحی سے فرماتے کہ ان آیات کو فلاں سورۃ میں فلاں فلاں آیات کے درمیان درج کردو۔"

ثُمَّ اِنَّ جِبْرِيْلَ كَانَ يَنْزِلُ فِيْ لَيَالِيْ رَمَضَانَ مِنْ كُلِّ عَامٍ لِعَرْضِ مَانَزَلَ مِنَ الْقُرْاٰنِ فَكَانَ يَقْرَءُ اَوَّلًا وَرَسُوْلُ اللّٰهِ يَقْرَءُ كَمَا قَرَءَ بِتَرْتِيْبِهٖ اِلٰى اَنْ كَانَ الْعَامُ الْاَخِيْرُ الَّذِيْ تُوُفِّيَ فِيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَعَرَضَهٗ مَرَّتَيْنِ وَبَعْدَ ذَالِكَ يَقْرَءُ رَسُوْلُ اللّٰهِ عَلٰى اَصْحَابِهٖ حَسْبَمَا عَرَضَهٗ جِبْرِيْلُ وَلَمْ يَنْتَقِلْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَى الرَّفِيْقِ الْاَعْلٰى اِلَّا وَالْقُرْاٰنُ كُلُّهٗ مَحْفُوْظٌ مُرَتَّبُ الْاٰيَاتِ فِيْ صُدُوْرِ اَصْحَابِهٖ وَمَكْتُوْبٌ كُلُّهٗ فِي الصُّحُفِ فِيْ بَيْتِهٖ غَيْرَ اَنَّهٗ لَمْ يَكُنْ مَجْمُوْعًا فِيْ مُصْحَفٍ وَّاحِدٍ (2)

"پھر حضرت جبریل امین ہر سال رمضان کی راتوں میں حضور ﷺ کے ساتھ نازل شدہ قرآن حکیم کا دور کرنے کے لئے نازل ہوتے۔ پہلے حضرت جبریل امین پڑھتے پھر حضور ﷺ اسی ترتیب سے پڑھتے جس ترتیب سے حضرت جبریل امین نے پڑھا ہوتا۔ یہ سلسلہ جاری رہا حتیٰ کہ وہ سال آ گیا جس میں حضور ﷺ نے اس دار فانی سے کوچ فرمایا۔ اس سال حضرت جبریل امین نے حضور ﷺ سے دوبار قرآن

1۔"اصول الفقہ الاسلامی"، جلد 1، صفحہ 93

2۔ ایضاً

حکیم کا دور فرمایا۔ اس کے بعد حضور علیہ السلام صحابہ کرام کے سامنے قرآن حکیم کو اسی طرح پڑھتے جس طرح حضرت جبریل امین نے آپ کے سامنے پڑھا تھا۔ جب حضور علیہ السلام اپنے رفیق اعلیٰ کے حضور باریاب ہونے کے لئے اس دنیا سے روانہ ہوئے تو قرآن حکیم مکمل طور پر محفوظ ہو چکا تھا۔ یہ کلام پاک آیات کی الہامی ترتیب کے ساتھ آپ کے صحابہ کرام کے سینوں میں محفوظ تھا اور اس کے تمام اجزا صحف کی شکل میں کتابت شدہ آپ کے کاشانہ اقدس میں محفوظ تھے البتہ اس وقت تک قرآن حکیم کو ایک مصحف کی شکل میں ابھی جمع نہیں کیا گیا تھا۔"

گزشتہ سطور میں جو حقائق بیان کئے گئے ہیں، ان کے پیش نظر اس بات میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ حضور علیہ السلام کی حیات طیبہ میں پورا قرآن حکیم مختلف صحف کی شکل میں ضبط تحریر میں آچکا تھا، بے شمار سینوں میں محفوظ ہو چکا تھا اور اسی ترتیب سے پڑھا جارہا تھا جس ترتیب سے وہ لوح محفوظ میں مرقوم ہے۔ صحابہ کرام اسی ترتیب سے قرآن حکیم کی تلاوت کرتے تھے جس ترتیب سے بارہا حضرت جبریل امین نے حضور علیہ السلام سے اس کا دور کیا تھا اور جس ترتیب سے وہ حضور علیہ السلام کی حیات طیبہ میں آپ کے سامنے پڑھا کرتے تھے۔

جہاں تک آیات کی ترتیب کا مسئلہ ہے، امت کے علماء کا ہر زمانے میں اس بات پر اجماع رہا ہے کہ آیات کی ترتیب توقیفی ہے۔ قرآن حکیم کو موجودہ ترتیب اللہ تعالیٰ کے حکم اور حضور علیہ السلام کی تبلیغ سے دی گئی ہے۔ اس میں کسی کے اجتہاد کا کوئی دخل نہیں ہے۔ امام سیوطی "الاتقان" میں فرماتے ہیں کہ اس بات پر ایک سے زیادہ علماء نے اجماع نقل کیا ہے۔ (1)

سورتوں کی ترتیب بھی جمہور علماء کے نزدیک توقیفی ہے لیکن بعض لوگوں نے اس سے اختلاف کیا ہے اور کہا ہے کہ سورتوں کی ترتیب صحابہ کرام کے اجتہاد سے عمل میں آئی ہے۔ اس بات پر ان کی دلیل یہ ہے کہ مختلف صحابہ کرام کے پاس قرآن حکیم کے جو نسخے موجود تھے، ان میں سورتوں کی ترتیب مختلف تھی۔ ان کے برعکس جو لوگ سورتوں کی ترتیب کے توقیفی ہونے کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ مختلف صحابہ کرام کے مصاحف میں

1۔ "اصول الفقہ الاسلامی"، جلد 1، صفحہ 94

ان سورتوں کی ترتیب کے مخالف ہونے کا قول اگر صحیح بھی ہو تو اس سے یہ دعویٰ ثابت نہیں ہوتا کہ سورتوں کی ترتیب توقیفی نہیں بلکہ صحابہ کرام کے اجتہاد سے عمل میں آئی ہے کیونکہ مذکورہ صحیفے ان صحابہ کرام نے جن میں اکثریت کاتبین وحی کی تھی، اپنی سہولت کے لئے تحریر کئے تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ قرآن حکیم ان کے پاس کتابت شدہ شکل میں محفوظ رہے، نہ یہ کہ لوگ ان کی مدد سے قرآن حکیم کی تلاوت کریں۔ جن صحابہ کرام کے پاس مذکورہ صحیفے موجود تھے وہ بھی قرآن حکیم کی اسی ترتیب سے تلاوت کیا کرتے تھے جس ترتیب سے انہوں نے حضور ﷺ کو تلاوت کرتے سنا تھا۔ انہوں نے عہد رسالت میں اسی ترتیب سے قرآن حکیم حفظ کیا تھا اور کسی صحابی کے متعلق یہ مروی نہیں کہ انہوں نے اس ترتیب سے اختلاف کیا تھا۔

جن لوگوں نے حضور ﷺ کی حیات طیبہ کے آخری رمضان میں حضور ﷺ اور جبریل امین کے درمیان قرآن حکیم کے دور کو سنا تھا، انہوں نے خود بھی قرآن کو اسی ترتیب سے پڑھا، دوسروں کو بھی اسی ترتیب سے پڑھایا۔ انہوں نے قرآن حکیم کو اسی ترتیب سے مصاحف میں مرتب کیا اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ اسی ترتیب سے ہر زمانے میں پڑھا جاتا رہا ہے، پڑھا جا رہا ہے اور پڑھا جاتا رہے گا۔

قرآن حکیم جس کو اس بے مثال حزم و احتیاط سے حضور ﷺ کی حیات طیبہ میں مومنین کے سینوں میں محفوظ کرنے کے ساتھ ساتھ ضبط تحریر میں بھی لایا گیا تھا، اسے بے شمار تابعین نے صحابہ کرام سے نہ صرف کتابت شدہ صورت میں حاصل کیا بلکہ انہوں نے صحابہ کرام کو یہ کلام پڑھتے ہوئے بھی سنا۔ اس طرح قرآن حکیم کی کتابت اور ترتیل دونوں صحابہ کرام سے تابعین کو منتقل ہوئیں اور پھر ہر زمانے میں نسل در نسل قرآن حکیم کی کتابت اور ترتیل دونوں منتقل ہوتی آئیں اور اسی تواتر سے قرآن حکیم ہم تک پہنچا ہے۔ اس میں نہ آج تک کوئی تغیر و تبدل واقع ہوا ہے اور نہ ہی قیامت تک اس میں کوئی تغیر و تبدل واقع ہوگا۔ اور ایسا کیوں نہ ہو؟ پروردگار عالم جو قادر مطلق ہے اس نے اس کلام مقدس کی حفاظت اپنے ذمہ قدرت پر لے رکھی ہے۔

قرآن حکیم کوئی ایسی کتاب نہیں جو دنیا کی چند مشہور لائبریریوں میں محفوظ ہو اور صرف چند محققین کی اس تک رسائی ہو بلکہ یہ کتاب عالم اسلام کے ہر گھر کی زینت ہے اور

وقت کی کوئی گھڑی ایسی نہیں ہوتی جس میں زمین کے کسی نہ کسی کونے سے اس کی تلاوت کی صدائیں بلند نہ ہو رہی ہوں۔

جس کتاب کا صرف مطالعہ کیا جاتا ہو اس میں تو کسی تبدیلی کی نشاندہی بڑا کٹھن کام ہے۔ اسی لئے اب یہ وتیرہ بن چکا ہے کہ کتابوں کے نئے ایڈیشنوں میں طرح طرح کی تبدیلیاں کر دی جاتی ہیں اور بہت کم لوگ ان تبدیلیوں سے آگاہ ہوتے ہیں۔ لیکن وہ کتاب جسے ترتیل سے پڑھا جاتا ہو۔ ایک پڑھنے والے کو ہزاروں لوگ سن رہے ہوں اور ان سننے والوں میں بے شمار لوگوں کے سینوں میں اس کتاب کا ایک ایک حرف محفوظ ہو اور وہ پڑھنے والے کو کسی زیر یا زبر کی غلطی پر بھی فوراً لقمہ دیتے ہوں، اور یہ عمل کسی ایک وقت یا دن کے ساتھ مخصوص نہ ہو بلکہ ہر روز لاکھوں مساجد میں صدیوں سے یہ عمل دہرایا جا رہا ہو، اس کتاب میں کسی قسم کی تبدیلی کیسے ممکن ہے؟

قرآن حکیم دنیا کی وہ واحد کتاب ہے جس کی حفاظت کے لئے حفظ وکتابت اور ترتیل کی سہ گونہ کوششیں عمل میں آئیں۔ مستشرقین چونکہ اپنی ہر چیز کو معیار قرار دینے اور دوسری چیزوں کو اس خود ساختہ معیار پر پرکھنے کے عادی ہیں، اس لئے حفظ و ترتیل کی شکل میں حفاظت قرآن حکیم کی جو بے مثال کوششیں عمل میں آئیں وہ ان کو کوئی اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں۔

حضور ﷺ نے جہاں قرآن حکیم کی کتابت کا اہتمام بلیغ فرمایا، وہاں آپ نے حفظ قرآن پر بھی زبردست توجہ مبذول فرمائی۔ حضور ﷺ وحی کے مشتاق تھے۔ آپ بڑے شوق سے نزول وحی کا انتظار فرماتے۔ جب وحی نازل ہوتی تو وعدہ خداوندی اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ (1) کے مصداق وہ آپ کو حفظ ہو جاتی۔ اس طرح حضور ﷺ بذات خود قرآن حکیم کے پہلے حافظ تھے۔

صحابہ کرام حضور ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے مطابق اپنی زندگیاں گزارنے کے دلدادہ تھے۔ قرآن حکیم جو دین اسلام کا مصدر اول تھا، اس کے ساتھ ان کا قلبی لگاؤ بے مثال تھا۔ اس لئے انہوں نے بھی حضور ﷺ کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرتے ہوئے قرآن حکیم کو حفظ کیا۔ نماز میں قراءت قرآن حکیم فرض ہونے کی وجہ سے قرآن حکیم کا کچھ حصہ حفظ کرنا تو

1۔ ہمارے ذمہ ہے اس کو (سینہ مبارک میں) جمع کرنا اور اس کو پڑھانا

ہر مسلمان پر فرض تھا لیکن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں کثیر تعداد ان لوگوں کی تھی جن کو سارا قرآن حکیم یا اس کا اکثر حصہ زبانی یاد تھا۔

عربوں کا حافظہ قدرتی طور پر زبردست تھا۔ وہ اپنی شعری روایات اور قصص وغیرہ کو زبانی یاد رکھنے کے عادی تھے۔ حفظ قرآن کے سلسلہ میں ان کا یہ خداداد ملکہ ان کے بہت کام آیا اور بے شمار لوگوں نے سارا قرآن حکیم حفظ کر لیا۔ احادیث طیبہ میں متعدد ایسے صحابہ کرام کے نام مذکور ہیں جن کو پورا قرآن حکیم حفظ تھا۔ ان میں حضرات عبد اللہ بن مسعود، سالم بن معقل مولیٰ ابی حذیفہ، معاذ بن جبل، ابی بن کعب، زید بن ثابت، ابو زید بن السکن اور ابو الدرداء رضوان اللہ علیہم اجمعین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ بعض صحابہ کرام وہ ہیں جن کو حضور ﷺ نے قرآن حکیم کا مستند معلم قرار دیا۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں:

سَمِعْتُ رَسُوْلَ ﷺ يَقُوْلُ خُذُوْا الْقُرْاٰنَ مِنْ اَرْبَعَةٍ: مِن عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ وَسَالِمٍ وَمُعَاذٍ وَاُبَيِّ ابْنِ كَعْبٍ (1)

"میں نے حضور ﷺ کو یہ فرماتے سنا: قرآن حکیم چار اشخاص سے حاصل کرو: عبد اللہ بن مسعود، سالم، معاذ اور ابی بن کعب رضوان اللہ علیہم اجمعین۔"

احادیث طیبہ میں کچھ صحابہ کرام کے متعلق وضاحت کے ساتھ مروی ہے کہ انہوں نے سارا قرآن حکیم جمع کر رکھا تھا:

عَنْ قَتَادَةَ قَالَ: سَأَلْتُ اَنَسَ ابْنَ مَالِكٍ: مَنْ جَمَعَ الْقُرْاٰنَ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ فَقَالَ اَرْبَعَةٌ، كُلُّهُمْ مِّنَ الْاَنْصَارِ: اُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ وَمُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ وَزَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ وَاَبُوْ زَيْدٍ، قُلْتُ: مَنْ اَبُوْ زَيْدٍ؟ قَالَ: اَحَدُ عُمُوْمَتِيْ(2)

"حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں: میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے پوچھا: حضور ﷺ کے زمانے میں کن لوگوں نے قرآن جمع کیا تھا؟ آپ نے فرمایا: چار اشخاص نے جو

1۔ مناع القطان "مباحث فی علوم القرآن" (موسسۃ الرسالہ بیروت، 1980ء)، صفحہ 119، بحوالہ بخاری

2۔ ایضاً

تمام کے تمام انصار میں سے تھے: ابی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت اور ابو زید۔ قتادہ فرماتے ہیں: میں نے پوچھا: کون سے ابو زید: تو آپ نے فرمایا: میرے چچاؤں میں سے ایک۔"

بخاری شریف کی ان احادیث طیبہ میں جن سات صحابہ کرام کو حفاظ قرآن کے طور پر پیش کیا گیا ہے، حفظ قرآن صرف انہی تک محدود نہ تھا بلکہ سب جانتے ہیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین حفظ قرآن کے سلسلے میں باہم مسابقت کیا کرتے تھے۔ وہ خود بھی قرآن حکیم کو حفظ کرتے، اپنے اہل خانہ اور اپنے بچوں کو بھی قرآن حکیم یاد کراتے۔ وہ راتوں کی تنہائیوں میں اپنے گھروں کے اندر، دست بستہ، اپنے پروردگار کے حضور کھڑے ہوتے اور حالت نماز میں قرآن حکیم کی طویل قراءت سے اپنے قلب وروح کو فرحت و انبساط بخشتے تھے۔ ان کی کیفیت یہ ہوتی تھی کہ ان کے گھروں کے سامنے سے گزرنے والا یوں محسوس کرتا تھا جیسے مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں اور یہ احساس ان کی تلاوت قرآن کی آوازوں سے پیدا ہوتا تھا۔

حضور ﷺ انصار کے گھروں کے پاس سے گزرتے، ان کو قرآن حکیم کی تلاوت کرتے ہوئے سنتے اور اپنے ہاتھوں سے لگائے ہوئے شجرہ طیبہ کے ثمر بار ہونے پر فرحت محسوس کرتے۔

عَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ: اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَهٗ: لَوْ رَاَیْتَنِیْ الْبَارِحَةَ وَاَنَا اَسْتَمِعُ لِقِرَاءَتِكَ؟ لَقَدْ اُعْطِیْتَ مِزْمَارًا مِّنْ مَزَامِیْرِ دَاوٗدَ (1)

"حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ان سے فرمایا: اگر تم مجھے دیکھتے جب کل میں تمہیں قرآن حکیم کی تلاوت کرتے سن رہا تھا۔ تمہیں تو حضرت داؤد علیہ السلام کے سازوں میں سے ایک ساز عطا ہوا ہے۔"

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: جَمَعْتُ الْقُرْاٰنَ فَقَرَاْتُ بِهٖ كُلَّ لَیْلَةٍ فَبَلَغَ النَّبِیَّ ﷺ فَقَالَ: اِقْرَاْهُ فِیْ شَهْرٍ (2)

1۔ مناع القطان "مباحث فی علوم القرآن" (موسسۃ الرسالہ بیروت۔ 1980)، صفحہ 120، بحوالہ بخاری
2۔ ایضاً، بحوالہ نسائی

"حضرت عبداللہ بن عمرو فرماتے ہیں میں نے سارا قرآن یاد کیا اور میں ہر روز ختم قرآن کرتا تھا۔ حضور ﷺ کو جب اس بات کا علم ہوا تو آپ نے مجھ سے فرمایا: قرآن حکیم کو مہینے میں ایک بار پڑھا کرو۔"

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو قرآن حکیم پڑھنے اور اسے یاد کرنے کا بے پناہ شوق تھا۔ حضور ﷺ ان کے اس شوق کی حوصلہ افزائی فرماتے۔ حضور ﷺ ایسے آدمی مقرر فرماتے جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو قرآن پڑھانے کا فریضہ سرانجام دیتے۔

عَنْ عُبَادَةَ ابْنِ الصَّامِتِ قَالَ: كَانَ الرَّجُلُ إِذَا هَاجَرَ دَفَعَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى رَجُلٍ مِّنَّا يُعَلِّمُهُ الْقُرْاٰنَ وَكَانَ يُسْمَعُ لِمَسْجِدِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ضَجَّةٌ بِتِلَاوَةِ الْقُرْاٰنِ حَتّٰى اَمَرَهُمْ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّخْفِضُوْا اَصْوَاتَهُمْ لِئَلَّا يَتَغَالَطُوْا۔ (1)

"حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا: جب کوئی آدمی ہجرت کر کے مدینہ طیبہ حاضر ہوتا تو حضور ﷺ اسے ہم میں سے کسی کے سپرد کرتے جو اسے قرآن حکیم پڑھاتا۔ مسجد نبوی سے تلاوت قرآن حکیم کی صدائیں گونجتی سنائی دیتیں حتی کہ حضور ﷺ نے صحابہ کرام کو حکم دیا کہ وہ آہستہ آواز میں قرآن حکیم کی تلاوت کیا کریں تاکہ ان میں سختی پیدا نہ ہو۔"

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا قرآن حکیم کو پڑھنے کا بے پناہ شوق، حضور ﷺ کا اس شوق کو مہمیز لگانا اور امت کے ہر فرد کو قرآن حکیم کی تعلیم دینے کا اہتمام کرنا، یہ سب باتیں اس حقیقت کو واضح کر رہی ہیں کہ پوری ملت اسلامیہ کس طرح اس عطیہ خداوندی کی حفاظت پر کمربستہ ہو گئی تھی۔ حفظ قرآن کے اسی شوق کا نتیجہ تھا کہ حضور ﷺ کے دور ہمایوں میں حفاظ قرآن کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی تھی کہ صرف بئر معونہ کے واقعہ میں ستر حفاظ کرام شہید ہوئے۔ جنگ یمامہ جو حضور ﷺ کے وصال کے تھوڑا ہی عرصہ بعد ہوئی، اس میں شہید ہونے والوں میں بھی ستر حفاظ قرآن تھے۔ ابو عبید نے

1۔ مناع القطان "مباحث فی علوم القرآن" (موسسۃ الرسالہ بیروت۔ 1980)، صفحہ 121، بحوالہ مناہل العرفان للزرقانی

"کتاب القراءات" میں خلفائے اربعہ کے علاوہ متعدد مہاجرین و انصار کے نام لکھے ہیں جنہیں قرآن حکیم یاد تھا۔(1)

مندرجہ بالا روایات سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ حضور ﷺ کے زمانہ میں بے شمار صحابہ کرام کو مکمل قرآن حکیم حفظ تھا۔

یہاں ایک سوال ذہنوں میں ابھر سکتا ہے کہ اگر عہد رسالت میں حفاظ کرام کی تعداد اتنی زیادہ تھی تو پھر مندرجہ بالا احادیث طیبہ میں صرف چھ، سات صحابہ کرام کو حفاظ کرام کے طور پر کیوں پیش کیا گیا ہے؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے "مباحث فی علوم القرآن" کے مصنف لکھتے ہیں:

"فَهٰذَا الْحَصْرُ لِلسَّبْعَةِ الْمَذْكُوْرِيْنَ مِنَ الْبُخَارِيِّ بِالرِّوَايَاتِ الثَّلَاثِ اَلْاٰنِفَةِ الذِّكْرِ مَحْمُوْلٌ عَلٰى اَنَّ هٰؤُلَآءِ هُمُ الَّذِيْنَ جَمَعُوا الْقُرْاٰنَ كُلَّهٗ فِيْ صُدُوْرِهِمْ وَعَرَضُوْهُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاتَّصَلَتْ بِنَا اَسَانِيْدُهُمْ ! اَمَّا غَيْرُهُمْ مِنْ حَفَظَةِ الْقُرْاٰنِ- وَهُمْ كُثُرٌ- فَلَمْ يَتَوَافَرْ فِيْهِمْ هٰذِهِ الْاُمُوْرُ كُلُّهَا" (2)

"بخاری شریف کی مذکورہ بالا تین روایات میں عہد رسالت کے حفاظ کی تعداد کے سات میں محصور ہونے کا جو تاثر ابھرتا ہے، اسے اس بات پر محمول کیا جائے گا کہ یہ وہ خوش نصیب ہیں جنہوں نے سارے قرآن حکیم کو اپنے سینوں میں محفوظ بھی کیا، اسے حضور ﷺ کو پڑھ کر بھی سنایا اور ان سے متصل اسناد کے ساتھ ہم تک قرآن حکیم پہنچا۔ ان کے علاوہ حفاظ قرآن کی تعداد بہت زیادہ تھی لیکن ان میں مذکورہ بالا تمام چیزیں جمع نہ تھیں۔"

امت مسلمہ نے قرآن حکیم کی حفاظت کے لئے حفظ و ترتیل کا جو طریقہ اپنایا ہے، وہ اس امت کی خداداد خصوصیت ہے۔ دنیا میں شاید کوئی اور کتاب ایسی نہیں جس کی حفاظت کے لئے کتابت کے علاوہ ان طریقوں کو بھی استعمال میں لایا گیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن

1۔ مناع القطان "مباحث فی علوم القرآن"، (موسسۃ الرسالہ بیروت۔ 1980ء)، صفحہ 2-121

2۔ ایضاً، صفحہ 121

حکیم صدیوں سے ہر قسم کے تغیر و تبدل سے محفوظ چلا آتا ہے۔ یہ بھی قرآن حکیم کی خصوصیت ہے۔ کوئی دوسری کتاب اس خصوصیت میں قرآن حکیم کی مثیل نہیں ہے۔

حفاظت قرآن کا دوسرا ذریعہ کتابت تھا۔ جیسے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ حضور ﷺ کی حیات طیبہ میں قرآن حکیم مکمل طور پر ضبط تحریر میں آچکا تھا۔ حضور ﷺ نے قرآن حکیم کی کتابت کے لئے کاتبین وحی کی باقاعدہ ایک جماعت تیار کر رکھی تھی، جو اکابر صحابہ کرام پر مشتمل تھی۔ ان میں حضرت علی، حضرت معاویہ، حضرت ابی بن کعب اور حضرت زید بن ثابت جیسے لوگ شامل تھے۔ جب کوئی آیت کریمہ نازل ہوتی تو حضور ﷺ ان کاتبین وحی کو حکم دیتے کہ وہ اس آیت کو لکھ لیں اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیتے کہ اس آیت کو کس سورۃ میں کس مقام پر لکھنا ہے۔

کاتبین وحی کی یہ جماعت جس کے ارکان حضور ﷺ کے باقاعدہ حکم کے تحت وحی کی کتابت کرتے تھے، ان کے علاوہ کچھ صحابہ کرام ذاتی طور پر بھی قرآن حکیم کو لکھا کرتے تھے۔ ان کو لکھنے کی جو بھی چیز میسر آجاتی وہ اس پر قرآنی آیات لکھ لیا کرتے تھے۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں:

كُنَّا عِنْدَ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نُؤَلِّفُ الْقُرْاٰنَ مِنَ الرِّقَاعِ (1)

"ہم حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے اور مختلف ٹکڑوں کی مدد سے قرآن حکیم کو جمع کر رہے تھے۔"

مختصر یہ کہ حضور ﷺ کی حیات طیبہ میں ہی سارا قرآن حکیم لکھا جا چکا تھا۔ کاتبین وحی نے حضور ﷺ کے حکم سے جو لکھا تھا وہ سارا حضور ﷺ کے کاشانہ اقدس میں محفوظ تھا۔ متعدد صحابہ کرام نے قرآن حکیم کی کئی سورتیں لکھ کر اپنے پاس محفوظ کر رکھی تھیں۔ بعض صحابہ کرام ایسے بھی تھے جن کے پاس پورا قرآن حکیم کتابت شدہ شکل میں موجود تھا۔ ان میں حضرت علی بن ابی طالب حضرت معاذ بن جبل، حضرت ابی بن کعب، حضرت زید بن ثابت اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضوان اللہ علیہم اجمعین کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ (2)

1۔ مناع القطان "مباحث فی علوم القرآن"، (موسسۃ الرسالہ بیروت۔ 1980)، صفحہ 123، بحوالہ "المستدرک"

2۔ ایضاً

مندرجہ بالا بحث سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کے اس دنیا سے تشریف لے جانے سے پہلے قرآن حکیم کو مندرجہ ذیل طریقوں سے محفوظ کر لیا گیا تھا۔

1۔ حفظ:۔ ہر مسلمان کو قرآن حکیم کا کچھ حصہ یاد تھا۔ کثیر تعداد ان خوش نصیبوں کی بھی تھی جن کو سارا قرآن حکیم حفظ تھا اور پوری ملت بڑے شوق سے حفظ قرآن کی کوششوں میں مصروف تھی۔

2۔ کتابت:۔ قرآن حکیم کی جو آیت نازل ہوتی اسے حضور ﷺ کے حکم سے فوراً لکھ لیا جاتا۔ وصال نبوی کے وقت پورا قرآن حکیم کتابت شدہ شکل میں کاشانہ نبوی میں موجود تھا۔ متعدد صحابہ کرام کے پاس بھی پورا قرآن حکیم کتابت شدہ شکل میں موجود تھا اور کئی صحابہ کرام کے پاس قرآن حکیم کی کچھ سورتیں لکھی ہوئی موجود تھیں۔

3۔ ترتیل:۔ قرآن حکیم ابتدائے نزول سے ہی مسلسل ترتیل کے ساتھ پڑھا جا رہا تھا۔ اس مسلسل ترتیل کی وجہ سے یہ امکان نہ تھا کہ قرآن حکیم کا کوئی لفظ غلط پڑھا جاتا یا بدل کر پڑھا جاتا تو اس بات کا پتہ نہ چلتا۔

4۔ جن لوگوں نے قرآن حکیم حفظ کر رکھا تھا وہ حضور ﷺ کو پڑھ کر سناتے تھے اور جن کے پاس قرآن حکیم کتابت شدہ شکل میں موجود تھا وہ بھی اپنا لکھا ہوا حضور ﷺ کو پڑھ کر سناتے تا کہ غلطی کا کوئی شائبہ باقی نہ رہے۔

5۔ حضرت جبریل امین ہر سال حضور ﷺ کے ساتھ قرآن حکیم کا دور کرتے اور آپ کی حیات طیبہ کے آخری سال انہوں نے آپ کے ساتھ دو مرتبہ قرآن حکیم کا دور کیا۔

قرآن حکیم جس کی حفاظت کے لئے حضور ﷺ کی حیات طیبہ میں اتنی کوششیں ہوئیں، اس کے متعلق ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ جب حضور ﷺ اس دار فانی سے رخصت ہوئے تو وہ قرآن حکیم سینکڑوں سینوں میں محفوظ تھا، متعدد مقامات پر کتابت شدہ شکل میں موجود تھا اور مدینہ طیبہ کی فضائیں صبح و شام اس کی تلاوت کی حسین صداؤں سے گونج رہی تھیں۔

قرآن حکیم کی کتابت عہد صدیقی میں

گزشتہ صفحات میں اس بات کو تفصیل سے بیان کر دیا گیا ہے کہ حضور ﷺ کی حیات طیبہ میں پورا قرآن حکیم لکھا جا چکا تھا۔ اور اس زمانے کے حالات کے مطابق قرآن حکیم کی

حفاظت کے جتنے ذرائع ممکن تھے، ان تمام ذرائع کو بڑی عرق ریزی، جانفشانی، احتیاط اور خلوص کے ساتھ استعمال کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں چونکہ کاغذ دستیاب نہ تھا اس لئے ۔ کتابت قرآن کے لئے کھجوروں کے پتوں، ہموار پتھروں، چوڑی ہڈیوں اور چمڑے کے ٹکڑوں کو استعمال کیا گیا تھا۔

یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس قسم کی چیزوں پر مختلف اجزاء کی شکل میں لکھی ہوئی کتاب کی حفاظت ایک مشکل کام تھا۔ ملت اسلامیہ نے اس حقیقت کا احساس کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگایا اور حضور ﷺ کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے تھوڑا ہی عرصہ بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں قرآن حکیم کو ایک مصحف کی شکل میں بھی ان ہی لوگوں نے جمع کر دیا جن لوگوں نے حضور ﷺ سے خود اسے سنا تھا۔ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے سارا قرآن حکیم حفظ بھی کیا تھا، اسے حضور ﷺ کے حکم سے آپ کے سامنے لکھا بھی تھا، انہوں نے حضور ﷺ کو قرآن حکیم پڑھ کر سنایا بھی تھا اور انہوں نے حضور ﷺ کو حضرت جبریل امین کے ساتھ قرآن حکیم کا دور کرتے سنا بھی تھا۔

حضور ﷺ کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد آپ کے خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو متعدد فتنوں سے واسطہ پڑا۔ مسلمان مجاہدین کو ان فتنوں کی سرکوبی کے لئے بارہا میدان میں اترنا پڑا۔ ان فتنوں میں کئی صحابہ کرام نے جام شہادت نوش کیا۔ اہل یمامہ کے خلاف جنگ میں جن لوگوں نے اپنے سروں پر شہادت کا تاج سجایا، ان میں کثیر تعداد ان لوگوں کی تھی جن کے سینوں میں قرآن حکیم محفوظ تھا۔ عربوں کو اپنی قوت حافظہ پر اعتماد تھا اور وہ کتابت شدہ مواد کی نسبت سینوں میں محفوظ مواد کو زیادہ محفوظ سمجھتے تھے۔ لیکن جب جنگوں میں کثرت سے صحابہ کرام شہید ہونے لگے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی دور رس نگاہوں نے فوراً اس خطرے کو بھانپ لیا کہ اگر حفاظ کرام کی شہادت کی رفتار یہی رہی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمیں قرآن حکیم کے کچھ حصے سے محروم ہونا پڑے۔ اس صورت میں ضروری محسوس ہوا کہ حفظ کے ساتھ ساتھ قرآن حکیم کی کتابت کو بھی ایسی شکل دی جائے کہ اس کے بعد اس کے کسی حصے کے ضائع ہونے کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

اب تک قرآن حکیم مختلف تحریروں کی شکل میں موجود تھا لیکن اس کو ایک صحیفے کی شکل میں جمع نہ کیا گیا تھا۔ مذکورہ بالا خطرے کے پیش نظر صحابہ کرام نے اس کو ایک صحیفے کی

شکل میں جمع کرنے کا فیصلہ کیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس ضرورت کو محسوس کر کے خلیفہ اول امیر المومنین حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی توجہ اس اہم کام کی طرف مبذول کرائی۔ ابتداء میں انہوں نے اس کام کو کرنے سے انکار کیا جس کو حضور ﷺ نے اپنے زمانے میں نہیں کیا تھا، لیکن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اصرار پر وہ اس کام کے لئے تیار ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں بھی اس کام کی اہمیت کا احساس پیدا کر دیا جس کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بڑی شدت سے محسوس کیا تھا۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں صحابہ کرام کی ایک جماعت کو اس کام پر مامور فرمایا۔ یہ لوگ وہی تھے جنھوں نے نہ صرف خود حضور ﷺ سے قرآن حکیم سن کر حفظ کیا تھا بلکہ یہ لوگ دور رسالت میں کتابت وحی کے فریضے پر بھی مامور رہے تھے۔ جمع قرآن کا فریضہ، ان لوگوں کے لئے جہاں ایک بہت بڑا اعزاز تھا، وہاں یہ ایک بہت بڑی ذمہ داری بھی تھی۔ انہیں اس فریضے کی نزاکت اور اس کی مشکلات کا احساس تھا اسی لئے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

فَوَاللّٰهِ لَوْ كَلَّفُوْنِیْ نَقْلَ جَبَلٍ مِنَ الْجِبَالِ مَاكَانَ اَثْقَلَ مِمَّا اَمَرَنِیْ بِهٖ مِنْ جَمْعِ الْقُرْاٰنِ (1)

”خدا کی قسم جمع قرآن کی بجائے اگر وہ مجھے کسی پہاڑ کو اپنی جگہ سے منتقل کرنے کا حکم دیتے تو وہ کام مجھ پر اس سے زیادہ بوجھل نہ ہوتا۔“

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے اس قول سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس فریضے کو وہ کتنی نازک ذمہ داری سمجھتے تھے اور اس کی تکمیل کے لئے انہوں نے کتنی جانفشانی سے کام کیا ہوگا۔

مستشرقین جب جمع قرآن کی تاریخ لکھنے بیٹھتے ہیں تو یا تو وہ ان کوششوں کو کلیۂ نظر انداز کر دیتے ہیں جو عہد رسالت میں جمع قرآن کے لئے کی گئیں اور یا انہیں اتنی کم اہمیت دیتے ہیں کہ یوں نظر آنے لگتا ہے جیسے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت سے پہلے جمع قرآن کے لئے کوئی قابل ذکر کوشش کی ہی نہیں گئی تھی۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں

1۔ ”مباحث فی علوم القرآن“، صفحہ 126

جب قرآن حکیم کو ایک مصحف میں جمع کرنے کی مہم شروع ہوئی تو اس وقت قرآن حکیم ان لوگوں کے سینوں میں بھی محفوظ تھا جو جمع قرآن کے کام پر مامور ہوئے تھے، ان کے علاوہ متعدد دیگر صحابہ کرام کے سینوں میں بھی محفوظ تھا۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے پاس کتابت شدہ شکل میں بھی پورا قرآن حکیم محفوظ تھا اور آپ کے پاس جو تحریریں تھیں وہ تحریریں آپ نے حضور ﷺ کو پڑھ کر سنائی بھی تھیں۔ حضور ﷺ کے کاشانہ اقدس میں بھی سارا قرآن حکیم تحریری شکل میں موجود تھا اور ان کے علاوہ متعدد صحابہ کرام کے پاس بھی یا تو پورا قرآن حکیم یا اس کی اکثر سورتیں محفوظ تھیں۔ متعدد صحابہ کرام ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنے پاس کتابت شدہ شکل میں محفوظ قرآن حکیم کو حضور ﷺ کے سامنے پڑھا بھی تھا اور حضور ﷺ نے اس کے صحیح ہونے کی تصدیق بھی فرمائی تھی۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقائے کار کا کام یہ تھا کہ وہ پہلے سے مرتب اور تحریر شدہ صحیفوں کو ایک صحیفے کی شکل میں جمع کریں۔ اس کام کے لئے انہوں نے جس عرق ریزی اور خلوص کا مظاہرہ کیا وہ انہی خوش نصیب لوگوں کا حصہ ہے۔ ان لوگوں نے اس عظیم منصوبے کی تکمیل کے لئے نہ تو اپنے حافظوں پر مکمل طور پر بھروسہ کیا اور نہ ہی انہوں نے اپنے پاس محفوظ مخطوطوں کی مدد سے مصحف مبارک تیار کرنے کا کام شروع کیا بلکہ انہوں نے اس کار خیر میں پوری امت مسلمہ کو شامل کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں میں اعلان فرمایا کہ جس نے حضور ﷺ سے سن کر قرآن حکیم کا کچھ حصہ لکھ رکھا ہو، وہ لے آئے۔ اعلان کے مطابق جس شخص کے پاس قرآن حکیم چمڑے کے ٹکڑوں، ہڈیوں یا کھجور کے پتوں میں سے کسی چیز پر لکھا ہوا موجود ہوتا، وہ اسے لے کر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اس تحریر کو قبول کرنے کے لئے صرف اتنا ہی کافی نہ سمجھتے تھے کہ وہ لکھا ہوا موجود ہے بلکہ جو شخص قرآن حکیم کا کوئی حصہ لے کر آتا، اس سے اس بات پر دو گواہ طلب کرتے کہ یہ تحریر حضور ﷺ کی موجودگی میں لکھی گئی تھی۔ جب کسی تحریر پر دو گواہ گواہی دے دیتے تو آپ اس کو مصحف میں درج فرما لیتے۔ یہ وہ طریقہ تھا جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے خود ان کے لئے متعین فرمایا تھا۔ حضرت ہشام بن عروہ رضی اللہ عنہما اپنے والد ماجد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر اور

حضرت زید رضی اللہ عنہما سے فرمایا:

اُقْعُدَا عَلٰی بَابِ الْمَسْجِدِ فَمَنْ جَآءَ کُمَا بِشَاهِدَيْنِ عَلٰی شَيْءٍ مِّنْ کِتَابِ اللّٰہِ فَاکْتُبَاهُ (1)

''مسجد کے دروازے پر بیٹھ جاؤ۔ جو شخص قرآن حکیم کے کسی حصے کو لے کر آئے اور اس پر دو گواہ پیش کرے، اسے لکھ لو۔''

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقائے کار نے مندرجہ بالا ہدایات کے مطابق قرآن حکیم کو جمع کرنا شروع کر دیا۔ ان کا اعتماد نہ تو صرف حفظ پر تھا، نہ صرف کتابت پر بلکہ وہ حفظ کے ساتھ کتابت کو ملاتے تھے اور اس پر کم از کم دو گواہوں کی گواہی حاصل کرتے اور ان احتیاطی تدابیر کے بعد کسی آیت کریمہ کو مصحف میں درج کرتے۔ اس طرح خدا کا وہ کلام جو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے سینے میں پہلے سے محفوظ تھا اور جو آپ کے پاس کتابت شدہ شکل میں بھی موجود تھا، آپ نے اس کی ہر آیت پر صحابہ کرام کی کم از کم دو شہادتیں حاصل کر کے، اسے ایک مصحف میں جمع کر دیا۔ اس مصحف کی سورتوں اور آیات کی ترتیب وہی تھی، جو آپ کے اور آپ کے متعدد رفقائے کار کے سینوں میں محفوظ تھی۔ جس ترتیب کے مطابق وہ خود قرآن حکیم پڑھتے تھے۔ جس ترتیب کے مطابق انہوں نے حضور ﷺ کو قرآن حکیم پڑھتے سنا تھا اور جس ترتیب سے انہوں نے حضور ﷺ کو حضرت جبریل امین کے ساتھ قرآن حکیم کا دور کرتے سنا تھا۔ یہ بعینہ وہی ترتیب ہے جس ترتیب سے قرآن حکیم لوح محفوظ میں مرقوم ہے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے اس قرآن حکیم کو جو عہد رسالت میں مکمل طور پر نازل ہو کر لکھا جا چکا تھا اور ہزاروں سینوں میں محفوظ تھا، آپ نے اسے ایک صحیفے میں الہامی ترتیب کے ساتھ مرتب کر دیا۔ پوری امت مسلمہ دین متین کی اس خدمت جلیلہ کے لئے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ہدیہ تشکر پیش کر رہی ہے۔

مستشرقین نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا مساعی کو غلط رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ وہ یہ تاثر دینے کی کوششیں کرتے ہیں کہ قرآن حضور ﷺ کے

1۔ ''مباحث فی علوم القرآن''، صفحہ 127

اقوال پر مشتمل ہے جس کو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مرتب کیا اور اس میں ضروری ترامیم واضافے کئے۔

یہ قرآن حکیم پر بھی الزام ہے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو حضور ﷺ پر نازل ہوا۔ حضور ﷺ نے اس کلام خداوندی کو یاد کیا، آپ کے بے شمار صحابہ کرام نے اسے یاد کیا، ہر آیت کو نزول کے فوراً بعد لکھ لیا گیا، عہد رسالت میں پورا قرآن حکیم لکھا ہوا حضور ﷺ کے کاشانہ اقدس میں بھی موجود تھا اور کئی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے گھروں میں بھی موجود تھا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حزم واحتیاط کی تمام ممکنہ تدابیر کو بروئے کار لاتے ہوئے، اسے اس ترتیب کے ساتھ ایک مصحف میں جمع کر دیا جس ترتیب سے اسے پڑھا جاتا تھا۔ یہ مصحف مبارک حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زندگی میں آپ کے پاس رہا۔ آپ کے انتقال کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس محفوظ رہا اور ان کی شہادت کے بعد ان کی صاحبزادی اور تمام مسلمانوں کی ماں حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس محفوظ رہا۔

قرآن حکیم کی کتابت عہد عثمانی میں

قرآن حکیم سات قراءتوں پر نازل ہوا تھا اور سہولت کی خاطر تمام عربوں کو اپنے اپنے لہجوں میں قرآن حکیم پڑھنے کی اجازت دی گئی تھی۔ اس اجازت کی وجہ سے قرآن حکیم کو مختلف لہجوں سے پڑھا جاتا تھا۔ لہجوں کا اختلاف ایسی معمولی بات تھی جس سے اہل زبان عربوں میں کسی قسم کے اختلاف کا کوئی اندیشہ نہ تھا کیونکہ وہ لہجوں کے اختلاف کی حقیقت کو سمجھتے تھے اور انہیں اس بات میں کسی قسم کا شک وشبہ نہ تھا کہ لہجوں کے اختلاف سے قرآن حکیم کے مفاہیم میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوتی۔ قراءتوں کے اختلاف کی نوعیت بھی اسی سے ملتی جلتی تھی جس کی تفصیلی بحث پہلے گزر چکی ہے۔

اسلام نے جزیرۂ عرب کی حدود سے باہر نکلنے میں زیادہ وقت نہیں لگایا۔ یہ آفاقی دین، اپنی آفاقی فطرت کے سبب، بہت جلد جزیرۂ عرب کی حدود پھلانگ گیا اور ایسے لوگ جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے جن کی مادری زبان عربی نہ تھی۔ اپنی زندگی خالص اسلامی انداز میں گزارنے کے لئے ہر مسلمان کے لئے ضروری تھا کہ وہ قرآن حکیم کا کچھ حصہ

زبانی یاد کرے۔ جو لوگ سارا قرآن حکیم یاد نہیں کر سکتے تھے وہ بھی تلاوت قرآن حکیم کی سعادت حاصل کرنے کے لئے اسے سیکھنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ یہ لوگ مختلف اساتذہ سے قرآن حکیم سیکھتے تھے۔ جب ایسے دو آدمی اکٹھے ہوتے جنہوں نے مختلف اساتذہ سے قرآن حکیم پڑھا ہوتا تو ایسے اتفاقات پیش آجاتے جب کوئی آدمی کسی دوسرے آدمی کو اس سے مختلف لہجے میں قرآن حکیم پڑھتے ہوئے سنتا جو اس نے اپنے استاد سے پڑھا تھا۔ عربی زبان کو نہ جاننے کی وجہ سے وہ اس اختلاف کی نوعیت کو نہ سمجھ سکتے اور ہر شخص دوسرے شخص کی تغلیط کرنے لگتا۔

جو لوگ بچوں کو قرآن حکیم کی تعلیم دیتے ان کو بھی اسی صورت حال سے واسطہ پڑتا۔ لہجوں کا یہ اختلاف کبھی کبھار طویل بحثوں اور جھگڑوں کی شکل اختیار کر لیتا۔ یہ صورت حال ایسی تھی جو کسی بھی وقت ملت اسلامیہ کے اتحاد کو پارہ پارہ کر سکتی تھی اس لئے اس کا مداوا لازمی تھا۔ ارمینیہ اور آذر بائیجان کی جنگوں میں حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے اس سنگین صورت حال کا مشاہدہ کیا۔ وہ امیر المومنین حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

اَدْرِكِ الْاُمَّةَ قَبْلَ اَنْ يَّخْتَلِفُوْا اِخْتِلَافَ الْيَهُوْدِ وَالنَّصٰرٰى (1)

"اس امت کی دستگیری فرمائیے اس سے پہلے کہ یہ یہود و نصاریٰ کی طرح باہم اختلاف کرنے لگے۔"

اس صورت حال کا احساس صرف حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ ہی نے نہیں کیا تھا بلکہ اکثر صحابہ کرام اس صورت حال کی سنگینی کو محسوس کرتے تھے اور اس کے فوری مداوے کو وقت کی اہم ترین ضرورت قرار دیتے تھے۔ اس صورت حال کا واحد حل یہ تھا کہ پوری امت مسلمہ کو قرآن حکیم کی لغت واحدہ پر جمع کر دیا جائے۔ یہ کام آسان نہ تھا کیونکہ ابتدائے اسلام سے لوگ مختلف لہجوں میں قرآن حکیم پڑھتے آ رہے تھے، مختلف صحابہ کرام کے پاس قرآن حکیم کے جو مخطوطے محفوظ تھے وہ بھی ان کے اپنے اپنے لہجوں کے مطابق تھے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جو مصحف تیار کروایا تھا وہ صرف ایک تھا اور اس غرض سے تیار کیا گیا تھا کہ حفاظ قرآن کے کثرت سے شہید ہونے کی وجہ سے قرآن حکیم

1۔ "مباحث فی علوم القرآن"، صفحہ 129

کا کوئی حصہ ضائع ہونے کا خدشہ نہ رہے۔ اسے مرتب کرتے وقت یہ مقصد پیش نظر رہا تھا کہ تمام مسلمان مختلف لہجوں کو چھوڑ کر صرف اسی مصحف کے مطابق قرآن حکیم کی تلاوت کریں۔ لہجوں کے اختلاف سے جو صورت حال پیدا ہوئی اس سے نمٹنے کے لئے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے دیگر صحابہ کرام کے مشورے سے "المصحف الامام" کا تصور پیش کیا۔ مطلب یہ تھا کہ لغت قریش جس میں قرآن حکیم نازل ہوا تھا، اس کے مطابق قرآن حکیم کا ایک نسخہ تیار کیا جائے اور ساری امت مسلمہ اسی نسخے کے مطابق قرآن حکیم کی تلاوت کرے۔ اور قرآن حکیم کی کتابت، طباعت اور اشاعت سب اسی نسخے کے مطابق ہوں۔

اس عظیم منصوبے کے لئے آپ نے ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے وہ مصحف مبارک منگوایا جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی نگرانی میں تیار ہوا تھا اور اس وقت حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس محفوظ تھا۔ پھر آپ نے چار صحابہ کرام کو منتخب فرمایا جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں: حضرت زید بن ثابت، حضرت عبد اللہ بن زبیر، حضرت سعید بن عاص اور حضرت عبد الرحمن بن حارث بن ہشام رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ ان حضرات میں سے حضرت زید بن ثابت کے علاوہ سب کا تعلق قبیلہ قریش سے تھا۔ آپ نے ان اصحاب کو حکم دیا کہ وہ مصحف صدیق کی مدد سے قرآن حکیم کا ایک نسخہ تیار کریں اور اگر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور تین قریشی اصحاب کے درمیان کسی لفظ پر اختلاف ہو تو قریشی حضرات کی رائے کے مطابق لکھیں کیونکہ قرآن حکیم ان ہی کی لغت کے مطابق نازل ہوا ہے۔ (1)

ان حضرات نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ارشاد کی تعمیل کی۔ ڈاکٹر محمد مصطفیٰ شلبی لکھتے ہیں:

فَلَمْ يَخْتَلِفُوْا فِيْ شَيْئٍ اِلاَّ فِيْ كَلِمَةِ التَّابُوْتِ- فَقَالَ زَيْدٌ تُكْتَبُ بِالْهَاءِ وَقَالُوْا: تُكْتَبُ بِالتَّاءِ فَعَرَضُوْا الْاَمْرَ عَلٰى عُثْمَانَ فَاَمَرَهُمْ بِكِتَابَتِهٖ بِالتَّاءِ (2)

"کلمہ "تابوت" کے سوا ان کا کسی لفظ پر اختلاف نہیں ہوا۔ اس لفظ کے بارے میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی رائے تھی کہ اسے

1۔ "مباحث فی علوم القرآن"، صفحہ 129

2۔ "اصول الفقہ الاسلامی"، جلد 1، صفحہ 96

"ۃ" سے یعنی "تابوۃ" لکھا جائے، جبکہ قریشی حضرات اس لفظ کو "ت" سے یعنی "تابوت" لکھنے کے قائل تھے۔ معاملہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپ نے اسے "ت" سے یعنی "تابوت" لکھنے کا حکم دیا۔

قارئین کرام ملاحظہ فرمائیں کہ یہاں ایک لفظ جو ایک ہی طریقے سے پڑھا جاتا ہے اور سب کے نزدیک اس کا معنی ایک ہی ہے، صرف اس کی املا میں معمولی سے فرق کو اختلاف کہا جا رہا ہے اور اس معمولی سے فرق کو اتنی اہمیت دی جا رہی ہے کہ کتابت وحی کے ماہرین اس مسئلے کو فیصلہ کے لئے امام وقت کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مصحف صدیق اور مصحف عثمانی میں کوئی قابل ذکر فرق نہ تھا۔

ان حضرات نے اس کمال احتیاط سے قرآن حکیم کا جو نسخہ تیار کیا اس کو "المصحف الامام" کا نام دیا گیا اور پھر اس کی متعدد نقلیں تیار کر کے مختلف علاقوں میں روانہ کر دی گئیں۔(1)

احتیاط کا یہ عالم تھا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے مختلف علاقوں میں صرف "المصحف الامام" کی نقلیں ہی نہیں بھیجیں بلکہ ہر مصحف کے ساتھ ایک قاری بھی روانہ فرمایا جو لوگوں کو وجوہ قراءات سکھاتا۔(2)

یہ مصاحف نقطوں اور اعراب کے بغیر تھے اس لئے ان میں ان تمام قراءات متواترہ کا احتمال تھا جو حضور ﷺ سے تواتر کے ساتھ مروی تھیں۔ بعد میں جب قرآن حکیم پر نقطے اور اعراب لگائے گئے تو ساری امت ایک ہی قراءت پر جمع ہو گئی اور آج ساری دنیا میں قرآن حکیم کی کتابت وترتیل میں کسی ایک لفظ کے اختلاف کی نشاندہی کرنا ممکن نہیں رہا۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے مختلف اطراف میں صحیفے اور قاری روانہ فرمانے کے ساتھ ساتھ یہ حکم نامہ بھی جاری فرمایا:

إِنِّیْ قَدْ صَنَعْتُ كَذَا وَكَذَا، وَمَحَوْتُ مَا عِنْدِیْ فَامْحُوْا مَا عِنْدَكُمْ (3)

"میں نے امت مسلمہ کو ایک مصحف پر جمع کرنے کے لئے لغت قریش

1۔ "مباحث فی علوم القرآن"، صفحہ 131
2۔ "اصول الفقہ الاسلامی"، جلد 1، صفحہ 96
3۔ "مباحث فی علوم القرآن"، صفحہ 130

کے مطابق ایک نسخہ تیار کروایا ہے۔ اس کے علاوہ میرے پاس جو کچھ تھا، اسے میں نے تلف کر دیا ہے لہٰذا تم بھی اس کے سوا جو کچھ تمہارے پاس ہو اس کو تلف کر دو۔"

وَتَلَقَّتِ الْاُمَّةُ ذَالِكَ بِالطَّاعَةِ (۱)

"ساری امت نے امیر المومنین حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔"

امت مسلمہ اپنے دور عروج میں کتنی وسیع الظرف تھی، اس کا اندازہ آپ اس ایک واقعہ سے لگا سکتے ہیں۔ وہ صحابہ کرام جنہوں نے حضور ﷺ کی زبان اقدس سے سن کر خدا کا کلام حفظ کیا تھا، حضور ﷺ کے سامنے ہی انہوں نے اسے تحریر بھی کیا تھا اور حضور ﷺ سے اس کی تصدیق بھی کرائی تھی، خلیفہ وقت انہیں کہہ رہا ہے کہ تمہارے پاس جو مصاحف ہیں ان کی صحت میں تو کوئی کلام نہیں لیکن امت کی مصلحت اسی میں ہے کہ ساری ملت ایک ہی صحیفے پر جمع ہو جائے اور اس کے سوا جتنے صحیفے ہیں انہیں تلف کر دیا جائے۔ پوری ملت اپنے امام کے اس فیصلے کو بسر و چشم تسلیم کرتی ہے اور کوئی ایک بھی شخص اتنے نازک فیصلے سے اختلاف نہیں کرتا۔ اتحاد اور یکجہتی کی یہی فضا تھی جس میں ملت اسلامیہ نے عروج کی منزلیں طے کیں لیکن جب وہ معمولی معمولی مسائل پر طویل بحثیں اور مجادلے کرنے لگی تو اس کی قوت منتشر ہو گئی اور وہ عظمتوں سے محروم ہو کر ذلیل و خوار ہو گئی۔

امت مسلمہ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے سے نہ صرف اتفاق کیا بلکہ اسے ضروری قرار دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ، جو اپنی اصابت رائے کی وجہ سے صحابہ کرام میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے اس کارنامے پر ان کا ردعمل یہاں نقل کرنا فائدے سے خالی نہ ہوگا:

عَنْ سُوَيْدِ بْنِ غَفْلَةَ قَالَ: قَالَ عَلِيٌّ: لَا تَقُوْلُوْا فِيْ عُثْمَانَ اِلَّا خَيْرًا فَوَاللّٰهِ مَافَعَلَ الَّذِيْ فَعَلَ فِي الْمَصَاحِفِ اِلَّا عَنْ مَّلَأٍ مِّنَّا– قَالَ: مَا تَقُوْلُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْقِرَاءَةِ؟ فَقَدْ بَلَغَنِيْ اَنَّ بَعْضَهُمْ يَقُوْلُ: اِنَّ قِرَاءَتِيْ خَيْرٌ مِّنْ قِرَاءَتِكَ وَهٰذَا يَكَادُ يَكُوْنُ كُفْرًا قُلْنَا فَمَا تَرٰى قَالَ اَرٰى اَنْ يُّجْمَعَ النَّاسُ عَلٰى

1۔ "مباحث فی علوم القرآن"، صفحہ 131

مُصْحَفٍ وَّاحِدٍ فَلَا تَكُوْنُ فُرْقَةٌ وَّلَا اِخْتِلَافٌ ' قُلْنَا: فَنِعْمَ مَا رَأَيْتَ (1)

"حضرت سوید بن غفلہ سے روایت ہے فرماتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے متعلق کوئی غلط بات مت کہو۔ خدا کی قسم، مصاحف کے سلسلہ میں انہوں نے جو کچھ کیا ہمارے مشورہ سے کیا۔ آپ نے فرمایا: مختلف قراءتوں کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ مجھے پتہ چلا ہے کہ کچھ لوگ دوسروں سے کہتے ہیں کہ میں جس قراءت سے قرآن پڑھتا ہوں یہ تمہاری قراءت سے بہتر ہے۔ یہ بات انسان کو کفر کے قریب پہنچا دیتی ہے۔ ہم نے عرض کیا آپ کی کیا رائے ہے؟ تو آپ نے فرمایا: میری رائے یہ ہے کہ تمام لوگوں کو ایک مصحف پر جمع کر دیا جائے تاکہ ہر قسم کے تفرقے اور اختلاف کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے۔ ہم نے عرض کیا: آپ کی رائے بہت عمدہ ہے۔"

گویا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے قرآن حکیم کے سلسلہ میں جو کام کیا، وہ تمام صحابہ کرام کے دلوں کی آواز تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کسی ایک نے بھی آپ کے اس اقدام سے اختلاف نہیں کیا اور "المصحف الامام" تمام ملت کے لئے معیاری صحیفہ قرار پا گیا۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی نگرانی میں جو مصحف مبارک تیار ہوا تھا وہ اب تک پوری ملت اسلامیہ میں چلا آ رہا ہے۔ اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آئی۔ حتیٰ کہ رسم الخط، جس میں "المصحف الامام" تیار ہوا تھا اس میں بھی تبدیلی نہیں آئی۔ حضرت مالک بن انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ قرآن حکیم کو جس رسم الخط میں دور عثمانی میں لکھا گیا تھا، کیا کتابت قرآن کے لئے اس سے مختلف رسم الخط استعمال کیا جا سکتا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: نہیں بلکہ قرآن حکیم کو اسی رسم الخط میں لکھا جائے جس میں پہلے کاتبین وحی نے لکھا تھا۔(2) اس مصحف میں بعد میں صرف یہ تبدیلی ہوئی کہ اس پر نقطے اور اعراب لگائے گئے۔ اس عمل کے بعد ساری قوم ایک ہی مصحف کی ایک ہی قراءت پر متفق ہو گئی اور اس میں

1۔ "مباحث فی علوم القرآن"، صفحہ 130

2۔ "اصول الفقہ الاسلامی"، جلد 1، صفحہ 96

کسی قسم کے اختلاف کا امکان باقی نہ رہا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے "المصحف الامام" کی جو نقلیں مختلف ممالک میں بھیجی تھیں، "مورس بکائیے " نے ڈاکٹر حمید اللہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان میں سے ایک کاپی تاشقند میں اور ایک استنبول میں ہے۔(1)

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بعد ہر زمانے میں ملت اسلامیہ کے خلفاء وسلاطین قرآن حکیم کی طباعت واشاعت کے لئے بھرپور کوششیں کرتے رہے۔ قرآن حکیم کی طباعت کے وقت پوری احتیاط برتی جاتی کہ اس میں کتابت کی کوئی غلطی نہ رہ جائے۔ اس طرح قرآن حکیم کی زبانی روایت بھی متصل ہے اور اس کی کتابت بھی متصل ہے۔

جمع قرآن کی تین مرحلوں میں کوششیں ہوئیں: عہد رسالت میں، عہد صدیقی میں اور عہد عثمانی میں۔ تینوں مراحل میں ایک ہی شخص، یعنی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، اس عظیم منصوبے کی روح رواں تھے۔ ایک ہی آدمی نے مختلف ادوار میں جو کام کیا اس میں اختلاف کی گنجائش کیسے ہوسکتی ہے؟

مستشرقین چونکہ تعصب کی عینک لگا کر قرآن حکیم پڑھتے ہیں، اس لئے وہ امت مسلمہ کی ان بے مثال کوششوں کو خراج تحسین پیش نہیں کرسکتے جو انہوں نے اپنے الہامی صحیفے کو محفوظ رکھنے کی غرض سے کیں۔ اس کے برعکس وہ مسلمانوں کی ان کوششوں کو باہم متضاد ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو انہوں نے حالات کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے پیش نظر مختلف ادوار میں سرانجام دیں۔ وہ یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ حضور ﷺ کے زمانہ میں قرآن حکیم جمع نہیں ہوا تھا۔ اس کو عہد صدیقی اور عہد عثمانی میں جمع کیا گیا اور جامعین نے قرآن حکیم میں ضروری ترامیم واضافے بھی کئے۔ وہ یہ تاثر دینے کی کوشش بھی کرتے ہیں کہ حضور ﷺ کے زمانے میں قرآن حکیم غیر مرتب تھا، اس کو بعد کے لوگوں نے ترتیب دیا، حالانکہ معمولی عقل وسمجھ کا آدمی بھی جانتا ہے کہ متعدد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو حضور ﷺ کی حیات طیبہ ہی میں پورا قرآن حکیم حفظ تھا اور وہ قرآن حکیم کی اول سے آخر تک تلاوت بھی کرتے تھے۔ ظاہر ہے یہ دونوں کام اس وقت تک ممکن نہیں جب تک قرآن حکیم مرتب نہ ہو۔

ہم نے گزشتہ صفحات میں جمع قرآن کے متعلق مسلمانوں کا نقطہ نگاہ پیش کیا ہے۔ ایسے مستشرقین کی تعداد بھی کم نہیں جو، اپنے ہم مذہب اور ہم مسلک مستشرقین کے رویے

1۔ "دی بائیبل، دی قرآن اینڈ سائنس"، صفحہ 138

کے برعکس، تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن حکیم حضور ﷺ کے زمانے میں ہی مدون و مرتب ہو چکا تھا اور اس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ ہم یہاں اپنے موقف کی حمایت کے لئے چند مستشرقین کے اعترافات نقل کرتے ہیں۔

روڈی پیرٹ (Rudi Paret) کہتا ہے: ہمارے لئے یہ یقین رکھنے کا کوئی سبب نہیں کہ قرآن حکیم میں کوئی آیت ایسی بھی ہے جو حضرت محمد (ﷺ) سے مروی نہیں۔(1)

"منٹگمری واٹ" اسلام پر حملے کرنے کے بہانے تلاش کرتا ہے لیکن وہ بھی، غالباً بے دلی سے، یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہے کہ ملت اسلامیہ نے اپنے الہامی صحیفے کی حفاظت کے لئے بے مثال کوششیں کیں۔ وہ لکھتا ہے:

"Muhammad continued to receive such revelations at frequent intervals. He and his followers memorized them, and they were repeated in the ritual worship or prayer which he introduced. Most of them were probably written down during Muhammad's lifetime." (2)

"محمد (ﷺ) پر مختلف وقفوں کے ساتھ وحی آتی رہی۔ آپ اور آپ کے متبعین اسے یاد کرتے اور انہیں اپنی نمازوں میں دہراتے تھے۔ غالباً وحی کا اکثر حصہ محمد (ﷺ) کی زندگی ہی میں لکھا جا چکا تھا۔"

قرآن حکیم کی ترتیب کے متعلق یہی مستشرق لکھتا ہے:

"It seems likely that to a great extent the surahs or chapters of the Quran were given their present form by Muhammad himself". (3)

"یہ بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ قرآن حکیم کی سورتوں کو موجودہ ترتیب محمد (ﷺ) نے خود دی تھی۔"

ولیم میور عیسائیت کا کٹر داعی ہی نہیں، اسلام کا زبردست دشمن بھی ہے۔ اس نے حضور ﷺ کی سیرت طیبہ اور دین اسلام پر حملے کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں

1۔ "الاستشراق والخلفیۃ الفکریہ للصراع الحضاری"، صفحہ 112
2۔ "محمد: پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین، صفحہ 16
3۔ ایضاً

دیا۔ وہ قرآن حکیم کو کلام خداوندی تسلیم کرنے کے لئے تو تیار نہیں البتہ یہ بات وہ تسلیم کرتا ہے کہ آج مسلمانوں کے ہاتھوں میں جو قرآن حکیم ہے، یہ وہی ہے جو حضرت محمد ﷺ نے ان کے سامنے پیش کیا تھا۔ محمد احسان الحق سلیمانی صاحب نے اپنی مایہ ناز تصنیف "رسول مبین" میں اس موضوع پر ولیم میور کی تحریروں کے چند اقتباسات نقل کئے ہیں۔ ہم موصوف کے شکریے کے ساتھ ان میں سے چند اقتباسات یہاں درج کرتے ہیں:

ولیم میور لکھتا ہے:

"ارکان اسلام کی بنیاد اس مقدس وحی پر ہے۔ جس کا کوئی نہ کوئی حصہ روزانہ کی نماز میں پڑھنا واجب ہے۔ نماز کے بعض ارکان میں اس "مقدس وحی" کی تلاوت فرض اور بعض میں سنت ہے اور صدر اول ہی سے مسلمانوں کا اس پر اجماع تھا جس کے احکام وہ اس مقدس وحی سے مستنبط کرتے ہیں۔ اسی ضرورت (نماز میں پڑھنے) کے لئے صدر اول کا ہر مسلمان قرآن کا کچھ نہ کچھ حصہ حفظ کر لیتا تھا جسے وہ اپنی زندگی کا گراں بہا سرمایہ سمجھتا تھا۔ عرب کے رہنے والوں کے لئے جنہیں اشعار و انساب و روایات حفظ کر لینے کی (ایام) جاہلیت سے عادت پڑی ہوئی تھی، قرآن کی آیتیں حفظ کر لینا اور بھی سہل تھا۔ مگر ہم اہل عرب کی اس مافوق العادت قوت حافظہ کے باوجود تسلیم نہیں کر سکتے کہ اسی ایک طاقت کے بل بوتے پر پورا قرآن محفوظ رہ گیا۔ بلکہ ہمارے سامنے ایسے دلائل ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت محمد (ﷺ) کے اصحاب میں اکثر افراد نے اپنے پیغمبر کی زندگی ہی میں قرآن کی متفرق سورتیں املا بھی کر رکھی تھیں جس کے مجموعے میں تقریباً سارا قرآن سمٹ آیا تھا۔" (1)

"یہ اس امر کا بین ثبوت ہے کہ قرآن کی جو آیتیں اور سورتیں مسلمانوں کے حافظے میں منقوش تھیں وہ کتابت کی شکل میں بھی مسطور ہوتی گئیں۔ پھر یہ بھی ثابت ہے کہ بدوی قبائل میں سے جو لوگ اسلام لاتے، حضرت محمد (ﷺ) ان کی تعلیم و راہبری کے لئے اپنے اصحاب میں سے ایک یا زیادہ اشخاص ان قبائل میں بھجوا دیتے اور یہ بھی ثابت ہے کہ ان مبلغین کی تحریری دستاویزوں میں قرآن بھی تحریری صورت میں موجود ہوتا۔

1۔ محمد احسان الحق سلیمانی، "رسول مبین"، (مقبول اکیڈمی لاہور، 1953)، صفحہ 185

قرآن خود بھی اپنی کتابت پر نص فرماتا ہے۔ اور کتب سیرت میں بھی اس کا ثبوت موجود ہے۔ جیسا کہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کے اسلام لانے کا واقعہ ہے کہ ان کی ہمشیرہ کی تحویل میں قرآن کی سورہ "طٰہٰ" املاشدہ شکل میں موجود تھی۔"(1)

"حضرت محمد (ﷺ) کی زندگی میں قرآن حفاظ کے سینوں اور مختلف لکھے ہوئے اجزا میں موجود تھا۔ یہ کیونکر تسلیم کر لیا جائے کہ قرآن کی ان دونوں صورتوں (حفظ و کتابت) میں تطابق نہ ہو۔ جب کہ قرآن حضرت محمد (ﷺ) کا عزیز ترین سرمایہ تھا۔ مسلمان اسے اپنے نبی کی زندگی میں خدا کا کلام سمجھتے۔ اگر کسی کو اس کے متن میں شبہ ہوتا تو فوراً رسول (ﷺ) سے مراجعہ کیا جاتا۔"(2)

جمع قرآن کے متعلق حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی کوششوں کے متعلق ولیم میور لکھتا ہے:

"زید نے ایک ایک تحریر کو سمیٹ لیا اور حفاظ قرآن کو اپنے گرد و پیش بٹھا کر دو یا تین سال میں یہی قرآن جو ہمارے ہاتھ میں ہے مرتب کیا۔ یہ نسخہ اسی ترتیب کے مطابق ہے جو زید (رضی اللہ عنہ) لکھ کر آنحضور (ﷺ) کے بالمواجہ آپ کو سنایا کرتے۔"(3)

"زید کا مرتب کیا ہوا نسخہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے حفاظت کی غرض سے اپنی صاحبزادی اور آنحضور (ﷺ) کی زوجہ محترمہ حضرت حفصہ (رضی اللہ عنھا) کی سپردگی میں دے دیا۔ تاآنکہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے زمام خلافت ہاتھ میں لی اور اسی نسخہ کو مدار صحت و کمال قرار دیا۔"(4)

"بنو امیہ اور دوستداران حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کے مناقشات کے باوجود سب اسی قرآن پر متفق رہے جسے بعد میں لوگوں نے "صحیفہ عثمانی" کا نام دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ آج تک تمام فرقے قرآن کی صیانت و عصمت پر متفق ہیں۔"(5)

"بنابریں ہم پوری طمانیت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ مصحف عثمان اور زید بن ثابت

1۔ محمد احسان الحق سلیمانی، "رسول مبین"، (مقبول اکیڈمی لاہور۔ 1953)، صفحہ 186

2۔ ایضاً

3۔ ایضاً

4۔ ایضاً

5۔ ایضاً

کے اس نسخے میں اصلاً تعارض نہ تھا جس میں زید نے قراءات کی مختلف صورتوں میں سے صرف قریش کے لہجہ کو ملحوظ رکھا۔"(1)

"قرآن کی ترتیب خود اس کی شاہد ہے کہ جامعین نے اس میں پوری دقت نظر سے کام لیا۔ اس کی مختلف سورتیں اس سادگی سے ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کر دی گئیں تھیں جن کی ترتیب دیکھ کر تصنیفاتی تکلف کا شائبہ تک نہیں ملتا۔ یہ اس امر کا بین ثبوت ہے کہ جامعین قرآن میں تصنیف کی شوخی سے زیادہ ایمان واخلاص کا جذبہ کار فرما تھا اور اسی ایمان کے ولولے میں وہ نہ صرف سورتوں اور آیتوں کی ترتیب میں بھی تصنع سے اپنا دامن بچاتے ہوئے نکل گئے۔ ہم پورے شرح صدر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ عہد عثمان میں زید بن ثابت نے قرآن کی جس صورت میں نظر ثانی کی، وہ نہ صرف حرف بحرف صحیح ہے بلکہ اس کے جمع کرنے کے موقعہ پر جو اتفاقات جمع ہوتے گئے ان کی رو سے بھی یہ نسخہ اس قدر صحیح ہے کہ نہ تو اس میں سے کوئی آیت وحی او جھل ہو سکی اور نہ جامعین نے از خود کسی آیت کو قلم انداز کیا۔ بس یہی قرآن ہے جسے شارع (علیہ السلام) نے پوری دیانت اور امانت کے ساتھ دوسروں کو سنایا۔"(2)

ولیم میور جیسے اسلام کے مخالف کے قلم سے مندرجہ بالا اعترافات کا نکل جانا، اس حقیقت کا بین ثبوت ہے کہ عصمت وصیانت قرآن ایک ایسی قوی حقیقت ہے جو دشمنوں سے بھی اپنے آپ کو منوالیتی ہے۔

مرور زمانہ کے ساتھ قرآن حکیم کے ہر قسم کے تغیر و تبدل سے محفوظ ہونے کے متعلق ڈاکٹر مورس بکائلے کے چند اقتباسات بھی ہدیہ قارئین کئے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر بکائلے لکھتے ہیں:

"Thanks to its undisputed authenticity, the text of the Quran holds a unique place among the books of revelation, shared neither by the Old nor the New Testament. In the first two sections of this work, a review was made of the alterations undergone by the Old Testament and the Gospels before they were

1۔ محمد احسان الحق سلیمانی، "رسول مبین"، (مقبول اکیڈمی لاہور، 1953)، صفحہ 186

2۔ ایضاً، صفحہ 187

handed down to us in the form we know today .The same is not true for the Quran for the simple reason that it was written down at the time of the prophet".(1)

”قرآن حکیم کا مستند ہونا ایک تسلیم شدہ مسئلہ ہے۔ اسی لئے اس کتاب کو الہامی کتابوں میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اس حیثیت میں نہ عہد نامہ قدیم اس کے ہم مثل ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے اور نہ ہی عہد نامہ جدید۔ اس کتاب کے پہلے دو ابواب میں ہم نے تفصیل سے اس بات پر بحث کی ہے کہ عہد نامہ قدیم اور انجیلوں کے ہم تک پہنچنے تک، ان میں کس طرح کی تبدیلیاں اور ترمیمات رونما ہوئی ہیں، لیکن قرآن کے متعلق یہ سمجھنا غلط ہے۔ اور اس کا سبب بالکل واضح ہے کہ قرآن حکیم پیغمبر (ﷺ) کی حیات (طیبہ) ہی میں لکھ لیا گیا تھا۔

"As the revelation Progressed, the Prophet and the believers following him recited the text by heart and it was also written down by the scribes in his following. It therefore starts off with two elements of authenticity that the Gospels do not possess. This continued up to the Prophet's death. At a time when not everybody could write, but everyone was able to recite, recitation afforded a considerable advantage because of the double checking possible when the definite text was compiled". (2)

”جب وحی کا سلسلہ آگے بڑھا تو پیغمبر (ﷺ) اور آپ کے مومن پیروکار قرآن حکیم کو زبانی پڑھتے بھی تھے اور آپ کے پیروکاروں میں سے کاتبین وحی نے اسے لکھ بھی لیا تھا۔ یہ سلسلہ پیغمبر (ﷺ) کے انتقال تک جاری رہا۔ جس زمانے میں ہر شخص لکھنا تو نہیں جانتا تھا لیکن (زبانی) تلاوت کرنا ہر شخص کے لئے ممکن تھا، اس زمانے میں زبانی تلاوت نے بہت بڑا فائدہ پہنچایا کیونکہ جب قرآن حکیم کا حتمی صحیفہ

1۔”دی بائبل، دی قرآن اینڈ سائنس“، صفحہ 133

2۔ایضاً، صفحہ 134

مرتب کیا گیا تو اس وقت وحی کی صحت کو پرکھنے کے لئے دوہرا معیار (ترتیل وکتابت) موجود تھا۔"

"Texts formally prove that long before the Prophet left Mecca for Medina (i.e Long before Hegira), the Quranic text so far revealed had been written down." (1)

"متون میں اس حقیقت کے باقاعدہ ثبوت موجود ہیں کہ ہجرت سے بہت پہلے قرآن حکیم کا جو حصہ اس وقت تک نازل ہوا تھا وہ لکھا جا چکا تھا۔"

"ڈاکٹر موریس بکائلے" قرآن حکیم کی مختلف آیات سے ثابت کرتے ہیں کہ قرآن حکیم خود اپنے مکتوب ہونے کی گواہی دے رہا ہے۔ ان کے اپنے الفاظ ملاحظہ فرمائیے:

"The Quran itself therefore provides indications as to the fact that it was set down in writing at the time of the Prophet. It is a known fact that there were several scribes in his following, the most famous of whom ,Zaid Ibn Thabit, has left his name to posterity". (2)

"قرآن حکیم خود اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اسے پیغمبر (ﷺ) کی زندگی ہی میں لکھ لیا گیا تھا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت محمد (ﷺ) کے پیروکاروں میں متعدد کاتبین وحی تھے جن میں سب سے زیادہ مشہور زید بن ثابت تھے جن کا نام بعد کی نسلوں میں بھی مشہور رہا۔"

"Not long after the Prophet's death (632), his successor Abu Bakr, the first Calif of Islam, asked Muhammad's former head scribe, Zaid Ibn Thabit, to make a copy; this he did. On Omar's initiative (the future second calif), Zaid consulted all the information he could assemble at Medina (the witness of the Hafizeen, copies of the Book wirtten on various materials belonging to private individuals). all with the object of

---

1۔ "دی بائیبل، دی قرآن اینڈ سائنس"، صفحہ 134

2۔ ایضاً، صفحہ 136

avoiding possible errors in transcription. Thus an extremely faithful copy of the Book was obtained." (1)

"حضرت محمد (ﷺ) کے انتقال کے تھوڑا ہی عرصہ بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جو مسلمانوں کے پہلے خلیفہ تھے، حضرت زید بن ثابت کو، جو حضرت محمد (ﷺ) کے کاتبین وحی میں سرفہرست تھے، حکم دیا کہ وہ قرآن حکیم کو ایک مصحف میں جمع کریں۔ حضرت زید نے یہ فریضہ سرانجام دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشورے سے حضرت زید بن ثابت نے ان تمام معلومات کا جائزہ لیا جو مدینہ بھر میں میسر آسکتی تھیں۔ یعنی آپ نے حفاظ کرام کی شہادت لی اور مختلف لوگوں کے پاس ذاتی طور پر جو نسخے محفوظ تھے ان کا جائزہ لیا۔ ان تمام احتیاطی تدابیر کا مقصد یہ تھا کہ قرآن حکیم کی کتابت میں کوئی معمولی سی غلطی بھی راہ نہ پاسکے۔ اس طرح قرآن حکیم کا ایک انتہائی قابل اعتماد نسخہ تیار ہو گیا۔

"One might perhaps ponder the motives that led the first three califs, especially uthman, to commission collections and recensions of the text. The reasons are in fact very simple: Islam's expansion in the very first decades following Muhammad's death was very rapid indeed and it happened among peoples whose native language was not Arabic. Absolutely essential steps had to be taken to ensure the spread of a text that retained its original purity: uthman's recention had this as its objective."(2)

"کوئی شخص یہ سوچ سکتا ہے کہ وہ کون سے عوامل تھے جنہوں نے اسلام کے پہلے تین خلفاء خصوصاً حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قرآن حکیم کو جمع کرنے اور نظر ثانی کی طرف مائل کیا۔ ان کے اس رویے کے محرکات بالکل واضح ہیں۔ حضرت محمد (ﷺ) کے انتقال کے بعد کی

1۔ "دی بائبل، دی قرآن اینڈ سائنس"، صفحہ 137
2۔ ایضاً

چند دہائیوں میں اسلام بہت تیزی سے پھیلا اور اس کی اشاعت زیادہ تر ان لوگوں میں ہوئی جن کی مادری زبان عربی نہ تھی۔ مسلمانوں کی اس بڑھتی ہوئی تعداد میں قرآن حکیم کی اشاعت اور اس کو اپنی اصلی حالت پر قائم رکھنے کے لئے انتہائی اہم اقدامات کی ضرورت تھی۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی نظر ثانی کے پیش نظر یہی مقاصد تھے۔"

ہم نے گزشتہ صفحات میں اپنوں اور بیگانوں کی تحریروں سے ثابت کیا ہے کہ قرآن حکیم کی حفاظت کے لئے نہ صرف سرکاری سطح پر کوششیں ہوئیں بلکہ ساری ملت اسلامیہ حفاظت قرآن کے مقدس فریضے کی تکمیل میں لگ گئی۔ ساتویں صدی عیسوی کے مسلمانوں کے لئے یہ تو ممکن نہ تھا کہ وہ قرآن حکیم کو آڈیو کیسٹوں میں ریکارڈ کرلیں یا کمپیوٹر میں فیڈ (Feed) کردیں، جن کو دور حاضر میں کسی چیز کی حفاظت کا معتبر ذریعہ سمجھا جاتا ہے لیکن انہوں نے حفاظت قرآن کے لئے ہر وہ ذریعہ بھرپور طریقے سے استعمال کیا جو ان کے زمانے میں دستیاب تھا۔ انہوں نے قرآن حکیم کی حفاظت کی کسی ایک ہی کوشش پر اکتفا نہیں کیا بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ جب حالات بدلتے گئے تو مسلمانوں نے فوراً محسوس کرلیا کہ اب حفاظت قرآن کے متعلق سابقہ ذرائع پر اعتبار کرنا مناسب نہیں بلکہ ہر زمانے کے لحاظ سے حفاظت کلام کا جو ذریعہ میسر تھا، انہوں نے اسے استعمال کیا۔ حفاظت قرآن کے سلسلے میں مسلمانوں کی یہ کوششیں صرف قرون اولیٰ کے مسلمانوں تک محدود نہ تھیں بلکہ ہر زمانے کے مسلمان اس سعادت سے بہرہ ور ہوئے ہیں۔ وہ قرآن جو کبھی پتھر کے ٹکڑوں اور چمڑے کی جھلیوں پر لکھا گیا تھا، آج اس کے رنگ برنگے نسخے دنیا سے خراج عقیدت وصول کر رہے ہیں، خوش الحان قراء کی آوازوں میں پورا قرآن حکیم آڈیو اور وڈیو کیسٹوں میں محفوظ کروڑوں مسلمانوں کے گھروں میں موجود ہے، جسے سن کر مسلمان اپنے قلب و روح کو مسرور کرتے ہیں اور مسلمانوں نے اس کتاب مبین کی حفاظت کے لئے کمپیوٹر کو استعمال کرنے میں بھی کوتاہی نہیں کی۔

یہ کتنا بڑا مزاح ہے کہ جس کتاب کی حفاظت کے لئے اتنی کوششیں کی گئیں، اس کتاب کی صحت کو تو مشکوک ثابت کرنے کی کوشش کی جائے اور وہ صحیفے جن کے لکھنے والوں کا بھی پتہ نہیں اور جن کے مختلف ایڈیشنوں میں متعدد اختلافات موجود ہیں ان

صحیفوں کو مستند الہامی کتابیں قرار دیا جائے۔

مسلمانوں کو اس بات پر بجا طور پر ناز ہے کہ انہوں نے اپنے الہامی صحیفے کی حفاظت کے لئے جو بے مثال کوششیں کی ہیں وہ صرف ان ہی کا حصہ ہیں۔ مسلمانوں کا یہ بھی ایمان ہے کہ ہر زمانے میں ملت اسلامیہ سے یہ خدمت خود رب قدوس نے لی ہے، جس نے حفاظت قرآن کو اپنے ذمہ قدرت پر لے رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے لشکروں کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ (1)

"اور کوئی نہیں جانتا آپ کے رب کے لشکروں کو بغیر اس کے۔"

وہ جس سے چاہے اپنے حکم کی تعمیل کرا سکتا ہے لیکن یہ اس کا امت مسلمہ پر کرم ہے کہ اس نے اپنے مقدس کلام کی حفاظت کا کام اپنے حبیب کے امتیوں سے لیا ہے۔ جس چیز کی حفاظت خدا فرمارہا ہے، اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرنے والے خواہ مکہ کے بت پرست ہوں خواہ یورپ کے مستشرق، وہ اپنی نامسعود مساعی میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

1۔ سورۃ المدثر: 31

قصّہ غرانیق

قصہ غرانیق

صحیح بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث درج ہے:

إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَجَدَ بِالنَّجْمِ وَسَجَدَ مَعَهُ الْمُسْلِمُوْنَ وَالْمُشْرِكُوْنَ وَالْجِنُّ وَالْإِنْسُ (1)

"حضور ﷺ نے سورہ نجم کی آیت سجدہ پر سجدہ کیا تو آپ کے ساتھ مسلمانوں، مشرکوں، جنوں اور انسانوں، سب نے سجدہ کیا۔"

اس حدیث پاک میں جس واقعہ کا ذکر ہے، اس کو مہاجرین حبشہ کی مکہ واپسی کے ساتھ منسلک کر کے ایک افسانہ گھڑا گیا کہ شیطان نے دوران تلاوت کچھ ایسے الفاظ (نعوذ باللہ) حضور ﷺ کی زبان سے نکلوا دیے جن میں بتوں کی تعریف تھی اور ان کی شفاعت کے عقیدے کو تسلیم کیا گیا تھا۔ حضور ﷺ کے رویے میں اس تبدیلی سے کفار کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ انہوں نے حضور ﷺ کے ساتھ مل کر سجدہ کیا۔ اس خبر کو سن کر مہاجرین حبشہ مکہ واپس آگئے۔ جب حضرت جبریل امین نے حضور ﷺ کو شیطان کی اس کارروائی سے آگاہ کیا تو آپ کو بہت رنج ہوا۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دینے کے لئے سورہ حج کی آیت نمبر 52 نازل فرمائی کہ شیطان اس قسم کی کارروائیاں پہلے رسولوں سے بھی کرتا رہا ہے لیکن اس کی یہ چالیں کامیاب نہیں ہوتیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کی کارروائیوں کو مٹا کر اپنی آیات کو محکم فرما دیتا ہے۔

جن لوگوں نے یہ قصہ گھڑا، انہوں نے بڑی عیاری سے اسلام پر وار کیا ہے۔ اگر اسلام کے خلاف یہ سازش صرف دشمنوں تک ہی محدود ہوتی تو کوئی بڑی بات نہ تھی۔ بد قسمتی سے یہ موضوع روایت مسلمانوں کی تصنیفات میں بھی راہ پا گئی ہے اور بعض ایسے لوگوں نے بھی اسے بیان کر دیا ہے جن کو ملت مسلمہ میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

1۔ "صحیح البخاری"، باب ما جاء فی سجود القرآن، جلد 1، صفحہ 146

مستشرقین جو شکاریوں کی طرح کسی ایسی چیز کی تلاش میں رہتے ہیں، جس کے ذریعہ وہ اسلام پر حملہ آور ہو سکیں، انہوں نے اس افسانے کو نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر قبول کیا ہے اور انہوں نے اس کو اپنی اسلام دشمن کارروائیوں میں دل کھول کر استعمال کیا ہے۔

چاہئے تو یہ تھا کہ اسلامی ادب اس قسم کی واہیات سے پاک ہوتا، لیکن جب یہ روایت سیرت اور تفسیر کی بعض کتابوں میں راہ پاگئی ہے تو اب اس کو نظرانداز کرنا ممکن نہیں ہے۔

اس لئے ہم اس افسانے کو مندرجہ ذیل زاویوں سے پرکھ کر اس کی حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

(ا) شیطان انسان کو گمراہ کرنے کے لئے کس قسم کی کارروائیاں کر سکتا ہے اور کون سے کام اس کے لئے ممکن نہیں ہیں۔

(ب) کیا حضور ﷺ کی زبان پاک سے، بحیثیت رسول، ان کلمات کا ادا ہونا ممکن ہے جو اس افسانے میں آپ کی طرف منسوب کئے گئے ہیں؟

(ج) اس افسانے میں جن مختلف واقعات کو یکجا کیا گیا ہے، کیا ان کی تاریخی حیثیت اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ انہیں ایک واقعے کی مختلف کڑیاں قرار دیا جا سکے؟

(د) اس افسانے کو جن ذرائع نے بیان کیا ہے، کیا ان میں اتنی جان ہے کہ ان گنت عقلی اور نقلی دلائل کے مقابلے میں ان پر اعتماد کیا جا سکے؟

(ہ) کیا روایت کے متن کی خامیاں اس بات کی اجازت دیتی ہیں کہ ان کی موجودگی میں اس روایت پر عقلاً اعتماد کیا جا سکے؟

(و) علمائے ملت اسلامیہ کی اکثریت نے اس افسانے کے متعلق کس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

دنیوی اور اخروی زندگی میں انسانوں کی کامیابی کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہر زمانے میں نبی اور رسول مبعوث فرمائے اور انہیں کتابوں اور صحیفوں کی شکل میں ضابطہ ہائے حیات عطا فرمائے تاکہ انسان ان ضابطوں کے مطابق زندگی گزار کر رضائے خداوندی کی منزل تک پہنچ سکیں اور جنت جو آدمیت کا مستقر اصلی ہے، جہاں سے ان کے جد اعلیٰ کو اغوائے شیطانی کے سبب نکلنا پڑا تھا، اس کی ابدی بہاروں سے دوبارہ لطف اندوز ہو سکیں۔ لیکن شیطان جو حضرت آدم علیہ السلام کی وجہ سے راندہ درگاہ ہوا تھا، اس نے قسم کھا رکھی ہے کہ وہ نسل

آدم کو اس جنت سے محروم رکھنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرے گا جس سے آدم وحوا کو نکلوانے کے لئے اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا۔

شیطان نے جب بارگاہ خداوندی سے اپنے ہمیشہ کے لئے دھتکارے جانے کا اعلان سنا تو اس نے اللہ تعالیٰ سے قیامت تک مہلت مانگی جو اسے مل گئی۔ یہ مہلت ملنے کے بعد اس نے اپنے مستقبل کے منصوبوں کا بارگاہ خداوندی میں یوں علی الاعلان اظہار کیا:

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ۝ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ (1)

"وہ بولا: اے رب! اس وجہ سے کہ تو نے مجھے بھٹکا دیا میں (برے کاموں کو) ضرور خوش نما بنا دوں گا ان کے لئے زمین میں اور میں ضرور گمراہ کروں گا ان سب کو سوائے تیرے ان بندوں کے جنھیں ان میں سے چن لیا گیا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے شیطان کے اس گستاخانہ قول کا جواب ان الفاظ میں دیا:

قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ۝ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ (2)

"فرمایا: یہ سیدھا راستہ ہے جو میری طرف آتا ہے۔ بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی بس نہیں چلتا مگر وہ جو تیری پیروی کرتے ہیں گمراہوں میں سے۔"

پروردگار عالم نے اپنے بندوں کو شیطان کی مخالفانہ چالوں سے ہوشیار رہنے کی تاکید فرمائی اور انہیں حکم دیا:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ۗ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۗ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ (3)

1۔ سورۃ الحجر: 39-40
2۔ سورۃ الحجر: 41-42
3۔ سورۃ الاعراف: 27

"اے اولادِ آدم! نہ فتنہ میں مبتلا کر دے تمہیں شیطان جیسے نکالا اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے (اور) اترو ادیا ان سے ان کا لباس تاکہ دکھلا دے انہیں ان کے پردہ کی جگہیں۔ بے شک دیکھتا ہے تمہیں وہ اور اس کا کنبہ جہاں سے تم نہیں دیکھتے ہو انہیں۔ بلاشبہ ہم نے بنا دیا ہے شیطانوں کو دوست ان کا جو ایمان نہیں لاتے۔"

اللہ تعالیٰ رحمٰن اور رحیم ہے۔ وہ اپنے برگزیدہ بندوں کو ہدایت کے ساتھ مبعوث فرماتا ہے تاکہ وہ نسل انسانی کو صراط مستقیم کی طرف بلائیں۔ خدا کے یہ برگزیدہ بندے اپنے رب کے حکم کی تعمیل میں اپنی زندگیاں وقف کر دیتے ہیں جبکہ شیطان اپنے منصوبے کے مطابق نسل انسانی کو گمراہ کرنے کے لئے اپنا ہر حربہ آزماتا ہے۔ تاریخ انسانی کے ہر دور میں حق و باطل کی مسلسل آویزش کا راز اسی حقیقت میں مضمر ہے۔ رحمانی قوتیں "خیر" کی حکمرانی کے لئے مصروف تگ و دو رہتی ہیں اور شیطانی قوتیں خیر کے شجرہ طیبہ کو جڑوں سے اکھیڑ کر "شر" کا بیج بونے کے لئے اپنے سارے وسائل بروئے کار لاتی ہیں۔

شیطان نسل انسانی کا دشمن ہے اور اس کی ساری کوششیں اور کارروائیاں اسی ایک محور کے گرد گھومتی ہیں کہ انسان خدا کی رحمت سے دور ہو کر اپنی دنیا اور آخرت کو برباد کرے اور جنت سے، جس سے اس نے آدم و حوا کو نکلوایا تھا، ان کی اولاد میں سے جتنے لوگوں کو دور رکھنا ممکن ہو، دور رکھے۔ یہ شیطان کا پروگرام ہے اور ہر انسان کو یہ حقیقت کبھی فراموش نہیں کرنی چاہئے۔

یہاں ایک بات ذہن میں رکھنی ضروری ہے۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو نسل انسانی کیلئے ایک امتحان تو بنایا ہے، لیکن اس نے شیطان کو انسانوں پر مسلط نہیں کیا کہ وہ جس طرح چاہے انہیں انگلیوں پر نچاتا رہے اور انسان اس کے مقابلے میں کچھ نہ کر سکیں۔ قرآن حکیم کی بے شمار آیات بڑی وضاحت سے شیطان کی طاقت کی حقیقت سے پردہ اٹھا رہی ہیں۔

انسان کی ہدایت اور گمراہی، زندگی اور موت، عزت اور ذلت، خوشی اور غمی، فتح و شکست، صحت اور بیماری، نفع اور نقصان، یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ نے اپنے قبضہ قدرت میں رکھی ہوئی ہیں۔ جس طرح دوسری کسی مخلوق کا ان میں سے کسی چیز پر کوئی اختیار نہیں، اسی

طرح شیطان کا بھی ان میں سے کسی چیز پر کوئی اختیار نہیں۔ انسان کے خلاف جو چیز شیطان کے حق میں جاتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ناری مخلوق ہونے کی وجہ سے انسانوں کو نظر نہیں آتا، جبکہ وہ خود انسانوں کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔

إِنَّهُ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ (1)

"بے شک دیکھتا ہے تمہیں وہ اور اس کا کنبہ جہاں سے تم نہیں دیکھتے ہو انہیں۔"

شیطان کا حربہ صرف یہ ہے کہ چھپ کر انسان کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے۔ وہ شر کو انسان کے سامنے بڑا مزین بنا کر پیش کرتا ہے اور خیر سے انسان کو دور رکھنے کے لئے، اس کے سامنے خیر کے خیالی منفی پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔ شیطان انسان کو اسی صورت میں نقصان پہنچا سکتا ہے جب انسان ہدایت ربانی کو نظر انداز کر کے شیطان کی چکنی چپڑی باتوں میں آجاتا ہے اور اسے اپنا خیر خواہ سمجھ کر اس کے اشارے پر وہ کام کر بیٹھتا ہے جو اس کے لئے تباہ کن ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم نے وضاحت کی ہے کہ شیطان انہی لوگوں کو جہنم کے راستے پر گامزن کرتا ہے، جو اس کے ساتھ رشتہ قائم کر لیتے ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے:

إِنَّمَا يَدْعُوا حِزْبَهُ لِيَكُونُوا مِنْ أَصْحٰبِ السَّعِيرِ (2)

"وہ فقط اس لئے (سرکشی) کی دعوت دیتا ہے اپنے گروہ کو تاکہ وہ جہنمی بن جائیں۔"

اسی لئے قرآن حکیم انسان کی کوتاہیوں اور گمراہیوں کو شیطان کی طرف نہیں بلکہ خود انسان کی طرف منسوب کرتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَمَا أَصٰبَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ (3)

"اور جو مصیبت تمہیں پہنچی ہے، تمہارے ہاتھوں کی کمائی کے سبب پہنچی ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں نسل آدم کو بتا دیا ہے کہ شیطان تمہارا سب سے بڑا دشمن ہے، تم اسے دشمن ہی سمجھا کرو۔ جب انسان اللہ تعالیٰ کے اس واضح حکم کے باوجود شیطان

1۔ سورۃ الاعراف: 27

2۔ سورۃ فاطر: 6

3۔ سورۃ الشوریٰ: 30

کو اپنا ہمدرد اور خیر خواہ سمجھنے لگتا ہے اور اس کے بچھائے ہوئے دام تزویر میں جان بوجھ کر پھنستا ہے، تو یہ اس کا اپنا قصور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو انسانوں پر کوئی ایسا تسلط عطا نہیں فرمایا کہ انسان نہ چاہے تو بھی شیطان جبراً اسے گمراہی کی دلدل میں پھینک دے۔ اس حقیقت کو قرآن حکیم نے بار بار بڑے واشگاف الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ "سورہ سبا" میں جہاں قرآن حکیم نے شیطان کے ہاتھوں ایک قوم کے گمراہ ہونے کا ذکر کیا ہے، وہاں واضح الفاظ میں اعلان فرمایا ہے:

وَمَا كَانَ لَهٗ عَلَيْهِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يُّؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِيْ شَكٍّ ؕ وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ (1)

"اور نہیں حاصل تھا شیطان کو ان پر ایسا قابو (کہ وہ بے بس ہوں) مگر یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ ہم دکھانا چاہتے ہیں کہ کون آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور کون اس کے متعلق شک میں مبتلا ہے۔ اور (اے حبیب!) آپ کا رب ہر چیز پر نگہبان ہے۔"

جو لوگ اپنی زندگیاں شیطان کے اشارے پر گزار کر روز محشر عذاب خداوندی کے مستحق ٹھہریں گے، شیطان ان سے مخاطب ہو کر کہے گا:

وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ (2)

"اور نہیں تھا میرا تم پر کچھ زور مگر یہ کہ میں نے تم کو (کفر) کی دعوت دی اور تم نے (فوراً) قبول کر لی میری دعوت۔ سو تم مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو۔"

مندرجہ بالا بحث سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو کوئی ایسا اختیار نہیں دیا کہ وہ زبردستی کسی انسان کو پکڑ کر گمراہی کے گڑھے میں پھینک دے۔ انسان شیطان کے نرغے میں اس وقت آتا ہے جب وہ اللہ اور اس کے رسول کے واضح ارشادات سے روگردانی کرتا ہے اور شیطان کو اپنا خیر خواہ سمجھنے لگتا ہے۔ جب انسان خدا کی بجائے

1۔ سورۂ سبا: 21

2۔ سورۂ ابراہیم: 22

شیطان کو اپنا خیر خواہ سمجھنے لگتا ہے تو شیطان اسے اپنے دام ہمرنگ زمین میں پھنسا لیتا ہے اور پھر اس سے ایسے کام کرواتا ہے جن سے وہ انسان غضب خداوندی کا مستحق ٹھہر تا ہے اور اس کی دنیا اور آخرت دونوں برباد ہو جاتی ہیں۔

اس کے برعکس جو لوگ خدا کی بتائی ہوئی صراط مستقیم پر قائم رہتے ہیں، ان کے بارے میں قرآن حکیم نے بار بار اعلان کیا ہے کہ شیطان کا ان پر بس نہیں چلتا، ارشاد خداوندی ہے:

اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (1)

"یقیناً اس کا زور نہیں چلتا ان لوگوں پر جو (سچے دل سے) ایمان لائے ہیں اور اپنے رب پر کامل بھروسہ رکھتے ہیں۔"

اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں اعلان فرمار کھا ہے:

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا (2)

"جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا غلبہ نہیں ہو سکتا اور (اے محبوب) کافی ہے تیرا رب اپنے بندوں کی کارسازی کے لئے۔"

بلکہ یہ حقیقت تو وہ ہے جس کا اقرار خود شیطان نے اس وقت کر لیا تھا جب بارگاہ خداوندی میں اس نے اپنے منصوبے کا اعلان کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ تمام نسل آدم کو گمراہ کرے گا، لیکن اس نے اپنے اس اعلان کے ساتھ یہ بھی کہا تھا:

اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ (3)

"سوائے تیرے ان بندوں کے جنہیں ان میں سے چن لیا گیا ہے۔"

قرآن حکیم کی مندرجہ بالا آیات وضاحت کر رہی ہیں کہ خدا کے وہ بندے، جن کے سینوں میں ایمان کی شمع ضوفشاں ہے، جن کے قول و عمل میں خلوص کی چاشنی ہے، جو خدا پر توکل کے سہارے گردش دوراں کا مقابلہ کرتے ہیں اور جنہیں ان کے رب نے خود "عبادی" (4) کہہ کر پکارا ہے، شیطان ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ شیطان حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سائے سے بھی بھاگتا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ جس

1۔ سورۃ النحل: 99

2۔ سورۃ بنی اسرائیل: 65

3۔ سورۃ الحجر: 40

4۔ میرے بندے

راستے سے گزر رہے ہوتے تھے، شیطان وہ راستہ چھوڑ دیتا تھا۔

کیا عقل سلیم اس بات کو تسلیم کر سکتی ہے کہ شیطان جوان بندوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، جو ایمان، خلوص اور توکل کی صفات سے متصف ہوں، کیا وہ شیطان ان نفوس قدسیہ پر غلبہ پاسکتا ہے جو دنیا میں تشریف ہی اس لئے لاتے ہیں کہ خدا کی مخلوق کو شیطان کے شر سے بچا کر خداوند قدوس کے دربار میں حاضر کریں؟ حقیقت یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات کی روشنی میں شیطان جب مذکورہ صفات سے متصف کسی بندے پر غلبہ نہیں پاسکتا تو انبیائے کرام، جو ان تمام صفات میں دوسرے لوگوں سے ممتاز ہوتے ہیں، ان پر شیطان کے غلبے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جہاں تک ہدایت کی اس روشنی کا تعلق ہے جو اللہ تعالیٰ، انبیاء ورسل کے ذریعے، اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے نازل فرماتا ہے، اس میں دخل اندازی کرنا یا اس کی روشنی کو دھندلا کرنا قطعاً شیطان کے بس سے باہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی اس روشنی کو ہر قسم کے شک وشبے سے پاک رکھنے کے لئے خصوصی انتظام فرمایا ہے۔

قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب اپنے رسولوں کو علوم غیبیہ عطا فرما کر مبعوث فرماتا ہے تو ان علوم اور ہدایت کے اس سرچشمہ کی حفاظت اس طرح فرماتا ہے:

فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۙ لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا (1)

"تو مقرر کر دیتا ہے اس رسول کے آگے اور اس کے پیچھے محافظ تا کہ وہ دیکھ لے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے ہیں۔ (در حقیقت پہلے ہی) اللہ ان کے حالات کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور ہر چیز کا اس نے شمار کر رکھا ہے۔"

ہدایت ربانی کی حفاظت کا یہ اہتمام اس وقت اور بھی سخت کر دیا گیا جب اللہ تعالیٰ کا آخری رسول، ہدایت کا آخری صحیفہ لے کر اس دنیا میں جلوہ گر ہوا۔ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ حضور ﷺ کی بعثت کے بعد آسمان پر پہرہ سخت کر دیا گیا۔ جنات پہلے تو کوئی نہ

1۔ سورۃ الجن: 28-27

کوئی ایسی جگہ تلاش کر لیتے تھے جہاں بیٹھ کر وہ آسمانوں پر ہونے والی گفتگو سن سکتے، لیکن اب ان کے لئے ایسا کرنا ممکن نہ رہا۔ اب جوں ہی وہ آسمان کی طرف جانے کی کوشش کرتے تو شہابوں کا مینہ ان پر برسنے لگتا، جس کے باعث ان کا اوپر جانا بالکل ناممکن ہو گیا۔ (1)

قرآن حکیم نے بھی اس حقیقت کو جنوں کی زبانی ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

وَاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًاۙ وَاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِؕ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا (2)

"اور سنو! ہم نے ٹٹولنا چاہا آسمان کو تو ہم نے اس کو سخت پہروں اور شہابوں سے بھرا ہوا پایا، اور پہلے تو ہم بیٹھ جایا کرتے تھے اس کے بعض مقامات پر سننے کے لئے لیکن اب جو (جن) سننے کی کوشش کرے گا تو وہ پائے گا اپنے لئے کسی شہاب کو انتظار میں۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ آسمانوں کی حفاظت کا جو یہ اہتمام بلیغ فرمایا گیا، اس کا مقصد صرف اور صرف یہی تھا، کہ آسمانی ہدایت جو انسانوں کی خاطر نازل ہونے والی تھی وہ ہر قسم کی دخل اندازیوں سے محفوظ رہے۔ اس وحی میں نہ تو جنوں اور شیطانوں کو کسی قسم کی دخل اندازی کی جرأت تھی اور نہ ہی خدا کے مقدس، عظیم اور حبیب رسول کو اپنی طرف سے اس میں کچھ تغیر و تبدل کرنے کی اجازت تھی۔ کفار مکہ نے جب حضور ﷺ سے مطالبہ کیا کہ آپ قرآن حکیم میں ردوبدل کریں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو دوٹوک الفاظ میں یہ اعلان کرنے کا حکم دیا:

قُلْ مَايَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّۚ اِنِّيْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (3)

"فرمائیے: مجھے اختیار نہیں کہ ردوبدل کر دوں اس میں اپنی مرضی سے۔ میں نہیں پیروی کرتا (کسی چیز کی) بجز اس کے جو وحی کی جاتی ہے میری طرف۔ میں ڈرتا ہوں اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں بڑے

1۔ "ضیاء القرآن"، جلد 5، صفحہ 390
2۔ سورۃ الجن: 9-8
3۔ سورۃ یونس: 15

دن کے عذاب سے۔"

کفار مکہ حضور ﷺ کو دعوت دین سے باز رکھنے کے لئے مختلف حربے استعمال کرتے تھے۔ انہوں نے اس مقصد کی خاطر حضور ﷺ کو قسم قسم کے لالچ بھی دیئے۔ وہ چاہتے تھے کہ حضور ﷺ ان کی مرضی کے مطابق قرآن حکیم میں تبدیلی کریں۔ ان کی ان کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے قرآن حکیم نے یہ پر جلال انداز اختیار فرمایا:

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّا تَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ۝ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ۝ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا (1)

"اور انہوں نے پختہ ارادہ کیا کہ وہ آپ کو برگشتہ کر دیں اس (کتاب) سے جو ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے تاکہ آپ بہتان باندھ کر (منسوب کریں) ہماری طرف اس کے علاوہ تو اس صورت میں وہ آپ کو اپنا گہرا دوست بنالیں گے اور اگر ہم نے آپ کو ثابت قدم نہ رکھا ہوتا تو آپ ضرور مائل ہو جاتے ان کی طرف کچھ نہ کچھ۔ (بفرض محال اگر آپ ایسا کرتے) تو اس وقت ہم آپ کو چکھاتے دوگنا عذاب دنیا میں اور دوگنا عذاب موت کے بعد۔ پھر آپ نہ پاتے اپنے لئے ہمارے مقابلہ میں کوئی مددگار۔"

ان آیات میں تین چیزیں بڑی وضاحت سے بیان کی گئی ہیں:

پہلی یہ کہ کفار حضور ﷺ کو اپنی دعوت کے اصولوں میں ردوبدل کرنے کے لئے بار بار مجبور کرتے تھے۔

دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی دستگیری فرمائی، آپ کو ثابت قدم رکھا اور کفار آپ کو اپنے مشن سے منحرف کرنے کی کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکے۔

اور تیسری یہ کہ اگر بفرض محال حضور ﷺ ان کے دام تزویر میں گرفتار ہو جاتے تو اس صورت میں آپ خدا کے عذاب سے نہ بچ سکتے۔

1۔ سورۂ بنی اسرائیل: 75-72

قرآن حکیم میں ایک اور جگہ اسی حقیقت کو اتنے پر جلال انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ اسے دیکھ کر انسان کانپ اٹھتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۙ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۙ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۖ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ (1)

"اگر وہ خود گھڑ کر بعض باتیں ہماری طرف منسوب کرتا تو ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے پھر ہم کاٹ دیتے اس کی رگ دل۔ پھر تم میں سے کوئی بھی (ہمیں) اس سے روکنے والا نہ ہوتا۔"

ذرا غور فرمائیے! جس کتاب کی حفاظت کے لئے خود پروردگار عالم نے اتنے انتظامات فرمائے، ان تمام راستوں کو ہی مسدود کر دیا جن کے ذریعے ابلیس اور اس کی ذریت کسی بھی حیثیت میں اس مقدس کلام میں دخل اندازی کر سکے، جس کے متعلق پروردگار عالم نے اپنے حبیب کو اتنے سخت الفاظ میں تنبیہات فرمائیں، کیا یہ ممکن ہے کہ اس کلام کی تلاوت کے دوران، شیطان حضور ﷺ کی زبان پر ایسے کلمات جاری کر دے جو اس کتاب مبین کے پیغام کی روح سے متصادم ہوں؟

یا کیا یہ ممکن ہے کہ شیطان اپنی آواز کو حضور ﷺ کی آواز کے مشابہ بنا کر یہ کلمات ادا کرے اور سامعین یہ محسوس کریں کہ یہ آواز حضور ﷺ کی ہے؟ حالانکہ یہ بات ثابت ہے کہ شیطان حضور ﷺ کی شکل اختیار نہیں کر سکتا۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اِنَّ الْاُمَّةَ اَجْمَعَتْ فِيْمَا طَرِيْقُهُ الْبَلَاغُ اَنَّهُ مَعْصُوْمٌ فِيْهِ مِنَ الْاِضْمَارِ عَنْ شَيْئٍ بِخِلَافِ مَاهُوَ عَلَيْهِ لَا قَصْدًا وَّلَا عَمْدًا وَّلَا سَهْوًا وَّلَا غَلَطًا (2)

"یعنی امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ تبلیغ کلام الٰہی میں حضور ﷺ سے ہرگز غلطی نہیں ہو سکتی نہ قصداً، نہ عمداً، نہ سہواً اور نہ غلطاً۔ اس میں نبی ہر طرح سے معصوم ہیں۔"

قرآن حکیم میں ہر قسم کی دخل اندازیوں کے تمام ممکنہ راستے مسدود کرنے کے بعد ہی پروردگار عالم نے یہ اعلان فرمایا:

1۔ سورۃ الحاقۃ: 47-44

2۔ "ضیاء النبی"، جلد 2، صفحہ 353

وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌۙ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ (1)

"اور بے شک یہ بڑی عزت (حرمت) والی کتاب ہے۔ اس کے نزدیک نہیں آسکتا باطل نہ اس کے سامنے سے اور نہ پیچھے سے۔ یہ اتری ہوئی ہے بڑے حکمت والے، سب خوبیاں سراہے کی طرف سے۔"

غرانیق والا افسانہ ان تمام آیات قرآنی کے مفہوم سے متصادم ہے۔ اس کی کوئی بھی تاویل ممکن نہیں۔ اس کی صحت کو فرض کر کے جتنی بھی تاویلیں کرنے کی کوشش کی گئی ہے، وہ ساری تاویلیں مذکورہ آیات سے کسی نہ کسی صورت میں متصادم ہیں۔ کوئی روایت خواہ اس کی سند کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو، جب وہ قرآن حکیم کی متعدد آیات سے متصادم ہے تو اصول درایت کا کوئی ضابطہ، اسے تسلیم کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کا یہ قول حق ہے:

لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ

اور اسی طرح اس ذات پاک کا یہ قول بھی برحق ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (2)

اور قصہ غرانیق کے متعلق وہ تمام روایات جو خداوند کریم کے اس واضح اعلان سے متصادم ہیں، وہ زندیقوں کی اختراع ہیں اور جن مسلمان علماء نے ان کو اپنی تصانیف میں نقل کیا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی اس خطا سے درگزر فرمائے۔

گزشتہ صفحات میں متعدد قرآنی آیات کے حوالے سے اس بات کو ثابت کیا گیا ہے کہ نہ تو شیطان کو اللہ تعالیٰ نے اتنی طاقت دے رکھی ہے کہ وہ ایسی حرکت کر سکے جس کا دعویٰ قصہ غرانیق میں کیا گیا ہے اور نہ ہی حضور ﷺ سے کسی بھی صورت میں اس قسم کے کلمات کا صدور ممکن ہے۔ کیونکہ اگر بفرض محال ایسا ہوا ہوتا تو حضور ﷺ کی تسلی و تشفی کی آیات نازل نہ ہوتیں بلکہ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ والی آیت میں جس عذاب خداوندی کا ذکر ہے، وہ حرکت میں آتا اور نہ جانے دنیا کا کیا حشر ہوتا۔

1۔ سورۂ حم السجدہ: 42-41

2۔ سورۃ الحجر: 9۔ ترجمہ: بیشک ہم نے ہی اتارا ہے اس ذکر (قرآن مجید) کو اور یقیناً ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

بڑی عجیب منطق ہے کہ حضور ﷺ سرداران قریش سے گفتگو کے دوران اپنے نابینا مگر مخلص غلام کی طرف سے معمولی اعراض فرمائیں تو بارگاہ خداوندی سے سخت الفاظ میں تنبیہ ہو، لیکن آپ اپنی زبان سے ایسے الفاظ نکالیں جو دین توحید کی بنیادیں ہلا دیں، آپ ان الفاظ کو قرآن بھی سمجھیں اور لوگوں کو بھی قرآن کی شکل میں سنائیں اور اس پر نہ غضب خداوندی جوش میں آئے اور نہ عتاب کی کوئی آیت نازل ہو بلکہ اتنی بڑی بات پر آپ کو صرف تسلی دی جائے۔ یہ بات نہ عقل تسلیم کرتی ہے اور نہ حضور ﷺ کی حیات طیبہ کے شب و روز کا مطالعہ اس بات کو تسلیم کرنے کی اجازت دیتا ہے کہ اس قسم کے الفاظ کبھی آپ کی زبان پاک سے نکل سکتے ہیں۔

جس ہستی نے مکہ میں آنکھ کھولی تھی، جہاں بت پرستی اپنے عروج پر تھی، لیکن اپنے گرد و پیش سے متاثر ہو کر، اپنے بچپن میں بھی کبھی بتوں کو اچھی نظر سے نہ دیکھا تھا، اس ہستی کے متعلق یہ مفروضہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ اس نے خدا کی طرف سے بت شکنی کا فریضہ عطا ہونے کے بعد بھی بتوں کی تعریف کی تھی۔ جس شخص کے شب و روز بتوں کی پرستش کے خلاف جدوجہد میں گزر رہے تھے، اس کی زبان سے تو حالت خواب میں بھی یا حالت بیہوشی میں بھی اس قسم کے الفاظ کا نکل جانا علم نفسیات کے اصولوں کے خلاف ہے کیونکہ عموماً حالت خواب میں بھی انسان کی زبان سے اسی قسم کے خیالات کا اظہار ہوتا ہے جو حالت بیداری میں اس کے اعصاب پر چھائے رہتے ہیں۔ اس لئے ہمیں اس بات میں ذرہ برابر شک نہیں ہے کہ حضور ﷺ کی طرف اس قصے کا انتساب غلط ہے اور خدا کے حبیب کا دامن جو ماہ تاباں سے بھی درخشندہ تر ہے، وہ اس دھبے سے مطلقاً پاک ہے۔

اب ہم اس زاویے سے اس واقعہ کو پرکھنا چاہتے ہیں کہ اس قصے میں جن واقعات کو شامل کیا گیا ہے، کیا ان کی تاریخی حیثیت اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ ان سب کو ایک دوسرے سے منسلک کیا جائے۔ وہ واقعات جن کی تاریخی حیثیت کا ہمیں جائزہ لینا ہے، ان کی تعیین کے لئے ضروری ہے کہ اس قصے کے وہ تمام پہلو سامنے ہوں جن کو اس قصے سے متعلق مختلف روایات میں بیان کیا گیا ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی تفسیر "الدر المنثور" میں ان تمام روایات کو جمع کر دیا ہے جو اس قصے کے متعلق مختلف کتابوں میں بکھری پڑی ہیں۔ ان روایات میں بے شمار

اختلافات ہیں جن پر ہم بعد میں بحث کریں گے سر دست ہم اس قصے کی تلخیص کو ان روایات کی روشنی میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ان متعدد روایات میں بکھری ہوئی تمام چیزیں یکجا ہو جائیں تاکہ ان میں مذکور واقعات کو تاریخ کے حوالے سے پرکھا جاسکے۔

تفسیر "الدر المنثور" میں مذکور اس واقعہ کے متعلق، اٹھارہ یا انیس روایات کو یکجا کیا جائے تو اس واقعے کا خلاصہ اس طرح بنتا ہے کہ:

حضور ﷺ نے خانہ کعبہ کے اندر حالت نماز میں یا نماز کے بغیر سورہ نجم تلاوت کی حتیٰ کہ آپ اس آیت پر پہنچے:

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى (1)

"(اے کفار!) کبھی تم نے غور کیا لات و عزیٰ کے بارے میں اور منات کے بارے میں جو تیسری ہے۔"

جب آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی تو شیطان نے کسی حیلے سے آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلوا دیئے:

تِلْكَ الْغَرَانِيقُ الْعُلٰى وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى

"یعنی یہ بت مرغان بلند پرواز ہیں اور ان کی شفاعت کی امید کی جاسکتی ہے۔"

حضور ﷺ کی زبان پاک سے یہ الفاظ سن کر کفار بہت خوش ہوئے اور جب اختتام سورہ پر حضور ﷺ نے سجدہ کیا تو آپ کے ساتھ مسلمانوں اور مشرکوں، سب نے سجدہ کیا۔ جب حضور ﷺ نے سجدہ سے سر اٹھایا تو کفار مکہ نے آپ کو کندھوں پر اٹھالیا۔ وہ آپ کو لے کر مکہ کے طول و عرض میں چکر لگانے لگے۔ وہ اپنی زبانوں سے مسلسل یہ نعرے بلند کر رہے تھے: یہ بنو عبد مناف کے نبی ہیں۔ یہ خبر حبشہ میں بھی پہنچ گئی اور وہاں مشہور ہو گیا کہ مکہ والوں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اس لئے حبشہ سے کئی مہاجرین مکہ واپس آگئے۔ شام کو جب حضرت جبریل حضور ﷺ کے پاس آئے تو انہوں نے آپ سے سورۂ نجم پڑھنے کے لئے کہا۔ آپ نے سورۂ نجم پڑھی اور اس میں "تلک الغرانیق العلیٰ" والے دو جملے بھی پڑھے۔ اس پر جبریل امین نے فرمایا: میں اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں نے یہ

1۔ سورۂ نجم: 20-19

جملے آپ کے سامنے پڑھے ہوں۔ اس پر حضور ﷺ بہت مغموم ہوئے اور فرمایا: (نعوذ باللہ) میں نے اللہ تعالیٰ پر افتراء کیا ہے اور ایسی بات کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمائی۔ اس حالت میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِیْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِیَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ۝ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيْلًا ۝ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ۝ (1)

"اور انہوں نے پختہ ارادہ کیا کہ وہ آپ کو برگشتہ کر دیں اس (کتاب) سے جو ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے تاکہ آپ بہتان باندھ کر (منسوب کریں) ہماری طرف اس کے علاوہ۔ تو اس صورت میں وہ آپ کو اپنا گہرا دوست بنالیں گے۔ اور اگر ہم نے آپ کو ثابت قدم نہ رکھا ہوتا تو آپ ضرور مائل ہو جاتے ان کی طرف کچھ نہ کچھ (بفرض محال اگر آپ ایسا کرتے تو) اس وقت ہم آپ کو چکھاتے دوگنا عذاب دنیا میں اور دوگنا عذاب موت کے بعد۔ پھر آپ نہ پاتے اپنے لئے ہمارے مقابلے میں کوئی مددگار۔"

بعض روایات میں ہے کہ اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے آپ پر یہ آیت نازل فرمائی:

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِیْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى (2)

"اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں جن کی شفاعت کسی کام نہیں آسکتی مگر اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ اذن دے جس کے لئے چاہے اور پسند فرمائے۔"

حضور ﷺ اس صورت حال میں سخت مغموم رہے حتی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی تسلی کے لئے یہ آیت نازل فرمائی:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِیٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى

1۔ سورۂ بنی اسرائیل: 75-73

2۔ سورۂ نجم: 26

الشَّيْطٰنُ فِیْٓ اُمْنِیَّتِهٖ فَیَنْسَخُ اللّٰهُ مَا یُلْقِی الشَّیْطٰنُ ثُمَّ یُحْكِمُ اللّٰهُ اٰیٰتِهٖ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ (1)

"اور نہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول اور نہ کوئی نبی مگر اس کے ساتھ یہ ہوا کہ جب اس نے پڑھا تو ڈال دیئے شیطان نے اس کے پڑھنے میں (شکوک) پس مٹا دیتا ہے اللہ تعالیٰ جو دخل اندازی شیطان کرتا ہے، پھر پختہ کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی آیتوں کو اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا بہت دانا ہے۔"

جب کفار مکہ کو معلوم ہوا کہ حضور ﷺ نے بتوں کی تعریف میں جو الفاظ کہے تھے، ان کو شیطانی کارروائی کہہ کر ان سے براءت کا اعلان کر دیا گیا ہے، تو انہوں نے مسلمانوں کے خلاف ظلم وستم کی وہ کارروائیاں دوبارہ شروع کر دیں جو اس واقعہ کی وجہ سے عارضی طور پر رک گئی تھیں۔

ہم مندرجہ بالا افسانے کو غور سے دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس میں مندرجہ ذیل واقعات کو زمانے کے حساب سے یکجا کر دیا گیا ہے۔

1۔ سورۂ نجم کا زمانہ نزول کیونکہ اسی کے نزول کے وقت ان شیطانی کلمات کی ادائیگی کا دعویٰ کیا گیا ہے۔

2۔ حبشہ کے مہاجرین کی واپسی، کیونکہ اسی واقعہ کو ان کی واپسی کا سبب قرار دیا گیا ہے۔

3۔ سورۂ بنی اسرائیل کا زمانہ نزول، کیونکہ آیت وَاِنْ كَادُوْا لَیَفْتِنُوْنَكَ الایہ، جس کے اس واقعہ کے دوران نازل ہونے کا ذکر ہے وہ آیت سورۂ بنی اسرائیل کی ہے۔

4۔ سورۂ حج کا زمانہ نزول کیونکہ آیت وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ الایۃ" سورۂ حج کی ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس آیت کے نزول کے ذریعے اعلان کیا گیا ہے کہ تِلْكَ الْغَرَانِیْقُ الْعُلٰی الخ والے کلمات شیطانی آمیزش تھے، انہیں منسوخ کر دیا گیا ہے اور اس طرح حضور ﷺ کو تسلی دی گئی کہ شیطان اس قسم کی حرکتیں پہلے انبیائے کرام سے بھی کرتا رہا ہے۔

معتبر تاریخی روایات کی رو سے ہجرت حبشہ 5 بعد بعثت واقع ہوئی اور مہاجرین حبشہ کا

1۔ سورۃ الحج: 52

ایک گروہ مصالحت کی افواہ سن کر تین مہینے بعد واپس آگیا تو مہاجرین حبشہ کی واپسی 5 بعد بعثت تقریباً شوال کے مہینے میں عمل میں آئی۔ (1)

سورۃ نجم کا زمانہ نزول بھی بعض مصنفین نے رمضان 5 بعد بعثت کو قرار دیا ہے، لیکن اس سال کو سورۃ نجم کا زمانہ نزول قرار دینے کے لئے ان کا اعتماد اسی روایت پر ہے جس میں مہاجرین حبشہ کی واپسی کو اس واقعے کے ساتھ منسلک کیا گیا ہے کہ کفار مکہ نے حضور ﷺ کے ساتھ مل کر سجدہ کیا یہ خبر حبشہ پہنچی تو مہاجرین یہ سمجھ کر مکہ واپس آگئے کہ کفار مکہ نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ جن روایات میں مہاجرین حبشہ کی واپسی کو کفار کے سجدہ کے ساتھ منسلک کیا گیا ہے، ان روایات میں تِلْكَ الْغَرَانِيقُ الْعُلٰى جیسا جھوٹا افسانہ بھی ہے۔

5 بعد بعثت کو سورۃ نجم کا زمانہ نزول قرار دینا کسی طرح سے بھی صحیح نہیں ہے۔

خود اس سورۃ کے مضامین اس قول کی تردید کرتے ہیں کہ اس کا نزول بعثت کے پانچویں سال میں ہوا کیونکہ اس سورۃ کی ابتدائی آیتوں میں معراج النبی ﷺ کا تذکرہ ہے خصوصاً

عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ‎﴿﴾‏ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى (2)

"سدرۃ المنتہیٰ کے پاس۔ اس کے پاس ہی جنت الماویٰ ہے۔"

یہ دو آیتیں اس امر پر قطعی دلالت کرتی ہیں کہ اس سورۃ کے ابتدائی حصہ میں ان احوال کا بیان ہے جو سفر معراج میں پیش آئے۔ کیونکہ علی اختلاف الروایات، وہاں جبریل امین کا دیدار ہوا ہو یا رویت باری کا شرف حاصل ہوا ہو، یہ رویت بہرحال سدرۃ المنتہیٰ کے مقام پر ہوئی اور سدرۃ المنتہیٰ پر حضور ﷺ کی معراج کی رات میں ہی تشریف آوری ہوئی ہے، اس سے پہلے نہیں ہوئی اور معراج کے بارے میں محدثین کا اتفاق ہے کہ یہ واقعہ ہجرت سے ایک یا ڈیڑھ سال قبل وقوع پذیر ہوا۔ اس لئے وہ سورۃ جس میں ایسا واقعہ مذکور ہے جو نبوت کے دسویں یا گیارہویں سال رونما ہوا، اس سورۃ کا نزول نبوت کے پانچویں سال کیونکر متصور ہو سکتا ہے۔ (3)

اگر سورہ نجم کا زمانہ نزول واقعہ معراج کے بعد قرار دیا جائے، جیسے کہ اس سورۃ کے مضامین تقاضا کرتے ہیں، تو قصہ غرانیق کے افسانے کا تانا بانا ہی ادھڑ جاتا ہے کیونکہ یہ کیسے

1۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی "سیرت سرور عالم"، (ترجمان القرآن لاہور، 1979)، جلد 2، صفحہ 574

2۔ سورۃ النجم: 15-14

3۔ "ضیاء القرآن"، جلد 5، صفحہ 6

ممکن ہے کہ جو واقعہ دس یا گیارہ نبوی میں پیش آیا، اس کی خبر سن کر مہاجرین حبشہ اس واقعہ کے پیش آنے سے چھ سال پہلے حبشہ سے مکہ واپس لوٹ آئے ہوں۔

اسی واقعے کے ضمن میں دو اور آیتوں کے نازل ہونے کا بھی ذکر ہے: ایک سورۂ بنی اسرائیل کی آیت وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ الایہ، ہے اور دوسری وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ الایہ ہے۔

پہلی آیت کو اس واقعے کے ضمن میں درج کرنے کی وجہ سمجھ نہیں آتی۔ بعض لوگوں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس آیت میں حضور ﷺ کو تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى والے الفاظ کو وحی سمجھنے پر تنبیہ کی گئی ہے حالانکہ اس آیت کریمہ میں کسی قسم کے عتاب یا تنبیہ کا ذکر نہیں بلکہ یہ آیت تو اس بات کی وضاحت کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو ہر حال میں ثابت قدم رکھا اور کفار کی طرف سے آپ کو متزلزل کرنے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔

بہر حال یہ آیت افسانہ غرانیق کی کئی روایات میں درج ہے جبکہ اس کا تعلق سورہ بنی اسرائیل سے ہے اور سورہ بنی اسرائیل واقعہ معراج کے بعد نازل ہوئی۔ اور معراج کا زمانہ 11 یا 12 بعد بعثت ہے۔ اگر عتاب والے قول میں کچھ وزن ہو بھی تو یہ بات کتنی عجیب ہے کہ جو بے قاعدگی 5 بعد بعثت سرزد ہوئی، اس پر عتاب 12 بعد بعثت میں ہو رہا ہے۔

سب سے حیران کن بات یہ ہے کہ قرآن حکیم کی جس آیت کی تفسیر کے طور پر یہ افسانہ گھڑا گیا ہے، یعنی وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ الایہ، وہ آیت سورۂ حج کی ہے جو مدنی ہے اور اس کا سیاق و سباق بتا رہا ہے کہ یہ 1ھ میں نازل ہوئی ہے۔ قصہ غرانیق کی اکثر روایات میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اس آیت کے ذریعے حضور ﷺ کو تسلی دی گئی اور اس آیت کے نازل ہونے کے بعد ہی حضور ﷺ کا غم دور ہوا، جس میں آپ اس سانحہ کی وجہ سے مبتلا ہوئے تھے۔

اگر سورۂ نجم کا زمانہ نزول 5 بعد بعثت تسلیم کیا جائے تو تاریخی نقطہ نگاہ سے اس واقعہ کی تفصیل یہ بنتی ہے کہ 5 بعد بعثت (نعوذ باللہ) حضور ﷺ کی زبان پر شیطان نے تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى کے الفاظ جاری کئے۔ اسی شام حضرت جبریل امین نے تو اس سے اپنی براءت کا اعلان کر دیا اور حضور ﷺ اس لغزش کے سبب غم کی اتھاہ وادی میں ڈوب گئے۔

یہ سلسلہ آٹھ نو سال تک چلتا رہا حتی کہ 1ھ میں سورہ حج نازل ہوئی، جس میں آیت، وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ الایہ، نازل ہوئی اور حضور ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا گیا کہ قرآن حکیم میں یہ آمیزش القائے شیطانی سے ہو گئی تھی جسے اللہ تعالیٰ نے اب منسوخ فرمادیا ہے۔

کیا کوئی صاحب عقل سلیم اس قسم کی تاریخ کو تسلیم کر سکتا ہے؟ سچ ہے، "دروغ گو را حافظہ نہ باشد" جن لوگوں نے یہ افسانہ تراشا ہے وہ یہ بھول گئے ہیں کہ اس کی مختلف کڑیوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے۔

اب ہم اس روایت کو اس کی اسناد کے اعتبار سے دیکھتے ہیں، کہ وہ روایت جو دین کے بنیادی اصولوں سے متصادم ہے اور بے شمار قرآنی آیات کی مخالفت کر رہی ہے، کیا اس کی اسناد میں اتنی جان ہے کہ اسے قابل اعتناء سمجھا جا سکے؟

اس واقعے کو جس طرح روایات میں بیان کیا گیا ہے، اگر یہ ایسے ہی پیش آیا ہوتا تو یہ واقعہ مکہ کا ایک تاریخی واقعہ ہوتا اور زبان زد خاص و عام ہوتا، متعدد صحابہ کرام اسے بیان کرتے لیکن اس قصے کو بیان کرنے والی روایات کی اسناد سے پتہ چلتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنھما کے علاوہ، اور کسی بھی صحابی سے مروی نہیں۔ ساتھ ہی تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنھما کی عمر ہجرت کے وقت صرف تین سال تھی۔ گویا 5 بعد بعثت جب ان روایات کے مطابق یہ واقعہ پیش آیا، اس وقت ابھی آپ کی ولادت ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے یہ بات تو ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ آپ اس واقعہ کے عینی شاھد نہ تھے۔ یہ واقعہ اختراع کرنے والوں کو یہ خیال بھی نہیں آیا کہ وہ یہ غور کر لیں کہ جس سال وہ اس واقعہ کے وقوع پذیر ہونے کو بیان کر رہے ہیں، اس سال اس صحابی کی ولادت بھی ہو چکی تھی یا نہیں جس کی طرف وہ اس واقعے کو منسوب کر رہے ہیں۔ جن روایات میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے، ان کی سند کی حیثیت کیا ہے، اس سلسلے میں ہم چند علمائے محققین کی آراء پیش کرتے ہیں تا کہ ان روایات کی سند کی حیثیت میں کسی قسم کا اشتباہ باقی نہ رہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے ان روایات کو کثرت اسانید کی وجہ سے قبول کیا ہے۔ جن میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے ان روایات کی اسانید کے

متعلق وہ بھی یہ اعتراف کرتے ہیں: "ان روایات کی تمام اسانید ہر چند کہ ضعف، انقطاع اور ارسال سے خالی نہیں لیکن چونکہ یہ روایت متعدد اسانید سے منقول ہے اس لئے اس کی کثرت اسانید سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی کوئی نہ کوئی اصل ہے۔" (1)

علامہ ابن حجر کا مقام علم حدیث میں بہت بلند ہے۔ ہم ان کی گرد راہ کو بھی نہیں پہنچ سکتے لیکن یہاں یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ ایک روایت جس کو تسلیم کرنا عقلاً محال ہے اور جس کی تمام اسانید میں خود بقول ان کے ضعف، انقطاع اور ارسال جیسی علتیں موجود ہیں، صرف کثرت اسانید سے اس کی اصل کیسے ثابت ہو جاتی ہے؟ کیا کثرت اسانید اور ان سب کے مرسل، منقطع یا ضعیف ہونے کی وجہ سے یہ بات زیادہ قرین قیاس معلوم نہیں ہوتی کہ جن لوگوں نے اس قصہ کو تراشا ہے، انہوں نے بڑی ہوشیاری سے اس کے لئے متعدد اسانید بھی وضع کر دی ہیں تا کہ ان کی کثرت کو دیکھ کر لوگ یہ محسوس کرنے لگیں کہ اس کی کچھ نہ کچھ اصل ضرور ہو گی؟

اکثر علمائے محققین نے بڑے پرزور طریقے سے ان روایات کو غلط ثابت کیا ہے۔ ہم یہاں چند بزرگوں کی آراپیش کرتے ہیں۔ امام بیہقی جن کا علم حدیث کے اکابر میں شمار ہوتا ہے وہ فرماتے ہیں۔

هٰذِهِ الْقِصَّةُ غَيْرُ ثَابِتَةٍ مِنْ جِهَةِ النَّقْلِ (2)

"یہ قصہ ازروئے نقل ثابت نہیں ہے۔"

قاضی عیاض فرماتے ہیں:

اِنَّ هٰذَا حَدِيْثٌ لَمْ يُخْرِجْهُ اَحَدٌ مِّنْ اَهْلِ الصِّحَّةِ وَلَا رَوَاهُ ثِقَةٌ بِسَنَدٍ سَلِيْمٍ مُتَّصِلٍ وَاِنَّمَا اَوْلَعَ بِهٖ وَبِمِثْلِهِ الْمُفَسِّرُوْنَ وَالْمُؤَرِّخُوْنَ وَالْمُوْلَعُوْنَ بِكُلِّ غَرِيْبٍ...... وَمَنْ حُكِيَتْ عَنْهُ هٰذِهِ الْمَقَالَةُ مِنَ الْمُفَسِّرِيْنَ وَالتَّابِعِيْنَ لَمْ يُسْنِدْهَا اَحَدٌ مِّنْهُمْ وَلَا رَفَعَهَا اِلٰى صَحَابِيٍّ وَاَكْثَرُ الطُّرُقِ عَنْهُمْ فِيْهَا ضَعِيْفَةٌ وَاهِيَةٌ (3)

1۔ غلام رسول سعیدی، "شرح صحیح مسلم"، (فرید بک سٹال لاہور، 1988ء)، جلد 2، صفحہ 158

2۔ الدکتور الشیخ محمد بن محمد ابو شھبہ، "الاسرائیلیات والموضوعات فی کتب التفسیر"، (مکتبہ السنہ قاہرہ، 1408ھ) صفحہ 315

3۔ ایضاً

"اس حدیث کو کتب صحاح کے مصنفین میں سے کسی نے بیان نہیں کیا اور نہ ہی ثقہ راویوں نے اس کو صحیح اور متصل سند سے روایت کیا ہے۔ اس قصہ کو بعض مورخین، مفسرین اور ایسے لوگوں نے بیان کیا ہے جو ہر عجیب و غریب بات کو اپنی تحریروں میں بیان کر دیتے ہیں......اور جن مفسرین اور تابعین سے یہ قصہ مروی ہے، ان میں سے کسی نے بھی اس کو کسی صحابی سے متصل سند کے ساتھ روایت نہیں کیا۔ اکثر طرق جن سے یہ قصہ مروی ہے وہ ضعیف اور فضول ہیں۔"

قاضی عیاض رحمتہ اللہ علیہ نے اس روایت کی ایک ایک سند کی دھجیاں بکھیری ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس روایت کی صرف ایک سند مرفوع ہے جو یہ ہے: شعبہ عن ابی البشر عن سعید بن جبیر عن ابن عباس فیما احسب...... قاضی عیاض ابو بکر بزار کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ اس روایت کو مذکورہ سند کے بغیر کسی متصل سند سے روایت نہیں کیا گیا۔ اس سند میں "فیما احسب" (1) کے الفاظ خود اس کو کمزور کر رہے ہیں۔ کیونکہ یہ الفاظ حدیث کے متصل ہونے میں شک کا اظہار کر رہے ہیں اور اس شک کی موجودگی میں نہ اس پر اعتماد ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کی کوئی حقیقت ہے۔

قاضی عیاض فرماتے ہیں اس روایت کی ایک سند، کلبی عن ابی صالح عن بن عباس بھی متعارف ہے لیکن وہ فرماتے ہیں:

وَاَمَّا حَدِیْثُ الْکَلْبِیْ فَمِمَّا لاَ یَجُوْزُ الرِّوَایَۃُ مِنْہُ وَلاَ ذِکْرُہٗ لِقُوَّۃِ ضُعْفِہٖ وَکِذْبِہٖ (2)

"جہاں تک کلبی کی حدیث کا تعلق ہے، تو کلبی تو ایسا شخص ہے جس کے ضعف اور کذب کی وجہ سے، نہ تو اس سے روایت جائز ہے اور نہ ہی اس کا ذکر کرنا صحیح ہے۔"

قاضی ابو بکر ابن عربی نے ازروئے نقل اس قصے پر شدید تنقید کی ہے۔(3)

مشہور حافظ حدیث محمد بن اسحاق بن خزیمہ سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں

1۔ ترجمہ: میرا خیال ہے

2۔ "الاسرائیلیات والموضوعات"، صفحہ 315

3۔ ایضاً

نے فرمایا:هٰذَا مِنْ وَّضْعِ الزَّنَادِقَةِ کہ یہ قصہ زندیقوں کی اختراع ہے، انہوں نے اس کی تردید میں ایک کتاب بھی لکھی۔(1) امام ابو المنصور الماتریدی نے بھی اس قصہ کو موضوع قرار دیا ہے اور فرمایا ہے:

تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى مِنْ جُمْلَةِ اِيْحَاءِ الشَّيْطٰنِ اِلٰى اَوْلِيَآئِهٖ مِنَ الزَّنَادِقَةِ حَتّٰى يُلْقُوْا بَيْنَ الضُّعَفَاءِ وَاَرِقَّاءِ الدِّيْنِ لِيَرْتَابُوْا فِيْ صِحَّةِ الدِّيْنِ! وَالرِّسَالَةُ بَرِيْئَةٌ مِنْ مِثْلِ هٰذِهِ الرِّوَايَةِ (2)

"تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى والا افسانہ ان باتوں میں سے ہے جو شیطان ان زندیقوں کے دلوں میں ڈالتا ہے جو اس کے ساتھی ہیں تاکہ وہ انہیں کمزور ایمان والوں میں پھیلائیں اور ان کی نظر میں دین کو مشکوک بنائیں۔ جناب رسالت مآب ﷺ اس قسم کی فضول روایات سے بری الذمہ ہیں۔"

سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس روایت کی جملہ اسناد کو ناقدین حدیث کی نظر میں یہ حیثیت حاصل ہے، اس پر کیسے اعتماد کیا جاسکتا ہے، خصوصاً جبکہ وہ متعدد آیات قرآنی سے متصادم بھی ہو۔

قصہ غرانیق کو بیان کرنے والی روایات کی صرف اسناد ہی ناقابل اعتماد نہیں بلکہ ان روایات کے متن کی بھی یہی حالت ہے۔ ان روایات کے متن میں انتہائی اضطراب ہے کہ اس اضطراب کی موجودگی میں، ان روایات کو کوئی وقعت نہیں دی جاسکتی۔

کسی روایت میں ہے کہ حضور ﷺ کی زبان پاک سے یہ الفاظ حالت نماز میں نکلے اور کچھ روایات کہتی ہیں کہ حضور ﷺ اپنی قوم سے مخاطب تھے، جب یہ الفاظ آپ کی زبان پر جاری ہوئے۔ کسی روایت میں ہے کہ آپ پر اونگھ طاری ہوگئی اور اس حالت میں آپ کی زبان پاک سے یہ الفاظ نکلے اور کوئی روایت کہتی ہے کہ حضور ﷺ کے دل میں کوئی خیال پیدا ہوا اور بھول کر آپ نے یہ الفاظ کہہ دیئے۔ کوئی روایت کہتی ہے کہ شیطان نے آپ کی آواز میں یہ الفاظ خود کہے اور کوئی روایت کہتی ہے کہ شیطان نے کافروں کو بتایا کہ حضور

1۔ "الاسرائیلیات والموضوعات"، صفحہ 316

2۔ ایضاً

ﷺ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے ہیں۔

وہ الفاظ جن کے بارے میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ وہ شیطان نے آپ کی زبان پر جاری کئے، وہ بھی تقریباً ہر روایت میں مختلف ہیں۔ امام جلال الدین سیوطی کی جمع کردہ روایات کی مدد سے ہم ان مختلف کلمات کے چند نمونے یہاں نقل کرتے ہیں۔

کسی روایت میں ہے:

اِنَّھُنَّ لَفِی الْغَرَانِیْقِ الْعُلٰی وَاِنَّ شَفَاعَتَھُنَّ لَتُرتَجٰی

کسی روایت میں ہے:

تِلْكَ الْغَرَانِیْقُ الْعُلٰی وَاِنَّ شَفَاعَتَھُنَّ لَتُرتَجٰی

کسی روایت میں ہے:

اِنَّ تِلْكَ الْغَرَانِیْقَ الْعُلٰی مِنْھَا الشَّفَاعَةُ تُرتَجٰی

کسی روایت میں صرف یہ الفاظ ہیں:

اِنَّھُنَّ الْغَرَانِیْق الْعُلٰی

کسی روایت میں صرف یہ الفاظ ہیں:

اِنَّ شَفَاعَتَھُنَّ تُرتَجٰی

کسی روایت میں ہے:

وَاِنَّھُنَّ لَھُنَّ الْغَرَانِیْقُ الْعُلٰی وَاِنَّ شَفَاعَتَھُنَّ لَھِیَ الَّتِیْ تُرتَجٰی

کسی روایت ہے:

تِلْكَ الْغَرَانِیْقُ الْعُلٰی مِنْھَا الشَّفَاعَةُ تُرتَجٰی

کسی روایت میں ہے:

تِلْكَ الْغَرَانِیْقُ الْعُلٰی وَشَفَاعَتُھُنَّ تُرتَضٰی وَمِثْلُھُنَّ لَا یُنْسٰی

کسی روایت ہے:

وَھِیَ الْغَرَانِیْقُ الْعُلٰی وَشَفَاعَتُھُنَّ تُرتَجٰی

کسی روایت میں ہے:

وَاِنَّ شَفَاعَتَھَا لَتُرتَجٰی وَاِنَّھَا لَمَعَ الْغَرَانِیْقِ الْعُلٰی

کسی روایت میں ہے:

تِلْكَ اِذَنْ فِي الْغَرَانِيْقِ الْعُلٰى تِلْكَ اِذَنْ شَفَاعَةٌ تُرْتَجٰی

کسی روایت میں ہے:

تِلْكَ الْغَرَانِقَةُ الْعُلٰى وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ تُرْتَجٰی

صرف یہی نہیں کہ مختلف روایات میں یہ الفاظ مختلف مذکور ہیں بلکہ ایک اور حیران کن بات یہ ہے کہ اکثر روایات میں تو یہ ہے کہ یہ الفاظ سورہ نجم کی ان آیات کے بعد حضور ﷺ کی زبان پر جاری ہوئے:

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى

لیکن ایک روایت ایسی بھی ہے جو کہتی ہے کہ یہ الفاظ اس سے ایک اور آیت بعد یعنی تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى کے بعد آپ کی زبان پر جاری ہوئے۔ ان روایات کا یہ اضطراب تو ان کے موضوع ہونے کا واضح اعلان کر رہا ہے نہ کہ تعدد طرق ان کی اصلیت ثابت کر رہا ہے۔(1)

یہ قصہ نقلاً بھی نا قابل اعتبار بلکہ دو ٹوک الفاظ میں مسترد کر دینے کے قابل ہے اور عقلاً بھی اس کو تسلیم کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اول تو حضور ﷺ کی عصمت اور الہامی ہدایت کی حفاظت کے خدائی انتظامات، جن کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہوا ہے، ان کی موجودگی میں اس قسم کے الفاظ کا حضور ﷺ کی زبان پاک سے ادا ہونا ممکن ہی نہیں۔ معمولی عربی جاننے والا شخص بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ الفاظ اسلام کے عقیدہ توحید سے متصادم ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ مشرکین نے تو یہ کلمات سنتے ہی فوراً سمجھ لیا ہو کہ حضور ﷺ نے اسلام سے منہ موڑ کر اپنے آبائی دین کی طرف رجوع کر لیا ہے، لیکن نہ خود حضور ﷺ نے اتنی بڑی بات کو محسوس کیا ہو اور نہ ہی صحابہ کرام میں سے کسی نے اتنی بڑی بات کی نشاندہی کی ہو اور اس وقت تک حضور ﷺ کو اتنے بڑے سانحے کا علم ہی نہ ہوا ہو جب تک حضرت جبریل امین نے آکر آپ کو متنبہ نہ کیا ہو؟ کیا اس واقعے کے وقت سب ایمان دار سو رہے تھے یا ان سب پر عالم بیہوشی طاری تھا؟

خدا کا کلام تو مخلوق کے کلام سے ممتاز ہوتا ہے۔ ولید بن مغیرہ وغیرہ سرداران عرب کفر کے باوجود قرآن حکیم کو دوسرے کلاموں سے ممتاز کر لیتے تھے، کیا حضور ﷺ (نعوذ باللہ) شیطان کے کلام کو خدا کے کلام سے ممتاز نہ کر سکے؟

1۔ مذکورہ بالا اختلافات کی نشاندہی کے لئے ہم نے "الدر المنثور"، جلد چہارم صفحہ 67-366 پر مذکور روایات کا تجزیہ کیا ہے۔

خود اس قصے میں ایک ایسی شہادت موجود ہے جو اس کے بطلان کو ثابت کر رہی ہے۔
اس قصے کو بیان کرنے والی روایات کہتی ہیں کہ اس واقعے کے دوران یہ آیات نازل ہوئیں:

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ۝ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ۝ (1)

"اور انہوں نے پختہ ارادہ کیا کہ وہ آپ کو برگشتہ کر دیں اس (کتاب) سے جو ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے تاکہ آپ بہتان باندھ کر (منسوب کریں) ہماری طرف اس کے علاوہ تو اس صورت میں وہ آپ کو اپنا گہرا دوست بنالیں گے۔ اور اگر ہم نے آپ کو ثابت قدم نہ رکھا ہوتا تو آپ ضرور مائل ہو جاتے ان کی طرف کچھ نہ کچھ۔"

یہ آیتیں اس قصے کا انکار کر رہی ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرما رہا ہے کہ کفار مکہ نے آپ کو بتلائے فتنہ کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ حضور ﷺ کو ثبات اور استقامت عطانہ فرماتا تو قریب تھا کہ آپ ان کی طرف مائل ہو جاتے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو محفوظ رکھا، آپکو استقامت عطا فرمائی اور آپ ان کی طرف مائل ہونے کے قریب بھی نہ گئے۔ گویا یہ آیات اعلان کر رہی ہیں کہ خدائی حفاظت کے سبب کفار کی باتوں کی طرف مائل ہونا تو دور کی بات ہے، آپ تو ان کی طرف مائل ہونے کے قریب بھی نہ گئے۔

جن روایات میں یہ افسانہ بیان کیا گیا ہے، وہ حضور ﷺ پر صرف کفار کی طرف مائل ہونے کا الزام نہیں لگا رہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ بھی کہہ رہی ہیں کہ حضور ﷺ نے غیر قرآن کو قرآن کہا اور بتوں کی تعریف کی۔ یہ افسانہ مذکورہ بالا آیات کے مفہوم سے متصادم ہے۔ یہ روایات تو حضور ﷺ پر یہ الزام لگا رہی ہیں کہ آپ نے بتوں کی تعریف کی حالانکہ ثقیف اور قریش نے ایک بار حضور ﷺ کو پیش کش کی تھی کہ آپ صرف ان کے بتوں کی طرف رخ کریں تو وہ مسلمان ہو جائیں گے، لیکن حضور ﷺ نے ان کی اس پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا۔ (2) کیا اس تضاد کو عقل سلیم تسلیم کر سکتی ہے؟

1۔ سورۂ بنی اسرائیل: 74-73
2۔ "الاسرائیلیات والموضوعات"، صفحہ 320

اگر یہ واقعہ پیش آیا ہوتا تو جہاں کفار خوش ہوئے تھے وہاں حضور ﷺ کے گرد جتنے مسلمان جمع تھے وہ اسلام سے کنارہ کش ہو جاتے۔ انہیں نہ ان کلمات کی یہ وضاحت مطمئن کر سکتی کہ یہ شیطان کی کارروائی تھی اور شیطان پہلے نبیوں کے ساتھ بھی یہی کرتا رہا ہے اور نہ ہی اس کی کوئی اور تاویل انہیں مطمئن کر سکتی۔ وہ سوچتے کہ جب الہامی ہدایت ہی شیطانی دخل اندازی سے محفوظ نہیں اور خود رسول اللہ ﷺ بھی وحی ربانی اور القائے شیطانی میں تمیز نہیں کر سکتے تو پھر حق کے حق ہونے پر کس طرح اعتماد کر لیا جائے۔

وہ لوگ اسلام کی خاطر جو قربانیاں دے رہے تھے، وہ قوت یقین کے بغیر ممکن ہی نہ تھیں۔ جب اس قسم کے واقعے سے یقین متزلزل ہو جاتا تو نہ تو وہ اسلام کی خاطر قربانیاں دے سکتے اور نہ اسلام پر قائم رہنا ان کے لئے ممکن ہوتا۔ اس واقعے کی بنا پر کسی ایک مسلمان کی طرف سے کسی قسم کے احتجاج کا ظاہر نہ ہونا، اس حقیقت کا ناقابل تردید ثبوت ہے کہ یہ واقعہ بے اصل ہے اور اسے اسلام دشمن قوتوں نے اسلام کو نقصان پہنچانے کے لئے گھڑا ہے۔

ابن ابی حاتم نے سدی کی روایت سے، جو واقعہ بیان کیا ہے، اس میں یہ حیران کن الفاظ بھی ہیں۔

فَلَمَّا رَفَعَ رَأْسَهٗ حَمَلُوْهُ فَاشْتَدُّوْا بِهٖ بَيْنَ قُطْرَىْ مَكَّةَ يَقُوْلُوْنَ نَبِیُّ بَنِیْ عَبْدِ مَنَافٍ (1)

"کہ جب حضور ﷺ نے سجدے سے سر اٹھایا تو کفار مکہ نے آپ کو اٹھا لیا۔ آپ کو مکہ کے طول و عرض میں پھرایا اور یہ نعرے لگاتے رہے کہ یہ بنو عبد مناف کے نبی ہیں۔"

کفار مکہ حضور ﷺ کے جانی دشمن تھے۔ وہ آپ کو نقصان پہنچانے کے لئے موقعہ کی تلاش میں رہتے تھے۔ بنو ہاشم خصوصاً آپ کے چچا، کفار مکہ سے آپ کی حفاظت کے لئے ہمہ وقت مستعد رہتے تھے۔ کیا حضور ﷺ کے رشتہ دار اور خیر خواہ کفار مکہ پر اتنا اعتماد کر سکتے تھے کہ وہ حضور ﷺ کو اٹھائے شہر کے طول و عرض میں پھرتے رہیں اور انہیں کسی قسم کی فکر دامن گیر نہ ہو۔ یہی حال تمام مسلمانوں کا بھی تھا۔ وہ بھی ان حالات میں کفار مکہ پر اتنا اعتماد کرنے کی غلطی نہیں کر سکتے تھے۔ غالباً یہ الحاقی کلمات اختراع کرنے والے نے اپنے دیگر ہمنواؤں سے بھی دو قدم آگے بڑھنے کی کوشش کی ہے۔ غرض اس واقعے کی

1۔"الدر المنثور"،جلد 4، صفحہ 368

روایات میں بے شمار چیزیں ایسی ہیں جن کو عقل تسلیم نہیں کر سکتی۔ اس قسم کی روایات کی اسناد بھی جب کمزوریوں سے پر ہیں تو یہ واقعہ اس قابل نہیں کہ اس کو کوئی اہمیت دی جاسکے۔

قصہ غرانیق کے متعلق علمائے محققین کی رائے

ملت اسلامیہ کے علمائے محققین نے ہر زمانے میں اس قصے کو موضوع اور زندیقوں کی اختراع ثابت کرنے کے لئے اپنی پوری صلاحیتیں استعمال کی ہیں۔ جن لوگوں نے اس واقعے کی تردید کی ہے، ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

علامہ محمد الصادق ابراہیم عرجون نے اپنی کتاب "محمد رسول اللہ" کی دوسری جلد میں اس واقعے کی ایک ایک روایت کو علیحدہ بیان کر کے اس کو عقلاً اور نقلاً ناقابل اعتبار ثابت کیا ہے۔ انہوں نے اس قصے کے مختلف راویوں کے متعلق ثابت کیا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔ جن علمائے ملت نے اسانید کی کمزوری کے باوجود اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ کثرت طرق اس بات کی نشاندہی کر رہے ہیں کہ اس واقعہ کی کوئی اصل ہے، علامہ ان پر خوب برسے ہیں بلکہ وہ علماء جنہوں نے اس واقعہ کی صحت کا انکار کیا ہے لیکن ساتھ ہی یہ کہا ہے کہ اگر بالفرض اس واقعہ کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کی یہ تاویل ممکن ہے، علامہ نے ان کے خلاف بھی خوب لکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں یہ قصہ اول تا آخر جھوٹ ہے، اس کی کوئی تاویل ممکن نہیں ہے۔ ملاحظہ فرمائیے انہوں نے اپنے اس موقف کو بیان کرنے کے لئے کیا انداز اختیار کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

وَهِيَ اُقْصُوْصَةٌ مُخْتَلَقَةٌ بَاطِلٌ فِيْ اَصْلِهَا وَفَصْلِهَا وَاُكْذُوْبَةٌ خَبِيْثَةٌ فِيْ جُذُوْرِهَا وَاَغْصَانِهَا وَفِرْيَةٌ مُتَزَنْدِقَةٌ اِخْتَرَقَهَا (غَرْنُوْقٌ) اَبْلَهُ جَهُوْلٌ اَوْ شَيْخٌ حَاقِدٌ عَلَى الْاِسْلَامِ زِنْدِيْقٌ اَوْ مُنَافِقٌ فَاجِرٌ عِرْبِيْدٌ اَلْقَى بِهَا اِلَيْهِ شَيْطَانٌ عَابِثٌ مَرِيْدٌ (1)

"یہ ایک گھڑا ہوا افسانہ ہے جو ہر لحاظ سے باطل ہے۔ یہ اول و آخر ایک خبیث جھوٹ ہے۔ یہ ایک کافرانہ جھوٹ ہے جسے گھڑنے والا یا تو کوئی احمق اور جاہل جوان ہے، یا کوئی حاسد اور بے ایمان بوڑھا، جو اسلام کا دشمن ہے یا کوئی فسادی منافق اور فاجر ہے اور یہ افسانہ اس کے دل میں

1۔ محمد الصادق ابراہیم عرجون، "محمد رسول اللہ ﷺ"، (دار القلم دمشق۔ 1985)، جلد 2، صفحہ 30

شیطان مردود نے ڈالا ہے۔"

علامہ عرجون نے اپنی کتاب میں مختلف علمائے ملت کی آرا بھی نقل کی ہیں جن میں سے چند ہم قارئین کے فائدے کے لئے یہاں درج کرتے ہیں۔

علامہ ابوالبرکات النسفی فرماتے ہیں:

یہ روایت قابل قبول نہیں کیونکہ اس کی تین ہی صورتیں ہیں: یا تو حضور ﷺ عمداً یہ الفاظ کہیں اور یہ جائز نہیں کیونکہ یہ کفر ہے۔ حضور ﷺ بتوں کی توہین کے لئے مبعوث ہوئے تھے، آپ ان کی تعریف کرنے کے لئے تشریف نہیں لائے تھے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ شیطان نے جبراً یہ الفاظ آپ کی زبان پر جاری کردیئے ہوں اور آپ کے لئے اسے اس سے روکنا ممکن نہ ہو۔ یہ بھی محال ہے کیونکہ

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ (1)

کے مصداق، شیطان دوسرے لوگوں پر بھی اس قسم کی قدرت نہیں رکھتا تو حضور ﷺ کے حق میں بدرجہ اولیٰ یہ طاقت نہیں رکھتا۔

تیسری صورت یہ ہے کہ یہ کلمات سہواً یا غفلت سے آپ کی زبان پر جاری ہوگئے۔ یہ بھی غلط ہے کیونکہ تبلیغ وحی کی حالت میں آپ کے لئے اس قسم کی غفلت جائز نہیں۔ اور اگر اس کو جائز مان لیا جائے تو آپ کے قول پر اعتماد ختم ہو جائے گا۔(2)

امام شوکانی فتح القدیر میں فرماتے ہیں:

"ان روایات میں سے کوئی روایت نہ صحیح ہے اور نہ ہی کسی طور پر ثابت ہے۔ محقق علمائے کرام نے اس روایت کی عدم صحت بلکہ بطلان کے باوجود قرآن حکیم سے اس کا رد کیا ہے۔"(3)

اس قصے کے بارے میں علامہ ابن حزم کی رائے یہ ہے:

وَاَمَّا الْحَدِیْثُ الَّذِیْ فِیْهِ وَاِنَّهُنَّ الْغَرَانِیْقُ الْعُلٰی وَاِنَّ شَفَاعَتَهَا لَتُرْتَجٰی فَکَذِبٌ بَحْتٌ مَوْضُوْعٌ لِاَنَّهٗ لَمْ یَصِحَّ قَطُّ مِنْ طَرِیْقِ النَّقْلِ وَلَا مَعْنٰی لِلْاِشْتِغَالِ بِهٖ اِذْ وَضْعُ الْکَذِبِ لَا یَعْجَزُ عَنْهُ

1۔ سورۃ الحجر: 42۔ ترجمہ: "بے شک میرے بندوں پر تیرا بس نہیں چلتا۔"
2۔ عرجون، "محمد رسول اللہ"، جلد 2، صفحہ 148
3۔ ایضاً

اَحَدٌ (1)

"وہ حدیث جس میں غرانیق کا واقعہ درج ہے، وہ سفید جھوٹ اور موضوع ہے کیونکہ یہ قصہ از روئے نقل کے قطعاً ثابت نہیں۔ اس لئے اس کے متعلق بحث کرنے کا کوئی مطلب نہیں کیونکہ جھوٹ کوئی شخص بھی گھڑ سکتا ہے۔"

اس افسانے کے متعلق شیخ محمد عبدہ کی رائے یہ ہے۔

اَلْعِصْمَةُ مِنَ الْعَقَائِدِ الَّتِىْ يُطْلَبُ فِيْهَا الْيَقِيْنُ فَالْحَدِيْثُ الَّذِىْ يُرِيْدُ خَرْمَهَا وَنَقْضَهَا لَا يُقْبَلُ عَلٰى اَىِّ وَجْهٍ جَآءَ وَقَدْ عَدَّ الْاُصُوْلِيُّوْنَ الْخَبَرَ الَّذِىْ يَكُوْنُ عَلٰى تِلْكَ الصِّفَةِ مِنَ الْاَخْبَارِ الَّتِىْ يَجِبُ الْقَطْعُ بِكِذْبِهَا هٰذَا لَوْ فُرِضَ اِتِّصَالُ الْحَدِيْثِ فَمَا ظَنُّكَ بِالْمَرَاسِيْلِ (2)

"عصمت (انبیاء) ان عقائد میں سے ہے جن پر یقین رکھنا شرعاً مطلوب ہے۔ ایسی حدیث جو اس عقیدے کو نقصان پہنچائے، وہ کسی بھی طریقے سے مروی ہو مقبول نہیں ہے۔ علمائے اصول کا فیصلہ یہ ہے کہ جو حدیث اس قسم کی ہو اس کو قطعیت کے ساتھ جھوٹ قرار دینا واجب ہے۔ یہ حکم تو اس صورت میں ہے جب اس قسم کی حدیث مرفوع ہو۔ جب اس قسم کی مرفوع حدیث کے متعلق حکم یہ ہے تو مرسل روایات کی حیثیت ہی کیا ہے۔"

امام فخر الدین رازی نے بھی زور شور سے اس روایت کا رد کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

اگر چہ سطحی قسم کے لوگوں نے اس روایت کو لکھا ہے لیکن علمائے محققین کا اس کے متعلق یہ فیصلہ ہے:

هٰذِهِ الرِّوَايَةُ بَاطِلَةٌ مَوْضُوْعَةٌ

کہ یہ روایت جھوٹی ہے، گھڑی ہوئی ہے۔ اور

وَاحْتَجُّوْا عَلَيْهِ بِالْقُرْاٰنِ وَالسُّنَّةِ وَالْمَعْقُوْلِ

1۔ عرجون، "محمد رسول اللہ"، جلد 2، صفحہ 151

2۔ ایضاً، صفحہ 150

اس کے باطل اور موضوع ہونے پر ان علماء نے قرآن، سنت اور عقلی دلائل پیش کئے ہیں......امام رازی عقلی دلائل پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں: جو شخص کہتا ہے کہ حضور پر نور ﷺ نے بتوں کے بارے میں تعریفی جملے کہے وہ کافر ہے کیونکہ اس طرح تو حضور ﷺ کی بعثت کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ نیز شریعت، قرآن اور دین اسلام کی کسی بات پر یقین نہیں رہتا۔ پھر فرماتے ہیں: ان دلائل سے روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ اِنَّ هٰذِهِ الْقِصَّةَ مَوْضُوْعَةٌ یعنی یہ قصہ موضوع ہے۔ اس کے حق میں زیادہ سے زیادہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ بعض مفسروں نے اسے لکھا ہے تو اس کا جواب یہ ہے:

خَبَرُ الْوَاحِدِ لَا يُعَارِضُ الدَّلَائِلَ النَّقْلِيَّةَ وَالْعَقْلِيَّةَ

کہ یہ خبر واحد ہے اور دلائل عقلیہ و نقلیہ جو حد تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں، ان کے سامنے اس کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ اس روایت کے ناقلین نے اس کی جو مختلف تاویلیں کی ہیں امام موصوف نے ان کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی ہیں اور فرمایا ہے کہ اس روایت کی کوئی تاویل درست نہیں۔ اس کا کوئی صحیح محمل اور مصداق تلاش نہیں کیا جاسکتا۔ یہ روایت اپنی تمام تاویلات، احتمالات اور اختلاف الفاظ کے ساتھ مسترد کر دینے کے قابل ہے۔(1)

علامہ ابو عبداللہ القرطبی نے بھی "احکام القرآن" میں اس روایت کی خوب تردید کی ہے۔ وہ ہر ہر سلسلہ روایت پر بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

فِيْ ذٰلِكَ رِوَايَاتٌ كَثِيْرَةٌ كُلُّهَا بَاطِلٌ لَا أَصْلَ لَهَا

"کہ اس سلسلہ کی سب کی سب روایات باطل ہیں، ان کا کوئی ثبوت نہیں اور کیونکہ یہ روایت ضعیف ہے اس لئے اس کی تاویل کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔"

وَضُعْفُ الْحَدِيْثِ مُغْنٍ عَنْ كُلِّ تَأْوِيْلٍ

آخر میں فرماتے ہیں کہ اگر اس روایت کی کوئی سند صحیح بھی ثابت ہو جائے تو بھی وہ ضعیف اور ناقابل اعتبار ہو گی کیونکہ آیات قرآنی کی صراحۃً مخالف ہے۔

اور اب تو یہ آیات قرآنی کے بھی مخالف ہے اور اس کی کوئی سند بھی صحیح نہیں ہے۔ ان

1۔ "ضیاء القرآن"، جلد3، صفحہ 226-225

حالات میں یہ اہل نظر کے لئے کب قابل التفات ہو سکتی ہے۔(1)

ان کے علاوہ بھی بے شمار علمائے کرام نے زور شور سے اس واقعہ کی تردید کی ہے لیکن ہم مذکورہ بالا اقوال پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

یہاں چند سوالات باقی رہ جاتے ہیں۔ ایک سوال تو یہ ہے کہ اگر یہ واقعہ صحیح نہیں تو مہاجرین حبشہ کے اتنی جلدی مکہ واپس آجانے کی وجہ کیا تھی؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مہاجرین حبشہ کی واپسی کے فرضی اور غلط سبب کو تسلیم کرنا ضروری نہیں ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے خود بخود ان اسباب کا پتہ چل جاتا ہے جو مہاجرین حبشہ کو مکہ واپسی پر مائل کر سکتے تھے۔ مہاجرین حبشہ کے قیام حبشہ کے دوران، دو بڑے اہم واقعات پیش آئے: ایک تو مکہ مکرمہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کر لیا تھا اور خدا کے اس شیر کی ہیبت سے کفار مکہ مسلمانوں کو مسجد حرام میں نماز پڑھنے سے روکنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔

دوسرا واقعہ یہ پیش آیا تھا کہ نجاشی کے اسلام کی طرف میلان کو دیکھ کر حبشہ میں اس کے مخالفین نے بغاوت کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ حبشہ کے ان داخلی حالات میں جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام قبول کرنے کی خبر مشہور ہوئی تو کچھ مسلمانوں نے حبشہ میں مزید قیام پر مکہ واپس لوٹ جانے کو ترجیح دی اور یہ بھی ممکن ہے کہ جب قریش کی سفارت، نجاشی سے مسلمانوں کی واپسی کے مطالبے کی منظوری نہ لے سکی، تو انہوں نے نئی چال چلی ہو اور یہ افواہ پھیلا دی ہو کہ مکہ والے مسلمان ہو گئے ہیں تاکہ اس افواہ کو سن کر مسلمان خود حبشہ چھوڑ کر مکہ واپس چلے جائیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر "تلك الغرانيق العلى" والی بات صحیح نہیں تھی تو کافروں نے حضور ﷺ کے ساتھ مل کر سجدہ کیوں کیا تھا؟

کفار مکہ کا حضور ﷺ کے ساتھ مل کر سجدہ کرنا روایات صحیحہ سے ثابت ہے لیکن اس کی توجیہ کے لئے قصہ غرانیق کو تسلیم کرنا ضروری نہیں۔ کلام خدا کو حبیب خدا ﷺ کی زبان پاک سے سن کر ہزاروں عربوں نے اپنا دین چھوڑ دیا تھا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بہن سے کلام الٰہی کی چند آیات سن کر ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ اکابر قریش قرآن کی عظمتوں کے

1۔ "ضیاء القرآن"، جلد 3، صفحہ 266

سامنے بے ساختہ گردنیں جھکا رہے تھے۔ اسی کلام کی قوت تاثیر تھی کہ جب سورۂ نجم تلاوت کرنے کے بعد حضور ﷺ نے سجدہ کیا، تو وہ کافر جو تلاوت کے دوران اس کلام کی عظمتوں پر حیران ہو رہے تھے، وہ بھی بے ساختہ سجدے میں گر گئے۔ اور جب انہیں احساس ہوا کہ انہوں نے کیا کیا ہے تو اپنے کئے پر پچھتانے لگے۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ یہ واقعہ صحیح نہیں تو سورۂ حج کی اس آیت کا مفہوم کیا ہے، جس کی تفسیر میں کئی مفسرین نے اسے لکھا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ سورۂ حج کی آیت وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّ لَا نَبِىٍّ الایہ، میں نہ تو حضور ﷺ کے کسی فعل کا کوئی ذکر ہے، جس کی اصلاح کی جا رہی ہو اور نہ ہی آپ کے کسی حزن و ملال کا ذکر ہے جس پر آپ کو تسلی دی جا رہی ہو۔ اور نہ اس آیت کے سیاق و سباق میں اس قسم کی کوئی چیز مذکور ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ حضور ﷺ کو انبیاء و رسل کے متعلق اپنی ایک سنت پر آگاہ فرما رہا ہے کہ جب بھی کوئی نبی یا رسول خدا کا پیغام اس کے بندوں کو پڑھ کر سناتا ہے تو شیطان لوگوں کو ہدایت کے اس نور سے محروم رکھنے کے لئے سننے والوں کے دلوں میں طرح طرح کے وسوسے ڈالتا ہے۔ وہ لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے کہ خدا کا رسول تمہیں جو کچھ کہہ رہا ہے اس پر عمل کرو گے تو تمہارا نقصان ہو گا، تمہارے مفادات کو دھچکا لگے گا اور تم طرح طرح کی پریشانیوں میں مبتلا ہو جاؤ گے لیکن اللہ تعالیٰ شیطان کے ان وسوسوں کو ختم کر دیتا ہے اور اپنی آیات کو محکم فرما دیتا ہے۔ آیت قرآنی کے اس واضح مفہوم کو پیچیدہ اور ناقابل قبول بنانا انہی لوگوں کا کام ہے جو محکمات کو چھوڑ کر متشابہات کے پیچھے دوڑنے کے عادی ہیں۔

قصہ غرانیق کو مستشرقین نے نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر قبول کیا ہے اور نہ صرف اس افسانے کو حقیقت سمجھا ہے بلکہ اس کو مختلف انداز میں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا ہے۔

جس واقعے کو بے شمار مسلمان محققین نے بے شمار دلائل کی مدد سے عقلاً اور نقلاً غلط ثابت کیا ہے، اس کے متعلق سر ولیم میور اپنا فیصلہ بغیر کسی دلیل کے یوں صادر فرماتے ہیں:

"بظاہر ایک خوب معتبر قصہ موجود ہے جس سے محمد صاحب کا کفار مکہ کے ساتھ ایک عارضی موافقت اور مصالحت کرنا ثابت ہوتا ہے۔" (1)

1۔ "سیرت محمدی"، صفحہ 486

منٹگمری واٹ نے اس افسانے کو اپنی تمام کتابوں میں خوب استعمال کیا ہے۔ وہ اس افسانے کی مدد سے ثابت کرتا ہے کہ اسلام ہمیشہ ایک توحیدی مذہب نہیں رہا بلکہ حالات کے بدلنے سے اس میں تبدیلیاں آتی رہی ہیں وہ کہتا ہے:

"It must be remembered that the outlook of Muhammad's more enlightened contemporaries has been described as a vague monotheism".(1)

"یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ محمد (ﷺ) کے ہم عصر زیادہ روشن خیال مسلمانوں کے عقیدے کو مبہم توحید کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔"

اسی افسانے کے سہارے اس نے یہ مفروضہ بھی تراشا ہے کہ ابتدا میں اسلام نہ بت پرستی کے خلاف تھا اور نہ ہی قرآن کی ابتدائی سورتوں میں توحید پر زور دیا گیا ہے۔ اسی افسانے کی مدد سے اس نے ناسخ اور منسوخ کے تصور کو غلط معنی پہنا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضور ﷺ جب کسی آیت کو مصلحت کے خلاف سمجھتے تھے تو اس کو منسوخ کر دیتے تھے۔ اسی افسانے کی مدد سے اس نے قرآن حکیم میں تغیر و تبدل ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی واقعے کی مدد سے اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان شیطانی آیات کے نازل ہونے اور ان کے منسوخ ہونے کے دونوں واقعات کے پیچھے سیاسی عوامل کار فرما تھے۔ منٹگمری واٹ کی کتابوں میں جا بجا اس افسانے کے آثار نظر آتے ہیں۔ کبھی تو وہ اس روایت کو زیادہ قابل اعتماد نہیں سمجھتا اور کہتا ہے:

"........ but the details of the accounts do not inspire much confidence and may be neglected here, since there is no reference in the Quran. Likewise the Sira gives no clear indication of how long it was before Muhammad discovered that the verses were satanic". (2)

"لیکن واقعات کی تفصیلات انسان کے دل میں زیادہ اعتماد پیدا نہیں کرتیں، اس لئے اس (واقعے) کو یہاں نظر انداز کر دینا چاہئے۔ کیونکہ قرآن (حکیم) میں اس واقعے کا کوئی اشارہ نہیں۔ اسی طرح سیرت کی

1۔ محمد: پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین" صفحہ 62
2۔ "محمد ایٹ مکہ"، صفحہ 88

کتابوں میں بھی اس بات کا کوئی واضح اشارہ موجود نہیں کہ محمد (ﷺ) کو یہ معلوم کرنے میں کتنا وقت لگا کہ وہ آیات شیطانی تھیں۔"

پھر یہی مستشرق اپنی دوسری کتاب میں اسی ناقابلِ اعتماد واقعے کو حقیقت ثابت کرنے کے لئے یہ اچھوتا انداز اختیار کرتا ہے:

"This is a strange and surprising story. The prophet of the most uncompromisingly monotheistic religion seems to be authorizing polytheism. Indeed the story is so strange that it must be true in essentials. It is unthinkable that anyone should have invented such a story and persuaded the vast body of Muslims to accept it". (1)

"یہ ایک عجیب اور حیران کن کہانی ہے۔ اصولوں پر سودا بازی نہ کرنے والے توحیدی مذہب کا پیغمبر، شرک کو جواز مہیا کرتا نظر آتا ہے۔ البتہ کہانی اتنی حیران کن ہے کہ اس کی بنیادی باتیں ضرور سچی ہوں گی۔ یہ ممکن نہیں کہ کسی شخص نے یہ کہانی تراشی ہو اور پھر مسلمانوں کی اتنی کثیر تعداد کو اس کہانی کو قبول کرنے کی طرف مائل کر لیا ہو۔"

مستشرقین ایسی باتیں خود بھی گھڑنے کے ماہر ہیں جن کا اسلامی ادب میں کوئی نشان نہیں۔ قصہ غرانیق کو تو خود متعدد مسلمان مصنفین نے بیان کیا ہے، اس لئے اس کو اگر مستشرقین اپنے مقاصد کے لئے استعمال کریں تو تعجب کی کوئی بات نہیں۔

منٹگمری واٹ نے اس قصے پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک ایسی چیز بیان کی ہے جس کا سیرت اور تفسیر کی کتابوں میں ذکر نہیں ہے۔ اسے اس واقعے میں دو چیزیں یقینی نظر آئی ہیں۔ پہلی یہ کہ حضور ﷺ نے یقیناً کسی وقت قرآن کے حصے کے طور پر ایسی آیات تلاوت کی تھیں جن میں بتوں کی شفاعت کے عقیدے کو تسلیم کیا گیا تھا اور دوسری یہ کہ بعد میں ان آیات کو منسوخ کر دیا گیا۔ منٹگمری واٹ کے اس بے بنیاد دعوے کو سمجھنے کے لئے، اس کے اپنے الفاظ کو یہاں نقل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے:

"At some times Muhammad must have recited as part of the Quran certain verses which apparently

1۔ "محمد: پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین"، صفحہ 61

permitted intercession to idols. One version of these is:

Did you consider al-Lat and al-Uzza and al-Manat, the third, the other? Those are the swans exalted;
Their intercession is expected;
Their likes are not neglected.
Then, some time lator, he received another revelation cancelling the last three verses here and substituting others for them:
Did you consider al-Lat and al-Uzza And al-Manat, the third, the other? For you males and for him females? That would be unfair sharing.
They are but names you and your fathers named: God revealed no authority for them; they follow only opinion and their souls fancies, though from their lord there has come to them guidance". (1)

"یہ بات یقینی ہے کہ کسی وقت محمد (ﷺ) نے قرآن کے حصے کے طور پر کچھ آیات پڑھیں جن میں بظاہر بتوں کو شفاعت کو تسلیم کیا گیا تھا۔ ایک روایت کے مطابق وہ آیات یہ تھیں:
کیا تم نے غور کیا لات اور عزیٰ کے بارے میں اور منات کے بارے میں جو تیسری ہے۔ وہ شاندار پرندے ہیں۔ ان کی شفاعت کی امید کی جاتی ہے اور ان جیسی چیزوں کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ پھر کچھ عرصہ بعد محمد (ﷺ) کے پاس ایک اور وحی آئی جس نے مذکورہ بالا وحی کی آخری تین آیتوں کو منسوخ کر دیا اور ان کے بدلے میں دوسری آیتیں نازل ہوئیں جو یہ ہیں۔
کیا تم نے غور کیا لات اور عزیٰ کے بارے میں اور منات کے بارے میں جو تیسری ہے۔ کیا تمہارے لئے تو بیٹے ہیں اور اللہ کے لئے نری بیٹیاں۔ یہ تقسیم تو بڑی ظالمانہ ہے۔ نہیں پیروی کر رہے یہ لوگ مگر

1۔"محمد: پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین"، صفحہ 60

اپنے گمان اور اپنے خیال کی۔ حالانکہ ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے ہدایت آگئی ہے۔"

منٹگمری واٹ نے ناسخ منسوخ کا یہ افسانہ اپنے تخیل سے گھڑا ہے۔ تفسیر اور حدیث کی کتابوں میں اس کا ذکر نہیں۔ مستشرق مذکور اس کے ذریعے اسلام پر ایک بڑا خطرناک وار کرنا چاہتا ہے۔ وہ مسلمانوں کے نزدیک مسلم ناسخ اور منسوخ کی اصطلاحوں کو اپنی مرضی کے معنی پہنانا چاہتا ہے۔ وہ یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ ناسخ و منسوخ کا دائرہ لامحدود ہے، یہ ممکن ہے کہ قرآن میں ایک آیت شرک کے حق میں نازل ہو اور دوسری آیت اس کو منسوخ کر دے حالانکہ ناسخ اور منسوخ کا جو قاعدہ مسلمانوں کے نزدیک مسلم ہے، عقائد اس کے دائرہ کار سے باہر ہیں۔

اس واقعے کے موضوع ہونے کو پہلے بڑی تفصیل سے بیان کر دیا گیا ہے۔ یہاں ہم مستشرقین کے موقف کے پیش نظر چند باتیں ذکر کرنا چاہتے ہیں۔

مسلمان کسی واقعے کی حقیقت کو پرکھنے کے لئے دو طریقے اختیار کرتے ہیں۔ پہلے روایت کی سند کو دیکھتے ہیں اور پھر اس کے متن کو پرکھتے ہیں۔ جس روایت کی سند اور متن ہر قسم کی علتوں سے پاک ہوتے ہیں، اس خبر کو مان لیتے ہیں۔ اگر سند اور متن میں کمزوریاں ہوں تو ان کمزوریوں کی نوعیت کے مطابق اس خبر پر حکم لگاتے ہیں۔ اس طرح یا تو روایت کو کلیۃً تسلیم کر لیتے ہیں یا اسے کلیۃً مسترد کر دیتے ہیں اور یا اسے ایسی خبر قرار دیتے ہیں جس کے صحیح ہونے کے ساتھ ساتھ غلط ہونے کے امکانات بھی ہیں۔

مستشرقین کے ہاں کسی خبر کی صحت کو پرکھنے کیلئے سند کو پرکھنے کا رواج نہیں حالانکہ خبر کی صداقت کی پہلی کسوٹی مخبر کی صداقت ہی ہوتی ہے۔ ان کی مجبوری یہ ہے کہ وہ مذہبی میدان میں جن خبروں پر ایمان لانے پر مجبور ہیں، ان کے بارے میں ان کو نہ تو یہ پتہ ہے کہ وہ خبریں دینے والے کون ہیں اور نہ ان کو یہ پتہ ہے کہ ان خبروں کے راویوں کا کردار کیسا ہے۔ اپنی اس کمزوری کی وجہ سے وہ خبر کی صحت پرکھنے کے اس نظام ہی کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ گویا جس خوبی سے ان کا اپنا مذہب محروم ہے، وہ اس خوبی کو اسلام میں بھی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔

روایت کو پرکھنے کا دوسرا طریقہ متن کی جانچ پڑتال ہے اور اس طریقے کو مستشرقین

بھی استعمال کرتے ہیں بلکہ ان کے نزدیک خبر کو پرکھنے کا واحد طریقہ ہی یہی ہے۔
مسلمانوں نے ان دونوں کسوٹیوں پر پرکھ کر اس واقعہ کو جھوٹ ثابت کیا ہے اور مدلل انداز میں اس کو مسترد کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی معتبر کتابوں میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ مستشرقین کی خدمت میں عرض ہے کہ ان کے کچھ ہمنوا مستشرقین نے "وفنسک" کی نگرانی میں صحاح ستہ اور حدیث کی دیگر تین معتبر کتابوں کا جو اشاریہ "المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث" کے نام سے مرتب کیا ہے، اس میں اس روایت کا کوئی حوالہ نہیں۔ گویا انہوں نے جن نو کتابوں کو خود منتخب کیا ہے وہ اس قصے کے بیان سے پاک ہیں۔
جب یہ قصہ عقلی اور نقلی طور پر نا قابل اعتبار ہے تو پھر اس کو قابل اعتبار سمجھنے اور اسی کی بنیاد پر اپنے مزعومات کا محل تعمیر کرنے کا مستشرقین کے پاس کیا جواز ہے؟
منٹگمری واٹ اور دیگر مستشرقین کی یہ منطق بھی عجیب ہے کہ چونکہ یہ واقعہ بہت ہی عجیب ہے، اس لئے ضرور سچا ہو گا۔
کیا ہر حیران کن بات کے سچا ہونے کے اصول کو وہ اپنے روزمرہ معاملات میں تسلیم کرتے ہیں؟ حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام کے اکثر واقعات، جن کا تعلق معجزات سے ہے، ان کو مستشرقین اسی لئے مسترد کر دیتے ہیں کہ وہ حیران کن ہیں اور عقل ان کی توجیہ نہیں کر سکتی۔
مستشرقین کہتے ہیں کہ اگر یہ واقعہ سچا نہ ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ ایک ایسی بات جو اسلام کے اصولوں کے خلاف تھی، اسے کوئی شخص گھڑتا اور پھر بے شمار مسلمانوں کو اس من گھڑت بات کو تسلیم کرنے کی طرف راغب کر لیتا۔ مستشرقین کی یہ سوچ غلط ہے کیونکہ ایسے ہوتا رہتا ہے کہ کسی مذہب کے دشمن، اس مذہب کے خلاف باتیں گھڑتے ہیں اور پھر اس مذہب کے ماننے والوں سے ان خود تراشیدہ باتوں کو تسلیم کروا لیتے ہیں۔ جیسے کچھ ظالموں نے خدا کے معصوم پیغمبروں پر الزام تراشیاں کیں اور پھر انہیں بائیبل کا حصہ بنا دیا گیا۔ سینٹ پال یہودی نے عقیدہ توحید کو تثلیث کا رنگ دیا، خدا کے مقدس رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کا افسانہ گھڑا، جس بندے کو خدا نے زندہ آسمانوں پر اٹھا لیا تھا، اس کے مصلوب ہونے کا شوشہ چھوڑا اور پھر ان تمام کفریہ عقائد کو بائیبل کا حصہ بنا دیا اور عیسائیت کے دشمنوں نے ان کے مذہب کے اصولوں کے خلاف جو باتیں گھڑی تھیں، عیسائیوں کی اکثریت انہیں تسلیم کرتی آ رہی ہے۔

اسلام کی شان اس سلسلے میں امتیازی ہے۔ مسلمانوں کے پاس قرآن حکیم ہے جس کی حفاظت نزول قرآن کے دوران بھی اور بعد میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ قدرت پر لے رکھی ہے۔ اس میں باطل کسی طرح سے دخل انداز نہیں ہو سکتا۔ احادیث کا معاملہ قرآن حکیم سے مختلف ہے۔ احادیث طیبہ کو خدائی حفاظت کی ضمانت میسر نہیں ہے۔ ان کی حفاظت اسی طرح امت مسلمہ کے ذمہ لگائی گئی ہے جس طرح تورات وانجیل کی حفاظت متعلقہ امتوں کے ذمہ لگائی گئی تھی۔

جس طرح تورات اور انجیل میں ترامیم اور اضافے کئے گئے ہیں، اسی طرح انسانوں نے اپنی مختلف خواہشات کے تحت احادیث طیبہ میں بھی اسرائیلیات اور موضوعات کو داخل کرنے کی کوششیں کیں۔ لیکن اس میدان میں بھی امت مسلمہ کی شان نرالی نظر آتی ہے۔

بائیبل کی تمام ایسی باتیں جو یہودیت اور عیسائیت کے اصولوں کے بھی خلاف ہیں اور ان میں سے بے شمار چیزیں عقل اور علوم جدیدہ کی تحقیقات کے بھی خلاف ہیں، وہ بائیبل کا حصہ بن چکی ہیں۔ اب ان مذاہب کے ماننے والوں کے پاس دو ہی طریقے ہیں کہ یا تو بائیبل میں جو رطب ویابس ہے، اسے جوں کا توں قبول کرلیں اور یا ساری بائیبل کو مسترد کردیں۔ اور عملاً یہی ہو رہا ہے کہ جو لوگ مذہب کے ٹھیکیدار بنے ہوئے ہیں، وہ موجودہ بائیبل کے ہر لفظ کو کلام اللہ ثابت کرنے پر مصر ہیں اور عام عیسائی بائیبل کو ایک ناقابل قبول کتاب سمجھ کر مسترد کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس مسلمانوں نے غلط اور صحیح میں امتیاز کرنے اور سچ اور جھوٹ کو پرکھنے کیلئے ایک نہیں کئی علوم ایجاد کئے ہیں۔ وہ صحیح اور غلط کو پرکھنے کے اصولوں پر ہر روایت کو پرکھتے ہیں۔ اگر وہ روایت ان اصولوں پر پوری اترتی ہے تو اسے تسلیم کر لیتے ہیں وگرنہ اسے مسترد کر دیتے ہیں۔

قصہ غرانیق کو بھی مسلمانوں نے جرح و تعدیل کے انہی اصولوں پر پرکھا ہے اور اسے اس لئے مسترد کر دیا ہے کہ وہ ان مقررہ اصولوں کے مطابق ناقابل اعتماد ہے۔

یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ مسلمان یہ کسوٹی صرف ان روایات کو پرکھنے کیلئے استعمال نہیں کرتے، جو اسلام میں کوئی نقص ثابت کر رہی ہوں بلکہ ایسی روایات جن میں اسلام یا اسلام کے کسی شعار کی تعریف کی گئی ہو اور جو بظاہر اسلام اور مسلمانوں کے حق میں نظر آتی ہوں، انہیں پرکھنے کے لئے بھی مسلمان یہی معیار استعمال کرتے ہیں۔

قصہ غرانیق کو بعض مسلمان مصنفین نے اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے لیکن یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اس قصے کو گھڑنے والا مستشرقین ہی کا کوئی ہمنوا ہے۔ جس طرح قرون وسطٰی میں مستشرقین اسلام کے متعلق افسانے گھڑ کر مشہور کرتے رہے ہیں، اسی طرح یہ افسانہ بھی مستشرقین ہی کے کسی پیشرو نے گھڑا ہے۔ بعض مسلمان مصنفین نے اس افسانے کو اپنی کتابوں میں جگہ دینے کی فحش غلطی کی لیکن امت نے کبھی اجتماعی طور پر اس افسانے کو تسلیم نہیں کیا بلکہ محقق علماء نے اس قصے کے بطلان کو روز روشن کی طرح واضح کر دیا، اور امت مسلمہ جس کو اس افسانے کے ذریعے گمراہ کرنے کی کوشش دشمنان اسلام نے کی تھی، اسے اس گمراہی سے بچالیا۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى مَنِّهٖ وَكَرَمِهٖ وَفَضْلِهٖ

کتابیات

نام کتاب	نام مصنف	مطبوعہ	سال طباعت
القرآن الکریم			
تفسیر فتح المنان (تفسیر حقانی)	علامہ عبدالحق حقانی	دلی پرنٹنگ پریس دلی	س ن
تفسیر الخازن	علاء الدین علی بن محمد بن ابراہیم البغدادی المشہور بالخازن	المکتبہ التجاریہ الکبریٰ بمصر	س ن
فی ظلال القرآن	سید قطب	دار احیاء التراث العربی بیروت	1971
ضیاء القرآن	پیر محمد کرم شاہ	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور	1402ھ
الدر المنثور فی التفسیر بالماثور	امام جلال الدین السیوطی		
فتح القدیر	محمد بن علی بن محمد الشوکانی	دار المعرفہ بیروت	س ن
مباحث فی علوم القرآن	مناع القطان	مؤسسۃ الرسالہ بیروت	1980
صحیح البخاری	امام محمد بن اسماعیل بخاری	ایچ۔ایم۔سعید کراچی	1936
شرح صحیح مسلم	غلام رسول سعیدی	فرید بک سٹال لاہور	1988
الصحیح لمسلم	امام ابوالحسن مسلم بن حجاج	قدیمی کتب خانہ کراچی	1956
الوحی المحمدی	السید محمد رشید رضا	دار المنار مصر	1947
المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام	جواد علی	دار العلم للملایین بیروت	1970
فتوح البلدان	ابوالحسن البلاذری	دار الکتب العلمیہ بیروت	1983
مقدمہ تاریخ الحروب الصلیبیہ ازولیم صوری	ڈاکٹر سہیل زکار	دار الفکر	1990
اطلس تاریخ اسلام	حسین مونس	الزہراء لاعلام العربی القاہرہ	1987
تاریخ العلامہ ابن خلدون	علامہ ابن خلدون المغربی	بیروت	1968
شمس العرب تسطع علی الغرب	زیغرید ھونکہ	المکتب التجاری بیروت	1979
اضواء علی الاستشراق و المستشرقین	دکتور محمد احمد دیاب	دار المنار قاہرہ	1989

نام کتاب	نام مصنف	مطبوعہ	سال طباعت
الاستشراق رسالۃ الاستعمار	دکتور محمد ابراہیم الفیومی	دار الفکر العربی قاہرہ	1993
رویۃ اسلامیۃ للاستشراق	دکتور احمد عبدالحمید غراب	دار الاصالۃ للثقافۃ والنشر والاعلام ریاض	1988
الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری	دکتور محمود حمدی زقزوق	دار المنار قاہرہ	1989
الاستشراق وجہ الاستعمار الفکری	دکتور عبدالمتعال محمد الجبری	مکتبہ وہبہ قاہرہ	1995
الاستشراق فی الادبیات العربیۃ	عن ابراہیم النملہ	مرکز الملک الفیصل للبحوث والدراسات الاسلامیہ	1993
قوی الشر المتحالفۃ وموقفھا من الاسلام والمسلمین	محمد محمد الدھان	دار الوفا للطباعۃ والنشر المنصورہ	1988
الاسلام والمستشرقون	نخبۃ من العلماء المسلمین	عالم المعرفۃ جدہ	1985
لماذا اسلمنا	مجموعۃ مقالات لنخبۃ من رجال الفکر	مکتبہ الحرمین	س ن
المنجد فی الاعلام			
الحیل والاسالیب فی الدعوۃ الی التبشیر	مصطفیٰ فوزی غزال	مطابع المجموعۃ الاعلامیہ	س ن
افتراءات المستشرقین علی الاسلام	دکتور عبدالعظیم محمد المطعنی	مکتبہ وہبہ قاہرہ	1992
اصول الفقہ الاسلامی	دکتور محمد مصطفیٰ شلبی	الدار الجامعیۃ للطباعۃ والنشر بیروت	1983
اظہار الحق	علامہ رحمت اللہ کیرانوالی	المکتبۃ العصریۃ بیروت	س ن
الاسرائیلیات والموضوعات فی کتب التفسیر	الدکتور الشیخ محمد بن محمد ابوشھبہ	مکتبہ السنۃ قاہرہ	1408ھ
محمد رسول اللہ ﷺ	محمد صادق ابراہیم العرجون	دار القلم دمشق	1985
الاسلام والمستشرقون	زکریا ہاشم زکریا	المجلس الاعلی للشئون الاسلامیہ	1965

نام کتاب	نام مصنف	مطبوعہ	سال طباعت
نیو ورلڈ ٹرانسلیشن آف دی ہولی سکرپچرز (بائبل)	بائبل	واچ ٹاور بائبل اینڈ ٹریکٹ سوسائٹی نیویارک	1982
انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا دی ایج آف فیتھ	ول ڈیوران	سائمن اینڈ شسٹر نیویارک	1950
محمد پرافٹ اینڈ سٹیٹسمین	منٹگمری واٹ	آکسفورڈ یونیورسٹی پریس	1961
اسلام، اے وے آف لائف	فلپ کے۔ ہٹی	آکسفورڈ یونیورسٹی پریس	1971
اے ویسٹرن اٹیمپٹ ٹو انڈر سٹینڈ اسلام	کیرن آرمسٹرانگ	وکٹر گولانکز لمیٹڈ لندن	1991
دی ہنڈرڈ: اے رینکنگ آف دی موسٹ انفلوئنشل پرسنز ان ہسٹری	مائیکل ایچ۔ ہارٹ	اے اینڈ ڈبلیو ڈوال لائبریری نیویارک	1978
دی بائبل، دی قرآن اینڈ سائنس	ڈاکٹر موریس بکائلے	اسلامک بک کارپوریشن اسلام آباد	س ن
آن ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ	تھامس کارلائل	ایوری مین لائبریری نیویارک	1973
ٹائم انٹرنیشنل (دی ویکلی نیوز میگزین)		نیویارک	18 دسمبر 1995
The Koran	جارج سیل	فریڈرک وارن اینڈ کمپنی نیویارک	1890
محمد ایٹ مکہ	منٹگمری واٹ	ایڈنبرا یونیورسٹی پریس	1988
اسلام، محمد اینڈ ہز ریلیجن	آرتھر جیفری	بابز میرل ایجوکیشنل پبلشنگ انڈیاناپولس	1979
دی ڈیکلائن اینڈ فال آف دی رومن ایمپائر	ایڈورڈ گبن	ایوری مین لائبریری لندن	1962

نام کتاب	نام مصنف	مطبوعہ	سال طباعت
دی انسائیکلوپیڈیا آف لونگ فیتھس	آر۔ سی۔ زائنر (ایڈیٹر)	ہاچنسن گروپ ساؤتھ افریقہ	1984
اردو دائرہ معارف اسلامیہ		دانش گاہ پنجاب لاہور	
تاریخ اسلام	معین الدین احمد ندوی	ناشران قرآن لاہور	س ن
یورپ پر اسلام کے احسان	ڈاکٹر غلام جیلانی برق	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور	س ن
اسلام اور مستشرقین	مختلف علمائے اسلام کے مقالات کا مجموعہ	مکتبہ معارف اعظم گڑھ	1986
سنت خیر الانام	پیر محمد کرم شاہ	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور	1977
سیرت محمدی	سر سید احمد خان	مقبول اکیڈمی لاہور	1988
رحمۃ للعالمین	قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور	س ن
ایمان بالکتب	پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری	منہاج القرآن پبلی کیشنز لاہور	
رسول مبین	محمد احسان الحق سلیمانی	مقبول اکیڈمی لاہور	1993
سیرت سرور عالم	سید ابوالاعلیٰ مودودی	ترجمان القرآن لاہور	1979